جگنو میرے تعاقب میں

عاصمہ رحمان

sohnidigest.com

ناول

عاصمہ رحمان

جگنو میرے تعاقب میں

تاریخ: دو سال قبل

مقام: اسلامیہ کالج یونی ورسٹی پشاور

لائبریری میں کھڑکی کی سمت لگی میز پر وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ پیچھے اور دائیں طرف کتابوں کے بڑے بڑے ریکس تھے۔ ان ریکس میں اوپر سے نیچے تک بے شمار کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔ میز پر سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ گل کرسی پر گوتم بدھ والے انداز میں بیٹھی، گھٹنا جھلا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کافی کے گھونٹ بھرتی اسکرین کو بھی دیکھ رہی تھی۔

لیپ ٹاپ کے پیچھے سات آٹھ کتابیں پڑی تھیں جنہیں عنبر باری باری کھول رہی تھی۔ عنبر گل کی روم میٹ اور دوست تھی۔ وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے، تیز تیز صفحے پلٹتی، مطلوبہ ٹاپک نکالتی پھر اسے جلدی سے نوٹ پیڈ پہ اتارنے لگ جاتی۔ وہ دونوں پچھلے دو گھنٹے سے سر سے سر ملا کر اپنی فائنل

اسائنمنٹ لکھ رہی تھیں جو تقریباً مکمل ہوگئی تھی۔

یہاں سے تیس قدم دور ریک کے پاس دو لڑکے، کچھوے کی طرح گردن نکال کے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ایک لمبا لڑکا تھا۔ناک کی تیز نوک نکلی ہوئی تھی اور ٹھوڑی پر خم تھا جب کہ دوسرا متناسب قد کا دبلا سا لڑکا تھا۔دونوں نے بیگ کراس میں پہن رکھے تھے۔

گل اب لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ساتھ ساتھ وہ عنبر کو بھی دیکھ رہی تھی جو اسے شاید کچھ بتا رہی تھی۔

''میں جا کے پہلے سلام دعا کروں گا۔حال چال پوچھوں گا۔پھر سیدھا مدعے پر آؤں گا۔چوں کہ وہ پڑھ رہی ہے۔اس لیے میں اس کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ایک اچھے، سلجھے اور باادب بچے کی طرح جا کے اس کے سامنے اپنی مانگ رکھوں گا۔مجھے پورا یقین ہے وہ میری تمیز اور تہذیب سے متاثر ہو کر میری مدد ضرور کرے گی۔''اس کا انداز پرعزم تھا۔

''ایک بات بتاؤں؟''ذیشان رازدارانہ انداز میں اس کی طرف جھکا۔

''کیا؟''

''میں نے سنا ہے کہ اگر پڑھنے والی لڑکیوں کو پڑھائی کے دوران کوئی ڈسٹرب کرے تو وہ ہاتھ میں آنے والی کوئی بھی چیز اٹھا کے دے مارتی ہیں۔''

''ڈراؤ تو نہیں یار۔''وہ خفگی سے بولا۔''میں نے بڑی جستجو کی ہے یہاں تک آنے کے لیے۔لمبی لمبی Motivational تقریریں سنی ہیں۔قاسم علی شاہ سے لے کر عاطف اسلم تک سب کو سن سن کے کان تھک گئے ہیں۔''

ذیشان نے ابرو سکیڑے۔''عاطف اسلم کب سے موٹیویشنل تقریریں کرنے لگا؟''

''کیوں۔تم نے وہ گانا نہیں سنا۔زندگی آ رہا ہوں میں۔''

''پھر تو تم نے قاسم علی شاہ کا وہ گانا بھی سنا ہوگا۔ تیری گلیاں.....گلیاں تیری گلیاں.....''

اسد نے بری بری نظروں سے اسے دیکھا۔''اڑا لو میرا مذاق۔خود تو کر لی ہے ناں گھسی پٹی اسائنمنٹ۔لالے تو مجھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''اچھا ناں۔اب جس کام کے لیے آئے ہو۔وہ جا کر کر لو۔ایسا نہ ہو وہ اٹھ کر چلی جائیں۔''

''ہاں صحیح کہہ رہے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔پہلے اس نے کالر ٹھیک کیے پھر شرٹ کی سلوٹیں مٹائیں۔بالوں میں ہاتھ پھیرا اور خود کو کمپوز کیا۔وہ اچھا بچہ لگ رہا تھا۔ڈیسنٹ اور باادب۔خود کو سراہنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔میز کے قریب پہنچ کر اس نے آس پاس دیکھا۔ایک آدھ سٹوڈنٹ ہاتھ میں کتاب لیے گزر رہا تھا۔ لائبریری میں رش نہیں تھا،مکمل خاموشی تھی۔اس نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے گلا کھنکارا۔

''ایکسکیوزمی لیڈیز!''

آواز پہ گل نے سر اٹھایا۔''یس؟''

اس کی نیلی آنکھوں کو دیکھ کے وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔''وہ.....وہ.....''

''جی۔کہیے۔''

اس نے ہاتھ پیچھے کیے اور نیت کی طرح سینے پر باندھ لیے۔سر جھکا لیا۔

''السلام علیکم گلِ لالہ۔میرا نام اسد رحمان ہے۔میں آپ ہی کی کلاس سے ہوں مگر سیکشن سی سے۔آپ کے سر محمود چغتائی ہمیں بھی آپ کی طرح کلاسک انگلش لٹریچر پڑھاتے ہیں۔دو دن پہلے ہی ان کے ساتھ ہماری کلاس ہوئی تھی۔انہوں نے یاد دلایا کہ George Eliot پر ہماری فائنل اسائنمنٹ وہ کچھ دن بعد ہم سے جمع کریں گے۔جو ٹاپک ہمیں ملا ہے وہی ٹاپک آپ کو ملا ہے۔اس لیے میں یہاں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔مس گل لالہ (اس نے اس کی آنکھوں

میں دیکھا پھر گڑبڑا گیا اور تیزی سے نیچے دیکھنے لگا) بلاشبہ آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی خونخوار (گلا کھنکارا) میرا مطلب ہونہار سٹوڈنٹ ہیں۔کلاسک انگلش لٹریچر پارٹ ون میں آپ کی اسائنمنٹ نے ٹاپ سکور کیا تھا۔اس لیے میں بندہ ناچیز آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اگر آپ اپنی اس سمیسٹر کی اسائنمنٹ مجھے دکھا دیں تو میں اندازہ کرلوں گا کہ اسائنمنٹ کیسے کی جاتی ہے۔اس سے کیا ہوگا کہ میرے مشاہدے اور میرے علم میں اضافہ ہوجائے۔"

بڑی ہی خیر خواہی سے کہنے کے بعد اس نے گل کی طرف نظریں اٹھائیں جو منہ میں کافی کا سٹرا پکڑے اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔عنبر کا تو منہ ہی کھل گیا تھا۔اس نے سر جھٹک کر کافی کا کپ ایک طرف رکھا اور الجھن سے آگے ہوئی۔"میں کچھ سمجھی نہیں اسد صاحب۔آسان لفظوں میں بتائیں۔کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"مجھے آپ کی.....اسائنمنٹ.....چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

اس نے ابرو سکیڑے۔"کیوں؟"

"کیوں کہ میں آئیڈیا لینا چاہتا ہوں کہ اسائنمنٹ کیسے کرتے ہیں۔اس کے لوازمات کیا ہیں۔اس کی نوک پلک کیسی سنوارنی ہے۔اس کے اجزائے ترکیبی کیسے ہونے چاہئیں۔"

"کیوں آپ کو نہیں پتہ؟"

"نہیں مگر آپ کی اسائنمنٹ دیکھوں گا تو پتہ چل جائے گا۔" وہ مسکرایا۔

"مگر پھر تو ہماری اسائنمنٹ ایک جیسی ہوجائے گی۔"

"نہیں ہوگی۔میں صرف پیٹرن دیکھوں گا۔"

گل نے کنپٹی پہ دو انگلیاں رکھیں اور دلچسپی سے اسے دیکھا۔"ابھی آپ نے کہا کہ ہم دونوں کلاس کے ٹاپکس ایک جیسے ہیں۔اس کا مطلب ہم نے وہی لوازمات لکھنے ہیں جو اس میں ہونے

چاہئیں۔اگر میں نے آپ کو اپنی اسائنمنٹ دکھا دی اور آپ نے پیٹرن دیکھ لیا تو.....آپ تو اسے کاپی کرلیں گے۔کیوں عنبر؟''

''بالکل.....''عنبر نے تائید کی۔

اس کا منہ بن گیا۔''میں کاپی نہیں کروں گا۔میں صرف پانچ منٹ لوں گا۔ضروری چیزیں دیکھوں گا پھر واپس کردوں گا۔قسم سے۔''

''سوری اسد۔میں آپ کو اپنی اسائنمنٹ نہیں دے سکتی۔''اس نے ٹھنڈے بے رحمانہ انداز میں کہا۔''میں نے بہت محنت کی ہے۔پچھلے تین راتیں جاگ کر میں نے مسلسل اسی پہ کام کیا ہے۔اس لیے میں اپنی نیند حرام محنت کسی کو نہیں دوں گی۔''

''مگر میں آپ کا کلاس فیلو ہوں۔آپ کو مجھ سے کاپریٹ کرنا چاہیے۔''

''سوری برادر۔نو آفینس۔''

''گل لالہ.....''یکدم وہ مظلوم سی شکل بنا کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔''تم اپنی کلاس کی پراکٹر ہو۔پلیز مجھے منع مت کرو۔دیکھو میں بہت مجبور ہوں۔پچھلے ایک ہفتے سے میرے سر میں بے تحاشا درد رہا ہے۔یونو(ایک نم سی سانس لی) مجھے مائیگرین ہے۔جب جب وہ ہوتا ہے۔میرا سر،کندھے اور گردن کھینچ جاتی ہے۔مجھ سے نہ لکھا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔پچھلے ایک ہفتے سے میں اس درد کو جھیل رہا ہوں۔پلیز(بازو میز پر لمبے کر کے رکھے میز پر رکھے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے)میری مدد کریں۔آپ میری آخری امید ہیں۔ترسوں مجھے اسائنمنٹ دینی ہے۔میں کیسے پچاس صفحے لکھوں گا؟''

گل نے پین کی مدد سے اس کے ہاتھ پر Tap کیا۔''ان سے.....''

''ان سے.....''اس نے ہاتھ کھول کر ہتھیلیوں کو دیکھا۔''یہ تو تب کام کریں گے ناں،جب ان

کا فنگر بلاک ختم ہوگا۔"

"Finger Block؟" عنبر انگلی سے چشمہ پیچھے کرتے ہوئے ٹھٹکی۔

"ہاں۔ فنگر بلاک۔ ایک خاص قسم کی بیماری ہے جو بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ دنیا میں صرف دو (وکٹری کا نشان بنایا) فیصد لوگوں کو یہ بیماری ہے۔ اور بدقسمتی سے میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں ہے۔ پتہ ہے اس میں کیا ہوتا ہے (لاچارسی شکل بنائی) اس میں مریض کئی ہفتوں تک پین، چمچ، ریکٹ، بیٹ اور ایسی ڈنڈی والی چیزیں نہیں پکڑ پاتا۔ اس کی انگلیاں بینڈ نہیں ہوتیں۔"

"اوہ..... سیڈ....." عنبر کا دل بری طرح دکھا۔

گل نے رکھ کے اس کے سر پہ تھپڑ لگایا۔ "سوسیڈ کی بچی۔ زیادہ ہمدردی ہو رہی ہے تو اپنی انگلیاں اسے دے دو۔ کام کروا پنا۔ ابھی جلدی سے مجھے Critical anaylasis نکال کر دو اس ٹاپک کا۔"

عنبر نے برا سا منہ بنا کر کتاب کو قریب کھینچ لیا۔ (ڈائن کہیں کی)

"تو اسد صاحب....." وہ اب پوری طرح متوجہ ہوئی۔ "آپ کی لاتعداد (لاتعداد کو لمبا کھینچا) بیماریوں کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ میں آپ کے لیے خصوصی دعا کرواؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں یہ بیماریاں "کام چور" موسم میں پھیلتی ہیں اور "نکما پن، سستی، ہڈحرامی اور بے شرمی" اس کی علامتیں ہیں۔ آپ ایسا کریں۔ "پروفیسر محمود چغتائی اور ڈین اسلم عمریال" نام کی گولیاں لے لیں۔ آپ کی تکلیف دور ہو جائے گی۔"

وہ بہت ہی خیر خواہی سے بولی تو عنبر کتابیں الٹے پلٹے "کھی کھی" کرنے لگی۔ اسد کا برا سا منہ بن گیا۔ گل نے کافی اٹھائی اور لبوں سے جوڑ دی۔ اب وہ پھر سے اپنی فائل پڑھ رہی تھی۔

"میں آپ کی اسائنمنٹ تھوڑی سی دیر کے لیے دیکھوں گا گل۔ یقین کریں۔ صرف پانچ

منٹ۔اس کے بعد آپ کو واپس کر دوں گا۔'' وہ لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے آپ کو اسائنمنٹ نہیں دینی۔ براہِ مہربانی یہاں سے جائیں۔'' وہ دوٹوک لفظوں میں بولی۔

''میں ایسے نہیں جاؤں گا۔ مجھے اسائنمنٹ دکھائیں۔'' وہ بچوں کی سی ضد سے بولا۔

''تم میر.....''

''گل.....ان کتابوں میں Critical anaylasis نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لی ہے۔ وہ کلاسک آتھر کے چھٹے ریک میں ملی گی۔ تم وہاں سے لے آؤ گی۔'' اس سے پہلے کہ وہ اسد کو کچھ کہتی، عنبر نے ٹوک دیا۔

اس نے سر جھٹک کر پیر نیچے لٹکائے۔ ''ٹھیک ہے میں لاتی ہوں تم اس کا ڈرافٹ بناؤ۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ دفعتاً کتابوں کے ڈھیر پہ نظر پڑی۔ ''ان کتابوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''اونہوں۔'' عنبر نے سر کو نفی میں ہلایا۔

''پھر میں انہیں رکھ لیتی ہوں۔'' اس نے ایک ایک کر کے ساری کتابیں بانہوں میں اٹھائیں اور ریکس کی طرف بڑھ گئی۔

اسد بھی دُم کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا۔ ذیشان بھاگ کے ریکس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ اس طرف ہی جا رہی تھی۔ ذیشان نے ریک میں رکھی کتابوں کو دائیں بائیں دھکیلا اور ان کے درمیان ''V'' کی طرح جگہ بنائی۔ اب وہ وہاں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''گل پلیز۔ میری بات مان جائیں۔ ہم بیچارے سٹوڈنٹس دنیا کے ستائے ہوئے ہیں۔ کیا آپ ہمیں یونہی چھوڑ دیں گی۔'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا جب کہ وہ لاپرواہی سے کتابیں اپنی اپنی ریکس میں رکھ رہی تھی۔ ''کیا آپ جیسے لائق، مہان اور ۴/۴ جی پی اے والے

سٹوڈنٹس کی نظروں میں ہم فقیر، مسکین اور لاچار سٹوڈنٹس کی کوئی عزت نہیں ہے؟"

"نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"کیوں؟ کیوں ہوتے ہیں آپ لوگ اتنے ظالم؟ چند سو نمبر ہی تو زیادہ ہوتے ہیں آپ لوگوں کے۔ کوئی تیر تھوڑے ہی مار لیتے ہیں تین چار سو نمبر زیادہ لے کر۔ اس میں اتنا اکڑنے والی کونسی بات ہے؟" وہ ناک چڑھا کر بولا۔

"اتنا آسان ہے تو آپ بھی مار لیجیے..... یہ تیر۔"

"مار لوں گا۔ میرے ہاتھ عقلمندی کی کمان آنے دیں۔ میں اپنا ترکش خالی کر دوں گا۔" وہ پر عزم لہجے میں بولا۔

"بیسٹ آف لک۔" اس نے ایڑیاں اٹھا کے کتاب اوپر والے ریک میں رکھ دی۔

"آپ پلیز۔ ایسا مت کریں۔ میں نے کہا ناں میں صرف پانچ منٹ کے لیے دیکھوں گا پھر واپس کر دوں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے کتابیں ریک میں رکھتی رہی۔ اپنی متعلقہ کتاب لینے کے لیے وہ چھٹے ریک کی طرف جانے لگی تو وہ یکدم آگے آ گیا۔ اب وہ الٹے قدم لے رہا تھا۔ اس کا رخ گل کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ایک ڈیل کر لیتے۔ آپ مجھے اسائنمنٹ دکھا دیں میں آپ کے سارے نوٹس ٹائپ کر دوں گا۔"

"شکریہ۔ میں نے ٹائپ کر لیے ہیں۔" ٹھنڈے لہجے میں کہتی وہ چھٹے ریک میں مڑ گئی۔

وہ جو آگے جا رہا تھا، ساتویں ریک کی طرف نکل گیا۔ اسے مڑتا دیکھ کے تیزی سے واپس پلٹا۔

"چلیں دوسری ڈیل۔ میں آپ کے ہاسٹل آ کر آپ کے روم کی صفائی کر دوں گا۔ کپڑے بھی دھو

دوں گا اور واش روم (ناک میچی) بھی دھودوں گا۔"

"ہمارا کمرہ اور واش روم صاف ہی ہوتے ہیں۔" وہ جبڑے بھینچ کر مسکرائی۔

"او کے ٹھیک ہے۔ تیسری ڈیل۔ میں آپ کو اس کے بدلے ڈنر کروادوں گا۔ آپ جس بھی ریستوران جائیں گی میں لے جاؤں گا۔ چاہے کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو۔ چاہے میں کنگال کیوں نہ ہو جاؤں۔ میرا دیوالیہ کیوں نہ نکل جائے۔ میں آپ کو کھانا کھلا دوں گا۔ اب تو مان جائیں۔" اس نے تھکی سی سانس نکالی۔

"شکریہ۔" وہی ٹھنڈا انداز۔

اس نے تلملا کے ریک سے پیٹھ جوڑ دی اور ناک چڑھا کے اسے دیکھا۔ "پتہ ہے آپ کو لٹریچر نہیں پڑھنا چاہیے تھا۔ آپ کو وکالت پڑھنی چاہیے تھی۔ وکیلنیاں آپ جیسی ہی تو ہوتی ہیں۔ روڈ..... روڈ..... اور صرف روڈ..... میرے دوست کی بیوی بھی وکیل ہے۔ اس بیچارے کی ناک میں ہر وقت دم کیا ہوتا ہے اس بلا نے۔"

گل نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ وہ اپنی کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ اس کے بے نیاز انداز پہ بھنا گیا۔

"میں نے آپ کی اتنی منتیں کیں۔ ڈیلز بھی رکھیں۔ آپ کا واش روم تک دھونے کو تیار ہو گیا۔ اگر میں اتنی منتیں، اتنے ترلے کسی اور کی کرتا تو اب تک وہ مجھے اپنی اسائنمنٹ کی "کاپی" دے چکا ہوتا۔" اس نے ٹونٹ کیا۔ گل نے ابرو اچکائی اور ریک سے کتاب نکالی۔ وہ کھڑے کھڑے صفحے پلٹنے لگی۔

"گل پلیز۔ میری بات مان لیں۔ دیکھیں میں فیل ہو جاؤں گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ دو دن ہیں۔ چالیس نمبر کی اسائنمنٹ ہے۔ ترسوں جب پروفیسر مجھ سے مانگیں گے تو میں کیا

جواب دوں گا۔'' وہ انتہائی لاچاری سے بولا۔

''جواب آپ نے سوچا ہوگا۔ وہی دے دیجیے گا۔'' وہ مسکرا کر پلٹی اور کتاب لیے اپنی جگہ کی طرف بڑھنے لگی۔

''گل۔ صرف پانچ منٹ کا سوال ہے۔'' وہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

''نہیں دوں گی۔'' وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

''صرف پانچ منٹ۔''

''نہیں۔'' وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔ ''جاؤ یہاں سے۔ میرا دماغ نہ کھاؤ۔''

'' آپ ایسا تو مت کریں۔ آپ ادب کی سٹوڈنٹ ہیں۔ ادب کی سٹوڈنٹ بڑے مددگار ہوتے ہیں۔ دوسروں کے کام آتے ہیں۔ وہ کیا کہا تھا شیکسپیئر نے۔ راستے میں ہمیں صرف یہ سیکھنا چاہیے کہ لوگوں کی مدد کرنے سے بڑی کوئی شے نہیں ہے۔''

''یہ شیکسپیئر نے نہیں، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے کہا تھا۔''

''جس نے بھی کہا تھا۔ آپ پلیز میری مدد کر دیں۔''

''میں..... مدد..... نہیں..... کروں..... گی.....''

''پلیز!''

''کیا مسئلہ ہے۔'' رکھائی سے کہتے اس نے کتاب میز پہ پٹخی اور اس کی طرف تیورا کے مڑی۔ وہ گڑبڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''جب میں نے کہا کہ میں نہیں دوں گی تو بلاوجہ پیچھے کیوں پڑے ہو؟''

''صرف..... پانچ منٹ.....'' اس نے معصوم سی شکل بنائی۔

''تم یہاں سے خود جاؤ گے یا پھر میں لائبریری کی سکیورٹی کو بلاؤں اور تمہیں دھکے مار کر

نکلواؤں؟"

"چلا تو خود جاؤں گا مگر آپ ایک بار اسائنمنٹ دکھا دیں....."

"او کے فائن۔" اس نے جھٹکے سے میز سے فون اٹھایا اور کھٹ کھٹ کسی کا نمبر ملانے لگی۔ اسد ٹھٹک گیا۔ فون کان سے لگانے کے بعد وہ پیر بجاتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔ گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ عنبر خوفزدہ ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اگلے دو سیکنڈ میں پروفیسر محمود چغتائی نے فون اٹھا لیا تھا۔

"السلام علیکم سر۔ گل لالہ بات کر رہوں۔ جی سر میں ٹھیک ہوں۔ جی۔ وہ دراصل آپ کا ایک سٹوڈنٹ میرے پاس میری اسائنمنٹ مانگنے آیا ہے..... وہ چاہتا ہے میں اسے اپنی اسائنمنٹ دوں تا کہ وہ کاپی کر لے..... نہیں سر، میری کلاس سے نہیں ہے۔ سیکشن سی سے ہے..... نام..... (اس نے اسد کو دیکھا) کیا نام بتایا تھا تم نے....."

اس کے پیروں تلے سرنگ پھٹی، اس نے جھٹکے سے اس کے کان سے فون ہٹایا اور کال کاٹ دی۔

"یہ کیا کر رہی تھیں آپ؟" وہ برہمی سے بولا۔

"تمہارا علاج۔ اب تم یہاں سے خود جاؤ گے یا میں سکیورٹی کو اونچی آواز لگاؤں۔" وہ پوری طرح سنجیدگی سے بولی تو اسد چار و ناچار زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اپنی ہزیمت دور کرتے ہوئے وہ آگے ہوا۔

"جا رہا ہوں۔" خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون میز پہ رکھا اور برا سا منہ بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ کرختگی سے کرسی پر آن بیٹھی اور کنپٹی سہلانے لگی۔ اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی وہ باہر نکلا، ذیشان اس کے پیچھے لپک گیا۔ وہ مزے مزے سے چل رہا تھا۔

''نہیں دی ناں اس نے؟ مجھے پتہ تھا۔ وہ خونخوار لڑکی کسی کے کام سے نہیں آسکتی۔'' وہ نخوت سے کہتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

اسد نے اس کی گردن کے گرد اطمینان سے ہاتھ حائل کیا۔ ''دے دے گی یار۔ ابھی تو پہلی کوشش کی ہے۔ پہلی بار میں پھل تھوڑے ہی مل جاتا ہے۔''

''ایک منت۔'' وہ ٹھٹکتے ہوئے رک گیا۔ ''تم دوبارہ اس سے مانگو گے؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''عزت نفس نام کی کوئی چیز ہے تم میں یا نہیں؟'' ذیشان نے لتاڑا۔

''بدقسمتی سے.....نہیں!'' وہ ڈھٹائی سے کہتے ہوئے مسکرایا اور آگے نکل گیا۔ ذیشان نے کرختگی سے سر کو دائیں بائیں ہلایا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ضلع چترال کے ایک سردار قبیلے سے تعلق رکھنے والی روایتی لڑکی تھی۔ یونی ورسٹی کی تعلیم کے لیے وہ پہلی بار اپنے قصبے سے نکلی تھی۔ پشاور جیسے بڑے شہر میں، اتنے قدیم جامعہ میں پڑھنا اس کا خواب بھی تھا اور ضرورت بھی۔ خواب اس لیے تھا کہ اس کے بابا یہاں سے پڑھ کے گئے تھے اور ضرورت اس لیے تھی کہ بابا کے دوست بھی یہاں سے پڑھ کے گئے تھے۔ IDK نام کا یہ دوست اس کی بدترین ضرورت بن گیا تھا لیکن یہ ضرورت اپنے ساتھ ایک کالا طوفان بھی لا سکتی تھی اور اس کالے طوفان کا سامنا کرنے سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھی۔

فزا عالمگیر کی کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ڈورم کی طرف چل پڑی۔ ہاسٹل قریب ہی تھا۔ اکثر اوقات وہ کلاس ختم ہونے کے بعد لائبریری میں پائی جاتی تھی لیکن آج اسد نے زچ کر دیا تھا۔ اپنی اسی تلخی کو دور کرنے کے لیے وہ دوبارہ لائبریری نہیں گئی بلکہ اپنے ڈورم آگئی۔ اس کا

ڈوروم تیسری منزل پر تھا۔اس کے روم میٹس میں عنبر کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی تھی۔وہ لڑکی زینب کوہاٹ سے تھی۔یہ تینوں آخری سمیسٹر والی تھیں۔عنبر اور زینب دونوں ہی پٹھان تھیں۔وہ آپس میں پشتو میں بات کرتیں تو وہ سانس بھر کر رہ جاتی۔اتنی کٹر پٹر زبان میں جانے وہ کیا کیا بول رہی ہوتی تھیں۔اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتا تھا۔

کمرہ چکور تھا۔ہر دیوار سے بیڈ جڑا ہوا تھا اور جس دیوار سے نہیں جڑا تھا وہاں دو دروازے تھے۔ایک اندر آنے کا اور ایک واش روم کا۔دونوں دروازوں کے درمیان ایک چھوٹی سی بالکونی تھی۔یہ اتنی چھوٹی تھی کہ وہ تینوں ایک ساتھ کھڑی ہوتیں تو قطار بنانی پڑتی۔یہاں وہ صرف کپڑے سکھاتی تھیں اور اگر ضرورت پڑتی تو شام کی چائے کھڑے کھڑے پی لیا کرتی تھیں۔

اس کا بیڈ کھڑکی کے ساتھ رکھا ہوا تھا جہاں رات کو بدر جہا مچھر ہوتے تھے مگر دن کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بھی آتی تھیں۔اس نے کھڑکی کے اطراف میں چترال کی کئی تصویریں آویزاں کر رکھی تھیں۔ایون کی،اصطبل کی،رستم کی،ترچ میر کی۔گھر والوں میں سے ابراہیم اور بابا کے علاوہ کسی کی تصویر ساتھ نہیں لائی تھی۔ابراہیم کی تصویر بیڈ کی پشت پہ چسپاں تھی جب کہ بابا کی تصویر اس نے چھت سے چپکائی ہوئی تھی۔بابا اس تصویر میں گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے۔وہ ہاتھ میں پولو سٹک پکڑے،گھاس پہ پڑی بال کو ہٹ کر رہے تھے۔یہ تصویر اسے ایک راز نہیں بھلانے دیتی تھی۔

''تم نے شندور کا پولو پلیئر بننا ہے۔گلے۔'' وہ اس سے کہا کرتے تھے۔شندور کا پولو پلیئر بننے کا خواب اس نے آنکھوں میں نصب کر دیا تھا۔اس کے لیے اس کے تمام خواب اس کے بابا جان نے دیکھے تھے۔پھر چاہے وہ تعلیم حاصل کرنے کا خواب ہو یا پولو پلیئر بننے کا۔ان کی ہر امید گلِ لالہ کی ذات سے منسلک تھی۔اپنے بابا کی ساری خواہشیں اس نے پوری کر دی تھیں۔وہ ایک قدیم اور اعلیٰ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔اس کے پاس شعور آ گیا تھا۔اپنے حق کے لیے

لڑنے، اپنی ذات کی بقا کے لیے آواز اٹھانے کا ہنر آ گیا تھا۔ جس قدر مضبوط اس کے بابا اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بن گئی تھی۔ شندور پولو کے علاوہ ان کے تمام خواب پورے ہو گئے تھے۔ رات نیند کی وادیوں میں اترنے سے پہلے وہ اس تصویر کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھتی تھی۔ اس کے اندر نیا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ایک نیا جوش جاگتا تھا۔ اس کا آخری سمیسٹر چل رہا تھا۔ ان شاء اللہ اس کے بعد وہ شندور پولو کی سلیکشن کمیٹی کو درخواست بھیجے گی اور وہ اسے رکھ لیں گے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے۔ اپنا میس کارڈ لیا اور نیچے ڈائننگ ہال میں آ گئی۔ میس میں دوپہر کے کھانے پر زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا کیوں کہ آدھے سے زیادہ ہاسٹل کے بچے یونی ورسٹی میں ہوتے تھے۔

کھانے میں آج کڑی پکوڑا اور ابلے ہوئے چاول بنے تھے۔ اس نے میز پر لڑکیوں کو کھاتے دیکھ کے ناک سکوڑ لی۔

جانے ہر ہاسٹل میں کڑی پکوڑا کیوں بنتا ہے۔ مٹن بروسٹ، ازبک اور منتو (چترالی کھانے) کیوں نہیں بنتے تھے۔ وہ گوشت خور تھی اور یہاں آ کر وہ سبزی خور، دال خور اور جانے کیا کیا خور بن گئی تھی۔ گوشت تو ہفتوں بعد ملتا تھا۔ اپنی پلیٹ میں شوربا ڈالتے وقت اگر بوٹی نظر آتی تو ایسا جیسے عید کا چاند دیکھ لیا ہو۔ بوٹی کو دو انگلیوں میں پکڑ کے اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ کتنا یاد کرتی تھی وہ اپنے گوشت کو۔ اپنے مٹن بروسٹ کو۔

ہاسٹل والے دیتے بھی کیا تھے؟ صرف ایک بوٹی؟ وہ بھی اتنی شرمیلی سی بوٹی ہوتی تھی کہ بندہ کہے اسے کھاؤں یا بچہ سمجھ کے چھوڑ دوں۔ اتنا سا گوشت تو دانتوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔ کجا فاطمہ اور دالیہ چچی کے ہاتھ کے بنے دیگ اور دیسم تائی کے ہاتھ کے بنے بروسٹ اور کہاں یہ بدمزہ اور کڑوا سا شوربہ جس میں آلو غوطے لگا رہے ہوتے تھے۔ اور یہ روٹیاں۔ ایسی پتلی روٹیاں کہ پنکھے

کے نیچے رکھ دو تو دانتوں سے نہیں پلاس سے توڑنی پڑ جائیں۔ کہاں عائشہ چچی اور ماں کے ہاتھ کے خستہ نان۔ جن کی شکل آنسو کی طرح ہوتی تھی۔ اتنے نرم، خستہ اور میٹھے کہ بغیر سالن کے بھی تین چار نگل لو۔ ہفتے کے تمام دنوں پر سبزیاں، دالیں اور دیسی کھانے تقسیم ہوئے تھے۔ زیادہ تر سبزیاں بنتی تھیں، پھر دالیں اور ایک آدھ دن گوشت۔

اتنا پھیکا مینو دیکھ کے اسے لگتا تھا جیسے وہ ہاسٹل نہیں، ہسپتال آئی ہو۔ سبزیاں کھائے تو اسے کئی سال ہو گئے تھے۔ نہیں یاد پڑتا آخری بار سبزی کب کھائی تھی؟ سبزیوں کی نیلی پیلی سبز شکلیں دیکھ کے اس کا خون کھولتا تھا۔ کیا کام تھا ان سبزیوں کا ہمارے جسم میں؟ کرتی کیا تھیں یہ؟ ذائقہ ان میں کچھ نہیں ہوتا۔ طاقت ان میں کچھ نہیں ہوتی۔ کیا کریں گی یہ معدے کے اندر جا کے؟

اس نے کئی بار میس کی انتظامیہ سے شکایت کی لیکن میس تو پھر میس تھا۔ شکایت کے اگلے روز پلیٹ میں بوٹی بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ خالی خولی پلیٹ دیکھ کے باورچن کو ایسے گھورتی تھی جیسے ساس کم جہیز لانے والی بہو کو۔ اس کا دل کرتا تھا یہ سالن باورچن کے سر پہ انڈیل دے۔ ایسا ہوتا ہے سالن؟ اسے کہتے ہیں سالن؟ یہ سالن نہیں، سالن کی انتہائی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ اس سے گاڑھی تو یخنی ہوتی ہے۔ ہونہہ۔

آج بھی وہ کڑی پکوڑے کو صرف ''سلام دعا'' کر کے آئی تھی۔ ایک نوالہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا۔ کڑی پکوڑا کوئی کھانے والی چیز ہے؟ حلق کیوں نہیں کڑوا ہوتا ان لوگوں کا۔ (میں کڑی پکوڑا سے دشمنی نکالتے ہوئے) اس کی دونوں دوستوں کو بھی یہ سبزیاں کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ہر روز آدم خور..... سوری..... میرا مطلب..... گوشت خور خوراک منگواتی تھیں۔ پیسوں کی گل لالہ کے پاس فراوانی تھی۔ خان جی یاد سے اس کے بینک اکاؤنٹ میں ہر مہینے لاکھ دو لاکھ ڈلوا دیتے تھے۔

اس نے کمرے میں آ کے گوشت خور کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ وہ اتنے تسلسل سے گوشت کی چیزیں منگواتی تھی کہ اس کے قریبی دکانیں، میس کے کھانے کی خوشبو سونگھ کر سبزی یا دال کا اندازہ لگا لیتے اور پھر اپنے اپنے کچن میں گوشت کو انگاروں پر سلگنے کے لیے رکھ دیتے۔ باربی کیو کی بھینی بھینی خوشبو جب اس کی کھڑکی سے ہو کر اس کے نتھوں میں داخل ہوتی تو وہ مدہوش ہو جاتی۔ انتہائی کوئی سستہ نشہ تھا اس گوشت کا۔ سو میل دور سے بھی کڑاہی کی خوشبو آ جاتی تھی۔

شنواری تکہ، بٹ کڑاہی، چپلی کباب، دم پخت، کابلی پلاؤ اور نمک منڈی کڑاہی کا نام سن کے ہی رال ٹپکنے لگ جاتی تھی۔ وہ منحوس بھی اپنے کھانوں کے دھویں کا رخ اس کی کھڑکی کی اور کر لیتے تھے اور وہ بھی عادت سے مجبور اور خصلت سے لاچار ہو کر تین چار ہزار کا کھانا منگوا لیتی تھی۔ یوں اس کے آس پاس دکانوں کے وارے نیارے ہوئے تھے۔

کھانا ختم کر کے وہ لیپ ٹاپ کھول کے بیٹھ گئی۔ اسے پروفیسر فضہ کو کوِز کے مارکس کی لسٹ بنا کر دینی تھی۔ پروفیسر جابر کو لیکچر نیٹ کر کے دینا تھا۔ اپنی پریزنٹیشن کی سلائیڈز بنانا تھیں اور فائنل اسائنمنٹ پر بھی ابھی کام کرنا رہتا تھا۔ اس لیے وہ سارے برے خیالات جھٹک کے کام میں جت گئی۔

☆.....☆.....☆

کھڑکیوں کے باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مچھر بھی بھنبھنانے لگے تھے۔ عنبر اور زینب اپنی اپنی کلاس ختم کر کے ہاسٹل آ گئی تھیں۔ وہ تاحال لیپ ٹاپ کھولے کی پیڈ پہ ''ٹک ٹک'' کر رہی تھی۔ کنپٹی میں مسلسل اسکرین کو دیکھنے سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

رات کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ ان کا کوئی پروگرام نہیں بنا۔ اس نے دوپہر میں جو کھانا منگوایا تھا۔ اسی کا بچا ہوا حصہ رات میں کھا لیا۔ عنبر اور زینب نے بھی ہاسٹل کے کھانے سے معدے

کو زحمت دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ دونوں اس کی سوغات نکال کر اپنی اپنی پیٹ پوجا کر چکی تھیں۔

اس وقت عنبر کپڑے دھو رہی تھی جب کہ زینب اپنی کتاب کھول کے اونچا اونچا رٹا لگا رہی تھی۔ اس کا کل کو زتھا۔ اس کی پھٹی ہوئی آواز سن کے گل نے کئی بار کان میں انگلی ڈال کے گھمائی تھی۔

''سقراط دوائیاں کا باپ تھا۔ سقراط دوائیوں کا باپ تھا۔'' وہ کا جو کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ یہ فقرہ وہ پچھلے دس منٹ میں ایک سو دس مرتبہ سن چکی تھی۔ زینب سوچ کچھ رہی تھی، پڑھ کچھ رہی تھی اور یاد اسے کچھ ہو رہا تھا۔ وہ ایسی ہی بے دھیانی میں پڑھتی تھی۔

''سقراط دوائیوں کا باپ تھا۔ سقراط.....''

اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتی، اس نے کشن اٹھا کے اس کی پیٹھ پہ دے مارا۔ وہ بھنا کے پلٹی۔

''باپ نہیں تھا۔ بانی تھا۔ سقراط دوائیوں کا بانی تھا۔ بانی۔'' اس نے دانت کچلتے ہوئے کہا۔ ''Hippocrates is the father of medicine اس میں فادر کا مطلب باپ ہوتا ہے۔ سمجھیں۔ مجھ پہ اپنی انگریزی کا رعب مت جھاڑا کرو۔ میں نے بھی انگلش میڈیم میں پڑھا ہے۔''

اس نے واپس کشن اس کی طرف پھینک دیا۔ اس نے ضبط سے سانس چھوڑی۔ اس پہ لعنت بھیجی اور اپنے کام میں لگ گئی۔

اسے قہوے کی شدید طلب ہو رہی تھی لیکن عنبر اور زینب دونوں مصروف تھیں۔ کچھ دیر مزید کام کرنے کے بعد جب سر کا درد بڑھ گیا تو وہ بادلِ نخواستہ اٹھ گئی اور تپائی پہ رکھی الیکٹرک کیتلی میں پانی ڈالنے لگی۔ عنبر اب بالکونی میں کپڑے بچھا رہی تھی۔ زینب نوٹس کو چھوڑ کے کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل میں گھس گئی تھی۔ اس نے پانی گرم کے لیے رکھ دیا پھر واش روم چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھونے

کے بعد وہ باہر آئی تو چائے کا پانی ابل رہا تھا۔اس نے تپائی کی دراز سے ایک چکور باکس نکالا جس میں صرف چائے کا سامان تھا۔چترالی قہوہ آسانی سے نہیں بنتا تھا۔اس میں بیسیوں اجزاء ڈالے جاتے تھے۔رنگ،خوشبو،ذائقے اور اثر کے لیے اس نے چترال ٹاؤن سے چن چن کے اس کے لوازمات خریدے تھے۔

کیتلی کا ڈھکن اٹھانے کے بعد وہ کھولتے ہوئے پانی میں چھوٹے چمچ سے چیزیں ڈالنے لگی۔ جیسے ہی سونف کے دانے پانی میں پڑے،بالکونی سے بالٹی لیے تھکے تھکے قدموں سے اندر آتی عنبر کے نتھنوں میں کچھ پڑا۔

''قہوہ بنا رہی ہو؟''اس کی جان میں جان آئی۔

''ہاں۔تم پیو گی؟''

''بنا دو۔بہت تھک گئی ہوں۔''وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتی ہوئی بولی۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے مسکرا کے کہا۔جب تک کے عنبر واش روم سکھاتی،منہ ہاتھ دھوتی،اس نے دو کپوں میں قہوہ نکال لیا تھا۔ایک کپ اپنے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دوسرا اس کے سائیڈ ٹیبل پر۔زینب ابھی تک فون میں میسج ٹائپ کر رہی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔نوٹس اس کی گود میں پڑے ہوئے تھے۔

وہ واپس اپنے بیڈ پہ آئی،کمبل ٹانگوں پہ کھینچا اور کشن پہ لیپ ٹاپ ٹکا دیا۔اب وہ اپنی تفریح کے لیے انٹرنیٹ پر کوئی زبردست پولو میچ ڈھونڈ رہی تھی۔عنبر نے آ کے اپنا کپ اٹھا لیا اور پائنتی پر بیٹھ گئی۔

''عنبر!پتہ ہے آج ہال میں کس کی فلم لگی ہے؟''زینب نے پشتو میں عنبر کو مخاطب کیا۔

''کس کی؟''وہ تھکے لہجے میں بولی۔

''شاہد خان کی۔ستر گے سرے نم منعم (سرخ آنکھیں قبول نہیں)''

''کیا؟'' یکدم وہ اچھلی،اس کا قہوہ چھلک گیا۔اس کے ''کیا'' پہ گل نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

''ہاں۔چلو چلتے ہیں۔دس منٹ میں شروع ہوجائے گی۔'' زینب نے نوٹس پرے پھینکے اور شورش سے اٹھی۔جلدی جلدی پیروں میں جوتے ڈالے اور اپنی چادر کندھوں پر اوڑھ لی۔

''عنبرے جاؤ مڑا میوہ بھی لاؤناں۔'' زینب نے اسے عجلت میں پچکارا۔وہ بے باکی سے گل کی الماری کی طرف بڑھی۔اندر پڑی ٹوکری سے پیالوں میں بھر بھر کے میوے نکالے اور چادروں میں چھپا لیے۔وہ دونوں کا ہیجان دیکھ کے پریشان ہوگئی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''فلم دیکھنے۔تم بھی چلو۔بڑی مزے کی فلم لگی ہے۔'' وہ دبے دبے جوش سے بولی۔

''یقیناً کوئی پشتو فلم ہوگی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہاں۔شاہد خان کی ہے۔کچھ مہینے پہلے ہی ریلیز ہوئی ہے۔تم آؤناں۔بیٹھی کیوں ہو۔'' وہ دونوں تیار ہو کے اب دروازے میں کھڑی تھیں۔

''نہیں۔تم لوگ جاؤ۔مجھے ویسے بھی پشتو کی سمجھ نہیں آتی۔''

''لیکن تم تو پٹھان ہو۔'' عنبر نے جیسے یاد دلایا۔

''میں..... پٹھان .....نہیں .....ہوں.....میں.....کھووار.....ہوں۔'' اس نے رک رک کے بری طرح جتایا۔

''اوہ.....'' دونوں خائف ہوگئیں۔''سوری۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ تکلف سے مسکرائی۔(آج یاد دلایا ہے،کل پھر بھول جائیں گی)''تم

دونوں اپنی فلم انجوائے کرو۔ میں یہاں صائمہ افتخار کا پولو میچ دیکھتی ہوں۔"

"پھر سے پولو میچ۔" زینب کا منہ بن گیا۔ "ابھی کل ہی تو دیکھا تھا تم نے۔"

"وہی والا دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔" اس نے تپا کے جواب دیا۔

"یار آخری سمیسٹر ہے۔ تم ایک دن بھی ہمارے ساتھ ہال میں "پوری" فلم دیکھنے نہیں گئی۔ آج تو دیکھ لو۔ بہت اچھی مووی ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"سوری سویٹ ہارٹ مگر مجھے جو اچھا لگتا ہے، میں اسے ترجیح دیتی ہوں۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"پھر بھی تمہیں ہمارا....."

"تم لوگ دیر مت کرو۔ ہال میں اگلی سیٹیں بھر جائیں گی۔" اس نے ہیجان سے کہا۔ ان دونوں نے سٹپٹا کے ایک دوسرے کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے غائب ہو گئیں۔ اس نے اطمینان سے کراؤن سے ٹیک لگائی، اپنے قہوے کا کپ اٹھایا اور صائمہ افتخار کا دو ماہ قبل ہوا آسٹریلیا کے ساتھ میچ دیکھنے لگی۔ صائمہ افتخار اس کی آئیڈیل تھیں۔ چوں کہ پاکستان میں کوئی فی میل پولو ٹیم نہیں تھی۔ اس لیے صائمہ افتخار انگلینڈ نقل مکانی کرنے کے بعد وہاں کی پولو ٹیم میں بطور کھلاڑی شامل ہو گئی تھیں۔ وہ پاکستانی نژاد برطانوی پولو پلیئر تھیں۔

میچ کے دوران شائقین عموماً اپنی ٹیم کی بہتر کارکردگی کی دعا کرتے ہیں۔ سکور دیکھتے ہیں۔ کسی بڑے شارٹ یا ہٹ پر کھڑے ہو کر چیختے چلاتے ہیں تا کہ اپنی ٹیم کو سپورٹ کر سکیں۔ جب کہ وہ کبھی بھی میچ اس نیت سے نہیں دیکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ میچ میں ہارنے والی ٹیم کی "کوتاہیاں" اور جیتنے والی ٹیم کے "واؤ پیچ" ٹٹولتی تھی۔ کس زاویے پر کسی نمبر والے کھلاڑی کا گھوڑا درست نہیں تھا۔ کس کھلاڑی کو کس مقام پر بال مارنی چاہیے تھی۔ کس کھلاڑی کو کب دوسرے کھلاڑی کی جگہ سنبھالنی چاہیے تھی۔

پوزیشن ون، ٹو اور فور پر کس نے کس قسم کا برتاؤ رکھا۔ یہ سارے چیدہ چیدہ نکتے وہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتی تھی۔ خود وہ پولو پلیئر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میدان میں عموماً کھلاڑیوں پر بے انتہا پریشر ہوتا ہے اور بعض اوقات ٹیم کی ہم آہنگی اور باہمی روابط میں خلل پڑنے کی وجہ سے گھوڑے حیص بیص کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے صحیح وقت پر درست طریقے سے بال کو ہٹ نہیں کر پاتے۔ اس سے دوسری ٹیم فوراً موقع اٹھا لیتی ہے اور گول کر لیتی ہے۔

ایک بہترین کھلاڑی ہی، بہترین نقاد ہوتا ہے۔

ایک گھنٹہ ایک اعصاب شکن میچ برطانیہ نے جیتا تھا۔ صائمہ افتخار اس بار بھی نمایاں تھیں۔ ان کا توانا جسم اور دلیرانہ انداز اس کے روئیں روئیں میں اتر جاتا تھا۔ وہ خود کو ان کے آگے ایک حقیر چیز محسوس کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی۔ کیا وہ کبھی ان سے مل پائے گی؟ کیا کبھی صائمہ پاکستان آ کر اس سے ملیں گی؟ کیا صائمہ کو پتہ ہوگا کہ پاکستان میں ان جیسی پولو کی محبت میں سرتاپا ایک لڑکی چُور چُور ہے؟

اس کو ہر سوال کا جواب ''ہاں'' میں ملتا لیکن جیسے ہی وہ پرامید ہوتی، خان جی کی تنی ہوئی ابرو اور بھینچے ہوئے لب یاد آ جاتے۔ وہ اپنی حویلی اور قبیلے کے سخت اور دشوار روایات اور اصولوں سے تنگ آ چکی تھی۔ ان کی حویلی میں ازل سے عورتوں اور مردوں کے حقوق وحدود قائم تھے۔ مردوں پر قابل بیان کوئی روک ٹوک نہیں تھی جب کہ عورتوں کا نام ہی سراپا ''پابندی'' تھا۔ ان کو اگرچہ ہر سہولت میسر تھی لیکن وہ اپنی مرضی اور اپنی چاہ سے کوئی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی عورتیں مظلوم نہیں تھیں۔ مجبور تھیں۔ وہ چاہ کر بھی اپنے اندر کی خواہشات کو زبان پر نہیں لا سکتی تھیں۔

اس کے بابا اسے شندور پولو پلیئر بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ حویلی سے اس کی اجازت کبھی نہیں ملے گی۔ بی جان سے لے کر پلوشے تک سب اعتراض کریں گے۔ آخر وہ لڑکی تھی۔ شندور

میں پولو صرف مرد کھیلتے تھے۔ وہ کبھی اپنی جگہ نہیں بنا سکتی تھی مگر پھر بھی، وہ کوشش کرے گی اور اپنے بابا کا خواب پورا کرے گی۔

بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔ بابا کا شاندار انداز تھا۔ ان کی بے نیاز طبیعت پر سارا چترال فدا تھا۔ ان کا رعب، طنطنہ اور سادگی ہر کسی کے دل میں با آسانی اتر جاتی تھی۔ چھبیس سال کی بالی عمر میں انہوں نے چترال کی سرزمین پر اپنا نام پیدا کیا تھا۔ وہ اس لیے نہیں پہچانے جاتے تھے کہ وہ سرور خان کے بیٹے تھے جو سردار تھا بلکہ سردار اس لیے پہچانا جاتا تھا کہ وہ کلیم اللہ کا باپ تھا۔

جب وہ ڈگری مکمل کر کے چترال جائے گی تو سب سے پہلے وہ پولو پر دھیان دے گی۔ ان چار سالوں میں وہ ہر سمیسٹر بریک میں چترال گئی تھی اور ان چند روزہ چھٹیوں میں اس نے ہر صبح، ہر رات پولو کو دہرایا تھا۔ چوں کہ وہ روزانہ مشق نہیں کر پاتی تھی اس لیے ڈرتی تھی کہ کہیں داؤ پیچ بھول نہ جائے۔ بس یہ ڈگری مکمل ہو جائے پھر وہ واپس جائے گی اور سارا دن ساری رات مشق کرے گی۔

☆.....☆.....☆

صبح اس کا شیڈول کسی مصروف بزنس مین کی طرح سیٹ ہوتا تھا۔ اس کے گلابی رائٹنگ پیڈ پر ایک فہرست بنی ہوئی تھی۔ صبح میم صفیہ کے ساتھ کلاس تھی۔ گیارہ بجے پروفیسر سرمد کو میک اپ کلاس کے لیے کال کرنی تھی۔ ایک بجے سیکنڈ آڈیٹوریم میں چوتھے سمیسٹر والوں کا سیمینار تھا۔ چار بجے پروفیسر جاوید عرفانی کی کلاس تھی اور۔۔ اور..... اس کے علاوہ بھی وہ ایک یوسی بی میں تمام اساتذہ کے کاغذات لے کر جا رہی تھی جن کا اسے پرنٹ نکلوانا تھا۔

قریباً نو بجے وہ ہاسٹل سے نکلی۔ پونے دس بجے کلاس تھی۔ ہاسٹل سے اس کے ڈیپارٹمنٹ کا راستہ دس منٹ کا تھا۔ راستے میں کئی ڈیپارٹمنٹس پڑتے تھے۔ سبزے میں گھری ہوئی اسلامیہ کالج

لاہور گھنٹہ گھر کی کوئی قدیم عمارت لگتی تھی۔ایک نظر دیکھنے پر ایسا لگتا جیسے وہ کوئی سولہویں صدی کا محل ہو۔وہ اپنے بیگ کو کندھے پر لادے، ہاتھ میں کتاب اور فائل پکڑے، فون میں دیکھے جا رہی تھی۔ آس پاس سے طلباء و طالبات تیزی سے گزر رہے تھے۔صبح صبح طلباء بڑے زور و شور سے پڑھنے آتے تھے۔وہ موبائل میں کسی پروفیسر کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔سر جھکا ہوا تھا۔پیر کہاں پڑ رہے تھے، دکھائی نہیں دے رہا تھا۔یکدم وہ چلتے چلتے کسی سے بری طرح کندھا ٹکرا بیٹھی۔اس ایک دم ٹھوکے پر اس کا دماغ گھوم گیا۔کندھے سے بازو اور بازو سے ہاتھ میں ایک کرنٹ دوڑا اور بانہوں میں تھامی کتاب اور فائل دھڑام سے روڈ پہ جا گرے۔

اس نے تیورا کے سر اٹھایا۔

نوارد طلباء کے ریلے میں گم ہو چکا تھا۔وہ جھنجھلا کے نیچے بیٹھی اور فائل سمیٹنے لگی جس کے کاغذ ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔جلدی جلدی کاغذ جھپٹتے ہوئے وہ ٹھہری اور اگلی چیز جو دیکھی تو دماغ بھک سے اڑ گیا۔

کاغذ کے پلندے کو پرے دھکیل کر اس نے دو انگلیوں سے وہ تصویر اٹھائی۔اس میں دو ہنستے مسکراتے آدمی تھے۔دونوں کی عمر لگ بھگ چوبیس سال ہوگی۔دونوں نے ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔بائیں طرف والے اس کے بابا تھے جب دائیں طرف والے کون تھے۔اسے آج تک پتہ نہیں چلا تھا۔بابا نے ہر جگہ اس کا نام "IDK" رکھا تھا۔اب IDK سے کیا بنتا تھا۔کون جانے۔اس تصویر کا پس منظر اس کے سامنے تھا۔

یعنی لاء ڈیپارٹمنٹ جس کے اندر سیاہ کوٹ والی لڑکے اور لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا وہ یونی ورسٹی میں نہیں، کچہری میں کھڑی ہو۔تصویر کے نوارد اور اس کے بابا نے بھی یہی لباس پہنا تھا۔کالا اور سفید۔

یہ تصویر اس کے بیگ میں ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ پچھلے چار سالوں میں اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس تصویر والے کے بارے میں معلومات حاصل کر لے۔ پتہ لگائے کہ یہ کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے، اس وقت کہاں ہوں گے۔ مگر جانے کیوں ''لاء ڈیپارٹمنٹ'' کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم زنجیر ہو جاتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ بابا اور ان کے اس دوست نے یہاں سے لاء کی ڈگری لی تھی۔ وہ یہاں جا کے پرانا ریکارڈ نکلوا لے گی پھر اس کے سامنے سب سچ آ جائے گا مگر جانے کیوں دل اور ٹانگیں یہاں قدم رکھنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

بیگ میں اس تصویر کو رکھنے کا یہی مقصد تھا کہ اسے بار بار یاد آئے کہ اس نے یہاں جانا ہے اور اس آدمی کا پتہ کرنا ہے مگر وہ ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ اس کے اندر سچائی کو جاننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ اتنی باہمت نہیں تھی کہ گزرے ہوئے سولہ سال کی کتھا کھلوا لیتی۔ اگرچہ وہ کھلوا بھی لیتی مگر ان تلخ حقیقتوں کو سننے کا حوصلہ کہاں سے لاتی؟ اس کی جان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اپنے باپ کے مرنے کی وجہ اور قاتل کو تلاش کرتی۔ وہ سچ سننے سے کتراتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ اگر گڑے مردے اکھڑ گئے تو جانے کتنی ہی نئی آباد زندگیاں دفن ہو جائیں گی۔ کتنے ہی لوگ اس عتاب کا شکار ہو جائیں گے۔ اور وہ خود؟ وہ جیسی ہے۔ وہ کبھی ویسی نہیں رہ پائے گی۔ اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ماضی سننا مشکل ہوتا ہے لیکن اسے برداشت کرنا اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

پشاور آنے سے پہلے وہ یہ طے کر کے آئی تھی کہ اس شخص کو ڈھونڈے گی۔ چار سال ہونے کو تھے مگر اس نے تا حال اس ڈیپارٹمنٹ میں بھی جانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے تصویر بیگ میں ڈالی، کاغذ سمیٹ کے بیگ میں ٹھونسے اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

وہ جیسے ہی راہداری مڑ کر اپنی کلاس کی طرف جانے لگی، کلاس روم کے باہر وہ بدمعاش دیوار

سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ بلیو جینز، سفید ٹی شرٹ، نوکدار ناک پر کالا چشمہ جمائے، وہ ہونٹوں کو گول کر کے سیٹی بجا رہا تھا جس سے راہداری میں گزرنے والی لڑکیاں بری طرح چڑ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کے اس کا پارہ چڑھا۔ مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس کی آواز سن کے وہ سپرنگ کی طرح اچھل گیا۔

''آ۔۔آ.....آپ؟'' ہڑبڑا کر چشمہ نیچے اتارا۔

''جی میں.....'' وہ غرائی۔

''وہ میں.....میں.....'' ذرا سا سر جھکا دیا، چہرے پر مظلومیت لائی۔ ''مجھے آپ کی اسائنمنٹ چاہیے تھی۔'' بڑی ہی ''لاچاری'' سے منمنایا۔

''پھر سے وہی راگ الاپنے آ گئے ہو؟'' وہ تلملا گئی۔ ''ٹھہرو ذرا۔ تمہارا علاج میں ابھی کرتی ہوں۔''

وہ کلاس کے اندر گئی، کرسی پر بیگ، فائل پٹخی اور آستین چڑھاتی جارحانہ انداز میں باہر آئی مگر.....وہ پھر ہو چکا تھا۔ اس نے تیزی سے گردن گھما کے یہاں وہاں دیکھا۔ راہداری میں دوسرے سٹوڈنٹس گزر رہے تھے۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''گھٹیا انسان۔''

☆.....☆.....☆

رات کو وہ سونے کے لیے لیٹی تو نظریں بابا کی تصویر پہ ٹک گئیں۔ بچپن سے لے کر اب تک اسے یہی بتایا گیا تھا کہ اس کا باپ اپنے گھوڑے سمیت کھائی سے نیچے گرا تھا۔ کیسے گرا تھا؟ کیوں گرا تھا، کیا وجہ تھی؟ اسے کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اپنے کالج اور سکول کی لڑکیوں سے اس نے ہمیشہ ایک

بات سنی تھی ۔وہ کہتی تھیں کہ جس دن اس کے بابا کی موت ہوئی اس دن سے ہمارے بلتیوں (گلگت کا قبیلہ) سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوستی ختم ہوگئی۔لوگ کہتے تھے کہ سولہ سال پہلے شندور میں بلتیوں کا کوئی آدمی مرا تھا۔اس آدمی کا بابا کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا تھا۔اس کے ٹھیک پندرہ دن بعد بابا کھائی سے گر گئے۔کچھ کہتے تھے کہ بابا کے گھوڑے نے چرتے ہوئے بھنگ کھالی تھی جس کی وجہ سے بپھر گیا اور کھائی میں کود گیا۔تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بابا نے چھلانگ کیوں نہیں لگائی۔

کسی نے بتایا کہ بابا کا قتل ہوا تھا۔کسی آدمی نے اس کو گھوڑے سمیت کھائی سے نیچے پھینک دیا تھا۔تب سوال یہ بنتا ہے کہ بابا جو اتنے لمبے چوڑے تھے۔اور ان کا چودہ کلوگرام کا گھوڑا۔ان دونوں کو ایک آدمی کھائی سے کیسے پھینک سکتا ہے؟

کسی نے کہا کہ بابا ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔اس لیے انہوں نے خود ہی چھلانگ لگائی۔اگر ایسا تھا تو پھر بابا نے گھوڑے کو ساتھ کیوں مارا۔انہوں نے اکیلے چھلانگ کیوں نہیں لگائی۔کسی نے کہا کہ بابا کے گھوڑے کو سانپ نظر آ گیا۔گھوڑے چوں کہ سانپوں سے ڈرتے ہیں،اس لیے ان کے گھوڑے کو کچھ سجھائی نہیں دیا اور وہ کھائی میں کود گیا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ بابا اس کھائی کی طرف گئے ہی کیوں؟

باہر والے بہت کچھ کہتے ہیں۔ان کو سچائی کا کیا علم۔اس کو اس کی دادی نے بتایا تھا کہ بابا کے گھوڑے نے بھنگ پی لی تھی اس لیے وہ گر گئے۔مگر وہ پوچھتی کہ بابا نے چھلانگ کیوں نہیں لگائی۔تو دادی چپ ہو جاتی تھیں۔پھر اسے باہر والوں کی باتوں پر شک ہونے لگتا تھا۔ماں سے اس نے تعلقات بگاڑ رکھے تھے۔سو ان سے کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی پوچھنے کی۔اسے مہابت خان کا کا (گھوڑوں کا رکھوالا) اکثر اس کے بابا کے قصے سناتا تھا۔ان قصوں کا تعلق ان کے گھوڑے سے جڑا ہوتا تھا۔اگر اس کے بابا کا اپنے گھوڑے کے ساتھ اتنا اچھا تعلق تھا تو وہ اسے کیوں گرائے گا؟اس

کے ذہن کے سوال ختم نہیں ہوتے تھے لیکن ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے۔تصویر میں موجود یہ ایک ہی شخص ایسا تھا جو سب جانتا تھا۔وہ بابا کا دوست تھا۔اسے پتہ ہوگا کہ اصل بات کیا تھی۔

وہ جب سے پشاور آئی تھی تب سے اسی کشمکش میں تھی کہ ان سے ملے یا نہ ملے۔اب ڈگری مکمل ہونے والی تھی۔اسے بی جان نے بڑی مشکل سے پشاور جانے کی اجازت دی تھی۔اگر وہ واپس چلی گئی تو کبھی بھی اس سچائی کے بارے میں جان نہیں پائے گی۔یہ پراسرار کتھا ایسے ہی رہ جائے گی۔وہ اکثر سوچتی اس کی ہمت کیوں نہیں ہوتی۔ایسی کونسی قوت ہے جو اسے روک رہی ہے۔کیا اسے اپنے بابا کے بارے میں جاننے کی کوئی دلچسپی نہیں تھی؟ کیا وہ اس کتھا کو ایسے ہی رہنے دے گی؟ ایک ماہ بعد وہ چلی جائے گی۔حویلی والے اسے پہلے ہی شش و پنج میں ڈال رہے تھے۔ان سے بعید نہیں تھا کہ اب نئی کہانی گھڑ لیں۔اسے صرف ''سچ'' جاننا تھا۔وہ سچ کیا تھا۔اسے پرواہ نہیں۔بس اسے بتایا جائے کہ اس کے باپ کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

اس نے زنیب کے لگے کیلنڈر کو دیکھا۔زینب کو عادت تھی کیلنڈر کے ہر گزرتے دن کو سرخ مارکر سے کراس لگانے کی۔اس نے اپنی ڈگری کے دن گن گن کر رکھے تھے۔اسے جلد از جلد اپنے آبائی علاقہ جانا تھا۔آج مہینے کی پچیس تاریخ تھی۔اگلے مہینے کی دس تاریخ سے فائنل پیپر شروع ہونے والے تھے۔کل پانچ پیپر تھے۔شمار اً پندرہ دن لگیں گے ہونے میں، پھر ہاسٹل خالی ہو جائے گا۔سب چلے جائیں گے۔اسے بھی لوٹنا پڑے گا۔بابا کے بارے میں اصل حقیقت دھری کی دھری رہ جائے گی۔

وہ کیا کرے؟ جائے یا نہ جائے۔

اس نے الجھن سے دونوں روم میٹس کو دیکھا۔وہ دونوں اپنے اپنے موبائلوں میں لگی ہوئی

تھیں۔اس کے سرہانے عنبر کا بیڈ شروع ہوتا تھا اور پیروں کی سمت زینب کا بیڈ شروع ہوتا تھا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر عنبر کے سر پر رکھا۔

''ایک بات بتاؤ عنبر۔'' وہ کہنی پر سیدھی کروٹ لیٹ گئی اور سر کے نیچے ہتھیلی رکھ لی۔

''پوچھو۔''

''اگر تمہیں کوئی بچپن میں ایک دلچسپ کہانی سنائے مگر اسے ختم نہ کر پائے اور درمیان میں سسپنس کے ساتھ چھوڑ دے۔اسے آگے نہ آتا ہو۔پھر تمہیں بڑے ہو کر پتہ چل جائے کہ اس کہانی کا باقی حصہ ایک شخص کو پتہ ہے اور وہ شخص تمہارے بہت قریب ہو۔کیا تم کہانی کا اس نصف حصہ اس سے سنو گی؟''

''یہ ہماری ضرورت پہ منحصر کرتا ہے۔'' عنبر نے کہا۔

''کیسے؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''دیکھو! اگر وہ کہانی مجھے اندر سے کاٹے جا رہی ہے اور سکون کا سانس نہیں لینے دے رہی تو میں ضرور اس کا باقی حصہ سنوں گی اور اگر وہ مجھے کچھ نہیں کر رہی۔مجھے اس کے آدھے حصے سے فرق نہیں پڑ رہا یا اس کا آدھا حصہ میرے لائق نہیں تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔'' اس نے شانے اچکائے۔

وہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبانے لگی۔بات تو وہ ٹھیک کر رہی تھی۔ہم دن میں جانے کتنی کہانیاں سنتے ہیں۔کچھ کا سسپنس ہمیں کھا جاتا ہے اور کچھ کو ہم چھوڑ دیتے ہیں۔جس کا سسپنس ہمیں کھا رہا ہوتا ہے اسے ہم تلاش کرتے ہیں۔چاہے کہیں بھی ہو۔انٹرنیٹ، کتابوں، قصہ خوانوں، رسالوں میں۔کہیں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔کیوں کہ وہ ہمیں کہیں نہ کہیں متاثر کر رہی ہوتی ہیں۔ان کا تجسس ہمیں تنگ کر رہا ہوتا ہے۔

''اگر وہ کہانی آپ کو متاثر کر رہی ہو تو؟''

''تو ظاہر ہے میں اس کا بقیہ حصہ جاننے کی کوشش کروں گی۔'' وہ ہاتھ جھلا کے بولی پھر اس نے ابرو سکیڑے۔ ''ویسے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ سیدھی ہو گئی اور چھت کو دیکھنے لگی۔ ''میں نے بچپن میں ایک ادھوری کہانی سنی تھی۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کا بقیہ حصے اس یونی ورسٹی میں کسی کے پاس ہے۔ میں وہ سننا چاہتی ہوں۔''

''او کے.....'' عنبر نے سر ہلایا۔

تو اسے جاننا ہی ہوگا۔ چاہے سچائی کچھ بھی ہو۔ بری، بھلی، بھیانک یا پراسرار۔ وہ پتہ کرے گی اور ضرور کرے گی۔

☆.....☆.....☆

صبح بارہ بجے وہ ''لاء ڈیپارٹمنٹ'' کے سامنے کھڑی تھی۔ سیاہ شلوار قمیص پہنے، کندھوں پر چادر ڈالے، مٹھی میں چودہ سال پہلے لی گئی اس تصویر کو دبائے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ وہ پوری طرح تیار تھی۔ آج اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ کس کروٹ بیٹھے گی۔ آج موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈ میں قدرے اضافہ ہوا تھا۔

ڈیپارٹمنٹ کے باہر سیاہ سفید یونی فارم پہنے مستقبل کے وکیل اندر باہر ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں فائلیں تھیں اور کندھوں سے بیگ لٹک رہے تھے۔ ان کی چالوں میں تمکنت تھی۔

وہ لمبی سانس لے کر اندر کی طرف بڑھی۔ ڈیپارٹمنٹ کی راہداریاں طلبا سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا۔ کوئی سائیڈ پہ ہو کے کرتیں کر رہا تھا۔ عجیب سی لافانی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ قدم قدم چلتی، انتظامیہ کے دفاتر والی لابی میں مڑ گئی۔ اسے ریکارڈ ایڈمنسٹریٹر کے پاس جانا تھا۔ لابی لمبی اور کشادہ تھی۔ دائیں بائیں وقفے وقفے سے کمروں کے دروازے بنے تھے جن

کے اوپر متعلقہ پروفیسر یا منتظم کا نام درج تھا۔ تقریباً سب ہی دروازے بند تھے۔ وہ چلتے ہوئے ایک ایک دروازے پہ لکھا نام پڑھ رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ ٹھہر گئی۔ راہداری میں چوتھے نمبر پر بائیں طرف ''عباس عالم یوسف زئی'' لکھا تھا۔ وہی ریکارڈ ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور ہاتھ الٹا کر کے انگلیوں سے ناک کیا پھر ناب پہ ہاتھ رکھا اور ذرا سا گھما کے دروازہ کھول دیا۔ سر اندر کر کے اس نے سامنے دیکھا۔

''سر، میں اندر آ جاؤں؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''آ جائیں۔'' سر اٹھائے بغیر وہ بولے۔ وہ ٹھنڈے قدم لیتی ہوئی اندر آئی اور ان کی میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔

ان کے دائیں بائیں، آگے پیچھے فائلوں کے اونچے اونچے بنڈل پڑے ہوئے تھے۔ اس کے قد جتنے اونچے۔ ہر دیوار میں ریکس تھے اور ان ریکسوں میں فائلیں بے رحمی سے ٹھونسی ہوئی تھیں۔ اتنی بوسیدہ اور پرسان حال فائلوں کو دیکھ کے ایک لمحے کے لیے اسے لگا وہ کسی ردی والے کی دکان میں داخل ہو گئی ہے۔

ان کی میز بھی کسی کباڑیہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر طرف کاغذ ہی کاغذ اور کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کمرے میں سگریٹ اور نسوار کی ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایڈمنسٹریٹر سر جھکائے انہماک سے کچھ ٹائپ کر رہے تھے۔ کمپیوٹر کی ایل ای ڈی سکرین نے ان کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ کمرے میں کی پیڈ کی ٹک ٹک گونج رہی تھی۔

اس نے گردن ترچھی کر کے ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ''السلام علیکم سر۔''

''وعلیکم السلام۔'' وہ مختصر بولے۔

''سر..... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔'' اس نے تجسس بھری تمہید باندھی۔ کی بورڈ

کی ٹک ٹک رکی، چیئر کھسکنے کی آواز آئی، وہ پیچھے ہوئے۔ کمپیوٹر کی اسکرین گھما کے دائیں طرف کی اور دیدار کروایا۔ وہ تیس پینتیس سال کے آدمی تھے۔ داڑھی بالشت بھر تھی اور مونچھیں نہیں تھیں۔ سر پہ سفید ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر موٹی فریم والا بھدا سا چشمہ تھا۔

''بہت شکریہ آنے کے لیے مادام۔ تشریف رکھیں اور بتائیں کیا بات ہے۔ آرام سے سکون سے بتایئے گا۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔'' وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی فراغت سے گویا ہوئے۔ وہ ٹھٹک گئی۔ کیا وہ واقعی ریکارڈ آفس آئی تھی۔ اس نے بے اختیار میز پر دھرے ان کے نام کا بیج دیکھا۔ وہ ایڈمنسٹریٹر ہی تھے۔ وہ غلط جگہ نہیں آئی تھی۔

کسل مندی سے مسکرا کر اس نے کرسی کھینچی اور پراعتماد انداز میں بیٹھ گئی۔ ''میرا نام گل لالہ کلیم ہے۔ میں انگریزی ڈیپارٹمنٹ سے ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ کام تھا۔''

''انگریزی ڈیپارٹمنٹ کو مجھ سے کیا کام؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگے۔

''مجھے آپ کے ایک سٹوڈنٹ کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔''

''معلومات؟'' وہ ٹھٹک گئے۔

''جی۔'' اس نے سر کو خم دیا۔

''کیسی معلومات؟ اور کیوں چاہئیں؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی تصویر ان کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے الجھتے ہوئے تھام لی اور چشمہ سیٹ کر کے دیکھنے لگے۔

''ان میں بائیں طرف والے کون ہیں۔ ان کا نام کیا ہے۔ ایڈریس کیا ہے۔ اب کہاں ہوتے ہیں۔ مجھے یہ پتہ کرنا ہے۔''

انہوں نے تصویر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ تو کافی پرانی تصویر لگ رہی ہے۔''

''جی۔ چودہ سال پہلے کھنچوائی گئی تھی۔''

اس کے جواب پر ان کا منہ کھل گیا۔ ''چودہ سال پہلے؟ اور آپ ابھی اس آدمی کو ڈھونڈنے آئی ہیں۔ محترمہ، چودہ سال بعد ان کا رنگ روپ، قد کاٹھ، نین نقش سب بدل گئے ہوں گے۔''

''مگر ان کے اکیڈمک ڈاکومنٹس پر آج بھی یہی تصویر لگی ہوگی۔'' وہ بڑی ہی سمجھداری سے بولی تو وہ قدرے جھینپ گئے۔ ان کے پیچھے چھوٹی سی کھڑکی لگی ہوئی تھی جس کی منڈیر پر چڑیا کا گھونسلا تھا اور چوکھٹ پر دانے کی پلیٹ اور پانی کا مگ۔ وہاں لحہ بہ لحہ چڑیا آ رہی تھیں۔

''کتنا جانتی ہیں آپ ان کے بارے میں؟''

''زیادہ نہیں۔ مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۹۸ء میں یہاں سے لاء کی ڈگری لی تھی۔'' وہ دھیرے سے بولی پھر ذرا چمک کے بولی۔ ''اور مجھے ان کے نام کا مخفف بھی آتا ہے۔ IDK سے بنتا ہے ان کا نام۔''

''IDK کا مطلب I Dont Know ہوتا ہے۔'' وہ ہنسنے لگے۔

''اور وہ یقیناً ان کا نام نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی سے کہا تو ان کی ہنسی تھم گئی۔ ذرا سنجیدگی سے گلا کھنکارتے وہ آگے ہوئے۔

''آپ کو ان کے بارے میں معلومات کیوں چاہئیں؟'' وہ تفتیشی انداز میں پوچھ رہے تھے۔

''میرا ایک پرانا کیس ہے ان کے پاس۔ مجھے وہی کھلوانا ہے مگر میں یہ نہیں جانتی اب یہ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کا ایڈریس کیا ہے۔ کس فرم میں جاب کرتے ہیں۔ ہائی کورٹ میں ہوتے ہیں یا سپریم کورٹ میں۔ کچہری میں بیٹھتے ہیں یا چیمبر ہے ان کا۔ دن کو کہاں ہوتے ہیں۔ رات کہاں گزارتے ہیں۔ عمر کیا ہے۔ دکھتے کیسے ہیں۔ کچھ نہیں پتہ۔'' وہ بے حد شکست خوردہ انداز میں بولی تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔

''میں تو نہیں بتا سکتا۔ کیوں کہ میں یہاں پچھلے پانچ سال سے جاب کر رہا ہوں مگر میں ضمیر

صاحب کو بلاتا ہوں۔ وہ پچھلے پچیس سال سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ کون ہیں اور کہاں ہوتے ہیں۔'' امید بھرے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اپنا فون نکالا اور ضمیر کا نمبر ملانے لگے۔ کال اٹھانے کے بعد وہ کچھ دیر ان سے بات کرتے رہے پھر فون بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

''آ رہے ہیں۔''

وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ کسی بھی ادارے کو اپنے کسی پرانے طالب علم کا ریکارڈ نکالنا مشکل نہیں ہوتا اور خصوصاً جب اس طالب علم نے وہاں سے اپنی چار یا پانچ سالہ ڈگری مکمل کی ہو۔ اس عرصے میں اسے یونی ورسٹی کے در و دیوار تک پہچان جاتے ہیں کجا کہ کسی پروفیسر یا سٹاف کو اس کا نام یاد نہ ہو۔ اس کے بابا ایک عام طالب علم نہیں تھے۔ وہ ٹاپر تھے اور ٹاپرز کبھی نہیں بھلائے جاتے۔

کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک ضعیف العمر شخصیت اندر آئی۔ وہ ادب سے کھڑی ہو گئی۔ ضمیر صاحب پست قد کے دبلے سے آدمی تھے۔ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ گردن میں باریک فریم کا چشمہ جھول رہا تھا۔

''السلام علیکم سر۔'' اس نے احترام سے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے بڑی ہی باریک آواز نکالی۔ غالباً ان کو کوئی کمزوری ہو رہی تھی۔

''ضمیر صاحب! یہ لڑکی انگریزی ڈیپارٹمنٹ سے آئی ہے۔ اسے ایک چودہ سال پرانے سٹوڈنٹ کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں۔ ان کا کیس ہے ان کے پاس۔ یہ (تصویر بڑھائی) تصویر لائی ہیں ان کی۔ ظاہر ہے چودہ سال پہلے کی ہے تو میں تو نہیں پہچانوں گا۔ آپ دیکھ لیجیے۔ کیا پتہ آپ نے ان کو کہیں دیکھا ہو۔'' وہ رسان سے کہتے واپس اپنے کام میں لگ گیا۔

ضمیر صاحب نے تصویر پکڑی اور سینے پہ جھولتے چشمے کو ناک کی نوک پر سجالیا۔اب وہ جھری زدہ آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑے ''پوسٹ مارٹم'' والے انداز میں تصویر کے پیچ وخم دیکھ رہے تھے۔ان کے حیص بیص تاثرات کو دیکھ کر گل کی بے تابی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''یہ تو کلیم اللہ اور احتشام الدین ہیں۔'' وہ قدرے خوشگوار حیرت سے بولے۔وہ بری طرح چونکی۔

''آ۔۔آ.....آپ جانتے ہیں ان کو؟''

''میں کیا۔پورا پشاور جانتا ہے۔''

وہ بے قراری سے آگے ہوئی۔''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں یہ کون ہیں۔کہاں ہوتے ہیں؟''

''یہ والا تو ڈگری لینے کے بعد پشاور ہائی کورٹ میں چیمبر تلاش کر رہا تھا پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔پچھلے سولہ سال سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ورنہ اس پورے بیچ کے ایک ایک طالب علم کا نمبر تھا میرے پاس۔یہ سارے بڑے ہی چاؤ سے مجھے ہر دن فون کیا کرتے تھے۔''

''آپ پلیز ان کے بارے میں بتائیں ناں۔'' اس نے جھنجلا کے دوسرے آدمی پر انگلی رکھی۔

''یہ احتشام الدین خٹک ہے۔بڑا ہی ہونہار اور لائق بچہ تھا۔سارا وقت کتابوں میں سر دیے رکھتا تھا۔اس لیے تو آج کامیاب ہے۔پشاور ہائی کورٹ میں ہوتا ہے یہ۔ادھر قریب میں ہی اس کا لاء فرم بھی ہے۔وہاں ہمارے شعبے کے بیس بڑے وکیل کام کرتے ہیں۔'' وہ فخر سے بتانے لگے۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے پیچھے ہوئی۔''IDK یعنی Ihtisham-ul-deen Khattak۔''

''آپ کو ان سے کام ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی۔کیا آپ مجھے ان کے لاء فرم کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟''

''ضرور۔ یہ سٹریٹ روڈ.....''

''ایک منٹ۔'' اس نے بجلی سی تیزی سے اپنی گلابی رنگ کا رائٹنگ پیڈ نکالا اور دانتوں کی مدد سے پین کھولا۔ ''اب بتائیں۔''

انہوں نے چند سیکنڈز میں ایڈریس لکھوا دیا۔ پیڈ بند کر کے، ان کا شکریہ ادا کیا پھر اپنا بیگ اٹھایا، تصویر لی اور باہر آ گئی۔ قریباً ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ عدالت پانچ بجے بند ہوتی ہے۔ ان کا لاء فرم ابھی کھلا ہوگا۔ ایڈریس سے لگ رہا تھا کہ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلی اور یونی ورسٹی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ایک بج گیا۔ اس نے ٹیکسی رکوائی اور متعلقہ ایڈریس دکھایا۔

ٹیکسی ڈرائیور جانتا تھا۔ اس لیے وہ پیچھے بیٹھ گئی اور ان کے فرم کی طرف بڑھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

ایک بج کر پینتیس منٹ بعد وہ بڑھے ٹریفک اژدحام سے گزرنے کے بعد اپنی مطلوبہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ چار منزلہ یہ عمارت سفید رنگ کا ایک چکور باکس تھی جس میں چند فٹ کے فاصلے سے شیشے کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ عمارت سے سڑک تک روش سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور اطراف میں کئی رنگدار پھولوں والی کیاریاں تھیں۔ روش کے اختتام پر اسٹیج کی طرح لمبی سیڑھیاں لگی تھیں جس کے پار شیشے کا مرکزی دروازہ تھا۔ اسی دروازے کے دائیں بائیں دو گارڈز چوکنا انداز میں کھڑے تھے۔ روش نم تھی۔ یقیناً یہاں پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی آگے بڑھنے لگی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ایک گارڈ نے پلٹے بغیر، ہاتھ لمبا کر کے دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ وہ قدرے حیرانی سے اندر چلی گئی۔

عمارت اندر سے بھی سفید رنگ کی تھی۔ تیز بلبوں اور لاتعداد ائر کنڈیشنروں نے عمارت کو برف خانہ بنایا ہوا تھا۔ مئی کی گرمی میں بھی، یہاں جنوری چل رہا تھا۔ اندر آ کے اس نے بے ساختہ بازو سہلائے۔ سیلنگ، دیواریں، راہداریاں، یہاں تک کے ریسیپشن کی میز تک سفید رنگ کی تھی۔ اس سلیب کے پیچھے اونچی کرسی پر ایک چنچل سی لڑکی سفید شلوار پہ کالا کوٹ پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے، ہاتھ میں پین پکڑے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کاؤنٹر کے بائیں سمت سیڑھیاں تھیں جو اس قدر کشادہ تھیں کہ چار لوگ ایک ساتھ چڑھ سکتے تھے۔ یہ سیڑھیاں بھی سفید رنگ کی تھیں۔

وہ تعجب سے ریسیپشن کے کاؤنٹر کے قریب آئی۔ ''السلام علیکم!''

اس کی آواز پر لڑکی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ مسکرائی۔ ''وعلیکم السلام۔'' پھر تیزی سے چیزیں ادھر ادھر چھپانے لگی، اپنے سامنے کا عرشہ خالی کرنے کے بعد وہ چمکتی آنکھوں سے آگے ہوئی۔ ''جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''مجھے احتشام صاحب سے ملنا ہے۔ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' اس نے پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔

''احتشام صاحب تو نہیں ہیں مادام۔ مگر آپ فکر مت کریں۔ ہمارے پاس کئی قابل اور فرض شناس وکیل ہیں۔ آپ اپنا کیس بتائیں کس نوعیت کا ہے۔ میں آپ کو ہمارے فرم کا بہترین وکیل ریکامنڈ کروں گی.....'' اپنے ہی لے میں کہتی اس نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ''بتایئے ناں۔ قتل کا کیس ہے۔ پراپرٹی کا مسئلہ ہے۔ جبری ہراسانی کا کیس ہے یا پھر..... گھریلو تشدد کا..... ہمارے پاس.....''

''مجھے صرف احتشام صاحب سے ملنا ہے۔ میں کسی کیس کے سلسلے میں نہیں آئی۔'' وہ اس کی بے لگا کلام کو ٹوکتے ہوئے تیزی سے بولی۔

''احتشام صاحب تو یہاں نہیں آتے۔'' لڑکی نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''یہ فرم ان کا ہے۔ وہ یہاں نہیں آتے تو کہاں جاتے ہیں؟'' وہ دبے دبے غصے سے بولی۔ لڑکی اس کا دماغ چاٹ رہی تھی۔

''مادام۔ وہ وکیل نہیں۔ جج ہیں۔ صبح سے شام تک عدالت میں ہوتے ہیں۔ اس فرم میں ان کے ہائر کردہ وکیل ہوتے ہیں جو کیس لیتے ہیں۔ خود احتشام صاحب کو کوئی کیس لیے سال بھر تو ہو چکا ہے۔''

''مگر وہ یہاں آتے تو ہوں گے۔ کبھی۔ کسی دن۔ کسی مقررہ وقت میں۔''

''وہ جب فارغ ہوتے ہیں تو ایک آدھ بار چکر لگا لیتے ہیں مگر یہ کنفرم نہیں ہے۔ وہ کسی بھی دن، کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ فی الحال تو وہ پچھلے دو ماہ سے نہیں آئے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئی بولی۔

''اچھا۔ ان کے گھر کا ایڈریس تو ہوگا آپ کے پاس؟ یا پھر ان کے مینجر یا سیکرٹری کا نمبر دے دیجیے۔ میں خود میٹنگ فکس کرلوں گی۔'' وہ مفاہمت سے کہنے لگی۔

''میں آپ کو ان کے سیکرٹری کا نمبر دیتی ہوں۔ آپ اسے فون کر لیجیے۔ وہ آپ کی ملاقات کرا دے گا۔ رہی بات گھر کا ایڈریس دینے کی تو معذرت کے ساتھ میم۔ ہمیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ ان کی ذاتیات خراب نہ ہوں۔ اس لیے انہوں نے یہ فرم بنایا تھا۔'' وہ معذرت خواہ انداز میں کہتی، کاؤنٹر سے چپکے نوٹ کو اتار کے اس پر نمبر لکھنے لگی۔ گیارہ ہندسے لکھنے کے بعد اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

''شکریہ۔'' بڑے ہی تکلف سے وہ کہتی باہر آگئی۔ گیلی روش پہ ٹھہر کے اس نے فوراً سیکرٹری کا نمبر ملایا۔ کال نہیں اٹھائی گئی۔ اس نے دوسری کوشش کی۔ دوبارہ ملایا۔ نہیں اٹھایا گیا۔ تیسری بار بھی

جواب ندارد رہا تھا۔اس نے نمبر ''سیکرٹری'' کے نام سے سیو کیا اور واپس یونی ورسٹی کی طرف چل پڑی۔

راستے میں اس نے بارہا نمبر ملایا تھا۔نمبر یا بزی جا رہا تھا یا پھر مل کے کٹ جاتا تھا۔خیر وہ کوشش کرتی رہے گی۔جب وہ یونی ورسٹی پہنچی ڈھائی بج رہے تھے۔اس کی آج تین بجے کلاس تھی۔اس نے ساری کلاسز مس کر دی تھیں۔اس لیے وہ پروفیسر جاوید کی کلاس لینے چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

رات تک وہ وقفے وقفے سے ان کے سیکرٹری کا نمبر ملاتی رہی۔سیکرٹری تھا یا کوئی وزیر اعظم جو فون نہیں اٹھا رہا تھا۔اس نے پینتالیس بار نمبر ٹرائی کیا تھا۔بیل جا رہی تھی لیکن وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔اس وقت وہ ہاسٹل کی لابی میں ریلنگ کے پاس کھڑی تھی۔نیچے ہاسٹل کا لان تھا جہاں اس وقت کچھ لڑکیاں جا بجا بیٹھی فون پہ باتیں کر رہی تھیں۔

ایک آخری بار اس نے ہمت مجتمع کی اور کال ملائی۔گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ایک.....دو.....تین.....چار.....اور پھر یکدم۔

''السلام علیکم۔'' کی آواز ابھری۔وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

''وع.....ل.....لیکم السلام۔'' اپنی بوکھلاہٹ روک کے اس نے تیزی سے کہا۔

''کون بات کر رہی ہیں؟'' پیشہ ورانہ انداز میں وہ پوچھنے لگا۔

''آپ سر احتشام الدین خٹک کے سیکرٹری بات کر رہے ہیں؟'' اس نے فوراً اس کا حوالہ پوچھا۔

''جی جی۔''

''مجھے احتشام سر سے ملاقات کرنی تھی۔ان سے کچھ ضروری کام ہے۔''

''آپ کون؟''

''میں گل.....'' کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی۔ کچھ سوچا پھر گہری سانس لی۔ ''آپ ان سے کہہ دیجیے کہ گل لالہ ان سے ملنا چاہتی ہے۔ کلیم اللہ کے کیس کے سلسلے میں۔''

''کیا نام بتایا آپ نے؟''

اس نے ابرو سکیڑے۔

''گل لالہ۔''

''ٹھیک ہے مادام۔ ان سے بات کر کے آپ کی ملاقات ارینج کرتا ہوں۔''

''بہت شکریہ۔'' اس نے ممنونیت سے کہا اور فون بند کر کے ایک سکون کا سانس لیا۔ صد شکر چھیالیسویں کال اٹھالی گئی تھی۔ اس نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی۔ رہ رہ کے ریسپشنسٹ پہ غصہ آرہا تھا کہ اس نے کہیں غلط نمبر تو نہیں دے دیا۔ اپنے مزاج میں وہ کہیں سے بھی سنجیدہ نہیں لگی تھی مگر خیر۔ اس کا کام ہو گیا۔ اب وہ جلد ان سے مل کر اپنے بابا کے بارے میں سب جان جائے گی۔

وہ مسکراتے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

آج موسم ابر آلود تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے عالیشان گھر سے باہر نکلے تو گارڈ نے تیزی سے چھتری ان پر تان لی۔ وہ فون میں جھکے قدم قدم گاڑی کی طرف چل پڑے۔ سیاہ پینٹ پہ سفید شرٹ پہنے، بالوں کو جیل سے جمائے وہ Young Judge تھے۔ ان کا لمبا قد اور متناسب جسامت ان کی متانت میں خاطر خواہ اضافہ کر رہا تھا۔

گارڈز نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ اندر بیٹھ گئے۔ سر فون میں ہی جھکا ہوا تھا۔ سیکرٹری ڈرائیور

کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔اس کے ہاتھ میں ٹیب تھا جس پر وہ Stylus سے کچھ لکھ رہا تھا۔انہیں اندر آتا دیکھ کے الرٹ سا ہو گیا۔

''گڈ مارننگ سر۔''

اس نے گردن گھما کر انہیں دیکھا۔

''گڈ مارننگ۔کیسے ہو عابد۔''فون ایک طرف رکھتے ہوئے وہ خلوص سے گویا ہوئے۔

''میں اچھا ہوں سر۔'' وہ مسکرایا۔''میں آپ کو آپ کا شیڈول بتا دیتا ہوں۔''وہ سٹائلس سے سکرین کو اوپر کر کے ایک نیا صفحہ لوڈ کرتے ہوئے بولا۔اس صفحے میں ترتیب سے کچھ فقرے لکھے ہوئے تھے۔ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔اب وہ گارڈز کے پروٹوکول میں سڑک پر چل رہے تھے۔

''آپ کی پہلی ساعت جوڈیشل کمیٹی کے ساتھ دس بجے ہے۔عالم زیب قتل کیس کی۔سبیل جان زیادتی اور قتل کیس کی ساعت دو بجے ہے۔شام پانچ بجے آپ کو میڈم ثوبیہ (بیوی) کو میکے لینے جانا ہے۔رات آٹھ بجے آپ کے دوست نے کیس جیتنے کی خوشی میں پارٹی رکھی ہے۔آپ مدعو ہیں۔'' وہ رٹو طوطے کی طرح بول کر خاموش ہو گیا۔

''او کے۔شکریہ۔'' وہ دوبارہ فون اٹھا کے اس میں جھک گئے۔باہر بارش کے قطرے گر رہے تھے۔ایک نم دھندلاہٹ سی شیشوں پر پھیل گئی تھی۔وہ سیٹ سے پشت لگائے ہوئے تھے۔

سیکرٹری نے گلا کھنکارا۔''اور ایک اور بات سر.....کل گل لالہ نام کی لڑکی کا فون آیا تھا۔وہ آپ سے کسی کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہے۔''

''کیا وہ کیس میں دیکھ رہا ہوں؟''انہوں نے پوچھا۔

''نہیں سر،یہ کوئی نیا کیس ہے۔''

''پھر اسے بتا دو کہ میں جج ہوں۔وکیل نہیں۔'' بے رخی سے کہتے ہوئے انہوں نے پہلو

بدلا۔سیکرٹری نے سر کو خم دیا۔وہ کچھ لمحے فون میں لگے رہے پھر یکدم انہوں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔سیکرٹری فون میں لگا شاید اسے کال کر رہا تھا۔

''ایک منٹ.....'' وہ ٹھٹک گئے۔''نام کیا بتایا تم نے لڑکی کا؟''

''گل لالہ۔''

''گل.....''انہوں نے کچھ سوچا۔''کس کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتی تھی وہ؟''

''سر۔کوئی کلیم اللہ کا کیس تھا۔وہ کہہ رہی تھی۔''

ان کے قدموں تلے باردوی سرنگ پھٹی۔وہ کئی لحظوں تک سیکرٹری کو دیکھتے رہے پھر تیزی سے آگے ہوئے۔''کب.....کب فون کیا تھا اس نے؟''

''کل رات کو۔''

''بلاؤ اسے۔مجھے ملنا ہے اس سے۔''وہ بے چینی سے بولے تھے۔

''سر! مگر ابھی تو ممکن نہیں۔آپ کا سارا دن Engadged ہے۔کچھ دیر میں آپ کے پہلے کیس کی سماعت ہے۔جوڈیشل کمیٹی (یعنی دو تین اور ججوں کے ساتھ مل کر) کے ساتھ۔کیا میں وہ کینسل کر دوں؟''سیکرٹری نے عاجزی سے پوچھا تو وہ ٹھٹک گئے۔

ایک لمحے کے لیے وہ جیسے بھول گئے کہ وہ دوست نہیں جج ہیں۔پشاور ہائی کورٹ کے جج۔ان کی سماعتوں کے دن اور وقت مقرر تھے۔وہ اس وقت سے ایک انچ نیچے یا اوپر نہیں ہو سکتے تھے۔وہ کوئی سرکاری نوکری نہیں تھی کہ آج نہیں گئے تو کوئی قباحت نہیں۔وہ عدالت تھی۔ہر سماعت مہینوں بعد اپنی تاریخ پہ ہوتی تھی۔وہ کسی سماعت کو سننے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے گہری سانس لی۔''ٹھیک ہے اسے شام میں گھر بلاؤ۔میں گھر میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔''

''شام میں آپ کو آپ کے دوست کی پارٹی.....''

''تم سیکرٹری ہو یا میرے باپ؟ جب میں ملنا چاہتا ہوں تو تم کیوں بار بار مداخلت کر رہے ہو؟'' وہ اتنے تیزی سے غرائے کہ عابد کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ڈرائیور نے بے ساختہ سٹیئرنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ آج پہلی بار اس کا باس غصے میں لگ رہا تھا۔

''سوری سر۔'' شرمندگی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے سر جھکا دیا۔

''اسے شام میں، میں اپنے گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھے۔'' انہوں نے برہمی سے کہا۔

''جی سر۔'' عابد نے سر کو تابعداری سے خم دیا۔

انہوں نے کالر کا بٹن کھول کر گہری سانس لی۔ گل لالہ اپنے باپ کا کیس کھلوانا چاہتی تھی۔ اس کے باپ کا کیس تو اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے پاس تو کچھ اور تھا پھر وہ لڑکی باپ کے کیس کی بات کیوں کر رہی تھی؟ گل تو اس وقت سات سال..... سوچتے سوچتے وہ تھم گئے۔ سات جمع سولہ۔ وہ اب سات کی نہیں۔ تیئس سال کی تھی۔ مگر وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟ کیا وہ چترال سے پشاور محض اس لیے آئی تھی؟

انہوں نے پیشانی سہلائی۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ اس معاملے پر اب تا عمر کوئی بات کرنے نہیں آئے گا۔ کلیم مرا تو مرا۔ اب اس کا پوچھنے والا کوئی نہیں تھا مگر وہ گل لالہ کو کیسے بھول گئے تھے؟ وہ لڑکی۔ جس کی باتیں اس کا دوست کرتے کرتے نہیں تھکتا تھا۔ وہ لڑکی اب بڑی ہوگئی تھی۔ اتنی بڑی کہ باپ کے کیس کے بارے میں پشاور تک آ گئی تھی۔ وہ اس سے ضرور ملیں گے۔

☆.....☆.....☆

ابھی پروفیسر سرمد کی کلاس شروع نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے کلاس روم میں ہلڑ مچا رہے تھے۔ پروفیسر سرمد نے آج پریزنٹیشن لینا تھی۔ جن بچوں کی پریزنٹیشن تھی وہ لیپ ٹاپ کھولے، انہماک سے اپنے

فقرے دہرا رہے تھے۔ وہ دونوں بیگ کلاس میں رکھ کے، خود سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ گل اوپر تھی اور عنبر نیچے۔ اس کی گود میں لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ گل جھک کے سکرین کو دیکھتے ہوئے سلائیڈ پڑھ رہی تھی۔

وہ دونوں بدمعاش لابی کے سرے پر کھڑے تھے۔ اسد دیوار کے ساتھ سیدھے کھڑے ہو کر ایک آنکھ سے گل کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دیوار پہ تھے۔ اس کے سامنے والی دیوار سے ذیشان اسی لے میں جھانک رہا تھا۔ گل اور عنبر سے چالیس قدم اور ان سے صرف بیس قدم کے فاصلے پر گل کا کلاس روم تھا۔ چوں کہ وہ سیکشن سی سے تھے تو سیکشن سی کی لابی ہی الگ تھی۔ اس راہداری میں طالب علم آجا رہے تھے۔

گل اور عنبر اتنی انہماکی سے لیپ ٹاپ میں گھسی ہوئی تھیں کہ کب وہ بدمعاش ان کی کلاس میں داخل ہو گئے، انہیں پتہ ہی نہیں چل سکا۔ اب وہ پہلی قطار میں رکھی کرسی پر پڑے گل کے بیگ پر یلغار بولنے والے تھے۔ کل اسائنمنٹ جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ ممکن تھا کہ وہ جو بھدی فائل لاتی ہے۔ اس میں اسائنمنٹ موجود ہو۔ تلاشی لینے کی غرض سے اسد نے بیگ کی زِپ کھولی۔ کلاس میں موجود لڑکے آپس میں دھینگا مشتی کر رہے تھے جب کہ لڑکیاں سر جھکائے کچھ پڑھ رہی تھیں۔ کسی کا دھیان ان دونوں کی جانب نہیں تھا۔

اس نے حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا اور فائل باہر نکال لی۔ اب وہ فرصت سے کھڑے ہو کر ایک ایک صفحہ پلٹ رہا تھا۔ اس کا اطمینان دیکھ کے ذیشان بوکھلا گیا۔

''جلدی کر۔ کیا کر رہا ہے؟ وہ آجائے گی۔'' ذیشان نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''ارے وہ نہیں آئے گی۔'' وہ تسلی سے کہتے ہوئے انگلی کو تھوک سے نم کرتا صفحے آگے کر رہا تھا۔ ذیشان اس کے کندھے سے جھانک کے فائل کو دیکھ رہا تھا ساتھ ساتھ وہ منڈی گھما کے

دروازے کو بھی دیکھتا۔

کئی صفحے پلٹنے کے بعد بھی اسے اسائنمنٹ نہیں ملی تھی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ ''کہاں رکھی ہے محترمہ نے۔'' ضبط سے کہتے ہوئے جیسے ہی اس نے اگلا صفحہ پلٹا۔ دھڑام سے ایک کتاب اس کے سر پہ آن پڑی۔

''تمہاری تو.....'' وہ تلملا کے ایڑھیوں کے بل پلٹا اور جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ سامنے گل ماتھے پر بل ڈالے کھڑی تھی۔ اس نے پھرتی سے فائل پیچھے چھپالی۔ اسے دیکھ کے ذیشان بجلی سی تیزی سے باہر نکل گیا جب کہ اس کی فرار کے تمام راستے مفقود ہوگئے۔ وہ تیورا کے اسے دیکھ رہی تھی۔ نیلی آنکھوں میں ٹھنڈی بے رحمی تھی۔

''وہ.....ام.....''

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بیگ کی تلاشی لینے کی؟'' وہ بری طرح غرائی۔ اس کی غراہٹ سن کے اسد نے بے اختیار ایک قدم پیچھے لیا تھا۔

''وہ..... مجھے.....اسائنمنٹ چاہیے تھی.....'' اس نے ٹھوڑی سینے سے جوڑتے ہوئے کہا۔

گل کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے کھینچ کے کتاب اس کے بازو پہ ماری اور پھر یونہی اسد پر کتابوں کے وار شروع ہوگئے۔ وہ بے اختیار خود کو بچاتا پیچھے ہٹنے لگا۔ پوری کلاس اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''گھٹیا انسان۔ تمہیں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی مرتبہ کہوں کہ مجھے نہیں دینی کوئی اسائنمنٹ۔ پھر سے اپنا بے غیرت منہ لے کر آجاتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہو تم، ہاں۔'' مار مار کے اس کا بھرکس نکال چکی تھی۔ پوری کلاس یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کے دروازے میں کھڑے پروفیسر سرمد بھی۔

''گل۔ میں نے ایک دفعہ دیکھنی ہے۔ پلیز۔ صرف ایک بار۔'' وہ اب بھی ڈھیٹوں کی طرح

اڑا ہوا تھا۔

''ایک بار.....صرف ایک بار.....'' دانت پیستی وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ 'ابھی بتاتی ہوں تمہیں۔'' کتاب چھوڑ کر اس نے ہاتھ استعمال کیا۔ زنانہ ہاتھ کا تیکھا تھپڑ اس کے بازو اور پیٹھ پہ آن پڑا تو وہ بوکھلا گیا۔

''دیکھیں گل۔ یہ غلط بات ہے۔ میں آپ کا لحاظ کر رہا ہوں۔ آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔''

''تو تم بھی اٹھاؤ ہاتھ۔ میں بھی دیکھتی ہوں تم اور کتنا گھٹیا پن دکھا سکتے ہو۔'' وہ تلخی سے کہتی پھر سے اسے مارنے لگی کہ جب ہی پروفیسر کی آواز آئی۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' گمبھیر اور گونجتی ہوئی آواز سن کے پوری کلاس سپرنگ کی طرح اچھل گئی۔ پروفیسر نے بیگ روسٹرم پر رکھا اور تیزی سے دونوں کی طرف آئے۔ ''کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ مس گل، آپ کیوں مار رہی ہیں اسے؟''

''کیوں کہ یہ.....''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ہاتھ میں پکڑا اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے چونک کے اسکرین دیکھی۔ سیکرٹری نے کال بیک کیا تھا۔ موقع جانے کے خوف سے اس نے اسد پر لعنت بھیجی اور ہڑبڑا کے کلاس سے باہر نکل گئی۔ لابی کی ریلنگ کے قریب آ کے وہ رکی اور عجلت میں کال اٹھالی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔ مس گل لالہ، میں نے ان سے بات کی ہے۔ انہوں نے شام میں آپ کو اپنے گھر بلایا ہے۔ میں آپ کو ان کے گھر کا ایڈریس دیتا ہوں۔ آپ لکھ لیجیے۔''

اس نے فون کان اور کندھے کے درمیان پکڑ لیا پھر جلدی سے گریبان میں اٹکا پین نکالا اور ہتھیلی پہ پرنب رکھی۔ ''بتایئے۔''

چند سیکنڈ میں انہوں نے ایڈریس لکھوا کر فون بند کر دیا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر ہتھیلی اپنے سامنے کی۔ وہ یونی ورسٹی ٹاؤن پشاور کی لوکیشن تھی۔ یہ جگہ یہاں سے دور نہیں تھی۔ وہ ٹیکسی کر کے با آسانی وہاں پہنچ سکتی تھی۔ وہ مسکرا کے واپس کلاس میں آئی تو وہ لنگور جا چکا تھا اور پروفیسر کے سامنے عنبر کھڑے ہو کر پریزنٹیشن دے رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر تیزی سے اندر آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

مغرب کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ نیلگوں روشنی چھٹ کر سیاہی میں بدل گئی تھی۔ باہر بارش بدستور جاری تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار کے سبب اس نے اپنے لیے چھتری بھی نکال لی تھی۔ وہ بڑی ہی نفاست اور تکلف سے تیار ہوئی تھی۔ سفید شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہرے نیلے رنگ کی چادر اوڑھی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں بند کر دیا تھا۔ اس نے چہرے کو کسی بھی میک اپ سے عاری رکھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری۔ اسے اپنی خوبصورتی اور زاویے ٹھیک کرنے کے لیے کسی بھی قسم کے میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ چترال کا حسن اس کے بند بند سے جھلکتا تھا۔

آٹھ بجے کا وقت ہو رہا تھا جب وہ ہاسٹل سے باہر نکلی۔ مغرب کے بعد لڑکیوں کو ہاسٹل سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر زیادہ ضروری ہوتا تو انہیں وارڈن سے پرمیشن لیٹر لینا پڑتا تھا جس وہ درج کرتیں کہ کہاں جا رہی ہیں۔ کس کے ساتھ ہیں۔ فون نمبر اور لوکیشن کھلی رکھنا تھی۔ اس نے سرِ شام ہی وارڈن سے پرمیشن لیٹر لے لیا تھا۔

سڑک نم پڑی تھی۔ چاروں طرف جل تھل ایک ہوا تھا۔ وہ یونی ورسٹی سے باہر نکلی تو بادل گرج رہے تھے۔ دور فلک پر بجلیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ اس نے ٹیکسی کو روکا اور اندر بیٹھ گئی۔ ضعیف العمر پٹھان ٹیکسی ڈرائیور نے اسے متعلقہ مقام کی طرف لے کر روانہ ہو گیا۔

وہ جیسے جیسے منزل کے قریب ہو رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں نم اور گلا رندھ رہا تھا۔ وہ بار بار تھوک

نگل کر حلق تر کر رہی تھی۔ پونے نو ہو رہے تھے جب وہ یونی ورسٹی روڈ میں اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے رکی۔ وہ چھتری کھول کر باہر آئی۔ لمبا سا کلچ کندھے سے لٹک رہا تھا۔ ٹیکسی اس طرف رکی تھی جب کہ گھر سامنے تھا۔ وہ بیس قدم دور اس عالیشان گھر کو دیکھ رہی تھی جس کے باہر اور اندر دونوں طرف چوکیاں تھیں۔ گارڈز اسلحے سے لیس چوکس کھڑے تھے۔

گلی کشادہ تھی۔ امیر کبیر گھرانوں کے گھر یہاں فاصلے فاصلے سے بنے ہوئے تھے۔ سڑک کنارے لگے سٹریٹ پولز روشن تھے جن کی نارنجی روشنیوں میں پانی کے گرتے قطرے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

وہ ہمت مجتمع کر کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ سڑک پار کر کے وہ دوسری سمت آئی تو بارودی گارڈ چہرے پر غیظ سجائے اس کی طرف آیا۔

''السلام علیکم مادام۔ آپ گل لالہ ہیں؟'' اس نے خشک مگر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''جی۔'' اس نے سر کو جنبش دی۔

''آپ آیئے میرے ساتھ۔ اس طرف۔'' وہ بڑے گیٹ کی بجائے چھوٹے سے گیٹ کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ وہ اس کے عقب میں چلتے ہوئے چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ گھر کے بیرونی دروازے تک سفید روش تھی جس پر آگے پیچھے تین گاڑیاں پارک تھیں۔ دائیں طرف لان تھا اور بائیں طرف دیوار۔ لان میں ایک چھوٹا سا شیر کے مجسمے کا فوارہ نصب تھا۔ وہ قدم قدم چلتی بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو چھتری بند کر دی اور ایک طرف پڑے بڑے سے Umberella Holder کے اندر ڈال دی۔

اب وہ گارڈ کے ساتھ چلتی بری طرح گھبرا رہی تھی۔ گھر پر تعش تھا۔ راہداریاں اور دیواریں ستائش سے سجائی گئی تھیں۔ پہلی راہداری کی ساری دیواروں پر جا بجا فریم لگے تھے جس میں احتشام

صاحب کے گھر والوں کی تصویریں تھیں۔ دوسری راہداری کا پہلا دروازہ سٹنگ روم تھا اور بائیں طرف ڈائننگ ہال۔ گھر میں سکوت تھا۔ کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ الجھی الجھی گارڈ کے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ گارڈ نے ناب پہ ہاتھ رکھا اور اندر داخل ہوا۔

''سر! آپ کی مہمان آ گئی ہیں۔'' اس نے آگاہ کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گارڈ نے راستہ چھوڑ کے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیگ کی اسٹریپ کو مضبوطی سے پکڑے، لب کچلتی اندر چلی گئی۔ گارڈ نے دروازہ بند کر دیا۔

یہ کمرہ سٹڈی روم تھا۔ سامنے بڑی سی میز پڑی تھی جس کے پیچھے سربراہی نشست تھی۔ اس کے بعد کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑے تھے۔ ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ کریم رنگ کی شلوار قمیص پہنے، کندھوں پر شال ڈال رکھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باہر برستی بارش نظر آ رہی تھی۔

میز کے دائیں طرف بڑا سا صوفہ تھا اور ٹھیک اس کے پیچھے آتش دان تھا جو بجھا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار میں عجیب شکل کے ٹیڑھے میڑھے ریکس لگے ہوئے تھے جن میں موٹی موٹی کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میز پر ایک طرف ہتھوڑا اور دوسری طرف ترازو پڑا تھا۔ عجیب سی طلسماتی خاموشی تھی۔ وہ لب کچلتی منتظر سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''اس..... السلام علیکم.....''

اس کی کھنکتی آواز پر ان کی گردن میں جنبش ہوئی۔ ایسا لگا جیسے اس نے انہیں ایک گہری سوچ سے نکالا ہو۔ وہ دھیرے سے ایڑیوں کے بل پلٹے اور اسے دیکھا..... اور..... ایک لمحے کے لیے لگا جیسے کلیم اللہ کا عکس نظر آیا ہو۔ وہ آنکھیں، وہ ناک اور وہ گول سی ٹھوڑی تو کلیم کی تھی۔ وہ قد اور وہ چہرہ۔ وہ اپنے باپ پہ گئی تھی۔ وہ نرمی سے مسکرائے۔

''وعلیکم السلام بچے۔بیٹھو۔'' وہ اپنائیت سے کہتے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گئے جب کہ وہ ادب سے صوفے پر براجمان ہوگئی۔

''میں گلِ لالہ ہوں۔کلیم اللہ خان کی بیٹی۔آپ کے دوست۔جانتے تو ہوں گے۔'' اس نے تعارف کرایا۔

''اس کو کون بھول سکتا ہے۔'' وہ گھائل سے مسکرائے۔

گل نے سر کو تائیدی انداز میں خم دیا۔''میں اسلامیہ کالج یونی ورسٹی سے ایم اے انگریزی کر رہی ہوں۔میرا آخری سیمسٹر چل رہا ہے۔اس کے بعد میں چترال لوٹ جاؤں گی۔میں نے سوچا آپ سے مل لوں پھر وقت، موقع اور اجازت نہیں ملے گی۔''

''تم یہاں پڑھتی ہو؟'' احتشام کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''جی۔'' اس نے سر ہلایا۔''یہ بابا کی خواہش تھی۔انہوں نے کہا تھا کہ پشاور یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرنا ہے۔سو اس لیے۔''

''ہاں..... یاد پڑتا ہے مجھے۔وہ کہا کرتا تھا۔'' انہوں نے دکھی سی سانس لی۔

''کتنی بار میں نے کوشش کی کہ میں آپ سے ملوں۔آپ کو ڈھونڈوں۔میرے بابا کی کتابوں میں آپ کا نام لکھا تھا۔ہر بار لاء ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں قصداً آگے بڑھ جاتی تھی۔مجھے ہمت نہیں تھی آپ سے ملنے کی۔مجھے بابا کی موت کے بارے میں پتہ کرنا تھا کہ وہ کیسے ہوئی تھی۔اس لیے میں نے آپ کو ڈھونڈا اور یہاں چلی آئی۔''

''تمہیں کلیم کی موت کے بارے میں پتہ کرنا ہے؟'' وہ قدرے ٹھٹک گئے۔

''جی۔''

''تمہیں نہیں پتہ؟'' انہوں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''صرف اتنا پتہ ہے کہ وہ اپنے گھوڑے سمیت کھائی میں گر گئے تھے مگر اس میں کتنی سچائی ہے یہ نہیں پتہ۔'' وہ الجھن سے کہہ رہی تھی۔

''گر گئے تھے یا.....گرا.....یا.....گیا تھا؟''

''جی؟ کیا مطلب؟'' وہ چونک گئی۔انہوں نے گہری سانس لی۔اس کا مطلب اسے نہیں بتایا گیا تھا کہ اس کے بابا کے ساتھ کیا ہوا۔

☆.....☆.....☆

تاریخ:۱۶سال قبل

مقام:ایون-چترال

حویلی کے آگے بنے لان میں اس وقت پہلوانی کا بڑا اکھاڑا ہوتا تھا۔اس اکھاڑے میں ہر وقت نرم مٹی اور کیچڑ پڑا رہتا تھا۔اکھاڑے کی چاروں طرف زمین کی سطح پر اینٹوں کی پکی روش تھی۔ہر صبح پہلوانوں کے آنے سے پہلے ملازم اس پکی روش پر پانی چھینکتے،اکھاڑے میں نئی مٹی ڈالتے جو جلندھر کی زمین سے کھودائی کے لائی جاتی تھی۔اس مٹی میں موجود چھوٹے کنکر،گھاس پھوس،فصل کی ڈنڈیوں کو ہاتھوں کی مدد سے ملازم الگ کرتے تھے۔اس کی چھانٹ پھٹک ایسی ہوتی گویا وہ مٹی نہیں آٹا ہو۔اس کے بعد اسے اکھاڑے میں ڈالتے تھے اور اوپر سے بھاری لکڑی کے ٹکڑے کو گھسیٹتے تھے تاکہ مٹی مکمل طور پر نرم اور ریشمی ہو جائے۔اس کے بعد اس پر ہلکا ہلکا پانی ڈالا جاتا تھا۔کڑی محنت کے بعد اکھاڑے کی مٹی پاؤڈر کی طرح ہو جاتی تھی۔

پہلوان نری صبح پہنچ جاتے تھے۔ادھر سورج نکلا ادھر پہلوانوں نے ''سلام سردار'' کی صدا بلند کی۔یہ شاہی پہلوان تھے جن کو سردار نے خود پہلوان بنایا تھا۔کسی زمانے میں سردار کو بھی پہلوانی کا جنون تھا پھر سر پہ دستار ایسی پڑی کہ سارے شوق ختم ہو گئے۔چترال کی ذمہ داریوں اور مسائل نے

انہیں اپنے میں الجھائے رکھا مگر انہوں نے اپنے شوق کو جسمانی تسلی بھلے ہی نہیں دی تھی لیکن وہ حویلی میں اکھاڑا سجا کے روزان کا مقابلہ دیکھتے تھے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ترچ میر کی سفید چوٹی پر سورج کی نارنجی شعاعیں پھیل رہی تھیں۔کچھ پہلوان اکھاڑے میں ایک دوسرے پر داؤ مارنے میں مصروف تھے جب کہ کچھ پکی روش پر اپنے ڈھولوں اور پٹھوں کی کسرت کر رہے تھے۔

داجی تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔سفید دستار سر پہ سجی ہوئی تھی۔وہ حسبِ عادت حقے کی نال تھامے وہ مضرز ہر پی رہے تھے۔ان کی بیوی خرسندہ (khursanda) بیگم ان کے ساتھ موڑھے پر براجمان تھیں۔انہوں نے خالص چترالی لباس زیبِ تن کیا تھا۔سر پہ دلہن کی طرح چادر لی ہوئی تھی۔

ماتھے پر جھومر لٹک رہا تھا اور گردن میں سیاہ چاندنی کے لاتعداد ہار اور مالائیں پہنی ہوئی تھیں۔ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔وہ ذرا ترچھی ہو کر یوں بیٹھی تھیں کہ اکھاڑے کی طرف پشت تھی۔وہ قہوے کی پیالی اٹھائے دھیرے دھیرے گھونٹ بھر رہی تھیں۔ان کے پیچھے دو زنانہ اور دو مردانہ ملازم ادب سے ہاتھ باندھے،سر جھکائے کھڑے تھے جب کہ ملازماؤں نے گھونٹ نکالا ہوا تھا۔

داجی کے تخت کے پہلو میں ایک سات سال کی بچی غلیل سے کھیل رہی تھی۔وہ چھوٹے چھوٹے سخت اخروٹوں سے سامنے موجود پہلوان کا نشانہ لے رہی تھی جو موٹی سی لکڑی اٹھائے سر کے اوپر سے گھماتے ہوئے پٹھے کھینچ رہ تھا۔

اکھاڑے میں داجی کا دوسرا بیٹا نعیم اللہ بھی تھا۔وہ گھٹنوں تک آتی پتلون پہنے،پہلوان سے گتھم گتھا تھا۔پہلوان داؤ کی خوفناک آوازیں نکالے رہے تھے۔داجی بڑے غور سے ان کو دیکھ رہے تھے۔

''آج کلیم آنے والا ہے خان جی۔ پھر کیا سوچا آپ نے؟'' خرسندہ بیگم نے ان کو دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

''کس بارے میں؟'' وہ قدرے چونکے۔

''سرداری کے بارے میں خان جی۔ آپ کے سارے بیٹے جوان ہو چکے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ سرداری کی منتقلی کے بارے میں سوچیں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''سوچ تو لیا ہے میں نے۔ اب یہ سوچ رہا ہوں اس فیصلے کو عمل میں کیسے لاؤں؟'' وہ حقے کا دھواں چھوڑتے ہوئے پرسوچ انداز میں بولے۔ خرسندہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور بے تابی سے آگے ہوئیں۔

''کیا فیصلہ کیا ہے خان جی؟''

''خرسندہ! ہمارے چار بیٹے ہیں۔ یوسف تو سرداری کے لیے اہل نہیں۔ مجاہد چھوٹا ہے۔ رہے نعیم اور کلیم تو میں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرتے ہوئے تھوڑا ڈر رہا ہوں۔ نعیم بھی اچھی کھیتی باڑی جانتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ ذمہ دار ہے۔ چترال کے قبائل اس کی حکمت عملیوں کو پسند کرتے ہیں۔ جب کہ کلیم ایک پڑھا لکھا اور ذہین انسان ہے۔ اس کے پاس نئے تجربے اور نکور طریقے ہیں۔ اوپر سے اس کا میٹھا لہجہ اور نرم خُو۔ چترال کے قبیلے اس کے اخلاق سے بدرجہا متاثر ہیں اور اس کی حب الوطنی کو دی گئی ترجیحات کی بھی دل سے عزت کرتے ہیں۔ کلیم بھلے ہی عمر میں چھوٹا ہے لیکن دونوں بھائیوں میں بلا کی برابری ہے۔ دونوں کسی سے کم نہیں۔ اس لیے میں بہت الجھن کا شکار ہوں۔'' وہ فکرمندی سے بولے۔

نعیم اللہ اکھاڑے میں پہلوانوں کو دونوں شانے چت کر رہا تھا۔ اس کے پاس Muscle Power تھی۔ وہ اپنے مضبوط پٹھوں کو استعمال کرتے ہوئے مختلف چال چلتے اور مقابل کو گرا کر

بے بس کر دیتے۔

''خان جی! سرداری کے لیے آپ کو دونوں کو کڑا امتحان دینا ہوگا۔ جیسا کہ سرداری کا اصول ہے۔ ان دونوں میں سے جو اس امتحان کو پاس کرے گا، آپ سردار اسے چن لیجیے گا۔'' خرسندہ بیگم نے اپنے تئیں مشورہ دیا۔

اسی لمحے سات سال کی اس بچی نے اخروٹ کو چھوڑا تو وہ گولی کی طرح سرسراتا ہوا پہلوان کی پیٹھ میں جا کبھا۔ ایک کرب ناک چیخ اس کے منہ سے نکلی، ہاتھ میں موجود لکڑی قدموں میں جا گری اور وہ ہاتھ پشت پر لے جا کر کمر مسلنے لگا۔ وہ جلدی سے تخت کے نیچے ہو گئی۔ پہلوان تلملا کے پلٹا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''امتحان تو سرداری کا اصول ہے۔ میں تو اس لیے پریشان ہوں کہ دونوں کا امتحان کس چیز پر لوں جب دونوں ہی ہر چیز میں اپنی مثال آپ ہیں۔'' ان کی پیشانی پر گہری فکر کے آثار تھے۔

''دونوں بھلے ہی ہر چیز میں ماہر ہوں مگر خان جی..... ہمیں ان کی قابلیت ہر چیز میں نہیں چاہیے۔ ہمیں وہ دیکھنا ہے جو ایک سردار میں ہوتا ہے۔'' انہوں نے پیالی واپس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مثلاً؟'' انہوں نے ابرو سکیڑے۔

''رعب۔ فیصلہ سازی۔ سنجیدگی۔ رہنمائی، تحمل اور بردباری۔''

''ہوں۔'' انہوں نے پرسوچ انداز میں ہنکارہ بھرا اور حقہ گڑگڑانے لگے۔ اسی اثنا میں بچی نے تخت کے نیچے سینے کے بل بیٹھ کے غلیل سے پہلوان کا دوبارہ نشانہ لیا جو جھک کر اب لکڑی اٹھا رہا تھا۔ اس نے اب کی بار اس کی منڈی کا نشانہ باندھا۔ اس کی سیاہ رنگ کی گردن سے پسینہ پھسل پھسل کر کمر پر بہہ رہا تھا جس سے اسے کراہیت آ رہی تھی۔ اب تو وہ کراہیت ختم کر کے ہی دم لے گی۔

کچھ دیر گزری تھی کہ حویلی کا گیٹ کھلا اور ایک گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی اور تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ سب کی نگاہیں بے اختیار اس طرف اٹھیں۔ گاڑی کا اگلا دروازہ کھلا اور ایک سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ والا آدمی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں فائل تھی۔ وہ لان میں سجے اکھاڑے کو دیکھ کے مسکرایا۔ حویلی کے اندر جانے کی بجائے وہ سیدھا اکھاڑے کی طرف آ گیا۔ خرسندہ بیگم چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

''میرا بچہ آ گیا۔'' انہوں نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا۔ وہ مسکراتا ہوا، ان کے گلے جا لگا۔ خرسندہ کی آواز پر اکھاڑے میں موجود نعیم اللہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا مگر پھر سر جھٹک کر واپس پہلوانوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ (آ گیا منحوس)

وہ پیچھے ہوا۔ ماں کا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ چوما اور آنکھوں سے لگانے کے بعد نرمی سے چھوڑ دیا۔ ''کیسی ہیں آپ مور جان۔''

''میں اچھا ہے۔ تم سناؤ۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' مسکرا کے کہتا وہ باپ کی طرف پلٹا۔

''سلام داجی۔'' وہ ان کے آگے پورا جھک گیا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ پیچھے ہوا، دفعتاً اس کی نظر پیروں میں موجود حقے تک گئی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''داجی۔ منع کیا تھا ناں میں نے کہ آئندہ آپ حقہ نہیں پئیں گے؟'' انہوں نے دبی دبی برہمی سے انہیں دیکھا۔

''سردار ہوں۔ جان دے سکتا ہوں مگر حقہ نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولے پھر اسے جتانے کے لیے ایک لمبا کش لیا اور ہوا میں دھواں تحلیل کر دیا۔ مگر دھواں باہر آنے کی بجائے ان کے سینے میں دب گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بری طرح کھانسنے لگے۔ لمبے کش نے پھیپھڑوں کو چھیر دیا

تھا۔منہ پر ہاتھ رکھ کے سینے کے بل جھٹکے کھا رہے تھے۔خرسندہ اور کلیم انہیں بھنا کے دیکھ رہے تھے۔چند سیکنڈ بعد ان کی کھانسی رک گئی اور وہ معتدل ہو گئے۔

کلیم نے ان کا حقہ اٹھایا اور ملازم کو پکڑایا۔''اسے لے جاؤ اور دوبارہ ان کے سامنے مت لانا۔ اگر تم نے ایسی جرأت کی تو میں تمہارے گھٹنے توڑ دوں گا۔'' ملازم کو کڑی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ باپ کی طرف تیورا کے مڑا۔

''بابا جان! آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں ناں کہ آپ کو Emphysema (پھیپھڑوں کی بیماری) ہے۔کیوں کرتے ہیں اپنے ساتھ ایسا ظلم؟ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ سردار ہیں۔ آپ کو اپنی صحت کی پرواہ کرنی ہے۔اپنے پھیپھڑوں کا خیال رکھنا ہے۔یہ زہر نگل کر آپ کی روح کو کونسا سکون ملتا ہے؟ بتائیں مجھے؟'' وہ برہمی سے پوچھنے لگا۔

''مجھے لگا.....تم.....وکالت.....کو خیر باد.....کہہ کے.....آئے ہو.....'' انہوں نے ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے درمیان اس پر ٹونٹ کیا۔

''چھوڑ آیا ہوں میں وکالت۔فکر نہ کریں۔صرف اپنی صحت کو دیکھیں۔کیا حالت ہو گئی ہے آپ کی.....'' وہ بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔''مور جان۔آپ بھی خیال نہیں رکھتیں ان کا؟''

''مجھے بھی یہی جواب دیتے ہیں جو تم کو دیا ہے۔'' خرسندہ بیگم نے گلو خلاصی کی۔

بچی نے غلیل کو پیچھے کھینچا، نچلے لب کا کونا کاٹا اور چھناکے سے اخروٹ چھوڑ دیا۔وہ اب کی بار بھی سرسراتا ہوا پہلوان کی گدی میں جا لگا تھا۔وہ بے ساختہ آگے کو جھکا۔اخروٹ ٹھک کی آواز سے روش پر گر گیا۔بچی نے منہ پر ہاتھ رکھا اور کھلکھلانے لگی۔پہلوان اب کی بار تاؤ کھا گیا۔اس نے لکڑی نیچے پٹخی اور اسے ڈھونڈنے لگا۔تخت پہ بچھے پوش کے کنارے اتنے لمبے لمبے تھے کہ اس کے گرد ایک چکور کمرہ بن گیا تھا۔یہاں سے وہ کیا، کوئی بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔

''بابا جان! یہ زہر ہے۔ جسے آپ آبائی فخر اور غرور سمجھتے ہیں۔ یہ آپ کے پھیپھڑوں میں جا کے کینسر جیسا خطرناک مرض بناتا ہے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اتنی مشکل سے سانس لیتے ہیں آپ۔ ڈاکٹر نے بھی منع کیا ہے لیکن پھر بھی اپنا شوق اور نشہ آپ نہیں چھوڑ رہے۔'' وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

''ذرا دھیمے لہجے میں بات کرو۔ میں سردار ہوں۔'' انہوں نے جتایا۔

''مسٹر سردار! آپ پہلے میرے..... باپ..... ہیں۔ سمجھے آپ۔'' سپاٹ لہجے میں ان کو باور کرانے کے بعد انہوں نے میز سے پانی کا گلاس لیا۔ انہیں چند گھونٹ پلائے پھر گاؤ تکیے پر انہیں لٹا دیا۔ پانی پینے کے بعد وہ قدرے پرسکون ہو گئے تھے۔

''اب میں آ گیا ہوں۔ آئندہ آپ نے اس زہر کو ہاتھ لگایا تو میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔'' اس نے میز پر گلاس رکھ دیا۔

''اچھا تم بیٹھو۔ غصہ مت کرو۔ میں تمہارا لیے چائے نکالتا ہے۔'' خرسندہ بیگم نے بیٹے کو پرسکون کرتے ہوئے کہا۔

''میں غصہ نہیں کر رہا مور جان۔ میں ان کے لیے پریشان ہوں۔ یہ بات جو نہیں سنتے۔'' تشویش سے کہتے ہوئے باپ کے ساتھ پائنتی پر بیٹھ گئے۔ سرور خان نے ناک چڑھا کر سر جھٹکا۔ (پریشان۔ ہونہہ)

''اچھا چلو۔ آئندہ نہیں پئیں گے۔ تم بتاؤ۔ سفر کیسا رہا۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی۔'' وہ کیتلی سے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''نہیں مور جان۔ سب ٹھیک رہا۔'' اس نے چائے کی پیالی ان کے ہاتھ سے لے لی۔

''پشاور کا موسم کیسا تھا؟ یہاں تو ہر وقت بارش ہوتا رہتا ہے۔''

''اچھا تھا وہاں کا بھی۔ برسات کی وجہ سے زیادہ گرمی نہیں تھی۔'' انہوں نے چائے کا گھونٹ

بھرا۔ پہلوان تاحال بچی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اکھاڑے میں موجود نعیم اللہ نے دیکھ لیا کہ اس کا بھائی آیا ہے لیکن وہ جان بوجھ کے اکھاڑے سے باہر نہیں نکلا۔ اسے کوئی شوق نہیں تھا اس بھائی کا استقبال کرنے کا۔

''اچھا کیا تم آ گیا۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شکل بھی زرد ہو گئی ہے۔ میں یہاں اپنے ہاتھوں سے کھانے بنا بنا کر کھلاؤں گی ناں تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' خرسندہ مامتا سے کہہ رہی تھیں حالاں کہ وہ بالکل ٹھیک تھے۔ کلیم نے چائے کے چند گھونٹ بھرے اور سرور خان کو دیکھا جو دلچسپی سے اکھاڑے کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر بیس قدم دور اس میدان کو دیکھا جہاں مٹی ہی مٹی کا طوفان اڑایا جا رہا تھا۔ پہلوان پورے انہماک سے ایک دوسرے کو پچھاڑ رہے تھے۔

انہوں نے چائے کی پیالی رکھی۔ ''میں چلتا ہوں۔ جا کے کپڑے بدل لیتا ہوں۔ شام ہونے والی ہے۔ مینے بھی یاد کر رہی ہو گی۔''

''مینے تو ادھر ہی تھی..... ابھی.....'' خرسندہ بیگم نے انکشاف کیا پھر گردن گھما گھما کے یہاں وہاں دیکھنے لگیں۔ ''مینے..... مینے.....''

دادی کی آواز سن کے وہ جو تخت کے نیچے چھپی ہوئی تھی، پیٹھ کے بل کھسکی، پوش کا کونا اٹھایا۔ آگے کلیم کی دونوں ٹانگیں تھے۔ سیاہ بوٹ اور سیاہ پتلون دیکھ کے سٹپٹا گئی۔ (بابا آ گئے تھے) اس نے پیٹھ کے بل خود کو گھسیٹ کے کلیم کی ٹانگوں کے عین درمیان سے نکالا۔ کلیم نے بری طرح چونک کے نیچے دیکھا۔ وہ سر نکالے انہیں شرارت سے دیکھ رہی تھی۔

''مینے.....'' کلیم اس کی حرکت پہ غش کھا کے رہ گیا۔ ہاتھ نیچے کر کے اس کے دونوں بازو پکڑے اور اوپر کھینچا۔ وہ پھسلتی ہوئی جھٹکا کھا کے ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''نیچے کیا کر رہی تھی؟ میری باتیں سن رہی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ سر کو دائیں بائیں ہلانے لگی۔

''پھر؟'' دادی نے گھرکا۔اس نے معصومیت سے بازو آگے کیے۔بائیں ہاتھ کا چلوا خروٹوں سے بھرا تھا جب کہ دائیں ہاتھ میں غلیل تھی۔دونوں چیزوں کو دیکھ کے ان کے ماتھے پر بل پڑے۔

''پھر سے تم نے لڑکوں والی چیزیں اٹھائی ہیں کم عقل لڑکی۔'' انہوں نے تلملا کر اس کے ہاتھوں سے دونوں چیزیں لے لیں۔''کتنی مرتبہ تمہیں سمجھائیں کہ لڑکوں کی چیزوں کے ساتھ مت کھیلا کرو۔تمہیں ایک بات سمجھ میں آتی ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''نہیں.....اب آجائے گی.....'' انہوں نے اس کی دونوں چیزیں پوری قوت سے پیچھے پھینک دیں جو سیدھا اسی پہلوان کے قدموں میں جا گریں۔پہلوان نے جھک کر اپنے قدموں کو دیکھا جہاں غلیل اور اخروٹ آ گرے تھے۔

مینے نے برا سا منہ بنا کر باپ کو دیکھا۔کلیم اللہ نے گہری سانس لی اور اسے گلے لگا لیا۔

''کوئی بات نہیں میری جان۔تمہاری دادی ہیں۔صبر کرو۔'' وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اردو میں بولے۔سرور خان کا دھیان نہیں تھا۔وہ اکھاڑے کو ہی دیکھے جا رہے تھے شاید اس دھیان میں وہ اپنے نشے (حقے) کو بھول رہے تھے۔پہلوان نے غلیل اٹھائی اور اخروٹ چنے۔اب وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ ہتھیار کس کے ہیں۔بدھو کہیں کا۔

''آپ کی ماں..... بری ہے۔'' وہ منہ بنا کے تنفر سے بولی۔

''اونہوں.....'' انہوں نے اسے پیچھے کر کے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔''وہ تمہاری دادی ہیں۔تمہیں ہمیشہ ان کی عزت کرنی ہے اور ادب سے پیش آنا ہے۔سمجھیں؟''

''وہ ہمیشہ مجھے ٹوک دیتی ہیں۔کچھ مزے کا کرنے ہی نہیں دیتیں۔'' وہ بھنا رہی تھی۔

''تو آپ کو کس نے کہا ہے کہ ان کے سامنے یہ مزے مزے والے کام کریں۔ ہاں؟'' انہوں نے اس کے پھولے ہوئے گال پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر آپ کو غلیل چلانی ہی ہے تو کھیتوں میں، پچھلے لان میں یا پھر کھائی کے سرے پر چلائیں۔ دادی کے سامنے چلائیں گی تو وہ اسی طرح ٹوکیں گی۔''

''مگر کیوں..... غلیل چلا سکتی ہوں ناں میں.....'' وہ بری طرح خفا تھی۔

''ضرور چلاؤ۔ مگر دادی، دادا اور تایا کے سامنے نہیں۔ ٹھیک ہے میرا بچہ۔'' وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ''اچھا چلو..... ہم اندر چلتے ہیں۔ شام ہوگئی ہے۔ تمہارے لیے گفٹس لایا ہوں۔ ہم وہ دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے اسے ہلکا سا گدگداتے ہوئے گود میں اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگی۔

باپ کی گود میں وہ بے حد بری لگ رہی تھی۔ سات سال کی عمر میں اس کا قد اچھا خاصا لمبا ہو گیا تھا۔ کلیم اللہ اسے گود اٹھاتا تو وہ اس کی ٹانگیں ان کے گھٹنوں پہ لگتی تھیں۔ خرسندہ اور یوسف انہیں ٹوکتے تھے مگر وہ بیٹی کو سر آنکھوں پر بٹھانے سے باز نہیں آتے تھے۔

باپ کی گردن کے گرد بازو حمائل کر کے اس نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ جونہی وہ پہلوان کے سامنے سے گزارے، اس نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکے سے اس سے غلیل اچک لی اور تپانے والی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ پہلوان ہاتھوں کو دیکھتا رہ گیا۔ (لڑکی تھی یا بجلی؟)

''جانے کس زبان میں کٹر پٹر کرتے رہتے ہیں باپ بیٹی۔'' ان کے جانے کے بعد خرسندہ بیگم نے ناک سے مکھی جھلائی۔

☆.....☆.....☆

''اگر اس دنیا میں نالائقی، بدمعاشی، کام چوری، لڑائی اور نکمے پن پہ آسکر ملتا تو میری بات کان کھول کر سن لو ابتہاج خان..... تم..... ہر سال..... یہ ایوارڈ جیت کر آتے.....'' صحن میں یوسف

تایا بہت غصے میں اپنے بیٹے کو گھرک رہے تھے۔ وہ ہاتھ پہلو میں گرائے، گردن جھکا کے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ نعیم اللہ کا بیٹا غاذان کرسی پر براجمان تھا۔ وہ مزے سے اس کی بے عزتی انجوائے کر رہا تھا۔

''مگر بابا، میں نے پوری کوشش کی تھی۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

''کہاں ہے تمہاری کوشش؟ حویلی کے کس طاق میں رکھی ہے تم نے وہ کوشش؟ نکال کر لاؤ۔ دکھاؤ مجھے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں میرے بیٹے کی کوشش کیسی دکھتی ہے۔''

''وہ کوشش ہے بابا جان..... آپ کی بہو تھوڑے ہی.....'' وہ ہونٹ بسور کے بولا تو وہ تیورا کے پلٹے۔

''کیا کہا تم نے؟ دوبارہ کہو۔''

ابتہاج نے خرسندہ بیگم کی طرف دیکھا جو تخت پر بیٹھیں چائے پی رہی تھیں۔ ''دادی جان..... آپ کا بیٹا اونچا سننے لگا ہے۔ ان کے کانوں کا علاج کرائیں۔''

''کیا کہا تم نے؟'' یوسف بری طرح تیورایا۔

''دیکھ لیں۔ پھر پوچھ رہے ہیں کیا کہا۔ مجھے تو سیریس مسئلہ لگتا ہے۔ کوئی جراثیم وراثیم تو نہیں گھس گیا کانوں میں؟'' وہ کافی فکرمندی سے بولا۔ اگلے ہی لمحے یوسف خان نے ایک زوردار ڈنڈا اس کی ٹانگوں پر رسید کیا۔ اس نے کرب سے منہ میں ہوا پکڑ لی۔ (اف اف۔)

ثمینہ بیگم (ابتہاج کی ماں) راہداری میں کھڑی تھیں، اپنے بیٹے کو بے دردی سے پٹتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ مسفرہ (نعیم اللہ کی بیوی) ان کے شانے خوفزدہ کھڑی تھیں۔ کلیم کی بیوی البتہ کچن میں تھی۔ گل لالہ غاذان کی کرسی کے پیچھے کھڑی، ہاتھ میں لیا ''شیشر (چترالی بسکٹ)'' کھا رہی تھی۔ پوری حویلی کی خواتین لابیوں میں، کونوں، کھدروں سے جھانک جھانک کے صحن میں دیکھ

رہی تھیں۔

ابتہاج اور غاذان دونوں کزن تھے۔ جہاں غاذان بے انتہا پڑھتا تھا وہاں ابتہاج کتاب کو دیکھ کے راستہ الگ کر لیتا تھا۔ غاذان کو سکول، کتابوں اور تندرست سرگرمیاں کرنے کا شوق تھا جب کہ ابتہاج کو کڑی دھوپ میں ایون کے باغات میں گھس کر چڑیاں مارنے، دیگر قبیلے کے لڑکوں کو دھمکانے، ڈرانے، مارنے اور ہراساں کرنے کے علاوہ کسی چیز کا اشتیاق نہیں تھا۔ وہ سارا دن یا تو ایون میں مارا مارا پھرتا یا پھر کھائی کے سرے پر جا کر بندوق سے فائرنگ کرتا۔

یوسف خان سرور خان کے بڑے بیٹے تھے جن کا بایاں ہاتھ کہنی سے کٹا ہوا تھا۔ وہ اس معذور ہاتھ سے بھی زندگی کے تمام کام خود کرتے تھے۔ انہیں اس معذوری کے سبب کسی چیز کا غم نہیں تھا۔ وہ اس کمی پر بھی خوش تھے۔ انہوں نے ایم اے انگریزی کیا ہوا تھا۔ ہر شام کو وہ غاذان اور ابتہاج کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کے بقیہ مضامین کے لیے انہوں نے استاد رکھے تھے مگر چوں کہ ان کو خود انگریزی پر عبور حاصل تھا اس لیے وہ یہ فریضہ خود ہی سرانجام دیتے تھے۔ وہ دنوں فرماں برداری سے آجاتے تھے۔ غاذان پورے دھیان سے سبق پڑھتا تھا۔ تایا کے دیے ہوئے ٹیسٹ کی تیاری کرتا تھا جب کہ ابتہاج ایک کان سے سنتا، دوسرے سے نکال دیتا۔ ہر ٹیسٹ میں اس نے صفر نمبر لے رکھے تھے۔ یوسف خان اس کے مستقبل کو لے کر پریشان تھے۔

پے در پے پڑنے والے ڈنڈوں نے اسے ادھ موا بنا دیا تھا۔ اس کا حشر نشر بگاڑ کے وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہو گئے۔ مسلسل مارنے سے انہیں بری طرح سانس چڑھ گیا تھا۔

''اب بتاؤ۔ مجھے سنائی دیتا ہے یا نہیں؟'' وہ اسے للکارنے لگے۔

ابتہاج ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ یہ مارا، یہ ڈانٹ اور یہ صلواتیں وہ آئے روز سنتا تھا۔ اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ غاذان اب مزے کی بجائے الرٹ سے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گلِ لالہ کو پکڑ کے

اپنے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ انہماک سے بسکٹ کھائے جا رہی تھی۔ ثمینہ بیگم رو رہی تھیں۔ مسفرہ انہیں تسلی دے رہی تھی جب کہ خرسندہ بیگم پرسکون تھیں۔ انہوں نے کسی سولوشو کی طرح ابتہاج کی پٹائی دیکھی تھی۔

''کل یہ ٹیسٹ میں تم سے دوبارہ لوں گا اور اگلی بار.....'' وہ قریب آئے، اس کا منہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ ''اگلی بار تم نے زیرو نمبر لیے تو میں..... تمہاری..... پسلیاں..... گنتے..... ہوئے توڑوں گا۔'' انہوں نے چبا چبا کے کہا۔

ابتہاج کی آنکھوں میں ہزیمت اتری۔ اس نے یک ٹک باپ کو دیکھا جو اتنا مارنے کے بعد بھی پرسکون نہیں ہوا تھا۔ حالاں کہ خود سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں اپنی جگہ جم گئی تھیں۔

''میں دوبارہ ٹیسٹ نہیں دوں گا۔'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دوٹوک لہجے میں بولا۔

''ٹیسٹ نہیں دو گے۔ ٹیسٹ تمہارا باپ بھی دے گا۔ سمجھے تم۔''

''تو خود سے لے لیں۔ میں نہیں پڑھوں گا۔'' وہ چیخا۔

''آواز نیچی رکھو اپنی۔''

''نہیں رکھوں گا۔'' وہ رو پڑا۔ بے بسی سے۔ غاذان نے دکھ سے اسے دیکھا۔ وہ کہنیوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ ''میں کبھی پڑھائی نہیں کروں گا۔ مجھے نہیں پڑھنا۔ اس کو پڑھائیں۔ ان سب کو پڑھائیں۔ میں ایک لفظ نہیں پڑھوں گا۔''

''تم ضرور پڑھو گے۔'' وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھے۔

''لالہ۔'' کلیم کی آواز پر ان کے قدم تھم گئے۔ ''جانے دیں اسے۔ کچھ مت کہیں۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھومے۔ کلیم فوارے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے ثمینہ کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑی۔ (شکر کوئی تو بچانے آیا تھا۔)

''یہ ہر روز یہی تماشا کرتا ہے۔ میں کب تک برداشت کروں گا۔'' وہ ضبط سے کہہ رہے تھے۔

''جب تک آپ کر سکتے ہیں۔'' رکھائی سے کہتے وہ ان کے پاس سے گزر کر ابتہاج کے پاس چلے گئے جو کانپ رہا تھا۔ وہ بارہ سال کا لڑکا بہت کمزور تھا۔ کلیم اللہ نے اسے کرسی پر بٹھایا۔ ''جاؤ گل۔ پانی لاؤ۔''

انہوں نے بیٹی کو پانی لانے بھیجا۔ ابتہاج کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ غاذان ہمدردی سے اس کے قریب ہو گیا۔ کلیم پلٹ کے یوسف تک آیا اور ان کے ہاتھ سے ڈنڈا کھینچ کر پرے پھینک دیا۔

''مار کٹائی کسی چیز کا حل نہیں ہوتا بھائی صاحب۔ آپ بچے کو تشدد اور ہراسانی سکھا رہے ہیں۔ آج آپ اسے مار رہے ہیں۔ کل وہ کسی اور کو مارے گا۔ یہ بارہ سال کا بچہ آپ سے کیا سیکھ رہا ہے؟ گھر والے بچوں کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب آپ ہی اسے مارنا سکھائیں گے تو وہ کچھ اور کیا سیکھے گا؟''

''یہ پڑھتا کیوں نہیں ہے؟'' وہ برہم ہوئے۔

''کیوں کہ یہ پڑھنا نہیں چاہتا۔'' وہ سرد مہری سے بولے۔ ''اس عمر میں بچے کھیل کود چاہتے ہیں۔ موج مستی چاہتے ہیں۔ انہیں کتابیں نہیں اچھی لگتیں۔''

''غاذان تو ایسا نہیں ہے۔ وہ تو سارا دن پڑھتا ہے۔'' انہوں نے تیزی سے کہا۔

''ہاں۔ وہ پڑھتا ہے کیوں کہ کچھ بچے خود سے سمجھدار ہوتے ہیں اور کچھ کو ہمیں سمجھانا پڑتا ہے۔ اگر آپ ابتہاج کو پیار سے سمجھائیں گے تو وہ سمجھ جائے گا۔'' انہوں نے تحمل سے کہا۔

''میں نہیں پڑھوں گا۔'' ابتہاج بدلحاظی سے بولا۔

''دیکھا۔ سن لیا۔ یہی چلن ہیں اس کے۔ یہی ضد۔ یہی ہٹ دھرمی مجھے غصہ دلاتی ہے۔''

''او کے ٹھیک ہے۔ میں سمجھاتا ہوں اسے۔'' وہ رسان سے کہتے ہوئے پلٹے، اسی لمحے گل پانی

کا گلاس دونوں ہاتھوں میں دبائے ''شڑپ شڑپ'' کرتی ہوئی آرہی تھی۔ سارا پانی اس نے راستے میں گرادیا تھا۔ ایک آخری گھونٹ بچا تھا۔ اس نے بڑے ہی عاجزی سے باپ کی طرف گلاس بڑھایا۔ کلیم نے گلاس لے کر اس میں پانی کی مقدار دیکھی تو غش کھا کر رہ گیا۔ گل معصومیت سے پلکیں جھپکتی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے گہری سانس چھوڑی اور اس گلاس کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر وہ ایسے ہی ابتہاج کے قدموں میں پنجوں کے بل بیٹھ گئے اور اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ابتہاج کے گھٹنوں میں بھاری لرزہ تھا۔

''دیکھو ابتہاج۔ میں مانتا ہوں کہ پڑھائی بورنگ ہوتی ہے۔ دل بھرا دیتی ہے۔ غصہ آتا ہے اور دل کرتا ہے ان کتابوں کو پھاڑ دوں یا پھر جلا دوں۔ بس کسی طرح اس زحمت سے جان چھڑا لوں۔ تمہاری عمر میں بچے ایسا ہی سوچتے ہیں۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ تم اپنے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے کہ تمہارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ ہم تمہارے بڑے ہیں۔ ہماری عمر اور تجربہ دونوں تم سے زیادہ ہیں۔ تم اپنے مستقبل کے بارے میں بھلے ہی پریشان نہ ہو مگر ہم ہیں۔ ہمیں تمہارا ایک بہترین اور روشن مستقبل چاہیے۔'' وہ نرمی سے کہہ رہے تھے جب کہ ابتہاج ڈبڈباتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

یوسف خان نڈھال سے صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ ریشم بھاگ کے ان کے لیے پانی لانے لگی۔

''تمہارے بابا نے پڑھا ہے۔ میں نے پڑھا ہے۔ ہم سب پڑھ رہے ہیں۔ ایک اچھا اور کامیاب انسان بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پڑھا جائے۔ اچھی تعلیم حاصل کی جائے تاکہ شعور آجائے۔ اچھے اور برے کی پہچان ہو جائے۔''

''تعلیم اچھا انسان نہیں بناتی۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

کلیم مسکرائے۔ ''اچھا۔ پھر کیا بناتی ہے؟''

"تعلیم انسان کو چالاک کر دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ انسان کے پاس ڈھیر ساری معلومات ہوتی ہیں بس۔ اور کچھ نہیں ہوتا۔" وہ ناک چڑھا کر بولا۔

"معلومات ہونا بری بات ہے؟ ابتہاج؟"

"ہر کسی کو نہیں چاہیے ہوتیں معلومات۔"

"یہی زہریلی باتیں یہ منہ سے نکالتا ہے جس پر میرا پارہ چڑھ جاتا ہے۔" یوسف خان تیورا کے بولے۔

"بھائی صاحب۔ میں بات کر رہا ہوں ناں۔ مجھے کرنے دیجیے۔" کلیم نے نرمی سے مگر خشک لہجے میں انہیں پچکارا۔ انہوں نے سر جھٹک دیا۔ (تم سمجھاؤ گے اور یہ سمجھ جائے گا۔ میرا خون ہے۔ میں جانتا ہوں اسے۔)

"دیکھو ابتہاج۔ تعلیم کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے۔ اچھائی اور برائی کی تمیز۔ اگر تم....."

"اچھائی اور برائی کی تمیز ہے مجھے۔" اس نے درشتی سے ان کی بات کاٹی جس پر وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "مجھے پتہ ہے اچھا کیا ہے برا کیا ہے۔ کونسا کام کرنا چاہیے اور کونسا نہیں۔"

"یعنی تمہیں تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم بہت لائق ہو۔ تمہیں سب آتا ہے۔ اچھا کیا برا کیا ہے۔ تم سب جانتے ہو۔ ہم تمہیں پھر بھی پڑھائیں گے۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ "تم سکول جاؤ گے۔ پڑھو گے اور ایک اعلیٰ انسان بنو گے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ غرایا۔

"تم ضرور جاؤ گے ابتہاج۔ اگر تم نہیں گئے تو ہم تمہارا اس حویلی سے باہر نکلنا ہی بند کر دیں

گے۔تمہاری بندوق،تمہاری غلیل،تمہارا گھوڑا،تمہارے دوست۔ہر چیز کو تم سے دور کر دیں گے۔"

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" وہ بے چین ہو گیا۔

"ہم ایسا کریں گے۔ہم تمہیں ایک کمرے میں قید کر لیں گے اگر تم نے پڑھائی سے انکار کیا تو....."

"پڑھائی کو میں ہمیشہ انکار کروں گا چچا جان۔میں نہیں پڑھوں گا۔اگر آپ کو بہت شوق ہو رہا ہے تو اپنی بیٹی کو پڑھائیں۔میں مر جاؤں گا مگر پڑھائی نہیں کروں گا۔" وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔یوسف خان نے سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

"تم مستقبل کے سردار ہو ابتہاج۔اگر تم پڑھائی نہیں کرو گے تو سردار کبھی نہیں بن سکو گے۔" انہوں نے آخری داؤ دا غا۔

"مجھے نہیں بننا سردار۔اس (غاذان) کو بنا دیں۔" تلخی سے کہتا وہ ڈگمگاتے ہوئے باہر چلا گیا۔کلیم اللہ نے گہری سانس چھوڑ دی۔

کچھ بچے لاعلاج ہوتے ہیں۔وہ آپ کو زچ نہیں کرتے۔تباہ کر دیتے ہیں۔آپ انہیں سمجھائیں،دھمکائیں یا پھر لالچ دیں۔وہ کسی بھی طرح قابو میں نہیں آتے۔وہ ضدی،اڑیل اور بے تحاشا سرد ہوتے ہیں۔ان میں ذرا بھی لچک نہیں ہوتی۔ایسے بچے اپنا بچپن اور جوانی دونوں برباد کر دیتے ہیں۔جب تک ان کو سمجھ آتی ہے۔ان کی شخصیت تباہ و برباد ہو چکی ہوتی ہے۔ایسے بچے ماں باپ تک کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ اس وقت ابتہاج بات نہیں سنے گا۔وہ غصے میں تھا۔ہم دوسروں کی بات تب سمجھ سکتے ہیں جب ہم normal ہوتے ہیں۔ہمارے حواس،ہمارے جذبات اور ہماری دماغی حالت Stable ہوتی ہے۔ان تینوں میں سے اگر ایک بھی چیز غائب ہے تو ہم کبھی بھی دوسروں

کی بات نہیں سمجھ سکتے۔اس لیے انہوں نے ابتہاج کو جانے سے روکا نہیں تھا۔کچھ دِنوں میں اس کا غصہ ختم ہو جائے گا۔اس کی جسمانی تکلیف دور ہو جائے گی اور واپس نارمل ہو جائے۔پھر وہ جا کے اسے سمجھائیں گے۔

وہ گہری سانس لے کر مڑے تو پیچھے سیڑھیوں پر یوسف خان انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ثمینہ بیگم اٹھ کے ابتہاج کے پیچھے جا چکی تھیں۔مسفرہ البتہ ستون کے ساتھ سہمی سی کھڑی تھیں۔

''میں پھر سمجھاؤں گا۔بچہ ہے۔ابھی غصے میں تھا۔اس لیے ایسے کہہ گیا۔''انہوں نے مفاہمتی انداز میں کہا۔

''وہ میری اولاد ہے کلیم۔مجھے سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس قدر ہٹ دھرم ہے۔''وہ تھکے تھکے سے کھڑے ہو گئے۔''وہ نہیں پڑھے گا۔اس نے بول دیا ہے ناں۔اب وہ مر جائے گا مگر سکول نہیں جائے گا۔''

''بھائی صاحب، برا مت مانیے گا مگر.....''وہ کہتے کہتے رکے۔''آپ نے اسے متنفر کر دیا ہے۔اتنا کون مارتا ہے اپنے بچے کو۔''

''تمہاری ایک اولاد ہے۔وہ بھی نہایت فرماں بردار اور نیک۔تم اس سات سال کی بچی کو جو کہتے ہو وہ کر دیتی ہے۔میری اولاد ایسی نہیں ہے۔وہ سرکش ہے۔باغی ہے۔وہ ہر بات کا جواب اتنی رکھائی اور بے حیائی سے دیتی ہے کہ خون کھول دیتی ہے۔مجھے کوئی شوق نہیں ہے اسے مارنے کا۔وہ لڑکا۔مجبور کر دیتا ہے۔میرا صبر ختم ہو جاتا ہے اس کی بدزبانی کے آگے۔''

وہ اپنا غصہ تھوکتے وہاں سے چلے گئے۔ان کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔کلیم اللہ نے گہری سانس لی۔

اگر بیٹا اتنا ہٹ دھرم تھا تو باپ بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ہمارے بچے ہمارا عکس ہوتے ہیں۔ہم

جیسے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔وہ اپنی جوانی میں ویسا دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں۔بچپن کی عمر سیکھنے کی ہوتی ہے۔نشوونما پانے کی ہوتی ہے۔اس وقت سوچ میں لچک ہوتی ہے۔آپ بچوں کو کسی سمت موڑ سکتے ہیں لیکن جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ان کی لچک ختم ہوتی جاتی ہے۔ان کے اندر سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔پھر آپ انہیں جتنا سمجھاتے ہیں۔ان کا ردعمل اس سے بہت برا آتا ہے۔بچپن سے جو چیزیں انہوں نے اپنے خون میں ڈالی ہوتی ہیں۔اپنا دماغ،اپنا ضمیر جن چیزوں پر پالا ہوتا ہے۔وہ چیزیں بڑے ہو کر،جوان ہو کر ان کے اعمال میں آجاتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

وہ بیر کے درخت پہ چڑھ کے اونچی ٹہنی پر پیٹھ کے بل لیٹا تھا۔اس کے ہاتھ میں غلیل تھی اور جیب کنکریوں سے بھری ہوئی تھی۔نری دوپہر تھی۔حویلی کے لوگ سو رہے تھے۔چاروں طرف وادیوں میں مکمل سکوت تھا۔کسی جانور کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔وہ غلیل سے درخت پہ آنے والی چڑیوں کا نشانہ باندھ رہا تھا۔باپ سے لڑنے کے بعد یہ تیسرا دن تھا جب وہ سکول نہیں گیا تھا۔

وہ خوش تھا۔اس کا دوٹوک فیصلہ کامیاب ہوا تھا۔جان چھوٹ گئی تھی روکھی سوکھی کتابوں سے۔کچھ دیر میں غاذان بھی اسے ڈھونڈتا ہوا آگیا۔وہ قدم قدم چل کے درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا اور تنے کے گرد ہاتھ حمائل کر کے اوپر دیکھا جہاں وہ درخت کی سرسبز شاخوں میں کسی چیتے کی طرح چھپا ہوا تھا۔

''ابتہاج.....تم سکول کیوں نہیں جا رہے؟'' تیرہ سالہ غاذان سمجھ دار تھا۔اس لیے فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

''کیوں کہ مجھے سکول پسند نہیں۔'' وہ سرد مہری سے بولا۔

''تایا جان ناراض ہو جائیں گے۔ پورا ایون جاتا ہے سکول۔ سارے لڑکے آتے ہیں۔ صرف تم نہیں جاتے۔''

''دلاور، غفار، مدثر اور شفیق بھی نہیں جاتے۔ زیادہ جھوٹ مت بولو۔'' وہ جل کے بولا۔

''ہاں۔ کیوں یہ سارے تمہارے دوست ہیں۔'' اس نے چوٹ کی۔

''تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' وہ گردن گھما کے اسے دیکھنے لگا۔ غازان سکول کے یونیفارم میں تھا۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ ''تم جا رہے ہو ناں۔ یہی کافی ہے۔ پڑھ لکھ کر بن جانا بڑا فوجی افسر۔ مجھے نہیں پڑھنا۔''

''تمہیں پڑھائی اچھی نہیں لگتی ناں۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ جو جو تمہیں سمجھ نہیں آئے گا۔ وہ میں تمہیں سمجھا دوں گا۔'' وہ جیسے مذاکرات کر رہا تھا۔

''نہیں سمجھنا مجھے کچھ بھی۔ سمجھے تم۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''مگر تم میری مدد تو لے.....''

''یہاں سے جاؤ غازان ورنہ میں چڑیوں کی بجائے تمہارے سر کا نشانہ لے لوں گا۔'' اس نے غلیل کا رخ اس کی طرف کیا۔ اس سے بعید نہیں تھی کہ وہ ایسا کر بھی دے۔ وہ یہ چھوٹی چھوٹی کنکریاں دریائے چترال کے کناروں سے باقاعدہ ڈھونڈ کے لاتا تھا۔ اس کا نشانہ اچھا تھا۔ وہ اتنی سختی سے پتھر مارتا تھا کہ دماغ گھوم جاتا تھا۔ غازان اس سے پنگا نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اس پر لعنت بھیج کر وہاں سے چلا گیا۔

''میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ ہونہہ۔ آیا بڑا۔'' وہ نخوت سے کہتے ہوئے واپس کھیلنے لگ گیا۔

☆.....☆.....☆

اصطبل کے اندر سرور خان نے شندور پولو کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک بڑا سا پولو گراؤنڈ بنایا تھا

جہاں چترال کی پولو ٹیم سالہا سال مشقیں کرتی تھی۔ یہ اصطبل حویلی سے دور، دریائے چترال کے کنارے ہموار جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں پورے پاکستان سے بیش قیمت، اعلیٰ نسل اور خوبصورت گھوڑے منگوائے گئے تھے۔ یہ گھوڑے سردار کی اپنی ملکیت تھے لیکن اس پر سواری پورا چترال کرتا تھا۔ سرور خان نے کسی کو گھوڑوں پر سوار ہونے یا گھڑ سواری کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا اصطبل ہر روز لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔

وہ خود بھی پہلوانی کی طرح پولو کے بھی شوقین تھے اور جب مقابلہ گلگت اور چترال کے مابین ہوتا تو وہ ان کی خوشی کی انتہا دیدنی ہوتی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار اصطبل آتے تھے اور باقاعدگی سے کھلاڑیوں کی مشقوں کا جائزہ لیتے تھے۔ ان کے دونوں سپوت نعیم اور کلیم چترال پولو ٹیم میں تھے اور پچھلے چھ سال سے باقاعدگی سے پولو کھیل رہے تھے۔ مجاہد کو بھی گھڑ سواری کا شوق تھا مگر ابھی وہ پڑھ رہا تھا۔ یوسف خان اپنے ہاتھ کے سبب پولو نہیں کھیل سکتے تھے۔ وہ گھڑ سواری بھی بہت مشکل سے کرتے تھے۔

شندور پولو فیسٹیول قریب آ رہا تھا۔ پندرہ دن رہ گئے تھے۔ میلے کی ساری تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ سرور خان آج اصطبل کا دورہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مقامی سلیکشن کمیٹی کے ساتھ مل کر کھلاڑیوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا تھا۔ چوں کہ یہ مقابلہ بلتیوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ کسی بھی قیمت پر شکست کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ بلتیوں کی طرف بھی سرداری تھی اور کھوواریوں کی طرف بھی سرداری تھی۔ یہ مقابلہ محض پولو کا نہیں ہوتا تھا۔ یہ مقابلہ دونوں بڑی طاقتوں کی پیمائش کا ہوتا تھا۔ جہاں ان کے پاس پورا چترال تھا اور طاقت و پیسے کی ریل پیل تھی، وہ کیوں کر خود کو شکست سے دوچار کر سکتے تھے؟ جب طاقت، پیسہ اور پوزیشن ہو تو ہار بری نہیں لگتی، ہار..... گھٹیا لگتی ہے۔ چیپ..... انتہائی..... چیپ.....

میدان میں پولو کی ٹیم کے لڑکے پوری سنجیدگی اور انہماک سے پولو کھیل رہے تھے۔ گھوڑوں کے پیروں تلے دھول اڑ رہی تھی۔ عجیب سی دھڑ دھراہٹ تھی جو سارے میں گونج رہی تھی۔ وہ لان کے قطعے پر کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ کے نیچے چھڑی دبی تھی اور سر پر دستار سجی ہوئی تھی۔ ان کے دو ملازم ان کے پیچھے کھڑے تھے اور ان کے دائیں بائیں کمیٹی کے ممبران تھے جن کا تعلق چترال سے ہی تھا۔ پیچھے کھڑے ملازم نے ہاتھ بڑھا کر چھتری ان پر تھامی ہوئی تھی۔ آج سورج نکلا ہوا تھا تو دھوپ چبھ رہی تھی۔

اصطبل میں گھڑ سواروں کا رش تھا۔ کچھ مقامی شائقین بھی میچ دیکھنے آئے تھے۔ جا بجا اس عرشے میں لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ سرور خان بھنوؤں پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر کلیم کو دیکھ رہے تھے جو اپنی بلوری پر بیٹھا کسی دیومالائی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سیاہ بلوری ایک اعلیٰ نسل کی چکنی اور اونچے قد کاٹھ کی گھوڑی تھی۔

دو سال پہلے کلیم اسے کسی خانہ بدوش سے خرید کر لایا تھا۔ دراصل خانہ بدوش کے پاس اس کا نر بھی موجود تھا۔ چوں کہ وہ ہر وقت سفر میں ہوتے ہیں، اس لیے کسی پڑاؤ میں اس خوبصورت گھوڑے نے کچھ زہریلا نگل لیا۔ اس پڑاؤ سے اگلے پڑاؤ تک وہ مر چکا تھا۔ اسے راستے میں چھوڑ کر وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ نر کی غیر موجودگی میں حاملہ مادہ زیادہ عرصے تک معتدل نہیں رہ پائے گی۔ مادہ ایک دو ہفتے تک کھانے میں سستی دکھاتی رہی پھر اس نے چلنا چھوڑ دیا۔ وہ جانوروں کے ساتھ چرنے کے لیے جانے سے گریز کرنے لگی۔ اس کی خراب طبیعت اور اس کا ڈپریسڈ انداز دیکھ کر خانہ بدوش کو لگا کہ وہ بھی مرنے والی ہے۔ گھوڑا حلال جانور تو ہے نہیں کہ اسے ذبح کر کے کھا لیا جائے۔ جب یہ بیمار ہوتا ہے تو جانی نہیں، صرف مالی نقصان ہوتا ہے۔ خانہ بدوش کو بھی یہ گھاٹا سوگوار گزرا۔ اسی سے وہ چلتے چلتے کالاش کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔ ان دنوں

کالاش میں کلیم اللہ شاہ سردار کے لیے کچھ ضروری کام کروا رہا تھا۔

خانہ بدوش کے پاس سسکتی بلکتی گھوڑی دیکھی تو اس پر فریفتہ ہو گئے۔ ویسے بھی ان کو گھوڑوں کا بدرجہا شوق تھا۔ انہوں نے اچھی قیمت پر گھوڑی کو خرید لیا۔ سوداگر نے گھوڑی کی خراب حالت اور بیمار طبیعت کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا تھا مگر انہوں نے قطعاً اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ علاج کر کے اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔ وہ گھوڑی کی خوبصورتی پر اس کی بیماری کو فوقیت دے کر اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے اور ویسے بھی وہ حاملہ تھی۔ اگر وہ نہ بھی بچی تو اس کا بچہ بچ سکتا تھا۔ سوداگر کو فکر تھی کہ گھوڑی کو حاملہ ہوئے ایک مہینہ ہی ہوا تھا۔ بچہ جننے تک وہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔ اس لیے اس نے دوران سفر اس ان دیکھے بوجھ سے جان چھڑا لی۔ کلیم گھوڑی کو اصطبل لایا اور ایک بہترین ویٹرنری ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا۔

گھوڑی کو ڈیپریشن ہوا تھا۔ (ہاں۔ جانوروں کو بھی ڈپریشن ہوتا ہے)۔ یہ ڈپریشن اس کے تنہا رہ جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اصطبل میں آنے کے بعد اس کا باقی گھوڑوں سے رابطہ ہوا۔ کچھ ڈاکٹر نے ٹوٹکے آزمائے۔ اس پر محنت کی۔ جسکے بعد وہ ٹھیک ہو گئی اور اس نے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کلیم نے اس کا نام ''بلوری'' رکھا جس کا مطلب ہوتا ہے ''کانچ''۔ کانچ یعنی نازک اور بے حد حسین۔ قریباً دس ماہ بعد اس نے بچہ جن لیا۔ بچہ نر تھا۔ یہ نر اپنے قد کاٹھ اور خوبصورتی میں ماں پر گیا تھا۔ اس کے اندر کی سنجیدگی اور اس کے اندر کا غرور لافانی تھا۔

کلیم نے وہ گلِ لالہ کو دے دیا۔ گلِ لالہ ان دنوں ایران کے بادشاہ رستم کی کہانیاں پڑھ رہی تھی۔ اس نے اس چھوٹے گھوڑے کا نام ''رستم'' رکھ دیا۔ رستم اب گلِ لالہ کا تھا۔

جب کلیم اصطبل آتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ آتی تھی۔ کلیم اسے رستم کی سواری کراتا

تھا۔ چوں کہ رستم خود بھی چھوٹا تھا اس لیے وہ گل لالہ کی سواری کے لیے مناسب تھے۔ باقی سارے گھوڑے گل کے قد اور ''قابو'' سے باہر تھے۔

آج بھی وہ آئی تھی۔ میدان سے ہٹ کر لان کے قطعے پر رستم پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہیں وہ گر نہ جائے اس احتیاط کے سبب مہابت خان (ملازم) اس کے ساتھ تھا۔ وہ گھوڑے پر کسی ننھی شہزادی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ رستم نے پیدائش کے بعد اپنی پیٹھ پر انسانی شکل میں صرف ایک لمس محسوس کیا تھا اور وہ لمس گلِ لالہ کا تھا۔ جس قدر وہ خونخوار اور ضدی گھوڑا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ گل کے علاوہ یہ لمس کسی کو محسوس کرنے نہ دیتا۔ خود اس کی ماں بھی بڑی مشکل سے کلیم اللہ پر راضی ہوئی تھی۔ وہ اپنے سوداگر کی تمازت نہیں بھول پا رہی تھی۔ رستم کی پیدائش تک دس مہینے کلیم اللہ نے اس کی خدمت کی تھی۔ وہ ان کو خود پر بیٹھنے کی اجازت دے کر یہ احسان اتار رہی تھی۔

آخری راؤنڈ ہو گیا تو کھلاڑی میدان ہی میں گھوڑے روک کر دھپ دھپ اتر گئے سوائے کلیم کے وہ سب گھوڑوں کو مرصع لگاموں سے تھامے ستانے کے لیے پیدل چلنے لگے۔ کلیم بلوری کو بھگا کر سرور خان تک آیا۔ لگام کھینچ کر اس نے بلوری کو روکا اور پھر مسکراتا ہوا نیچے آیا۔ سرور خان کے چہرے پر عتاب پھیلا ہوا تھا۔ وہ سر سے ہیلمٹ اتار کر ان کی طرف آئے تو سرور خان کی آنکھوں کی پتلیاں ہل رہی تھیں۔

''ونڈر فل کلیم..... زبردست.....'' کمیٹی کے سربراہ نے تحسین بھرے انداز میں کہا۔ وہ مسکرایا۔

''شکریہ سر۔''

''تم نے کمال کر دیا ہے۔ اس بار اسی طرح کھیلے تو بلتی ہم سے نہیں جیت پائیں گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' وہ تمام ممبران سے ہاتھ ملاتا ہوا جا رہا تھا۔ سرور خان کے سامنے رک کر اس نے خود کو جھکایا۔ انہوں نے نرمی سے اس کا شانہ تھپک دیا مگر ان کا غصہ برقرار تھا۔ کلیم ان کے سوبر

تاثرات دیکھ کے چونک گیا۔

''کیا ہوا بابا جان۔آپ کو کارکردگی اچھی نہیں لگی کیا؟'' وہ یکدم پریشان ہو گیا۔

''وہ پھر نہیں آیا؟'' انہوں نے نعیم اللہ کے بابت پوچھا۔کلیم نے گہری سانس نکالی۔

''نہیں۔''

''یہ .....اور.....اس.....کی.....غیر.....سنجیدگیاں.....'' وہ دانت پیستے ہوئے بولے۔ شدت جذبات سے چھڑی پہ رکھا ہاتھ تھرتھرایا۔

''خفا نہ ہوں بابا جان۔وہ مصروف ہوگا۔آجائے گا۔'' اس نے قریب آ کے ان کا کندھا تھام لیا۔

''آج کارکردگی کا میچ تھا۔اس کے علاوہ اسے کونسا ایسا ضروری کام پڑ گیا کہ وہ نہیں آیا؟'' وہ بہت برہمی سے پوچھ رہے تھے۔

''میں پوچھتا ہوں ملازموں سے.....'' انہوں نے دلاسا دیا مگر اسی لمحے وہ اصطبل کے گیٹ سے اندر آتا ہوا دکھائی دیا۔ٹیم کا یونیفارم پہنے،سر پہ ہیلمٹ رکھ رہا تھا۔کھلاڑیوں کو میدان سے واپس جاتا دیکھ کے وہ چلتے چلتے رک گیا پھر دھیرے سے ہیلمٹ واپس اتارا اور یہاں وہاں نا سمجھی سے دیکھا۔

سرور خان ضبط سے اسے دیکھ رہے تھے۔باپ کو میدان میں دیکھ کے اس کے پیروں تلے سرنگ پھٹ گئی۔یعنی اب عزت افزائی ہونے والی تھی۔سرور خان نے اپنی سرداری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گھٹنے توڑنے تھے۔وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتے ہوئے ان کے پاس آیا اور مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں تھے تم اب تک؟'' سرور خان دھاڑے۔''تمہیں پتہ تھا ناں کہ میچ ہے پھر کیوں اتنا

لیٹ ہو گئے؟ میں سردار تمہارے لیے دھوپ میں کئی گھنٹوں تک انتظار کروں گا کہ کب موصوف کی نیندیں پوری ہوں اور وہ خود کو زحمت دیتے ہوئے یہاں پہنچے۔ مجھے خود کا ملازم سمجھتے ہو۔ کمیٹی کو کیا سمجھا ہوا ہے؟ یہ ہر روز آ کر تمہارا کام دیکھیں گے۔ ان کو خود کوئی اور کام نہیں ہے۔ زرخرید ملازم ہیں یہ سارے.....؟''

وہ سر جھکائے لب دبا رہے تھے۔ سرور خان کا غصہ ان کے پورے خاندان کو وراثت میں ملا ہوا تھا۔

''بابا جان غصہ مت کریں۔ جانے دیں۔'' کلیم نے مصلحت سے کہا۔

''کیوں جانے دوں۔ اس نے پولو نہیں کھیلنا؟ تیاری ہے اس کی۔ بتاؤ مجھے؟'' انہوں نے تیزی سے کمیٹی کے ممبران سے پوچھا۔

''جی سرداران کی تیاری ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں مگر یہ.....'' وہ کہتے کہتے رکے۔ نعیم نے بدمزگی سے سر اٹھایا۔

''مگر کیا؟''

''یہ تھوڑی لاپرواہی کرتے ہیں مشقوں میں۔ سب کھلاڑی آ جاتے ہیں اور یہ نہیں آتے۔'' انہوں نے باپ کو دیکھ کر شیر بنتے ہوئے نعیم کی شکایت لگائی۔ حالاں کہ سردار کی غیر موجودگی میں وہ نعیم کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتے تھے۔ بہر حال وہ کمیٹی سے تھے۔ ان پر ٹیم کی کارکردگی کا پریشر تھا۔ آج ان کا کوئی کھلاڑی یوں غیر سنجیدگی دکھائے گا تو کل خمیازہ پوری ٹیم کو بھگتنا پڑے گا۔

''اس کی لاپرواہی میں دور کرتا ہوں.....'' وہ جارحانہ انداز میں کہتے ہوئے مڑے۔ نعیم کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ وہ پلٹ کے مہابت خان کو دیکھ رہے تھے جو گل کو لگام پکڑنا سکھا رہا تھا۔

''مہابت خان.....'' انہوں نے غرا کے آواز دی۔ مہابت خان نے آواز سنی تو بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''جلدی یہاں آؤ۔''

وہ گل کو چھوڑ کر سٹپٹاتے ہوئے بھاگ کر اس طرف آیا۔

''جی خان جی۔''

''آج شام تک نعیم اللہ پولو کھیلے گا اور تم اس بات کا پورا خیال رکھو گے کہ وہ سورج غروب ہونے سے قبل میدان سے باہر نہ آئے۔'' انہوں نے بے لچک لہجے میں حکم دیا تھا۔ نعیم کا منہ کھل گیا۔ پورا دن۔ گرمیوں کا پورا دن۔ اف خدایا۔

''جی خان جی.....'' مہابت خان نے تابعداری سے سر کو خم دیا۔ انہوں نے دھواں دھواں کھڑے بیٹے کو دیکھا پھر اس پر ایک زہریلی نظر ڈال کے آگے بڑھ گئے۔ نعیم نے اپنی جگہ جم کر میدان کو دیکھا جہاں سے سارے کھلاڑی جا چکے تھے۔ صرف گل اور رستم تھے۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس نکال کر کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے بیڈ پر براجمان تھے۔ خرسندہ بیگم ان کے ساتھ پائنتی پر بیٹھی ان کو تشویش سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے یوسف خان کو بلایا تھا۔ وہ کچھ ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بڑی بہو ثمینہ بیگم ان کو دوا دے رہی تھیں۔ وہ ذرا آگے کو ہو کے ہتھیلی پہ رکھی جانے والی ایک ایک گولی کو دھیرے دھیرے نگل رہے تھے۔

یوسف خان ایک طرف صوفے پر براجمان تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔

دوا کھانے کے بعد وہ پیچھے ہو گئے اور ذرا سکون سے ٹیک لگا لی۔ خرسندہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر ان کو لحاف سینے تک اوڑھا دیا۔ بہو بیگم گلاس پکڑے پکڑے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

''تم جانتے ہو یوسف، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔'' انہوں نے ڈوبتی سانسوں کے درمیان کہا۔ یوسف نے سر کو خم دیا۔ ''تم سے اور چترال سے میری حالت چھپی ہوئی نہیں ہے۔ سب

جانتے ہیں کہ سردار اب بے تحاشا بیمار رہنے لگا ہے۔ کبھی بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ چوں کہ ہر بادشاہ اپنے جیتے جی اپنا ولی عہد نامزد کرتا ہے۔ اس لیے میں سردار ہونے کے ناطے اپنی موجودگی میں یہ دستار (میز کی طرف اشارہ کیا) اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کو منتقل کرنا چاہتا ہوں۔"

بہو بیگم نے دبے دبے جوش سے شوہر کا چہرہ دیکھا جہاں خوشی کا جوش کا شائبہ نہیں تھا۔ وہ باپ کی بات سنجیدگی سے سن رہے تھے۔

"یوسف....." انہوں نے توقف کیا۔ "بلاشبہ تم ایک ہوشیار اور سمجھدار انسان ہو۔ تمہارے اندر ایک سردار بننے کی تمام قابلیت موجود ہے۔ تم میرے بڑے بیٹے ہو۔ تمہیں یہ اعزاز دینا میرے لیے قابلِ ستائش ہوگا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اس ذمہ داری کو پوری ایمانداری سے نبھاؤ گے....."

"بابا جان! خدا کے لیے یہ مت کہیے گا کہ آپ نے مجھے چنا ہے۔ میں سرداری (ایک تکلیف دہ سانس لی) نہیں نبھا سکتا۔ یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔ مجھے یہ مت دیجیے گا۔ پلیز۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب مت دیجیے گا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" بہو بیگم نے دبے دبے غصے سے انہیں دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ثمینہ۔ میں سرداری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میرے کندھے اس لائق نہیں ہیں۔ میں نے بابا جان کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اتنا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے کہ میں یہ بوجھ اٹھا سکوں۔" وہ جیسے بری طرح گھبرا گئے تھے۔

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ سرداری اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ بڑے بیٹے ہیں تو آپ ہی کو....."

''نہیں بہو۔'' سرور خان نے ان کی خوش فہمیوں پر پانی پھیر دیا۔ ''یوسف جسمانی طور پر سرداری کے لیے اہل نہیں ہے۔'' انہوں نے ڈھکے لفظوں میں ان کے کٹے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جو کہنی سے آگے نہیں تھا۔ بہو بیگم کے چہرے پر کرب سا گزر گیا۔

''ایک سردار جسمانی طور پر مکمل ہونا چاہیے تا کہ وہ کل آنے والے برے حالات کا سامنا کر سکے۔ کل کو تمہیں اوزار بھی تھامنے پڑیں گے اور بندوقیں بھی چلانے پڑیں گی۔ تم سے لوگ ملنے بھی آئیں گے اور تمہیں لے کر بھی جائیں گے۔ تمہاری یہ کمی، کل کو تمہیں رسوا کر دے گی۔ ایک سردار ہونے کے ناطے تم اپنا رعب، اپنا غرور بنا نہیں پاؤ گے۔ تمہارا اعتماد ڈگمگا تا رہے گا۔ چترال اتنا بے معنی نہیں ہے کہ میں تمہارے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے وہ تمہیں سونپ دوں۔''

بہو بیگم نے گلاس میز پہ پٹخا اور پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ ان کا طنطنہ دیکھ کے یوسف نے سر جھکا دیا۔ خرسندہ بیگم کے چہرے پر بھی اداسی چھا گئی۔

''بابا جان! میں سمجھ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے خود دستبرداری دی ہے۔''

''تم ایک ہوشیار اور سمجھدار انسان ہو۔'' انہوں نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا نہیں سکے۔

''تمہارے باقی دونوں بھائی سرداری کی مکمل اہلیت رکھتے ہیں۔ مجاہد ابھی چھوٹا ہے۔ کم عمر ہے میں اسے اس جھنجھٹ میں نہیں دھکیلنا چاہتا۔ میری عمر اب تمام ہو رہی ہے۔ کبھی ایک بیماری ہوتی ہے تو کبھی دوسری۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ میں اس دنیا سے چلا جاؤں اور میرے بچے ایک دوسرے کو سرداری کے لیے کاٹ دیں۔ میں خود ہی اس کا فیصلہ کر لیتا ہوں۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔

''خان جی..... دونوں سردار نہیں بن سکتے۔'' خرسندہ نے انکشاف کیا۔

''جانتا ہوں۔ میں دونوں کو بنا بھی نہیں رہا۔ میں صرف ایک کو بناؤں گا۔''

''کس کو؟'' بیگم نے بڑی تیزی سے پوچھا تھا۔

''روئے چترال پر ایسا کوئی مقابلہ نہیں ہے جو دونوں کے مابین میں کروا کر ان کی کارکردگی کی پڑتال کروں۔ میں جو بھی شرط رکھوں گا۔ وہ دونوں ہی اسے جیت جائیں گے۔'' انہوں نے گہری سانس لی اور سوچ میں پڑ گئے۔ یوسف نے ماں کو دیکھا پھر باپ کو۔ کیا وہ خود سے ہی کسی ایک کا فیصلہ کرنے والے تھے؟ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ نعیم اور کلیم دونوں بہت کمال تھے۔ دونوں میں سردار بننے کی اہلیت تھی۔ ان کو غیر جانبدار ہو کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ یوسف نے دل میں سوچا۔

''دونوں صرف ایک نہج پر مجھے اپنی قابلیت دکھا سکتے ہیں۔'' وہ سوچ چکے تھے۔

یوسف بے چینی سے آگے ہوا۔

''کس نہج پر دا جی؟''

''سردار ہو یا وزیر اعظم۔ نمبردار ہو یا نظام۔ کبھی اکیلا کام نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنی کابینہ یعنی اپنی ٹیم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ میرے دونوں بیٹے انفرادی طور پر بہت مستحکم اور بہت قابل ہیں۔ اگر میں نے ان کا الگ الگ امتحان لیا وہ تو سو فیصد کامیاب ہوں گے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں دونوں کی طاقت انفرادی نہیں، اجتماعی طور پر ناپوں گا۔ میں انہیں ایک ٹیم کے ساتھ کڑی آزمائش سے گزاروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ اپنی کابینہ کے ساتھ کس قدر مفاہمت کرتے ہیں اور ایک گروہ میں کیسے کام کرتے ہیں۔'' وہ رسانیت سے بولے۔

''مگر خان جی آپ ٹیم کس لیے بنائیں گے اور کیا کروائیں گے ان دونوں سے؟'' خرسندہ بیگم کو فکر ہوئی۔

''میں دونوں کو شاندور کی سرزمین پر آزماؤں گا۔'' (چترالی شندور کو محبت سے شاندور کہتے ہیں۔)

''شاندور؟''

''میں دونوں کو الگ الگ ٹیم کا کپتان بناؤں گا۔کلیم کو چترالی ٹیم کا اور نعیم کو بلتی ٹیم کا۔پھر میں دیکھوں گا کہ ایک دوسرے کے مخالف آ کر وہ دونوں اپنی ٹیم کو کس سمت لے کر جاتے ہیں۔جس نے اپنی ٹیم کے ساتھ بہترین روابط اور مستحکم معاونت کی ہوگی۔اس کی ٹیم خود بخود جیت جائے گی اور سردار کا فیصلہ اہلِ چترال و بلتستان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔''

کہتے کہتے وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔یوسف خان نے ستائش سے اپنے باپ کو دیکھا جنہوں نے کمال کا دماغ لگایا تھا۔وہ ان کی ذہانت اور تدبر سے متاثر ہوئے تھے۔

''اچھا فیصلہ کیا ہے خان جی۔دونوں پولو کھیلتے ہیں۔بغیر کسی بڑی آزمائش کے خود بخود اپنا عہدہ طے کر لیں گے۔'' بیگم نے پذیرائی کرتے ہوئے کہا۔وہ مسکرا دیے۔

''میرا امتحان یہ نہیں تھا کہ سردار کیسا ہوگا۔میرا امتحان یہ ہے کہ دونوں میں سے کونسا ہوگا۔''

''بے فکر ہو جائیں داجی۔آپ نے ایک بہترین فیصلہ لیا ہے۔اس سے دونوں کی اہلیت سامنے آ جائے گی۔'' یوسف خان نے سراہا۔

''یقیناً۔'' انہوں نے ایک پرسکون سانس لی۔

دروازے سے کان لگا کر کھڑی بہو بیگم نے ہاتھ اٹھائے۔

''یا اللہ! تو نے میرے شوہر کو سب دیا ہے۔ذہانت، قابلیت اور طاقت بھی۔پھر یہ ہاتھ کیوں چھین لیا۔کیوں اسے اپاہج کر دیا۔یا اللہ، میری بددعا ہے داجی کو اپنے دونوں بیٹوں پر جس قدر غرور ہے ان کا غرور خاک میں مل جائے۔میرا شوہر سردار نہیں بن سکا تو ان دونوں میں سے بھی کوئی نہ بنے۔''

اپنی کالی زبان سے دی گئی بددعا بھلا آسمان پر ''آمین'' کے ساتھ کیسے نہ سنی جاتی۔

☆.....☆.....☆

نعیم کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ سرور خان نے پولو جیتنے کی شرط رکھی ہے۔اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔تو بابا نے یقینی طور پر کلیم کو چن لیا تھا جب ہی انہوں نے پولو کی شرط رکھی وگرنہ وہ کوئی اور شرط بھی رکھ سکتے تھے۔محض اس لیے کہ وہ پولو کھیلتے وقت لاپرواہی کرتا ہے۔اس کے بابا اس کے ساتھ ایسا سلوک کررہے تھے۔ان کے دل میں سرور خان کے لیے ایک باقاعدہ نفرت پیدا ہوگئی۔وہ سمجھنے لگا کہ اس کے بابا نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیوں کہ وہ بہرحال اپنے وکیل بیٹے سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔اس بغض اور کینہ کے سبب اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے والد کو غلط ثابت کرنے اور اپنے بھائی کو ہرانے کے لیے اصطبل میں مشقیں شروع کردیں۔شندور میں دس دن رہ گئے تھے۔اس کے پاس وقت نہیں تھا۔وہ سارا دن ساری رات مختلف گھوڑوں پر مشقیں کرنے لگا۔کلیم اسے یوں انتھک محنت کرتا دیکھ کے منع کرتا تھا۔وہ خود کو مقابلے سے پہلے تھکا رہا تھا۔کھلاڑی کا مقابلے سے پہلے تھک جانا اسے ستر فیصد ہرا دیتا ہے۔

مگر نعیم کو لگا جیسے کلیم اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے اسے محنت سے روک رہا ہے تاکہ وہ مشقیں نہ کرسکے اور اس کی ٹیم ہار جائے۔یوں سرداری اس کو مل جائے گی۔وہ کسی بھی حالت میں کلیم کو سرداری نہیں دے سکتا تھا۔گلگت کی ٹیم نے شندور سے دو دن پہلے آنا تھا مگر اپنی ٹیم کی حکمت عملیاں مستحکم بنانے کے لیے اس نے بلتی ٹیم کو دس دن پہلے بلا لیا تھا۔ٹیم اصطبل پہنچ گئی تھی۔وہ سارا دن اپنی ٹیم کو مختلف داؤ پیچ سکھاتے تھے۔

چوں کہ وہ دونوں محض کھلاڑی رہ چکے تھے۔انہوں نے کبھی کپتانی نہیں کی تھی،اس لیے اپنے تجربے کے لیے انہوں نے سابقہ کپتانوں اور ریٹائرڈ کھلاڑیوں کو بھی بلا لیا تھا۔نعیم نے دن رات ایک کردیے تھے۔سرور خان بیٹے کو یوں محنت کرتا دیکھتے تو فخر سے مسکرانے لگ جاتے۔ان کا بیٹا سرداری کے لیے پوری جان لگا رہا تھا جب کہ کلیم کو پرواہ نہیں تھی۔یہ بابا جان کی خواہش تھی کہ وہ

سرداری کے لیے نامزد ہوا اور نعیم سے مقابلہ کرے۔اس لیے انہوں نے پشاور ہائی کورٹ میں چیمبر کی تلاش چھوڑ دی اور وکالت کو خیر باد کہتے ہوئے چترال آ گئے۔وہ خود اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر پشاور جانا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک صحت مند تعلیم حاصل کر سکے اور اپنا مقام بنائے۔

بابا کی خواہش نے ان کے منصوبوں کو ختم کر دیا تھا۔اب ان کا منصوبہ پہلے چترال اور بعد میں یہاں ایک بہترین سکول کی منظوری تھی تاکہ گل اور گاؤں کی باقی لڑکیاں بہترین تعلیم حاصل کر سکیں۔وہ محنت کر رہے تھے۔مشق بھی کرتے تھے لیکن کپتانی کے لیے انہوں نے جان نہیں ماری۔ جو سابقہ کپتان تھے۔انہوں نے اسی کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔وہ بہتر جانتے تھے کہ میدان میں کھلاڑیوں کا رویہ کیسا ہوگا تب ہی وہ جیت سکیں گے۔کلیم اللہ کپتانی سے زیادہ واقف تھا۔اسے سب سے بڑا اعتماد اپنی ٹیم کے باصلاحیت کھلاڑیوں پر تھا۔وہ ہر روز ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔اسے یقین تھا کہ اس کے کھلاڑی اسے ہرائیں گے نہیں۔

آج کل اصطبل گھوڑوں کی دھڑ دھڑاہٹ سے گونجتا رہتا تھا۔چترال کے قبائل حیران تھے کہ کس طرح دو بھائی سرداری کے لیے جسم و جان لگا رہے ہیں۔وہ اصطبل کے میدان میں بھی ایک گھنٹے کا مقابلہ منعقد کرتے تھے تاکہ دیکھ سکیں کہ کس کی ٹیم کتنی تیار ہے۔اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے مقامی شائقین جوش و خروش سے آتے تھے۔ان ٹیموں کے جیتنے سے زیادہ نعیم اور کلیم کے ردعمل سے دلچسپی تھی۔

خرسندہ پہلے تو سرور خان کے فیصلے سے بہت مطمئن تھیں لیکن جیسے جیسے وہ نعیم کی جنونیت دیکھ رہی تھیں۔ان کو ایک ان دیکھا سا خوف لگ گیا تھا۔انہیں ڈر لگنے لگا کہ کہیں ان کے دونوں بچے ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچا دیں۔انہوں نے دبے لفظوں میں سرور خان سے ذکر بھی کیا تھا مگر

سرور خان ایک دفعہ جب حکم دیتے دوسری مرتبہ خود بھی نظر ثانی نہیں کرتے تھے۔ان کا رویہ ایسا تھا کہ منہ سے بات نکلی تو پتھر کی لکیر ہوگئی۔

بہو بیگم ہر وقت کڑھتی رہتی تھیں۔دونوں دیورانیوں کو دیکھ کے ان کے منہ سے ہمیشہ زہر اگلتا تھا۔شوہر کے سردار بننے کا مطلب تھا ان کا سردارنی بننا۔یعنی اس حویلی پر راج کرنا۔یوسف کی محتاج زندگی نے ان سے یہ خوشی چھین لی تھی۔دل میں کمینہ سا خیال آتا تھا کہ کاش نعیم سے یا پھر کلیم سے شادی کر لی ہوتی۔مگر یہ سوچ کر شادی کر لی تھی کہ وہ بڑا بیٹا ہے۔سردار اسے ہی بنایا جائے گا۔اوپر سے ان کے ماں باپ کے لیے حویلی کا سردار بیٹھ گیا تو انہوں نے انکار کرنے کو اپنی ناشکری اور گھمنڈ مان لیا۔اس لیے دلہے میں کمی بیشی نکالنے کی بجائے انہوں نے عاجزی سے ان کا رشتہ دے دیا۔گو کہ ابھی تک یوسف نے ان پر اپنی کمی سے کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا۔مگر یہ خلش وہ جانے انجانے میں ڈال چکے تھے۔وہ جب دیورانیوں کے کہنے،ان کے حکم اور فیصلوں کے آگے سر جھکائیں گی تو تضحیک سے زمین میں گڑھ جائیں گی۔اپنی بڑائی،عمر اور رتبے پر غصہ آتا تھا۔

چھوٹی دیورانیاں خوش تھیں کہ ان کے شوہر سرداری کے لیے نامزد ہوئے ہیں۔وہ بہو بیگم کی کھٹاس اور خشکی سمجھ سکتی تھیں۔ان کا کھچا کھچا انداز سب بتا دیتا تھا۔ان کا مقام بلند تھا۔چترالیوں کے ہاں بڑوں کی بڑی عزت اور قدر ہوتی ہے۔ان سے دھیمے لہجے،نرم خو اور مدھم انداز میں بات کی جاتی ہے۔بڑا سوچ سمجھ کے بولا جاتا ہے۔اس لیے وہ بہو بیگم کے رویے پر صبر کا گھونٹ پی لیتیں۔انہوں نے کبھی ان کے ٹھنڈے رویے کی شکایت نہیں کی۔یہ پندرہ دن انہوں نے ہر طرح کی ہراسانی سہی۔

بہو بیگم ان کے سردارنی بننے سے پہلے اپنی بڑائی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھیں۔کلیم کی بیوی پر تو جیسے ان کا بس چلتا تھا۔کھیتوں میں بیلوں کی طرح سارا دن اس کو جوتتی رہتی تھیں۔اس بے چاری کو

دن کا سکون تھا نہ رات کا آرام۔زندگی جیسے ایک پہیے کی طرح ہوگئی تھی۔گھومتی جارہی ،گھومتی جارہی تھی۔رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

سرور خان سارا دن پہلوانوں کی پہلوانیاں دیکھتا۔شام میں کھیتوں میں نکل جاتا۔رات میں قبیلے کے سرداروں کو بلا کر دعوت رکھ لیتا۔حویلی میں بلتی مہمانوں کے آنے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔وہ قبیلہ بھی ان کی طرح بہت بڑا تھا۔وہ جب آتے تھے تو پوری فوج لے کر آتے تھے۔حویلی کے انگنت کمروں میں ان کے لیے نت نئے بستر اور لحاف نکالے جاتے تھے۔ان کے لیے حویلی کو سجایا جاتا تھا۔

کھانوں کا مینو بدلا جاتا تھا۔ان کی پسندیدہ مشروبات، میٹھائیاں اور پکوان بنائے جاتے تھے۔شندور کے چار دن نکال کے وہ باقی تین دن حویلی میں گزارتے تھے۔اس دفعہ وہ عین وقت پہ آرہے تھے۔ان کے بیٹے ''رمیز'' کی شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔شندور کے فوراً بعد اس کی شادی تھی۔خود رمیز پہلے ہی اپنی ٹیم کے ساتھ آچکا تھا۔وہ بلتیوں کی طرف سے پولو کھیلتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔چترال کے لوگوں کی بے چینیاں بڑھ رہی تھیں۔تجسس کا یہ حال تھا کہ لوگوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ دونوں بھائیوں میں سے کون سا سردار بننے والا ہے۔مختلف قبائل نے ایک دوسرے کے ساتھ شرائط بھی لگائی تھیں۔چوں کہ انتخاب دو طرح سے ہوتا ہے۔اول، لوگوں کے ووٹ سے۔دوم، جو ووٹ لے رہا ہے اس کے امتحان سے۔اس لیے لوگ یہاں ایک دوسرے کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔جیسے عام انتخابات میں جیالے مخالف پارٹی پر آوازیں کستے ہیں۔ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔وہ نہیں کرتے تھے۔

سرداری کے انتخاب میں مقامی لوگوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔یہاں کے قبائلی سردار ان کی آپسی اتفاق سے سرداری کے لیے چنے جانے والے ولی عہد کے حق میں ''رضا'' مانگی جاتی تھی۔

ان سے پوچھا جاتا تھا کہ ان کو سردار پر کوئی تحفظ تو نہیں۔ اگر کسی قبیلے کا سردار اعتراض اٹھاتا تو سرداری کا عمل روک دیا جاتا تھا۔ تین سرداروں کے اعتراض کے بعد چنے جانے والے سردار کی سرداری متنازعہ ہو جاتی۔

یہاں اصول تھا کہ سردار (اگر وہ متنازعہ) نہ ہو، تب تک نہیں ہٹ سکتا، جب تک کہ وہ خود نہ ہٹ جائے مگر متنازعہ سردار کو دوسرا کوئی شخص جو خود کو سردار نامزد کرتا ہے وہ ہٹا سکتا ہے۔ مثلاً کلیم اللہ پر تین سرداروں نے اعتراض کیا تو نعیم اللہ اپنی شرط جیت کر اس کی سرداری ختم کر سکتا ہے۔ متنازعہ سردار کی سرداری ہر وقت خطرے میں ہوتی ہے جب کہ مستحکم سردار (جس پر ایک بھی اعتراض نہ ہو) کی سرداری بے خطر ہوتی۔ وہ اپنے بڑھاپے میں پہنچ کر نیا سردار چن سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ سردار دوران سرداری اس دنیا سے چلا جاتا اور کوئی ولی عہد نامزد نہیں کر پاتا تو مقامی جرگہ اس سردار کے قبیلے کے جوان مردوں میں سے دو کا انتخاب کرتے اور ان کے لیے خطرناک سے خطرناک اور دشوار سے دشوار شرائط ڈھونڈتے۔

سابقہ سردار نامزد کردہ سردار کے لیے ایک شرط رکھتا تھا۔ وہ شرط کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے امیدوار کو ایک مقررہ وقت ملتا تھا۔ اس مقررہ وقت میں نامزد سردار کو اپنی شرط پوری کرنی ہوتی تھی۔ وہ ایسی شرط ہوتی تھی کہ سارا چترال اس کا گواہ بنتا تھا۔ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ سردار نے شرط پوری کی یا نہیں۔ اگر وہ نہیں پوری کر پاتا تو اسے رد کر دیا جاتا اور اس کی سرداری منتقل ہو جاتی تھی۔

سرداری حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ خود کو اس کا اہل بنانا پڑتا تھا۔ خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ یہ کوئی سیاسی وزارت کا عہدہ نہیں تھا کہ چند تقریروں پر مل جاتا۔ یہ ایسا مقام تھا کہ جسے حاصل کرنے کے لیے امیدوار جانیں لگا دیتے تھے۔ اپنی راتوں کی نیندیں اور خوراکیں بھول جاتے تھے۔

نعیم، کلیم کے مقابلے میں دگنی محنت کر رہا تھا۔اس نے واقعی سرداری کے لیے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ پورا چترال دیکھ سکتا تھا۔کلیم لاپرواہ نہیں تھا مگر وہ اس حد محنت بھی نہیں کر رہا تھا۔ جانے وہ کیوں لاپرواہی برت رہا تھا۔شاید اسے دلچسپی ہی نہیں تھی۔

کچھ دِنوں بعد کلیم کی اور گلگت کے کچھ لڑکوں کی بلوری کو لے کر لڑائی ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

بلتی قبیلہ ہو یا بلتیوں کی ٹیم۔دونوں کا خیال حویلی میں بہت خلوص اور اپنائیت سے رکھا جاتا تھا۔کوشش کی جاتی تھی کہ قبیلے کے کسی بھی فرد کی دل آزاری نہ ہو۔ان کی ضرورتوں کی پوری پوری تسلی کی جاتی تھی۔ان کے کاموں کے لیے قبیلے کے ان گنت ملازم تعینات کیے گئے تھے جو ہر وقت ان کی ناز برداریاں اٹھاتے تھے۔نعیم اللہ کی ٹیم بڑی چست تھی۔کڑی محنت کر رہی تھی۔اس دن اصطبل میں جانے کیسے نعیم نے اپنی ٹیم کو بریک دیا تھا۔وہ میدان کی بجائے پہلی بار اصطبل کے اندر دیکھے گئے تھے۔وہ بڑی ہی محبت اور ستائش سے کھوواریوں کی گھوڑوں کی نئی کھیپ دیکھ رہے تھے۔یوسف خان نے اس دفعہ اصطبل میں آٹھ نئے گھوڑوں کا اضافہ کیا تھا۔

اصطبل کے اندر گھوڑے اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں ہنہنا رہے تھے۔ملازم ہر کوٹھڑی کے ساتھ چوکنا کھڑے تھے جیسے نمائش کے دوران فنکار اپنے نمونے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔بلتی ٹیم کے سات لوگ جن میں سردار کا بیٹا ''رمیز'' بھی شامل تھا، وہ گھوڑوں کی پھرتی اور چکناہٹ دیکھ کر داد دے رہے تھے۔

اسی اثنا کلیم اللہ بلوری پر بیٹھے اصطبل کے اندر آئے۔جیسے ہی بلوری دروازے پر نمودار ہوئی۔کھلاڑی چوکھٹ میں سائے ابھرنے پر وہ انہی قدموں سے پلٹے۔کلیم اللہ مسکراتا ہوا بلوری کو اندر لایا پھر جست لگا کر اتر گیا، اس کے ہاتھ میں پولو سٹک تھی۔

''السلام علیکم بھائی جان۔ کیسے ہیں؟'' رمیز خوشگوار مسکراہٹ چہرے پر سجائے ان کی طرف بڑھا۔

''اچھا ہوں میں۔ تم لوگ سناؤ۔ پریکٹس کیسی چل رہی ہے؟'' انہوں نے بغل گیر ہونے کے بعد دریافت کیا۔

''مت پوچھیں۔ کپتان صاحب سانس نہیں لینے دے رہے۔'' وہ تکان سے مسکرائے۔

''ہاہاہا۔ کوئی بات نہیں۔ تم لوگ اپنے کپتان کی مجبوری سمجھو۔ تمہارے لیے محض ایک میچ ہے جب کہ میرے اور میرے بھائی جان کے لیے وہ سرداری کی شرط ہے۔'' انہوں نے مذاق میں یہ بات کہی مگر نعیم اللہ کا منہ بن گیا۔ وہ تیوریوں پر بل ڈالے آگے آیا۔

''اور بلاشبہ یہ شرط میں جیتوں گا۔'' اس نے کلیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے باور کرایا۔ کلیم اس کے تاثرات دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ رمیز بلوری کی شان کو آنکھوں میں خیرہ کر رہا تھا۔

''ان شاءاللہ۔'' کلیم نے سر جھٹک کر نرمی سے کہا۔

''بھائی جان، یہ بلوری ہے ناں؟'' رمیز نے پوچھا۔ وہ جو لگام تھامے کھڑے تھے۔ بلوری کی گردن کو سہلاتے ہوئے بولے۔

''ہاں۔ یہ میری جان ہے۔''

''کمال کی گھوڑی ہے۔ اس کا تو قد چھت سے مل رہا ہے۔ کیا آپ اس پر پولو کھیلیں گے؟'' وہ بلوری کی کاٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ہاں۔ ان شاءاللہ۔''

''پھر تو نعیم بھائی جان۔ ہم ہار جائیں گے۔ اس گھوڑی کے رعب سے گھوڑے بپھر سکتے ہیں۔'' وہ رکاب میں پیر ڈال کر بلوری پر بیٹھ گیا اور کلیم سے لگام کھینچ لی۔ بلوری نے دو قدم آگے لیے پھر بے چینی سے دو قدم پیچھے ہوئی۔ اسے دوسرا لمس برا لگا تھا۔

''ہم نہیں ہار سکتے رمیز۔ بھول جاؤ کہ کوئی اس ''لائق'' ہوگا کہ ہمیں ہرا سکے۔'' نعیم نے ناک سے مکھی اڑائی۔ کلیم بلوری کے پیروں میں اٹھنے والے اضطراب کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹھیک نہیں تھی۔

''کیا شاندار سواری ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں براق پہ بیٹھا ہوں۔ کسی دیومالائی شہزادے کی طرح۔'' وہ اپنے تخیل میں کھونے لگا۔

''رمیز، اسی گھوڑی چڑھ جایئے گا اپنی شادی پہ۔'' اس کے ساتھی کھلاڑی نے آنکھ دبائی۔ سب ہنس پڑے۔ وہ بھی مسکرایا۔ بلوری کی ہلکی سی ہنکار سنائی دی۔ کلیم کو گڑبڑ محسوس ہوئی۔

''چڑھ تو جاؤں مگر کلیم اللہ اجازت نہیں دے گا۔'' اس نے نروٹھے انداز میں چوٹ کی۔

''رمیز، اتر جاؤ دوست۔ گھوڑی ناراض ہو رہی ہے۔'' کلیم نے مفاہمت سے کہا۔

''گھوڑی ناراض ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے پھر تو یہ سن بھی سکتی ہوگی۔ رکو ایک منٹ۔'' رمیز شرارت سے کہتا سینے کے بل جھکا اور بلوری کے کان کے پاس چہرہ قریب کر لیا۔ ''سنو میری کالی گھوڑی، کیا تم مجھے اپنے اوپر بٹھا کر میرے ساتھ بارات میں جاؤ گی؟'' گھوڑی ہنہنائی۔ ''سن لیا اس نے۔ دیکھو اس نے ہاں کر دی ہے۔'' وہ خوشی سے مچل گیا۔

''رمیز اترو۔ گھوڑی برا مان رہی ہے۔'' کلیم نے ایک بار پھر کہا۔

''کپتان صاحب تم نے سنا۔ گھوڑی راضی ہے۔ میں اسی پہ برات لے کر جاؤں گا۔ کلیم بھائی، اب تو آپ کو اسے مجھے دینا پڑے گا۔ اب یہ میری بارات لے کر جائے گی۔'' وہ بلوری کو سہلا رہا تھا۔ یکدم بلوری نے دو قدم پیچھے لیے اور گھومی، وہ اپنا سر اٹھا رہی تھی۔ کلیم کو لگا جیسے وہ سرپٹ بھاگنے والی ہے۔

یکدم وہ آگے گئے۔ رمیز کو ہاتھ اور گردن سے پکڑ کر نیچے کیا اور جھٹکا دے کر کھینچا۔ بے دھیانی میں ان کا دوسرا ہاتھ بازو کی بجائے کالر پہ پڑ گیا۔ اس خوف سے رمیز گرے نہیں، کلیم نے بڑی

مضبوطی سے اسے کالر سے پکڑا۔اس بے عزتی پر پورا اصطبل منہ کھولے کلیم کو دیکھنے لگا۔اس نے رمیز کو نیچے لا کر زمین پر چھوڑ دیا۔وہ گرتے گرتے بچا۔کلیم اسے چھوڑ کر تیزی سے بلوری کی طرف بڑھے اور اس کا سر سہلانے لگے۔شناسا لمس پا کر بلوری کی بے تابی میں کمی آئی۔

رمیز ہکا بکا اپنے کالر کو دیکھ رہا تھا۔اس کے ساتھی کھلاڑی اسے دیکھ رہے تھے۔نعیم اللہ کلیم کو دیکھ رہا تھا جو اس بات سے بے خبر تھا کہ اس نے بلتی مہمان کو کھینچ کر گھوڑے سے اتارا ہے۔وہ بلوری کی گردن کو سہلانے میں مصروف تھا۔

رمیز نے قمیص کو جھٹکا دیا۔کالر ٹھیک کیا۔وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے کلیم؟''نعیم برہمی سے آگے آیا۔

''کیا ہوا بھائی جان۔''وہ لاعلمی سے پلٹے تھے۔

''تم نے رمیز کو کالر سے کھینچا ہے۔''

ان کے دل پہ گھونسا پڑا۔تیزی سے گردن موڑ کر رمیز کو دیکھا جو اپنا اشتعال قابو کر رہا تھا۔

''رمیز! مجھے معاف کرو۔میں نے جان بوجھ کے ایسا نہیں کیا۔بلوری کسی دوسرے کو خود پہ نہیں بٹھاتی۔بپھر جاتی ہے۔سرپٹ دوڑنے لگتی ہے۔تمہیں چوٹ نہ لگ جائے اس لیے مجھے تمہیں کھینچنا پڑا۔''انہوں نے وضاحت دی۔

یہ بات چند تلخ جملوں سے شروع ہوئی تھی اور معافی کے دو بول کے بعد ختم ہوگئی۔اس کے دو دن بعد شندور تھا۔شندور چوں کہ تین روزہ ہوتا ہے۔اس لیے دونوں ٹیموں کا مقابلہ آخری دن تھا۔آخری دن کچھ ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آئے گا،کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔میچ کے تیسرے راؤنڈ میں کلیم کی گھوڑی بلوری بپھر گئی۔وہ ایسی بپھری کہ سامنے آنے والوں پہ چڑھنے لگی۔اس کا پہلا شکار رمیز تھا۔اس نے رمیز کے گھوڑے پر یلغار کی تو رمیز بری طرح بوکھلا کر گھوڑے سے گر گیا اور اس کی

گردن پر رسی پھر گئی۔ یہ رسی بلوری سے بندھی ہوئی تھی۔ بلوری چوں کہ بپھری ہوئی تھی تو سرپٹ دوڑنے لگی۔ رمیز کو پورے میدان میں خود کے پیچھے کھینچتے ہوئے بلوری نے اس کی جان لے لی۔

اس کے بعد بلتیوں اور چترالیوں میں ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ بلتیوں کو لگا کہ یہ سب کلیم نے جان بوجھ کر کیا ہے کیوں کہ اس کا اور رمیز کا کچھ دن پہلے جھگڑا ہوا تھا۔ انہوں نے فوراً اس کو دشمنی کی شکل دی تھی۔ چوں کہ دونوں سردار تھے اس لیے طاقت میں ایک دوسرے سے خائف نہیں ہو رہے تھے۔ بلتی سردار نے پیغام بھجوایا کہ اس کو اپنے بچے کا قصاص چاہیے۔ قصاص یعنی کلیم کا قتل کیوں کہ اس نے رمیز کو مارا ہے۔

کلیم نے اپنے گھر والوں کو سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے۔ سرور خان نے بلتیوں کے پاس قاصد بھیجے یہ پیغام لے کر کہ وہ مذاکرات سے یہ معاملہ حل کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کے بیٹے نے صحتِ جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنے بابت قتل کے بدلے قتل کا سن کے کلیم کے ہوش اڑ گئے تھے مگر جب بلتیوں نے یلغار کر کے پیغام پہنچایا تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے۔ اس گھناؤنے الزام کے بعد بے رحم سزا سن کر ان کو سب کو ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

ہو نہ ہو یہ بلتی غلط فہمی میں آ کر اسے سزا دے ڈالیں گے۔ وہ ڈرتا نہیں تھا مگر اس کے قتل کے بعد بھی تو یہ دشمنی نہیں تھمنے والی تھی۔ صدیوں کے تعلقات ختم ہونے والے تھے۔ اس لیے انہوں نے احتشام الدین کو حویلی بلایا۔ وہ قانونی آدمی تھا۔ وہی سب کا سدِ باب کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے۔ لوگ رابطوں کے لیے ایک دوسرے کو چھٹی لکھتے تھے جس کے پہنچنے اور آپ کو اس کا جواب ملنے میں پورے پندرہ دن لگتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔

انہوں نے ملازم کو گاڑی دی، وہ اگلے روز احتشام کو لیتا ہوا آیا تھا۔

"یہ سب کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ غش کھا رہا تھا۔ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ہورہا ہے۔ مگر میں سچ کہہ رہا ہوں (جذبات سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا) میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ جس چیز کو جواز بنا کر یہ لوگ مجھ پر قتل کا الزام لگا رہے ہیں۔ وہ چھوٹی سی تلخی کلامی تھی۔ اس میں بھی زیادہ میری طرف سے ہوئی تھی۔ بدلہ اسے لینا چاہیے تھا۔ میں زیادتی پہ دوسری زیادتی کیوں کروں گا؟'' وہ بہت پریشان تھے۔

''اچھا تم فکر مت کرو۔ میں پولیس سے ملتا ہوں۔ قانونی کارروائیاں دیکھ لیتا ہوں۔''

''پلیز احتشام۔ مجھے ان سب سے بچالو۔ میری طرف کوئی بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ میں کسی کو صفائی نہیں دے پارہا ہوں۔'' وہ ایک اذیت سے کہہ رہے تھے۔

''بے فکر رہو۔ میں تمہیں اس سب میں نہیں رہنے دوں گا۔ میں سارا معاملہ خود دیکھ لوں گا۔''

انہوں نے پولیس کی کارروائی میں ان کی بھرپور مدد شروع کردی۔ وہ وکیل تھے۔ انہوں نے نہ صرف سپیشل ٹیم بلا کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا تھا بلکہ انہوں نے بلوری کے ٹیسٹ بھی کرائے تھے۔ آخر یہ حادثہ اس کے بپھرنے کے سبب ہوا تھا۔ ہفتہ گزر گیا۔ احتشام نے بہت ساری چیزوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ سارا کیس ان کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ مگر بلتیوں اور کھوواریوں کے مابین کشیدگی میں کمی نہیں آرہی تھی۔ کلیم مضطرب تھا لیکن اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔

احتشام نے جانچ پڑتال کی تو پتہ چلا کہ بلوری کو چارے میں بھنگ دی گئی تھی۔ اس بھنگ کے نشے نے اس کے دماغ پر اثر کیا جس کی وجہ سے وہ میدان میں بپھر گئی۔ اس بپھرنے کے سبب وہ دائیں طرف کھڑے رمیز کی طرف بڑھی۔ کلیم نے رمیز کو چھلانگ لگانے کا اشارہ کیا تو رمیز جان بچانے کے لیے کود گیا۔ عین اسی وقت بلوری اس کے گھوڑے پر چڑھ گئی اور رمیز جو گرا ہوا تھا۔ اس کی گردن میں قدرتی طور پر رسی پھر گئی۔ اس کے بعد وہ سرپٹ دوڑنے لگی۔ چوں کہ رسی گردن پہ پھری ہوئی تھی، اس لیے ممکن نہیں تھا کہ اتنے جھٹکوں کے بعد رمیز بچتا۔ اور یہی ہوا۔ وہ مر گیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ احتشام یہ تحقیقات لے کر چترال جاتا، بلتی قبیلے کے سردار کے بڑے بیٹے اور رمیز کے بڑے بھائی جہانگیر نے کلیم کو کھائی سے گرا دیا۔ جس دن کلیم کا قتل ہوا، اس دن وہ بلوری کو لے کر ریس لگانے گیا تھا۔ جہانگیر نے قبول کیا کہ اس نے نہ صرف بلوری کو بھنگ کھلائی تھی بلکہ اس کی بصارت گل کرنے کا ٹیکا بھی لگایا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ دوران ریس پھر بپھر گئی۔ کچھ نظر نہ آنے کے باعث وہ کھائی کی طرف بھاگی اور کلیم اللہ کو اپنے ساتھ لیتی ہوئی کود گئی۔

حویلی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ کالے کوے اور گِدھ حویلی کی چھتوں پر منڈلا رہے تھے۔ پہلوان کے اکھاڑے کے پاس بے شمار کتے آ گئے تھے جو مسلسل بھونک رہے تھے۔ آج اکھاڑے کی مٹی بہت سخت تھی۔ ملازم جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کسی نے مٹی چھانی ہی نہیں تھی۔ فوارے، لان، زعفران کے کھیتوں میں بھی خاموشی تھی۔ حویلی کے اندر صفِ ماتم بچھا ہوا تھا۔ چترال کے تمام قبائل پہنچ گئے تھے۔ کس نے کلیم کو وہاں سے نکالا، کس نے غسل دیا، کس نے کفن پہنایا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ جب پہنچے تب تک جنازے کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو سب کی زبانی یہی معلوم ہوا کہ جہانگیر نے بھائی کا قصاص لیا ہے۔ اس نے بلوری اور کلیم کو کھائی سے نیچے پھینکا ہے۔ خود جہانگیر نے یہ ''الزام'' قبول کیا تھا۔

یہاں پر سارا قصہ ہی ختم ہو گیا۔

اب تک جو تگ و دو انہوں نے کی تھی۔ وہ پشاور تا چترال اور چترال تا پشاور سفر کر رہے تھے۔ شندور جا رہے تھے۔ پولیس کی مدد سے تحقیقات کر رہے تھے۔ اس سب کا کیا مقصد تھا؟ یہی ناں کہ کلیم پر لگا الزام جھوٹا ثابت کر دیا جائے اور دونوں قبائل کو ایک دوسرے کو خون خرابے اور بے وجہ کی دشمنی سے بچایا جائے؟ کیا ایسا ہو پایا تھا؟ نہیں۔ کیا ان کی بیس دِنوں کی تحقیقات کوئی رنگ لائی تھی؟ نہیں۔ سب کچھ بے کار گیا تھا۔ ان کے دوست کی موت ہو گئی تھی۔ اب رمیز کا مرنا قتل یا

حادثہ ثابت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ دونوں قبیلوں کے مابین بڑھتی کشیدگی کے سبب مقامی جرگے نے کلیم کی موت کے پندرہ دن بعد دونوں قبائل کا بڑا فیصلہ رکھا جو جلندھر کی زمین پر ہوا تھا۔ مقامی جرگے میں مذہبی سکالرز سے لے کر قانون دانوں تک سب ہی موجود تھے۔ مقامی جرگے نے دونوں قبیلوں پر کڑی پابندیاں لگائیں۔

انہوں نے کھووار اور بلتی قبیلے دونوں پر شندور میں شرکت اور شندور پولو میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی۔ انہوں نے بلتیوں کا چترال اور چترالیوں کا بلتیوں کے حدود میں داخل ہونا ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے دونوں قبیلوں کے برسوں کے تعلقات کو ختم کر دیا۔ دونوں کسی بھی تقریب خواہ وہ خوشی کی ہو یا غمی میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ چوں کہ ان کی وجہ سے چوگان شندور میلہ متاثر ہوا تھا اس لیے ان پر کڑی حد نافذ کی گئی تھی کہ وہ شندور کے معاملات سے دور رہیں گے۔ پہلے پہل سرور خان پولو کے کھلاڑیوں کا جائزہ لیتا تھا۔ کون ٹیم میں رہے گا اور کون نہیں۔ اس کا فیصلہ ان کی رائے اور ان کی صلاح سے ہوتا تھا۔ ان سے یہ حق چھین لیا گیا۔ پولو کی تمام ذمہ داری مقامی کمیٹی پر ڈال دی گئی تھی۔ بلتیوں سے بھی یہی حق چھینا گیا۔ چوں کہ قتل دونوں طرف ہوئے تھے اس لیے دونوں ہی اس وقت مجرم تھے۔ کوئی معصوم نہیں تھا۔ اس لیے جتنی بھی سزائیں عائد ہوئیں برابر نافذ ہوئیں۔

سرور خان کو کسی بھی سزا نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا شندور سے جدائی نے پہنچایا تھا۔ تاعمر وہ شندور سے دور ہو گئے تھے۔ ان کے قبیلے کا کوئی فرد پولو نہیں کھیل سکتا تھا۔ وہ ان کا بطور سردار استحصال نہیں ہوا تھا مگر سرداری کی بہت سارے اختیارات چھین لیے گئے تھے۔ جہانگیر کو صلح کے قاصد کا پیغام نہ ماننے اور ان کی بے عزتی کے جرم میں بیس لاکھ روپے (جو اس وقت بہت زیادہ تھے) جرمانہ ہوا۔ یہ جرمانہ شندور کے نقصان کا ہرجانہ تھا جو انہوں نے بخوشی خوشی بھرا۔

اس کے بعد احتشام بالکل بکھر گیا تھا۔ وہ ساری گتھیاں سلجھا چکے تھا۔ وہ یقیناً ثبوت اور گواہ لے کر سرور خان کے پاس ایک دو دن میں آنے والے تھا مگر انہی دِنوں کلیم کو مار دیا گیا۔ کلیم کی موت کی خبر سن کے انہوں نے اس کیس پر لعنت بھیجی تھی۔ کیا حاصل ہوا تھا اتنی تحقیقات کر کے، کیا ملا تھا اتنا سب کچھ کر ید کر؟ کلیم کی موت نے سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اتنی محنت اور کارروائی کے باوجود اگر اپنے دوست کی جان نہیں بچا پایا تھا تو لعنت تھی ایسی تحقیق پر۔

اس کو سکون نہیں تھا۔ وہ بلتیوں کو بتانا چاہتا تھا کہ انہوں نے کتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ انہوں نے چترال کا کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔ اس لیے وہ پولیس، رپورٹس، گواہ اور ثبوت لے کر گلگت پہنچا اور بلتیوں کی حویلی میں سردار، اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کے شوہروں کو بلا کر سارا معاملہ سامنے رکھا۔ جب ساری سچائی سامنے آئی تو ان کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا۔ احتشام کو ردعمل نہیں چاہیے تھے۔ وہ تو ان کو ان کی غلطی کا احساس دلانے گیا تھا۔ ان کو بتانے گیا تھا کہ انہوں نے ایک بے گناہ کو مار کر کتنے گھر اجاڑے ہیں۔ اس کی بیوی بیوہ ہوگئی۔ سات سال کی بچی یتیم ہوگئی۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

بارش بدستور برس رہی تھی۔ کھڑکی پر بھاپ کی طرح دھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بارش کے قطرے دھیرے دھیرے پھسل رہے تھے۔ وہ اپنی کرسی پر براجمان تھے جب کہ گل صوفے پر آگے ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں نیچے فرش کو دیکھ رہی تھیں۔ پلکیں اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں۔

''اس کے بعد میں پشاور آ گیا۔ میں تمہارے دادا کے پاس نہیں گیا۔ ان کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب جرگے کا فیصلہ آ چکا تھا اور کلیم بھی چلا گیا تھا۔ وہ بلتیوں سے مزید دشمنی بڑھا کر اپنا اور نقصان کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے اس قصے کو طول نہیں دی۔'' احتشام نے فائل بند کر دی اور

کناروں پر ہاتھ جما دیے۔

''ہاں۔اتنی امید ضرور تھی کہ کلیم کے لیے میرے پاس کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔اتنے سال تک میں انتظار کرتا رہا۔حویلی سے اور گلگت سے کوئی نہیں آیا۔کل جب عابد نے مجھے بتایا کہ تم کلیم کے بارے میں پوچھنے آئی ہو تو میں بری طرح چونک گیا۔حویلی کو سب پتہ ہے۔پورا چترال جانتا ہے کہ جہانگیر نے تمہارے بابا کو مارا ہے۔تمہیں بھی پتہ ہوگا پھر تم مجھ سے کیا پوچھنے آئی ہو؟''

وہ تذبذب کا شکار تھے۔گل نے تھکی سی نظر اٹھائی جس میں سالوں کی شکایت تھی۔

''مجھے کسی نے نہیں بتایا۔مجھے کہا گیا تھا کہ میرے بابا اپنے گھوڑے سمیت کھائی سے گر گئے تھے۔وہ ایک حادثہ تھا۔مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ بلتیوں نے میرے بابا کو مارا ہے۔مجھے کسی نے نہیں بتایا۔'' وہ رونے لگی۔

''لیکن انہوں نے کیوں چھپایا؟''

''نہیں جانتی۔میں نے سب سے پوچھا۔کسی نے تفصیل نہیں بتائی۔موٹی چچی کے منہ سے ایک بار نکلا تھا کہ بلتی.....پھر بی جان نے ان کو ٹوک دیا۔اس کے بعد مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔میں نے پوچھا کہ اب بلتی ہمارے یہاں کیوں نہیں آتے۔سب نے کہا کہ ہماری ان سے دوستی ختم ہوگئی ہے۔کیوں ختم ہوگئی ہے۔کس نے ختم کرائی۔کسی نے نہیں بتایا۔'' وہ شکوہ کناں تھی۔اس سچائی سے لاعلم گل زار و قطار رو رہی تھی۔

احتشام نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''آپ کو جلدی آنا چاہیے تھا۔آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اس کے دل کو کچھ ہوا۔اٹھارہ سال پہلے چترال ایسے نہیں تھا۔۲۰۰۰ء میں یہاں راستے،

سڑکیں، ٹرانسپورٹ اور باقی سہولیات نہیں تھیں۔ چترال سے ایون اور ایون سے شندور کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ وہ ہر روز اتنا سفر نہیں کر سکتے تھے پھر بابوسر ٹاپ پہ یہ حادثہ ہوا تھا۔ چترال سے ۱۵۰ کلومیٹر دور ہے بابوسر ٹاپ۔ وہاں کا راستہ انسان کے اندر دل اور گردے ایک کر دیتا ہے اور پھر جب آپ کے پاس ذریعہ آمد و رفت نہ ہو اور چترال ٹاؤن میں فارنزک اور دیگر کارروائیوں کی سہولتیں نہ ہوں تو جلدی کے کام بھی دیر سے ہوتے ہیں۔

چترال سے پشاور کا ۳۶۰ کلومیٹر۔ چترال سے ایون ۳۵ کلومیٹر۔ ۵۴۵ کلومیٹر کا سفر وہ ہر روز نہیں کر سکتے تھے۔ کسی بھی قتل، حادثے یا کیس کی تحقیقات میں مہینوں اور سالوں لگ جاتے ہیں۔ وہ قانونی آدمی تھے۔ اس لیے صرف پندرہ دن لگے مگر بلتیوں نے پندرہ دن کا انتظار بھی نہیں کیا۔ ان پندرہ دنوں میں وہ دو دفعہ چترال آئے، جب تیسری دفعہ آئے تو کلیم کے جنازے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ چوتھی بار وہ چترال نہیں گلگت گئے تھے۔ اس ڈیڑھ ماہ میں انہوں نے صرف چار بار یہ سفر کیا تھا۔

وہ کیسے جلدی کر سکتے تھے۔ کیسے؟ وہ کوئی فرشتے نہیں تھے اور نہ ہی ان کے پاس مافوق الفطرت قوتیں تھیں۔ وہ عام انسان تھے۔ اپنے تئیں انہوں نے پوری کوشش کی تھی۔ مسئلہ ان کی تحقیقات میں دیر کرنا نہیں تھا۔ مسئلہ بلتیوں کے سرور خان کے قاصدوں کی بات نہ سننا تھا۔ بات مذاکرات تک جاتی اور بلتی اتنی برافگختگی نہ دکھاتے تو کلیم کی جان بچ سکتی تھی۔ یہ دشمنی ختم ہو سکتی تھی۔ انہوں نے ضرورت سے زیادہ پھرتی دکھائی تو معاملہ خطرناک حد تک تشویشناک ہو گیا۔ وہ پشاور میں تھے۔ ان کے پاس ٹیلی فون نہیں تھا۔ وہ کلیم کو کیس کی پیش رفت کے بارے میں آگاہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے جتنا ہو سکا تھا، انہوں نے کیا۔

''اس فائل میں رمیز کی موت کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ یہ فائل تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں

نے اس وقت ہمت نہیں کی کیوں کہ کلیم جا چکا تھا اور جن کا قصور تھا میں نے ان کو بتا دیا۔ مگر افسوس۔ ان کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اگر تم چاہو، تو یہ اپنے دادا کو دکھا دو اور اپنے بابا کی بے گناہی ثابت کر دو۔'' انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

''بابا کی موت کے چھ ماہ بعد دادی مر گئے تھے۔ اور پچھلے سال ایک دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے وہ کمینہ جہانگیر گودائی بھی۔'' وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے تلخی سے بولنے لگی۔ ''دونوں مر چکے ہیں۔ نعیم چچا گاؤں میں نہیں ہیں اور میں نے اپنے سوتیلے باپ اور اپنی سگی ماں سے سولہ سال سے بات نہیں کی۔ کس کو دکھاؤں ان کے علاوہ؟ تایا جان کو دکھاؤں جو مجھ پر پابندیاں لگاتے ہیں۔ وہ لیں گے میرا بدلہ یا اس دادی کو دکھاؤں جو مجھے میرے بابا کی بہادری کے قصے تو سناتی ہے لیکن کبھی یہ نہیں بتایا کہ میرے بابا کے ساتھ ہو کیا تھا۔ میں کس کو دکھاؤں؟ بتائیں مجھے؟''

احتشام لاجواب ہو گئے۔ انہوں نے فائل پیچھے کر لی۔ گل سر جھکائے کئی ساعتوں تک روتی رہی۔ وہ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ ایک بارش باہر ہو رہی تھی اور ایک اندر۔ وہ جانتے تھے یہ سولہ سال کا دکھ ہے۔ پل بھر میں نہیں ختم ہو گا۔

''یہاں آنے میں، میں نے دیر کر دی۔ پہلے ہی سمیسٹر میں آ جاتی تو تایا جان کو یہ فائل دکھا کر جہانگیر کو مروا دیتی اور اپنے دل کو ٹھنڈا کر لیتی۔ مگر وہ کم بخت تو اس دنیا سے جا چکا ہے۔ اب کس سے انصاف مانگوں؟ کس کو دکھاؤں یہ فائل؟ اب تو بلتیوں کے ساتھ ہزار ہا دشمنیاں بھی آئیں گی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا باپ اور میرے باپ کا قاتل مر چکا ہے۔''

''گل! جو سزا ہم لوگوں کو نہیں دے پاتے، قدرت دے دیتی ہے۔ جہانگیر زندہ بھی ہوتا تو اسے مار کر تمہیں سکون نہیں مل سکتا تھا۔ سکون کا تعلق قتل سے نہیں ہے۔ معاف کر کے، ظرف بڑا کر کے، آگے بڑھ جانے میں ہے۔''

''مگر انہوں نے بابا کو مارا ناں۔ کیوں؟ اپنے سکون کے لیے۔ انہوں نے معاف کیوں نہیں کیا اور حقیقت جاننے کے بعد بھی معافی کیوں نہیں مانگی؟ اپنا جرم کیوں نہیں قبول کیا؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''کاش میرے پاس اس سوال کا جواب ہوتا۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''وہ بے غیرت ہیں۔ ان میں انسانیت نام کی چیز ہی نہیں ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ احتشام نے سر کو حمایتی انداز میں ہلایا۔ بلاشبہ بلتیوں میں اپنا جرم قبول کرنے کی غیرت نہیں تھی۔ انہوں نے دو طرفہ نقصان کیا تھا۔ ان کا حق تھا کہ معافی مانگتے۔

اس نے رگڑ رگڑ کے گالوں سے آنسو پونچھ لیے۔ ''اب کچھ نہیں بچا۔ آپ نے سولہ سال پہلے دیر کردی اور میں نے ان چار سالوں میں۔ ہم دونوں نے دیر کردی ہے۔ اب کچھ نہیں بچا۔ نہ مقتول نہ قاتل۔ مجھے سچائی جاننے کے بعد کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔'' وہ مایوسی سے کہتے ہوئی کھڑی ہوگئی۔

''میری بچی۔ یہ فائل لے جاؤ۔ اس کی کاپی نکال لو۔ میں جج ہوں۔ وکیل رہ چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ معاملات ایسے رفع دفع نہیں ہوتے۔ تمہیں اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

''نہیں سر، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہوگی۔ کم از کم اس میں وہ ثبوت ہیں جن کے سہارے تم بلتیوں سے جواب مانگ سکتی ہو؟'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس فائل کی ضرورت اس وقت پیش آسکتی ہے جب وہ یہاں سے جائے گی اور اپنی بی جان کے منہ پر یہ فائل مارے گی اور ان سے کہے گی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی حفاظت کیوں نہیں کی؟ کیوں ان کو حویلی سے باہر جانے دیا جب ان کے خون کے پیاسے بھیڑیے ان کی تلاش میں

تھے؟ کیوں انہوں نے قاصدوں کے پیغام آنے تک اس کے باپ کو چار دیواری میں نہیں رکھا۔

اس نے فائل لے لی۔

''ٹھیک ہے لے جاتی ہوں مگر خدا کی قسم اس کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ بھرائے دل سے بولی اور آنکھوں کی نمی مٹانے لگی۔

''تمہارے بابا اور میں نے بہت اچھا وقت گزارا ہے گل۔ اس نے جب بھی ذکر کیا تمہاری قابلیتوں کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ فائل اب کسی کام کی نہیں مگر تمہارے پاس ایک چیز کام کی ہے۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔ وہ لمبے چوڑے اور مضبوط انسان تھے۔ ''تمہارے بابا کے تمہارے لیے دیکھے گئے خواب۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے بہت سارے خواب دیکھے ہیں۔ تم جانتی ہو، تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں ایک پروفیسر ہے رافعہ سلطان۔ وہ ہمیں تیسرے سمیسٹر میں انگریزی پڑھانے آئی تھیں۔ کلیم اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے تمہارے لیے فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں انگریزی پڑھائے گا اور تم بھی انہی کی طرح پٹر پٹر انگریزی بولو گی۔'' انہوں نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

''میں تم سے یہی کہوں گا کہ اللہ نے تمہیں میرے پاس لانے میں دیر اس لیے کی تاکہ تم اس جھمیلے میں مت پڑو اور اپنے بابا کی خواہشات پر فوکس کرو۔ فرض کرو تم پہلے آجاتیں تم جہانگیر کو مروا دیتیں تو تم میں اور جہانگیر میں کیا فرق رہ جاتا۔ اس کا حاصل کیا آتا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ یہی انسان کی عمر ہے۔ اس کے بعد موت کا سفر ہے۔ ایک بوڑھے آدمی کو مار کر تمہیں کیا ملتا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اچھا ہوا تمہیں اللہ نے دور رکھا۔ اب تم بس اپنے بابا کے خوابوں پر دھیان دو۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ بلتیوں نے بلاشبہ بہت برا کیا۔ بہت برا۔ مگر اللہ نے اس انسان کو سبق سکھا دیا ہے۔ وہ پانی میں ڈوب کر مر چکا ہے۔ اب اس کے مردہ جسم سے تمہیں تسکین

نہیں ملے گی۔اس لیے اپنی راہ لگو گل۔اپنے بابا کے لیے جیو۔ان کے خوابوں کو پورا کرو۔وہ جیسا تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ویسا بنو۔"

انہوں نے انتہائی محبت اور شفقت سے سمجھایا۔

گل کے پاس بچا ہی کیا تھا؟ وہ انجان ہو کر کچھ نہ کر پائی تھی تو جان کر کیا کر لے گی؟ اس کے پاس دوسرا انتخاب نہیں تھا۔اس لیے وہ پھیکی سی مسکرائی اور تائیدی انداز میں سر کو خم دیا۔انہوں نے دراز سے ایک کارڈ نکالا اور اس پر کچھ ہندسے لکھے۔

"یہ میرا ذاتی نمبر ہے۔اسے رکھ لو۔زندگی میں کسی بھی مقام پر میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک مجھے فون کر دینا۔تمہارا یہ دوسرا باپ،تمہارے لیے حاضر ہو جائے گا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔اس نے متورم آنکھوں سے سر ہلایا۔

"نہیں میں ادھر ہی ہوتی ہوں۔"

"جانتی ہو۔میں نے ہر انسان کا سوچا تھا کہ وہ آئے گا کلیم کے بارے میں مجھ سے ملنے۔میں نے کبھی تمہارا نہیں سوچا تھا۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

اس نے کارڈ مٹھی میں دبایا۔"اور میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری ماں کی بجائے آپ مجھے سچائی بتائیں گے۔" وہ تلخی سے بولی۔احتشام ہلکا سا مسکرایا۔وہ ماں بیٹی کے معاملات میں کیا مداخلت کر سکتا تھا؟ اگر اس کی ماں نے نہیں بتایا تھا تو ان کا مقصد بھی اسے ان جھمیلوں سے دور رکھنا ہوگا۔اس کو اپنے بابا کے خوابوں کے تابع کرنا ہوگا اور کیا.....

وہ احتشام صاحب کے گارڈ اور ڈرائیور کے ساتھ واپس اپنے ہاسٹل روانہ ہو گئی۔آج دل سے بوجھ اترا نہیں تھا۔مزید بڑھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنی کلاس کی راہداری میں پنڈولم کی طرح دائیں بائیں ٹہل رہا تھا مگر یہ ٹہلنا اتنا تیزی سے تھا کہ الامان الحفیظ۔ ذیشان کرسی کے ہینڈل پر بیٹھ کر اس کی اڑتی ہوائیاں دیکھ رہا تھا۔ دو گھنٹے میں فائنل اسائنمنٹ جمع کروانی تھی اور گل لالہ صاحبہ نے اب تک اس کو اسائنمنٹ دکھائی نہیں تھی۔

''ایک سو پینسٹھ۔ ایک سو چھیاسٹھ۔ ایک سو ستاسٹھ۔'' ذیشان اس کے چکر گن رہا تھا۔

''چپ کرو۔ میرا دماغ کھول رہا ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ دو گھنٹے۔ صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ وہ فرعون مجھے دنیا سے رخصت کرے گا۔ کچھ کرو ذیشان۔ کچھ کرو۔'' وہ بے حد بے چین تھا۔

''میری اسائنمنٹ کی کاپی نکال لو۔ کیا پتہ چلے گا اس لگڑو کو۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کی طرف دوستانہ انداز میں بڑھائی۔

''تمہاری اسائنمنٹ.....'' اس نے طنز سے ذیشان کو دیکھا۔ ''اس سے بہتر ہے میں لگڑو سے معذرت کرلوں۔''

ذیشان کا منہ بن گیا۔ (بھلائی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔) وہ چلتے چلتے دروازے تک گیا اور سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہاں فوٹو کاپیئر کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ فوٹو کاپیئر کے پاس آنے والے ہر بچے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اس نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''شٹ.....''

''نہیں آئی ناں۔ مجھے پتہ تھا۔ اس نے کہیں اور پرنٹ نکال لیا ہوگا۔ دیکھ لینا۔'' ذیشان نے باور کرایا۔

''جی نہیں۔ اس کا ریکارڈ ہے۔ وہ یہیں سے پرنٹ نکالتی ہے۔ اس نے آج تک یونی ورسٹی کے دوسرے فوٹو کاپیئر کی خدمات نہیں لیں۔'' اس نے ذیشان کی بات کی تردید کرتے ہوئے وثوق

سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر انتظار کرو۔اس کی کلاس آدھے گھنٹے میں شروع ہو جائے گی۔وہ اگر اب تک نہیں آئی تو یقیناً پرنٹ نکلوا چکی ہے۔تم مانو یا نہ مانو۔'' ذیشان نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

''وہ بہت تیز لڑکی ہے ذیشان۔وہ ہمیشہ دس منٹ پہلے پرنٹ نکالتی ہے اپنی اسائنمنٹس کا تاکہ کسی بھی بچے کو اس کی کاپی کرنے کا وقت نہ ملے۔''

''کیا گارنٹی ہے کہ اس آخری لمحے میں وہ تمہیں اپنی اسائنمنٹ دکھا دے گی؟'' ذیشان نے چوٹ کی۔

''میں اب کی بار مانگوں کا تھوڑی ہی۔'' اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''پھر؟'' ذیشان نے سانس روکے کے پوچھا۔

''میں اس بار.....'' وہ رکا اور اس کی طرف رازدارانہ انداز میں جھکا۔''میں چراؤں گا۔''

''کیا.....'' وہ کرنٹ کھا کر کھڑا ہوا۔''کک.....کیسے؟''

'' تم دیکھتے جاؤ بس۔'' اس نے شاطرانہ انداز میں سر کو جھٹکا دیا۔اسی لمحے وہ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آتی دکھائی دی۔اس کے ساتھ عنبر تھی۔وہ گلابی شلوار قمیص پہنے، کندھوں پر چادر ڈالے، بانہوں میں فائل پکڑے فوٹو کاپیئر کی طرف جا رہی تھیں۔

''آ گئی ہے۔وہ دیکھو فوٹو کاپیئر کی طرف جا رہی ہے۔چلو میرے ساتھ۔'' اس نے ذیشان کی کلائی پکڑی اور ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔چوں کہ لابی میں بے تحاشا طالب علم گزر رہے تھے اس لیے ان دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ دونوں ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔فوٹو کاپیئر کے پاس رک کر گل نے فائل کاؤنٹر پر رکھی اور فوٹو کاپی کرنے والی باجی سے باتیں کرنے لگی۔اس کے دائیں بائیں اور بھی بچے پرنٹ اور فوٹو کاپیاں نکال رہے تھے۔ہجوم کی وجہ سے عنبر شاپ سے سائیڈ پہ

کھڑی ہوگئی۔ یہ دونوں شاپ کے پاس نہیں گئے۔

انہوں نے اس لڑکے کو جو وہاں کھڑا تھا، اس سے کہہ کر عنبر کو اپنی طرف بلایا۔ عنبر ایک نظر گل کو دیکھتی ان دونوں کی طرف چلی آئی۔ اسد نے ذیشان سے فائل چھین لی۔

''تم نے چپ رہنا ہے۔ اب دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔'' اس نے عنبر کے قریب آتے ہی ذیشان کو بڑبڑاتے ہوئے تنبیہہ کی۔

''کیا ہوا۔ تم نے بلایا مجھے۔'' عنبر نے اسد کو پہچان لیا تھا۔ اس لیے بغیر کسی تکلف کے پوچھنے لگی۔

''میں نے اس لیے بلایا ہے کہ بھونچال آ گیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ کون لایا ہے میں نہیں جانتا مگر اب کچھ برا ہونے والا ہے۔'' وہ ہراساں انداز میں بولا۔ عنبر کے ماتھے پر بل پڑے۔

''کیا مطلب؟''

''ایچ او ڈی نے آپ کی دوست گلِ لالہ کو اپنے آفس بلایا ہے۔ وہ آگ کا گولہ بنی ہوئی ہیں۔ اپنے آفس کی ہر چیز انہوں نے تہس نہس کر دی ہے۔ انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر گلِ لالہ دس منٹ کے اندر ان کے پاس نہ آئی تو وہ بہت بری طرح پیش آئیں گی۔ اس لیے آپ اپنی دوست کو فی الفور وہاں بھیجیں اس سے پہلے کہ مس ایچ او ڈی آتش فشاں بن کر پھٹ جائیں اور پورا ڈیپارٹمنٹ ان کے غصے سے جل کر راکھ ہو جائے۔'' اس نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کہا۔

''میم نے یہ پیغام تم دونوں کے ذریعے بھجوایا ہے؟'' عنبر نے دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''نہیں۔ ہمیں تو مس فضہ نے بتایا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تمہاری کوئی چال ہے یہ۔ اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں۔'' عنبر نے ناک پر انگلی سے چشمہ پیچھے کیا۔

''آپ کو بتانا ہمارا فرض تھا۔ آگے آپ یقین کرتی ہیں یا نہیں۔ آپ کی مرضی۔ خیر۔ ہم چلتے ہیں۔ ہماری کلاس ہے اور مجھے اپنی اسائنمنٹ جمع کرانی ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے فائل دکھائی اور پلٹ کے چلا گیا۔ عنبر سر جھٹک کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں کلاس میں آئے۔ چوکھٹ کے ساتھ سیدھے کھڑے ہوگئے اور ایک آنکھ باہر نکالی۔

''وہ جائے گی؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''سو فیصد۔'' وہ مسکرایا۔

''ہیلو عنبر۔'' اسی لڑکے نے جو فوٹو کاپیئر کے پاس اسد کے لیے چوکیداری کر رہا تھا۔ انتہائی خوش اخلاقی سے عنبر کو پکارا۔

اس نے سر اٹھایا۔ ''جی؟''

''آپ کی دوست گل لالہ کو ایچ او ڈی بلا رہی ہیں۔ بے حد غصے میں ہیں۔ جلدی جائیں۔''

عنبر نے حیرت اسے دیکھا۔ کیا واقعی ایچ او ڈی غصے میں تھی۔ اگر وہ غصے میں تھیں تو اس کا مطلب ڈیپارٹمنٹ میں طوفان آنے والا تھا۔ وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ گل فوٹو کاپیئر کو فائل سے کاغذات نکال کر کچھ سمجھا رہی تھی۔ وہ سرپٹ اس کی طرف بھاگی اور اسے بازو سے پکڑ کر گھمایا۔

''گل! تمہیں ایچ او ڈی بلا رہی ہیں۔ بہت غصے میں ہیں۔ ہری اپ۔''

''واہ بھائی واہ۔ پلاننگ میں تو تم استاد ہو۔'' ذیشان نے اسد کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔

''کیا مطلب؟ کیا کہہ رہی ہو؟'' گل پریشان ہوئی۔

''سوال مت کرو۔ چلو میرے ساتھ۔ وہ آگ کا گولہ بنی ہوئی ہیں۔ کچھ دیر میں آتش فشاں بن کر پھٹ جائیں گی۔ کم آن۔'' عنبر نے اسے کھینچا۔

''اچھا ایک منٹ۔'' وہ مفاہمت سے کہتی رکی اور فوٹو کاپیئر باجی کو کو دیکھا۔ ''آپی ان تمام کاغذات کی ایک کاپی بنادیں۔ میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔''

فوٹو کاپیئر باجی نے سر ہلایا۔ وہ عنبر کے ساتھ سیڑھیوں والی راہداری میں گم ہوگئی۔ ان کے جاتے ہی وہ دونوں باہر آئے۔

'' پکڑو اپنی اسائنمنٹ۔'' اس نے نخوت سے فائل ذیشان کے ہاتھ میں رکھی۔ ذیشان نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ (ناشکرا۔)

وہ دھونس سے قدم اٹھاتا فوٹو کاپیئر کے پاس آیا اور کاؤنٹر پر رکھی گل کی فائل کھولی۔

☆.....☆.....☆

وہ بیگ، چادر، کتابیں سنبھالتیں، گرتی پڑتیں، پھسلتیں سیڑھیاں اترتیں، طالب علموں سے ٹکراتی بھارتی فلموں میں غنڈوں کے پیچھے بھاگنے والے ہیرو کی طرح اٹکتی، ڈگمگاتیں پورے پانچ منٹ میں ایچ او ڈی کے آفس کے سامنے پہنچ گئی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے پاس رک کر گل نے کمر پکڑ لی۔ اس کے گردوں میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا۔ عنبر نے دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر ایچ او ڈی کا دروازہ کھولا اور کسی چھاپے مار ٹیم کی طرح دندناتی ہوئی اندر گئی۔ کتاب پڑھتی، اے سی روم میں پرسکون بیٹھی ایچ او ڈی نے دونوں کو چونک کے دیکھا۔

''میم! پلیز آپ پرسکون ہو جائیں۔ جو بھی ہوا ہے۔ ہم صفائی دینے کو تیار ہیں۔''

وہ دونوں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

''کون ہیں آپ لوگ؟ یہ طریقہ ہے اندر آنے کا؟'' ایچ او ڈی نے تلملا کر کتاب بند کردی۔

''میم آئی ایم سوری۔ ہم سے غلطی ہوگئی ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم بہت بدتمیز اور جاہل لڑکیاں ہیں۔ آپ ہمیں معاف کردیں اور خود کو ٹھنڈا کرلیں۔ ہم آپ کو پوری صفائی دیں

گے۔'' عنبر تیر تیز بول رہی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ ہیں کون آپ؟'' ایچ اوڈی برہم ہوگئیں۔

''میم! میں عنبر امین اور یہ گلِ لالہ جسے آپ نے بلایا ہے۔ یہ لڑکی بہت شریف ہے۔ یہ غلط کام نہیں کرتی۔ آپ پلیز اسے معاف کردیں۔'' وہ کیا بول رہی تھی۔ دونوں فریقین کے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو۔ پلیز صاف صاف کہو۔'' میم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔

''میم! ابھی مجھے فائنل سمیسٹر کے دو لڑکے ملے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ نے گلِ لالہ کو بلایا ہے اور آپ اس پر بہت غصہ ہیں۔ پلیز میم۔ ہمارا فائنل سمیسٹر ہے ہمارے ساتھ کچھ مت کیجیے گا۔'' اس نے ہاتھ جوڑ لیے اور گڑگڑانے لگی۔

''میں نے تم دونوں کو نہیں بلایا۔ میں کیوں بلاؤں گی۔'' ایچ اوڈی عاجزی سے بولی۔

''آپ نے نہیں بلایا؟'' عنبر کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''نہیں۔''

وہ نڈھال انداز میں پیچھے ہوگئی اور چاروں طرف کمرے میں نظر ڈالی۔ کمرے میں ہر چیز ترتیب اور اپنی جگہ پڑی ہوئی تھی۔ کچھ تہس نہس نہیں ہوا تھا۔ میم بھی پرسکون تھیں۔ اس کا مطلب ان دونوں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے غصے سے آنکھیں میچ لیں۔

''تم سے کن دو لڑکوں نے کہا کہ میم نے بلایا ہے؟'' گل نے پوچھا۔

''کسی نے بھی نہیں گل۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ ''سوری میم۔ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ وی آر رئیلی ویری سوری۔ چلو۔'' وہ گل کا ہاتھ پکڑ کے جھینپ کے پیچھے ہونے لگی۔

''مجھے بتاؤ تمہیں کس نے کہا کہ میم نے بلایا ہے؟'' گل نے ہاتھ جھٹکا اور سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے

خوفزدہ سی نظر گل کی طرف اٹھائی۔ وہ گھور رہی تھی۔ اس نے تھوک نگلا۔ اس نے سینے سے ٹھوڑی لگا لی۔ ''وہ.....وہ.....سیکشن سی کے اسد اور ذیشان نے.....''

گل نے پیشانی پر ہاتھ دے مارا۔

''اوہ عنبر۔ تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو.....انہوں نے.....'' پھر وہ ٹھہری۔ احتشام صاحب کی فائل ذہن میں کھٹکی، ایک جھماکا سا ہوا۔

''اوہ خدایا۔'' وہ بجلی سی تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ کہیں وہ فائل کو اسائنمنٹ سمجھ کے کچھ کر نہ لیں۔ وہ امانت تھی۔ اسے واپس کرنا تھی۔ وہ باہر نکلی تو عنبر نے جھینپتے ہوئے دانت نکال کر میم کو دیکھا۔ میم تیورا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اسے سخت قسم کی شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ وہ بلی کی طرف قدم قدم پیچھے ہوئی اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا پھر دل پہ ہاتھ رکھا اور ہونٹ گول کر کے سانس چھوڑ دی۔

''شکر.....جان بچ گئی.....''

وہ جس طرح اندھا دھند بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اسی طرح بھاگتی ہوئی اوپر گئی تھی۔ فوٹو کاپیئر کے پاس پہنچ کر اس نے کاؤنٹر کو پکڑے پکڑے بریک لگائی۔

''آپی۔ میری فائل؟'' اس نے بے حد ہڑبڑا کے پوچھا۔ آپی نے چونک کے اس کی ہوائیاں دیکھیں پھر دوسری طرف پڑی اس کی فائل اور فوٹو کاپی کاغذات لا کر اسے دے دیے۔

''یہ لو۔ اتنی پریشان کیوں ہو گئی۔ نکال دی ہے میں نے کاپی۔'' آپی نے منہ بسور کے کہا۔ اس نے تیزی سے فائل کھولی۔ صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کاغذات وہی تھے۔ سب ترتیب سے پڑے تھے۔ ایک بھی چیز غائب نہیں تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ شکر اس نے فائل کو کچھ نہیں کیا تھا مگر اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ شاید اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ فائل وہ نہیں، جو اسے چاہیے تھی۔ اس

لیے چھوڑ دی ہوگی۔ چلو اللہ کا شکر ہے۔ سب محفوظ تھا مگر یہ عنبر کی بچی۔ اس کو چھوڑوں گی نہیں۔ چترالی لڑکی کا مکا کھائے ہوئے اسے بہت دن جو ہو گئے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے بعد:

آج قریباً چار بجے وہ فارغ ہوئی تھی۔ سارا دن بے حد مصروف گزرا تھا۔ اس کی ٹانگیں مسلسل چلنے کی وجہ سے بری طرح دکھ رہی تھیں۔ وہ صبح جیسے ہشاش بشاش گئی تھی، واپسی پر اتنی ہی نڈھال اور ماندہ ماندہ چل کے آرہی تھی۔ چہرے پر بیزاری اور اکتاہٹ چھائی ہوئی تھی۔

وہ پیر رپٹے جیسے ہی ہاسٹل کے گیٹ سے اندر داخل ر ہوئی، نظر سامنے چوکیدار کے ساتھ براجمان آدمی پہ گئی۔ چوکیدار کی چھوٹی سی چوکی میں وہ کرسی پر بیٹھا، پیروں میں نیلے رنگ کے بڑے بڑے شاپر رکھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار فون میں تاریخ دیکھی۔ آج دو تاریخ تھی۔ یعنی وہ پھر سے ماں کا خط اور ماں کے لوازمات لے کر آیا تھا۔ اف.....

اس نے ضبط سے سانس کھینچی اور قدم قدم چلتی چوکی کے قریب آئی۔ ''سلام۔''

اس کی آواز پہ بخت محمد نے سر اٹھایا۔ سامنے وہ چادری میں چھپی، پہلو میں ہاتھ گرائے ماتھے پر بل لیے کھڑی تھی۔

وہ سٹپٹا کے کھڑا ہو گیا۔ ''سلام بی بی۔ کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے ٹھنڈا سا جواب دیا۔ بخت نے پیروں کے جوتوں سے اسے دیکھنا شروع کیا اور سر کے بالوں پر ختم کر دیا۔ وہ ٹھیک تھی۔ وزن بھی متناسب تھا۔ آنکھوں کے نیچے البتہ حلقے تھے جنہیں دیکھ کے بخت محمد گھبرا گیا۔

''بی بی..... آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

گل جانتی تھی کہ اس نے حلقے دیکھ لیے ہیں مگر وہ جواب کیوں دے؟ وہ کسی کو جوابدہ نہیں ہے۔اس لیے سر جھٹک کر شاپر اٹھا لیے۔ملازم بے چینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس نے کھڑے کھڑے شاپر کھول کر دیکھا۔اندر سیل پیکٹس میں میوے، چادریں، کپڑے اور کچھ ڈبے پڑے تھے۔اس نے کوفت سے شاپر بند کر دیا۔(پھر وہی سامان.....ہونہہ)

''شکریہ۔مل گئی ساری چیزیں۔اب تم جا سکتے ہو۔'' اس نے بے نیازی سے ہاتھ جھلایا اور پلٹ کے جانے لگی۔

''بی بی بات سنیں۔'' وہ بے قراری سے آگے آیا، اس کا راستہ روک لیا۔

پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔بخت محمد کی پشت سے سورج کی زرد شعاعیں نکل نکل کے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔بخت محمد کا چہرہ سیاہی میں تھا۔اس نے جیب سے ماں کا خط نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔اس کے ماتھے پر بل پڑے۔

''مجھے نہیں چاہیے۔واپس لے جاؤ۔'' وہ بے رخی سے بولی۔

''بی بی۔حویلی کے حالات ٹھیک نہیں۔بڑی بی بی نے کہا ہے کہ یہ ہر حال میں آپ تک پہنچا دوں۔آپ ان کا آنے والا کوئی خط مت پڑھیے گا مگر اسے پڑھ لیں۔'' بخت محمد نے گزراش کی۔آج سے پہلے ماں نے کبھی کسی خط کے ساتھ پیغام نہیں بھجوایا تھا۔وہ جانتی تھیں کہ گل پڑھتی ہے اگر آج ایسا پیغام آیا تھا تو ضرور کچھ نہ کچھ حویلی میں چل رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ملازم سے خط لے لیا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب میں ڈال دیا۔

''بی بی! تحمل سے پڑھیے گا۔''

اب کی بار وہ برہمی سے اسے دیکھنے لگی۔''کیا ہے اس میں ایسا ہاں؟ کیوں کر رہے ہو اتنی نصیحتیں؟''

''معذرت چاہتا ہوں مادام۔'' وہ بری طرح شرمندہ ہوگیا۔اس نے تلملا کے اسے دیکھا۔دل تو چاہا اس کا منہ نوچ لے۔ماں کا چمچہ نہ ہوتو۔مگر وہ کوئی تماشا نہیں کھڑا کرنا چاہتی تھی۔اس لیے اس پر لعنت بھیج کر اپنے ڈورروم کی طرف چل پڑی۔

ڈورروم میں آ کے اس نے ساری چیزیں بیڈ پہ پھینکیں۔عنبر اور زینب آ چکی تھیں۔اسے سامان لاتا دیکھ کے لپکتے ہوئے آگے بڑھیں اور نیلے سے شاپر پہ جھپٹ پڑیں۔اس نے خود سے چادر کھینچ کر الگ کی اور فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔وہ جلدی سے جلدی خط پڑھنا چاہتی تھی۔

عنبر اور زینب اب ایک ایک چیز شاپر سے نکال کے دیکھ رہی تھیں۔

اس کی ماں اس کے لیے ہر ماہ کسی نہ کسی ملازم کے ہاتھوں ڈھیر سارے سوغات بھیجا کرتی تھیں۔ماں سے اسے خاص لگاؤ نہیں تھا۔ان کی بھیجی ہوئی چیزوں کو وہ کھٹے دل سے قبول کرتی تھی۔بارہا ملازم کو سمجھایا تھا کہ ان کی چیزیں مت لایا کرے مگر وہ ہر ماہ پھر سے آجاتا تھا۔

یا تو وہ ملازم ڈھیٹ تھا یا پھر اس کی ماں۔

یہاں آ کر وہ ماں کا خط بھی دے جاتا تھا۔حویلی میں خواتین کو فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔وہاں نہ لینڈ لائن تھی اور نہ کسی کے پاس ذاتی فون تھا۔اس نے یہاں آ کر ضرورت کے لیے فون خرید لیا تھا۔حویلی کے مردوں کے پاس فون تھے مگر اس نے کبھی اپنے کسی کزن کو فون کر کے ماں سے بات نہیں کی تھی۔وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اس کی ماں جو دسویں پاس تھی۔وہ اس کے لیے خط لکھتی تھیں۔اپنے ہر خط میں انہوں نے اپنی بچوں جیسی رائٹنگ میں تین صفحے لکھے ہوتے تھے جس میں حویلی کے تمام معاملات سے لے کر موٹی چچی کی چالوں، یوسف خان کے احکام، ابتہاج کی ہٹ دھرمی اور ابراہیم کی شرارتوں کے قصے

ہوتے تھے۔خود اپنے بارے میں انہوں نے کبھی نہیں بتایا تھا۔اچھا تھا۔نہیں بتاتی تھیں۔اگر ذرا بھی وہ اپنے بارے میں لکھ لیتیں تو ملازم کا لایا ہوا اگلا خط وہ پڑھنے سے پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی۔اسے ماں کے حالات جاننے میں دلچسپی نہیں تھی۔وہ خوش تھیں اپنے بچوں کے ساتھ۔انہیں مزہ آتا تھا گل لالہ سے دور رہ کے۔جہاں وہ اتنے امن میں تھیں،وہ کیوں کر اپنے حالات بیان کریں گی۔ہونہہ۔

اس نے ایک بھی خط کا جواب انہیں نہیں دیا تھا۔وہ جانتی تھی کہ ماں کو ہر بار انتظار ہوتا ہوگا۔ملازم کو خالی ہاتھ دیکھ کے وہ مایوس بھی ہو جاتی ہوں گی۔مگر وہ کیوں خط لکھے؟ کیوں بتائے وہ کیسی ہے؟ کیا انہوں نے پچھلے سولہ سال سے اس کی خبر لی تھی؟ وہ کہاں ہوتی ہے۔کیا کرتی ہے۔کس کے ساتھ کھاتی ہے۔کس کے ساتھ سوتی ہے کیا انہوں نے کبھی اس کے بابت فکرمندی ظاہر کی تھی؟ نہیں۔انہوں نے اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ دیا تھا۔اس وقت اس کی عافیت کے بارے میں پتہ کرنا اہم تھا۔اب نہیں۔اب تو وہ بڑی ہوگئی تھی۔اپنا خیال رکھ سکتی تھی۔اب اسے کسی خیر خواہ اور خواستگار کی ضرورت نہیں تھی۔

ملازم جب جب آتا تھا۔اسے سرتا پیر دیکھتا تھا۔اس نے کیسے کپڑے پہنے ہیں۔اس کا وزن کتنا ہے۔رنگت کیسی ہوگئی ہے۔آنکھوں کے نیچے حلقے تو نہیں۔کوئی زکام یا کوئی بیماری۔ دوائی تو لے رہی ہے یا نہیں۔بال تو نہیں کاٹے تھے۔رنگ تو نہیں کیا تھا۔کوئی ٹیکا،ٹیٹو یا چہرے میں کوئی چھید تو نہیں کرایا تھا۔وہ پورے غور سے اس کا جائزہ لیتا تھا۔وہ جانتی تھی کہ ماں نے اسے ایسا کرنے کو کہا ہے۔پہلے پہل وہ اسے دیکھتے وقت بہت ہچکچاتا تھا کیوں کہ وہ حویلی کا ملازم تھا اور حویلی کے ملازموں کو حویلی کی عورتوں کو دیکھنے کی قطعی اجازت نہیں تھی مگر پھر وہ جیسے اس کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ماں نے کر دیا تھا۔ان کے اس کے بابت پوچھے جانے والے ہزار سوالوں نے کر دیا

تھا۔وہ دس منٹ کی ملاقات کا اختتام ہمیشہ ''معذرت بی بی۔معافی چاہتا ہوں'' کے الفاظ سے کرتا تھا۔وہ بھی سر جھٹک دیتی تھی۔وہ ماں کی تڑپ سمجھ سکتی تھی مگر وہ انہیں تڑپانا چاہتی تھی۔ان کے بھیجے گئے تھے ڈھیروں ڈھیر سوغات کا سارا مزہ زینب اور عنبر لیتی تھیں۔وہ اگر سوغات کھاتی بھی تھی تو محض اپنے چترال کی وجہ سے۔ان میوں میں سے چترال کی خوشبو آتی تھی۔عنبر اور زینب کے وارے نیارے ہوگئے تھے۔وہ ہر رات اس کے میوں سے پیالے بھر کے نیچے ''ٹی وی ہال'' میں لے جاتی تھیں۔ٹی وی ہال میں ہر رات ایک ''شریف فلم'' لگی ہوتی تھی جس کے لیے پورا ہاسٹل جمع ہوتا تھا۔وہ کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔اسے فلموں میں دلچسپی نہیں تھی۔البتہ اگر وہ ''پولو'' کا کوئی میچ لگا دیتے تو گل لالہ ساری رات وہاں بیٹھی رہ سکتی تھی۔

وہ باہر نکلی تو وہ دونوں سارا سامان کھول کے پستہ،بادام اخروٹ کھا رہی تھیں۔اسے آتا دیکھا تو بے شرمی سے مسکرائیں۔

''گل !اس دفعہ تمہاری ماں نے کڑھائی والی چادر بھیجی ہے۔دکھاؤں؟'' زینب بے تابی سے چادر کھول کر لہرانے لگی۔وہ سر جھٹک کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی اور جھک کے کتاب میں رکھا خط باہر نکالا۔

''یہ دیکھو۔یہ اونی کڑھائی بھی ہوئی ہے اس پہ۔'' زینب اپنے بازو اور کندھے پر چادر ڈالے اسے بتا رہی تھی۔اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔سیاہ رنگ کی شال پہ سرخ رنگ کی کڑھائی ہوئی تھی مگر اسے ان کی بھیجی ہوئی کوئی چیز نہیں چاہیے تھی۔اس نے ہاتھ سے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور بالکونی میں چلی گئی۔زینب نے مڑ کے اسے دیکھا۔وہ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

بالکونی کا دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے وہ پرانی لکڑی کی کرسی پہ پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی۔سورج غروب ہو رہا تھا۔اس کی سرخ نارنجی روشنی آسمان کے آخری کونے میں پھیلی ہوئی

تھی۔اس نے کئی تہوں میں لپٹے ماں کے خط کو دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا۔آج وہ تین نہیں پورے چھ صفحات پر مشتمل تھا۔اس کا حجم دیکھ کے اس کے دل کو کچھ ہوا۔اس نے خشک گلا تر کیا اور پڑھنے لگی۔

''السلام علیکم گلے (میری جان، میرا بچہ۔ایسے لفظوں کو وہ چھوڑ دیتی تھی)۔میری دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو، آباد رہو۔(یہ بھی اگنور کر دیا)۔گلے بچے، حویلی میں ایک بہت بڑا فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔(ماں کبھی تمہید کے بغیر نہیں کرتی تھیں۔اس کا مطلب معاملہ واقعی سنگین تھا۔)تم چھوٹی تھیں تو میں کبھی تمہیں بتا نہیں سکی مگر تم سب جانتی ہو۔بلتیوں نے تمہارے باپ کے ساتھ کیا کیا تھا۔تم اس سے واقف ہو۔اس لیے مجھے شروع سے یہ کہانی سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔میں جو تمہیں کہنے جا رہی ہوں وہ یہ ہے کہ تمہارے تایا جان بلتیوں کے ساتھ ہماری سولہ سال پرانی دشمنی ختم کرنے والے ہیں۔(اس کے دل پر گھونسا پڑا، وہ بے اختیار آگے ہوئی)تمہاری دادی نے اور تمام گھر والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب اس قبائلی چپقلش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔

میں ایسا نہیں کہہ رہی کہ تم آ کے یہ فیصلہ رکوا یا اس کے خلاف آواز اٹھاؤ۔بلکہ تمہیں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اب اس گند میں مزید نہیں رہنا چاہتے۔کیچڑ کو جتنا صاف کیا جائے اتنا گندہ ہوتا ہے۔اللہ نے امن کو جنگ پر فوقیت دی ہے۔اس لیے ہم سب زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اس معاملے کو رفع دفع کر رہے ہیں۔اس فیصلے میں میری مرضی شامل ہے گل۔تم یہ مت سمجھنا کہ شاید حویلی والوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا ہے(اس نے دانت پیس لیے)میں خود بھی اس دشمنی کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔تم اب بڑی ہو گئی ہو۔تمہارے بہن بھائی جوان ہو رہے ہیں۔اگر یہ خلش باقی رہی تو خدانخواستہ کل اپنے باپ کی جگہ تم لوگ ہو گے۔میں پرانی نسل کے گناہ نئی نسل کو نہیں بھگتنے دوں گی۔تم اور تمہارے بہن بھائی، میں تم سب کے لیے ایک اچھا اور بہتر مستقبل دیکھ رہی ہوں۔ایسا

مستقبل جس میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا، کوئی دشمنی نہ ہو۔ میں چاہتی ہوں تم لوگ آزاد ماحول میں جیو۔ تم لوگوں کو یہ ڈر نہ لگے کہ تمہارا دشمن تمہارے تعاقب میں ہے۔ میں کتوں کو نہیں، جگنوؤں کو تمہارے تعاقب میں لگانا چاہتی ہوں۔ میں روشنیوں کو تم لوگوں کے دامن میں سمونا چاہتی ہوں۔

تم اپنے باپ سے بدر جہا محبت کرتی ہو گل۔ میں مانتی ہوں۔ تم یہ سب سن کر شاید کھول جاؤ مگر تمہارے یہاں آنے کے بعد حویلی والوں کے سامنے دھاڑنے سے بہتر ہوگا کہ تم ادھر شہر میں ہی چیخ چیخ کر اپنی بھڑاس نکال لو۔ یہاں آ کے اگر تم نے آواز بھی اونچی کی تو دوبارہ کبھی بول نہیں پاؤ گی۔ اس لیے میری جان، میرے دل! تم سارا غصہ، ساری کلفت وہیں چھوڑ کے آنا۔ تمہارے لیے اور میرے لیے یہی بہتر ہے ہم دونوں امن کو ترجیح دیں۔ بلتیوں کے ساتھ صدیوں کے تعلقات ہیں۔ ہم یہ تعلقات بحال کرنا چاہتے ہیں۔ اب خان جی کبھی واپس نہیں آسکتے گل۔ ہم دنیا والے یہ خلشیں، یہ بدگمانیاں رکھ کے کیا کریں گے؟ میں مانتی ہوں وہ ہمارے گناہگار ہیں۔ انہوں نے تمہارے بابا کو مارا ہے مگر گل ہم واویلا کر کے کیا کر سکتے ہیں؟ قتل کے بعد شور سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ استقامت اور صبر بڑی چیز ہے۔ تم اپنا دل بڑا کرو۔ اس میں فراخ لاؤ اور بلتیوں کو معاف کر دو۔ صرف اپنے مستقبل کے لیے کیوں کہ تمہیں میں رائفل نہیں اٹھانے دوں گی۔ تمہارے باپ نے تمہیں قلم پکڑایا ہے گل۔ تم قلم کا حق ادا کرو گی۔ خاندانی دشمنیوں اور خاندانی جھگڑوں میں پڑ کر تم اپنی ماں کو دوبارہ اس اذیت سے نہیں گزارو گی۔ میری جگر کے ٹکڑے! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ تم میری قیمتی متاع ہو۔ اس لیے میں تم سے یہی کہوں گی اپنا دل بڑا کرو۔ اپنے دل میں درگزر پیدا کرو۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر تم اس نہج پر اللہ کی سن لو گی تو زندگی میں کسی دوسری نہج پر اللہ تمہاری سنے گا۔

اس وقت تمہارے پاس دو انتخاب ہیں۔ اول، تم بندوق اٹھاؤ اور باپ کا بدلہ لو۔ دوم، تم قلم

اٹھاؤ اور اپنے بابا کے خواب پورے کرو۔ انتخاب کا اختیار تمہیں ہے۔ تم دونوں کے مستقبل سوچ کے اپنا فیصلہ کر لینا۔ مگر یاد رہے بندوق کا مستقبل ہمیشہ سیاہ رہا ہے اور قلم کا مستقبل ہمیشہ روشن۔ اگر آج تم نے ٹھیک فیصلہ کیا تو کل تم زندہ و جاوید ہو گی اور اگر آج تم نے غلط فیصلہ کیا تو میں تمہارے باپ کے ساتھ تمہاری قبر بھی کھود دوں گی۔

معاف کرنے والے کا ظرف بڑا ہوتا ہے میری جان، تمہارے بابا جان اب واپس نہیں آسکتے۔ ان کے بعد ہم چاہے جتنی بھی دشمنیاں کر لیں۔ چاہے جتنے بھی قتل کر لیں ہم کبھی انہیں لا نہیں سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ اللہ کے لیے..... محض اللہ کے لیے تم ان کو جانے دو۔ تم جان لینے والی نہیں، جان بچانے والی بنو گی میری پیاری بیٹی۔ تم لڑنے والی نہیں، صلح کرنے والی بنو گی۔ تم کسی سے بدلہ نہیں لو گی۔ کسی سے بھی نہیں۔ اور اگر تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال ہے تو اسے نکال دو۔ تم صلح کرنے والی لڑکی ہو، دشمنی کرنے والی نہیں۔ تمہیں کلیم خان جی نے ''امن'' کے لیے پیدا کیا تھا۔ ''جنگ'' کے لیے نہیں۔

میں امید کرتی ہوں تمہیں میری بات سمجھ آ گئی ہو گی اور اگر نہیں آئی تو ابراہیم کا واسطہ دے کر کہتی ہوں۔ رستم کی قسم دیتی ہوں۔ تمہارے مرے ہوئے باپ کا واسطہ دیتی ہوں گل۔ اب تم کسی سے نہیں لڑو گی۔ تم وہاں سے ایک باشعور اور با ادب لڑکی بن کر آؤ گی۔ تم لڑنے جھگڑنے والی لڑکی کبھی نہیں بنو گی۔

دو دن بعد فیصلہ ہے۔ بلتی والے لازم ہیں۔ وہ مجرم بن کر ہمارے قبیلے آئیں گے اور ہم انہیں معاف کر کے انہیں اپنا ظرف دکھائیں گے۔ ہم دنیا کے لیے نہیں، اللہ کے لیے انہیں معاف کریں گے۔ ہم اللہ کے لیے دل میں ہر بغض کو بھلا دیں گے۔

تم نے بھی بھلانا ہے۔ دل میں کچھ نہیں رکھنا۔ مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں گلے۔ میری

جان، اپنی ماں کو رسوا مت کرنا۔ میں تمہاری شکر گزار رہوں گی۔ میری لاڈلی بیٹی، میرا مان رکھ لینا۔ میری نظریں مت جھکا دینا۔

تمہاری ماں۔

اس نے چہرہ اٹھایا۔ چہرہ گردن تک بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور زکام زدہ سی سانس وہ کھینچ رہی تھی۔ اس کی ماں نے واسطے دیے، منتیں کیں، انہوں نے بابا کی کہانی کیوں نہیں سنائی۔ ماں نے کہا تم جانتی ہوگی۔ ہاں اسے ایک ہفتہ پہلے پتہ چلا تھا۔ اب تک اسے بہلایا جا رہا تھا۔ آج اسے سچائی پتہ چلی تھی۔ اس کی ماں کو لگتا تھا کہ وہ باپ کے مرنے کے وقت سات سال کی تھی۔ سات سال کے بچے کو کیا یاد رہ سکتا ہے؟ ہاں۔ سات سال کے بچے کو باپ کا قتل یاد نہیں رہ سکتا لیکن باپ کے ساتھ گزارے ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ ضرور یاد رہ سکتا ہے۔

اس نے خط کو کئی ٹکڑوں میں پھاڑا اور بالکونی سے نیچے اچھال دیا۔

☆.....☆.....☆

تاریخ: اٹھارہ سال بعد

مقام: لاہور

جون کی دوپہر تھی۔ قریباً چار بجے کا وقت تھا۔ پوری کالونی سو رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سناٹا تھا۔ بابا اور اماں سوئے ہوئے تھے۔ نادیہ (ملازمہ) اپنے کوارٹر چلی گئی تھی جب کہ احمد بھائی ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔ چوکیدار گیٹ کے پاس کھڑے ہو کے فون پہ سندھی میں بات کر رہا تھا۔

وہ اپنے ٹیرس میں جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پیروں کو اوپر کیے، کتاب گود میں رکھے، ایک مٹھی گال تلے رکھی ہوئی تھی۔ آسمانی رنگ کی کاٹن کی شارٹ قمیص کے نیچے، کلیوں والی پٹیالہ شلوار پہنے، بالوں کو جوڑے میں مقید کیے انہماک سے کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ہسپتال سے

آئی تھی۔ عادتاً دوپہر میں سوتی نہیں تھی۔ یہ وقت وہ اکثر کتابوں کے مطالعہ میں گزارتی تھی۔ یہ ہلکا پھلکا موڈ والا وقت ہوتا تھا۔

اس کے ٹیرس کا رخ لان کی طرف تھا جہاں سامنے گھر کا گیٹ تھا۔ آگے وقفے وقفے سے سوسائٹی کے گھر بنے ہوئے تھے جن کا نقشہ تقریباً ایک جیسا تھا۔ اس وقت سوسائٹی کی سڑکیں ویران تھیں۔ تیز دھوپ کی وجہ سے سب ہی گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بھی کمرے میں ہوتی لیکن اس کے ٹیرس میں سایہ آچکا تھا۔ اب وہ جگہ ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

اس نے گال سے مٹھی ہٹا کے کتاب کا ورق پلٹا جب کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ چیخ اتنی دلخراش تھی کہ سارے سناٹے میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔

وہ کتاب بند کر کے کھڑی ہوگئی۔ یہ کیسی آواز تھی؟ اتنی کرب ناک؟ وہ تیزی سے ریلنگ کے قریب آئی اور نیچے جھانکا۔ لان، برآمدہ، پورچ سب خالی تھا۔ گلی میں بھی خاموشی تھی۔ پھر یہ چیخیں کہاں سے آرہی تھیں؟ اس نے بائیں جانب مڑ کر نادیہ کے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

"نادیہ..... نادیہ..... باہر آؤ۔" وہ بے چینی سے چلانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازہ کھلا اور نادیہ سر پہ دوپٹہ اوڑھتی، پیروں میں جوتے اڑستی باہر آئی۔

"جی بی بی جی.....؟"

"یہ بلی کے چلانے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟"

"بلی کی آواز....." ملازمہ نے الجھن سے ادھر ادھر دیکھا۔ "شاید پیچھے کنسٹرکشن والی جگہ سے....."

اس نے جھٹ سے کتاب جھولے پہ رکھی اور بھاگتے ہوئے نیچے آئی۔ بیرونی گیٹ پہ چوکیدار

ہنوز باتیں کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھا تو فون بند کر دیا۔

"بی بی....." وہ کچھ کہتے کہتے رکا جب عبادہ نے خود سے گیٹ کھول دیا اور سڑک پہ نکل آئی۔ ملازمہ بھی تعاقب میں تھی۔ گھر کے پیچھے سوسائٹی کے نئے گھر بن رہے تھے۔ نیم بنی عمارتوں کے برہنہ ڈھانچے کھڑے تھے۔ مزدور تپتی دھوپ میں کام کر رہے تھے۔ ہر طرف اینٹوں، سیمنٹ، بجری اور ریت کے ٹھیلے تھے۔ ایک طرف کرین، بلڈوزر اور گارا بنانے والی مشین کھڑی تھی اور مشین غالباً چل رہی تھی۔ مزدور اینٹیں ٹھیلے میں بھر بھر کے لے جا رہے تھے۔

"بی بی .....آپ کے جوتے....." ملازمہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ جوتے پہن کے باہر نہیں آئی۔ اس کے پیر جھلس رہے ہیں لیکن وہ اپنے اعصاب میں نہیں تھی۔ وہ بلی کی آہ وزاری کا تعاقب کرتے ہوئے بھاگ رہی تھی۔ یہ جگہ دوسری جگہوں کے برعکس ویران اور اجڑی ہوئی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور چبھنے والی چھوٹی چھوٹی کنکریاں پورے میدان میں بکھری ہوئی تھیں۔ سیکٹر میں جس جگہ مٹی کھود کے بنیادوں کے لیے گڑھے بنائے گئے تھے۔ وہاں کی مٹی سخت ہو چکی تھی۔ اتنی سخت کہ اس پر چلنا پل صراط جیسا تھا۔

"بی بی جی.....آرام سے چلیں....." ملازمہ اس کے پیچھے چلتی، اس کچی پگڈنڈی سے بار بار پھسل رہی تھی۔

"آرام سے نہیں چل سکتی نادیہ۔ بلی مشکل میں ہے۔" وہ بے صبری سے بولی۔

کنسٹرکشن سائٹ پہ موجود مزدور اپنا کام چھوڑ کے اسے اندھا دھند بھاگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ سرتاپا پسینے سے تر تھی۔ اس کی سانس اتر بتر ہو رہی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے ایک مزدور کے پاس آئی جو ماتھے پر پٹی باندھے، اینٹیں ٹھیلے میں ڈال رہا تھا۔

"بلی.....بلی.....ک.....کی آواز.....سنی؟ کہاں سے آ رہی.....ہے.....کون تنگ کر

رہا..... ہے؟'' وہ سانسوں کی بے ترتیبی کی وجہ سے بول نہیں پا رہی تھی۔اس کا حال بھی مزدوروں جیسا ہو گیا تھا۔ چہرہ نم، سرخ اور گرمی سے تپ رہا تھا۔

'' آواز، نہیں تو..... نہیں آ رہا.....'' مزدور نے ایسی ہانکی کہ عبادہ (Ubadah) کا دل چاہا اس کے کان اکھاڑ لے۔

اتنی صاف اور شفاف چیخیں اسے سنائی نہیں دے رہی تھیں؟ کیسے؟ وہ جھنجھلا کے اسے چھوڑتی آواز کے تعاقب میں بھاگی۔آواز عمارت کے پچھلے حصے سے آ رہی تھی جو بن چکی تھی۔ وہ بھاگ کے عمارت کے نیچے آن کھڑی ہوئی، اب کی بار سایہ اس کے چہرے پر گرا، اس نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا تو چوتھی منزل سے بلی کو لٹکتے پایا۔

''اوہ خدا.....'' اس نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ بلی الٹی لٹکی ہوئی تھی اور بری طرح سسک رہی تھی۔

وہ حواس باختہ انداز میں عمارت کے اندر بھاگی اور ننگے پیر کچی سیڑھیوں سے اوپر چڑھنے لگی۔سیڑھیوں پہ بوند بوند گری سیمنٹ گری ہوئی تھی جس سے وہ کھردری ہو گئی تھیں۔ دھپ دھپ چڑھنے سے اس کے تلوے چھل رہے تھے۔اندر عمارت میں جگہ جگہ موجود مزدور اور معمار اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''بی بی..... رک جائیں۔'' نادیہ نے عمارت کے داخلی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا۔

بھاگ بھاگ کے اس کے گھٹنے ٹوٹ چکے تھے۔وہ اوپر نہیں گئی۔ادھر ہی کھڑی رہ گئی۔عبادہ چوتھی منزل پہ آ چکی تھی۔اب اس کی نظریں بے چینی سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھیں۔عمارت نامکمل تھی۔ دیواریں اونچی تھیں لیکن کھڑکیاں دروازے ابھی نصب نہیں کیے گئے تھے۔اس لیے جگہ جگہ سے خلا نظر آ رہا تھا۔

وہ بائیں سمت بھاگی جہاں کمرے بنے ہوئے تھے۔ایک کے بعد ایک کمرے سے ہوتی وہ

عمارت کے اختتام پر پہنچ گئی۔ آگے منڈیر تھی اور سطح ختم ہو رہی تھی۔ وہ منڈیر کے قریب آئی جہاں سے لمبائی میں آگے ایک ستون نکل رہا تھا۔ اس ستون کے سریوں میں بلی کی پچھلی ٹانگ پھنسی ہوئی تھی۔ وہ پوری کی پوری نیچے لٹک رہی تھی۔

عبادہ تیزی سے آگے آئی لیکن جیسے ہی منڈیر کے قریب ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ ستون لمبا ہے اور سریوں کے منہ بہت دور ہیں۔ بلی کی ٹانگ تک ہاتھ نہیں پہنچ پائے گا۔

''ایک منٹ میری جان..... آ رہی ہوں میں.....'' وہ سہج سہج کے قدم رکھتی قریب آئی اور منڈیر پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے بازو لمبا کر کے بلی کی ٹانگ کو چھونے کی کوشش کی لیکن اس کی انگلیوں سے وہ ایک فٹ دور تھی۔ اس نے اپنی تئیں کوشش کی کہ ایک انگلی، محض ایک انگلی پہنچ جائے لیکن بازو نہ اتنے لمبے تھے اور نہ ہی انگلیاں!

وہ کھڑی ہو گئی۔

اسے ہر حال میں بلی کو بچانا تھا۔ بھورے رنگ کی موٹی بلی سسک رہی تھی۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو ستون پہ پیٹ کے بل لیٹ گئی۔ کسی پائپ کے گرد ہاتھوں جما کے رینگنے والے انداز سے وہ دھیرے دھیرے کھسک کے آگے آئی۔ اس کا نچلا دھڑ عمارت کی منڈیر پہ تھا جب کہ بقیہ دھڑ ستون پہ۔

''مادام.....'' نیچے کھڑے مزدور کی نظر اچانک پڑ گئی۔ ''کیا کر رہی ہیں؟ گر جائیں گی۔ عامر، شفقت، رشید سر کو بلاؤ۔ مادام نیچے اتریں۔ سر۔ ادھر آؤ سب۔'' وہ احتجاجی انداز میں چلانے لگا۔

مگر عبادہ نے نہیں سنا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سریے کے درمیان خلا بنا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے خلا کر بھی دیا تو بلی سیدھا نیچے گرے گی اور نیچے جو کھڑے ہیں وہ کبھی اسے کیچ نہیں کریں گے۔ اس لیے اس نے ایک ہاتھ سے بلی کی ٹانگ پکڑی، دوسرے ہاتھ سے سریا مخالف سمت

کھینچا۔ بلی کی ٹانگ آزاد ہو کے اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ بلی کو سریوں کے نیچے سے گزار کے اس نے جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔

''بی بی..... جی.....'' ملازمہ کہیں سے کود پڑی، اس کو یوں الٹا لیٹا دیکھا تو اس کی سانس حلق میں رک گئی۔

بلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ وہ اس حالت میں نیچے کیسے جائے گی؟ عبادہ کو مشکل راستے چڑھنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ گر سکتی تھی لیکن وہ جس طرح کھسک کھسک کے آئی تھی اسی طرح بلی کو پکڑے دھیرے دھیرے کھسک کھسک کے نیچے ہو گئی یہاں تک کہ اس کا پیٹ اور ٹانگیں منڈیر پہ آ گئے۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''اوہ.....'' ملازمہ نے آنکھیں بند کر کے رکی ہوئی سانس بحال کی۔ بلی دہشت کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

''میری جان..... ٹھیک ہو گیا سب۔ تم محفوظ ہو۔'' وہ بلی کو نرمی سے سہلانے لگی۔ اسی اثنا میں ایک سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ والا آدمی اوپر آ گیا۔ اس نے سر پہ زرد رنگ کی ہیٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس عمارت کا انجینئر تھا۔

''مادام..... آپ کا دماغ صحیح ہے۔ کیا کیا آپ نے؟'' انجینئر چھوٹتے ہی پھٹ پڑا۔ وہ بلی کی ٹانگ دیکھ رہی تھی۔ جو پنجے سے ہل رہی تھی۔ ہلانے پر بلی کی سسکی نکل جاتی، یقیناً اس کی ٹانگ کا جوڑ ٹوٹ گیا تھا۔

''سن رہی ہیں آپ میں کیا کہہ رہوں۔ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہم کس کو جواب دیتے؟ ہم ٹھیکے دار ہیں۔ یہاں پہ کرائم سین مت بنائیں اور نیچے جائیں۔ ہمیں کسی قانونی کارروائی میں پڑنے کا شوق نہیں ہے۔'' انجینئر اس کے لاپرواہ انداز پہ مزید برہم ہوا۔

وہ سٹپٹا کے کھڑی ہوگئی اور پلٹ کے اسے دیکھا۔ ''اگر یہ بلی یہاں سسک سسک کے مرجاتی تب کوئی کرائم سین نہ بنتا؟''

''بلی کی موت کا کرائم سین؟ مادام، ہر وقت یہاں کئی جانوروں کی موت ہوتی ہے۔ آج تک تو نہیں لگا۔ کیوں کیا ہوا؟'' وہ ایک قدم آگے آیا اور استہزائیہ انداز میں اس کی طرف جھکا۔ ''کیا جانوروں کی موت پر دفعہ تین سو دو لگنے لگی ہے؟''

عبادہ کے معدے میں تتلیاں گھومیں۔ ''نہیں لگتی لیکن لگنی چاہیے۔ آپ جیسے نالائق اور بے رحم ٹھیکے دار پہ لگنی چاہیے۔''

''گرمی آپ کے سر چڑھ گئی ہے۔ جا کے ٹھنڈا پانی پئیں۔'' انجینئر نے پچکار کے کہا۔

''ٹھنڈے پانی کی ضرورت آپ کو ہے جسے بلی کی آواز نہیں آئی اور میں نے آدھے کلومیٹر دور سے سن لی۔''

''آپ کی بلی ہے یہ؟ مادام تو اسے گھر رکھیں، یہاں کھلا کیوں چھوڑا ہے؟''

''میری بلی نہیں ہے یہ.....''

''تو پھر اس واویلے کی وجہ؟'' انجینئر بھنا گیا۔

''میرا نام عبادہ سلیم ہے اور میں جانوروں کی ڈاکٹر ہوں۔ ان کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔''

''اوہ.....'' انجینئر نے سر کو جنبش دی۔ ''ہوگئی حفاظت؟ اب نیچے جائیں اور آئندہ ایسا کوئی تماشا نہیں کرنا، ہم ان عمارتوں کو متنازعہ نہیں بنانا چاہتے۔''

''لیکن جانوروں کی جان لینا جانتے ہیں۔ ہونہہ۔'' وہ نخوت سے سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔

کالونی سکیم ایریا تھا، یہاں تعمیر کے دوران کسی ناخوشگوار واقعے کا مطلب ان عمارتوں کو متنازعہ بنانا تھا۔ اس کی تعمیر مشکوک ہوجاتی، اس کے ٹھیکے دار، انجینئر کے خلاف کارروائی ہوتی۔ اس لیے

انجینئر ضرروت سے زیادہ عبادہ پہ بھڑک گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ نیچے آئی تو ملازمہ حواس باختہ انداز میں اس کی طرف لپکی۔

''بی بی جی! کیا کر رہی تھیں آپ؟ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟ میں سلیم صاحب کو کیا جواب دیتی؟'' ملازمہ نے گالوں کو ہاتھوں کے پیالے میں بھر کے اسے ہراساں نظروں سے دیکھا۔

''میں دس سال کی ناسمجھ بچی ہوں جو تم جواب دیتیں؟'' وہ بلی کی ٹانگ کو مضبوطی سے پکڑے اس سے پوچھنے لگی۔ ملازمہ کو چپ لگ گئی۔ ''سب کو میری فکر ہے کسی کو اس بلی کی فکر بھی تھی؟''

''آپ اکلوتی ہیں۔ آپ کو کچھ ہو جاتا تو سلیم صاحب.....'' ملازمہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نادیہ، ایک بات بتاؤ۔ تم سات بہن بھائی ہو ناں؟'' وہ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پہ چلنے لگی۔ ''اگر تمہارا چوتھا بھائی مر جائے تو تم اس کا متبادل لے آؤ گی؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بی بی جی۔'' ملازمہ تڑپ اٹھی۔ ''کسی کا متبادل کیسے آ سکتا ہے؟''

''وہی تو..... اس لیے میں اکلوتی ہو کے مروں یا کوئی درجن ہو کے دنیا سے جائے۔ بات زندگی کے ختم ہونے کی ہے۔ کسی کے ایک ہونے کی نہیں۔'' وہ رسان سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

ملازمہ لازم سی اس کے پیچھے آنے لگی۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچ کے اس نے ملازمہ کو فرسٹ ایڈ لانے کا کہا اور خود بلی کو لے کے کمرے میں آ گئی۔ بلی کو بیڈ پہ الٹا لٹایا اور اس کی ٹانگ کا معائنہ کرنے لگی۔ ٹانگ جہاں پھنسی ہوئی تھی وہاں سے پچک گئی تھی۔ عبادہ ہاتھ لگاتی تو بلی سسک اٹھتی۔

''اوہ..... میرا بچہ.....'' اس نے بلی کو گود میں بھر لیا اور اسے سہلانے لگی۔ کتنا درد سہا تھا اس نے۔

کچھ دیر بعد ابا کمرے میں داخل ہوئے۔ان کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا اور چہرہ شدید تپا ہوا تھا۔یقیناً نادیہ نے انہیں الف لیلہ سنادی تھی۔فرسٹ ایڈ باکس کو بیڈ پہ رکھ کے وہ سامنے صوفے پہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''نادیہ.....نادیہ.....'' ابا کی تیوریوں کو نظر انداز کر کے اس نے ملازمہ کو آواز دی۔وہ بوتل کے جن کی طرح دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔

''جی بی بی؟''

''دودھ گرم کر کے لاؤ بلی کے لیے۔''

''جی بی بی.....'' ملازمہ تابعداری سے کہہ کے مڑ گئی۔ابا اسے گھور کے دیکھ رہے تھے۔

اس نے فرسٹ ایڈ باکس کھولا اور پلاسٹر کی مصنوعات باہر رکھیں جن میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔گاڈ تھی۔پٹی تھی اور مرہم بھی۔اس نے بلی کو بیڈ پہ لٹایا اور اس کی ٹانگ پکڑی۔

ٹانگ جہاں سے ٹوٹی تھی اس ہڈی کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے لکڑی کے چھوٹے ٹکڑے وہاں چاروں طرف سے رکھے جس سے بلی کی ٹانگ کو سہارا ہوا۔اس کے بعد اس نے روئی بھر بھر کے ٹانگ پہ لپیٹی اور سختی سے پٹی باندھ لی۔ابا تحمل سے اسے سب کرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔وہ جانتی تھی کہ وہ عنقریب پھٹنے والے ہیں۔

بلی کی مرہم پٹی کرنے کے بعد اس نے فرسٹ ایڈ باکس بند کیا اور پیچھے میز پہ رکھ دیا۔اتنے میں نادیہ دودھ کا پیالا لے آئی۔اس نے نادیہ سے دودھ کا پیالا پکڑا اور بیڈ پہ بیٹھ گئی۔بلی کو گود میں بٹھایا۔ہاتھ میں پکڑے پیالے سے اسے دودھ پلانے لگی۔

ابا اسی طرح کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''اب بس کریں بابا.....'' وہ ان کی نظروں سے بری طرح خائف ہوئی۔

''نہیں۔تم کرو۔جو تمہارا دل چاہ رہا ہے۔مجھے کیا پرواہ؟ میں نے ایک فاتحہ پڑھ کے تمہیں دفنا دینا ہے۔دیٹس اٹ۔'' انہوں نے کمال بے رحمی سے کہا۔

''بابا.....'' عبادہ صدمے سے انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا بابا؟ تمہیں بہت شوق ہے ناں۔ونڈر وومن بننے کا تو میں نے سوچا تم جب جب ایسا کوئی کام کرو میں تمہیں پہلے سے ہی کفن پہنا دیا کروں۔اس سے کیا ہوگا کہ مجھے تسلی ہو جائے گی کہ تمہاری لاش کی بے حرمتی نہیں ہوگی۔''

''بلی پھنسی ہوئی تھی۔''

''اور خدمت خلق کے لیے صرف تم رہ گئی تھیں؟'' وہ برہمی سے بولے۔

''میں کیا کرتی؟ مجھے آواز آئی تو میں نے سوچا.....''

''تم نے ''سوچا''؟ تم سوچ سمجھ کے کونسا کام کرتی ہو عبادہ سلیم؟'' ابا نے طنز کیا۔

''بابا.....!''

''خاموش رہو۔'' وہ کھڑے ہو گئے اور انگشت اٹھائی۔''اپنی حالت دیکھو۔پوری پسینے میں بھیگی ہوئی ہو۔چہرہ دیکھا ہے اپنا۔سن برن ہو رہا ہے تمہیں اور یہ پیر دیکھو.....'' انہوں نے اس کے پیروں کی طرف اشارہ کیا جو جگہ جگہ سے سرخ اور نیلے پڑ چکے تھے۔

اس نے جھک کے پیروں کا حشر دیکھا۔

''اوہ.....'' اسکے منہ سے بے ساختہ نکلا۔اس کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔اس نے بلی کو چھوڑ دیا اور کھڑی ہو گئی۔اب احساس ہو رہا تھا کہ اس کے تلوے کتنے جل رہے تھے۔

اس سے فرش پہ کھڑا نہیں ہوا گیا۔وہ لڑکھڑا کے واپس بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟ درد ہو رہا ہے؟'' ابا نے تمسخر سے پوچھا۔اس نے بودہ سا سر ہلا دیا۔

''ایکشن ہیروئین۔'' وہ اسے جھاڑ کے فرسٹ ایڈ کھولتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ ''نادیہ جاؤ جا کے ٹب میں برف والا پانی لاؤ۔''

''بابا..... میں کرلوں گی.....'' اسے باپ کا قدموں میں بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔

''چپ چاپ بیٹھی رہو۔ اتنی ہی پھنے خان ہو نا تم؟ تو خود کو چوٹ لگائے بغیر ہیرو بنا کرو۔''

''بابا..... میں کیا کرتی کوئی اور آپشن نہیں تھا۔''

''کوئی اور لوگ بھی نہیں تھے؟ تم سے لمبے بازوؤں والے؟ کوئی مشین بھی نہیں تھی؟ کوئی راڈ؟ کوئی لکڑی؟'' ابا نے سر اٹھا کے اسے گھورا۔

''لیکن اگر انہوں نے بچانا ہوتا تو اب تک بچا لیتے.....'' وہ معصومیت سے بولی۔

''چپ کرو پاگل لڑکی۔ تمہیں ذرا بھی اپنا خیال نہیں ہے۔ وہ تو بھلا ہو نادیہ اس نے مجھے سب بتا دیا ورنہ تم نے مجھے اپنے اس ایکشن سے بھی نابلد ہی رکھنا تھا۔'' وہ اس کے تلوؤں کا جائزہ لینے لگے۔ وہ اس کے بارے میں فکر مند ہوتے تھے۔ عبادہ کے اندر سے خدمت حیوان کا جذبہ کچھ زیادہ ہی بھل بھل کے باہر آتا تھا جو اسے اندھا کر دیتا تھا پھر وہ نہ دن دیکھتی، نہ رات، نہ حالات، بس جانور کو بچانے کے لیے اپنی جان سے گزر جاتی۔ نادیہ ٹب میں پانی لائی تو ابا نے اس کے دونوں پیر پانی میں ڈال دیے۔ اس کے جلتے تلوؤں کو سکون سا مل گیا۔

''بابا.....'' اس نے خفیف سا پکارا۔

''بولو۔'' ابا کے اعصاب ابھی تک تنے ہوئے تھے۔

''سوری..... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پرامس.....'' اس نے اپنے گردن پہ چٹکی کاٹ کے کہا۔

''یہ بات میں ایک سو ایک مرتبہ سن چکا ہوں۔''

''اس بار پکے والا وعدہ.....'' اس نے ہتھیلی آگے کی۔

ابا نے اس کا ہاتھ دیکھا، نظر کلائی پہ پڑی جس پر سریوں سے رگڑ کھانے کی وجہ سے لمبی لمبی لکیریں تھیں۔ ان لکیروں پر ننھے ننھے خون کے قطرے تھے جیسے شبنم۔ اس نے فوراً آستین آگے کی لیکن ناکام ہوئی۔ ابا نے ایک چپت اس کے ہاتھ پہ رسید کی اور آستین ہٹائی۔

''یہ دیکھو۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ ابا نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے اس کی مرہم پٹی کی اور ہر بار مرہم لگاتے ہوئے اسے جھڑک دیتے تھے۔ ایسی ڈانٹ، ایسی شامت ہوئی کہ الامان الحفیظ۔

بلی کی اور اس کی مرہم پٹی ہوگئی تو ابا مطمئن سے اٹھ گئے۔

''اب زیادہ نہیں چلنا تم نے اور یہ موزے بھی نہیں اتارنے۔ تلوے خراب ہو جائیں گے۔'' وہ تنبیہی انداز میں کہنے لگے۔

''جی سلیم صاحب۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔'' وہ بیڈ پہ سمٹ کے بیٹھ گئی اور تابعداری سے بولی۔ سلیم صاحب نے فرسٹ ایڈ باکس اٹھایا اور باہر چلے گئے۔

''دیکھا تمہاری وجہ سے میری کتنی بے عزتی ہوئی ہے؟'' اس نے بلی کے نرم گرم جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پچکار کے کہا۔ بلی دودھ پی چکی تھی۔ اس کے نرم نرم لمس کو محسوس کرتے ہوئے مخصوص آوازیں نکالنے لگی۔

دفعتاً جانے کیا ہوا۔ وہ بلی کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ سا گزر گیا۔ اس کا دل ایسے بجھا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سات سال پہلے کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ بے ساختہ اس کی منڈی اٹھی اور اس نے اپنے سائیڈ ٹیبل کو دیکھا جہاں ایک فریم پڑا تھا۔ فریم میں بھورے بالوں والی لڑکی نے ایک سفید رنگ کی موٹی بلی اٹھائی ہوئی تھی۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کے وہ فریم اٹھایا۔ وہ اس کی کرسٹی تھی۔ ''کرسٹی لینا Cristy Leena

)'' جسے نازش خالہ نے آسٹریلیا سے بھیجا تھا۔ کرسٹی صرف چار ماہ کی تھی جب اس کے پاس آئی تھی اور پھر ایک دن.....

اس کے آنسو فریم کے شیشے پہ چھلک گئے۔ وہ ہاتھ سے کرسٹی کو چھو رہی تھی اور اس کا دل بری طرح جکڑ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ ایک نڈر عبادہ تھی مگر اب..... وہ اپنی اولاد کھونے والی ایک لاچار ماں بن گئی تھی۔ کرسٹی کی تصویر کو سینے سے لگا کے وہ بے آواز رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

شام میں وہ اماں کے ساتھ کچن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اماں مشرقی عورت تھیں۔ ملازماؤں سے سب کرا سکتی تھیں لیکن کھانا نہیں بنوا سکتی تھیں۔ کھانا وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے بنواتیں۔ عبادہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیر نیچے لٹک رہے تھے۔ گود میں بلی تھی جسے وہ پیالے سے دودھ پلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بائیں جانب نادیہ کھڑی تھی جو کٹنگ بورڈ پہ دھیرے دھیرے دھنیا کاٹ رہی تھی۔ اماں چولہے کے سامنے دوپٹہ سینے پہ کراس میں باندھے، بالوں کا جوڑا بنائے، دیگچے میں چمچہ مار رہی تھیں۔ سالن کا گھی سڑسڑا رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے عبادہ۔ تمہاری فاطمہ آنٹی پاکستان آئی ہیں۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔

''اچھا..... کب؟'' عبادہ چونک گئی۔

''کچھ دن پہلے آئی ہیں۔ صبح ملنے آئی تھی مجھ سے۔ اتنی دبلی ہوگئی ہے کہ پہچانی ہی نہیں جا رہی۔ بالکل تمہاری جیسی ہے سلم اینڈ سمارٹ۔''

''لگتا ہے کینیڈا کا پانی لگ گیا ہے انہیں۔''

''ایسا ویسا؟ رنگت نکھر گئی ہے۔ چٹی، سفید۔ مجھے لگا شاید فشل وشل کروا کے آئی ہوگی لیکن اس نے کہا، فشل اس نے کئی سالوں سے نہیں کروایا۔ یہ تو نیچرل بیوٹی ہے۔ میں تو حیران رہ گئی۔'' اماں

کو فاطمہ آنٹی کی اسکن کی پڑ گئی۔

''جھوٹ بول رہی ہوں گی اماں ورنہ کینیڈا جانے سے پہلے آپ نے ان کی رنگت نہیں دیکھی تھی کیا؟ کوئی پنجاب میں رہے اور دھوپ میں کالا نہ ہو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''مگر کینیڈا میں دھوپ ہوتی ہی کہاں ہے؟ سارا سال تو برف ہی برف ہوتی ہے۔''

''وہ تو پیدائشی سانولی ہیں۔ ان کی رنگت کو برف کیسے ٹھیک کر سکتی ہے۔'' وہ سمجھداری سے بولی پھر یکدم وہ ٹھٹکی۔ ''کہیں وائٹننگ انجیکشن تو نہیں لگوائے؟''

''نہیں۔ ٹیکے شیکے نہیں لگوائے۔ کہہ رہی تھی یہ نور اللہ کی دین ہے۔''

''بی بی جی..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو جلانے کے لیے کہہ رہی ہو۔'' نادیہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''ایگزیکٹلی.....'' عبادہ نے حمایت کی۔

''میں کیوں جلوں گی۔ میں کونسا ساٹھ سال کی بڑھیا ہوں۔ ابھی عمر ہی کیا ہے میری؟ ابھی پچھلے ہی دنوں کی بات ہے۔ احمد کا کولیگ آیا تھا فائل لینے، مجھے کہتا ہے آپ احمد کی بڑی بہن ہیں؟ میں نے کہا نہیں جھلے۔ میں ماں ہوں اس کی۔ اس کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔'' اماں اپنی ہی بات پر شرم سے لال ہو گئیں۔ ملازمہ نے عبادہ کو دیکھا، عبادہ نے ملازمہ کو پھر دونوں کا بلند بانگ قہقہہ کچن میں گونج گونج گیا۔

اماں نے برہمی سے دونوں کو دیکھا۔

''ہنس کیوں رہی ہو تم دونوں؟ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' انہوں نے برا مان لیا۔

''نہیں..... نہیں تو.....'' عبادہ نے ہنسی روک کے تیزی سے کہا۔

''ایک بھی جھری نہیں ہے چہرے پر۔ کوئی بوٹوکس، کوئی سکن ٹریٹمنٹ، کوئی وٹامن نہیں

لگاتی۔ یہ نیچرل گلو ہے۔ کسی سے بھی پوچھ لو میں دو جوان جہان بچوں کی ماں نہیں لگتی۔"

انہوں نے جتا کے کہتے ہوئے جھٹکے سے نادیہ کے ہاتھ سے پلیٹ لی اور سارا دھنیا سالن میں انڈیل دیا۔ عبادہ نے بمشکل ہنسی روکی ہوئی تھی۔ اماں بہت جلد برا مان جاتی تھیں۔ وہ دھیرے سے نیچے اتری، بلی کو نیچے فرش پہ بٹھایا اور خود ان کے ساتھ لگ گئی۔

"یہ بتائیں وہ کیوں آئی ہیں پاکستان؟ انہوں نے تو کہا تھا کہ کبھی نہیں آئیں گی۔"

"اپنے بیٹے صائم کے لیے رشتہ تلاش کرنے آئی ہیں۔"

"کیوں؟"

"صائم بڑا ہو گیا ہے ناں۔"

"کب؟" وہ اچنبھے سے بولی۔ اماں نے گھور کے دیکھا۔

"نہیں۔ میرا مطلب۔ شادی کے لائق ہو گیا ہے کیا؟"

"تم سے دو سال بڑا ہے۔ اندازہ لگا لو پھر۔"

"لیکن رشتہ کرنے کے لیے وہ پاکستان کیوں آئی ہیں؟ یاد ہے انہوں نے فون پہ کیا کہا تھا؟ کہ میں تو اپنے بیٹوں کے لیے گوری چٹی، لمبی معصوم، نازک اور پتہ نہیں کیا کیا بہوئیں لاؤں گی۔ پھر پاکستان کیا ضرورت پڑ گئی آنے کی؟" عبادہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

"ہائے۔ ایسی بہوئیں آرڈر پر تیار کی جاتی ہیں۔ دنیا میں موجود نہیں ہوتیں۔ میرے خیال سے اس نے کینیڈا کی پیداوار دیکھ لی ہے۔ اس لیے اسے پاکستانی مہذب اور پاکیزہ لڑکی چاہیے جو ایک مکمل بہو، بیوی اور بیٹی کا کردار ادا کرے۔ ہک ہا..... (اماں نے لمبی سانس نکالی) مغرب میں کہاں ملتی ہیں ایسی اصول پسند بہوئیں۔"

"پاکستان میں مل جاتی ہیں کیا؟"

''کیوں نہیں۔اپنا پاکستان بہت ذرخیز ہے۔'' وہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کے بولیں۔

''پھر تو ضرور کسی پہ نظر ہوگی ان کی۔فاطمہ آنٹی بہت ہوشیار ہیں۔'' اس نے کاؤنٹر پہ پڑی ٹوکری سے کیلا اٹھایا اور چھیل کے کھانے لگی۔اماں نے نرم سی نظر اس کی طرف اٹھائی۔وہ لاپرواہی سے کیلا کھا رہی تھی۔

''ہاں۔نظر تو ہے اس کی اور امید بھی ہے۔'' اماں زیرلب مسکرائیں۔

''کس پہ ہے نظر؟'' عبادہ نے پلٹ کے انہیں دیکھا۔

''اس پہ.....'' اماں نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔آئینے میں ماں بیٹی کی شکل نظر آرہی تھی۔خود پہ نظر پڑنے سے اماں کی بات کا مطلب سمجھنے تک،اسے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ لگا اور جب سمجھ آگئی،اس نے بچا ہوا کیلا کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

صبح ذرا کھل کے سورج نکلا تھا۔گرمی زوروں پر تھی۔آسمان بے حد نیلا تھا۔بادل کی کوئی ٹکیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے ہسپتال آئی تھی۔ہسپتال کے احاطے میں گاڑی رکی تو وہ اوورآل کو بازو پر ڈالے،ہاتھ میں پرس پکڑے باہر نکلی۔اس نے نارنجی رنگ کی شرٹ کے نیچے سفید رنگ کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔بال حسبِ معمول جوڑے میں مقید تھے البتہ چند آوارہ لٹکیں کانوں کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔

وہ قدم قدم چلتی اندر آئی۔سامنے کاؤنٹر تھا جہاں نمیرہ (کولیگ) کرسی پر براجمان سر جھکا کے رجسٹر پہ نوٹس اتار رہی تھی۔وہ اندر آئی تو ٹھٹک گئی۔کاؤنٹر کے بائیں جانے گلاس ڈور تھا جس کے پار میٹنگ روم تھا۔میٹنگ روم کے پردے گرے ہوئے تھے۔یہ تب گرتے جب کوئی ضروری

میٹنگ چل رہی ہوتی۔

''گڈ مارننگ ڈاکٹر عبادہ۔'' نمیرہ نے اسے چونکا دیا۔

''گڈ مارننگ۔'' وہ کاؤنٹر کے قریب آئی۔ ''خیریت؟ کوئی آیا ہے کیا؟ میٹنگ روم بند ہے۔''

''جی وہ کراچی اور اسلام آباد سے کچھ سینئر ڈاکٹرز کا بیچ آیا ہے۔'' نمیرہ نے بتایا۔

''کس سلسلے میں؟''

''آپ نے خبر نہیں پڑھی کیا؟''

''کونسی خبر؟'' اس نے پرس کاؤنٹر پہ رکھ دیا۔

''تھائی لینڈ کے ایک جنگل میں ستر ہاتھیوں کی موت ہوئی ہے۔ اس کی تحقیقات کے لیے کمیٹی بٹھائی گئی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے ویٹ ہسپتالوں سے ایکسپرٹ منگوائے جا رہے ہیں۔ شاید ہمارے ہسپتال سے بھی کچھ لوگ چلے جائیں۔''

''کب ہوا ہے یہ واقعہ؟''

''کل شام کو۔''

''اوہ۔'' اس نے بے ساختہ پیشانی چھوئی۔

دنیا کے کسی بھی حصے میں جانوروں کو پہنچنے والے نقصان کی تفتیش کے لیے بڑی بڑی کمیٹیاں بنائی جاتی تھیں جن میں لاہور کے اس بڑے اور شاندار ہسپتال کے تجربہ کار ڈاکٹر شامل ہوتے۔ اس کی ایکسپرٹیز گھوڑوں کی بیماریوں میں تھی جس کے سلسلے میں وہ کئی بار نیشنل اور انٹرنیشنل پولو، ٹنیٹ پے گینگ، ہارس ریس وغیرہ کے مقابلوں میں بطور سکیورٹی ڈاکٹر گئی تھی۔

پرس اٹھا کے وہ وارڈ میں آ گئی جہاں نرسنگ سٹاف اور ڈاکٹرز لمبی لمبی میزوں کے آگے کھڑے تھے۔ ان میزوں پر مختلف زخمی جانور پڑے ہوئے تھے جن کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی۔ اس کا کل والا

مریض ایک کتا تھا۔ ہلکے کریم رنگ کا کمزور سا کتا جو پتھر لگنے سے زخمی ہوا تھا۔ اس نے پرس متعلقہ خانے میں رکھا، اوورآل پہنا، ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، چہرے پہ ماسک چڑھایا اور اپنے مریض کے پاس آ گئی۔

وہ ویٹ (جانوروں کی ڈاکٹر) تھی۔ یہ پیشہ اس نے اپنی نفسیات کی ڈگری کو خیرباد کہہ کے اپنایا تھا۔ اس کے پیچھے ایک مخصوص وجہ تھی۔ نفسیات پڑھنا، اس کا ذاتی انتخاب نہیں تھا بلکہ درپیش حالات کا نتیجہ تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ نفسیات اس کا مستقبل نہیں ہے۔ اسے کچھ اور کرنا تھا اور یہ کچھ اور ویٹرنری ڈاکٹر بننا تھا۔

وہ متناسب قد کی ایک پیاری لڑکی تھی۔ آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ بال البتہ ہلکے سیاہ تھے لیکن اس کے کونے گہرے بھورے تھے جنہیں وہ ڈائی کرواتی تھی۔ بابا کے مطابق وہ دنیا کی حسن ترین لڑکی تھی۔ وہ سر جھٹک کے ہنستی۔ اگر وہ اکلوتی بیٹی نہ ہوتی تو یقیناً ابا کے خیالات کچھ اور ہوتے۔ اس نے روئی کو اینٹی بائیوٹک میں ڈبو کے کتے کے زخم پہ لگایا۔ اسی اثنا اس کی کولیگ افراح وہاں آ گئی۔

''ہیلو گرل.....'' افراح نے کاؤنٹر کے کنارے ہتھیلیاں جما کے اس پہ ایک خوشگوار نظر ڈالی۔ وہ بلیوں کی ڈاکٹر تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے سر اٹھا کے نرمی سے کہا۔

''گیس وہاٹ.....'' افراح نے سینے پہ ہاتھ باندھ کے پوچھا۔

''وہاٹ؟''

''آج میٹنگ ہوئی ہے۔''

''آئی نو۔'' وہ مسکرائی۔

''تمہیں پتہ ہے؟'' وہ چونک گئی۔

''ہوں، نمیرہ نے بتا دیا ہے۔ سن کے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں کیسے موت ہوئی ہوگی ان کی۔ کمیٹی والوں نے کچھ بتایا؟''

''کیا مطلب؟ موت تو نہیں ہوئی۔''

''ستر ہاتھیوں کی موت نہیں ہوئی؟ نمیرہ نے تو بتایا کہ موت ہوئی ہے۔''

''اوہ۔ تمہیں اس میٹنگ کے بارے میں پتہ چلا ہے۔ میں دوسری میٹنگ کی بات کر رہی ہوں۔''

''دوسری کونسی؟''

''چترال میں ایک فارم ہاؤس ہے۔ یوسف خان کا۔ ان کے چھ گھوڑوں کو کوئی بیماری ہوگئی ہے اور وہ پچھلے ایک ماہ سے مسلسل بیمار ہیں۔ انہوں نے سر طارق کو پیغام بھجوایا ہے کہ کسی ایکسپرٹ ڈاکٹر کو بھیج دیں۔ اس لیے طارق سر نے میٹنگ ارینج کی تھی۔''

''گھوڑوں کو کیا ہوا ہے؟''

''وہی تو سمجھ نہیں آ رہی کسی کو۔ نہ کھا رہے ہیں۔ نہ پی رہے ہی۔ اٹھ کے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ بے دم سے پڑے ہوئے ہیں۔ یوسف خان نے پشاور سے، گلگت سے، اسکردو سے کئی ویٹرنری ڈاکٹرز بلوائے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکے۔ انہوں نے طارق سر کو کہا ہے کہ جلد از جلد کسی کو بھیج دیں۔ گھوڑوں کی حالت تشویشناک ہے۔''

''اوہ.....'' اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

''سر طارق نے انہیں بتا دیا ہے کہ ہمارا تجربہ کار ڈاکٹر دو دن میں وہاں آ جائے گا۔''

''کون جا رہا ہے پھر؟''

''تم.....''

''میں.....؟''

''ہوں۔وہ سر فیصل اور سر ابرار کو بھیج رہے تھے لیکن تم جانتی ہوں ناں۔وہ ابھی ابھی اسکردو سے آئے ہیں۔اس لیے انہوں نے تمہیں اس مشن کے لیے چنا ہے۔وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔میں یہی بتانے آئی تھی۔جاؤ مل کے آؤ۔''

''صرف میں یا کوئی اور ہوگا؟''

''پتہ نہیں۔تم جا کے خود پوچھ لو۔''

اس نے الجھن سے ادھر ادھر دیکھا۔''ٹھیک ہے۔تم ادھر آؤ۔اسے دیکھو ذرا۔میں مل کے آتی ہوں۔''اس نے روئی رکھ کے گلوز اتار دیے اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آئی۔

وہ ہاتھوں کو دھو کے ٹشو سے پونچھتی ہوئی جب طارق سر کے آفس میں داخل ہوئی تو وہ سر براہی کرسی پر براجمان،سامنے کھلے لیپ ٹاپ میں کچھ دیکھ رہے تھے۔وہ پچاس سال کے پرکشش اور وجیہہ شخصیت رکھنے والے بارعب سے آدمی تھے۔شیو کلین تھی البتہ مونچھیں کافی گھنی تھیں۔ایک جھلک میں دیکھنے پر کسی فوجی افسر کا گمان ہوتا تھا۔

''میں اندر آجاؤں سر.....''اس نے دروازے سے سر اندر کر کے پوچھا۔طارق نے اس کی آواز سنی اور مسکرائے۔

''آجایئے مس سلیم۔''انہوں نے سر کی مدد سے اشارہ کیا۔

وہ اندر آئی اور میز کے سامنے مؤدب انداز میں کھڑی ہوگئی۔''آپ نے بلایا تھا سر۔''

''ہاں جی.....کچھ کر رہی تھیں آپ۔''طارق کو لگا جیسے اس نے عبادہ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔

''جی.....دراصل وہ ڈاکٹر اسد جس کتے کو لائے تھے اس کے زخم صاف کر رہی تھی۔کافی گہرا کٹ لگا ہے اسے۔''اس نے انگوٹھے سے کنپٹی رگڑتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں بتایا۔

''اوہ۔کیسا ہے وہ اب۔''

''ٹھیک ہے پہلے سے۔میرے خیال سے زخم بھر جائے تو جلد چلنے پھرنے لگے گا۔'' وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔

''ہوں۔گڈ۔'' وہ مصروفیت سے میز پر پڑی فائلیں پلٹنے لگے۔پھر دفعتاً انہوں نے ایک فائل نکالی اور اسے کھولا۔''افراح نے بتایا ہوگا آپ کو میں نے کیوں بلایا ہے؟''

''جی سر.....''

''یہ فائل پکڑیں۔اس میں اس کیس کی تفصیلات ہیں۔ایک دفعہ دیکھ لیں۔یہ کیس آپ کو ہینڈل کرنا ہے۔''

وہ جز بزسی قریب آئی اور فائل تھام لی۔فائل کے چند اوراق پلٹنے کے بعد اس نے الجھن سے طارق سر کو دیکھا۔

''سر!افراح نے بتایا مجھے چترال جانا ہوگا؟''

''ہوں.....''

''اکیلے؟''

''یس مس سلیم۔اس دفعہ اکیلے ہی جانا ہوگا۔آپ نے تھائی لینڈ والے واقعے کا تو سنا ہوگا۔ہمارے دو موسٹ سینئر ڈاکٹرز وہاں جا رہے ہیں۔اس لیے ہسپتال سے تو کوئی نہیں جائے گا البتہ آپ کے گھر والے اگر چاہیں تو جا سکتے ہیں ساتھ.....''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر.....''اس کی آواز کم ہوگئی۔''آپ جانتے ہیں میرے گھر میں ایسا کوئی نہیں جو جائے۔بابا اور بھائی بزنس دیکھتے ہیں۔اماں گھر۔ایسے میں کوئی نہیں جائے گا۔''

''اکیلے جانے میں کیا مسئلہ ہے مس سلیم؟''اب کی بار انہوں نے ذرا سرد لہجے میں پوچھا۔

''چترال کافی دور ہے لاہور سے۔ گلگت سے بھی آگے ہے تو..... مجھے شاید گھر سے اجازت نہ ملے۔'' اس نے نچلا لب کترا۔

''یعنی آپ کے والد آپ کو کسی جانور کا علاج کرنے سے روک لیں گے؟'' انہوں نے کافی ہتک انداز میں پوچھا تھا۔ اس نے بودہ سا سر ہلایا۔

''مس سلیم! ہم دوسرے ملک جا رہے ہیں۔ تھائی لینڈ۔ کتنا دور ہے وہ یہاں سے اور آپ اپنے ملک میں ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جا سکتیں؟'' وہ جھڑکنے لگے۔ ''اس سے پہلے بھی تو آپ گئی ہیں۔ ہم نے آپ کو اسلام آباد، بھکر اور سیالکوٹ بھیجا۔ اس وقت تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا آپ کے ماں باپ نے۔''

عبادہ کا سر مارے تضحیک کے جھک گیا۔

''فرض کریں مس سلیم۔'' وہ کرسی سے اٹھ گئے۔ کھڑکی کے سامنے جا کھڑے ہوئے جہاں سے لاہور کی کمرشل عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ آسمان پر دھند تھی، دور دور تک سورج کی شعاعیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ''ان گھوڑوں کی جگہ وہاں چھ آدمی ہوتے۔ آپ ایک ویٹرنری ڈاکٹر کی بجائے ایک سپیشلسٹ ہوتیں تو کیا تب بھی آپ کے والد آپ کو روکتے؟''

اس کے معدے میں تتلیاں گھومیں۔

وہ پلٹے، اس کو دیکھا۔ ''بتائیں۔ کیا آپ رک جاتیں؟''

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں غصہ تھا۔ رنج تھا۔ مان تھا اور گلہ بھی۔ اس نے دھیرے سے سر نفی میں ہلایا۔

''گڈ..... زندگی چاہے انسان کی ہو یا جانور کی۔ زندگی زندگی ہوتی ہے مس سلیم۔ ہم زندگی بچانے کا کام کرتے ہیں چاہے وہ کسی بھی مخلوق کی ہو۔ اگر کسی انسان کا وقت نزع دس منٹ ہے تو یہ

دس منٹ اس کی زندگی کے تکلیف دہ ترین منٹ ہوتے ہیں لیکن اگر کسی مکھی کا وقت نزع چند سیکنڈ ہے تو یہ چند سیکنڈ ہم انسانوں کے لیے معنی نہیں رکھتے۔اس مکھی کے لیے یہ منٹ تکلیف دہ ترین ہوتے ہیں۔"

وہ واپس کرسی کی طرف بڑھنے لگے۔

"انسانوں کے ڈاکٹر درجنوں کے حساب سے ہیں۔ہر نکڑ پہ ایک ڈاکٹر ہے کیوں کہ ہمیں لگتا ہے کہ اگر ہم جو اشرف المخلوقات ہیں ہماری نسل کو کچھ ہوگیا تو ایکو سسٹم برباد ہوجائے گا۔اگر سٹیسٹکلی دیکھا جائے تو اس دنیا میں سب سے زیادہ نسل انسانوں کی ہے۔جانتی ہیں کیوں؟" اپنی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کے انہوں نے بازو کرسی کے سر پہ رکھے اور اسے دیکھا۔"کیوں کہ ان کو بچانے والا کوئی ہے۔ایک ذریعہ جسے ڈاکٹر کہتے ہیں لیکن کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ان جانوروں کو جن کی نسل ختم ہو رہی ہے endangered Extinct مخلوق کیوں کہتے ہیں؟ کیوں کہ ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہوتا۔اب ایک گھوڑا تو ڈاکٹر بننے سے رہا ناں۔اس لیے خود کو بھی ہم خود بچائیں گے اور ان جانوروں کی نسل کو بھی کیوں بہر حال ہم ان سے زندہ ہیں۔یہ کائنات ایک فوڈ ویب ہے۔ایک چین کے ذریعے چلتی ہے۔ہمیں جانوروں کی ضرورت ہے اور جانوروں کو ہماری۔ہم ان سے لاتعلق نہیں ہو سکتے۔آپ سمجھ رہی ہیں ناں؟"

عبادہ نے سر ہلایا۔

"جب آپ یہاں آئی تھیں۔میں نے آپ کا انتھوزیزم (انتہائی جوش) بہت بڑھا ہوا دیکھا تھا۔بلاشبہ آپ ہمارے ہسپتال کا فخر ہیں۔آپ کو ایسی بہانے نہیں بنانے چاہئیں جو بچے اسکول ٹرپ پہ عموماً بناتے ہیں۔آپ میچور ہیں۔خود مختار ہیں۔خود انحصار ہیں۔آپ کو اجازت ضرور طلب کرنی چاہیے میں یہ نہیں کہتا کہ فیملی کو بتائے بغیر آپ جائیں لیکن سات سال ایک پیشے میں

گزارنے کے بعد آپ خود پر اتنا اعتماد تو کر سکتی ہیں ناں؟ اس فائل میں آپ کی ٹکٹ، رہائش، فیسیلیٹیز اور دیگر کوائف درج ہیں۔ ان کو غور سے پڑھ لیجیے گا اور سب سے اہم چیز۔ آپ ہماری ذمہ داری پہ جا رہی ہیں۔ اس لیے اپنی سیکیورٹی کی فکر مت کیجیے گا۔ آپ سیکیور رہیں۔"

اس نے فائل کو دیکھا جہاں کاغذات پہ وہ سب لکھا تھا جو طارق سر نے کہا تھا۔ خستہ کاغذات پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ابا اس کے اکیلے جانے پہ نہیں مانیں گے اور بھائی؟ وہ تو پہلے ہی اس کے ویٹرنری ڈاکٹر بننے کے خلاف تھے۔ وہ تو بالکل نہیں مانیں گے اور اماں؟ اماں تو عزت کا واسطہ دے دے کے گھر بٹھا لیں گی۔

وہ کیا کہے طارق سر سے کہ کل ایک بلی کو بچاتے ہوئے ابا نے کیسی حوصلہ افزائی کی تھی؟ وہ چترال جانے کا کہے گی تو اسے دنیا سے ہی رخصت کر دیں گے۔

وہ کیا کرے؟ منع کر دے؟ منع کر دیا تو یہ پیشہ چننے کا فائدہ۔ اس نیت، اس ارادے، اس جذبے کا فائدہ؟ وہ گھوڑوں کی سپیشلسٹ ہو کے بھی مدد نہیں کرے گی؟ کیا اس لیے اتنے سال پڑھائی کی تھی؟ مغز ماری کی تھی؟ اس نے بے اختیار پیشانی چھوئی اور ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" طارق نے اس کے جز بز تاثرات پڑھ لیے تھے۔ "آپ نہیں جانا چاہتی تو مت جائیں۔ ادھر دے دیں یہ فائل۔ ہم کسی اور کو بھیج دیں گے۔" انہوں نے ہاتھ آگے کر کے ناگواری سے کہا۔

اس کا دل دھڑکا۔

"نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "میں جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ ان گھوڑوں کو میری ضرورت ہے۔" آواز میں استحکام تھا۔ سر طارق کے چہرے پر شفقت تاثر آ گیا۔ انہوں نے بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''گڈ..... پرسوں صبح آپ کی فلائٹ ہے گیارہ بجے کی۔ تیار رہیے گا۔''

''پرسوں.....'' اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ اتنی جلدی؟ اتنی جلدی وہ اماں ابا کو کیسے منائے گی؟ بھائی کو کیسے راضی کرے گی؟ دو دن..... محض دو دن.....

فائل لے کے وہ باہر آ گئی۔ لان میں کرسیوں پر کولیگز بیٹھے تھے جن کے گود میں چھوٹے چھوٹے پپیز تھے۔ وہ انہیں دودھ پلا رہے تھے۔ یہ وہ پپز تھے جن کی ماں کو ایک کار نے ٹھوک دیا تھا اور وہ مر گئی تھی۔ ان کا گروپ انہیں بچا کے لایا تھا اور اب انہیں مصنوعی دودھ دے کے بڑا کر رہا تھا۔ یہی تو وہ جذبہ تھا جس کے لیے اس نے نفسیات کی ڈگری کو لات ماری تھی۔ خدمت خلق کا جذبہ..... انسانیت کا جذبہ، ہمدردی، غمگساری، محبت، شفقت کا جذبہ۔

وہ قدم قدم چل کے برآمدے میں آ گئی اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اس نے فائل کھولی اور کیس کو پڑھنے لگی۔ وہاں بیمار گھوڑوں کی تصاویر تھیں جن میں گھوڑے بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ ان کا جسم بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ گھوڑے اعلیٰ نسل کے مہنگے اور قیمتی لگ رہے تھے۔ انہیں کیا بیماری تھی؟ وہ فی الوقت تصویروں سے اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے فائل بند کی اور گہری سانس لی

☆.....☆.....☆

''مجھے چترال جانا ہے۔''

رات کھانے کی میز پہ اس نے دھیرے سے کہا۔ ابا کھانے میں مصروف تھے۔ اماں البتہ نادیہ کو کوئی برتن نہ لانے پر ڈانٹ رہی تھیں جب کہ احمد فون پہ کوئی میسج پڑھ رہا تھا جب ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

اس کی بات کسی نے نہیں سنی یا سن کے ان سنی کر دی وہ سمجھ نہیں سکی۔

اس نے چمچ رکھا اور گلا کھنکارا۔

''میں..... چترال..... جا..... رہی..... ہوں..... مشن پہ..... کچھ دنوں کے لیے.....'' اب کی بار اس نے ٹھہر ٹھہر کے بتایا۔

میز پر ہوتی چمچوں اور پلیٹوں کی ٹھک ٹھوں ایک لمحے کے لیے تھم گئی۔

''کون..... کون جا رہا ہے؟'' ابا نے سرسری سا پوچھا۔

''صرف..... مجھے..... بھیج رہے ہیں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ابا کے نوالہ بناتے ہاتھ تھم گئے۔ اماں کی آنکھوں میں واضح ناگواری آئی اور احمد کے نتھنے پھولتے دکھائی دیے۔

''باقی ڈاکٹرز مصروف ہیں۔ سب اپنے اپنے مشن پر ہیں۔ اس لیے اس بار میں اکیلی جاؤں گی۔''

''ہرگز نہیں۔ تم اکیلی کہیں نہیں جاؤ گی اور چترال تو ہرگز بھی نہیں۔'' احمد قطعیت سے بولا۔

''لیکن اگر میں نہیں گئی تو گھوڑے مر جائیں گے۔''

''دیکھو عبادہ..... یہاں تک ٹھیک تھا۔ تم نے ویٹرنری بننا تھا ہم نے تمہیں سائیکولوجی چھڑا کے ویٹرنری پڑھائی۔ تم نے جاب کرنی چاہی۔ ہم نے اس کی بھی اجازت دے دی۔ تم نے گھر میں کتے بلیوں کا دفتر کھول دیا۔ وہ بھی سہہ لیا مگر اب تمہیں چترال جیسے پرخطر علاقے میں بھیجیں گے۔ ایسا سوچنا بھی مت۔'' احمد نے انتہائی انداز میں کہا۔

''اور میرا ایشن؟ کیا اس لیے یہ جاب کر رہی ہوں میں؟''

''بس کر دو۔ بہت ہو گئی جاب۔ تمہاری شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس وقت تمہیں اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اماں ابا کو ایسے دیکھنے لگی جیسے خدانخواستہ احمد نے اسے ڈولی میں بٹھا دیا ہو۔

''بابا.....'' اس نے چھوٹتی سانس کے ساتھ سلیم صاحب کو آواز دی۔ وہ چپ چاپ کھانا کھا رہے تھے اور ایسے انجان بنے تھے جیسے انہیں اس گفتگو سے کوئی لینا دینا نہ ہو۔

''بابا.....آپ سن رہے ہیں بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ رو دینے کو تھی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ ستائیس کی ہو تم۔ اب شادی نہیں کرو گی تو کب کرو گی جب میری عمر تک پہنچ جاؤ گی؟'' اماں نے ٹرے سے اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس پہ چوٹ کی۔

''اماں! آپ جانتی ہیں شادی کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں ہے۔''

''اچھا۔ پھر کیا کرو گی؟ ساری زندگی اسی طرح گزارو گی؟ بن بیاہی؟''

''میں نے کب کہا کہ میں ساری زندگی ایسے ہی گزاروں گی؟ کم از کم مجھے میرا لائف گول تو پورا کرنے دیں۔ میں اپنا پرسنل ویٹ کلینک (جانوروں کا ہسپتال) کھولنا چاہتی ہوں اس شہر میں۔ وہ تو کر لوں۔''

''کہاں بنوانا ہے ہسپتال؟'' احمد نے ایسے پوچھا جیسے ابھی اٹھ کے ہسپتال وہاں کھڑا کر دے گا۔

''میں اپنی محنت، اپنے پیسوں سے بناؤں گی۔'' اس نے احمد کا ارادہ بھانپ کے سختی سے کہا۔

''اور اگر میں بنا کے دے دوں تو اس میں حرج کیا ہے؟'' وہ غصے سے بولا۔

''حرج ہے۔ وہ میری محنت سے نہیں ہوگا۔ خواب اپنی محنت سے پورے کیے جاتے ہیں۔''

''اگر تمہارے ساتھ کوئی جا رہا ہے..... جب تم جاؤ گی ورنہ نہیں۔''

''میرے ساتھ کوئی نہیں جا رہا۔''

''پھر تم بھی نہیں جاؤ گی۔'' احمد نے قطعیت سے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کر دیا۔

نیم روشن ڈائننگ ٹیبل پر وہ سحر زدہ نظر آنے لگی۔ میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ انواع و اقسام کے کھانے پڑے تھے۔ گلاس گریپ جوس سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں شکوہ

تھا۔بات نہ ماننے جانے کا شکوہ!

''بابا!میں چترال جاؤں گی اوران بیمار گھوڑوں کا علاج کروں گی۔''اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''کیوں؟تمہارے کلینک میں کوئی اورنہیں ہے؟صرف تم جاب کرتی ہووہاں؟''احمد کی آواز اونچی ہوگئی۔

''احمد!''ابانے تنبیہی انداز میں ٹوکا۔

''نہیں بابا.....مجھے بات کرنے دیں۔''احمد نے پلیٹ پیچھے کھسکائی اور کرسی قریب کھینچ کے اس کے قریب ہوا۔''بتاؤ۔کوئی اور ہے؟یا سارا کلینک تم چلاتی ہو۔تمہارے یہ نازک کندھوں نے بوجھ اٹھا رکھا ہے۔''

اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔

''جب دیکھو یہ آپریشن کرنا ہے۔یہ بلی کو ٹانکنا ہے۔اس کتے کو سینا ہے۔اس گدھے کی مرہم پٹی کرنی ہے۔اس بکری کا پیر جوڑنا ہے۔تمہیں سب کرنا ہوتا ہے۔باقیوں کو پے ملتی ہے یا نہیں؟''

وہ رونے لگی۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں۔''احمد نے میز پہ ہاتھ مارا۔

وہ جھرجھری لے کے اچھلی۔وہ بری طرح ہراساں ہوگئی۔اس نے ڈرتے ہوئے اماں کو دیکھا پھر ابا کو.....اور پھر.....وہ اٹھ گئی۔کرسی تیزی سے پیچھے دھکیلی اور منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔

احمد نے آنکھیں ضبط سے بند کرلیں۔اس نے پہلے اس طرح اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا لیکن آج.....آج ضروری تھا۔وہ بگڑ رہی تھی۔ضد ایک حد تک اچھی لگتی ہے۔احمد نے نخوت سے سر جھٹکا

اور اپنی پلیٹ واپس قریب کی۔ وہ زہر مار چمچے منہ میں ڈالنے لگا۔ سلیم صاحب نے کھانے کی کوشش کی لیکن ان کو سالن ببول کی طرح لگنے لگا۔ انہوں نے پلیٹ پیچھے کی اور کھڑے ہو گئے۔

''بابا..... آپ اس کے پاس نہیں جائیں گے۔'' احمد نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

سلیم صاحب پلٹ کے اسے دیکھا۔

''احمد! تم اس پہ حکم چلاؤ۔ مجھے کیا کرنا کیا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں کروں گا۔ تم نہیں۔'' سلیم صاحب نے بڑی نرمی سے اسے چپ کروادیا۔ احمد نے تیورا کے ماں کو دیکھا۔ (کبھی تو انہیں سمجھالیا کریں۔) اماں نے بے بسی سے نظریں گرادیں۔

☆.....☆.....☆

سلیم صاحب اس کے کمرے میں آئے۔ وہ سرتا پا کمبل میں چھپی سسک رہی تھی۔ اس کی سسکیوں کی ہلکی ہلکی آواز سن کے سلیم صاحب کے پیر دروازے میں ہی زنجیر ہو گئے۔ وہ سب برداشت کر سکتے تھے۔ اپنی لاڈلی کی سسکیاں نہیں۔ شکست خوردہ انداز میں قدم اٹھاتے وہ اس کے بیڈ کے قریب آئے۔

''عبادہ.....'' انہوں نے نرمی سے اس کا نام لیا۔

''چلے جائیں یہاں سے بابا..... مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔'' اس کی زکام زدہ آواز نے انہیں مزید پریشان کر دیا۔

''بھائی ہے وہ تمہارا۔ تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'' وہ ناتواں انداز میں اس کی پائنتی کے پاس بیٹھ گئے۔

''ہاں ہاں..... سب میری بھلائی کے بارے میں سوچیں۔ خود تو اللہ نے مجھے دماغ کے ساتھ بھیجا جو نہیں ہے۔'' وہ منہ بسور کے بولی۔

''ایسی بات نہیں ہے بیٹے.....اسے تمہاری فکر ہے۔''

''کوئی فکر نہیں ہے اسے۔'' اس نے جھٹ سے منہ سے کمبل ہٹایا۔''وہ چاہتے ہیں میں عام لڑکیوں کی طرح گھر میں رہوں۔ چادر اور چار دیواری میں۔ رہتے تو وہ اکسویں صدی میں ہیں لیکن ان کی سوچ انیس سو ستر میں پھنسی ہوئی ہے۔''

اس کی آنکھ سرخ ہوگئی تھیں اس کی ناک کی طرح۔ وہ جب جب روتی آنکھیں گلابی ہو جاتیں اور آنکھوں کا سیاہ بٹن نکھر آتا۔

''چترال بہت دور ہے۔ شمال مغرب میں ہے۔ یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جانتی ہو؟''

''میں گھومنے نہیں جا رہی۔ ضرورت سے جا رہی ہوں۔ علاج کے لیے جا رہی ہوں۔ وہاں کے جانوروں کو میری ضرورت ہے۔ جب علاج ختم ہو جائے گا میں واپس آ جاؤں گی۔''

''تم اکیلی کیسے جاؤ گی عبادہ؟ چترال پہاڑی علاقہ ہے۔ ہم تمہیں کیسے بھیجیں؟'' ابا نے انتہائی لاچاری سے کہا۔

''بابا! مجھے وہاں رہائش مل رہی ہے۔ سکیورٹی مل رہی ہے اور کیا چاہیے آپ کو؟''

''تم بہت نازک ہو میری جان۔ تمہاری طبیعت میں اس طرح کی پختگی نہیں ہے جو ہمیں اس طرح کا فیصلہ لینے میں آسانی دے سکے۔'' ابا نے اس کے نازک اندامی پر ٹونٹ کیا۔

اس کا دل دکھا۔

''شادی کے لیے آپ کو میری نفسیاتی پختگی نظر آتی ہے لیکن چترال جانے کے لیے نہیں۔ کمال کا تضاد ہے بابا۔'' وہ منہ پھیر کے گلہ کرتے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں اور آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ وہ گزر جائے تو کوئی بھی لڑکا شادی نہیں کرتا۔'' ابا نے اس کے

گال کو چھو کے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''تمہارے بھائی نے تمہارے لیے ایک رشتہ دیکھا ہے۔ فاطمہ آنٹی۔ یاد ہے تمہیں جو پندرہ سال پہلے ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں پھر انگلینڈ چلی گئی تھیں۔ وہ واپس آ گئی ہیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے صائم کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہارے بھائی کو بہت مناسب لگا ہے یہ رشتہ۔ اس نے ہم سے بات کی۔ تمہاری ماں تو راضی ہے لیکن میں نے کہا میں پہلے تم سے پوچھوں گا۔''

تو وہ اس کی شادی کی پلاننگ کر رہے تھے۔ اسے مزید صدمہ ہوا۔

''تم ایک دفعہ صائم سے مل لو، اسے دیکھ لو..... پسند آئے تو بتا دینا ورنہ ایسی کوئی زبردستی نہیں ہے۔''

''میں چترال جانا چاہتی ہوں بابا۔'' اسے اپنی آواز مشکل سے ہونٹوں سے نکلتی سنائی دی۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔

''چترال والوں کو کوئی اور مل جائے گا..... تم اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔''

''آپ چاہتے ہیں ناں کہ میں نہ جاؤں؟'' اس نے آنسو پونچھے اور سیدھی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ ادھر ہی رہوں گی۔ آپ صائم کے گھر والوں کو بلا لیں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ ایسا کریں۔ اس ویک اینڈ کو میری شادی فکس کر دیں۔ میں رخصت ہو جاؤں پھر میری قدر ہو گی آپ کو۔''

''عبادہ.....''

''مت لیں میرا نام۔ چند سو کلو میٹر دور نہیں بھیج سکتے مجھے لیکن شادی کے لیے ہزاروں کلو میٹر دور کینیڈا بھیج رہے ہیں۔ اچھا ہے میں چلی جاؤں۔ رہیں آپ اپنے بیٹے کے ساتھ۔'' وہ کھڑی ہو گئی اور کروفر سے کہتی واش روم میں گھس گئی، دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ابا بے قراری سے

دروازے کے پاس آئے۔

''عبادہ.....دروازہ کھولو بیٹا بات سن لو.....'' انہوں نے دروازہ بجایا لیکن اس نے نہیں کھولا۔سلیم صاحب جانتے تھے کہ وہ اندر رو رہی ہوگی۔ان کے دل کو کچھ ہوا۔

''عبادہ.....'' وہ دروازہ پیٹنے لگے۔ایک گھنٹے تک پیٹتے رہے لیکن وہ ہنوز اندر بند ہی رہی۔وہ تھک گئے تو احمد اور اماں کو بلا لیا۔انہوں نے بھی کئی بار دروازہ بجایا لیکن عبادہ نے کوئی رسپانس دیا نہ دروازہ کھولا۔اندر خاموشی ہی رہی۔

''احمد! دروازہ کھولو اس کا۔اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔'' ابا نے تڑپ کے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''کچھ نہیں ہوا بابا۔آپ اس کی ضد سے واقف ہیں ناں۔یہ اس کا اپنی بات منوانے کا طریقہ ہے۔اس لیے آپ پریشان نہ ہوں۔میرے ساتھ آئیں۔'' احمد سلیم صاحب کو کندھے سے تھام کے باہر لے آیا۔اماں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔

انہیں کمرے میں لانے کے بعد اس نے انہیں بیڈ پہ بٹھایا۔

''یہاں بیٹھیں۔آرام کریں۔وہ کچھ دیر اندر رہے گی پھر خود ہی باہر آجائے گی۔''

''لیکن وہ.....''

''آپ بلاوجہ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔کتنی ضدی ہے۔اکلوتے پن کا فائدہ اٹھا رہی ہے اور کچھ نہیں۔دیکھ لیجیے گا صبح بالکل فریش ہو کے نکلے گی۔'' وہ رسانیت بولا لیکن یہ صبح کل نہیں آئی۔

اس کے روم کا دروازہ لاک ملا۔رات گئی،صبح ہوئی پھر شام۔چوبیس گھنٹے ہونے کو تھے اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ابا کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔احمد نے انہیں بے ہوشی کی دوا دے کے سلا دیا تھا۔اماں الگ واویلا کر رہی تھیں۔عبادہ بات تو کرتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھولتی تھی۔ایک دن سے

اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ابا دوہری چابی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول لیتے لیکن اس نے چٹخنی چڑھائی تھی اور دروازہ توڑنے کی طاقت ابا میں نہیں تھی۔ انہوں نے کئی بار احمد کو فون کیا لیکن وہ۔ ''نکل آئے گی'' کہہ کر ٹالتا رہا۔ عبادہ کو کمرے میں بھوکا پیاسا بند ہوئے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔

''اس سے کہو جہاں جانا چاہتی ہے جائے۔ ہم نہیں روکیں گے لیکن دروازہ کھول دے۔ باہر آجائے۔'' اماں نے سر پہ دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ جھلا جھلا کے کہہ رہی تھیں۔ نادیہ ان کے سر کھڑی تھی۔ وہ ان کا سر دبا رہی تھی۔

''اللہ، یہ لڑکی مجھے پاگل کر دے گی۔'' احمد مٹھیاں بھینچ بھینچ کے آنکھیں بند کر رہا تھا۔ وہ غصے سے کھول رہا تھا۔

''احمد! میری بات سن رہے ہو؟'' اماں اس پہ بھڑکیں۔

''سن رہا ہوں امی۔ جا رہا ہوں اس کے پاس۔'' احمد چار و ناچار اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کے پاس رک کے اس نے چند لمحے گہرے سانس لیے۔ وہ ابھی آفس سے آیا تھا۔ سرمئی پینٹ پہ سفید شرٹ کی آستین کہنیوں تک چڑھائی ہوئی تھیں۔ ٹائی گردن سے لٹک رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ غصے میں تھا۔

''ہم نے تمہیں اجازت دے دی ہے۔ تم نے جانا ہے جاؤ۔ اب پلیز دروازہ کھول دو۔'' اس نے بے انتہا ضبط سے کہا تھا۔

''قسم کھائیں۔'' اندر سے فریش فریش آواز آئی۔ (اتنی تمکنت؟ ایک دن نہ کھانے کے بعد بھی؟)

''قسم کھاتا ہوں۔'' اس نے دانت کچکچا کے کہا۔

''یہ قسم بھی کھائیں کہ جب میں باہر آؤں گی آپ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔''

وہ ٹھہر گیا۔(وہ تو اس کا کچومر نکالنا چاہتا تھا لیکن.....خیر.....)

''ہاں کچھ نہیں کہوں۔فارگاڈ سیک اب باہر آجاؤ۔امی ابو کی طبیعت خراب ہورہی ہے۔''

''امی ابو کی طبیعت خراب ہوسکتی ہے۔آپ کی طبیعت پہ تو جوں بھی نہیں رینگی ہوگی۔ہے ناں؟'' دروازہ کھول کے وہ شیرنی کی طرح ہشاش بشاش باہر نکلی۔پینٹ پہ لانگ سیاہ شرٹ پہنے،بالوں کو کھلا چھوڑے وہ سینے پر ہاتھ باندھ کے کتنی ڈھٹائی سے کھڑی تھی۔احمد کو لگا وہ بھوک سے نڈھال ہوچکی ہوگی۔

''تو تم یہ سب کرو.....''احمد اس پہ جھپٹا۔وہ جان بچا کے اس کی بانہوں کے درمیان سے نکل کے پیچھے بھاگی۔

''آپ نے قسم کھائی تھی کہ مجھے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔''وہ پلٹ کے خفگی سے بولی۔

''میں نے تو نہیں کھائی تھی ناں؟''اماں کی آواز بے حد قریب سے آئی۔وہ اپنی جگہ جم گئی۔اس نے دھیرے سے منڈی گھما کے پیچھے دیکھا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی.....

اماں نے چپل سے وہ چھتر پریڈ کی کہ سوسائٹی کے معزز گھرانوں نے اس کی آواز سنی۔اماں باٹا کا جوتا پہنتی تھیں۔لاؤنج میں۔راہداریوں میں۔ڈائننگ میں۔کمروں میں۔لان میں اسکی چیخیں گونجتی رہیں لیکن بچانے والا(یعنی ابا جی) سو رہے تھے جب تک کہ وہ اٹھتے،اماں نے اس کی طبیعت صاف کردی تھی۔

اب وہ لاؤنج میں صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی اپنے بازو دبا رہی تھی۔اس کے جسم میں جہاں جہاں چپل لگی تھی وہاں وہاں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔اماں سامنے ہی بیٹھی تھیں۔اس کے پیچھے بھاگنے کی وجہ سے ان کا سانس پھول گیا تھا۔نادیہ نے پانی کا گلاس لا کے دیا تو وہ پانی پینے لگیں۔

''اللہ پوچھے اماں آپ کو۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''یہ لاڈ اپنے باپ کے سامنے دکھانا۔ میرے سامنے آواز بھی نکالی تو ہڈیوں کا چورا بنا دوں گی۔'' اماں سیخ پا ہو چکی تھیں۔ احمد ایک طرف بیٹھا خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی کھی کھی سن کے عبادہ نے کشن اٹھا کے اسے دے مارا۔

''آپ کا الگ سے حساب ہوگا۔ سمجھے آپ۔''

''فی الحال مس ویٹ آپ اپنی مرہم پٹی کریں کیوں کہ ہم آرام کرنے جا رہے ہیں۔ اللہ نگہبان۔'' وہ شرارت سے لب کاٹتا کھڑا ہوا۔ صوفے کی پشت پر پڑا اپنا کوٹ اٹھایا۔ چلتے ہوئے وہ یکدم رک گیا پھر شرارت سے لب کاٹتے ہوئے اس پہ جھکا۔

''درد زیادہ ہو تو اپنے ڈنگروں والے ہسپتال چلی جانا۔''

عبادہ نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے پرے دھکیل دیا۔ ''دفع ہو جائیں۔''

احمد ہنستا، سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ جسم میں بہت درد ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ یکا یک سیاہ گھٹائیں اٹھیں اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پری مون سون کی بارش تھی اس لیے وقت تھا نہ گھڑی۔ من مرضی ہوئی اور بادلوں نے خوب جم کے پانی برسایا۔ اس وقت بارش تھمی ہوئی تھی لیکن ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ تند و مند ہوا چل رہی تھی۔ وہ سلیم صاحب کے کمرے میں تھی۔ سلیم صاحب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر کمفرٹر ڈالے چپ چپ تھے۔ عبادہ جانتی تھی کہ وہ اس کی بچگانہ حرکت پہ ناراض ہو چکے ہیں۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ پردے ہٹے ہوئے تھے۔ آسمان پہ بادل برقرار تھے۔ دور کہیں بجلیاں چمک رہی تھیں۔

''بابا! ادھر دیکھیں۔'' اس نے سلیم صاحب کے گال ہاتھوں میں بھرے اور ان کا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ ''کب تک بات نہیں کریں مجھ سے؟ کل مجھے چترال جانا ہے۔ آپ اسی طرح ناراض رہے تو میں نہیں جاؤں گی۔''

سلیم صاحب نے دھیرے سے اس کے ہاتھ نیچے کیے۔

''کچھ کھایا تم نے؟'' اس حال میں بھی انہیں اس کی فکر تھی۔

''کھالیا۔''

''کل رات سے بھوکی ہو۔ ڈاکٹر ہو کے اتنی لاپرواہی؟''

''یہ بھوکی رہ سکتی ہے؟ میں نے کہا تھا آپ سے یہ اس کی ضد پوری کرنے کے طریقے ہیں۔ اس کے جال میں نہ آئیں۔'' احمد جتانے والے انداز میں کہتا کمرے میں داخل ہوا۔ ''لیکن آپ سنتے کہاں ہیں؟ پزا۔ زنگر اور پرانز کے ڈھیروں ڈھیر ریپرز کو نادیہ نے اس کے کمرے میں موجود کوڑے دان سے نکالا ہے بابا۔ گرل سینڈوچ..... کوک..... ویلوٹ کپ کیکس اور کوکو مو..... یہ سب میں نے ادھ کھایا ہوا برآمد کیا ہے اس کے کمرے سے۔ آپ کا بلڈ پریشر بڑھا۔ اماں کی شوگر لو ہوئی۔ آپ کے لیے ڈاکٹر آیا۔ اماں کی جان ہلکان ہوئی اور مجھے دس بار آفس فون کیا گیا۔'' اس کی ٹھوڑی مارے شرمندگی کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

''اس کی بات مان لی گئی۔ اس کے بیگ پیک ہو گئے یہ کل چلی جائے گی لیکن.....'' احمد رکا۔ عبادہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''جانے سے پہلے یہ ہماری ایک بات مانے گی۔''

''کوک..... کونسی بات؟''

''صائم سے ملنے والی.....'' احمد صوفے پر بیٹھا۔ میز پہ ٹانگیں پھیلا کے قینچی بنائی اور اسے مسکرا کے دیکھنے لگا۔ عبادہ نے الجھن سے پہلے ابا کو دیکھا پھر احمد کو۔ یکدم اس کے چہرے پر شیطانی

مسکراہٹ عود آئی۔

''صرف ملنا ہے؟'' اس نے ایسا پوچھا جیسے یہ تو بہت آسان ہے۔

''ہوں۔'' احمد نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے بابا۔ میں چترال سے واپسی پر اس سے مل لوں گی۔'' اس نے سلیم صاحب کے ہاتھ پہ دباؤ ڈالا۔

''نہیں۔ چترال سے واپسی پر نہیں۔ ابھی ملنا ہوگا۔ اسی وقت۔ سوسائٹی کے مرکز میں جو اکلوتی کافی شاپ ہے ناں۔ وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جاؤ اس سے مل کے آؤ اور ہمیں بتانا کہ کیسا لگا۔''

''اس وقت؟ دس بج رہے ہیں بھائی۔'' اس نے احمد کی عقل پہ ماتم کیا۔

''گرمیوں کے دس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس لیے تیار ہو جاؤ۔ اس سے مل لو۔ چترال سے جانے تم کب واپس آؤ۔''

''ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی جا رہی ہوں۔ آ جاؤں گی کچھ دنوں میں.....''

''اوں ہوں۔ تمہارا اعتبار نہیں رہا۔ اٹھو شاباش۔''

''اس موسم میں..... اسے کیوں زحمت دے رہے ہو۔'' ابا نے گہری سانسوں کے بیچ رک رک کے کہا۔ ''چترال سے واپسی پر مل..... مل..... لے گی۔''

''نہیں بابا۔ اس کے سہارے بیٹھے رہے تو اس نے کبھی نہیں ملنا۔ اسی طرح ہمیں ٹرخائے گی۔ اسے ابھی اسی وقت صائم سے ملنے جانا ہوگا اور میں دور نہیں بھیج رہا۔ سوسائٹی کے کافی شاپ بھیج رہا ہوں۔ تم.....'' وہ کھڑا ہوا۔ اس کی طرف آیا۔ ''اٹھو شاباش۔ چلو میرے ساتھ۔ تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' احمد نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے اٹھایا۔

''سوسائٹی کا مرکز کوہ قاف میں نہیں ہے بھائی۔دس منٹ لگتے ہیں جانے میں۔میں خود بھی جا سکتی ہوں۔''ابا کے کمرے سے باہر نکل کے وہ احتجاجا بولی۔

''اچھا.....؟''احمد رک گیا پھر انگلی اس کے چہرے کے سامنے لہرائی۔''جاؤ۔لیکن میں ٹھیک بیس منٹ بعد صائم کو فون کروں گا۔اگر تم وہاں نہ گئیں تو چترال جانا کینسل۔سمجھیں۔''

''اتنی جلدی فیصلے کیوں سناتے ہیں آپ۔کہا تو ہے جا رہی ہوں اس انگریز لنگور سے ملنے۔''اس نے سٹپٹا کے اپنا بازو چھڑایا اور تیز تیز قدم لیتی کمرے کی طرف بھاگی کہ خدانخواستہ وہ واقعی پکڑ کے چترال جانے سے نہ روک دیں۔

کمرے میں آ کے اس نے کھڑکی کے پردے ہٹا کے باہر کا موسم دیکھا۔بارش رک چکی تھی لیکن ہلکی ہلکی پھوار ابھی بھی برس رہی تھی۔اس نے جلدی سے اپنی برساتی نکال کے پہنی۔چھتریاں اٹھانے سے اسے سخت چڑ تھی۔

اپنا فون برساتی کے جیب میں ڈالنے کے بعد وہ گھر سے نکل آئی۔دیکھنا وہ اس رشتے کا کیا حشر کرتی ہے۔ہونہہ۔

☆.....☆.....☆

سڑک پہ پانی پھسلا جا رہا تھا۔ایک چھوٹا سا دریا تھا جو سیوریج کے سوراخوں میں جذب ہو رہا تھا۔وہ دونوں ہاتھ برساتی کی جیب میں ڈالے فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔

کشادہ سڑک کے کنارے لگے اسٹریٹ پولز روشن تھے۔ان کی نارنجی روشنیاں سڑک پہ پڑ رہی تھیں جہاں بارش کی ہلکی پھوار رقصاں تھی۔چاروں طرف خاموشی تھی۔ابن آدم کا نام ونشان نہیں تھا۔پیدل چل کے وہ مرکز آئی تو یہاں لوگوں کا جم غفیر موجود تھا جن میں بیشتر وہ لوگ تھے جو بارش کے موسم سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔مرکز کشادہ،صاف اور روشن تھا۔دو اونچی عمارتیں تھیں

جن کے اندر قطار میں مختلف دکانیں تھیں۔ایک طرف بڑی سی مسجد تھی۔ایک سوسائٹی کا پول ہاؤس تھا،ساتھ ایک گیٹ تھا جس کے پار گالف گراؤنڈ تھا۔

وہ کافی شاپ کے اندر آ گئی۔اس کی برساتی پر بارش کے ننھے ننھے قطرے پڑ گئے تھے۔

ایک ہال کی طرح کے اس کافی شاپ میں جگہ جگہ میزیں نصب تھیں۔ایک بار کی طرح اونچے کاؤنٹر تھے جن کے سامنے اونچی کرسیاں لگی تھیں۔دیواروں پر ٹوٹے گٹار اور ہیٹس پڑے تھے۔اندر نیم اندھیرا تھا۔لوگ نشستوں پر براجمان تھے۔چاروں طرف پیالیوں کی گونج تھی اور خستہ بسکٹ،کیک اور کوکیز کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے گردن اونچی کر کے پورے ہال پہ نظر دوڑائی۔وہاں کوئی بھی انسان اکیلے نہیں بیٹھا تھا۔سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی تھا۔اس صائم کو پندرہ سال پہلے دیکھا تھا۔اتنے سارے چہروں کو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اسے کیسے تلاش کرے؟

وہاں موجود ایک ایک چہرے کو اس نے غور سے دیکھا۔ان میں کوئی بھی صائم نہیں تھا۔اتنے سالوں میں وہ کتنا بدل گیا ہو؟ کیا بے وقوفی نہیں کہ وہ اس کی تصویر تک دیکھ کے نہیں آئی تھی؟

''ایکسکوزمی۔میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' ایک ویٹر اس کی الجھن دیکھتے ہوئے قریب آیا۔وہ گڑبڑا گئی۔اب کیا کہے؟ وہ کیوں سب کو اس طرح دیکھ رہی ہے؟ ایسے مشکوک انداز سے؟

''مجھے گرل سینڈوچ اور ایک کپ کافی لا دیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔

''جی میم۔آپ تشریف رکھیں۔ہم لاتے ہیں۔'' ویٹر مؤدبانہ انداز میں کہتا کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سرعت سے ایک میز تک آئی،کرسی کھینچی اور دھپ سے بیٹھ گئی۔اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔کہاں تھا صائم؟ بھائی نے تو کہا تھا وہ ادھر ہی ہوگا۔وہ تصویر دیکھ کے نہیں آئی تھی لیکن صائم نے

تو اسے دیکھا ہوگا؟

''اوخدا.....'' اس نے ماتھے پہ ہاتھ دے مارا۔ ''حلیہ بھی نہیں پوچھا بھائی سے۔''

خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے اپنا فون نکالا، برساتی کی ٹوپی پیچھے کی اور احمد کو فون ملانے لگی۔ گھنٹیاں جاتی رہیں پھر یکدم ہی اس کی آواز آئی۔

''پہنچ گئیں؟''

''ڈونٹ ٹیل می کہ یہ پرینک ہے۔ آپ نے مجھے ذلیل کیا ہے۔'' وہ دبے دبے غصے سے چلائی۔

''پرینک؟ دماغ سیٹ ہے میرا مادام۔''

''تو کہاں ہے وہ لنگور؟''

''کافی شاپ میں.....''

''نہیں ہے۔'' اس نے تنک کے کہا۔ ''پوری شاپ دیکھ چکی ہوں۔ وہ نہیں ہے یہاں۔''

''ٹھیک سے دیکھو۔ ادھر ہی ہوگا۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''دیکھ چکی ہوں بھائی۔ اب تو کافی شاپ والے بھی مجھے گھور رہے ہیں۔'' وہ خجالت سے بولی پھر آنکھیں بند کر کے سانس لی۔ ''آپ ایک کام کریں۔ اسے فون کریں اور میرا حلیہ بتائیں کہ میں نے کیا پہنا ہے میں کیسی دکھ رہی ہوں۔''

''اس طرح تو وہ چڑیا گھر چلا جائے گا۔'' احمد نے مسکراہٹ روک کے کہا۔

''بھائی.....'' وہ چڑ گئی۔

''اچھا چھابتاتا ہوں تمہارا حلیہ۔ پہلے مجھے تو بتاؤ۔''

''سیاہ برساتی پہنی ہے۔ سرخ رنگ کے رین شوز ہیں۔'' اس نے دھیرے سے بتایا۔

''تم چھتری لے کر نہیں گئیں؟ ہاؤ ان رومینٹک۔ مجھے لگا تم عین سڑک کے درمیان سرخ چھتری لے کے اس کا انتظار کرو گی لیکن تم تو انتہائی سوکھی ہو۔'' وہ ناک چڑھا کے بولا پھر یکدم جیسے کچھ دیا آیا۔ ''اوہ۔ ہاتھ میں درد ہوگا۔ امی نے بازو پہ پہلی چپل ماری تھی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ واجبی سی ہمدردی جتانے لگا۔

''ہوں۔ جیسے خود تو آپ نے کبھی مار نہیں کھائی۔ یاد ہے مجھے پچھلے سال کا واقعہ جب ابا نے گال پہ کھینچ کے تھپڑ مارا تھا۔ میں نے یاد دلایا تو موصوف آپ اور آپ کے طعنے ڈاٹ کام خود بخود بند ہو جائیں گے۔'' اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ آیا بڑا۔ ہونہہ.....

ویٹر اس کا آرڈر لے آیا۔ خاکستری لمبے سے گول کپ میں سٹرانگی کافی تھی اور ٹشو پیپر میں دو سینڈوچ بند تھے۔ اس نے کارڈ نکال کے آرڈر کی قیمت دی اور جب ہی احمد کا فون آیا۔

''وہ کافی شاپ کے باہر ہے۔ پول کے پاس۔ اندر اسے گھٹن ہو رہی تھی تو وہ باہر آ گیا۔ بلیو شرٹ پہنی ہے اس نے۔ ہاتھ میں کافی کا کپ ہے۔'' وہ تیزی سے بولا۔ یقیناً منہ بن گیا تھا۔

''نوازش.....'' اس نے نروٹھے انداز میں کہا اور کال کاٹ دی۔

وہ اپنے سینڈوچ اور کافی اٹھا کے باہر آ گئی۔ باہر بھی کافی لوگ موجود تھے لیکن چوں کہ احمد حلیہ بتا چکا تھا اس لیے اسے صائم کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہوئی۔ وہ سیدھے ہی اس پول کے پاس آئی جہاں وہ ایک کندھا پول سے ٹکائے، ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، دوسرے سے کافی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کے عبادہ کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی کام نہیں ہے۔

کافی شاپ کے باہر لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا۔ جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ کافی شاپ کی روشنیاں پانی پر پڑ کے قوس قزح بنا رہی تھیں۔

''السلام علیکم.....'' اس نے قریب جا کے اسے مخاطب کیا۔ وہ چونکا، پھر سیدھا ہوا اور پلٹ کے

اسے دیکھا اور..... دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ سیاہ برساتی میں الپسرا لگ رہی تھی۔ اس کے پیشانی کے بال تھوڑے تھوڑے نم تھے۔ سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام.....'' صائم کو اپنا دل نکلتا محسوس ہوا۔

''میں عبادہ سلیم.....'' اس نے مروت کے مارے ہاتھ آگے کیا۔ صائم نے بے توجہی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''میں صائم عباس.....'' وہ بہکے بہکے لہجے میں بولا۔

''اوو..... کے.....'' عبادہ نے اپنا ہاتھ چھڑا کے ''گھن'' کھانے والے انداز میں کہا۔ وہ کافی بدل گیا تھا۔ بہت موٹا ہو گیا تھا اور دہری ٹھوڑی بھی نکل آئی تھی۔ اس کی ابرو کے پاس موجود سیاہ تل بھی پہلے سے زیادہ بڑا لگ رہا تھا۔

''آپ کب آئے؟ آپ تو انگلینڈ گئے تھے ناں؟'' اس نے خود کو سنبھال کے اس کی نظروں سے بچایا۔

''میں؟'' وہ گڑبڑایا پھر تیزی سے سنبھل گیا۔ ''میں دو ہفتے پہلے آیا ہوں۔''

''اچھا.....'' اس نے غیر دلچسپی سے کہا۔

''میں پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے چار کافی کے کپ پیے۔ ایسا لگ رہا تھا ساری کافی ختم کر دوں گا لیکن آپ نہیں آئیں گی۔ کہاں رہ گئی تھیں آپ؟'' وہ شکوہ نہیں کر رہا تھا۔ اپنے قیمتی وقت کے ضائع ہونے پر اسے ڈانٹ رہا تھا۔

وہ کافی کا سٹرا منہ میں پکڑے اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''آئی ایم سوری..... میری وجہ سے آپ کو اتنی زحمت ہوئی۔''

''نہیں نہیں۔ میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ آپ برا مت مانیے گا۔'' وہ تیزی سے

بولا۔عبادہ نے ہنسی زیرلب دبائی۔"دراصل مجھے ایسے موسم میں تھوڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔آپ کے بھائی نے ایمرجنسی میں فون کیا تو آنا پڑا۔بٹ اٹس اوکے۔"

اردو کو گٹکا منہ میں رکھ کے بول رہا تھا۔(جعلی انگریز.....ہونہہ!)

"یقین نہیں آرہا یہ آپ ہیں۔" کچھ توقف کے بعد وہ خمار آلود آواز میں کہنے لگا۔"آئی مین پندرہ سال پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں۔"

"کیوں کہ پندرہ سال پہلے میں بارہ سال کی تھی۔بارہ سال کی بچی اور ستائیس سال کی لڑکی میں فرق ہوتا ہے۔"اس نے ٹھنک کے کہا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" وہ جھینپ گیا۔

"پھر؟"

"میرا مطلب آپ کافی بدل گئی ہیں۔"

"اچھا.....کوئی بات نہیں۔"اس نے برساتی کی ٹوپی سر پہ ڈالی اور سڑک کی طرف چل پڑی۔

"کہاں جارہی ہیں؟"اس کے اس طرح پلٹنے پر وہ بری طرح چونکا۔

"گھر جارہی ہوں۔بارش ہونے والی ہے۔بجلیاں کڑک رہی ہیں۔"

"آپ کو بھی ڈر لگتا ہے؟"اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

"کس سے؟"

"بجلیوں سے؟"

"نہیں تو....."

"اچھا؟" وہ متحیر ہوا۔"پھر آپ کیوں جارہی ہیں؟"

"آپ کے لیے.....آپ کو گھبراہٹ ہوتی ہے ناں۔میں نے سوچا چلتے چلتے بات بھی کرلیں

گے اور گھر بھی پہنچ جائیں گے۔'' وہ نرمی سے مسکرائی۔

''گڈ آئیڈیا۔'' صائم بھی مسکرا کے اس کے پیچھے آیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار گرنے لگی تھی۔ صائم نے برساتی نہیں پہنی تھی، چھتری بھی نہیں تھی۔ وہ پھوار سے گیلا ہو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے بہتے پانی میں بچے کود کود کے چھینٹے اڑا رہے تھے۔ گرمی کی اس بارش نے ہر چیز نکھار دی تھی۔

''آپ واقعی بہت بدل گئی ہیں۔'' چلتے چلتے اچانک صائم نے دوبارہ کہا۔ وہ جبراً مسکرائی۔

''امی نے بتایا تھا مجھے کہ آپ کافی خوبصورت ہو گئی ہیں۔ پہلے تو یقین نہیں آیا مگر.....''

یکدم وہ پلٹی۔ ''مگر.....؟'' آنکھوں میں شوخی اتری۔

''یہی کہ امی سچ کہہ رہی تھیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''لیکن آپ تو بالکل نہیں بدلے۔ مجھے لگا انگلینڈ جا کے آپ میں تھوڑی تبدیلی آئے گی لیکن آپ تو ویسے کے ویسے دکھتے ہیں۔ وہی موٹاپا، وہی رنگت، وہی ان ہینڈسمنیس۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ (یہ رشتہ تو سر تلے)

صائم کے چہرے پہ رنگ گزر گیا۔ وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے مزے سے سینڈوچ کھا رہی تھی۔ کسی کو یوں باڈی شیم نہیں کرتے۔ یہ بہت غلط بات تھی۔ اس نے صبر کا گھونٹ پی لیا۔

''آپ کا پیر کیسا ہے؟ ماما نے مجھے بتایا تھا۔ آپ غالباً گھوڑے سے گری تھیں۔'' اس نے عبادہ کا تبصرہ نظر انداز کر دیا۔

''ابھی ٹھیک ہوں۔ چل پھر سکتی ہوں۔'' اس نے سپاٹ سا جواب دیا۔ تو فاطمہ آنٹی نے اسے بتا دیا تھا۔ کاش یہ آنٹیاں مغرب جا کے ''آنٹی پن'' سے باز آ سکتیں!

''آپ کو جانوروں سے دور رہنا چاہیے۔ خاص کر ایسے۔۔ کیا کہتے ہیں وہ.....''

''بکھرے ہوئے.....''

''بکھرے مطلب.....؟''

''scattered'.....''

''ہاں.....بالکل.....''

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔دونوں تین منٹ تک مسلسل چلتے رہے۔عبادہ سینڈوچ کھاتی رہی۔وہ آس پاس کو دیکھتا رہا۔

''آپ کی سٹڈیز کیسی جارہی ہیں؟''اس نے بات کرنے کے لیے پوچھا۔

''کیوں؟آپ کی ماما نے آپ کو نہیں بتایا۔''اس نے چوٹ کی۔

''جی؟'' وہ ٹھٹکا۔

'' میرا مطلب کہ فاطمہ آنٹی کو میرے بارے میں سب معلوم ہوتا ہے۔ماما کی دوست جو ہیں۔میں نے سوچا انہوں نے آپ کو بتایا ہوگا۔''اس نے بات کو گھما کے سنبھال لیا۔

''نہیں بتایا انہوں نے۔''

''ڈاکٹر ہوں میں.....''اس نے سینڈوچ کھا کے ریپر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

''ایم بی بی ایس؟یا سپیشلائزیشن کی ہے۔''

''اوں ہوں۔ویٹ ہوں۔''اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''یعنی جانوروں کی ڈاکٹر؟''

''بالکل۔میں مفت میں علاج کرتی ہوں جانوروں کا۔آپ میرا نمبر لے سکتے ہیں۔''اس نے پیشکش کی۔

''ضرور مگر میرا کوئی.....''اس سے پہلے کہ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتا،عبادہ کی ہنسی چھوٹ

گئی۔وہ سڑک کنارے، بازو منہ پہ رکھے ہنسنے لگی۔صائم خفگی سے اسے دیکھنے لگا۔عبادہ ہنستی گئی .....ہنستی گئی پھر دفعتاً اسے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا۔

''سوری.....''اس نے خجالت سے کافی کا سپ لیا اور چلنے لگی۔صائم کو اس کا یہ انداز بالکل نہیں بھایا۔وہ اسے سلجھی ہوئی، باتہذیب لڑکی سمجھتا تھا جب وہ.....اس نے سر جھٹک دیا۔

تیز ہوا چلنے لگی تھی۔عبادہ کی برساتی اڑ رہی تھی۔یکدم ہی ماحول میں سردی بڑھ گئی تھی یا شاید ماحول ہی سرد تھا۔پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گردن جھکائے، مؤدب سے چلتے صائم نے سوچا تھا۔

''آپ کی ہوبیز کیا ہیں؟''جب سارے سوال جواب ختم ہوگئے تو اس نے پہلی ملاقات کا روایتی سوال پوچھ لیا۔

''ہیوی بائیک چلانا۔''

''ہیوی.....بائی.....یک۔''وہ اس کی پسند سے متاثر ہوا۔''کافی مردانہ قسم کا شوق ہے آپ کا۔''

اس کا منہ بن گیا۔تیورا کے اسے دیکھا۔وہ اپنے قدموں کو دیکھتے ہوئے اطمینان سے آگے جا رہا تھا۔اس نے کچھ سوچا اور اسے دوستانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔''آپ شوقاً کیا کیا کرتے ہیں۔''

''میں.....''وہ قدرے چونک گیا۔''میں ڈرائیونگ کرتا ہوں۔سوئمنگ کرتا ہوں۔کلب جاتا ہوں۔واک کرتا ہوں۔رات میں کافی پینے کا شوق ہے اور بیکنگ بھی کر لیتا ہوں۔''

''بیکنگ۔''اس نے ناک چڑھالی۔

''ہوں۔بیکنگ میرا شوق ہے۔''اس نے فخر سے بتایا۔

''کافی ز.....نا.....نہ.....قسم کا شوق ہے آپ کا۔'' عبادہ نے اس کا فقرہ لٹا دیا۔ صائم زیر لب مسکرایا۔ (پاگل کہیں کی۔)

گھر قریب آ گیا تو وہ رک گئی۔

''چلیں برقرار رکھیں اپنے شوق کو۔ میرا گھر آ گیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ اللہ نگہبان۔'' اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کے سلیوٹ والے انداز میں کہا پھر وہ پلٹ گئی۔ (وہ ہاتھ ملانے والی غلطی نہیں کر سکتی تھی) صائم نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گہری سانس لی اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے سڑک پہ آگے بڑھ گیا۔

گیٹ سے اندر آنے کے بعد وہ طے کر چکی تھی کہ اس نے کس ''بنیاد'' پر یہ رشتہ مسترد کرنا ہے۔

☆.....☆.....☆

''تو کیسا لگا؟'' وہ کمرے میں آ کے برساتی کی زپ کھول رہی تھی جب بیڈ پہ گدھوں کی طرح چھلانگ لگا کے بیٹھتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

''بہت برا۔'' اس نے کروفر سے کہا۔

''پتہ تھا مجھے۔ تم اس کو پسند کرنے کی نیت سے گئی ہی نہیں تھی۔'' احمد نے ناک بھوں چڑھائی۔

''کیسے پسند کرتی؟ آپ نے وزن دیکھا ہے اس کا؟ اتنا موٹا ہو گیا ہے۔ توند باہر نکل آئی ہے۔ اتنی موٹی موٹی ٹانگیں گویا کوئی پہلوان ہو۔'' پائنتی پہ بیٹھ کے شوز اتارنے لگی۔ ''مجھے موٹے مرد نہیں پسند۔ آپ جانتے ہیں اور وہ.....اسے تو اپنی صحت کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ ایک گھنٹہ وہ میرے لیے انتظار کرتا رہا اور اس ایک گھنٹے میں اس نے چار کافی کے کپ پیے۔ اندازہ کر لیں آپ۔'' وہ شدید تپ کر آئی تھی۔

''میں مانتا ہوں وہ موٹا ہوا ہے لیکن یہ تو چیئر جاب کی وجہ سے ہے اور یورپ میں کافی پانی کی

طرح پی جاتی ہے۔ یہ تو کوئی ریزن نہیں ہوا کسی کو ناپسند کرنے کا۔'' احمد نے خفگی سے کہا۔

''بھائی! موٹاپا ایک خامی نہیں ہے۔ ایک بیماری ہے اور آپ ایک بیمار آدمی سے اپنی بہن کی شادی کروائیں گے؟''

''اس بیماری کا علاج ہے عبادہ۔''

''تو میں کیا کروں؟ میں جانوروں کی ڈاکٹر ہوں۔ انسانوں کی نہیں۔'' شوز اتار کر ریک میں رکھتے ہوئے وہ تنک کے بولی۔

''وہ اپنا وزن کم کرلے گا عبادہ۔'' احمد نے مفاہمت سے کہا۔

''مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔ سمجھے آپ۔'' رکھائی سے کہتی وہ واش روم میں گھس گئی۔ احمد نے دھڑام سے سر پیچھے پھینک دیا۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ تینوں اسے ائیر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ اس نے پی آئی اے کے چھوٹے جیٹ طیارے میں جانا تھا۔ انٹرنس کے باہر ٹرالی بیگ پکڑ کے کھڑی عبادہ سلیم کو اماں نے کندھے سے تھام کے اپنے سامنے کیا اور ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ ابا نے کوئی پنگا نہ لینے، خود کو نقصان نہ پہنچانے، شرافت سے رہنے اور تحمل سے اپنا کام کرنے کا مشورہ دیا۔ احمد نے کچھ نہیں کہا، بس اتنا کہا کہ وہ جتنے بھی دن وہاں رہتی ہے۔ بس رہ کے دکھائے۔

یہ ایک چیلنج تھا۔ وہ جانتی تھی۔ لیکن وہ پریشان نہیں ہوئی۔ اس نے مسکرا کے احمد کو دیکھا۔

''جتنا بھی وقت وہاں گزراروں گی۔ میں ڈٹی رہی ہوں گی۔ وقت سے پہلے نہیں آؤں گی۔ دیکھ لینا۔'' اس نے پوری طرح چیلنج کیا۔

''لیکن میں تمہارا کمرہ روز صاف کرواؤں گا۔'' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے احمد آنکھیں

سکیٹر کے مسکرایا۔

''سوٹ یور سیلف (جو آپ کو مناسب لگے)۔'' اس نے شانے اچکا کے لاپرواہی سے کہا۔

فلائٹ وقت پہ تھی یعنی گیارہ بجے۔اس کا چھوٹا سا جیٹ طیارہ ہوا میں بلند ہوا۔ہوا کی لہروں پر چڑھا۔اس کی اگلی منزل چترال کی تھی۔

ویلکم می چترال.....!

☆.....☆.....☆

تقریباً دو بجے اس کی فلائٹ چترال لینڈ ہوئی۔فلائٹ میں زیادہ تر سیاح تھے جن کی بڑی تعداد شندور پولو میچ دیکھنے اور وادی چترال گھومنے آئی تھی۔وہ جیٹ طیارے سے باہر نکلی تو خوشگواریت کا احساس ہوا۔

آسمان صاف تھا۔نیلا، بے حد نیلا۔سورج چمک رہا تھا۔کہیں کہیں آسمان میں بھیڑوں کی اون کی طرح بادل نظر آرہے تھے۔چاروں طرف کوہ ہندوکش کی سرمئی پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان برف سے ڈھکی، ترچ میر کی چوٹی سینہ تان کے کھڑی تھی۔دھوپ اس کے دربار میں سربسجدہ تھی اور حسن اس کے دیدار کے قصیدے سنا رہا تھا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ پہاڑ درختوں اور سبزے سے بالکل پاک تھے بالکل مکہ کی پہاڑیوں کی طرح..... سنگلاخ، چٹیل، کھردرے .....البتہ خاردار جھاڑیاں کہیں کہیں اگی ہوئی تھیں۔

وہ اپنا بیگ پیک پہن کے قدم قدم نیچے آئی۔

رن وے سے ائیر پورٹ کے احاطے پر موجود چترال ائیر پورٹ کی سفید عمارت نظر آرہی تھی جس کے عین سامنے پاکستان کا لمبا جھنڈا نصب تھا۔اس کی بالکونی سے چترال کا سرخ جھنڈا ہوا کے زور پہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

وادی چترال کوہ ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان دریائے چترال (کونڑ: کھووار زبان میں) کے کنارے آباد ایک وسیع سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ یہ دراصل دو طرفہ پہاڑوں کے درمیان موجود ہموار علاقہ ہے۔ ایک نظر دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے وادی میں ٹھیلوں کی شکل میں سبزے کا کارپٹ بچھا ہو جس پہ اونچے اور گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھایا اتر رہی ہے۔ دریائے چترال کے کنارے دیودار کے درختوں کے جھنڈ در جھنڈ لگے ہوئے ہیں جو اس کے ساتھ وہاں تک چلتے ہیں جہاں تک دریا چلتا ہے۔

وہ جیٹ سے اتر کے دور آ گئی تھی۔ باقی سیاح بھی رن وے پر وقفے وقفے سے کھڑے تھے۔ ان کا سامان ابھی پراسیسنگ میں تھا۔ اس نے نیلی چست جینز پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گردن میں مفلر تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑے رکھا تھا۔ وہ بیگ بیک کے اسٹریپس میں کندھوں کے قریب انگوٹھے ڈالے، آنکھوں پر کالا چشمہ لگائے، منہ میں چیونگم چباتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

اس یہاں آ کے ایک تازگی کا احساس ہوا تھا۔

چترال کا دریا خود میں موجود بڑی بڑی چٹانوں سے سر پٹخ رہا تھا۔ اس کے مدھم مدھم چپاکوں کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ سیاحوں نے اترتے ہی کیمرے نکال لیے اور اس ائیر پورٹ پر ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ اس دلفریب نظارے کو اپنے کیمروں میں عکس بند کرنا چاہتے تھے۔

یونہی گھومتے گھومتے ایک سیاح جوڑا اس کے پاس آیا۔ وہ غالباً اسے فارغ کھڑا دیکھ کے اس طرف آیا تھا۔

''ایکسکیوزمی.....!'' اس نے انگریزی لب و لہجے میں مخاطب کیا۔ وہ جو پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز پہ سیدھی ہوئی۔

"یس....."

"آپ ہمارا.....پکچر.....لے.....گا....." سرخ سفید جلد والے اوسط قد کے انگریز نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

"شور وائے ناٹ۔(ضرور، کیوں نہیں)" اس نے مسکرا کے اس کا کیمرہ تھام لیا۔انگریز اور اس کی سرخ بالوں والی بیوی اس کے سامنے قدرے فاصلے پر یوں کھڑے ہو گئے کہ پس منظر میں جیٹ طیارہ اور چترال کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔

اس نے مختلف زاویوں سے تین چار تصویریں لینے کے بعد کیمرہ نیچے کر دیا۔وہ دونوں مسکراتے ہوئے قریب آئے، اس سے کیمرہ لیا پھر ایک دوسرے سے بالکل جڑ کے یوں کھڑے ہو گئے کہ کیمرے کی اسکرین پر چھایا پڑ گئی۔وہ سر جھکا کے تصویریں دیکھنے لگے کہ کیسی آئی ہیں۔انہوں نے بٹن دبا کے ایک ایک تصویر کو پیچھے کیا، دفعتاً ان کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری۔

"تھینک یو....." انگریزی لڑکی نے ممنونیت سے کہا۔"گڈ کلکس....."

"مائین پلیور....." اس نے سر کو خم دیا۔

"یور آر ٹورسٹ....." لڑکی نے پوچھا۔

"نو آئی ایم ویٹ۔آئی ایم ہیئر ٹو ٹریٹ سم اینی ملز۔(نہیں۔میں ویٹ ہوں۔یہاں کچھ جانوروں کا علاج کرنے آئی ہوں۔)" اس نے اپنا کارڈ نکال کے اسے دکھایا۔انگریز لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

"وہاٹ آ نائس جاب گرل.....یو نو آئی آلسو ہیو آ پیٹ۔ہز نیم از ڈریسی۔آئی مس ہر۔(کیا اچھی نوکری ہے لڑکی! تمہیں پتہ ہے میرے پاس بھی ایک پالتو ہے اس کا نام ڈریسی ہے۔میں اسے یاد کر رہی ہوں۔)" وہ لہجے میں کرب سمو کے بولی تو اس کے شوہر نے اس کی پشت سہلائی۔

''ریلیکس ڈیئر۔ وی ال میٹ ہر سون۔ (پرسکون ہو جاؤ پیاری۔ ہم اس سے جلد ملیں گے۔''

''آئی ہوپ سو (مجھے امید ہے۔)'' وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولی پھر کارڈ کو دیکھا، کچھ لمحے دیکھتی رہی پھر عبادہ کو پکڑایا۔

''یو آر سچ کا نائس سول۔ کیپ یور سپیرٹ اپ۔ (تم ایک اچھی روح ہو۔ اپنے حوصلے بلند رکھنا۔)''

''ان شاءاللہ.....'' اس نے کارڈ واپس لیتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

کچھ دیر بعد ان کو ان کے سامان کی کلیئرنس مل گئی۔ وہ اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتے ہوئے ائیر پورٹ ٹرمنل سے باہر نکلی اور مرکزی سڑک کی سمت آ گئی۔ سیاحوں اور مسافروں کو لینے کے لیے جیپیں، ویگنیں اور کاریں کھڑی تھیں۔ اس نے وہاں لینے کے لیے آنے والوں پر تفصیلی نظر ڈالی ہی تھی جب دور سے ایک دبلا پتلا آدمی بھاگ کے اس طرف آتا ہوا نظر آیا۔ کھلی شلوار قمیص پہنے، شلوار کے پائنچے بالشت بھر فولڈ کیے، کندھے پر چادر کی گٹھڑی رکھے وہ اس کے پاس آ کے رکا۔

''سلام..... میں منیب خان..... یوسف خان کا ملازم..... آپ کو لینے آیا ہوں۔'' وہ لڑکا جس کی مونچھیں پتلی لکیر جیسی تھیں پشتو لہجے کا تاثر لیے اردو میں بولا۔

''وعلیکم السلام۔ میں عبادہ سلیم۔'' اس نے ٹھٹک کے کہا۔ وہ جھینپ کے مسکرایا پھر اس کا سامان کندھے پر اٹھایا اور اسے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ وہ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ اس نے پہچان کیسے لیا؟ شاید یوسف خان نے تصویر دکھائی ہو۔ وہ سر جھٹک کے اس کے پیچھے چلنے لگی۔

مرکزی سڑک پر باقی گاڑیوں سے دور ایک ڈبل سٹرک اپ ہٹ کے کھڑی تھی۔ پک اپ کے پچھلے حصے میں دو مقامی آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شلوار قمیص پہنے، کمر پہ کارتوسوں کا کمر بند باندھے، سر پہ کیپ رکھے، ایسے چوکنا تھے جیسے کوئی فوجی جوان۔ انہوں نے کلاشنکوف اپنے

پیروں کے درمیان رکھے ہوئے تھے۔ منیب خان نے عبادہ کا سامان ان اسلحہ برادروں کو پکڑایا اور اس کے لیے پک اپ کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ سن گلاسز اتارتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ منیب خان پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''آ گئی میڈم.....'' منیب نے گاڑی سٹارٹ کی تو کسی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ جو مفلر گردن سے ہٹا رہی تھی، چونکی۔ اگلی سیٹ پر کوئی براجمان تھا۔ اس نے کھڑکی کی سمت کھسک کے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے پیٹ پہ نیت کے انداز میں پڑے تھے۔

''جی چھوٹے خان.....'' منیب نے کہہ کے گاڑی سڑک پہ ڈال دی۔

''سامان لے لیا.....'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''جی خان۔''

''ہوں۔'' اس نے خمار آلود ہنکارا پھر کسمسا کے کروٹ بدل لی۔ اس نے سر جھٹک کے مفلر ایک طرف رکھا اور شیشہ کھول کے باہر دیکھنے لگی۔

ان کی گاڑی ہوا کی لہروں پر دریائے چترال کے کنارے چل رہی تھی۔ دریا کا نیلا پانی چمک رہا تھا ایسے جیسے سونے کے ذرات کو کسی نے پانی کی سطح پر چھڑک دیا ہو۔ سڑک سے دور آباد گھروں کی ڈھلوانی چھتیں نظر آ رہی تھیں جو ایک دوسرے کے اوپر وقفے وقفے سے بنے تھے۔ سڑک کے کنارے مقامی لوگوں کے کھیت تھے لیکن ان کھیتوں کا رقبہ بہت کم تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے قطعے تھے جن میں فصلیں اگی ہوئی تھیں۔

اس نے کہنی شیشے میں رکھ دی اور مٹھی ٹھوڑی تلے ٹکا دی۔ اس کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ باہر کا نظارہ ہی اتنا سہانا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے اس کے چہرے پر پڑ

رہے تھے۔اس کی تھکن تو یہیں ختم ہوگئی۔

ائیر پورٹ کے احاطے سے نکلنے کے بعد منیب خان نے ایک تنقیدی نظر اپنے مالک پہ ڈالی پھر آگے دیکھا لیکن چند لمحے بعد اس نے پھر ایسا کیا۔وہ یقیناً کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں سونے والا اس کی بات پر مخل نہ ہو جائے۔

''خان.....'' بالآخر اس نے تھوڑی ہمت جمع کر لی۔خان کی طرف سے خاموشی رہی۔

''چھوٹے خان جی.....'' اب کی بار اس نے آواز اونچی رکھی۔

''ہوں۔'' وہی گمبھیر ہنکار سنائی دی۔

''آپ کو پہلے ڈیرے پر لے جاؤں؟ وہ راستے میں پڑتا ہے۔مادام کو میں بعد میں حویلی لے جاؤں گا۔''

''نہیں۔پہلے حویلی چلو.....خان بابا ناراض ہو جائیں گے۔'' وہ تفکر سے کہہ رہا تھا۔اس کے لہجے میں ایک روانی تھی۔وہ اردو بول رہا تھا لیکن اس میں آبائی لہجے کی جھلک منیب خان کی نسبت بہت کم تھی۔

''جی چھوٹے خان.....'' منیب نے تابعداری سے کہہ کے موڑ کاٹ دیا۔

عبادہ نے اپنا فون نکالا۔کیمرہ آن کیا اور ویڈیو بنانے لگی۔وہ یہاں کے مناظر ریکارڈ کر کے احمد کو بھیجے گی اور اسے تپائے گی کہ اس نے لاہور میں رہ کے،سرخ اینٹوں والی در و دیوار اور نیلی ٹینکیوں کو دیکھنے کے علاوہ کیا پایا تھا؟ قدرت تو یہاں تھی۔جنت کا نظارہ تو اس کے سامنے تھا۔

اللہ کی تخلیق کردہ تمام چیزوں میں ''حیرت'' اور ''محبت'' ہے۔انسان نے اپنے شعور کو استعمال کر کے تھوڑا بہت فکر انسان کو ''حیران'' کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جو ''حسن'' اور جو ''ظرافت'' مالک کی تخلیق میں ہے وہ نوکر کی تخلیق میں کہاں؟ بات ظرف کی اور سمجھ کی نہیں ہے۔بات

استطاعت کی ہے۔انسان کی استطاعت نے شیشوں سے ہزار منزلوں والی عمارت بنا کے حسن کا نمونہ پیش کر دیا لیکن اللہ نے ایک پہاڑ بنا کے اس کی تسخیر کو پاش پاش کر دیا۔

ان کی گاڑی اب دریائے چترال کے اوپر چل رہی تھی۔ٹائروں کے نیچے پتھر آنے کی وجہ سے ان کی گاڑی ڈگمگا رہی تھی۔منیب بڑی احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔اس کے ہاتھوں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

دریائے چترال ان کی گاڑی کے نیچے تھا۔یہاں وہ انسانوں کی نسوں کی مانند جگہ جگہ سے نکل رہا تھا۔اس کی ساخت ایسی ہی ہے۔کہیں کہیں سے کٹ کے بالکل چھوٹی چھوٹی نالیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو بہتے تو ایک ہی نہج پر ہیں لیکن راستے الگ الگ ہوتے ہیں اور کبھی یہ یکجا ہو کے ایک موج میں آئے ہوئے بھرپور دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے پانی کو ایک جست میں پار کرنا نادانی سے بڑھ کے کچھ نہیں ہوتا۔

ان کی گاڑی کے ٹائرز پانی پر پڑتے تو چھینٹے فوارے کی طرح پیچھے گرتے۔اس نے گاڑی کا شیشہ چڑھا لیا تھا۔رک رک کے،دھیرے دھیرے کھسک کے ان کی گاڑی نے دریائے چترال کو عبور کر لیا۔اب وہ دوسری سمت آ گئے تھے۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کی حویلی کتنی دور تھی؟ پچھلے تیس منٹ سے وہ مسلسل سفر میں تھی۔فاصلہ ختم ہونے نہیں دے رہا تھا۔اور کتنا آگے جانا تھا؟ دریا کی دوسری سمت گاڑی پہاڑ کے پچھواڑے آگے بڑھ رہی تھی۔پہاڑ کا سایہ سڑک پہ گر رہا تھا جس کی وجہ سے یہاں ٹھنڈک تھی۔وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ پہاڑ کے سینے پر چڑھ رہے ہیں۔دریا نیچے ہوتا جا رہا ہے۔وہ چترال کے اوپر تھے۔یہاں سے نیچے کا منظر اتنا واضح اور جامع تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھی کہ کونسا گھر کس طرف ہے؟ کونسا درخت کہاں اگا ہے۔پہاڑی پر پالتو مویشی چر رہے تھے۔ان

کے چرواہے گاڑی کی آواز پہ مڑ مڑ کے اس طرف دیکھتے۔ بھوری بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آ رہے تھے۔

وہ شیشے کے پار سے ان جانوروں کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی چرواہا سامنے آتا وہ ہاتھ ہلا دیتی۔ چرواہا مسکرانے لگتا۔ (ہائیں کتنی اچھی باجی ہے!)

تھوڑا آگے جانے کے بعد منیب کو فون آیا۔ شاید حویلی سے تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور فون پہ بات کرنے لگا۔ وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ اسی اثنا اسے دو عورتیں بھیڑوں کے ایک بڑے ریوڑ کو ہانکتی ہوئی دکھائی دیں۔ ریوڑ بالکل ان کی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ منیب نے گاڑی روک دی۔ وہ تیزی سے بھیڑوں کو سڑک سے ہٹانے لگیں۔

بھیڑیں ان کی گاڑی کی چاروں سمت پھیل گئیں۔ وہ پیچھے جا رہی تھیں۔ اسی لمحے کئی بھیڑیں اس کی کھڑکی کے سامنے سے گزریں اور پھر اس کی نظر ایک بھیڑ پہ ٹھہر گئی جس کی چال بقیہ بھیڑوں سے مختلف تھی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس نے آنکھیں چندھیا کے غور سے اس کو دیکھا۔ اس بھیڑ کی بائیں آنکھ سے پیپ نکل رہا تھا۔ کئی مکھیاں اس کے زخم پر بھنبھنا رہی تھیں۔

اس کا دل کانپ گیا۔

وہ بجلی سی تیزی سے گاڑی سے اتری اور اس بھیڑ کی طرف لپک گئی۔ وہاں موجود بھیڑیں اس کے آنے سے خوفزدہ ہو کے یہاں وہاں بھاگنے لگیں۔ چرواہا عورتیں رک کے اسے دیکھنے لگیں جس نے گاڑی کے سامنے اس زخمی بھیڑ کو روک لیا تھا۔ پنجوں کے بل بیٹھ کے، بھیڑ کی گردن پہ ہاتھ رکھا اور اس کا زخم دیکھنے لگی۔

بھیڑ کی آنکھ سے خون رس رہا تھا۔ اس کے گردن، منہ اور کان کے پاس نیلاہٹ اور سرخی تھی جبکہ زخم کے گرد کچھ پیپ سوکھ کے پرت بن گئی تھی اور کچھ اتنی تازی تھی کہ بہتے ہوئے بھیڑ کے منہ

سے ٹپک رہی تھی۔ غلیظ مکھیاں اس زخم پر بھنبھنا رہی تھیں۔

اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔ بھیڑ کتنی تکلیف میں تھی۔ وہ نہ دیکھ پانے کی وجہ سے ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہی تھی۔ جانے یہ زخم اسے کب لگا ہوا اور اس کے مالکان..... اس نے گردن موڑ کے چرواہا عورتوں کو دیکھا جو مقامی لباس میں ملبوس تھیں۔ کھلی شیشے اور ستارے والی کامدار شلوار کے اوپر کھلی سی کیلاشی فراک پہنے، سر سے گھونگھٹ کی طرح پیچھے چادر لٹک رہی تھی۔ اس چادر کو ٹوپی کی مدد سے سر پہ باندھ رکھا تھا۔ ان کے پیروں میں ربڑ کے بوٹ تھے اور ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔

وہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ منیب بھی گاڑی کے اندر سے اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا فون ابھی بھی اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' وہ بھیڑ کو پکڑے اونچا سا پوچھنے لگی۔ بقیہ ریوڑ گاڑی کے پیچھے جا چکا تھا۔ سامنے کی سڑک خالی ہوگئی تھی۔ ایک چرواہا خاتون ریوڑ کو سنبھالنے کے لیے پیچھے چلی گئی جب کہ ایک اس کے پاس آئی۔

اس کی عمر لگ بھگ پچاس پچپن سال تھی۔

''یہ کیسے زخمی ہوئی؟'' وہ اردو میں پوچھ رہی تھی۔ عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے شاید اردو نہیں آتی تھی اس لیے وہ اسے ناسمجھی سے دیکھنے لگی۔ اتنے میں منیب گاڑی سے باہر نکلا اور اس تک آیا۔

''کیا ہوا مادام؟'' منیب نے پوچھا۔

''یہ بھیڑ زخمی ہے منیب۔ مجھے اس کا علاج کرنا ہے۔ تم اسے پکڑو میں مرہم نکالتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ منیب خان نے ضبط سے سانس کھینچی۔ کیا ضرورت تھی سرِراہ ہسپتال کھولنے کی؟ اسے گھوڑوں کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا نہ کہ پورے گاؤں کے مال

مویشوں کے لیے۔وہ بری طرح تپا تھا مگر صبر کا گھونٹ پی لیا۔وہ گاڑی کی پچھلی طرف آئی جہاں اسلحہ بردار بیٹھے ہوئے تھے۔

''بی..... بیگ.....'' اس نے ڈرتے ہوئے ایسے اشارہ کیا جیسے وہ بیگ کی مانگ پہ اسے بندوق پکڑا دیں گے۔اس میں سے ایک نے اس کا بیگ اٹھا کے اس کی طرف بڑھایا۔اس نے پکڑ کے نیچے اتارا اور گھسیٹتے ہوئے بھیڑ کے قریب لائی۔

''کتنا وقت لگے گا؟'' اس کو آتا دیکھ کے منیب نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہی کوئی دس پندرہ سال.....'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔وہ خائف ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔بیگ ان لاک کرنے کے بعد اس نے ضروری چیزیں باہر نکال کے سڑک پر وقفے وقفے سے رکھیں پھر اس نے بیگ سے گلوز نکالے،آستین کہنیوں تک چڑھائیں اور گلوز پہننے لگی۔منیب دلچسپی سے یہ دیکھ رہا تھا۔

''آپ اس کا علاج کر لیں گی؟'' منیب نے اسے دیکھتے ہوئے ٹونٹ کی۔

''کیوں تمہیں شک ہے؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں،ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' اس نے شانے اچکا کے کہا۔

''باتیں مت کرو۔ادھر اس بھیڑ کا منہ پکڑو تاکہ یہ ہلے نہیں۔'' وہ اسے پچکارتے ہوئے بولی۔منیب خان نے بھیڑ کے منہ کو دیکھا جہاں سے پیپ نکل رہی تھی۔اس کو ابکائی آئی۔اس نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا۔عبادہ نے دوبارہ اسے دیکھا۔

''بیٹھو۔کھڑے کیوں ہو؟''

منیب خان نے دوبارہ بھیڑ کو دیکھا پھر بادلِ نخواستہ نیچے بیٹھ گیا۔اس نے چادر کا کونہ ناک پہ کھینچا اور دانتوں کے درمیان پکڑ لیا۔پیپ سے اسے کراہیت آ رہی تھی۔

"مادام جلدی کرو..... چھوٹے خان میں برداشت تھوڑا کم ہے۔ وہ جاگ گیا تو بہت غصہ کرے گا۔"

"مجھے اس بھیڑ کا علاج کرنا ہے منیب خان۔ مجھے کسی خان، وڈیرے یا سردار کی پرواہ نہیں ہے۔" وہ برہمی سے کہتی گلوز پہن کے سرنج اور انجکشن نکالنے لگی۔ منیب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس نے انجکشن کو سرنج میں بھرا پھر اس کو اونچا کر کے اس کے چند قطرے باہر پھینکے۔

"اسے مضبوطی سے پکڑو منیب۔ یہ سر نہ ہلا پائے۔ مجھے ٹیکا لگانا ہے۔"

اس نے تنبیہہ کی تو منیب نے متلی روکتے ہوئے بھیڑ کا منہ سختی سے پکڑ لیا۔ عبادہ نے گہرا سانس لیا اور ٹیکے کی سوئی کو بھیڑ کی آنکھ کے پاس چبھو دیا۔ دوا اترتی گئی۔ بھیڑ ہل رہی تھی لیکن اس کا منہ قابو میں تھا۔ ٹیکا لگانے کے بعد اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔

منیب خان نے پلٹ کے گاڑی میں سوئے نفس کو دیکھا جس میں ابھی تک جنبش نہیں ہوئی تھی۔

"مادام! جلدی کرو۔ خان اٹھ نہ جائے۔" وہ بے چینی سے کہنے لگا۔ عبادہ نے برہمی سے اسے دیکھا۔

"کر رہی ہوں۔" وہ خفگی سے بولی۔ منیب خان کسمسا گیا۔ عبادہ نے غصے سے آنکھیں گھمائیں پھر چرواہن کو دیکھا۔

"اسے یہ زخم کیسے لگا؟" اس نے پوچھا مگر عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کی زبان سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"یہ زخم کیسے لگا ہے؟" وہی سوال منیب نے عورت سے مقامی زبان میں کیا۔ وہ تیزی سے کچھ بولی۔ عبادہ کو سمجھ نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا لیکن اتنا سمجھی کہ وہ وضاحت دے رہی تھی۔

"کچھ دن پہلے اس کا پوتا ریوڑ لے کے گیا تھا۔ ریوڑ کو صحیح راستے پر موڑتے ہوئے اس نے غصے

سے اس بھیڑ کو پتھر مار دیا۔ یہ ہٹ نہیں رہی تھی۔ پتھر غلطی سے بھیڑ کی آنکھ میں لگ گیا۔ جب سے یہ زخم بنا ہوا ہے۔'' وہ خفا خفا سا تیزی سے نروٹھے انداز میں بولا۔ وہ جو بھیڑ کے زخم کے پاس جمع پیپ کو کٹر سے کاٹ رہی تھی، منیب کی بات سن کے دل پہ گھونسا پڑا۔

''پتھر مارا ہے؟'' اس کا منہ کھل گیا۔ منیب نے سر ہلایا۔

''جانوروں کو پتھر کون مارتا ہے؟'' وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

''یہاں تو برچھی، چھتر اور چھڑیاں بھی مارتے ہیں مادام..... پتھر کیا چیز ہے.....'' منیب تمسخر سے ہنسا۔ وہ ہونٹ نیم وا کر کے اس سفا کی پر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے یہ جان کر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ عبادہ نے افسوس سے سر کو جنبش دی۔

بھیڑ کا زخم اس نے ڈیٹول سے دھو لیا تھا۔ آنکھ کا اندرونی زخمی نہیں تھا۔ باہر سے زور سے پتھر لگنے کی وجہ سے اندر سے گندا پانی باہر آ رہا تھا۔ یقیناً آنکھ کے پار کسی چیز کو نقصان پہنچا تھا۔ اس نے روئی پر اینٹی بائیوٹک لگا کے بھیڑ کی آنکھ پر رکھ دیا پھر اسے پٹیوں سے باندھ دیا۔

''ہو گیا؟'' منیب نے تنگ پڑ کر پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے گلوز اتار کے کہا۔ منیب بھیڑ کو چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ عورت نے بھیڑ کو ہانک لگائی۔ بھیڑ پھدکتے ہوئے آگے بھاگ گئی۔ خاتون عبادہ کو تشکر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مہربانی تھی۔

''ہر روز ٹھنڈے پانی سے اس کا زخم دھونا ہے اور یہ دوائی لگانی ہے۔'' اس نے ایک بوتل عورت کو دکھائی۔ ''بھیڑ کا زخم جانتی ہو کس لیے خراب ہوا ہے؟ کیوں کہ تم نے اسے صاف نہیں کیا۔ جراثیموں کی وجہ سے اس کے زخم میں گندگی پھیل رہی تھی۔ اب کی بار کوشش کرنی ہے کہ بھیڑ کا زخم گندہ نہ ہو۔ ٹھیک ہے؟'' منیب نے اس کے فقرے کو ٹرانسلیٹ کیا۔ عورت نے تیز تیز سر ہلایا۔

''اور یہ پٹی ہے۔ یہ پٹی اسی طرح باندھنی ہے جس طرح میں نے باندھی ہے۔ کس کے تاکہ زخم کو ہوا نہ لگے۔ ہوا میں بھی جراثیم ہوتے ہیں۔ اور پلیز اس بھیڑ کو باہر نہیں نکالنا۔ اس کو گھر میں چارا وغیرہ دو جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتی.....'' اس کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

منیب نے ترجمہ کر کے عورت کو سمجھا دیا۔ عورت نے مسکرا کے سر کو جنبش دی اور پٹی لے لی پھر اس سے ہاتھ ملایا۔ ''ممنون.....ممنون.....'' وہ مسکرائی اور وہاں سے چلی گئی۔ عبادہ سر جھٹک کے نیچے بیٹھی اور سامان سمیٹنے لگی۔

وہ گھٹنوں پہ بیٹھ کے بیگ کی زپ چڑھا رہی تھی جب گاڑی کے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ٹھک.....ٹھاہ..... بیگ سے تھوڑا دور کسی کی پشاوری چپل دکھائی دی۔ گھنیری شلوار والی ٹانگیں قدم قدم اس کی طرف بڑھیں۔ منیب کے معدے میں تتلیاں گھومیں.....

وہ وہی تھا۔ اگلی سیٹ پہ سونے والا۔

سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ قمیص بھی ایسی کہ ناف سے اوپر کے حصے پر کڑھائی ہوئی تھی۔ کندھوں کے گرد پیچھے سے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں پستول کا کمر بند تھا اور دوسرا ہاتھ پہلو میں تھا۔ اس کے چہرے پر شدید غصہ تھا۔ سفید گلابی کلین شیو رنگت دھوپ میں سرخ ہو رہی تھی۔ سیاہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے روہانسا ہو کے بیگ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

''کیا تمہیں وقت کا اندازہ ہے منیب خان.....'' آنکھیں اس پر گاڑھ کے سوال منیب سے کیا گیا۔ منیب پیٹ پہ ہاتھ باندھ کے، سر جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

''معذرت خان جی۔ وہ مادام کو زخمی بھیڑ نظر.....''

''مادام سے کہو یہ پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں ہر تیسرا جانور زخمی ہے۔ وہ کس کس کا علاج کرے گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ جس کے لیے آئی ہیں، وہی کریں۔ اپنا وقت برباد کریں نہ ہمارا۔'' اس کے

لہجے میں ایسی ترشی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے عبادہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

''جی خان جی.....'' منیب نے مسمسا سا جواب دیا۔

وہ اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کے پلٹ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھولا، اندر بیٹھا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بیگ کا ہینڈل تھامے دھواں دھواں کھڑی رہ گئی۔ منیب نے اس کا بیگ لیا، کندھے پہ لادا، گاڑی کے پچھلی حصے میں ڈالا اور پلٹ کے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے قدم قدم آگے آئی۔ اگلی سیٹ پہ بیٹھا وہ اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اپنی سیٹ کا دروازہ کھول کے وہ اندر بیٹھ گئی۔ منیب نے گاڑی آگے بھگا دی۔

باہر کھڑا ہو کے اسے پسینہ آچکا تھا۔ اس نے بیگ پیک سے پانی کی بوتل نکال کے منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ اندر گئے تو گرمی کا احساس تھوڑا کم ہوا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ہاں وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنی طرف کے سائیڈ ویو مرر میں.....

منہ میں گھونٹ روک کے اس نے تیورا کے اسے دیکھا پھر بوتل کا ڈھکن بند کیا اور سیٹ سے کھسک کے دوسری طرف چلی گئی۔ آگے بیٹھا ہوا وہ شخص زیر لب مسکرایا تھا۔

☆.....☆.....☆

تیس منٹ کے بعد ان کی گاڑی ایک شاندار حویلی کے احاطے میں رکی۔ اس نے گاڑی رکتے ہی دھپ دھپ کی آواز سنی۔ وہ اسلحہ بردار تھے جو گاڑی سے اتر کے آمنے سامنے یوں کھڑے ہو گئے جیسے سلامی دیتے وقت فوجی۔

وہ باہر آئی۔ بیگ پیک پہنا، مفلر کو بازو پہ ڈالا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ واپس لگا لیا۔ اگلی سیٹ والا باہر نہیں نکلا۔ وہ اندر ہی بیٹھا رہا البتہ اسے شیشے سے آنکھیں سکیڑ کے دیکھ رہا تھا۔

اس نے گردن اٹھا کے اس پراسرار اور قدیم حویلی کو دیکھا جس تک آنے کے لیے منیب کی

گاڑی پہاڑی کے سینے پر رولر کوسٹر کی طرح چڑھی تھی۔ یہ حویلی باقی آبادی سے دور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھی۔ پہاڑی کا بالائی حصہ جو یقیناً چوٹی کی مانند ہوگا۔ اسے کاٹ کے برابر کر کے اس حویلی کو قائم کیا گیا تھا۔ حویلی کا نچلا حصہ بھورے سرمئی پتھروں سے بنا ہوا تھا جب کہ بالائی حصہ لکڑی کا تھا۔ اس طرف جہاں ان کی گاڑی رکی تھی دور دور تک ویرانہ تھا۔ البتہ نظروں کے اوجھل ہوتے ہی ایک پتلی سی دیوار نظر آتی جو شاید اس حویلی کی چار دیواری تھی۔ یہ حصہ پارکنگ لاٹ کا تھا جب ہی یہاں چھوٹی جیپ سے بڑی ویگن تک ہر قسم کی گاڑی پارک تھی۔

''چلیں مادام، آپ کو زنان خانہ لے جاؤں پھر مجھے ڈیرے بھی جانا ہے۔'' منیب اس کا سامان کندھے پر لادتے ہوئے بولا۔

''زنان خانہ؟'' وہ چونکی۔

''جی۔ زنان خانہ جہاں صرف عورتیں رہتا ہے۔''

''کیا یہاں مرد اور عورتیں الگ الگ رہتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی بالکل.....'' اس نے آگے چلتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ مرد اور عورت دونوں الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں زنان خانہ اور مردان خانہ ہے۔''

وہ اسے اپنے ساتھ حویلی کی دوسری طرف لے آیا تھا۔ یہاں حویلی کا سامنے والا رخ تھا۔ سنگ مرمر کی راہداریوں سے لکڑی کے ستون جھانک رہے تھے۔ تکونی چھتوں والی حویلی کی راہداریاں ایسی تھیں جیسے لاہور کی گلیوں میں پرانی حویلیوں کی ہیں۔ کھڑکیاں بھی باہر ہی کھل رہی تھیں۔ وہ منیب کے پیچھے زینے اترنے لگی۔ زینے ایسے تھے جیسے اسٹیج شو کے ہوتے ہیں۔ لمبے اور چوڑے۔

''ان دونوں کا مقصد کیا ہے؟ کس لیے بنائے ہیں؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

''اس حویلی میں بہت سارے لوگ رہتے ہیں۔ کچھ خونی رشتے ہیں اور کچھ قبیلے کے لوگ ہیں۔ سب ایک دوسرے کے لیے محرم نہیں ہیں۔ نامحرموں کا پردہ برقرار رہے، اس لیے انہوں نے حویلی کے دو حصے بنا دیے۔''

سارے میں عجیب سی خاموشی تھی۔ سب کہاں تھے؟ کیا اتنی بڑی حویلی میں کوئی ذی النفس نہیں رہ رہا تھا۔ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔ منیب اسے حویلی کے اس عرشے سے گزار کے آگے لے آیا جہاں سرسبز لان تھا۔ ویسے تو پوری حویلی ہی پھول دار جھاڑیوں، اونچے اونچے درختوں اور بیل والے پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سنگی کرسیاں اور بنچ نصب تھے لیکن اس طرف لان کی کاٹ چھانٹ کر کے ایک باغ بنایا گیا تھا۔ لان کی گھاس برابر تھی، پودوں کی کٹائی ہوئی تھی۔ (یہاں اٹھارہ سال قبل اکھاڑہ ہوتا تھا۔)

''اس سے پردہ ہو جاتا ہے کیا؟'' اس نے ہنسی دبا کے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ ہم کبھی زنان خانے نہیں گیا۔'' وہ شانے اچکا کے بولا۔

''ویسے یہ والا رواج میں نے سیدوں کے ہاں دیکھا ہے۔ وہ پردے کے معاملے میں سخت ہوتے ہیں۔ چترالی بھی ہوتے ہیں۔ یہ مجھے آج پتہ چلا ہے۔''

''چترالی مرد عورتوں کے پردے کے معاملے میں دنیا کے سب سے سخت مرد ہیں مادام۔ عورت کا سر سے دوپٹہ بھی اترے تو وہ غیرت کھا لیتے ہیں۔'' وہ فخر سے کہہ رہا تھا یا افسوس سے؟ عبادہ سمجھ نہیں سکی۔

''اگر ایسا ہے پھر تو مجھے بڑی بری نظر سے دیکھا جائے گا۔'' اس نے بازو پہ ڈالے مفلر کو واپس گردن میں پہن لیا۔ منیب نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ لان کے درمیان بنی پتھریلی روش سے گزر رہے تھے۔لان میں فوارہ نصب تھا۔ایک پھول کی طرح کا فوارہ جس کا پانی پھوار بن کر گر رہا تھا۔اس کی مدھر ''چھم چھم'' نے خاموش فضا میں ایک موسیقی بنادی تھی۔منیب زینے اتر کے حویلی کو چھوڑ کے بالکل پچھلی طرف آ گیا۔وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اگر وہ تھوڑا آگے مزید چلی تو اپنی گاڑی تک پہنچ جائے گی۔

''ایک بات بتاؤ۔یہاں غیرت کے نام پہ قتل تو نہیں ہوتے؟'' اس نے اپنی شرٹ کا دامن نیچے کھینچتے ہوئے، ذرا جھجک کے پوچھا۔منیب خان مسکرایا۔

''ابھی تک تو نہیں ہوا۔آگے اللہ جانتا ہے۔''

''نہیں۔میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ لوگ عورتوں کے پردے کے معاملے میں اتنے کٹر ہیں تو عزت کے معاملے میں کتنے ہوں گے۔'' اس نے جھرجھری سی لی۔''میں نے رسالوں میں پڑھا ہے۔نیوز میں دیکھا ہے کہ شمالی علاقوں میں لوگ غیرت کے نام پر قتل کر دیتے ہیں۔''

''ہاں کر دیتے ہیں مگر اس حویلی میں نہیں ہوا۔'' وہ رسان سے کہتے ہوئے حویلی کے اندر آ کے مرکزی دروازے پر وہ رک گیا۔اس کا سامان پیٹھ سے اتار کے نیچے رکھ دیا پھر دروازے کے ساتھ لگی بیل بجائی اور انتظار کرنے لگا۔

مرکزی دروازہ کافی بڑا تھا۔اس پر نقش نگاری ہوئی تھی۔خوبصورت شاخوں والے پھول اس پر کھدے تھے۔بڑی پتیاں جو اوپر جا رہی تھیں پھر مڑ کے بیل کے طرح نیچے آ جاتی تھیں۔اس نے خوشگوار حیرت سے دیکھا۔ایسے دروازے اس نے صرف لاہور میں دیکھے تھے۔موٹے، وزنی اور منقش!

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک فربہ خاتون باہر آئی۔چہرے پر دوپٹے کا پلو اس طرح کھینچ رکھا تھا کہ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

''چچی.....آپ کا مہمان آ گیا.....'' منیب نے نظریں جھکا کے کہا۔ان کی سرمے سے اٹی سیاہ آنکھیں عبادہ کی طرف گھومیں۔انہوں نے اس کو سر سے نیچے تک بہت غور سے دیکھا۔

''یہ ان کا سامان۔'' اس نے عبادہ کا بیگ آگے کر کے ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔

''تم اسے لے کے آیا ہے؟'' بیگ کا ہینڈل پکڑتے ہوئے انہوں نے سرسری سا پوچھا۔

''نہیں چچی، چھوٹے خان بھی گئے تھے ساتھ۔'' منیب کی نظریں فرش پہ ٹکی ہوئی تھیں۔

''ہوں.....ٹھیک ہے.....جاؤ تم.....'' چچی نے ایسے سپاٹ لہجے میں کہا کہ منیب تیزی سے پلٹ گیا جیسے وہ نہ بھاگا تو پیچھے سے چچی اسے گولی مار دیں گی۔

''تم.....'' انہوں نے اس کو پکارا۔

''جی.....'' وہ گڑبڑائی۔

'' کیسے آیا ہے۔گاڑی سے یا ٹرین سے.....'' انہوں نے چہرے سے پلو ہٹایا۔وہ بھسبھے گالوں اور چھوٹی آنکھوں والی سفید خاتون تھیں۔کنپٹیوں،ٹھوڑی اور بھنوؤں کے درمیان تین تین نقطے تھے جیسے ''پ'' کے ہوتے ہیں۔

''لاہور سے جہاز میں اور ائیر پورٹ سے گاڑی میں.....''

''ولایتی ہے؟'' انہوں نے شاید اس کے کپڑوں کی وجہ سے پوچھا تھا۔

''نہیں تو.....پاکستانی ہوں.....'' وہ ہنس دی۔

''ہوں.....'' انہوں نے سر کو جنبش دی۔''چلو میرے ساتھ آؤ۔'' وہ اس کا بیگ پکڑ کے اندر لے گئیں۔

دروازے کے اندر ایک بڑا صحن تھا۔ایسا صحن جس میں اوپر کی تین منزلوں کی راہداریاں کھلتی تھیں۔درمیان میں ایک فوارہ نصب تھا۔اس فوارے کے اردگرد لکڑی کے تخت رکھے ہوئے

تھے۔اس نے قدم چوکھٹ پہ رکھا تو دنگ رہ گئی۔

وہاں عورتوں کا سمندر آباد تھا۔ایسا سمندر جس میں ہر سائز، ہر حجم، ہر عمر اور ہر رنگ کی عورتیں تھیں۔سب اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔بچے جن میں لڑکے بھی شامل تھے صحن میں اودھم مچا رہے تھے۔کچھ ضعیف العمر خواتین صحن میں نصب لکڑی کے تختوں پر براجمان تھیں۔لڑکیاں راہداریوں، لابیوں اور صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھی شوخ باتیں کر رہی تھیں۔ان کا شور اس قدر تھا گویا یہاں عورتوں کے لیے مینا بازار لگا ہو۔اتنا رش دیکھ کے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

''کیا ہوا؟'' چچی نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''اتنا رش.....اتنے سارے لوگ.....مینا بازار لگا ہے کیا؟'' اس نے ٹونٹ کیا۔چچی کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

''یہ ہمارا خاندان ہے۔'' انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ شرمندہ ہوگئی۔''سوری۔''

''اس حویلی میں اونچا بولنے کا پابندی ہے۔خاص کر عورتوں کا۔اگر ذرا سی آواز باہر گئی تو خان جی بہت ناراض ہوتا ہے۔اس لیے ہم اونچا نہیں بولتا۔''

''اندر شور کرنے پر پابندی نہیں ہے کیا؟'' اس نے دل میں سوچا۔

''یہ لو ریشمے.....یہ بیگ گل کے کمرے میں لے جاؤ اور تم.....'' انہوں نے اس کا بیگ ایک دبلی پتلی سی لڑکی کو پکڑایا پھر اس کی طرف پلٹیں۔''تم ہمارے ساتھ آؤ۔بی جان سے مل لو۔''

''بی جان؟'' اس نے چونک کے یہاں وہاں دیکھا۔''وہ کون تھی؟''

چچی اپنا آنچل ماتھے پر آگے کھینچتے صحن میں چلی گئی۔وہ بھی اسی لے میں ان کے پیچھے پیچھے آئی۔وہاں موجود سب ہی عورتیں اپنی اپنی جگہ ٹھہر کے اسے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی عالمی عجوبہ دیکھ لیا

ہو۔ بھیانک..... عجیب..... ڈراؤنا۔

صحن میں فوارے کے مخالف تخت پر ایک ادھیڑ عمر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیر نیچے پیڑھی پر تھے جن میں ایک لڑکی مہندی لگا رہی تھی۔ انہوں نے بالوں میں بھی مہندی لگا رکھی تھی۔ ان کے ہاتھوں کے دائیں بائیں لڑکیاں بیٹھی ہوئی ان کی ہاتھوں کی انگلیوں کے بالائی پوروں پر لگی مہندی کو چھوٹے چھوٹے کپڑوں سے باندھ رہی تھیں جیسے انگلی کی پٹی کرتے ہیں۔

''بی جان.....'' چچی نے قریب جا کے ان کا نام لیا۔ معمر خاتون نے سر اٹھایا۔ ''یہ خان جی کا مہمان ہے۔ لاہور سے آیا ہے۔'' چچی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے بازو سے پکڑ کے بی جان کے سامنے نمائشی انداز میں کھڑا کیا۔ انہوں نے آنکھیں میچ کے عبادہ کے کھسیانے چہرے کو دیکھا جو تکلف سے مسکرا رہی تھی۔

''السلام علیکم.....''

''وعلیکم السلام.....'' بی جان نے سلام کا جواب دیا پھر اپنا دایاں ہاتھ لڑکی سے چھڑا کے اس کے آگے پھیلایا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا؟ چوٹ لگی ہے کیا؟ زخمی ہے ہاتھ۔'' اس نے کلائی سے ان کا ہاتھ تھام کے الجھن سے اوپر نیچے پلٹا۔

''ہاتھ چومنے کا کہہ رہی ہیں۔ ہاتھ چومو۔ ہمارا رواج ہے۔'' چچی نے سخت لہجے میں پچکارا۔

''اوہ.....'' وہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔ اس نے جھک کے ان کے ہاتھ کی پشت چومی پھر آنکھوں سے لگایا اور نرمی سے چھوڑ دیا۔

''شاندور کے لیے..... آیا ہے؟'' وہ ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''نہیں وہ.....''

''ہاں.....ہاں.....شندور کے لیے ہی آیا۔'' اس سے پہلے کہ وہ بولتی چچی تیزی سے بولیں۔ اس نے چونک کے انہیں دیکھا۔ وہ شندور کے لیے تو نہیں آئی تھی۔ وہ تو.....

''سلامت رہو۔ سارا جشن دیکھ کے جانا۔ ثمینہ، اس کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہے۔'' بی جان نے بڑی بہو کو تنبیہی کی۔

''جی بی جان.....'' انہوں نے تابعداری سے سر ہلایا اور پھر عبادہ کی طرف پلٹیں۔ ''تم اب جا کے آرام کرو۔ ریشے.....اور ریشے.....'' وہ اونچا اونچا چلانے لگیں۔

''جی چچی.....'' ریشے تیزی سے سامنے آئی۔

''اسے لے جاؤ۔ جاؤ لڑکی۔ آرام کرلو۔'' انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا کے تھپتھپایا۔

(عبادہ کو تھپکی بہت عجیب لگی۔ شاید ان کے ہاتھ سخت تھے۔)

وہ سر جھٹک کے ریشے کی طرف چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

ریشے اس کا بیگ اٹھا کے لے جا رہی تھی۔ اس کا شیشے کے کام والا آنچل اس کے ٹخنوں کو چھو رہا تھا۔ وہ کافی چست قدم اٹھا رہی تھیں۔ عبادہ اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھی۔ چلتے چلتے ریشم ایک بار پلٹی، عبادہ شاک سے حویلی کو دیکھ رہی تھی، جیسے پہلی بار ایسی کوئی چیز دیکھی ہو۔

''تم جانوروں کا ڈاکٹر ہے؟'' ریشے نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جی.....''

''چچی جھوٹ بول رہا تھا کہ تم صرف مہمان ہے۔ یوسف خان نے بتایا تھا ہم کو تم شندور کے لیے نہیں آیا۔ گھوڑوں کا علاج کے لیے آیا ہے۔ میرا بھائی نے میرا ذمہ داری لگایا ہے کہ میں تمہارا خیال رکھوں۔ اب تم کو جو کام ہو۔ وہ مجھ کو کہنا۔ میں کرے گا۔ کچھ منگوانا ہو، کوئی چیز چاہیے ہو۔

سب میں لا کر دے گا۔" وہ اپنائیت سے کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔"

عبادہ خوشگواریت سے حویلی کی ساکھ سجاوٹ دیکھنے میں مصروف تھی۔ حویلی کا نقشہ جتنا باہر سے پیچیدہ لگ رہا تھا۔ اندر اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔ گلی کے اندر گلیاں نکلتی تھیں۔ دروازوں کے اندر دروازے تھے۔ جیسی کوئی بھول بھلیاں ہوں۔ یہاں موجود تقریباً ہر چیز لکڑی سے بنی تھی۔ فرش کی سطح البتہ سنگ مرر کی تھی۔ راہداریوں کو سہارے دینے کے لیے جو لکڑی کے ستون بنائے گئے تھے ان پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور یہ بیلیں راہداریوں کی منڈیروں سے ایسی الجھی ہوئی تھیں کہ یک لخت دیکھنے میں وہ صحن کے پردے لگ رہے تھے۔ وہ پوری حویلی، اس کی سجاوٹ کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔

"تو تم جانوروں کا علاج کرتا ہے۔" ریشے نے پھر تصدیق کی۔

"جی۔" اس نے تکلف سے سر ہلایا۔

"تم لاہور میں ہوتا ہے؟"

"جی۔"

"وہاں بھی یہی کام کرتا ہے؟ جانوروں کا علاج؟"

"ظاہر ہے۔"

"لاہور میں جانور ہوتا ہے کیا؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ مسکرا دی۔ "ہوتے ہیں ناں۔ کتے۔ بلیاں۔ مرغیاں۔ بکریاں۔"

"اچھا..... حیرت ہے۔ میں نے سنا ہے کافی روکھا ہوا شہر ہے وہ..... کھکھ مزہ نہیں وہاں۔"

اس کے نظریات پہ وہ نرمی سے ہنس دی۔ "ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت خوبصورت شہر ہے وہ۔"

''اچھا۔ پھر میں نے غلط سنا ہوگا۔'' وہ خائف سی ہوگئی۔ وہ لابی مڑ کے اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کا بیگ اس نے ایک ہاتھ سے اٹھا رکھا تھا۔ وہ بیگ جسے منیب کندھے پر لاد کے لایا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ لڑکی بے حد دبلی پتلی تھی پھر اس کا بھاری بھرکم بیگ کیسے اٹھایا ہوا تھا۔

''تم اکیلا آیا ہے؟''

''جی.....''

''لاہور سے چترال اکیلا.....؟؟'' وہ بالائی سیڑھی پہ رک کے اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''جی.....''

''تمہارے ماں باپ نے تم کو آنے دے دیا؟''

وہ سیڑھیوں کے ریلنگ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اوپر جا رہی تھی۔ ریلنگ پر پھولوں کی نقش و نگاری کھدی ہوئی تھی۔ ''جی.....''

''کمال ہے۔ ہم کو اتنا دور اکیلا کبھی نہ جانے دے۔ تمہارے ماں باپ کا ظرف بہت بڑا جو تم کو ادھر اکیلا آنے دیا۔''

''ہاں۔'' وہ پھیکا سا مسکرا دی۔ اب وہ ریشمے کو کیا سمجھاتی کہ وہ کتنے پاپڑ بیل کے یہاں آئی ہے۔ ریشمے کے پیچھے چلتی وہ دوسری منزل کی بائیں راہداری میں سب سے آخری والے کمرے کے سامنے آ گئی۔ ریشمے نے اس کا بیگ کمرے کے اندر ایک طرف رکھ دیا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے۔ تم ادھر رہے گا۔''

کمرہ؟ یعنی کمرہ؟ وہ جسے ریشمے کمرہ کہہ رہی تھی۔ وہ کمرہ نہیں تھا۔ محل تھا۔ شاہی محل۔ اتنا بڑا اور ہوا دار کمرہ۔ اتنا کشادہ۔ اتنا وسیع۔ اتنا تکلف سے سجا ہوا۔ وہ مبہوت انداز میں اندر آئی۔ اپنا سکارف اور بیگ پیک اتار کے بیڈ پہ اچھالا پھر ایڑیوں پہ گھوم گھوم گئی۔

کتنا حسین کمرہ تھا۔ مشرقی دیوار میں چار کھڑکیاں تھیں جو اس وقت کھلی ہوئی تھیں۔ پردے ہٹے ہوئے تھے۔ باہر سے تند و مند ہوا کے تھپیڑے اندر آ رہے تھے۔ جنوبی دیوار کے ساتھ شاہی پلنگ تھا۔ پلنگ جس کی پائنتیوں اور کراؤن پر وہی نقش کھدے ہوئے تھے جو باہر لکڑیوں پر کھدے تھے۔ بیڈ کے چاروں اور جالی دار پردے گر رہے تھے۔ اوپر سیلنگ سے فانوس لٹک رہا تھا۔ شمالی دیوار میں واش روم تھا اور اسی کی سیدھ میں صوفے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں اور دو کرسیاں نصب تھیں۔ دیواروں پر تجریدی آرٹ کے نمونے تھے اور کچھ لکڑی پر کھدے شیر، چیتے اور بھیڑیے.....

''کمرہ پسند آیا تم کو۔ ہے ناں؟'' ریشمے نے اس کے کھلتے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اخذ کیا۔

''بہت۔'' وہ خوشی سے اچھل کے سیدھی ہوئی۔

''شکر اللہ کا.....!'' اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ عبادہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیا لگا مجھے کمرہ پسند نہیں آئے گا؟''

''ہاں۔ تم شہری لڑکی ہے ناں۔ تمہارا پسند ناپسند ہم کو معلوم نہیں تھا۔ اس لیے مجھے لگا کہ شاید تم کو گاؤں کے طرز کا یہ کمرہ اچھا نہ لگے۔''

''ارے نہیں۔ کمرے میں بنیادی سہولیات ہونی چاہئیں۔ باقی کوئی مسئلہ نہیں۔''

''سارا سہولت ملے گا اس کمرے میں۔ حویلی کے ''اس'' کمرہ میں کم از کم کوئی کمی نہیں۔'' وہ مبالغہ آرائی کرنے لگی۔ عبادہ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی اور ران پہ ٹانگ رکھتے ہوئے جوتے کھولنے لگی۔

''چلو ابھی تم آرام کرو۔ میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہے۔'' ریشمے مسکرا کے کہتی جانے کے لیے مڑ گئی۔

''سنو ریشمے .....'' اس نے آواز دی۔ وہ ایڑیوں کے بل پلٹی۔

''ہاں.....''

''تم سب عورتیں.....آئی مین.....یہ سب جو میں نے نیچے دیکھیں.....سب یہیں رہتی ہیں۔اس حویلی میں۔'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''جی۔سب ادھر ہی رہتا ہے۔''

''کتنے خاندان آباد ہیں یہاں؟'' اس نے جوتے اتار کے ایک طرف رکھے پھر انگلیوں میں مساج کرنے لگی۔

''ایک ہی.....'' ریشے نے شانے اچکائے۔

''ایک.....؟'' اس کا منہ کھل گیا۔

''ہاں.....''

''قبیلہ بھی یہیں رہتا ہے؟'' وہ حیران رہ گئی۔

''کچھ لوگ اپنے گھروں میں رہتے ہیں.....باقی ادھر ہی ہوتا ہے۔دراصل ہمارے داجی سردار کے والد تھے۔انہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کے یہ حویلی بنائی تھی اور اس حویلی میں ان کے تین بیٹے رہتے تھے۔ان تین بیٹوں میں میرے داجی سردار بنے۔داجی کے بچے بھی یہیں رہنے لگے۔یہ ایک آدمی کا بچہ نہیں ہے۔ہم دادوں، پردادوں کی اولادیں ہیں۔اس میں دادا کے بھائیوں کے پوتے پوتیاں، بہوئیں بیٹیاں سب.....کل ملا کے تین سو لوگ رہتے ہیں یہاں۔''

''تین سو.....؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''ہاں۔دوسو عورتیں اور سو مرد۔''

عبادہ کو سماعتوں پر گمان ہوا۔اس نے بیڈ سے پیر اتارے اور گہرے گہرے سانس لیے۔

''تم.....تم لوگ.....دوسو عورتیں.....یہاں رہتی ہو؟''

''ہاں کیوں؟''

''اتنے سارے لوگوں کو کھانا، کپڑے کیسے دیتے ہو؟''

''بنا کے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''آگے چل کر تو آبادی مزید بڑھے گی پھر.....؟ یہاں.....'' اس نے انگلی سے دائیں بائیں اشارہ کیا۔ ''اس حویلی میں سب کو ایڈجسٹ کیسے کرو گے؟''

''ہمیشہ تو سب ایک ساتھ نہیں رہے گا ڈاکٹرنی۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہمارا بہت سارا کزن تو شہروں میں شفٹ ہو گیا ہے۔ اپنے بچوں کی پڑھائی کے لیے۔'' وہ رسان سے بولی پھر توقف کیا اور جذباتی انداز میں یہاں وہاں دیکھا۔ ''جلد اس شاندار محل کا بٹوارہ ہو جائے گا۔ سب الگ الگ ہو جائیں گے۔ اپنا اپنا زندگی جییں گے۔''

''ہوں.....ٹھیک ٹھیک.....'' اس نے تسلی سے سر ہلایا۔

''اب میں جاؤں؟'' ریشمے نے پوچھا۔

''ہاں جاؤ.....'' اس نے مسکرا کے کہا۔ وہ ممنونیت سے سر ہلا کے جانے کے لیے مڑی۔ چند قدم آگے لیے، دفعتاً کچھ یاد آیا، وہ ٹھہر گئی اور قدم قدم چل کے واپس اس تک آئی۔ عبادہ ٹھٹک گئی۔

''ایک بات کہوں.....؟''

''کہو.....''

''میرا نام ریشم ہے۔ ریشمے نہیں۔ یہ جاہل عورتیں یہاں سب کے ساتھ ''ے'' لگاتا ہے۔ گل مینے۔ پلوشے۔ زرینے۔ آمینے۔ سب ہی ایسے ہی لیتے ہیں۔ کوئی صحیح نام نہیں لیتا۔''

''کیا مطلب یہ لوگ لگاتے ہیں؟ یہاں کی زبان میں نہیں بولا جاتا کیا؟'' اس نے چونک کے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔ یہ تو روایت بن گیا ہے۔ یوں سمجھو کسی نے کبھی بولا ہوگا اب تو سب جان بوجھ کے بلاتا ہے۔ حالانکہ جب ہم نام لکھتا ہے تو ''ے'' نہیں لگاتا ہے۔ شناختی کارڈ پہ میرا نام ریشم ہی ہے۔'' وہ قسم کھانے کو تیار تھی۔

''اوہ.....'' اس نے سر ہلایا۔ ''چلو پھر میں تمہیں ریشم بلاؤں گی آئندہ۔''

''مہربانی.....اب آپ آرام کرو۔ میں نے آپ کا بہت مغز کھالیا۔ میں چلتا ہوں۔ چچی انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے کہا تھا مہمان کو تنگ نہیں کرنا ہے۔ میں ادھر مزید رکا تو وہ مجھے ڈانٹے گا۔ خدا حافظ۔'' وہ دوپٹہ آگے کھینچتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ مسکرا کے رہ گئی۔

اس نے ایک بار پھر سارے کمرے میں نظر ڈالی اور اس کی سجاوٹ کو دل ہی دل میں سراہا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھی تو گداز بے حد نرم و نفیس لگا۔ جالی دار پردے اوپر بندھے ہوئے تھے۔ بیڈ شیٹ سفید تھی جس پر ہاتھوں سے کڑھائی کی گئی تھی۔ تکیوں کے غلاف بھی شیشے کاری سے کندہ تھے۔ وہ خود کو پیچھے پھینک کے لیٹ گئی اور آنکھیں بند کیں۔ وہ کسی محل کے حرم سرے میں پداری تھی۔

☆.....☆.....☆

اس نے غلیل کے پلاسٹک کی اسٹرپس کے عین وسط میں لگے چمڑے کے ٹکڑے میں گول کنکر کو دبایا پھر غلیل کو اٹھا کے چہرے کے سامنے لائی۔ بائیں ہاتھ سے غلیل کی لکڑی آگے دھکیلی اور دائیں ہاتھ سے غلیل کی اسٹرپس کو پیچھے کھینچا.....آنکھ بند کی اور پتھر کو چھوڑ دیا۔ پتھر کسی گولی کی طرح سرسراتا ہوا بیر کی ٹہنی پہ بیٹھی چڑیا کو لگا۔ فضا میں چڑیا کی دلخراش چیخ گونجی اور اگلے ہی لمحے درخت سے کچھ گرتا دکھائی دیا۔ زمین پر ''دھپ'' کی آواز آئی۔

بیر کے نیچے مورچہ بنا کے کھڑے بچے اپنی چھاؤنی چھوڑ کے تیزی سے اس طرف بھاگے۔ چڑیا کے قریب گئے تو دیکھا چڑیا پھڑ پھڑا رہی ہے۔ کنکر سے اس کا پنکھ زخمی ہوا تھا۔

''مار دیا..... مار دیا..... گُلے باجی..... نشانہ لگ گیا۔'' ماحد پیروں پہ اچھل اچھل کے کہہ رہا تھا۔ چودہ سال کا ابراہیم جو اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے ایک زوردار جھانپڑ اس کی گدی پر مارا۔

''خانہ خراب کا بچہ..... چاقو نکالو..... جلدی..... وہ مردار ہو جائے گا۔''

''اوخدایا.....'' ماحد نے ماتھے پہ ہاتھ مارا پھر تیزی سے جیب سے چاقو نکال کے اسے پکڑایا۔ ابراہیم نے کمال مہارت سے ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند کی اور چڑیا کو حلال کر دیا پھر اس کی جان نکلنے کا انتظار کیا۔ جیسے ہی اس کی جان ساکت ہوئی۔ اس نے چڑیا کو اس کی ٹانگ سے پکڑا اور بیر کی اوٹ میں پڑی ٹوکری اٹھائی۔ درخت کے سائے سے جب وہ قدم قدم باہر آیا تو وہ اوپر حویلی کی تیسری منزل کی راہداری میں منتظر کھڑی تھی۔ اس نے بھنوؤں پر ہاتھ کا چھجا بنا کے اسے دیکھا۔

''کتنی ہوئیں؟'' اس نے منڈیر کی چار دیواری پر ہاتھ رکھ کے نیچے جھانکا۔

''یہ اٹھائیسواں ہے۔'' ابراہیم نے چڑیا کو ٹوکری میں رکھتے ہوئے بتایا۔

''صرف اٹھائیس؟'' اسے صدمہ ہوا۔ ''اٹھائیس سے کیا ہوگا؟ اس تو میرا پیٹ نہیں بھرے گا تم ساری پلٹون کو کیا کھلواؤں گی؟''

''ابتہاج بھائی کا بندوق لاؤں۔ تم اسے شکار کرنا۔ دیکھنا ایک گھنٹے میں چڑیا کے ڈھیر لگ جائیں گے۔'' ابراہیم نے شانے کڑا کے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ایک منٹ.....'' اس نے آنکھیں چندھیا کے جاسوسوں والے انداز میں اسے تاڑا۔ ''تم نے ان کی بندوق کہاں دیکھی؟''

ابراہیم نے سر کی پشت کھجائی۔ ''وہ.....''

''وہ کیا؟'' گل نے کملائے انداز میں پوچھا۔

''میں نے ان کے کمرے میں دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا دیکھا ہے۔''

''تم ان کے کمرے میں کب گئے؟''

اب ابراہیم کو اپنی شامت آتی نظر آئی۔اس سے پہلے کہ وہ مزید گل کی تفتیش کا مرتکب ٹھہرتا۔کسی نے پیچھے سے آ کے گل کے جوڑے میں ہاتھ ڈالا اور اسے پیچھے کھینچا۔

''آخ.....''اس نے زوردار چیخ ماری۔''کون ہو۔چھوڑو مجھے۔''

''شیطان کی دادی.....کتنا آواز دیا تم کو.....کانوں میں روئی ٹھونسا ہوا ہے؟''نووارد نے اس کی منڈھی پیچھے کھینچ رکھی تھی۔

''پلوشے.....''اس نے آواز پہچان لی۔''پلوشے چھوڑو مجھے ورنہ کچھ ہی دیر میں اپنے ہاتھوں سے محروم ہو جاؤ گی۔''

''اچھا.....کیسے؟''پلوشے نے اسے چیلنج کیا۔گل نے تاؤ کھایا۔اب بات عزت کی تھی!

غلیل نیچے پھینک کے،اس کی کلائی پر گرفت مضبوط کی،پھر پیچھے مزید خود کو جھکا کے اس نے پلوشے کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے ایک ہی جھٹکے سے بغل کے نیچے دبا کے آگے کیا۔پلوشے نے ہنوز اس کا جوڑا پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے گل کی گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔

گل نے اپنے تیز ناخن اس کی انگلیوں میں گاڑے۔پلوشے کی ایک سسکی نکلی اور اگلے ہی پل اس کی دونوں کلائیاں گل کے ہاتھ میں آ گئیں۔گل نے اس کے بازو کمر میں لے جا کے سختی سے جکڑ لیے پھر اسے جھٹکا دیا۔

''جب ہمت آ جائے پلوشہ بی بی تو مجھ سے مقابلہ کرنا۔تم جیسی چھٹانک بھر کی لڑکیوں کو میں بائیں ہاتھ سے سیدھا کرتی ہوں۔''اس کے کان کے پاس وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''شاباش گلے باجی.....''نیچے سے ماحد نے تالیاں بجائیں اور ساتھ ہی سترہ بچوں کے باقی گروپ نے ہوٹنگ شروع کر دی۔

''چھوڑو مجھے۔ مجھے درد ہو رہی ہے۔'' پلوشے کو اپنی ہزیمت پر طیش چڑھا۔

گل نے اسے منڈیر کے قریب لے جا کے اسے چار دیواری سے نیچے جھکایا۔ ''بتاؤ۔ چھوڑ دوں؟''

پلوشے نے تیسری منزل سے نیچے جھانکا تو اس کا دل ڈوب کے ابھرا۔ ''پیچھے کرو..... پیچھے کرو.....'' وہ آنکھیں میچ کے حواس باختہ انداز میں چلائی۔ اس نے پلوشے کو پیچھے کیا پھر اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ آگے کو لڑھک گئی۔

''بتاؤ کیوں آئی ہو؟'' گل نے سینے پر ہاتھ باندھے۔

''ریشمے بلا رہی ہے تم کو۔ اس کے ساتھ پیٹی سے اپنا بستر اور رضائی نکال کے دھوپ لگواؤ۔'' پلوشے نے آنسو گھونٹ کے بتایا۔ اس کے بازوؤں میں کندھے کے قریب درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اس نے بھنویں اٹھائیں۔ ''کیوں وہ لاہور کی ملکہ الزبتھ آ گئی؟''

''ہاں۔''

''کیسی ہے وہ؟''

''تم سے چار انچ قد بڑا ہے۔ دس کلو موٹا ہے اور کئی گنا طاقت ور بھی.....'' پلوشہ نے نروٹھے انداز میں کہا کہ دیکھ لو تمہاری ٹکر کی لڑکی آ گئی ہے۔ اب اس پہ اپنا بس چلا کر دکھاؤ۔

''ہوں۔'' گل نے کچھ سوچتے ہوئے گال پہ انگلی بجائی۔

''تم آ کر ریشمے کی مدد کرو۔ میں دوبارہ بلانے نہیں آئے گا۔'' وہ اس پہ ایک احتجاجی نظر ڈال کے اندر چلی گئی۔ گل کے چہرے پر تفکر کے آثار چھائے گئے تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

''گلے!اس کو پکا کے لاؤں؟'' ابراہیم نے اسے آواز دی۔وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔وہ گہری سوچ میں تھی۔

''گلے.....'' ابراہیم چلایا۔وہ چونک گئی۔

''ہوں۔'' اس نے نیچے دیکھا۔

''اس کو پکاؤں؟'' وہ چڑیوں کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

''ہاں۔پکاؤ۔میرے لیے بھی لانا۔''

''لے آؤں گا۔'' ابراہیم تابعداری سے کہتا حویلی کی بائیں سمت مڑ گیا۔

وہ منڈیر پہ کھڑے ہو کے سامنے جنگل کو دیکھنے لگی۔ایک احساس،ایک مردہ احساس اس کے اندر ایسے آیا جیسے اچانک موج میں دریا آتا ہے۔اس نے اس کے انگ انگ میں اتر کے اس کے وجود کو لپیٹ میں لے لیا۔وہ چاہتی بھی تو کبھی اس غم سے نہیں نکل پاتی تھی۔اس لیے اس نے خود کو اس خول میں بند کرنا بند کر دیا تھا۔وہ اندر اس غم کے ساتھ رہتی تھی اور باہر اس ظالم روپ کے ساتھ جہاں وہ نہ صرف بدترین اور بداخلاق لڑکی تھی بلکہ خان حویلی کا ایک باغی فرد تھی۔

باغی.....!

☆.....☆.....☆

وہ ڈیرے میں ایک کمرے میں صوفے پر براجمان تھے۔بادامی رنگ کی شلوار قمیص پہنے، کندھوں پر پیچھے سے شال ڈالے اپنے بائیں بازو پر تیل مل رہے تھے۔وہ اپنے ادھورے بازو میں سنہرے رنگ کا مصنوعی ہاتھ پہنتے تھے جو ان کی کمی تو دور نہیں کرتا تھا البتہ ان کو بدصورت اور ادھورا نظر آنے سے بچا لیتا تھا۔

وہ چترال کے سردار تھے۔قد کاٹھ کے لحاظ سے اونچے اور مضبوط تھے۔چہرے پر گھنی مونچھیں

تھیں اور آنکھوں میں ہر وقت عتاب نظر آتا تھا۔ چترال کا ہر باسی انہیں جھک کر سلام کرتا تھا۔ یہ ان کی شخصیت تھی جس کا طنطنہ مقابل کی ٹانگیں کانپ دیتا تھا مگر یہ واحد ایسی کمی تھی جس کو کسی سے چھپا نہیں سکتے، البتہ ڈھکنے کی کوشش وہ پوری کرتے تھے۔

اس وقت کلائی پہ تیل لگاتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھے اور یہ سوچ اس بندے کے بموجب تھی جو اس وقت ڈیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کالاش کا سردار۔ شاہ سوار۔ کالاش چترال کا واحد قبیلہ تھا جسے کھووار سرداروں سے بیر تھی۔ اس بیر کی وجوہات مقامی لوگوں کی زبانی بے شمار تھیں لیکن اصل وجہ خود شاید کالاشی بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ ہر وقت سردار کی مخالفت کرتے اور اپنے عتاب سے دوسرے قبائل کو بھی سردار سے متنفر کرتے تھے۔ یوسف خان ہمیشہ مصلحت کی بات کرتے تھے۔ دو طرفہ تعلقات خراب نہ ہوں اور علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے انہوں نے مذاکرات میں ہمیشہ پہل کی لیکن وہ کالاش کے مطالبات نہیں مانتے تھے۔ کالاشیوں کے مطالبات بڑے یا برے نہیں تھے۔ وہ حق کی بات کرتے تھے لیکن بطورِ سردار یوسف خان ان کاموں میں مداخلت نہیں کرسکتا تھا جو کارِ سرکار کے زیر آتے تھے۔

ان کے دو گارڈز دروازے پر رائفل کراس میں پکڑے چوکنا انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا اچکے شانوں سے چلتا اور غصے سے تپتا ہوا ابتہاج سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اپنی گن ہاتھوں میں لٹکائے چلا آرہا تھا۔ گارڈز کے قریب رک کے اس نے دونوں کو تلخی سے دیکھا پھر دونوں کو شانوں سے دھکا دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یوسف خان نے چونکتے ہوئے ایک نظر اس پہ ڈالی پھر واپس اپنا کام کرنے لگے۔

وہ ڈھیٹوں کی طرح ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں کراس بنا کر میز پر رکھ دیں جہاں ان کا مصنوعی ہاتھ پڑا تھا۔ انہوں نے اس کی ہلتی کھیڑیاں دیکھیں، ان کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔

''اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے ابتہاج خان تو اس گستاخی پر میں تمہاری ٹانگیں کٹوا دیتا۔'' وہ ٹھنڈی بے رحمی سے بولے۔

''پر تو کاٹ دیے ہیں۔ٹانگیں بھی کاٹ دیں۔'' اس نے دوبدو جواب دیا۔یوسف خان خاموش ہوگئے۔وہ جانتے تھے کہ ان کا تیس سالہ بیٹا کس بات پر اتنا بھڑکا ہوا ہے لیکن فی الوقت وہ کسی قسم کا ذاتی تماشا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے۔

''اسے لے آئے؟'' انہوں نے عبادہ کے بابت پوچھا۔

''لے آیا اور حویلی چھوڑ دیا ہے۔نوکر جو ہوں آپ کا۔'' وہ بدلحاظی کرنے لگا۔انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے میز پر پڑا ربڑ کا موزہ اٹھایا اور دائیں ہاتھ کی مدد سے بائیں بازو میں پہنا،اس کے بعد انہوں نے اپنا مصنوعی ہاتھ اٹھایا اور پہننے لگے۔ابتہاج استہزائیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے؟'' وہ اس کی بے چینی بھانپتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''آپ کے پاس وقت نہیں ہے خان۔آپ کا مہمان آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''اور شاید تمہاری بات ہی اتنی بے معنی ہے کہ میں سننا نہیں چاہوں گا۔'' وہ کروفر سے کہتے کھڑے ہوگئے۔ابتہاج کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔کسی کا باپ اتنا سفاک کیسے ہوسکتا تھا؟ سگی اولاد کے ساتھ ایسی بے رخی کون برتتا ہے۔وہ بیڈ کے پاس آئے جہاں ان کی دستار پڑی تھی۔انہوں نے اپنی دستار اٹھائی اور سر پہ پہننے لگے۔چہرے پر مکمل سکون تھا،انداز میں بے نیازی تھی۔

''کیا آپ کو کبھی میری پرواہ ہوگی؟'' وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ گیا۔انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں گھمائیں۔

''شاہ سردار کس کمرے میں ہے اعلام؟'' انہوں نے اونچا سے کہتے ہوئے گارڈ کو مخاطب کیا۔ابتہاج نے ضبط سے انہیں دیکھا۔

''بیٹھک میں ہے خان۔''

''چلو پھر.....'' وہ کہتے ہوئے آگے آئے اور جھک کے میز سے فون اٹھانے لگے۔ابتہاج اندر سے کھول رہا تھا۔انہوں نے جھکے جھکے اسے دیکھا۔''تمہیں اپنی پرواہ خود ہی نہیں تھی وگرنہ بچپن سے لے کر اب تک میں تمہیں اسی دن کے لیے تیار کر رہا تھا۔اب جو تم نے بویا ہے۔وہ کاٹو گے۔'' وہ سرد مہری سے کہتے ہوئے،اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کے سیدھے ہوئے اور باہر نکل گئے۔

اس نے غصے سے پستول اٹھا کے میز پہ دے ماری،''چٹاخ'' کی آواز آئی اور میز کی سطح پہ کریک پڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ ریشم کو ڈھونڈتے ہوئے کچن میں آئی۔کچن میں حسبِ معمول عورتوں کا اتنا رش تھا جتنا شادیوں کے موقع پر ہوتا ہے۔ہر طرف چہرے ہی چہرے نظر آ رہے تھے۔کچن بڑا تھا۔اتنا بڑا جتنا دو کمرے ہوتے ہیں۔ایک طرف تنور تھا اور بھٹیاں سلگ رہی تھیں۔دوسری طرف تختوں پر سبزی ترکاری کاٹی جا رہی تھی۔کھڑکی کے ساتھ والے چولہے لگے تھے جن پر صرف فرمائشی کھانے پکتے تھے۔

وہیں ریشم کھڑی تھی۔اس نے بڑے سے چینک میں چائے چڑھا رکھی تھی اور ساتھ کاؤنٹر پہ پڑی ٹرے میں لوازمات رکھ رہی تھی۔وہ قدم قدم چلتی اس کے پاس آئی۔کاؤنٹر سے لگ کے اس نے ٹرے سے نان خطائی اٹھائے۔

''لاہوری بھیڑ کی خاطر مدارت کر رہی ہو؟'' اس نے ریشم کی طرف کمینی سی مسکراہٹ اچھالی۔

''تم؟'' ریشم تیورا کے پلٹی۔''کدھر تھا؟ کب سے بلا رہا تھا میں؟''

''چھت پہ تھی۔'' اس نے سکون سے بتایا۔

''کیا کہا؟'' ریشم کو ٹھیک سے سنائی نہیں دیا۔

''چھت پہ تھی۔ چڑیا مار رہی تھی پچھلے لان کے بیر کے درختوں میں.....'' وہ ٹرے میں موجود باقی بسکٹوں کو انگلی سے گن رہی تھی۔ (دوسرا کونسا کھایا جائے؟)

''تم چھت پہ گئی تھیں؟ یا اللہ تم جانتا ہے کسی کو پتہ چلا تو کیا ہوگا؟'' ریشم اس کے قریب آ کے دبے دبے غصے سے بولی۔ کچن اس وقت عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ گو کہ یہاں اردو کسی کو نہیں آتی تھی لیکن وہ دو لڑکیوں کی کھسر پھسر پہ کان ضرور دھر سکتی تھیں۔

''کسی کو نہیں پتہ چلا۔'' وہ بے لاپرواہی سے بولی۔ (کونسا کھاؤں، نان خطائی، زیرہ، دودھ یا پھر کھوئے والا)

''اگر پتہ چل گیا تو؟'' ریشم نے کمر پہ ہاتھ رکھے۔

''پتہ تب چلے گا جب کوئی مخبری کرے گا (انگلی دودھ والے بسکٹ پہ رکھی) میرے ساتھ وہاں جو تھے وہ ایسی جرأت نہیں کریں گے (اس نے پلکیں اٹھا کے ریشم کو عیاری سے دیکھا) تم..... تم کرو گی؟''

''میں.....'' وہ گڑبڑا گئی۔

''ہاں تم.....'' اس نے بسکٹ اٹھا لیا۔

''میرا مت نہیں مرا جو میں ایسا کرے گا۔ تم سے پنگا لینا مطلب لاحول والا قوۃ۔'' ریشم نے اس کے ہاتھ سے بسکٹ لے کر واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ ''لیکن، میں پھر کہہ رہا ہوں۔ احتیاط کرو۔ تم جس طرح پر نکال رہا ہے ناں بہت جلد تمہیں پنجرے میں قید کر لیں گے خان جی پھر تم پھڑ پھڑاتا رہنا۔''

''قید اور میں؟'' اس نے تمسخر سے شانے جھٹکے۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''سوال کا بچہ بھی پیدا ہو جائے گا تم ایک دپہ (دفعہ) خان جی کے ہاتھ تو چڑھو۔'' ریشم نے چینک اٹھا کے ٹرے میں رکھی پیالی میں چائے انڈیلنا شروع کر دی۔

''گلے بچے.....'' اسی اثنا میں کہیں سے چچی کی آواز آئی۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ بے زاری سے کاؤنٹر سے ہٹی۔ چچی اس کے پاس آ گئی تھیں۔

''کہاں تھا تم؟ کتنا کام پڑا ہے گھر میں۔ کون کرے گا۔ جلدی کرو۔ شاباش ہاتھ بٹاؤ زرمینے کا۔ وہ آٹا گوندھ رہا ہے۔''

''تم کیوں نہیں کرتی چچی۔ تمہارے موٹے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے؟'' وہ انتہائی بدتمیزی سے بولی۔

''گل.....'' ریشم نے ٹوکا۔

''مجھے کام نہ کہنا چچی۔ میں مٹھی بھر بھر کے آٹے میں ریت ڈال دوں گی پھر کھلاتی رہنا پورے قبیلے کو ریت کی روٹی.....'' وہ زہر خند لہجے میں کہتی پیر پٹخ کے وہاں سے نکل گئی۔ گل نے ہاتھ میں چینک پکڑے چچی کو دیکھا جو دھواں دھواں چہرہ لے کے رہ گئی تھیں۔

http://sohnidigest.com

(قسط نمبر: 2)

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ سوگئی تھی۔ یہاں کی فضا میں ایک روح افروز تازگی اور تمکنت تھی جو اعصاب اور دماغ کو سکون دے رہی تھی۔ وہ چند گھنٹے سوئی، اس کے بعد عصر کے وقت اٹھ گئی۔ نہانے کے بعد اس کے مسام کھل گئے تھے۔ چترال کا پانی صاف ستھرا، ٹھنڈا اور خوشگوار تھا۔ اس کی طبیعت کا بوجھل پن دور ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ بالکونی میں ریلنگ پر ہاتھ رکھ کے یہاں وہاں جھانک رہی تھی۔ سفید شلوار قمیص پہنے، بالوں کو کھلا چھوڑے، کندھوں کے گرد چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ بال ابھی تک نم تھے۔

بالکونی میں لکڑی کا جھولا لگا تھا۔ دیوار میں کھونٹی سے بڑی سی رسی فائر بریگیڈ کے پائپ کی طرح گول گول لپٹی ہوئی تھی۔ ریلنگ کے ساتھ قطار میں خوش رنگ پھولوں والے گملے رکھے ہوئے تھے۔ انہی گملوں میں سے بعض کی بیلیں جھولے کے ستونوں کے گرد کسی دوشیزہ کے بالوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ بالکونی کے آگے درختوں کا جھنڈ تھا۔ گھنے اور پراسرار سے درخت تھے۔ دور دور تک کوئی دوسری بالکونی نہیں تھی، صرف حویلی کی منڈیریں نظر آرہی تھیں۔ وہ جھانک جھانک کے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی جب کسی کی کھنکار سنائی دی۔ وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔

ریشم اس کے لیے شام کی چائے لائی تھی۔ ''اچھا لگا ہمارا چترال؟'' وہ جھک کے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں..... کافی خوبصورت ہے۔'' وہ جھولے پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئی۔

عصر کا وقت تھا۔ بالکونی سے کوہ ہندوکش کے پہاڑوں پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ ہر طرف عجیب سی اداس گہما گہمی تھی جیسے سفر تمام ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ ریشم نے اس کے لیے شیشے

کی پیالی میں چائے نکالی اور پرچ اس کی طرف بڑھایا۔اس نے پرچ تھام کے پیالی کو گھما گھما کے دیکھا۔اس میں زرد رنگ کا محلول تھا جو کہیں سے بھی چائے نہیں لگ رہی تھی۔اس نے جھجکتے ہوئے پہلا گھونٹ لیا پھر مروت سے مسکرائی۔

''اس میں نمک ہے۔تم نے شاید غلطی سے نمک ڈال دیا ہے۔'' وہ بمشکل گھونٹ نگلتے ہوئے بولی۔ریشم ہنسی۔

''اس میں صرف نمک ہی نہیں ہے مکھن بھی ہے۔''

''مکھن؟'' اسے ابکائی آئی لیکن مروت سے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا پھر کھسیا کے مسکرائی۔''مکھن .....کیوں.....ڈالا.....ہے؟'' (ہائیں.....اتنا ظلم؟)

''کیوں کہ چترالی قہوہ ہے اور چترالی قہوہ میں مکھن ہوتا ہے۔''

''قہوہ؟'' (کہاں سے لگ رہا تھا وہ قہوہ؟ ایسے ہوتے ہیں قہوے؟)

''ہاں یہ یہاں کی سوغات ہے۔ہمارا جو مہمان آتا ہے،ہم اس کو سب سے پہلے یہی پلاتا ہے۔'' (پھر بے شک اس کی جان چلی جائے۔)

''ہوں۔'' اس نے سہمی نظروں سے قہوے کی شکل دیکھی جو اس کے تاثرات پر ہنس رہا تھا۔مکھن والی روٹی سنی تھی،ٹوس کھائے تھے،نوڈلز کھائے تھے مگر کبھی چائے نہیں پی تھی۔وہ کڑوی اور عجیب سے ذائقے والی چائے کو نہ پھینک سکتی تھی نہ نگل.....اس نے کھسیا کر ایک نان کٹائی اٹھایا۔

''تم یہ سب کھانا.....یہ سب یہاں کا سوغات ہے۔'' ریشم نے ٹرے کی طرف اشارہ کی جس میں پنیر،شہد،نان ختائی،سوکھی خوبانیاں،اخروٹ،بادام،سادے کیک اور کچھ کشمش رکھی ہوئی تھی۔

اس کے معدے نے ابھی دہائیاں دینا شروع کردی تھیں۔وہ اس مخلوق میں سے تھی جو دودھ ناک بند کر کے،گھونٹ گھونٹ پیتی تھی۔اسے ڈیری کی چیزیں راس نہیں آتی تھیں۔وہ دودھ بھی پیتی

تو جی متلانے لگتا تھا اور یہاں ریشم اسی فیصد چیزیں ہی وہی لائی تھی جو اس کے لیے وبال جان تھی۔

اس نے چائے کو ذائقہ محسوس کیے بغیر نگلا اور پیالی واپس رکھ دی۔ ریشم نے اور قہوہ ڈالنے کی پیشکش کی تو اس نے فوراً پیالی پہ ہاتھ رکھ دیا۔ (نہیں۔ بالکل نہیں۔ بس!)

☆.....☆.....☆

ریشم اسے اپنے کمرے سے ملحق سٹور میں لے آئی۔ یہ سٹور روم عام سٹور روم جیسا نہیں تھا بلکہ یہ رضائی، لحاف اور ایسی دیگر ضرورت کی اشیاء رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک عدد زرد بلب جل رہا تھا۔ چاروں طرف سٹور میں پیٹیوں پہ پیٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔

''کتنا بار کہا بستر نکال لو۔ تم سنتا کہاں ہے۔ اب دیکھو رات ہو گیا۔ کہاں سے دھوپ لگائے گا اس کو؟'' ریشم بڑی پیٹی کے اوپر رکھی چیزیں ہٹاتے ہوئے اسے ڈانٹ رہی تھی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ میں ناک پہ دوپٹے کا پلو رکھ کے کھڑی تھی۔ اس کا تو دم ہی گھٹ رہا تھا۔ کتنے نم اور بوسیدہ بھبکے تھے جو اندر سے اٹھ اٹھ کے اس کے نتھنوں میں داخل ہو رہے تھے۔

''تمہارے پاس اپنا بستر نہیں ہے؟ نیا؟'' ریشم نے پوچھا۔

''ایک اس لاہور کی بھیڑ کے لیے بچایا ہے اور دوسرے سارے گلگتیوں کو دیے ہیں۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''وہ عبادہ ہے۔ اس کا نام تو تمیز سے لو۔'' ریشم نے اسے گھورا۔

''تمیز سے میری جوتی لیتی ہے۔ ڈائن کہیں کی۔ میری ہر چیز پہ قبضہ کر لیا ہے۔'' وہ جل کے بولی۔ ریشم نے گہری سانس لی۔ وہ کبھی اس کو سمجھا نہیں سکے گی۔

''اچھا ادھر آؤ۔ اس کا ڈھکن پکڑو میں بستر نکال لوں۔'' اس نے بھاری بھرکم پیٹی کا بڑا ڈھکن اٹھایا ہوا تھا۔

''خود کرلوناں۔''

''کیسے کروں۔ایک ہاتھ سے نہیں نکال سکتا۔تم اس کو پکڑے گا تو میں جھک کے کچھ نکال سکے گا۔'' وہ ٹھنک کے بولی تو وہ بادل نخواستہ اس کے پاس آئی اور ڈھکن پکڑ لیا۔پیٹی کے اندر تہہ بہ تہہ تکیے، بستر اور لحاف رکھے ہوئے تھے۔ریشم نے ایک رضائی، ایک بستر اور ایک تکیہ نکال لیا۔

''بند کرو اس کو اور باہر آؤ۔'' وہ سامان لے کے باہر نکل گئی۔اس نے تیزی سے ڈھکن بند کیا، لائٹ آف کی، دروازہ لاک کیا اور باہر آ گئی۔ریشم بانہوں میں سامان تھامے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''یہ پکڑو۔'' اس نے رضائی اٹھا کے اس پر اچھالی۔اس نے جیسے ہی رضائی کیچ کی۔ناک چڑھالی۔

''چھی..... کتنی گندگی بو آ رہی ہے اس سے.....'' اس نے منہ کراہیت سے ایسے موڑا جیسے خدانخواستہ کوئی نجاست پکڑ لی ہو۔

''سردیوں سے پڑا ہے وہاں..... بدبو نہیں آئے تو کیا چنبیلی کی خوشبو آئے گا۔''

''چھی.....'' وہ ناک پہ واپس دوپٹے کا پلو کھینچ کے بولی۔رضائی سے کافور کی بدبو آ رہی تھی

''آخری بار کب دھویا تھا۔دس سال پہلے؟''

''دس سال نہیں۔بیس سال پہلے۔اس لیے تم کو کہہ رہا تھا۔آ کے دھوپ لگوالو۔اب اس میں تم پوری رات گزارے گا تو تم کو عقل آئے گا۔کل اٹھ کے سب سے پہلا کام تم اس کو دھوپ لگوانے کا کرے گا۔''

''میں اس میں نہیں سوؤں گی۔'' وہ بچوں کی سی ضد سے بولی۔

''تمہارا مرضی۔میرا تو اپنا بستر ہے۔'' وہ شانے اچکا کے راہداری میں آگے بڑھ گئی۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ریشم۔میں اس میں نہیں سو سکتی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''میں کیا کروں۔اپنا بندوبست خود کرو۔'' وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔وہ اس کے

پیچھے آئی۔

''اس میں تم سو جاؤ۔'' اس نے معصومیت سے پیش کش کی۔

''کیوں؟'' اس کا بستر کارپٹ پہ رکھنے کے بعد وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کے پلٹی۔

''مجھے گھن آ رہی ہے۔'' اس نے رضائی خود سے دور دھکیلی۔

''تو اپنی گھن کو صندوق میں بند کر دو آج رات کے لیے۔ اس کے ساتھ گزارا کرو۔ سمجھا۔'' اس نے اس کی رضائی نیچے رکھ دی پھر سیدھی ہوئی، اسے دیکھا۔ وہ ہونٹ لٹکا کے بستر کو دیکھ رہی تھی۔ ریشم اس کا شانہ نرمی سے تھاپ کے باہر نکل گئی۔ وہ اپنا سا منہ لے کے رہ گئی۔ کمرے میں ریشم کے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ اس کی چچازاد۔ وہ بھی چکور کمرے کے ہر خانہ میں ایک ایک کر کے سوتی تھی۔ اب اتنے سارے لوگوں کو اکیلا اکیلا کمرہ تو مل نہیں سکتا تھا۔

ریشم نے اس کا بستر شمالی کونے میں لگایا تھا جہاں کھڑکی تھی۔ اس نے ہونٹ لٹکا کے باقی لڑکیوں کو دیکھا جو اپنے اپنے کونے میں دبک کے فریم پہ کڑھائی کر رہی تھیں۔ اس کی نظروں کا اشارہ سمجھ کے بھنویں اٹھائیں، مسکرائیں پھر تیزی سے سر نفی میں ہلایا۔

''سوچنا بھی نہیں۔'' ان کی نظروں میں وارننگ تھی۔

''پلیز۔ صرف آج رات۔'' وہ مسمسے لہجے میں بولی۔ کیا گزارش تھی!

''نہیں۔'' ایک نے اپنی رضائی اپنے بانہوں میں سمیٹ لی۔ دوسری نے بھی ٹانگیں پھیلا کے رضائی پہ رکھیں۔ اسے کوئی صورت نہیں نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف ناکامی تھی۔ لیکن جو ناکام ہو وہ گل لالہ کیا؟ اس نے سوچا۔ یہ رضائی تو وہ نہیں اوڑھے گی۔ ہرگز نہیں۔

اس نے بستر اور رضائی اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ دو کمرے چھوڑ کے وہ تیسرے میں آئی۔ وہاں روشانے آپی اپنے دس ماہ کے بچے کے ساتھ رہنے آئی تھیں۔ دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے لیے

بیڈ تھے۔ روشانے آپا کا بیٹا بیڈ پہ سویا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دوسرے بیڈ سے رضائی ہٹائی۔ بستر اتارا۔ اپنا بستر اس پہ بچھایا، رضائی نفاست سے رکھی۔ یہ سب وہ کسی چور کی طرح دروازے کی طرف طرف بار بار دیکھتے ہوئے کر رہی تھی کہ خدانخواستہ کوئی آ نہ جائے۔ بستر سجانے کے بعد اس نے روشانے آپا کا بیٹا بانہوں میں اٹھایا اور اس بستر پہ لٹا دیا۔ رضائی کو اس کی گردن تک اوڑھ دیا۔

روشانے آپا کا بیٹا پاؤڈر دودھ پیتا تھا۔ اس لیے وہ جس قدر پیتا تھا، اسی قدر نکالتا تھا۔ روشانے آپا اسے ہر وقت ڈائپر میں نہیں رکھتی تھیں۔ وہ اس کے لیے نیچے ابزورابل میٹرس بچھاتی تھیں اور روز رات کو کئی نیپیز اسے تبدیل کراتی تھیں۔

اپنا مشن مکمل ہونے کے بعد وہ اس بیڈ کی رضائی بستر لے کے اپنے کمرے میں آئی اور گھنٹوں پہ بیٹھ کے بچھانے لگی۔ دونوں لڑکیوں نے اسے دیکھا پھر بستر کو اور پھر ایک دوسرے کو۔

''یہ تو پلوشے کا بستر ہے۔'' ایک بولی۔

''کون بتائے گا پلوشے کو؟'' وہ شیطانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ کے دونوں کو دیکھنے لگی۔ دونوں نے تیزی سے سر نفی میں ہلائے۔ ان کی مت نہیں ماری تھی تو جو گل سے پنگا لیتیں۔

کچھ دیر بعد اس نے پلوشہ کی آواز سنی جو روشانے آپی کو اس کے بستر پر اپنا بیٹا سلانے کی وجہ سے ڈانٹ رہی تھی۔ پلوشہ کا بستر نم ہو گیا تھا۔ روشانے آپا حیرت سے روہان کو دیکھ رہی تھی جو جانے وہاں کیسے پہنچا تھا؟

☆.....☆.....☆

رات گہری ہو رہی تھی۔ مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت تھا یعنی خان حویلی میں رات کے کھانے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ وہ حیران رہ گئی کہ یہاں مغرب کے فوراً بعد کھانا کھایا جا رہا تھا۔ نیچے

صحن اور کچن سے ملحقہ راہداریوں میں عورتوں کا ہجوم لگ گیا تھے۔ بچے اور لڑکیاں ہال میں کھانا کھا رہی تھیں۔ بی جان اور باقی بزرگ خواتین کے لیے تختوں پر کھانا لگایا گیا تھا۔

ریشم اسے نیچے لے آئی تھی تا کہ وہ کھانا کھا سکے۔ اس وقت وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ عبادہ ہر طرف تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ راہداریوں میں، لابیوں میں گزرتی ہوئی عورتیں کسی فیکٹری میں کام کرنے والی عورتوں کی طرح تیز تیز ہاتھ پیر چلا رہی تھیں۔ نیچے اترتے ہوئے لڑکیوں کا بڑا جھنڈ ہاتھوں میں بستر تکیے اٹھائے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ دونوں ایک طرف کھڑی ہوگئیں۔ ان لڑکیوں نے عبادہ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ الجھی پھر سر جھٹک کے نیچے آئی۔ راہداری سے گزری تو ایک کمرے کے آگے سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے کو دیکھا جس نے ہاتھوں میں کپڑوں کے ہینگرز اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے بے اختیار کمرے کے اندر جھانک کے دیکھا۔ وہاں چھ سات لڑکیاں میزوں پر کپڑے استری کر رہی تھیں۔ ان کو دیکھ کے عبادہ کو ایسا لگا جیسے یہاں کوئی لانڈری شاپ ہو۔ لڑکا بے چینی سے لب کاٹ رہا تھا۔

"جلدی کرو آئیمے ..... سونیے ..... خان ناراض ہو جائیں گے۔"

"کر رہے ہیں۔ فکر مت کرو۔" لڑکیوں میں سے کسی نے جواب دیا۔ وہ حیرت سے آگے آئی اور بائیں طرف مڑنے کی بجائے، دائیں طرف مڑ گئی جب ہی ساتھ چلتی ریشم نے ٹوکا۔

"عبادہ، اس طرف ..... وہاں کمرے ہیں۔"

وہ ٹھٹک گئی۔ آئی تو یہاں سے تھی پھر؟ وہ سر جھٹک کے ریشم کے ساتھ چل پڑی۔ ان راہداریوں میں وقفے وقفے سے کمرے بنے ہوئے تھے جہاں لڑکیاں اور عورتیں کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ پوری حویلی میں شادیوں کے ہجوم کی طرح گہما گہمی تھی۔ ساری لائٹیں روشن تھیں اور ہر چیز چمک رہی تھی۔ آگے چل کے وہ بائیں سمت مڑیں۔ وہ یکدم ٹھہر گئی، اس نے گردن ترچھی کر کے

دائیں سمت اندر کی طرف جاتی راہداری کو دیکھا۔ یہ واحد راہداری تھی جس میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ اندر تک سیاہی ہی سیاہی تھی۔

''یہاں مت دیکھو..... اس طرف مردان خانہ ہے۔ تم اس طرف آؤ۔ کچن دوسری طرف ہے۔'' ریشم نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے لے گئی۔

''مگر یہ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ کسی اور چیز نے اس کی توجہ بھٹکا دی۔ سامنے صحن آ گیا تھا۔ اونچے ستونوں کے ساتھ بلب لٹک رہے تھے، زرد روشنی صحن کے فرش پہ گر رہی تھی۔ وہاں فوارے کے پاس ایک خاتون بیٹھی تھیں جو فوارے کے پانی سے ہاتھوں کی مدد سے پتے نکال رہی تھی جو شاید بیلوں سے ٹوٹ کے اس کے اندر گرے تھے۔ وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔

اس کے لیے کھانا کچن کے اندر موجود میز کرسی پر لگایا گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو ششدر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی فائیو سٹار ہوٹل کے کچن مین قدم رکھا ہو اور شیف ہیلپرز کے ساتھ دھڑا دھڑ کھانا بنا رہے ہوں۔ آگ..... الاؤ..... نمک مرچی..... تڑکے.....

ایک ہال جتنے بڑے کچن میں ایک طرف تنور لگے ہوئے تھے جہاں چار خواتین بازو کہنیوں تک چڑھائے نان لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف نیچے وقفے وقفے سے دیگیں رکھی ہوئی تھیں جن پر تین خواتین چمچے ہاتھوں میں پکڑے کھڑی تھیں۔ وہ شاید سالن ڈال کے دیتی تھیں۔ مشرقی دیوار جو کھڑکی کے ساتھ تھی وہاں سلنڈر والے چولہے رکھے ہوئے تھے جن پر شاید فرمائشی کھانے پکتے تھے۔ خواتین آئی جائی رہی تھیں، جیسے ویٹرز ہوں۔ کھانوں کی خستہ خوشبو نے اس کی بھوک بڑھا دی تھی ورنہ اتنا سب کھا کر اس کا پیٹ بھر چکا تھا۔

ریشم نے اس کے لیے کھڑکی کے پاس رکھی کرسی کھینچی، وہ تذبذب سے بیٹھ گئی۔ کچن کے ماحول نے اسے چونکا دیا تھا۔

تپائی پہ دنبے کی نہاری، تل والے نان، سلاد اور باسمتی چاول رکھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں تازہ پھل، پنیر، خوبانیاں اور شہد رکھا ہوا تھا۔ ایک طرف دنبے کے سینے کے بروسٹ بھی پڑے ہوئے تھے۔ اتنا سارا کھانا دیکھ کے وہ حیران رہ گئی تھی۔ اتنا سارا وہ کیسے کھائے گی؟

ریشم اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ذرا سائیڈ پر تھیں۔ کھڑکی کے پاس جہاں سے باہر چترال کے سیاہ پہاڑ مزید سیاہ ہوتے نظر آ رہے تھے۔ ان کا کچن زمین کی سطح سے اوپر تھا۔ کھڑکی سے نیچے دیکھتے تو یوں لگتا جیسے کچن دوسری منزل پر ہو۔

ریشم نے کھڑکی میں لالٹین روشن کر کے رکھ دی تھی جس کے گرد پروانے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اس نے کلمہ پڑھ کے نان اٹھایا تو وہ چونک گئی۔ وہ آنسو کی شکل کے نان تھے۔ شہر والے نان سے سائز، رنگت اور ذائقے میں مختلف..... اس نے لقمہ الگ کیا۔

دیگوں کے پاس کھڑی خواتین ٹرے میں سجی پلیٹوں میں سالن نکال رہی تھیں اور نوعمر لڑکے وہی ٹرے کچن سے ملحقہ دروازے سے نکل کے باہر لے کے جا رہے تھے۔ وہ چونک کے ان کو دیکھنے لگی۔ وہ تیرہ چودہ سال کے بچے تھے جو تیزی سے، ایک قطار میں آتے، ٹرے اٹھاتے اور نکل جاتے۔

''یہ کھانا کہاں لے کے جا رہے ہیں؟'' اس نے یونہی پوچھ لیا۔ ریشم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں پیچھے مڑ کے دیکھا پھر مسکرائی۔

''مردان خانے لے کے جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' وہ چونک کے ذرا سیدھی ہوئی۔

''یہاں سے باہر نکل کے دائیں طرف مردان خانے کی ایک بڑی بیٹھک ہے۔ وہاں مرد کھانا کھاتا ہے۔ یہ لڑکے وہاں لے جا رہا ہے۔''

''کیا وہ الگ کھانا کھاتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟'' اس نے اتنی تیزی سے پوچھا کہ ایک لمحے کے لیے ریشم نے رک کے اسے دیکھا۔

''کیوں کیا مطلب؟ یہاں مرد پہلے کھانا کھاتا ہے اور الگ کھاتا ہے۔'' ریشم نے نہایت پرسکون لہجے میں کہا۔

''اور تم لوگ..... تم لوگ؟ تم کب کھاتے ہو؟''

''جب مرد کھالیتا ہے تو ہم بھی کھالیتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

عبادہ بھونچکا رہ گئی۔ اس نے یہ روایت سن رکھی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کررہی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے آخری دفعہ کب اکیلے کھانا کھایا تھا۔ وہ چاروں ہمیشہ ایک دوسرے کا انتظار کرتے تھے اور جب تک سارے آنہیں جاتے تھے، کسی کا نوالہ حلق سے نہیں اترتا تھا۔ ابا تو خصوصاً اماں کو عزت دیتے ہوئے پہلے ان کے نوالہ لینے کا انتظار کرتے تھے اس کے بعد خود شروع کرتے۔ انہوں نے کبھی تنہا کھانا نہیں کھایا حتیٰ کہ اماں سے ناراضگی کے باجود بھی وہ کھانا ساتھ کھاتے تھے۔ یہاں مردوں کو پہلے کھلانے کا فلسفہ اسے سمجھ نہیں آیا۔

''تین سو لوگوں کا کھانا یہاں بنتا ہے؟ اس کچن میں؟''

''ہاں۔'' ریشم نے سر ہلایا۔

''صرف عورتوں کا یہاں بنتا ہے یا مردوں کا بھی؟''

''دونوں کا۔''

''ایک ساتھ بنتا ہے؟ یا ان کے باورچی الگ بنانے کے لیے آتے ہیں۔''

''باورچی؟'' ریشم ہنس پڑی۔ ''باورچی کیوں بنائے گا؟ مردان خانہ الگ ہے اس کا مطلب

یہ نہیں کہ سب الگ ہوگا۔ یہ تو صرف پردہ کے لیے بنا تھا۔ مرد تو ہمارے ہی ہیں۔ اس لیے کوئی باورچی شاورچی نہیں ہے۔ ہم بناتا ہے سارا کھانا۔"

عبادہ کا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ اس نے بے اختیار گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ بھرا۔ "تم..... تم لوگ یہ سارا کھانا بناتی ہو؟ یہ دیگیں، یہ کڑاہیاں، یہ روٹیاں؟"

"بالکل....."

اور عبادہ کو چپ لگ گئی۔ اس نے بے اختیار چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ اگر شمار اس کا ایورج نکالتی تو یہاں چار سے پانچ دیگیں سالن کی بن رہی تھیں، وہ بھی ایک سالن نہیں، دو تین طرح کا سالن۔ روٹیوں کا اجماع تین سو افراد کے لیے چھ سات سو تک پہنچ رہا تھا۔ اتنی گرمی میں سلگتے تنوروں پر روٹی لگانا ایک مشکل کام تھا۔ تنوروں پہ جھکی خواتین پسینے سے شرابور تھیں۔ ان کے چہرے حدت سے سرخ پڑ رہے تھے۔ ہر روٹی لگانے کے بعد وہ بازو سے پسینہ پونچھ رہی تھیں۔

عبادہ کا دل بری طرح دکھا۔ وہ عورتیں تھیں۔ مزدور تو نہیں پھر یہ کیسا ظلم تھا؟ اتنے تاریک اور حبس سے بھرے کچن میں، اتنی شدید گرمی میں کام کرنا ایک صبر آزما کھیل تھا۔ ان کو باورچی رکھنے چاہیے تھے، قبیلے کی عورتوں سے اتنے جان جوکھوں والے کام کون لیتا ہے بھلا؟ وہ داد دینا چاہتی تھی ان خواتین کو جو بنا کوئی شکایت کیے، بنا کوئی فریاد کیے، دھڑا دھڑ لگی ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

رات کو سونے سے پہلے اس نے بالکونی کا دروازہ اچھے سے لاک کیا پھر کھڑکیوں کے پٹوں کو اندر سے چٹخنیاں چڑھائیں اور پردے برابر کر دیے۔ مین دروازہ اس نے لاک نہیں کیا، بس بند کر دیا۔ کمرے کی ڈھیر ساری لائٹیں آف کرنے کے بعد، اس نے سائیڈ ٹیبل کے لیمپ کی روشنی جلائے رکھی۔ بیڈ کے اوپر لٹکتے جالی دار پردے اس نے نہیں کھولے تھے۔ مچھر دانیوں میں اسے

ہمیشہ گھٹن ہوتی تھی۔

وہ ایسے ہی لحاف کے اندر گھس گئی اور حسبِ عادت اپنا فون دیکھنے لگی۔ جیسے ہی اس نے سکرین روشن کی، اس کی نظر سگنلز پر پڑی جن کے سارے نکتے خالی تھی۔ اس کی سم ''نونیٹ ورک'' شو کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہاں سگنل کم ہی آتے تھے۔ ظاہر ہے یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ سگنلز کے کھمبے دور دور لگے ہوتے ہیں۔ آپ کو بات کرنی ہو تو باقاعدہ ایک مخصوص جگہ جا کے بات کر سکتے ہیں جہاں سگنل آتے ہیں۔ چلو کوئی نہیں۔ کل کسی سے پوچھ کے سگنل والی جگہ معلوم کر لے گی۔

اس نے فون بند کر کے ایک طرف رکھا اور چہرے کے نیچے ہتھیلی رکھ کے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے سو کر اٹھی تھی۔ یہاں جلدی سونے کا رواج تھا۔ دس بجے تک ساری حویلی سو جاتی تھی۔ وہ بھی سونے کے لیے آ گئی مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بے وجہ کروٹیں بدلنے کے بعد وہ سیدھی ہو گئی اور کمرے میں نظر ڈالی۔ نئی جگہ پہ کم ہی نیند آتی ہے لیکن یہاں تو عجیب سی ویرانی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرہ بڑا تھا اور وہ اکیلی تھی۔ دفعتاً اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''پرانی حویلیوں میں پراسرار عرشے ہوتے ہیں۔ ڈراؤنے۔'' کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر یہاں وہاں دیکھا۔ کمرے میں سب اپنی جگہ پر تھا پھر جانے کیوں اسے ڈر لگنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرا لیمپ بھی جلا لیا۔ اب کمرے میں روشنی بڑھ گئی۔ باہر ہوا چل رہی تھی، کھڑکیوں کے پردے اڑ رہے تھے۔

اس نے واپس سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی، دھیان بھٹکانے کے لیے اس نے دوبارہ فون اٹھایا اور بے وجہ سکرالنگ کرتی رہی۔ ایک ایپ سے دوسری، دوسری سے تیسری یہاں تک کہ دو گھنٹے گزر گئے لیکن اس کی پلکوں میں تھکاوٹ کی رمق نہیں آئی۔ اس نے اکتا کر فون بند کر دیا اور

سونے کی کوشش کی لیکن پھر اسی خیال نے بے چین کر دیا۔ باہر پہاڑوں سے عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں، گیدڑ اور بھیڑیوں کے اونگھنے کی، اس نے تھوک نگل کے حلق تر کیا۔ وہ حویلی میں کبھی نہیں رہی تھی اور فلموں نے کبھی اسے حویلیوں کے حوالے سے اچھے تصور نہیں دیے تھے۔

وہ چھت کو دیکھتے ہوئے اماں ابا کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس وقت کیا کر رہے ہوں گے وہ۔ ایک بج رہا تھا۔ یقیناً سو رہے ہوں گے لیکن بابا..... ہاں بابا اسے یاد کر رہے ہوں گے، ان کو نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ اماں البتہ سو گئی ہوں گی اور احمد۔ وہ اس کے کمرے میں اس کی نیٹ فلکس کی سبسکرپشن اڑا رہا ہوگا۔ فیملی کے خیال پہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کروٹ لی اور آنکھیں بند کیں، پلکوں پر بھاری بوجھ گرنے لگا۔ میٹھی میٹھی نیند کسی وادی سے اچانک وارد ہوئی اور وہ ٹھنڈے بستر پر کب سو گئی، اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

☆.....☆.....☆

''آئی..... بابا!''

وہ گھٹنا پکڑ کے کراہ رہی تھی۔ اس کے دائیں گھٹنے میں بلا کا درد تھا۔

ریشم کارپٹ پہ بچھے بستروں کو تہہ لگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ثمامہ اور ثانیہ بھی تھیں۔ یہ دونوں گل لالہ کی سوتیلی بہنیں تھیں جو گل کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔

''چور مچائے..... شور۔'' ریشم نے قوال کی طرح ہاتھ لہرا لہرا کے کہا۔ رات کو کسی نے پلوشہ کو چغلی کی تھی کہ گل نے اس کا بستر چرا کے کافوری بستر اس کے لیے بچھایا ہے۔ پلوشہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ وہ آدھی رات کو آئی اور گل سے اس کی رضائی چھین کے بھاگ گئی۔ گل پوری رات سردی سے ٹھٹھراتی رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے گھٹنوں میں درد ہو رہا تھا۔ اب اتنی چست تو تھی نہیں کہ سٹور سے ایک عدد رضائی اپنے لیے نکال لیتی۔

''گل باجی، تم کو کس نے کہا تھا یوسف خان کی بیٹی کا بستر چراؤ؟'' ثمامہ پچکار کے بولی۔ وہ سترہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ گھنگھریالے بال، سبز آنکھیں اور پتلے ہونٹ۔ وہ مسکراتی تو ڈمپل پڑتے۔

''تم چپ کرو۔'' گل نے ایک تکیہ اٹھا کے اسے دے مارا۔ ''میری مخبری ہوئی ہے۔ ورنہ اس کے باپ کو بھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔''

''کھلے جاسوسوں کے سامنے واردات کرنا بے عقلی ہوتا ہے۔'' ریشم نے لحاف اٹھا کے پیٹی پہ رکھتے ہوئے شانے اچکائے۔

''میں چھوڑوں گی نہیں اس کو۔ مزہ چکھاؤں گی میں۔ میرا نام بھی گل لالہ ہے۔'' وہ بمشکل اٹھتے ہوئے بولی۔

''پہلے اٹھ تو جاؤ۔ بوڑھیوں کی طرح کمر چٹخا رہا ہے۔'' ریشم نے ہنسی دبائی۔ یکدم وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

''اٹھ گئی ہوں میں..... کہاں ہے وہ بزدل عورت؟'' اس نے چوکنا فوجی کی طرح پوچھا۔

''اپنی ماں کے پہلو میں دبی ہوگی۔ دیکھ لینا۔'' ثمامہ نے یقین سے کہا۔

''ماں کے پہلو میں ہو یا باپ کے..... آج اس کا سر پھٹ کے ہی رہے گا۔'' وہ جارحانہ انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ریشم نے بھنویں اچکائیں۔ پھر سے گلِ لالہ کا چوہے بلی کا کھیل شروع ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح کا موسم اچھا تھا۔ فجر کے بعد اترنے والی ٹھنڈک انسان کو اچھی نیند دیتی ہے۔ وہ بھی خوب سوئی لیکن ایک ہی گھنٹے بعد پوری حویلی کے رونق جاگ گئی۔ شور، ہنگامے، آوازیں۔ یہاں کے باسیوں کا دن شروع ہو چکا تھا۔ خود اس کے لیے بھی صبح چھ بجے ناشتہ آ گیا، اس وقت لاہور کے کتے

بھی نہیں جاگے ہوتے وہ تو پھر انسان تھے۔وہ روٹین کی ڈسٹربنس پر بری طرح تلملا کے اٹھی تھی۔کچھ دیر پہلے ہی تو آنکھ لگی تھی اور پھر گرمیوں کی راتیں ہوتی ہی کتنی ہیں۔پلک جھپکتے گزر جاتی ہیں۔وہ گھونسلا بنے بالوں کو چہرے سے ہٹاتی،آنکھیں مسلتی بے دلی سے اٹھی تھی۔سامنے ریشم کو ہشاش بشاش دیکھا تو یاد آیا،وہ لاہور میں نہیں،چترال میں تھی۔

اس نے مروت سے مسکرا کے بال سمیٹنا شروع کر دیے۔

آج اس نے اصطبل جا کے گھوڑوں کا چیک اپ کرنا تھا۔ناشتے کے بعد اس نے اپنا ایڈ باکس کا بھاری بیگ نکالا جس کے اندر وزنی اوزار رکھے ہوئے تھے پھر اسے ریشم کو پکڑایا جو اسے بلانے آئی تھی۔ریشم نے اس کا بیگ پکڑا اور دونوں نیچے آ گئیں۔صحن سے مرکزی دروازے تک جاتے ہوئے اس کی نظر ایک خاتون پہ پڑی جو صحن میں ایک مرد کے آگے سر جھکا کے کھڑی تھی اور وہ مرد مقامی زبان میں اناپ شناپ بول رہا تھا۔عورت تابعداری سے سر ہلا رہی تھی۔

''یہ کون ہیں؟''اس نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ بریکنہ چچی کے شوہر ہیں۔مجاہد خان جی۔''ریشم نے بتایا۔

''ان کو ڈانٹ رہے ہیں؟''

''نہیں۔ان کا مہمان آنے والا ہے۔اس کے لیے دوپہر میں کھانا بنانے کا کہہ رہے ہیں۔''

مرکزی دروازہ کھول کے،خود دروازے کے پیچھے چھپتے ہوئے ریشم نے کہا۔اس نے اس کا بیگ چھوڑ دیا تھا۔عبادہ نے بیگ کو ہینڈل سے تھاما اور باہر نکلی،ریشم نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔باہر دروازے کے بائیں طرف،دور منیب خان سر جھکا کے کھڑا تھا،اسے باہر آتا دیکھ تو اس کی طرف لپکا اور بیگ اٹھا لیا۔

☆.....☆.....☆

اصطبل حویلی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ نیچے میدانوں میں دریائے چترال کے کنارے واقع تھا۔ یہ ایک چکور قطعہ تھا۔ سرسبز گھاس کا نرم قطعہ جس کے کنارے اسٹیڈیم کی طرح تھوڑے سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ یہ اصطبل کے پیچھے واقع تھا۔ اصطبل کا رخ مقامی آبادی کی طرف تھا۔ اسے چاروں طرف سے چار دیواری سے بند کیا گیا تھا۔ وہ مقامی آبادی کی سمت سے آئی تھی۔ منیب خان اسے اور ابتہاج کو یہاں ڈراپ کر کے گیا تھا۔

وہ ابتہاج کے پیچھے اپنا بھاری بیگ گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ پہاڑوں کی دھند ختم ہو چکی تھی۔ سیاہ پہاڑ نکھر آئے تھے۔ سورج کی گرمی نیم دوپہر میں بدل چکی تھی۔ دھوپ کی حدت بھی بڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ گردن میں لٹکا دیا تھا۔ بال گردن پہ ڈھیلے سے جوڑے میں مقید تھے۔ کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں چمک رہی تھیں جو اماں نے منتیں ترلے کر کے پہنائی تھیں۔ مس عبادہ سلیم کو سونے سے بہت چڑ تھی۔

جہاں گاڑی رکی تھی وہاں سے اصطبل تک کافی فاصلہ تھا اور نیچے زمین بھی کھردری اور ناہموار تھی۔ اس کا بیگ بھاری تھا مگر مجال تھی جو ابتہاج نے ایک بار بھی بیگ پکڑانے کی آفر کی ہو۔ وہ اسے اپنے پیچھے بے دردی سے چلا رہا تھا۔

اصطبل مستطیل تھا جہاں وقفے وقفے سے جیل کی طرح کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کے دروازوں کے پٹ آدھے تھے۔ پولیس افسران کے آفس کے دروازوں کی طرح۔ بیچ میں اینٹوں کا صحن تھا جہاں وسط میں ایک بڑا تالاب تھا۔ تالاب کے پاس دو ملازم کاٹے ہوئے چارے کے بڑے بڑے ٹب نیچے رکھے، اس میں پانی ملا کے مکس کر رہے تھے۔ اصطبل کے اوپر انگریزی لفظ (V) کی طرح مخروطی چھت تھی۔ یہاں اندھیرا تھا گو کہ چاروں طرف کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں لیکن اندر کا تعفن اور نم بھبکے بری طرح نتھنوں میں کھب رہے تھے۔

وہ دونوں تالاب کے پاس آ کر رک گئے۔ ملازموں نے ابتہاج کو آتا دیکھا تو دونوں مؤدب سے کھڑے ہو گئے۔

''سلام صاب.....'' ایک نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام..... مہابت خان کہاں ہے؟'' ابتہاج نے آنکھوں سے گاگلز ہٹا کے گریبان میں اٹکاتے ہوئے سرد مہری سے پوچھا۔

''وہ باہر ہے۔ بیمار گھوڑوں کے پاس۔''

''اور رستم؟''

ایک ملازم نے کن اکھیوں سے دوسرے کو دیکھا، دوسرے نے اسے۔ نظروں کا تبادلہ ہوا اور.....

''رستم کہاں ہے؟'' ابتہاج کی آواز میں غصہ شامل ہو گیا۔

''وہ..... وہ..... اسے حاکم خان جی لے کے گیا ہے۔'' ملازم نے سہمی سی آواز نکالی۔

''کیا؟'' ابتہاج حواستہ باختہ انداز میں چیخا۔ عبادہ نے کان پر ہاتھ رکھا۔ ''کس نے جانے دیا اسے؟ میں نے منع کیا تھا ناں؟''

''صاب وہ.....'' ملازم نے وضاحت دینی چاہی۔

''چپ کرو کم عقلو..... اس (عبادہ) کو مہابت خان کے پاس لے جاؤ..... حاکم کو تو میں خود پوچھتا ہوں۔'' وہ اپنی شال کا پلو بری طرح جھٹک کے جارحانہ انداز میں باہر نکل گیا۔ عبادہ کان سے ہاتھ ہٹا کے سیدھی ہو گئی۔ اصطبل کے باقی گھوڑے اس وقت اپنی اپنی کوٹھڑی میں موجود نہیں تھے۔ انہیں ملازم چرانے کے لیے لے کے گئے ہوئے تھے۔ سارا اصطبل خالی تھا۔

''چلیں مادام.....'' ایک ملازم تالاب میں ہاتھ دھونے کے بعد اس کے پاس آیا۔ اس نے سر

ہلا دیا۔ وہ بیگ پکڑے اس کے پیچھے چل دی۔ ملازم اصطبل سے نکل کر میدان کی طرف جا رہا تھا جو دراصل پولو گراؤنڈ تھا۔

میدان کی سرسبز گھاس دھوپ کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے سونے کے ذروں کو بکھیر دیا ہو۔ اس میدان کے چاروں طرف لکڑی کی چار فٹ باڑ تھی اور اسی باڑ کے بائیں سمت دریائے چترال ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اس کی سریلی آواز سارے میں گھل رہی تھی۔ مکمل خاموشی میں جیسے کوئی روح افروز موسیقی جاگتی ہو، جیسے اپنے وجدان میں گم کسی فقیر کو دل کی دھڑکن سازوں میں بکھری ہوئی سنائی دے۔ میدان کے سرسبز قطعے میں دور گھوڑے نظر آ رہے تھے۔ ان گھوڑوں کے ساتھ کچھ لوگ بھی موجود تھے جو ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گھوڑے اتنے دور تھے کہ عبادہ کو وہ چنے منے سے نظر آ رہے تھے۔

''گھوڑے کہاں ہیں؟'' اس نے حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا بیگ (ایڈ باکس) بہت وزنی تھا اور وہ ریشم تو تھی نہیں کہ ایک ہاتھ سے اٹھا لے۔ وہ فارمی مرغیاں کھانے والی عبادہ سلیم تھی جو ایک عدد بوتل اٹھا کے تھک جاتی تھی۔ وہ شہری لڑکی تھی۔ پہاڑی نہیں!

''ادھر ہے۔'' ملازم نے ہاتھ سے ایک الگ تھلگ کھڑے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے پیچھے لمبی سی گول عمارت کھڑی تھی جیسے پنسل کی شکل ہوتی ہے ویسے ہی..... وہ دریا کے مخالف سمت تھی اور باقی اصطبل سے بہت دور تھی۔

عبادہ قدم قدم چل کے اس کمرے میں داخل ہوئی، جھٹ سے بیگ چھوڑا اور کمر پہ ہاتھ رکھ کے ہانپنے لگی۔ اسے بے حد پسینہ آیا ہوا تھا۔ تنفس بے ترتیب تھا۔ مدثر نے اس کے ستانے کا انتظار کیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

''مادام اس طرف.....''

وہ اپنی حالت سے خائف ہوتی، بیگ کو ہینڈل سے پکڑ کے اس کے پیچھے چل دی۔

کمرے سے گھوڑوں کی ہنہناہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ فریادیں نہیں تھیں، یہ ان کی آوازیں تھیں۔ یہاں بھی آمنے سامنے تین کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ بقیہ اصطبل کی کوٹھڑیوں کے مقابلے کھلی، ہوادار اور روشن تھیں۔ ان کی کھڑکیاں اس وقت کھلی ہوئی تھیں جن کے پار سے چترال کی وادی نظر آ رہی تھی۔

گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں ایک اور آواز بھی شامل تھی۔ دھیرے دھیرے گانے کی..... یہ آواز مردانہ تھی اور نہایت پر شفقت تھی۔ آواز میں ماتمی درد تھا۔ وہ جونہی آگے چل کر ایک کوٹھڑی کے سامنے کھڑی ہوئی، اسے کسی کی پشت دکھائی دی۔ کوئی بیٹھ کے گھوڑے کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''مہابت خان.....'' ملازم نے مخاطب کیا۔

''کہو مدثر.....'' ان کی آواز میں بلا کی تھکاوٹ تھی۔

''ڈاکٹر آ گیا۔''

مہابت خان کے ہاتھ رک گئے۔ وہ گھوڑے کو چھوڑ کے کھڑا ہوا اور دھیرے سے پلٹا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا گھنی داڑھی اور مونچھوں والا نفیس شکل انسان تھا جس نے سر پہ پٹھانوں کی گرم ٹوپی جما رکھی تھی۔

''ابتہاج خان جی نے بھیجا ہے۔ علاج کے لیے۔ یہ گھوڑوں کو دیکھے گا۔ ڈاکٹر، یہ مہابت خان ہے اصطبل کا رکھوالا۔'' ملازم دونوں کو متعارف کروا کے وہاں سے چلا گیا۔ مہابت خان گومگو کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ عبادہ قدم قدم مہابت خان کے قریب آئی۔

''سلام کاکا.....''

''وعلیکم السلام.....'' مہابت خان نے ٹھنڈی سی آواز نکالی۔اسے ابھی تک عبادہ کو دیکھ کے یقین نہیں آیا تھا وہ ایک لڑکی ویٹ ہے۔یعنی لڑکی!

''کاکا، مجھے گھوڑے دکھاؤ۔میں سب کو دیکھنا چاہوں گی۔'' اس نے بیگ ایک طرف ٹکا کے کہا۔

''تم ڈاکٹر ہے؟'' مہابت خان نے ''تم'' پہ زور دیا۔لہجے میں ترشی تھی۔

''جی.....میں عبادہ سلیم۔تجربہ کار ویٹ اور سرٹیفائیڈ ہارس ڈاکٹر ہوں۔لاہور سے اپنی ڈگری لی ہے اور یہاں یوسف خان کے کہنے پر اپنے ہسپتال کی طرف سے آئی ہوں۔'' اس نے رٹو طوطے کی طرح تیز تیز فقرے دہرائے۔مہابت چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک دیا۔

''آؤ تم کو دکھاؤں۔'' وہ اسے لے کے ایک طرف چل پڑا۔

چھ گھوڑے ان چھ کوٹھڑیوں میں رکھے گئے تھے۔وہ سدھ بدھ کھوئے انسان کی طرح وہاں پڑے تھے۔بے دم، بے ہوش اور نیم مردہ۔ان کا جسم ایسے سخت اور ٹھنڈا پڑ رہا تھا جیسے کسی مردہ انسان کا ہوتا ہے لیکن ان کا پیٹ پھول کے سکڑ رہا تھا یعنی ابھی سانسیں چل رہی تھیں۔پیٹ میں معدے کے قریب ایک گول سوراخ ہوا تھا جس کو ایک گول ڈھکن سے بند کیا گیا تھا۔یہ گول سوراخ گھوڑوں کو کھانا دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ملازم یہاں سے موٹی سرنجوں میں ملغوبہ ڈال کے گھوڑے کے معدے میں ڈالتے تھے۔گھوڑے اپنے جبڑے نہیں چلا سکتے تھے۔

عبادہ پہلے گھوڑے کے پاس آئی اور پنجوں کے بل بیٹھی۔گھوڑے کا منہ کھڑکی کی طرف تھا اور وہ آنکھیں پھڑ پھڑاتا باہر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ذبح کے وقت کوئی جانور اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کب چھری چلے اور وہ مر جائے۔اس نے اوور آل کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کیں پھر جیب سے دستانے اور ماسک نکالا۔ماسک منہ پہ چڑھا کے دستانے پہنے اور گھوڑے کی آنکھوں کو دیکھنے لگی۔اس نے گھوڑے کی آنکھوں میں ٹارچ کی روشنی پھینکی اور اندر کچھ ٹٹولنے کی کوشش کی.....

مہابت خان اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے گھوڑوں کے کانوں سے لے کے دانتوں تک..... آنکھوں سے لے کے ناک تک ..... بالوں سے لے کے گردن تک..... پیٹ سے لے کے ٹانگوں تک..... ٹانگوں کی ہاف وال تک سب تسلی اور اطمینان سے دیکھا۔ ایسا کرنے میں اسے پورے تین گھنٹے لگے۔

''کب سے ہے یہ حالت ان کی؟'' وہ گھوڑے کی ٹانگ کو اٹھا کے اس کے جوڑوں میں ایک پلاسٹک کی برچھی ہلکی ہلکی مار رہی تھی تاکہ وہ سنسیشن چیک کر سکے۔

''بیس دن ہو گئے ہیں۔'' مہابت خان نے دکھ سے بتایا۔

''کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟'' وہ گھوڑے کی ٹانگ کو ورزشی انداز میں بینڈ کرتے ہوئے بولی۔

''جی دکھایا ہے۔ بہت ڈاکٹر بلایا ہے غاذان خان جی نے لیکن کسی کو مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ سب کہتا ہے ہمارے بس سے باہر ہے۔''

''بس سے کچھ بھی باہر نہیں ہوتا کاکا..... انسان کی کم ہمتی جہاں جواب دے جاتی ہے وہاں لوگ ہر چیز کو قسمت، قدرت، تقدیر اور بس سے باہر ظاہر کرنے لگ جاتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ کوئی جاننے کی کوشش کرے تو کیا نہیں جان سکتا۔''

وہ برچھی گھوڑے کی دیگر ٹانگوں پر مار رہی تھی۔ مہابت خان بے بسی سے کہتا کھڑکی کی چوکھٹ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ اسی کھڑکی کی چوکھٹ کے باہر ایک سیاہ گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔

وہ نہ ہنہناتا تو عبادہ کبھی اس طرف نہ دیکھتی۔ اس نے سر اٹھایا تو آنکھیں مبہوت ہو گئیں۔ وہ اونچا، سیاہ، چکنا گھوڑا تھا۔ اس کی جلد اس قدر چمک رہی تھی کہ عبادہ کو اپنی آنکھیں چندھیاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی گردن کے بال کسی دوشیزہ کے بالوں جیسے تھے۔ لمبے، سلکی اور گھنگھریالے۔ اس کی دم کے بال ایک گچھے کی شکل میں نیچے آ رہے تھے جیسے آبشار ہوتی ہے۔

اس پر سیاہ کاٹھی لدی ہوئی تھی جس کے کنارے سنہرے تھے اور اس کی زین کا رنگ کا بھی چمکتا ہوا سنہرا تھا۔ وہ اس قدر خوبصورت تھا کہ عبادہ ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی۔ وہ میدان کی گھاس پہ منہ جھکائے چر رہا تھا۔ اسے اپنا دیرینہ خواب یاد آیا۔ ''گھڑ سواری۔'' آہ! وہ کبھی نہ بن سکی۔ ایک بار جو گری تو ڈر نے کبھی اٹھنے نہ دیا لیکن گھوڑوں سے اس کی محبت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ ہمیشہ برقرار رہی۔

اس نے گہری سانس لے کے سر جھٹک دیا۔

''کاکا! کچھ سوال کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ گھوڑے کو چھوڑ کے کھڑی ہوئی۔

''پوچھو بچے.....'' وہ پلٹ کے اس کو دیکھنے لگے۔

''ان گھوڑوں کی ایسی حالت کیسے ہوئی تھی؟ کیا ہوا تھا ان کو؟'' وہ اپنے بیگ تک آئی جو کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے ایک پٹی میں لپٹے اوزار نکالے اور قدم قدم چل کے گھوڑے کے سر کی سمت آ گئی۔ گھوڑے کا سر فرش پہ ہنوز پڑا ہوا تھا۔

''رات کا وقت تھا جب مجھے رات کو گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دیا۔ گھوڑا بہت زور زور سے آوازیں نکال رہا تھا۔ میں جب اصطبل میں آیا تو یہ چھ گھوڑے زمین پہ گرے ہوئے سسک رہا تھا۔ ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ میں بہت ڈر گیا۔ مجھے لگا شاید کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ کوئی خونخوار جانور۔ یہاں چترال کے وائلڈ پارک میں ہوتے ہیں چیتے، شیر اور تیندوے وغیرہ۔ میں نے سب ملازموں کو اٹھایا۔ گھوڑے بری طرح ہنکار رہے تھے۔ ملازم آئے، ابتہاج خان جی آئے اور کچھ اور خانان بھی.....ہم نے گھوڑوں کو دیکھا تو وہ ایسے ہی پڑے تھے جیسے ابھی آپ کے سامنے.....''

مہابت خان کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے بیمار بچے کی ماں کی آنکھوں میں ہوتے ہیں جب وہ ڈاکٹر کو دیکھتی ہے۔

''پھر کچھ پتہ چلا.....؟''

''کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ ہم نے ایک ایک کونا چھان مارا۔ کوئی جانور نہیں ملا اور کسی گھوڑے کے جسم پر کوئی کھروچ نہیں تھا۔''

اس نے گھوڑے کا منہ کھولنے کی کوشش کی۔ اوپر اور نچلا جبڑا مخالف سمت کھینچ کے زور لگایا لیکن نہیں کھلا..... گھوڑا زور زور سے سر ہلانے لگا جیسے مزاحمت کر رہا ہو۔

''کاکا! اس کو ذرا پکڑو.....'' اس نے گھوڑے کے جبڑوں کے بیچ ایک عدد لکڑی کا ٹکڑا دے دیا جیسے ٹانسلز چیک کرتے وقت ڈاکٹر آئس کریم سٹک حلق تک گھساتے ہیں ویسے ہی لیکن یہ لکڑی تھوڑی موٹی اور لمبی تھی۔

مہابت خان نے گھوڑے کے قریب بیٹھ اس کا سر مضبوطی سے پکڑا اور نچلا جبڑا عبادہ کے مطابق نیچے کھینچا اور عبادہ نے بالائی جبڑا اوپر۔ زور لگا تو گھوڑا بری طرح ہنہنایا لیکن منہ کھل گیا تھا۔ اس نے ایک لوہے کی ہک نما چیز گھوڑے کے دنوں جبڑوں کے درمیان دے کر انہیں کھلا چھوڑ دیا۔

منہ کھلا تو اس نے گھوڑے کی زبان کو کلپر سے پکڑا کے باہر نکالا اور آنکھوں پہ میگنیفائنگ گلاس لگا کے اس کے زیر و بم دیکھنے لگی۔ اس کا انداز اس قدر پختہ اور تجربہ کار تھا کہ مہابت خان دل ہی دل میں اس کو سراہنے پر مجبور ہو گیا۔

''اچھا..... کاکا یہ بتائیں، آخری بار انہوں نے کیا کھایا تھا؟ میرا مطلب کونسا چارہ کھایا تھا اور کس نے بنایا تھا؟'' وہ کسی انٹرویو لینے والی لڑکی کی طرح پیشہ ورانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''وہی چارہ کھایا تھا جو روز کھاتا ہے۔''

''مثلاً؟''

وہ اب لکڑی کے اس ٹکڑے کو گھوڑے کی زبان پر رگڑ رہی تھی۔ گھوڑا کا سر مہابت خان کے قابو میں تھا۔

''گھاس، بھوسہ، نمک، مکئی، روٹی کے نرم ٹکڑے اور جوار۔''

''مکس کر کے دیتے ہیں؟''

''نہیں۔ پیس کے دیتے ہیں۔ ایک ملغوبہ سا بناتے ہیں۔''

''اور کون بناتا ہے یہ ملغوبہ؟''

''وہی ملازم جو صبح آپ کو لے کے آیا تھا اور خرمند..... دونوں کے ذمے چارے کا ڈیوٹی ہے۔''

''بلائیں انہیں اور میں چارہ بھی دیکھنا چاہوں گی۔'' وہ گھوڑے کے منہ سے ہک نکال کے بولی۔

''جی بہتر.....'' مہابت خان گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ سیاہ کلیوں والی فراک پہنے، سر پہ آنچل رکھے، گردن میں سیاہ چاندی کا نیکلس ڈالے راہداریوں میں ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی جیسے بھیڑ میں بچے ماں کے پہلو میں دب دب کے چلتے ہیں۔ موٹی چچی جو ہر صبح کاموں کا جائزہ لیتی تھیں، آج بھی مردوں کی طرح ہاتھ پشت پہ باندھ کے، گردن اکڑا کے ایک ایک کام دیکھ رہی تھیں اور جس نے کام کیا تھا وہ کسی امیدوار کی طرح اپنے نمونے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور موٹی چچی کسی جج کی طرح اس کے پاس جا کے اسے ریمارکس دے رہی تھیں۔

گل اور ابراہیم ایک کمرے کی چوکھٹ میں کھڑے تھے۔ ابراہیم کے پیروں میں ایک باریک سی تار فرش پہ پڑی ہوتی تھی جو راہداری سے ہوتے ہوئے سامنے ستون تک جا رہی تھی جسے بیل کی مضبوط ٹہنی سے نتھی کیا گیا تھا۔

تار کا رنگ بالکل فرش جیسا تھا۔ کوئی بھی غور سے دیکھے بغیر اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ گل کے وہ ہتھیار تھے جسے وہ دوسروں کا جینا حرام کرنے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ وہ دور سے آتی

موٹی چچی اوران کی چہیتی کو دیکھ رہے تھے جو ماں کے پلو میں منہ چھپا رہی تھی۔ موٹی چچی کے دائیں بائیں دو اور لڑکیاں بھی تھیں۔

''میں صحن میں جا رہی ہوں۔ میں جیسے ''موسم'' بولوں تم نے تار کھینچ لینی ہے۔ ٹھیک ہے؟'' اس نے ابراہیم کے سامنے پھر سے دہرایا۔

''فکر مت کرو گلے۔ میں دیکھ لے گا۔'' ابراہیم نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اطمینان دلایا۔ وہ سر ہلا کے باہر نکل گئی۔ چچی ابھی دور تھیں، وہ ستون سے لٹکی بیلوں کی کاٹ چھانٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صحن میں آ کے گل جوتے اتارے بغیر تخت پر گوتم بدھ والے انداز میں بیٹھ گئی اور سر اٹھا کر یہاں وہاں دیکھنے لگی جیسے کوئی کام نہ ہو۔

پلوشہ نے اسے صحن میں دیکھا تو وہ ماں کے پلو کے اندر گھس گئی۔

''کیا ہے پلوشے؟ چھوڑ و میرا دوپٹہ۔'' موٹی چچی نے جھنجھلا کے دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ منمنائی۔

''میں نے کہا چھوڑو۔ کام کرنے دو۔'' وہ تیزی سے اپنا پلو کھینچتے ہوئے نیچے آ گئیں۔ پلوشہ ایسے سٹپٹا گئی جیسے اس کی حفاظتی دیوار گر گئی ہو اور وہ برہنہ ہو گئی ہو۔ وہ تیزی سے یہاں وہاں ہونے لگی۔ گل تسلی سے بیٹھی ہوئی تھی۔ موٹی چچی اب صحن میں کھڑیں سر اٹھا کر بیلوں کو دیکھ رہی تھیں۔

اسی اثنا پلوشے کے سامنے راہداری میں تین لڑکیاں بڑی سی آٹے کی پرات اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ پرات کے وزن کی وجہ سے تینوں نے اسے اٹھا رکھا تھا۔ ان کو دیکھ کے گل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور ہتھیلیوں کو آپس میں مسلا۔ اس کو کھڑا ہوتا دیکھ کے پلوشہ گڑبڑا گئی اور یہاں وہاں فرار کے لیے دیکھنے لگی، اس کا دماغ نہیں چلا، وہ راہداری میں آگے بھاگی۔

ایک طرف سے آٹے کی پرات آ رہی تھی اور دوسری طرف سے پلوشے بھاگ رہی تھی۔ گل

نے چند لمحے انتظار کیا۔ وہ تار سے ایک قدم دور تھی جب اس نے اونچا سا کہا۔

''آج موسم کتنا اچھا ہے۔''

اور موسم لفظ سن کے ابراہیم نے تار کھینچی، پلوشے کا پیر اٹکا، وہ بہت بری طرح لڑکھڑائی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن سنبھالتی، آٹے کے پرات میں منہ کے بل جا گری۔ لڑکیوں کے ہاتھ سے پرات چھوٹ گئی۔ ایک ٹھاہ کی آواز آئی اور سارا آٹا راہداری میں بکھر گیا۔

موٹی چچی نے چونک کے اس طرف دیکھا پھر تیزی سے اس طرف گئیں۔ ابراہیم نے تار کھینچ کے فولڈ کر لی اور گل کو انگوٹھا دکھایا۔ گل نے شاباشی میں سر ہلا دیا پھر پلوشہ کی حالت دیکھنے کے لیے راہداری کی طرف محظوظ انداز میں بھاگی۔ ابراہیم نے بھی کچھوے کی طرح کمرے سے گردن باہر نکالی۔ وہ آٹے سے اٹے کپڑوں کو جھاڑ رہی تھی۔ اس کے منہ، بال، گردن اور یہاں تک کہ پلکوں پر بھی سفید آٹا لگا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی نے اسے چونے کے ڈرم میں ڈبکی دی ہو۔

''کیا ہوا میری پلوشے کو؟'' گل نے لاڈ سے پوچھا۔ موٹی چچی نے پلٹ کے گل کو دیکھا۔ گل پشت پہ ہاتھ باندھ کے، معصوم سی شکل بنائے پلکیں جھپک رہی تھی۔ (خدا کی قسم لے لو چچی..... یہ میں نے نہیں کیا۔ اچھا..... تم اتنی اچھی ہو؟)

پلوشہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو سفید چہرے پر دھاری بناتے ہوئے بہہ رہے تھے۔ چچی نے کچھ سوچتے ہوئے رخ بدلا۔

''اچھا بس بس اٹھ جاؤ..... دیکھ کے چلا کرو۔'' موٹی چچی نے اسے ہاتھ دے کر اٹھایا اور اس کے کپڑے جھاڑنے لگیں۔ لڑکیاں گومگو کھڑی تھیں۔ ''تم لوگ کیا دیکھ رہی ہو؟ صاف کرو یہ سب اور جاؤ یہاں سے۔ کھانے کی تیاری کرو۔'' وہ ان کو جھڑکنے لگیں۔ لڑکیوں نے ہڑبڑا کر پرات اٹھائی جس کا آٹا خراب ہو چکا تھا۔

''ہر وقت گرتا رہتا ہے۔ دیکھ کے نہیں چل سکتا؟'' موٹی چچی نے پچکارا۔

''وہ کچھ..... اٹکا..... پیر..... میں.....'' وہ رندھے گلے کے ساتھ بولی۔

''اٹکے گا۔ جب تک وہ ہے۔ سب اٹکے گا۔ تم میری بیٹی ہوتیں تو اس دو ٹکے کی لڑکی کو سبق سکھا دیتیں لیکن نہیں۔ تم نے تو خود گر کر مجھ کو بھی شرمندہ کرنا ہوتا ہے۔ نالائق لڑکی۔ جاؤ کپڑے بدلو۔ شکل گم کرو۔'' انہوں نے آہستہ آواز میں پلوشے کو ڈانٹ پلائی جو بری طرح خائف ہوگئی تھی۔ اس نے سر جھکایا اور پلٹ کے راہداری میں گم ہوگئی۔ چچی نے گہری سانس خارج کی اور ایڑیوں کے بل گھوم کے گل کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت تھی۔

☆.....☆.....☆

''تو چارہ تم دونوں بناتے ہو؟''

وہ چارے کے گودام کی طرف چلتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ چہرہ گرمی سے تپا ہوا تھا اور آنکھیں اپنے حلقوں میں ابھر گئی تھیں۔ وہ ٹشو سے بار بار پسینہ پونچھ رہی تھی۔ دونوں ملازم مؤدب سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس کی بات سن کے دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی مادام.....''

''اس رات بھی تم دونوں نے بنایا تھا؟''

''جی.....''

''وہاں رکھتے ہو چارہ؟'' اس نے پنسل نما عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''جی۔'' ملازم نے سر ہلایا۔

وہ قدم قدم چلتی اس عمارت میں داخل ہوگئی جو دراصل ایک اونچا ہال تھا۔ اس میں دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے ڈرم پڑے تھے۔ گتے کی موٹی موٹی پیٹیاں اور کنستر رکھے ہوئے تھے۔ ایک

طرف گھاس کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کونے میں ضخیم ٹب پڑے تھے جن میں چارہ مکس کیا جاتا تھا۔ انہی ڈرموں کے پیچھے لوہے کی گول سیڑھیاں اوپر بالائی منزل کی طرف جارہی تھیں، وہاں محض راہداریاں تھیں جن میں چارہ رکھا ہوا تھا۔

عبادہ دھیرے دھیرے چل کے ایک ڈرم کے سامنے کھڑی ہوئی اور اس کا ڈھکن اٹھایا۔ وہاں جوار پڑا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفید دانے۔

''یہ ڈالا تھا اس دن؟'' اس نے چلو میں دانے بھرے۔

''جی.....''

''کہاں سے آتا ہے یہ؟'' وہ ہتھیلی میں موجود دانوں کو سونگھ رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے کوئی فوڈ اتھارٹی افسر چھاپہ مار رہا ہو۔

''مادام پخاور سے.....''

''دوائی وغیرہ ڈالتے ہیں وہ لوگ یا مکمل آرگینک ہے یہ سارا۔'' اس نے مٹھی سے دانے واپس ڈرم میں انڈیل دیے۔

''مادام! بالکل تازہ جوار ہے کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ ان سے لیتا ہے۔'' خرمند نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ عبادہ نے سر کو جنبش دی پھر قدم بھر کے دوسرے ڈرم کے پاس آئی اور ڈھکن اٹھایا۔ وہاں مکئی کے دانے تھے۔ زرد اور سفید۔

''اور یہ؟''

''یہ اپنا ہے۔ اپنے کھیتوں کا۔'' خرمند کی آواز میں فخر در آیا۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا پھر تیسرے ڈرم کو دیکھا، وہاں نمک کے بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ ثابت شکل میں تھے۔ اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور سامنے کیا، وہ کرسٹل کی

طرح چمک رہا تھا۔اس نے زبان کی نوک پتھر پہ رکھی۔

''کھیوڑہ کا نمک ہے؟''

''جی.....''

''اسے بھی چارے میں ڈالتے ہو؟''

''جی۔یہ کالا نمک ہے بڑا طاقت ور ہوتا ہے۔یوسف خان جی کے ایک دوست نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ گھوڑوں کو کھلائیں۔ہم پچھلے دس سال سے کھلا رہے ہیں۔''

''ہوں۔''اس نے پتھر واپس رکھ دیا۔''گھاس یہ والی استعمال کرتے ہو؟''وہ ایک ڈھیر کے سامنے کھڑے ہو کے پوچھنے لگی۔گھاس آدھی سوکھی اور آدھی ہری تھی۔نم سی بدبو اس سے اٹھ رہی تھی۔

''جی.....''

''لاتے کہاں سے ہو؟''

''پہاڑوں سے.....''

''اس دن بھی لائے تھے؟''وہ سینے پہ ہاتھ باندھ کے مڑی۔باہر میدان میں گھوڑوں کے ساتھ انسانوں کی چیخنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں جن میں زیادہ تر شاباشی،حوصلہ افزائی اور ہدایت کی آوازیں تھیں۔

''اس دن ہم نہیں لائے تھے۔ہم اس سے دو دن پہلے لائے تھے یہ پیچھے پہاڑ کے دامن سے۔وہاں ہرا ہرا گھاس اگتا ہے۔گھوڑے شوق سے کھاتا ہے۔اس سے بنایا تھا چارہ۔''

عبادہ نے ٹھوڑی کو دو انگلیوں سے چھوا۔''اس دن کچھ ایسا جو تم نے اس سب کے علاوہ مکس کیا ہو؟دوائی؟مضبوطی کی کوئی خوراک وغیرہ؟''

''نہیں۔ہم کچھ بھی بغیر تسلی کیے مکس نہیں کرتے مادام۔یہ سارے پولو کے گھوڑے ہیں۔ان کا خیال ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ رکھنا پڑتا ہے۔ان کو زکام بھی ہو جائے تو خان جی ہماری چمڑی ادھیڑ دیتا ہے۔'' خرمند کی آواز میں آہ وزاری سی کیفیت تھی۔

عبادہ نے گہری سانس لی۔

''اس رات کچھ تو گھوڑوں نے ایسا کھایا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے۔'' وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کے نچلا ہونٹ کچلتے ہوئے بولی۔''مہابت خان کہہ رہا ہے کہ کسی جانور نے نہیں کاٹا۔تم کہہ رہے ہو چارہ بھی ٹھیک تھا لیکن اس رات یہ چھ گھوڑے کسی نہ کسی چیز سے ضرور متاثر ہوئے ہیں خرمند..... کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔''

''کیا مادام؟'' ملازم نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔میں نے سارے گھوڑوں کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ہر جوڑ ہر بال دیکھا ہے۔کہیں کچھ نہیں ملا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ گھوڑوں کو کچھ ان کے انٹرنل میں ملا ہے۔ایسا کچھ جس نے ان کے اندرون کو متاثر کیا ہے۔'' وہ اوور آل کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے باہر آ گئی۔

میدان میں وہ گھوڑے جو بھاگ رہے تھے اب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے اور ان کے گھڑ سوار اُن سے اتر کے ان کے زین تھامے کچھ باتیں کر رہے تھے لیکن باتوں کی آواز یہاں تک نہیں آتی تھی۔

''اور پانی کونسا استعمال کرتے ہو؟ وہی والا جو میں اصطبل میں دیکھ کے آئی ہوں؟ وہ تالاب؟'' اس نے باہر آتے ہی پوچھا۔دور سے بانہوں میں چارہ لیے مہابت خان آ رہا تھا۔اس کے ایک ہاتھ میں آری تھی۔

''مادام، چارے کے لیے ہم اس تالاب میں ہر روز نیا پانی ڈالتے ہیں۔وہاں پانی کی موٹر لگی ہوئی ہے۔ہم کبھی بھی استعمال شدہ پانی سے چارہ نہیں بناتے۔''

وہ ایسے بول رہا تھا جیسے اشتہاری لوگ اپنی چیزوں کی گارنٹی دیتے وقت بولتے ہیں۔

''پینے کے لیے کونسا پانی دیتے ہو؟''

''اس تالاب میں نیا پانی ڈالتے ہیں۔''

عبادہ نے پیشانی سہلائی۔ جب سب ٹھیک تھا تو غلطی کہاں ہوئی تھی؟ قصور کدھر نکلتا تھا؟ کچھ نہ کچھ تو تھا جس کی پردہ داری کی جارہی تھی۔ ان چھ گھوڑوں کے ساتھ اچانک ایک حادثہ ہوجانے کو اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ ان کے پیچھے کچھ ضرور چھپا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں کہیں سے ظہر کی اذان کی مدھر آواز بلند ہوئی۔ بانگ کے خوبصورت لفظوں کو ہوا نے لہروں پر اٹھایا اور سارے میں ایک سحر انگیز خاموشی چھا گئی۔ اس نے گردن میں پہنا دوپٹہ سر پہ کرلیا۔ مہابت خان اتنے میں قریب آگیا تھا۔ اس نے گھاس کی گٹھڑی کو ایک طرف پھینکا پھر اس پر آری لگادی اور سیدھا ہوا۔

جب تک اذان ہورہی تھی۔ عبادہ کی نظروں نے اس کالے گھوڑے کو پھر سے حصار میں بھر لیا۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ابتہاج تھا جو اس کی زین تھامے، جھک کے اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ گھوڑے کی سنہری زین چمک رہی تھی۔ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ایسے شان سے کھڑا تھا جیسے کوئلے کے بیچ ہیرا..... قیمتی..... بے نیاز..... واحد..... ابتہاج اس کا سر سہلا رہا تھا۔ اذان ختم ہوچکی تھی لیکن عبادہ کی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا۔ وہ انتہائی ستائش سے اس گھوڑے کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ فرائز لینڈ گھوڑا (Friesland Horse) ہے۔ ہمارے اصطبل کا سب سے خوبصورت، اعلیٰ، قیمتی، بیش بہا اور نسلی..... گھوڑا۔'' مہابت خان نے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے گردن اکڑا کے کہا۔

''کیا؟'' وہ بری طرح چونکی۔ ''یہ فرائز لینڈ کا گھوڑا ہے؟''

''ہاں۔'' مہابت خان نے سر ہلایا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھے۔ ''یہ تو بہت نایاب ہے.....اس کی نسل کے دو تین گھوڑے ہی رہ گئے ہیں پوری دنیا میں۔''

''جانتا ہوں۔ اس لیے تو کہا.....اعلیٰ، قیمتی، بیش بہا اور نسلی۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''آپ لوگوں کے پاس کیسے آیا۔ یہ خریدا تو نہیں جاسکتا۔''

''اس کی ماں کو خرید کر لائے تھے۔ یہ اس کا بچہ ہے۔''

''واؤ.....'' وہ مسحور کن انداز میں بولی۔ ''ایک نایاب نسل کا گھوڑا ہونا کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں وہ بھی اس صورت جب اس کی قیمت کروڑوں میں ہو۔ ایسے گھوڑوں کو کوئی نہیں چھوڑتا۔ سب ہتھیانا چاہتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کوئی تین سال پہلے اس گھوڑے کی خبر پھیلی تھی کہ یہ ذات ختم ہو رہی ہے۔ تب اس کا ایک گھوڑا پچاس کروڑ کا بکا تھا۔ اب تو اس کی قیمت اور بڑھ گئی ہوگی۔''

''قیمت تو بڑھ گئی ہے مگر اس میں ایک خامی ہے۔'' مہابت خان وضو کے لیے آستین کہنیوں تک موڑنے لگا۔

''کیا؟''

''یہ جتنا خوبصورت ہے۔ اتنا ہی ظالم اور سفاک بھی ہے۔ اس کو قابو کرنا بہت مشکل کام ہے۔''

عبادہ نے رک کے واپس اس گھوڑے کو دیکھا۔ وہ کسی بھی لگام کے بغیر تھا۔ کوئی بھی ملازم اس کی سکیورٹی کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ تابعداری سے ابتہاج کو ردعمل دے رہا تھا۔ اس کا انداز پرسکون اور نرم تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ بہت فرماں برداری سے ابتہاج کی بات سنتا ہو۔

''اگر یہ قابو نہیں کیا تو یہ یہاں کیسے؟ اصولاً تو اسے رسیوں، زنجیروں سے بندھا ہوا ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے مہابت خان کو گھورا۔

''اس کو بڑی مشکلوں اور لاڈوں سے سدھایا گیا ہے۔ اس لاڈ نے اسے اتنا سرکش اور باغی بنایا ہے کہ چن چن کر اپنے سواروں کو منتخب کرتا ہے۔ کوئی غیر، انجان اور اجنبی اس پر بیٹھنے کی کوشش کرے تو یہ بپھر جاتا ہے اور بسا اوقات تو گھڑسوار کو منہ کے بل گرا کے..... کچل دیتا ہے۔''

''کک..... کیا؟'' عبادہ نے خشک حلق تر کیا۔ گھوڑوں کے بپھرنے سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ راولپنڈی میں گھوڑے سے گرنے کے بعد وہ صرف علاج کی حد تک گھوڑوں کو چھوتی تھی۔ سواری یا سیر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

''ہمارے ہاں اس لاڈلے کی قدر بہت زیادہ ہے۔ سب سے عالی شان کھانا اسے ملتا ہے۔ چھ تیل ملا کے اس کی مالش کی جاتی ہے۔ اس کے ہوف تک ہر مہینے کاٹے جاتے ہیں۔ اس کے بالوں کو ولایت سے منگوایا گیا شیمپو کرتے ہیں۔ کچھ انتہائی قیمت خوشبوئیں ہیں یا شاید مساج کی دوائیاں ہیں مجھے علم نہیں۔ اس سے روز اس کو نہلاتے ہیں۔ اس کی صفائی ستھرائی کا کام کئی ملازموں کے ذمے ہے۔ یہ یہاں کا بادشاہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پولو میدان کی گھاس کوئی گھوڑا نہیں کھا سکتا سوائے رستم کے۔ ایسے لاڈ تو پھر خراب کر دیتے ہیں ناں.....''

وہ سر ہلا ہلا کر تاکیدی انداز میں کہہ رہے تھے۔ اسی اثنا ابتہاج اس طرف آنے لگا۔ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ فرائز لینڈ کا گھوڑا کسی دوشیزہ کی طرح نرم اور نازک قدم اٹھاتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ مہابت خان نے دونوں ملازموں کو اشارہ کر کے وہاں سے ہٹایا کیوں کہ اذان سننے کے بعد وہاں موجود لڑکے گھوڑوں کی لگامیں تھامے اصطبل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ابتہاج اس کے سامنے رکا۔ ''ابتہاج خان۔ اصطبل کا مالک۔'' اس نے سرسری سا تعارف

کرایا۔

''عبادہ سل.....''

''جانتا ہوں۔'' اس نے بدتمیزی سے بات کاٹی۔'' اتنا تو ہم بھی نئے ڈاکٹر کی خبر رکھتے ہیں۔آخر ہمارے بیش قیمت گھوڑوں کا سوال ہے۔'' وہ ٹھنڈی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہوں.....'' وہ اس کی نظروں سے جھرجھرا گئی۔

'' آپ نے معائنہ کرلیا ہوگا گھوڑوں کا.....کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ علاج کرسکتی ہیں یا سب کی طرح آپ بھی.....(وہ رکا) بزدلی دکھا کے بھاگ جائیں گی اور کہیں گی، میرے بس کی بات نہیں۔کوئی اور بلا لیجیے۔میں لڑکی ہوں۔معصوم ہوں۔مجھے جانے دیں۔''اس نے ٹونٹ کی۔ عبادہ سنسنا گئی۔

''کا کا یاد ہے۔پچھلے سارے ڈاکٹر۔حویلی کے مرغ مسلم اور عیش و آرام سے لطف اندوز ہونے کے بعد کیا کہہ کر یہاں رفو چکر ہوگئے۔ہم سے نہیں ہوتا ابتہاج صاحب۔آپ کے گھوڑوں پہ جادو ٹونا ہوا ہے۔ایسی تو کوئی بیماری ایجاد ہی نہیں ہوئی۔یہ تو سراسر کالا جادو ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔مہابت خان نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''سنا تم نے رستم.....کالا جادو.....ہاہاہا.....کالا.....جادو.....''

وہ مسکراتے ہوئے آگے آئی، ابتہاج سے دو قدم دور ٹھہر گئی اور سینے پر ہاتھ باندھے۔

''باقی ڈاکٹر کیا کہہ کر گئے اور کیا نہیں۔مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ابتہاج صاحب لیکن میں آپ کو گارنٹی دیتی ہوں کیوں کہ میں نہ عیش و آرام کی خواہش مند ہوں اور نہ ہی اپنے کام میں نا اہل۔میں اگر لاہور سے چترال آئی ہوں تو گھوڑوں کو ٹھیک کر کے ہی جاؤں گی۔اسے آپ میرا وعدہ سمجھتے ہیں یا شرط۔آپ کی مرضی۔''اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

ابتہاج کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا قریب آیا۔

''دیکھ لیتے ہیں۔'' اس نے چبا چبا کے کہا۔

عبادہ کی پیشانی پر بل پڑے۔ ابتہاج اس پہ ایک تمسخر بھری نگاہ ڈال کے گھوڑے کو لے گیا۔ اس نے تنفر سے اسے جاتا دیکھا، کتنی بری نظریں تھیں۔ اس کی روح میں چبھ گئی تھیں۔ وہ سٹپٹا کے مہابت خان کی طرف مڑی۔

''کاکا! میں نے سنا ہے پچھلے ڈاکٹروں نے کچھ ٹیسٹ وغیرہ بھی کرائے تھے؟ کیا آپ مجھے ان کی رپورٹس لا کے دے سکتے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''میرے پاس فائل پڑا ہے۔ میں لے آتا ہوں۔'' مہابت خان جھٹ سے بولا اور ننگے پیر ہی اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جسے ملازموں کا کوارٹر کہتے تھے۔ عبادہ وہیں کھڑے ہو کے اس کا انتظار کرنے لگی۔

اس سے تھوڑا دور چار پانچ گھوڑوں کا گروپ کھڑا تھا جنہیں وہ دو ملازموں کے ساتھ باقی تین چار لوگ پکڑ کے ایک طرف باندھ رہے تھے۔ یہ گھوڑے کئی رنگوں کے تھے۔ ہلکے بھورے، تیز بھورے، دودھیا، سفید اور کریم رنگ کے۔ یہ بھی کالے گھوڑے کی طرح اونچے، لمبے اور چکنے تھے۔ ان کی مضبوطی کا اندازہ ان کے چم چم کرتی اسکن سے لگایا جا سکتا تھا۔ ان پر جو لوگ سوار تھے وہ کسی مخصوص یونیفارم میں ملبوس تھے۔ سر پہ ہیلمٹ تھے اور کہنیوں اور گھٹنوں کے ساتھ حفاظتی بیلٹ بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کاؤبوائے والے بوٹس پہنے ہوئے تھے۔

مہابت خان ایک موٹی بھدی فائل لے کے آ گیا۔

''یہ لو بچے..... اس میں سب کچھ ہے۔ کچھ اور چاہیے ہوا تو بتا دینا۔'' انہوں نے فائل اسے تھمائی۔ فائل کا رنگ سیاہ تھا اور جگہ جگہ سے کاغذات نکل رہے تھے۔ اس نے بمشکل سے اسے

بانہوں میں سمیٹا اور گرتے پڑتے کاغذات اندر ٹھونسے۔

''ٹھیک ہے کاکا۔ میں یہ دیکھ لیتی ہوں۔ ویسے تو میں اپنی طرف سے کچھ ضروری ٹیسٹ کروانا چاہتی تھی لیکن میں پہلے یہ دیکھ لیتی ہوں۔ ویسے بھی یہ اتنے پرانے ٹیسٹ نہیں۔ مجھے یقین ہے یہاں مجھے کچھ نہ کچھ مل جائے گا لیکن اگر پھر بھی ضرورت پڑی تو میں ٹیسٹ سیمپل لے لوں گی۔''

''ٹھیک ہے بچے۔'' انہوں نے سر کو جنبش دی۔ وہ جانے لگی تو رک گئی۔ نظر ان گھڑ سواروں پر پڑی جو چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔

''کاکا، یہ سب لوگ کون ہیں؟''

''یہ چترال پولو ٹیم ہے بچے۔ یہ وہ لڑکے جنہوں نے اس دفعہ شندور میں پولو کھیلنا ہے گلگت بلتستان کے خلاف۔ یہاں آ کے مشق کرتے ہیں ہر روز۔ خان جی نے یہ گراؤنڈ باقاعدہ ان کے لیے ہی بنایا تھا۔''

''ہوں۔'' اس نے سر جھٹک دیا۔ ''میں حویلی جاتی ہوں۔ تھوڑا آرام کر لوں گی اور یہ بھی پڑھ لوں گی۔ ویسے بھی یہ دو دنوں میں ہی پڑھ پاؤں گی۔ اتنے زیادہ صفحے ہیں۔ آپ گھوڑوں کا خیال رکھو کاکا۔ کھانے کو دو۔ گرم رکھو اور وقت وقت پہ دوائیاں دو جو ڈاکٹر نے دی ہیں۔ میں پھر چکر لگاؤں گی۔'' وہ مسکرا کے کہتی جانے کے لیے مڑ گئی۔ مہابت خان نے سر تابعداری میں ہلایا اور اس کے ساتھ چل پڑا تا کہ دروازے تک چھوڑ آئے۔

☆.....☆.....☆

وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا اور دوسرا گود میں۔ وہ کان میں لگے بلیو ٹوتھ پہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں ٹھنڈا تاثر۔ وہ ڈیرے جا رہا تھا۔

''نہیں ابھی نہیں ملا۔'' اس نے تردید کی۔

''کیوں نہیں ملے اب تک؟ فوراً ملو اس سے۔ وہ پاگل آدمی ابتہاج اسے نقصان پہنچا دے گا۔''
دوسری مردانہ آواز شدید غصے میں تھی۔
''میں اس کے ساتھ ہوں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے تسلی دی۔
یہ سڑک ایسی تھی کہ نشیبی مقام پر اصطبل کا راستہ اس سے مل جاتا تھا اور پھر یہی ایک سڑک اپنے مدوجزر میں حویلی تک جاتی تھی۔ حویلی کی سڑک کشادہ اور ڈھلوانی تھی جو گولائی میں گول گول چکر کاٹتے ہوئے اوپر جاتی تھی۔ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے والی سڑک نظر آتی تھی۔ یہاں ہر چوٹی پر گارڈ کی چوکی بنی ہوئی تھی۔ وہ دور سے آتی ہوئی گاڑی کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ اس طرح کوئی گاڑی ان کی نظر سے چھپ نہیں سکتی تھی۔
''اس لڑکی کو تمہاری ضرورت ہے غازی..... اس کے ساتھ رہو، اگر وہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہوئی تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔'' وہ تنبیہہ کر رہے تھے۔
''ڈونٹ وری..... میں نے کہا ناں کہ کچھ نہیں ہوگا۔ تسلی رکھیں۔''
نشیبی سڑک پہ پہنچ کے اس کی گاڑی حویلی کی سڑک پہ مڑ گئی، وہ خود سے دور پک اپ کو جاتے ہوئے دیکھ کے چونکا۔ ''ایک منٹ۔ آپ کو کال بیک کرتا ہوں۔'' اس نے بلیوٹوتھ والے کو الوداعی کلمات کہے اور گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔ کچھ لمحوں میں اس کی گاڑی منیب خان کے دائیں طرف برابر میں چل رہی تھی۔
جہاں منیب خان چونکا تھا۔ وہیں عبادہ بھی الجھ گئی تھی۔ منیب خان نے گاڑی کی سپیڈ کم کر دی، وہ گاڑی کو پہچان گیا تھا۔ وہ سفید چمچماتی سوک حویلی کی تھی۔ دفعتاً اس کا اگلا شیشہ نیچے ہوا، اس نے سر نیچے کر کے منیب کو دیکھا اور رکنے کا اشارہ کیا۔ منیب خان نے تیزی سے بریک پہ پیر رکھا، عبادہ آگے کو لڑھکی پھر یکدم پیچھے سیٹ سے جا لگی۔ اسی اثنا سوک بھی رک گئی۔

''کیا ہوا منیب خان؟ کون ہے یہ؟'' عبادہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''خان جی، ہے مادام۔ پریشان مت ہوں۔'' منیب سیٹ بیلٹ کھولتا ہوا نیچے اتر گیا۔ اتنے بھی وہ بھی باہر نکلا۔ عبادہ نے سر اٹھا کے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ وہ اونچا، کشادہ سینے والا کوئی لڑکا تھا۔ مقامی مردوں کے مقابلے میں وہ پینٹ شرٹ اور گول گلے والی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ عبادہ نے سر جھٹک کے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

منیب خان سے کچھ بات کر کے وہ ایک طرف ہو گیا جب کہ منیب خان قدم قدم چل کے عبادہ کے پاس آیا۔

''مادام! خان جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' منیب نے شیشے کے پاس جھکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' اس نے بے رخی سے پوچھا۔

''مادام! وہ گھوڑوں کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

عبادہ نے یہاں وہاں دیکھا۔ وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ آس پاس کھیت تھے، سامنے حویلی کی سڑک تھی اور دائیں طرف دوسری سڑک نکلتی تھی، درخت، گھر اور لوگ بھی تھے۔ اس مقام پر بات کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ غیر آرام دہ ہو گئی۔

''ان سے کہیں حویلی میں آ کے بات کر لیں گے۔'' وہ شیشہ چڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ منیب خان چونک کے پیچھے ہو گیا۔ اس کا عکس عبادہ کے شیشے پہ چمکا۔ اس نے پلٹ کے اسے دیکھا جو منتظر کھڑا تھا۔

''صاب! وہ نہیں ملنا چاہتیں۔ کہہ رہی ہیں حویلی میں ملاقات کر لیں۔'' منیب نے دکھ سے بتایا۔

''اوہ..... کوئی بات نہیں منیب۔ میں حویلی میں مل لوں گا۔ اٹس آل رائٹ۔ تم لوگ جاؤ۔'' وہ برامانے بغیر خوشدلی سے کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا، ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے

بعد اس نے گاڑی بھگادی اور حویلی کی طرف جانے کی بجائے بائیں طرف مڑ گیا۔ منیب کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ گہرا سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ سٹور میں فرش پہ گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل بیٹھی انگلیوں سے کچھ ٹٹول رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کپڑے کا بنا پاؤچ تھا اور دوسرے ہاتھ میں جالی، وہ پیٹیوں اور صندوقوں کے نیچے جھانک جھانک کے جالی مار رہی تھی۔ سٹور روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں ایک دس سال کی بھسبھسے گالوں والی لڑکی کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔ وہ بسکٹ کترتے ہوئے راہداری میں آگے دیکھتی پھر پیچھے اور کسی کو نہ پا کر مطمئن سی ہو جاتی۔

''تم نے مجھے آٹے میں گرایا تھا ناں گل کی بچی۔ اب تم دیکھنا میں کیسے تمہارا سونا حرام کرتا ہے۔'' اس نے کمینگی سے کہتے ہوئے جالی کو ٹھاہ کر کے فرش پہ مارا۔ ایک دھول سی اڑ کے اس کے نتھوں میں گھسی، وہ بے ساختہ کھانسی اور ہاتھوں کو جھلا جھلا کے گرد بھگائی پھر سیدھی ہوئی اور جالی کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس میں چھ پیروں والے چھوٹے چھوٹے بدشکل کیڑے تھے۔ اس نے مٹھی میں کیڑے بھر کے کپڑے کے پاؤچ میں چھانٹ دیے۔ کیڑے پاؤچ کی دیواروں سے چمٹ گئے۔

''اب دیکھتی ہے میں..... تم کس طرح مجھ سے بچتا ہے۔ اماں جان! میں بھی بدلہ نہیں چھوڑتا۔'' وہ پاؤچ کے منہ کا گرہ کس کے بولی۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆.....☆

بالکونی کا دروازہ کھلا تھا اور سامنے چترال کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ حدِ نگاہ تک سرسبز وادیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ گوتم بدھ کے انداز میں بیٹھ کے، ران پہ ڈائری رکھے، سامنے کھلی رپورٹس پڑھ رہی تھی۔ پلندہ بہت ضخیم تھا۔ اس میں مختلف ٹیسٹ، رپورٹس، دوائیوں کی رسیدیں، سبسکرپشن وغیرہ

لکھی ہوئی تھی۔ مہابت خان کو جو ملا تھا، اس نے اس فائل میں ٹھونس دیا تھا۔

ایک گھنٹے تک وہ متعلقہ اور غیر متعلقہ کاغذات کو الگ کرتی رہی۔ کچھ کاغذوں کی لکھائی اڑی ہوئی تھی، کچھ پڑ مردہ ہو گئے تھے، کچھ پر پانی گرا تھا تو کچھ گچڑ مچڑ تھے۔ حالیہ رپورٹس کے علاوہ، کسی بھی رپورٹ کی حالت تندرست نہیں تھی۔ اس نے تمام کاغذات کو فائل کے اندر ترتیب سے رکھ دیا تھا۔ اب کونے باہر نہیں جھانک رہے تھے بلکہ فائل کے اندر موجود ہک سے ٹنگے تھے۔

وہ سر جھکا کے قلم چلا رہی تھی۔ بال جوڑے میں بند تھے لیکن چند آوارہ لٹیں کاغذ کو چوم رہی تھیں۔ اس نے رپورٹ اٹھا کر آنکھوں کے سامنے ایکسرے کی طرح اٹھائی، یکدم کچھ کھٹکا۔ وہ چونکی، اس نے تیزی سے گردن گھما کے یہاں وہاں دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ دروازہ بند تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور واپس رپورٹ دیکھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

آج رات کا کھانا بھی اس کے لیے کچن میں پروسا گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ پوری حویلی میں کوئی اور جگہ نہیں ہے کیا جو یہاں کھانا دیا جا رہا تھا۔ مہمان کے ساتھ تھوڑا لگژری سلوک ہونا چاہیے۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا مگر یہی سوچتے پھر ابتہاج کی بات یاد آ جاتی۔ وہ سر جھٹک دیتی۔ یہاں وہ عیش و آرام کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس لیے کوئی نخرہ کیے بغیر وہ کچن میں ریشم کے ساتھ چلی گئی۔ اس کا ہر کام ریشم کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس کی اسسٹنٹ ہو۔ اس نے سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور سفید پینٹ پہنی ہوئی تھی، بال جوڑے میں مقید تھے۔ گلے میں کوئی دوپٹہ یا مفلر نہیں تھا۔

کچن میں حسب معمول رش تھا لیکن آج بڑے چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہاں دو اوسط عمر کی خواتین کہنیاں چڑھائے، اپنے اپنے آنچل کو کمر میں کس کر باندھے، لمبی ڈنڈی والے چمچے دیگوں میں چلا رہی تھیں۔ گو کہ یہ جہاں بیٹھ کے کھانا کھاتی تھی وہ جگہ اس گہما گہمی سے بہت دور تھی اور

بمشکل یہاں تک کوئی دھواں یا تپش پہنچتی تھی لیکن وہ اپنی آنکھوں سے کچن کی رونق دیکھ سکتی تھی۔

ریشم نے اسے کرسی پر بٹھایا۔ کھانا پہلے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ آج کھانے میں دنبے کی یخنی اور کابلی پلاؤ کے ساتھ روغنی نان اور تیز تیل والا شوربہ تھا۔ اس کے علاوہ لسی کا لمبا کاسنی گلاس اور میٹھے میں سرخ رنگ کی مٹھائی تھی۔

یہ کھانے اس کے لیے بہت بھاری تھے لیکن وہ ہاتھ روک کے کھاتی تھی۔ وہ ہرگز بھی موٹی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے کھانا بہت زیادہ لگتا تھا۔ اس نے نوالہ بنا کے شوربے میں ڈبویا اور جب ہی وہ ٹھٹک گئی۔ مرکزی دروازے سے چار لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں داخل ہوئیں جن کے ہاتھوں میں گول چاندی کے پرات تھے۔ ان پراتوں پر بکرے کا کچا گوشت رکھا ہوا تھا۔

''اتنا لیٹ کر دیا۔ کہاں گم ہو گیا تھا تم لوگ۔ جلدی دو اس کو۔'' دیگیں پکانے والی ایک عورت دبے دبے غصے سے بولی پھر ان کے ہاتھوں سے پرات لیے اور سارے کا سارا گوشت دیگ میں ڈال دیا۔

''لاہور میں دیگیں نہیں بنتا کیا؟'' ریشم اس کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جس نے پوری زندگی میں پہلی بار کوئی خاتون نائن دیکھی تھی۔ وہ جھینپ گئی۔

''نہیں بس ایسے ہی.....'' وہ خائف ہو کر کھانا کھانے لگی۔ چند لقمے لینے کے بعد اس نے واپس اس طرف دیکھا جہاں دوسری عورت دیگ میں چمچہ چلا رہی تھی اور پہلی والی اب مرچ مسالے ڈال رہی تھی۔ وہ چار لڑکیاں واپس چلی گئی تھیں۔

''ریشم! کیا تم مساوات سمجھتی ہو؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ریشم کے چہرے پر ناسمجھی والے تاثرات آ گئے۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ واقعی نہیں جانتی تھی۔

''مساوات کا مطلب ہوتا ہے برابری۔ مرد عورت کو ایک جیسے حقوق دینا۔ کسی کو کم یا زیادہ نہیں۔ ناپ تول کی طرح دونوں پلڑوں میں یکساں حق ڈالنا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی روٹی نیچے رکھی اور آگے ہوئی۔ ''دیکھو۔ اللہ نے مرد، عورت کو برابر پیدا کیا ہے۔ مرد کو عورت کا نگہبان بنایا ہے اور عورت کو مرد کی ذمہ داری۔ دونوں کے لیے ایک جیسے حقوق اتارے ہیں۔ جو مرد کے حقوق ہیں وہ عورت کے فرائض ہیں اور جو عورت کے فرائض ہیں وہ مرد کے حقوق ہیں۔ دونوں کو کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ ان کا اوڑھنا، بچھونا، کھانا پینا، رہنا سہنا، بولنا چلنا سب ایک جیسا ہے۔ جنس البتہ مختلف ہے لیکن یہ امتیاز قطعی عورت کو مرد سے کم نہیں کرتا۔ عورت مرد کے برابر ہے۔ جو مرد کھائے گا۔ وہ کھائے گی۔ جیسے وہ رہے گا۔ ویسے عورت رہے گی۔ یونو وہاٹ۔ ہم لاہور میں۔ میں بھائی۔ بابا۔ امی۔ ہم سب ایک میز پر کھاتے ہیں۔ میرے سامنے بابا بیٹھے ہوتے ہیں اور دائیں طرف بھائی۔ ایون میرے بابا مجھے پلیٹ میں کھانا ڈال کے دیتے ہیں اور ہاتھوں سے کھلاتے ہیں۔ ہم لوگ ایسے نہیں کرتے کہ پہلے مرد کھائیں پھر عورتیں۔''

''مرد عورت برابر نہیں ہے۔'' ریشم نے رکھائی سے کہا۔

''کس نے کہا ہے؟ مرد اور عورتیں برابر ہیں ریشم۔ سب ایکول ہیں۔ سب۔''

''نہیں۔ مرد کا رتبہ بڑا ہے۔ عورت کبھی مرد کا برابری نہیں کر سکتا۔ تم غلط کہہ رہا ہے۔'' وہ بدلحاظی سے بولی۔

''میں نے کہا ناں میں لاہور میں بابا اور بھائی کے ساتھ مل کے کھاتی ہوں۔ بلیومی۔ شہروں میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''تو تمہارا شرم مر گیا ہوگا عبادہ بی بی.....'' ریشم نے تلخی سے روٹیاں اوپر نیچے کرنا شروع

کیں۔ ”ہم اپنے مردوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان سے بات تک نہیں کرتے۔ ان کو پلکوں پہ بٹھاتے ہیں اور تم ساتھ بیٹھ کے کھانے کی بات کر رہا ہے۔“

عبادہ پیچھے ہوئی۔ ”ساتھ کھانے میں برائی کیا ہے ریشم؟“

”تو اچھائی کیا ہے؟ تم ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح کھانا پلیٹ میں دیا جائے؟ اس کی بھی چشم پوشی کی جائے؟“ وہ روٹی چھوڑ کے اسے دیکھنے لگی۔

”تو.....؟ اس میں کچھ برا ہے؟“

”ہے..... عورت مرد کا غلام ہے۔ اللہ نے عورت کو مرد کے سکون کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کی برابری کے لیے نہیں.....“

اس کے معدے میں تتلیاں گھومیں۔ ”نہیں ایسا نہیں ہے۔“

”بس.....“ ریشم نے ہاتھ اٹھایا۔ ”ہم کو مت سکھاؤ۔ کھانا کھاؤ تم.....“

”جانتی ہو۔ یہ تم لوگ نہیں ہو جو اس سب کا شکار ہیں۔ باقی دنیا بھی ایسی ہی ہے۔“ اس نے دکھ سے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ ”ترکی میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں کمائی اور پکائی کی ساری ذمہ داری خواتین کی ہے۔ افغانستان، ایران، بھارت، ازبکستان اور یہاں تک کے یورپی ممالک میں بھی جو دیہی علاقے ہیں وہاں زراعت کا سارا کام عورتیں سنبھالتی ہیں۔ بوائی سے کٹائی اور پھر دانے کو بوریوں میں بند کرنے کے عمل تک ہر کام میں عورت جتی جاتی ہے۔ یہ تفریق جو ہمارا معاشرہ یہ کام عورت کا یہ مرد کا کہہ کے کرتا ہے۔ یہاں وہ تفریق کہاں چلی جاتی ہے؟ ان مشکل کاموں میں مردوں کو عورت کیوں نہیں نظر آتی؟ کیوں اس کا جسم صنف نازک نہیں لگتا؟ جب وہ جھک جھک کے گندم کے سینکڑوں خوشوں کو مٹھی میں پکڑ کے آری چلاتی ہے تو مردوں کی غیرت کہاں چلی جاتی ہے؟ جب وہ ان کے دس دس بچوں کو جنم دیتی ہے۔ انہیں پالتی ہے تب ان کی شرم کہاں

گھاس چر رہی ہوتی ہے؟'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

''قرآن میں جہاں مردوں کا ذکر آیا ہے۔ وہیں عورتوں کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ مائدہ۔ سورۃ ممتحنہ۔ سورۃ نور۔ اللہ نے عبادات ہو یا احکام۔ مومنوں کے بعد مومنات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے بھی دونوں کو برابر رکھا ہے۔ اس نے کوئی تفریق نہیں کی۔ اس لیے پلیز یہ مت کہو کہ عورت مرد کے ساتھ نہیں کھا سکتا۔ یہ باتیں تو ویدک دور کے ہندو کرتے تھے۔ برہمن، کھستری، ویش اور شدور جیسی ذاتی تفریقیں تو ان میں تھیں۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ ہمیں مہذب رواج رائج کرنے چاہئیں۔'' وہ بات پہ زور دیتے ہوئے رسان سے بولی۔

ریشم ہنک سے مسکرائی۔ ''تم معصوم ہے عبادہ۔ بہت معصوم۔ تم یہ سب اس لیے کہہ رہا ہے کیوں کہ تم نے یہ پہلی بار دیکھا ہے۔ فکر مت کرو۔ تم جلد اس کا عادی ہو جائے گا۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کرتی اپنے لے میں اس پہ ہنستی وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ دکھ سے اسے دیکھنے لگی۔ کیا اس قدر بھی کوئی نادان ہوگا کہ خود کو نہیں پہچان سکتا ہوگا؟ اپنے حقوق کو۔ اپنے لیے آواز نہیں اٹھا سکتا ہوگا؟ اور یہ کیسا برین واش تھا؟ وہ ہرگز ہرگز یقین نہ کرتی لیکن اس نے پہلے ہی منیب کے منہ سے زنان خانہ اور مردان خانہ سن لیا تھا۔ تو کیا یہاں ایسی پالیسیاں چل رہی تھیں؟ ایسے عورتوں کو ٹریٹ کیا جا رہا تھا؟ اور یہ لڑکیاں..... وہ دیکھ سکتی تھی کہ مردوں کو خوش کرنے کے لیے وہ کیسے ہاتھ پیر چلا رہی تھیں..... تو کیا یہ سب ایسے ہی چلے گا؟ اسی ذہنیت کے ساتھ؟ کیا کبھی کوئی بھی لڑکی اپنے لیے آواز نہیں اٹھائے گی؟

''کھانا دے دو۔'' یکدم کہیں سے چلانے کی نسوانی آواز آئی۔ آواز اس قدر اونچی تھی کہ چچی کرسی سے مچل کے اٹھ گئی اور ساری عورتیں ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگیں جیسے کوئی اعلان جنگ ہوا ہو۔ عبادہ نے پلٹ کے کچن کے دروازے کو دیکھا جہاں وہ اندر آ رہی تھی۔

''بیڑا غرق ہو جائے تمہارا گلے۔آہستہ بولو کم اصل۔اندر مرد کھانا کھا رہا ہے۔تمہارا آواز سنا تو مار ڈالے گا۔'' چچی بڑا چمچہ پکڑ کر غرائی۔

''موٹی چچی، ایسی نوبت آ ہی نہ جائے۔تمہارے مردوں نے جس دن مجھے مار ڈالا۔اس رات میں چڑیل بن کے تمہاری حویلی کو تہس نہس کر دوں گی۔'' وہ لاپرواہی سے کہتی آگے آئی اور ان کے سامنے ڈھٹائی سے کھڑی ہو گئی۔اس نے گہرے نیلے رنگ کی کلیو والی فراک پہنی تھی۔آنچل گردن میں لٹک رہا تھا۔

''چپ کرو۔بد دماغ لڑکی۔'' چچی اسے چمچہ مارتے مارتے رکیں۔

''بھدی چچی۔آرام سے.....اگر گر گئیں تو کون اٹھائے گا۔ہم میں اتنی طاقت نہیں۔پلوشے۔'' وہ مڑ کے کاؤنٹر پہ جھک کے سلاد کاٹتی پلوشے کو دیکھنے لگی۔''تم شریف چچا کا بلڈوزر منگوا لینا اپنی ماں کے لیے۔وہی اٹھا سکتے ہیں ان کو۔''

''چپ کر بد بخت۔'' چچی تاؤ کھا کے رہ گئیں۔وہ ہنسنے لگی دفعتاً اس کی نظر دیگوں کے پاس رکھی پیڑھی پر پڑی۔

''ہائیں۔چور کو خزانے کی چوکیداری دے رکھی ہے۔دیگ پہ ان کو بٹھایا ہے۔اب موٹی نہ ہوں گی تو کیا ہوں گی؟'' وہ پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے زور زور سے ہنسنے لگی۔عبادہ نے دلچسپی سے اس لڑکی کو دیکھا جسے چچی کی کوئی بات اثر نہیں کر رہی تھی۔

''آواز بند کرو۔گلا گھونٹ دوں گی۔'' چچی نے دانت دبائے۔

''آپ سے کوئی بعید نہیں۔آپ میرے اوپر بیٹھ کے بھی میری جان نکال سکتی ہیں۔نہ بابا نہ۔ہرگز نہیں۔میں پنگا نہیں لوں گی آپ سے۔'' اس نے شوخ سے کہتے ہوئے کہا پھر قہقہہ لگایا۔

''بریخنے.....اپنی بگڑی بیٹی کو سنبھالو۔خان جی نے سن لیا تو تمہیں بھی اس کے ساتھ قتل کر دے

گا۔'' چچی نے تنور پہ روٹی لگاتی ایک اوسط عمر کی خاتون کو خبردار کیا۔

''یہ کیا قتل ہوں گی۔ یہ تو خود قاتلہ ہیں۔ ہونہہ.....'' وہ تلخی سے کہنے لگی۔ قاتلہ.....؟ عبادہ نے اس خاتون کے چہرے پر ایک رنگ گزرتا دیکھا تھا۔ ایسا رنگ جیسے کہ روئیں روئیں سنسنا اٹھی ہو۔

''بکواس بند کرو۔ کم اصل۔'' چچی نے بالآخر اسے ایک چمچہ کمر پہ مار ہی دیا۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح ہنس رہی تھی۔

''مارو چچی۔ مارو۔ مجھے بھی مار ڈالو۔''

''چپ.....'' ریشم نے اسے اپنی طرف گھمایا اور ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔ ''خبردار جو کوئی بکواس کی۔ سامنے دیکھو۔ مہمان دیکھ رہی ہے۔ کیا سوچے گی؟ کیسا اناپ شناب بول رہی ہو۔''

ریشم نے سارا جملہ مقامی زبان میں ادا کیا لیکن جملہ ختم ہوتے ہی گل نے تیزی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ریشم نے اس کے متعلق ہی بات کی ہے۔ وہ سر جھکا کے کھانا کھانے لگی جیسے وہ تو انہیں سن ہی نہیں رہی تھی۔

گل کے چہرے پر تمسخر عود آیا۔ عبادہ چپ چاپ کھا رہی تھی۔

''کھانا دو.....کھانا.....'' وہ اونچا اونچا چلانے لگی۔

''ابھی مرد کھا رہے ہیں۔ وہ کھالیں پھر دے دیں گے۔'' چچی بولی۔

''موٹی چچی۔ کھانے کا کہا۔ بکواس کا نہیں۔'' اس نے جارحانہ انداز میں کاؤنٹر سے پلیٹ اٹھائی۔ دیگ پہ جھپٹی۔ ڈھکن اٹھایا اور سالن نکالنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو جاہل لڑکی۔'' چچی بھونچکی رہ گئی تھیں۔ اس نے ہنستے ہوئے سالن نکالا۔ تازہ نان لیا۔ سلاد لیا۔ بروسٹ ڈالا اور بھری ہوئی پلیٹ لے کے عبادہ کے پاس آئی۔ ریشم والی کرسی کھینچ کے عبادہ کے بائیں طرف سیٹ کی، اپنی پلیٹ سامنے تپائی پہ رکھی اور آستینیں فولڈ کرنے لگی۔ چچی

اور باقی خواتین بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

عبادہ نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گول مٹول چہرے والی خوبصورت لڑکی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کی سفید ملائی جیسی رنگت چمک رہی تھی۔ بھنویں سیدھی تھیں۔ آنکھیں بڑی تھیں اور تیز بلیو رنگ ان میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ بلیو رنگ..... ہائیں..... اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے گالوں کو ہتھیلیوں کے پیالوں میں بھر کے اسے دیکھا۔ کتنی پیاری آنکھیں تھیں۔ ترچھی سی..... تیکھی سی ناک میں ایک لونگ تھی۔ سرسوں کے دانے جتنی جو روشنی پڑنے سے دمک رہی تھی۔

اس کی جھالری پلکیں اس کا رخسار چوم رہی تھیں اور وہ تیوریوں پر سنہرے بل ڈالے کھانا کھا رہی تھی۔ اپنے چہرے پر اس کی نظر کی تپش محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھایا۔ منہ میں نوالہ تھا۔ سو روک کے اسے دیکھا۔

''کوئی مسئلہ؟'' انداز سپاٹ تھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ تیزی سے سر نفی میں ہلایا اور سر جھٹک کے کھانا کھانے لگی۔

اسی اثنا کچن کے اس دروازے سے کوئی داخل ہوا۔ اس کے داخل ہوتے ہی سب خواتین ایسے بپھر گئیں جیسے بھیڑوں کے جھنڈ میں شیر آئے تو بھیڑیں گھبرا جاتی ہیں۔ چچی اور پلوشے کے علاوہ خواتین نے چہرے پر پلو کھینچ کے منہ پھیر لیے سوائے گل کے، وہ ہنوز کھا رہی تھی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پورے کچن میں آسیبی خاموشی چھا گئی۔ اس نے نظر آنے والے کو دیکھا۔ وہ ابتہاج تھا۔ ماتھے پر بل ڈال کے گل کو گھور رہا تھا۔

''مور جان! کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ان کو تازہ کھانا بنا دیں۔ گوشت کر لیں اور کچھ سبزیاں اور خیال رہے اس میں مرچیں نہ ہوں۔ وہ مرچ نہیں کھاتے۔'' ابتہاج نے مقامی زبان میں دھیرے سے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے بچے۔تم جاؤ میں بنواتا ہے۔'' موٹی چچی نرمی سے مسکرائیں۔وہ گل کو تلخی سے دیکھتا پلٹ گیا،ابھی چند قدم لیے تھے جب وہ رکا۔

''مور جان.....'' اس کی گمبھیر آواز لگائی۔گل سمجھ گئی تھی کہ کیا کہنے والا ہے۔

''جی بچے.....'' چچی فوراً اس کی طرف لپکیں۔

''جن عورتوں کے منہ پھٹے ہوئے ہیں۔ان کے منہ سلا دیں۔مجھے اگر کسی کی آواز آئی تو میں زبان گدی سے کھینچ کے کاٹ ڈالوں گا۔'' وہ گل کو دیکھتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا۔گل نے کھانے چباتے ہوئے کہنی کرسی کی پشت پہ رکھی اور اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''زنان خانے میں خوش آمدید ابتہاج بھائی! کھانا کھایا آپ نے؟''

''سر پہ چادر لو۔'' اس نے آنکھیں دکھائیں۔

''آپ بھی لیں ناں۔بہرحال آپ زنان خانے آئے ہیں۔''

''گل!'' چچی نے ٹوکا۔

''ویسے ابتہاج بھائی.....جان.....آپ یہاں مت آیا کریں۔یہاں صرف ''عورتیں'' آتی ہیں۔''چوڑیوں'' والیں.....مہندی والیں.....'' وہ ''بھائی جان'' کو لمبا کھینچتے ہوئے اکساتے ہوئے بولی۔

''اپنی بے حیائی کو قابو میں رکھو گل۔میں خاموش ہوں،اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میرے اوپر چڑھائی کرو۔تمہاری آواز اگر باہر آئی تو میں تمہارے ساتھ جو سلوک کروں گا۔تم دیکھ لوگی۔'' ابتہاج کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔چچی اس کے سامنے کھڑی تھیں۔گل نے اس کی بات پر بے پر کی اڑائی۔

''ابتہاج.....تم جاؤ.....میں دیکھ لے گا.....''

''چھوڑو چچی..... بیچارے کو بہت غم لگے ہیں اس وقت۔تمہارے حوصلے سے کچھ نہیں ہوگا۔''
وہ لقمہ بناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''سرداری کسی اور کو مل رہی ہے، دستار کوئی اور پہنے گا..... بہترین لڑکی سے شادی کسی اور کی۔''

''خاموش.....'' ابتہاج چیخ کے اس کی طرف جھپٹا۔

''ابتہاج نہیں۔'' چچی نے اس کے سینے پہ دباؤ ڈال کے اسے روکا۔

''چھوڑو مور جان۔آج میں اس کی اکڑ نکالتا ہوں۔''

''اکڑ نہیں۔بھڑاس۔اپنی۔'' وہ اسے بری طرح اکسا رہی تھی۔ابتہاج نے ماں کو سامنے سے ہٹایا اور جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔وہ یکدم کھڑی ہو کے عبادہ کے پیچھے چلی گئی۔اس نے عبادہ کو شانوں سے تھام کے ایک جھٹکے سے اپنے سامنے یوں کھڑا کیا جیسے وہ اس کی حفاظتی دیوار ہو۔

''بہت بے شرم ہوتی جا رہی ہو تم۔'' ابتہاج نے کاؤنٹر سے چاقو اٹھایا اور اس کی طرف آیا۔

''ابتہاج نہیں.....'' چچی تیزی سے اس کے پیچھے آئیں۔ابتہاج آگے آیا۔عین عبادہ کے سامنے کھڑا ہوا۔

''نکلو باہر..... خبیث لڑکی..... بے حیا..... بے شرم.....'' وہ عبادہ کے دائیں بائیں اس پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو دیکھ کے عبادہ نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

''تم بل سے نکلو۔چوہے ابتہاج خان۔کب تک چوہیا کی طرح چھپتے رہو گے؟'' گل نے اسے مزید طیش دلایا۔عبادہ بیچ میں پھنس گئی تھی۔پیچھے سے گل نے اسے پکڑ رکھا تھا۔آگے سے وہ ابتہاج کے سینے سے لگتے لگتے بچ رہی تھی۔

''اچھا۔ابھی میں بتاتا ہوں کون چوہا ہے اور کون نہیں.....'' اب کی بار ابتہاج نے عبادہ کا لحاظ

نہیں کیا۔ وہ آگے آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ عبادہ کے پیچھے سے ہاتھ گزار کے گل کو پکڑتا۔ گل نے ایک زوردار دھکا عبادہ کو دیا جس سے وہ لڑکھڑا کے ابتہاج پہ جا گری۔

ابتہاج سنبھلتا، عبادہ کا بوجھ اس کے سینے پہ آن پڑا۔ وہ پیچھے لڑکھڑایا لیکن گرا نہیں۔ اس نے عبادہ کو بازوؤں سے تھام کے فوراً ہی سیدھا کھڑا کیا۔ وہ یوں کھڑی ہوگئی جیسے کسی نے مجسمہ سمجھ کے نصب کر دیا ہو۔ شاکڈ..... فریز.....

ابتہاج اسے چھوڑ کے گل کے پیچھے لپکا۔ ''رکو تم.....'' وہ کچن کے مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا مگر زنان خانے کی راہداریاں ویران تھیں۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں رفو چکر ہو چکی تھی۔

وہ زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے چاقو لیے خالی ہاتھ واپس آیا۔ ''اگر یہ دوبارہ یہاں آئے تو مجھے بتانا۔ میں اس کی عقل ٹھکانے لگاتا ہوں۔'' وہ طیش سے چاقو ایک طرف پٹختا کچن کے اسی دروازے سے باہر نکل گیا جس سے اندر آیا تھا۔

عبادہ اسی طرح کھڑی تھی۔ مٹھیاں آپس میں پیوست تھیں اور ہونٹ آپس میں بند..... کاٹو تو لہو نہیں والی کیفیت تھی۔ چچی نے آ کے اسے ہاتھ لگایا۔

''تم ٹھیک ہے؟''

اس نے سر اٹھا کے انہیں دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ چچی نے اسے کرسی پہ بٹھایا اور پانی ڈال کے دیا۔ ''بچی کو ڈرا دیا ہے۔ بے شرم لڑکی۔ کتنا سہم گئی ہے وہ۔''

چچی اونچا اونچا گل کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اس نے پانی کے چند گھونٹ لیے۔ خود کو کمپوز کیا اور لمبی سانس لی۔ اسے لگا جیسے ابھی ابتہاج اس کا سر کاٹ دے گا۔ اس کا جارحانہ انداز دیکھ کے عبادہ کی کن پٹیاں سنسنا اٹھی تھیں۔ ریشم نے آ کے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالا۔

''ڈرو نہیں۔ یہ ان کا روز کا کھیل ہے۔''

اسی لمحے کچن کے دروازے سے گل نے سر اندر کیا۔ سارے میں نظر ڈالی۔ وہاں صرف ہکا بکا کھڑی عورتیں تھیں۔ وہ اندر آئی۔

''چلا گیا..... بزدل..... آیا بڑا مجھے مارنے والا۔'' پشت پہ ہاتھ باندھ کے وہ ڈھیٹوں کی طرح ہنسی۔

''گلے! تم مرے گا۔ تم جو کر رہا ہے تم مرے گا۔'' چچی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کے جھنجھوڑا۔

''چھوڑ دو موٹی خاتون..... انسان ہوں دوائی کی شیشی نہیں ہوں جو اتنا ہلا رہی ہو۔'' اس نے چچی کے بازو جھٹکتے ہوئے کہا۔ چچی نے اسے عاجزی سے دیکھا۔

''کہا تھا یوسف خان کو۔ مت پڑھاؤ اس کو۔ خراب ہو جائے گا لیکن اس کے سر پہ اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی کو پڑھانے کا بھوت سوار تھا۔ اب اتارے گا یہ بھوت ان کا۔ تم سب دیکھ لینا۔ یہ گل ایسا گل کھلائے گا کہ ہم سب یاد رکھیں گے۔'' وہ بڑبڑاتیں، سر پیٹتیں واپس سٹول پہ بیٹھ گئیں۔

''موٹی چچی تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ واپس کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ ''میں گل نہیں کھلائے گا۔ میں کارنامہ کرے گا۔ ایسا کارنامہ کہ تمہاری گردن..... نہیں..... گردن تو موٹی عورت تمہاری ہے ہی نہیں..... تم اٹھائے گا کیسے..... تم ایسے کرو..... پتلی ہو جاؤ تب تک میں سوچتی ہوں میں کیا کارنامہ کر سکتا ہے۔''

وہ بھی چچی کے انداز میں بولیں۔ جیسے عموماً پٹھان بولتے ہیں۔ جملے کھینچ کھینچ کے لیکن یہ اس نے جان بوجھ کے کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جیسے بھی بات کر رہی تھی اس میں مقامی لہجے کا ذرا بھی تاثر نہیں تھا۔

''اللہ اللہ.....'' چچی نے پیشانی کو کئی بار ہتھیلی ماری۔

اس نے ایک ٹانگ اوپر کر کے کرسی پر رکھی اور مسکراتے ہوئے دانتوں سے بروسٹ نوچنے لگی۔عبادہ زخمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔اس نے گل کے سامنے سے پانی کا گلاس اٹھا کے لبوں سے لگایا۔گلا ابھی بھی خشک تھا۔

گل نے اسے نظر اٹھا کے دیکھا۔''ہیلو.....میں؟ مجھے گل لالہ کہتے ہیں۔گل لالہ دی ٹیزنگ مونسٹر(The Teasing Monster)''اس نے فخر سے شانے اچکائے۔عبادہ اسے گھور کے دیکھ رہی تھی۔

''اگر مجھے لگ جاتی تو.....''اس نے سہمتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے بروسٹ سے نظریں ہٹائیں۔عبادہ کا رنگ فق ہو رہا تھا۔اس نے ٹھنڈی سانس لی۔''ریلیکس وہ بہت بزدل،کم عقل اور نالائق انسان ہے۔وہ کسی کو مار نہیں سکتا۔''

''میری جان پہ تو بن گئی تھی ناں۔''وہ میز پہ گلاس پٹخ کے بولی۔

گل نے بچوں کی طرح ہونٹ بسور لیے۔''میں اش ننھی جان کے شدقے.....انی جلدی ڈل جاتی ہو؟ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں ہے تمہارے ساتھ۔ابھی تو تم اس حویلی کے بڑے بڑے تماشے دیکھو گی۔اگر تم کچھ دن یہاں رہیں اور بھاگ نہ گئیں۔''

وہ سر کو خوفزدہ انداز میں جنبش دیتی،وہاں سے چلی گئی۔عبادہ نے نتھنے پھلا لیے۔واقعی مونسٹر تھی۔نیلی آنکھوں والی مونسٹر۔

☆.....☆.....☆

اس نے صبح ہی بستر نکال کر دھو،دھا کر سکھا دیا تھا۔اس کی کافوری بدبو بھی چلی گئی تھی اور وہ تھوڑا ٹھنڈا بھی ہو گیا تھا۔آج کھڑکی کے نیچے بستر ڈالتے ہوئے وہ ناک نہیں سکوڑ رہی تھی۔اس کی روم میٹ کزنیں بھی اس کی خوشی دیکھ کے کھسر پھسر کرتے ہوئے اس پر ہنس رہی تھیں۔اس نے تکیے پہ

ہاتھ مار کے اسے سیٹ کیا پھر نرم گداز بستر پر دراز ہوگئی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے عین اوپر کھڑکی کا پٹ تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے پٹ بند کر دیا اور پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے پرسکون سی سو گئی۔

دوسری طرف عبادہ نے پوری تسلی سے دروازے، کھڑکیاں بند کیں اور بیڈ پہ دبک کے بیٹھ گئی۔ آج اس نے کمرے سے برآمد کردہ انگریزی ناول نکالا تھا۔ وہ کراؤن سے ٹیک لگا کر اسے پڑھنے لگی۔ کمرے کی ساری روشنیاں اس وقت جل رہی تھیں۔ اس نے فون میں صبح سے کئی بار سگنلز چیک کیے تھے لیکن تاحال نیٹ ورک بند تھا۔ اس نے اکتا کر فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ جلدی سونے کی عادی نہیں تھی، رات بارہ یا ایک بجے اس کا معمول تھا۔ یہاں آ کے وہ روٹین سے مخل ہو رہی تھی۔ انگریزی ناول پڑھا ہوا لگتا تھا۔ اس کے صفحوں پر ہائی لائٹر کے نشان تھے، جگہ جگہ بک مارکس اور سٹکی نوٹس چپکے ہوئے تھے۔ اس نے حیرت سے اس ناول کو دیکھا۔ یہ کون پڑھتا ہوگا؟ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر سر جھٹک دیا۔

پڑھتے پڑھتے جب اسے کئی جمائیاں آئیں تو اس نے وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ اس نے کتاب بند کی اور بیڈ سے اتری۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اسے پانی پینا چاہیے۔ وہ سوچتے ہوئے میز کی طرف آئی مگر وہاں رکھے جگ اور بوتل میں پانی نہیں تھا۔ اب کچن سے پانی لانا ہوگا۔ اس نے بوتل اٹھائی، چادر کندھوں پر اوڑھی اور فون ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکلی۔

اسی راہداری میں آگے جاتے ہوئے وہ جیسے ہی بیچ کی راہداری میں پہنچی، وہ ٹھٹک گئی۔ ساری حویلی سنسان پڑی تھی۔ کسی ذی النفس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا یہاں کئی سالوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ بلب بجھے ہوئے تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، کونوں میں کوئی آدھ زیرو والٹ کی بلب جل رہا تھا۔ آگے کا سوچ کا اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ پانی کا

ارادہ ترک کر کے واپس کمرے میں آئی، دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔

در پردہ کسی نے دیکھ لیا تھا۔ کوئی جان گیا تھا کہ اندھیرے سے وہ ''ڈرتی'' ہے۔

☆.....☆.....☆

پوری رات وہ وقفے وقفے سے جسم کھجاتی رہی۔ مچھر تھے شاید۔ کبھی ایک جگہ کاٹتے تو کبھی دوسری جگہ۔ وہ اپنی سپید اسکن رگڑ رگڑ کے سرخ کر چکی تھی۔ صبح کی کرنیں کھڑکی سے اندر وارد ہوئیں تو وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ آنکھیں بوجھل تھیں، اعصاب بھاری تھے۔ اس نے دھندلاتی آنکھوں سے سامنے دیکھا جہاں ریشم اور دو اور لڑکیاں اسے گھور کے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر الجھن ابھری، اس نے آنکھیں مسل کے بصارت صاف کی، دھندلاہٹ ہٹی تو وہ تینوں نظر آئیں، ریشم کے ہاتھ میں تہہ شدہ کپڑے تھے، وہ دیدے پھاڑ کے اس کے چہرے اور گردن کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ پہلی بار دیکھ رہی ہو؟'' وہ خمار آلود آواز میں کہتی، لحاف ہٹا کر بیٹھ گئی۔

''گل.....تم کو گیارہ سال کی عمر میں خسرہ ہو چکا ہے۔'' ریشم نے کہا۔ وہ جو بال سمیٹ رہی تھی، اس کی بات سن کے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''مجھے بتا رہی ہو یا یاد دلا رہی ہو؟''

''انکشاف کر رہا ہے۔''

''کیوں؟'' اس نے بال سمیٹ کے پوچھا۔

''اپنا چہرہ دیکھو.....گردن دیکھو.....''

''کیا ہوا میرے چہرے اور گردن کو؟'' اس نے ہاتھوں سے چہرہ اور گردن چھوئے، انگلیوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے ابھار محسوس کر کے وہ بجلی سی تیزی سے اٹھی، سامنے دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے اور گردن پہ چھوٹے چھوٹے سرخ دانے تھے۔ پورا چہرہ

سرخ ہو رہا تھا۔اس نے بے اختیار گردن اور چہرے کو چھوا۔

''یہ۔کک.....کیا ہے ریشم؟'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔

''خسرہ تو نہیں ہو سکتا پھر.....''

''باجی.....'' اس سے پہلے کہ ریشم کچھ کہتی، ساتھ کھڑی لڑکی نے چیخ ماری۔وہ دونوں اسپرنگ کی طرح اچھل گئیں۔

''کیا ہوا؟'' گل نے پوچھا۔

''کیڑے.....وہ دیکھو.....'' لڑکی نے انگلی سے گل کے بستر کی طرف اشارہ کیا جہاں چھوٹے چھوٹے سرخ کیڑے جا بجا رینگ رہے تھے۔

گل ایک جست میں قریب آئی۔''یہ کہاں سے آئے؟''

ریشم تیورا کے اس کی طرف مڑی۔''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ دھوپ لگواؤ؟''

''دھوپ کیا سرف سے دھوئے ہیں یہ تینوں میں نے کل۔'' گل نے تیزی سے کہا۔

''پھر یہ کہاں سے آئے؟'' ریشم کو تعجب ہوا۔

''پلوشے باجی نے ڈالا ہے۔'' دروازے کی چوکھٹ سے آواز آئی۔وہ تینوں کرنٹ کھا کر پلٹیں۔یہ وہی دس سال کی لڑکی تھی جو کل بسکٹ کتر رہی تھی۔''سٹور سے لیا تھا اس نے کل۔''

گل کے تلوؤں سے لگی، سر میں بجھی۔اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''چھوڑوں گی نہیں میں اس کو.....'' وہ دانت کچکچا کے بولی۔

''اس وقت صحن میں بی جان کے ساتھ گوٹا کناری لگا رہا ہے ملکہ پلتستان کے لیے۔وہ آئیں گی ناں کچھ دنوں میں۔چاہو تو یہ لے جا سکتی ہو۔'' بچی نے ایک عدد ڈنڈا اس کی طرف بڑھایا۔

''ضرورت نہیں ہے اس کی۔اس چوزی کے لیے میرا زور بازو کافی ہے۔'' وہ آستین پیچھے فولڈ

کرتی ہوئی بولی۔

''لیکن ایک منٹ رک جاؤ۔'' ریشم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''میں نہیں رک رہی ریشم۔ میں جا کے اس کا سر پھاڑ دوں گی۔''

''پھاڑ دینا۔ پہلے یہ لے جاؤ۔'' ریشم نے کپڑوں کا تھان اٹھا کے اس کی طرف بڑھایا جس میں کیلاشی پشوازیں پے در پے تہہ تھیں۔ گل نے ناسمجھی سے اس تھان کو دیکھا۔

''اس کا کیا کروں؟''

''اس انگریز ڈاکٹرنی کو دے کے آؤ۔ چچی نے گفٹ کیے ہیں۔''

''میں کیوں دوں؟ خود دے کے آؤ۔'' ریشم کو کپڑوں کی پڑی تھی۔ اس کا حشر دیکھو کیا ہو رہا تھا۔ کوئی انفیکشن ہو گیا تو؟ ریشم نے اس کا انکار سن کے ناک چڑھالی۔

''میں بھی نہیں جا رہا۔ بڑا ہی گندی لڑکی ہے۔ مجھے لگتا تھا شہری سے آئی ہے کوئی تمیز ہو گا۔ کوئی تہذیب ہو گا لیکن نہیں..... پورا کمرہ..... تمہیں پتہ ہے پورا کمرہ اس نے تہس نہس کر دیا ہے۔ وہ تو حویلی کا عالیشان کمرہ لگتا ہی نہیں۔'' ریشم نے اسے گھیرنا شروع کیا۔

''کک..... کیا ہوا کمرے کو؟'' گل نے سانس روک کے پوچھا۔ سارے غم بھول گئے، یاد رہا تو بس کمرہ۔

''میں صبح گیا تھا۔ مت پوچھو۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ چادر۔ تکیے۔ کشن۔ کتابیں۔ سچ کہوں گل، میں نے آج تک اس کمرے کی ایسا حالت نہیں دیکھا تھا۔'' ریشم نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ گل کے معدے میں تتلیاں گھوم رہی تھیں۔ ایک طرف پلوشہ اور دوسری طرف عبادہ۔ اس نے ریشم کے ہاتھ میں موجود تھان جھپٹ لیا اور ہاتھوں میں زور سے بھینچا۔ ''دیکھ کے آتی ہوں میں اسے.....'' وہ جارحانہ انداز میں کہتی باہر نکل گئی۔

"چہرے پر دوائی لگالینا ورنہ خارش ہو جائے گی۔" ریشم بھاگ کے دروازے کے پاس آ کے چلائی۔
"دادی نے وہ کمرہ آپ کو صاف کرنے کا کہا تھا ریشم باجی۔" معصوم سی بچی نے ناک بسور کے کہا۔
"چپ کرو۔ دادی کی چمچی۔" وہ اسے جھڑک کے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

بیڈ کی چادر پر بے شمار سلوٹیں تھیں۔ کچھ تکیے فرش پہ پڑے تھے اور کچھ اوپر۔ صوفوں کے کشن بھی ادھر ادھر ایسے گرے تھے جیسے کسی نے کشن کی بارش کر دی ہو۔ کتابیں بھی یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بازوؤں پر لاتعداد کیلاشی جوڑے ڈالے، کندھا دروازے سے لگائے، سامنے بیڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر صدمہ تھا۔
عبادہ نہا کے باہر نکلی۔ نیلی قمیص کے نیچے چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کو سفید تولیے میں لپیٹا تھا۔ وہ ہاتھوں سے چہرہ رگڑتی جب قدم قدم چل کے مرکزی عرشے میں آئی تو وہاں دروازے کی چوکھٹ میں گل کو کھڑا دیکھا۔ وہ حیرت سے اس کے پاس آئی۔
"کیا ہوا؟"
اس نے تشویش سے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی تھی جہاں دانے نظر آ رہے تھے۔
گل نے صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے گہری سانس لی۔ "کچھ نہیں۔ یہ کپڑے دیے ہیں چچی نے۔ ان کا کہنا ہے آپ یہ پہنیں۔ ان کے روایتی لباس ہیں۔ آپ پہ اچھے لگیں گے۔" وہ سارے کپڑے عبادہ کی بانہوں میں ڈال کے آگے آئی اور فرش سے کشن اٹھانے لگی۔
"لیکن میرے پاس کپڑے ہیں گل۔ میں لائی ہوں۔" وہ کپڑوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بولی۔
"میں کچھ نہیں جانتی۔ انہوں نے کہا آپ کو دے دوں تو لے آئی۔" اس نے لڑکھڑا کے چلتے ہوئے سارے کشن اٹھائے اور صوفوں پر سیٹ کر کے رکھنے لگی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بہت بھاری ہیں۔'' اس نے ایک جوڑے کا پلو اٹھایا اور کڑھائی پہ انگوٹھا پھیرا۔'' اور کامدار بھی..... میں انہیں کیسے پہنوں گی؟ میں نے کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنے.....''

''پہلے ایسے کمرے میں بھی کہاں رہی ہوں گی آپ۔'' گل بڑبڑائی لیکن عبادہ نے نہیں سنا۔ وہ کپڑوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ چچی نے یہ کیوں بھجوائے، وہ بھی اتنے سارے؟ یہ گفٹ تو نہیں ہو سکتے تھے پھر..... یکدم اس کے ذہن میں کچھ کوندا..... چچی سے ہر ملاقات۔ ان کی سکین کرنے والی نظریں۔

''ہوں.....'' اس نے گہری سانس خارج کی۔ ''انہوں نے مجھے پینٹ شرٹ میں دیکھا ہے۔ سوری مجھے اندازہ نہیں تھا سب کو اتنا برا لگ جائے گا۔ پینٹ شرٹ تو سب ہی پہنتے ہیں۔ اس کے بغیر تو میرا گزارا ہی نہیں ہوتا۔ یہ میری چوائس ہی نہیں میری عادت بھی ہے۔ مگر مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ یہ علاقہ.....''

''آپ کا فون بج رہا ہے۔'' گل نے بیڈ کے تکیے پر ہاتھ مار کے پھلاتے ہوئے غیر دلچسپی سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں..... کیا؟'' وہ جیسے چونک گئی تھی۔

گل نے اس کا فون اٹھا کے اسے دکھایا۔ ''آپ کا فون وائبریشن پہ ہے اور بج رہا ہے۔''

''کیا.....'' اس نے کپڑے میز پہ پٹخے اور تیزی سے اس کی طرف لپکی، اس سے فون جھپٹ لیا۔ ''بھائی کا فون ہے۔ ویڈیو کال ہے۔'' وہ بے یقینی سے کہہ رہی تھی۔ سگنل اچانک آ جائیں گے، اسے اندازہ نہیں تھا۔ ''میں اٹینڈ کر کے آتی ہوں۔'' وہ خوشی سے کہتی بالکونی میں چلی گئی۔ گل سر جھٹک کے چادر درست کرنے لگی۔

پاگل عورت!

انگلی پھیر کے اس نے کال اٹھائی تو چند ثانیے بعد احمد کا چہرہ اسکرین پہ ابھرا۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ.....'' اس نے تمکنت سے کہا۔

''ہائے۔ کیسے ہیں آپ؟'' وہ چہک کے بولی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ جب سے گئی ہو کوئی اطلاع نہیں دی۔ کال کیوں نہیں کی ہمیں؟'' وہ خفگی سے بولا۔ اس وقت وہ جم میں تھا۔ موبائل سامنے کسی مشین میں پھنسا رکھا تھا اور کانوں میں ائیر پوڈز تھے۔ وہ کسی سیٹ پر براجمان، ایک ہاتھ سیٹ پہ رکھے دوسرے سے ڈمبلز اٹھا کے مسلز پھلا رہا تھا۔

''سگنلز نہیں تھے بھائی۔ یہاں نیٹ ورک کا ایشو ہے۔''

''اوہ.....کوشش کرو ہم سے دن میں ایک بار رابطہ کرو۔ اتنا دور اکیلے بھیجا ہے تمہیں، ہمیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولا۔

''جی بھائی۔ میں پتہ کرتی ہوں یہاں کونسی سم چلتی ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ احمد تسلی سے مسکرایا۔

''اور بتاؤ کیسے گزر رہے ہیں دن؟ گھوڑے کیسے ہیں تمہارے؟''

''ابھی تک تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں رپورٹس دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتہ ان میں کچھ clue مل جائے۔''

''بیسٹ آف لک دین!'' وہ مسکرایا۔

''تھینک یو۔'' اس نے سر خم کیا۔ دو دن بعد وہ احمد کو دیکھ رہی تھی جو پسینے میں شرابور ہونٹوں کو گول کر کے گہری گہری سانسیں نکال رہا تھا۔ گل کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑا

تھا جس سے وہ میزوں پر مار رہی تھی۔

''چترال کا موسم کیسا ہے؟ سردی وردی ہے یا لاہور جیسا ماحول ہی ہے۔'' احمد نے ہنس کے پوچھا۔

''یہاں بہت سردی پڑتی ہے بھائی۔ رات کو رضائی استعمال کرتے ہیں ہم سب۔ صبح بھی اتنی ٹھنڈ ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میں چترال نہیں مری آئی ہوں۔'' وہ مزے سے بولی۔

''اچھا..... گلگت کے قریب جو ہے یہ علاقہ۔ جب ہی۔''

''ہوں۔ آپ کو میں حویلی دکھاؤں؟'' وہ چمک کے آگے ہوئی۔

''اوہ ہاں۔ امی نے بتایا تھا کہ تم کسی حویلی شویلی میں رہتی ہو جس میں مردان اور زنان خانے ہیں۔ کوئی دو سو کمرے ہیں اور چار ہزار لوگ رہتے ہیں وہاں؟''

''بھائی!'' وہ برا منا کے بولی۔ ''سو کے قریب کمرے ہیں اور تین سو لوگ رہتے ہیں۔''

''تین سو لوگ تمہیں کم لگتے ہیں؟'' احمد نے صدمے سے پوچھا۔

عبادہ نے فون چہرہ کے قریب کیا پھر کمرے میں کارپٹ صاف کرتی گل کو دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''بھائی..... یونو وہاٹ..... یہ تین سو لوگ ایک ہی خاندان ہے۔'' اس نے انگریزی میں کہا تھا مبادا گل سمجھ نہ سکے۔

''وہاٹ.....'' احمد نے ڈمبلز نیچے کر کے اسے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

''یس۔ ہر مرد کے دس بیس بچے ہیں۔ میں سوچتی ہوں یہ لوگ گنتے کیسے ہیں اور ان کو پتہ کیسے چلتا ہوگا کہ ان کا بچہ کونسا ہے؟'' وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے کھی کھی کرنے لگی۔ احمد کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔ گل اپنے لے میں کارپٹ صاف کر رہی تھی۔

''اور تو اور یہاں مرد عورتوں سے دور رہتے ہیں اور جب کوئی مرد آتا ہے تو سب پردہ کرتی

ہیں۔ایسے پلو کھینچ لیتی ہیں۔''اس نے تولیے کا پلو چہرے پہ کھسکایا۔

''ہاہاہاہا۔اوہ گاڈ.....تم اپنا خیال رکھو۔اس تین سو کی فوج میں گم نہ ہوجانا۔''احمد نے اسے تنبیہہ کی۔

''میں نہیں گم ہوں گی۔میں تو شہری پیس ہوں۔الگ دکھتی ہوں۔یہ لوگ تو ایک جیسے کپڑے پہنتے ہیں۔میرے ساتھ دو لڑکیاں کھل کے بات کرتی ہیں اور جب دونوں سامنے آتی ہیں تو میں پہچان نہیں پاتی کہ کونسی ہے۔اٹس ڈیفیکلٹ.....''

''اوپس!''

''خیر یہ حویلی بہت پیاری ہے اور میرا کمرہ.....''وہ جھٹ پٹ کھڑی ہوگئی۔''اف بھائی۔سو یگ ہے اپنا۔آپ دیکھیں گے تو کہیں گے کس مغل بادشاہ کی مہمان خاص ہو تم عبادہ سلیم۔''وہ کمرے کے اندر آ گئی۔

گل اب کپڑا ان لکڑی کے چکور ٹکڑوں پر مار رہی تھی جس پہ نقش کھدے تھے۔اس کی صفائی ایسی تھی جیسے یہ تمام چیزیں اس کی قدیم وراثت ہوں۔وہ جس نفاست اور محبت سے صاف کر رہی تھی۔اس کے پیچھے چچی کا حکم تو پوشیدہ نہیں ہوسکتا تھا۔

قطعی نہیں!

''یہ دیکھیں یہ مغلئی بیڈ.....یہ صوفے.....یہ پردے.....یہ پینٹنگز.....اف اف.....''وہ شان سے بتا رہی تھی اور احمد فون ہاتھ میں پکڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔''میں اسے کمرہ نہیں کہتی بھائی۔میں اسے اکبر بادشاہ کی آرام گاہ کہوں گی۔اس کی ویڈتھ (وسعت) دیکھیں اور یہ کھڑکیاں۔بھائی ایسی لکڑی کی کھڑکیاں لاہور میں ہوتی ہیں۔ہے ناں؟ چاندنی چوک اور دہلی گیٹ۔یاد آیا۔''وہ چمک کے پوچھنے لگی۔

''واؤ.....فیبیولس (شاندار)۔''

''ہے ناں۔اور یہ ویو دیکھیں۔''اس نے کھڑکی کے پردے سرکائے اور کیمرہ بیک کیا۔اب احمد کوہ ہندوکش کے پہاڑوں پر اترتی سنہری روشنی کو دیکھ سکتا تھا۔وہ چترال کی سرسبز وادی میں جڑے مخروطی چھتوں کے گھروں کو دھوپ میں سینکتا دیکھ رہا تھا۔اس کے بھنویں خوشگوار حیرت سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

''ہے ناں امیزنگ؟''

اس نے کیمرہ بدل کے پوچھا۔وہ گل کی وجہ سے انگریزی میں بات کر رہے تھے۔

''کمال ہے۔تمہارے تو مزے ہو گئے ہیں۔''احمد نے جل کے کہا۔

''اس لیے تو کہہ رہی تھی جانے دیں۔''وہ شانے اچکا کے بولی۔

''ہاہاہا۔تمہیں پتہ تھا وہاں یہ سب ہوگا۔''احمد اب جھک کے بیگ سے کچھ نکال رہا تھا۔جب ہی اس کا کیمرہ بہت ہل رہا تھا۔اس کے فون میں تصویر بار بار اٹک رہی تھی۔

''آپ نے میرا واش روم نہیں دیکھا۔وہ کتنا بڑا ہے۔میں دکھاتی ہوں۔یہ دیکھیں۔''اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔واش روم واقعی کمال کا تھا۔الگ باتھ ٹب تھا جو نیچے سے لکڑی کا تھا اور اندر سے چینی کا۔یہاں بھی اس پر نقش کھدے ہوئے تھے۔ایک طرف ضخیم آئینہ لگا ہوا تھا جس کے آگے واش بیسن تھا اور فلک بوس الماریاں مغربی دیوار میں نصب تھیں۔

''نائس.....''احمد نے پذیرائی کی۔

''یو نو وہاٹ بھائی۔یہاں ہر چیز لکڑی سے بنی ہے اور اس لکڑی پر ایسے امیزنگ ڈیزائن کھدے ہوئے ہیں کہ توبہ۔میں تو حیران ہوں۔کس کارپینٹر سے کروائے ہوں گے یہ کام۔''

''پرانی حویلی ہے۔کسی پرانے کاریگر نے کر دیے ہوں گے۔''احمد تولیے سے پسینہ پونچھتے

ہوئے کہنے لگا۔

''بھائی جو بھی تھا۔'' وہ باہر نکلی۔ ''بڑا ہی کمال کا آرٹسٹ تھا۔ ٹرسٹ می۔'' وہ سراہے بنا نہیں رہ سکی۔

گل دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ عبادہ فون لیے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی اور سر سے تولیہ کھینچ کر الگ کر کے بیڈ پر پھینک دیا۔

''اور سنائیں۔ میری یاد آ رہی ہے یا میرے بغیر زندگی آسان ہو گئی ہے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''دوسرا آپشن.....'' احمد نے شانے جھٹکے۔ عبادہ کا منہ کھل گیا۔

''آئی ہیٹ یو.....'' وہ منہ پھلا کے بولی۔ گل اس کا تولیہ اٹھا رہی تھی۔ عبادہ نے چونک کے دیکھا اور پھر یکدم شرمندگی نے اسے گھیر لیا۔

''گل.....'' اس نے روکنے کی کوشش کی لیکن گل تولیہ اٹھا کے بالکونی میں چلی گئی تھی اور اب ریلنگ پر اسے پھیلا رہی تھی۔ اس کا سر خجالت میں جھک گیا۔ کتنی چیپ حرکت تھی!

''اچھا سنو..... ایک بات کرنی تھی۔'' احمد گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھا۔

''کیا بھائی؟'' وہ توجہ سے آگے ہوئی۔

''میں نے صا.....'' اس سے پہلے کہ احمد کچھ بولتا۔ عبادہ کی اسکرین اٹک گئی۔

''بھائی؟ ہیلو؟'' وہ فون کو اونچا کر کے بولی۔ تصویر اسی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور بازو اوپر کر کے سگنلز پکڑنے لگی۔ ''ہیلو بھائی آپ مجھے سن رہے ہیں؟ ہیلو۔''

وہ فون لے کے باہر آ گئی۔ اسکرین ہنوز پھنسی رہی۔ دفعتاً کال کٹ گئی اور سگنلز کا آپشن بلاک ہو گیا۔ اس پہ ایک کراس آ گیا۔ اس نے عام نیٹ ورک سے فون ملایا لیکن وہ بھی کٹ گیا۔

''اوہ میرے خدا.....'' اس نے غصے سے فون کو دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' گل نے پوچھا۔

''سگنلز..... سگنلز چلے گئے ہیں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' (اچھا ہوا۔ گڈ)

''چلے کیوں گئے؟ بھائی کچھ بتا رہا تھا۔'' وہ ہراساں ہوگئی۔

''کونسی سم ہے آپ کے پاس؟''

''وارد۔''

''پھر تو یہ سگنلز اتنے ہی چلنے تھے۔'' وہ جھک کے پودوں کی شاخوں کو چھونے لگی۔

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹکی۔

''مطلب یہاں وارد کے سگنلز بارش کی طرح ہیں۔ یعنی کبھی کبھی برستے ہیں۔ اب جو چلے گئے تو کچھ دنوں بعد ہی آئیں گے۔''

''کچھ دنوں بعد؟'' اس نے صدمے سے دہرایا۔ ''مگر میں گھر والوں سے بات کیسے کروں گی؟''

''گھر کے فون سے کر لینا۔''

''وہ کہاں ملے گا؟''

''کسی مرد کے پاس۔'' گل سرد مہری سے کہتی سر جھٹک کے باہر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے ناشتہ کر لیا تھا۔ اب ایک کپ چائے ہاتھ میں لیے وہ راہداریوں سے صحن میں اتری سیڑھیوں پہ آ کے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ جانے احمد کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ سگنلز نہیں تھے۔ فون ڈیڈ تھا۔ بالکل بند۔ وہ اب کیسے بات کرے گی۔ وہ اسی پر سوچ انداز میں پہلی سیڑھی پر

بیٹھ گئی۔اس سے نیچے سیڑھی پر گل بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے چہرے پر کوئی کریم لگی ہوئی تھی جس کا آئل اس کے گالوں پہ چمک رہا تھا۔اس کے پہلو میں گول سا پیالہ پڑا ہوا تھا جس میں زرد رنگ کا تیل پڑا تھا۔وہ تیل میں انگلیاں ڈبوتے ہوئے تلوؤں میں مساج کر رہی تھی۔اس کے چہرے پر ایک غضب تھا۔ایک انتہائی غضب۔وہ اچٹتی نظروں سے سامنے موتی ٹانکتی پلوشہ کو دیکھ رہی تھی جو بی جان کے پلو میں دبک کے بیٹھی ہوئی تھی۔وہ بھی گل کو اکساتی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ اب آؤ۔مارو ناں۔ہمت ہے بی جان کے سامنے ہاتھ لگانے کی؟ آئی بڑی۔ہونہہ۔

''سنو گل۔ایک بات پوچھوں؟''اس نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''پوچھو۔''گل نے پلٹ کر اسے دیکھے بغیر سپاٹ سے لہجے میں کہا۔وہ پلوشہ کو دیکھ رہی تھی۔

''ابتہاج تمہارا کیا لگتا ہے؟''اس نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔

''کزن۔''

''پلوشہ؟''

''کزن۔''

''کل جب رات ابتہاج آیا تھا کچن میں تو سب نے پردہ کیا تھا۔تم، پلوشہ اور چچی نے نہیں کیا تھا۔کیوں؟''

''پلوشہ ابتہاج کی بہن ہے اور چچی اس کی ماں۔''وہ خشک لہجے میں بول رہی تھی۔مختصر سوال مختصر جواب۔

''اور تم؟ تم کیا لگتی ہو اس کی؟''

اب کی بار گل نے گردن گھما کے اسے دیکھا۔''تمہیں کیا دلچسپی ہے جاننے میں؟''

''نہیں۔بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔غالباً تمہیں اچھا نہیں لگتا وہ۔''

''ٹھیک کہا۔ وہ اس کی بہن اور اس کی ماں، اس کا باپ۔ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔'' ناک چڑھا کے اس نے کروفر سے کہا۔

عبادہ ذرا دلچسپی سے آگے ہوئی۔ ''کیوں؟''

''پتہ نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''کہیں ابتہاج سے تمہارا رشتہ.....''

''وہ ریشم کا شوہر ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی گل تیزی سے بولی۔ عبادہ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اپنی پہلو میں شرمندگی سے سمٹتی وہ پیچھے ہوگئی۔

''آئی ایم سوری.....''

''ہمارا خاندان بڑا ہے بی بی۔ میرے دادا کے بھائی کی بیویوں کے بچے، پوتے، پوتوں کے بچے، میرے داد کے بچے، ان کے بچے اور پھر آگے سے ان کے بچے۔ ہم سب یہاں رہتے ہیں۔ اس حویلی میں۔ اس لیے ہمیں کسی کی بہن، بیٹی ماں یا بیوی بنانے سے پہلے تسلی کر لینا کہ ہم کسی کی کیا لگتی ہیں۔'' گل نے بے مروتی سے کہا تھا۔ عبادہ مزید پانی پانی ہوگئی۔

''سوری۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا۔'' اپنی کلفت چھپاتے ہوئے وہ پیچھے کھسک گئی اور چائے پینے لگی۔

''پلوشے! جاؤ، میرے لیے چائے لاؤ۔'' بی جان نے دھاگا دانت سے کاٹ کے پلوشے کو حکم دیا۔

''میں؟'' پلوشہ جھٹکا کھا کے بولی۔ گل کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چھا گئی۔

''ہاں.....''

''مگر میں.....'' وہ منمنائی۔

''کیا سوچ رہی ہو پلوشے؟ دادی جان نے چائے منگوائی ہے۔ لے کے آؤ اور یہاں سے ہوتے ہوئے کچن میں جاؤ۔'' گل نے تیل کی پیالی پرے دھکیلی اور سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ (خود کو

تیار کیا۔)

پلوشے نے یہاں وہاں دیکھا۔وہاں باقی لڑکیاں ضرور تھیں لیکن سب ہی کام میں جتی ہوئی تھیں۔کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کر سکتا۔ویسے بھی وہ چھوٹی تھی اور چترال میں مقامی روایت کے مطابق چھوٹا بڑے کو کسی کام کا نہیں کہہ سکتا تھا۔وہ بادل نخواستہ اٹھی اور ایسے چلنے لگی جیسے شامت آنے پر شاگرد استاد کے سامنے چلتا ہے۔گھس گھس کر قدم لیتے ہوئے۔

گل سر اٹھا کے اس کو محظوظ انداز میں دیکھ رہی تھی۔پلوشہ خوفزدہ سی چلتی آگے آئی۔اس سے چند قدم دور رک کے اس کو دیکھا۔

''ہاتھ بھی مت لگانا گل.....''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' گل نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔پلوشہ کے قدم مزید چھوٹے ہو گئے۔وہ ایسے محتاط انداز میں اس کے سامنے سے گزری جیسے کانٹے یا کیچڑ سے بچ کے گزرتے ہیں۔گل نے اسے کچھ نہیں کہا۔گزرنے دیا۔وہ سیڑھیاں دھیرے دھیرے پھلانگ کے اوپر چڑھی ،آخری سیڑھی پر رک کے پیچھے دیکھا۔گل مسکرا رہی تھی۔وہ تیزی سے اندر کی سمت بھاگ گئی۔

گل نے محظوظ انداز میں بالوں کی لٹ نکالی اور انگلی پہ لپیٹنے لگی۔وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

''گل۔'' عبادہ نے دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔

''میں نے روم میں کچھ انگریزی ادب کی کتابیں دیکھی ہیں۔کافی ساری۔یہاں کوئی انگریزی ناول پڑھتا ہے کیا؟''

''ہاں.....''

''کون؟''

''میں۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''تت.....تم.....۔؟'' عبادہ بوکھلائی۔

''ایم اے انگلش۔اسلامیہ کالج پشاور۔گولڈ میڈلسٹ۔''

''تم.....؟'' عبادہ نے چائے کی پیالی نیچے رکھی اور بے یقینی سے آگے ہوئی۔گل نے گردن موڑ کے اس کے متحیر چہرے کو دیکھا۔

''کیوں؟ کیا میں ایم اے انگریزی نہیں کر سکتی؟ یا پھر آپ شہری لوگ ہی پٹر پٹر انگریزی بول سکتے ہیں؟'' یہ جملہ اس نے روانی سے انگریزی میں کہا تھا۔عبادہ ساکت رہ گئی۔اس کا لہجہ شاندار تھا۔

''مجھے لگا.....کہ.....''

''کہ میں کالاشی کپڑے پہنتی ہوں۔آنکھوں میں کاجل لگاتی ہوں۔بالوں میں پتلی پتلی چٹیا۔تیل۔کھسے۔زیور۔میں کہیں سے پڑھی لکھی نہیں لگتی۔ہے ناں؟''

''نہیں مگر.....''

''ہمارا گاؤں اس قابل نہیں کہ یہاں سے کوئی پڑھ لکھ جائے۔''

عبادہ کو برا لگا۔''ایسی بات نہیں ہے۔''

''ہمارے سامنے انگریزی میں ہماری برائی کرتی ہیں آپ۔ہم زیادہ ہیں۔بیس تیس بچے۔ہوں؟''

عبادہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔وہ جسے جاہل سمجھ کے اس کے سامنے احمد سے انگریزی میں بات کر رہی تھی۔اسی نے اسے پکڑ لیا تھا۔

''ہم کیسے پہچانتے ہوں گے کہ کونسا بچہ ہمارا ہے؟''

عبادہ نے کھسیا کر دانت نکالے۔''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔تم غلط سمجھ گئی ہو۔یونو،ہم لاہور

میں..... چھوٹی چھوٹی فیملیز.....''

''جانے دو۔ مجھے خود بھی حیرت ہے کہ یہ عوام سبز ستارہ کا ستعمال کب کرے گی۔'' وہ صحن میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کے کروفر سے بولی۔

عبادہ رک گئی۔ کچھ لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر سمجھ آ گئی تو ہنسی..... ''تم کہو تو میں سبز ستارہ والوں کو اس حویلی کا پتہ دے سکتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مشورے، لیکچر اور دوائیوں سے قابو نہیں ہوں گے۔ ان کی روک تھام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' گل نے بے چارگی سے آسمان کو دیکھا۔ عبادہ کھل کے ہنسنے لگی۔ گل نے اسے محظوظ کیا تھا۔

''تو تم ایم اے انگلش ہو۔'' کچھ دیر توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''ہوں۔''

''پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟ آئی مین۔ کچھ بن کے نہیں دکھایا؟ کوئی خواب نہیں تھا کیا۔'' عبادہ کو اس بے باک اور حاضر دماغ لڑکی سے بات کرتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

''نہیں۔''

''تم نے خواب نہیں دیکھا؟ کوئی بھی؟'' عبادہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''خواب کیا ہوتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں۔''

''خواب زندگی ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہیں۔ خوابوں کے بغیر انسان ادھورا ہے گل۔ کھوکھلا ہے۔ خالی ہے۔''

''پھر مجھے ایسا ہی سمجھو۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں مسکرائی۔

''نہیں۔'' عبادہ نے تیزی سے سر نفی میں ہلایا۔ ''تم ایسی لڑکی نہیں ہو جو خواب نہ دیکھے۔''

''اچھا؟ کیسی لڑکی ہوں میں؟'' اس نے شرارت سے گال پہ ہاتھ رکھا۔

''تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مردانی ہو۔ سچ کے سامنے ڈٹ کے کھڑی رہنے والی لڑکی۔''

''اور یہ سب تمہیں ایک ملاقات میں پتہ چل گیا۔''

''مجھے ایک ملاقات میں بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ڈونٹ وری۔'' اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''کیوں؟ کوئی جادوئی چھڑی ہے تمہارے پاس، یا آئینہ جو تمہیں ماضی، حال اور مستقبل بتا دیتا ہے۔'' وہ گردن گھما کے اسے دیکھ رہی تھی پھر یکدم اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور عبادہ کے پیچھے دیکھنے لگی۔

''میں انسانوں کی شخصیات پڑھ سکتی ہوں۔''

''اچھا.....'' وہ پیچھے دیکھ رہی تھی جہاں پلوشہ ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑے چلی آ رہی تھی۔ وہ اپنی لے میں چل رہی تھی۔ اس کا دھیان گل کی طرف نہیں تھا۔

''پھر تو آپ اعصابی طور پر بھی کافی مضبوط ہوں گی؟'' گل نے ٹھوڑی سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔'' وہ فخر سے مسکرائی۔

''ہوں۔ گڈ.....'' گل سیدھی ہو گئی۔

اسی لمحے پلوشے نے سیڑھی پر قدم رکھا، وہ سامنے دیکھ رہی تھی اور جب ہی..... جب ہی..... کوئی چیز سامنے آئی، پیر کے نیچے گل کا پیر، قدم لڑھکے، توازن بگڑا اور وہ..... وہ ایک..... دو..... تین..... سیڑھیاں چھوڑتی..... نیچے فرش میں ٹھاہ..... کر کے جا لگی۔ ایک دلخراش چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ چائے کا کپ آگے چھلکا اور ٹوٹ کے کرچی کرچی ہو گیا۔

''بسم اللہ.....'' گل اداکاری سے کہتی اٹھ کے اس کے پاس آ گئی۔ عبادہ بھی گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

گل نے جھک کے اس کو سیدھا کیا۔

''کیا کرتی ہو۔ دیکھ کے چلا کرو۔'' وہ اسے خفت سے پچکارنے لگی۔

پلوشہ کی سانسیں تتر بتر ہو رہی تھیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ گھٹنوں پہ بیٹھ کے ہتھیلیاں جھاڑنے لگی۔ اس کا منہ بری طرح فرش سے رپٹ گیا تھا۔ دفعتاً کسی کی موٹی مخروطی انگلیاں اس کے بازو کے گرد حائل ہوئیں اور اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا۔ گل نے چونک کے اس وجود کو دیکھا۔ وہ ابتہاج تھا۔ وہ پلوشے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ گل کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''دیکھو کتنا خراب کر دیا حلیہ..... دھیان کہاں تھا تمہارا؟'' بی جان برہمی سے بولیں۔ پلوشہ نم آنکھوں سے گل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی کہنیاں کرچ گئی تھیں۔ گھٹنے چھل گئے تھے۔ اسے بہت درد ہو رہا تھا۔

''پلوشے! تم بھی ناں ابھی تک بچی ہو۔ دیکھ کے چلا کرو۔ کچھ بھی قدموں کے نیچے آ سکتا ہے۔ کہیں سے بھی ٹھوکر لگ سکتی ہے۔''

''تمہاری.....'' پلوشے دانت کچکچا کے اس کی طرف بڑھی مگر جب ہی ابتہاج نے اسے روک لیا۔ پلوشے نے صدمے سے بھائی کو دیکھا۔ ''بھائی اس نے پیر اٹکایا ہے۔''

''شش.....'' ابتہاج دھیرے سے بولا۔ ''تم اندر جا کے مرہم لگاؤ۔ میں آتا ہوں۔''

پلوشے نے حدت سے آنکھیں بند کر لیں پھر لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی جہاں عبادہ نے اسے تھام لیا اور سیڑھیاں چڑھنے میں مدد کی۔ وہ اوپر چڑھ کے اندر چلی گئی۔

ابتہاج گل کی طرف مڑا۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارا؟'' وہ زِچ ہو گیا تھا۔

''جانے دو..... تم نالائق جان کر کیا کرے گا؟'' وہ شانے جھٹک کے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

ابتہاج نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں۔وہ ہر بار اس کا صبر آزماتی تھی۔کاش.....کاش وہ اس کے ہاتھ آجائے اور وہ ایک لمحے میں ہی سارے حساب کتاب صاف کردے۔کاش.....!

''ابتہاج بچے.....!''بی جان نے اس کے دھیان کو توڑا۔''سب ٹھیک ہے؟''

''جی۔''اس نے سر ہلا کے کہا پھر وہ عبادہ کی طرف مڑا۔''جانوروں کی ڈاکٹرنی.....آپ کو اصطبل نہیں جانا؟''وہ تنفر سے بولا۔

''جانوروں کی ڈاکٹر کو ویٹ کہتے ہیں۔جاہل انسان۔''گل نے پچکارا۔

''اور تمہیں کیا کہتے ہیں؟کو.....''

''کوئین الزبتھ.....''وہ اس کا جملہ کاٹ کے تیزی سے بولی۔ابتہاج ٹھہر گیا۔گل نے آنکھیں گھمائیں۔''اب جاہل پوچھے گا کوئین الزبتھ کون ہے۔کبھی سکول کی شکل دیکھی ہو تو پتہ ہو ناں۔گنوار۔نالائق۔اکڑو۔''

''گل، میں تمہاری.....''اس سے پہلے کہ وہ زہر اگلتا،اس کی نظر گم صم کھڑی عبادہ پہ پڑ گئی۔''کچھ پوچھا ہے میں نے؟''

وہ سر جھٹک کے اندر چلی گئی۔ابتہاج نے واپس گل کو دیکھا۔

''تم بچ کے رہو مجھ سے۔ورنہ کسی دن میں تمہاری ایسی پٹائی کروں گا کہ تم بے ہوش جاؤ گی۔''

''اچھا جی.....ایک منٹ.....بی جان.....بی جان.....''وہ اونچا اونچا چلانے لگی۔

''ہے.....کیا کر رہی ہو۔''وہ بوکھلا گیا۔

''آپ کی شامت لا رہی ہوں.....بی جان.....''

''کیا ہوا گلے؟''

''آپ کا ان پڑھ پوتا مجھے دھمکا رہا ہے۔''وہ لحاظ کیے بغیر بولی۔

''ابتہاج.....'' بی جان کی سختی بھری ٹوک سنائی دی۔ابتہاج نے ضبط سے آنکھیں بند کر لیں۔''ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔''انہوں نے تخت کی سطح تھپتھپائی۔

''جی بی جان۔'' وہ بے بسی سے سانس بھرتا رہ گیا۔گل اس کو بھنویں اچکا اچکا کے فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ابتہاج نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔(تمہیں دیکھ لوں گا۔) گل نے منہ جھٹکا۔(ابھی دیکھ لو۔)

''ابتہاج.....''انہوں نے پھر نام لیا۔

''آیا دادی.....'' وہ تیزی سے پلٹ کے ان کے پاس چلا گیا۔

''کوئی کام تھا کیا؟''انہوں نے پوچھا۔

''ایسے ہی آ گیا۔''اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا..... مجھے لگا کوئی کام ہے۔تم کم کم آتے ہو ناں زنان خانے۔اس لیے۔''انہوں نے فریم اٹھایا اور گوٹا لگانے لگیں۔گل بدستور سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے بال کھول لیے تھے۔وہ اب بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔اس نے سر سے دوپٹہ ہٹا دیا تھا۔

''یہ کیوں کرتی ہیں بی جان؟ آپ کی نظر کمزور ہو جائے گی۔'' ابتہاج نے ان کے ہاتھ سے فریم لے کے ایک طرف رکھا۔

''ابھی ٹھیک ہے میری نظر۔اس باریک سوئی میں، میں نے خود دھاگا ڈالا ہے۔'' وہ فخر سے بتانے لگیں۔

''سچ میں؟''ابتہاج نے گھورا۔

''پلوشے سے پوچھ لو۔وہ تو ساتھ بیٹھا تھا۔''بی جان نے مسکرا کے کہا پھر یکدم ہی ان کی نظر گل پہ پڑی۔وہ تیل میں انگلیاں ڈبو ڈبو کے چمپی کر رہی تھی۔

''اوگلے .....تم کو نظر نہیں آتا ابتہاج یہاں بیٹھا ہے۔'' بی جان بھڑکیں۔

''نظر آرہا ہے دادی۔'' وہ ناک سے مکھی اڑا کے بولی۔

''اگر نظر آرہا ہے تو پردہ کیوں نہیں کر رہا؟ اس کے سامنے بال کھول رکھا ہے۔ اندر جاؤ۔ منہ چھپاؤ اپنا۔ بے حیا لڑکی۔'' وہ بری طرح ڈپٹنے لگیں۔ گل نے تیل کی پیالی ایک طرف رکھی اور اپنے سارے بالوں کو منہ کے آگے کر دیا یوں کہ چہرہ چھپ گیا۔

''اب ٹھیک ہے دادی؟ میرا چہرہ نظر نہیں آرہا۔''

''تو رک.....ایک منٹ.....'' دادی کا ہاتھ تخت کے نیچے پڑی اپنی چپل تک گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی ناتواں کمر کی ہڈیوں کو چٹخا کے سیدھا کرتیں اور اسے چپل مارتیں، وہ اندر بھاگ چکی تھی۔

''چلی گئی؟ رک جاتی بے شرم لڑکی۔ تعلیم نے محرم نامحرم کا فرق نہیں سکھایا تم کو؟ اپنے مرے باپ کا کچھ لحاظ کر لیا کرو بے غیرت۔''

''بی جان.....'' ابتہاج نے ان کے کندھوں کے گرد ہاتھ حمائل کیے۔ ''جانے دیں کیوں مغز ماری کر رہی ہیں۔ وہ کبھی نہیں سدھرے گی۔''

''تو کیا کروں میں؟'' بی جان نے بے بسی سے چپل نیچے پھینکی۔ ''باغی ہو رہا ہے آہستہ آہستہ۔ کسی کی بات نہیں مانتا۔ اگر ہاتھ سے نکل گیا تو؟'' بی جان کو تشویش نے گھیر لیا۔

''ہاں ہاں۔ ٹھیک کہا تم نے دادی۔ میں تو ہوں ہی بے پردہ۔ بے حیا اور آوارہ۔ تمہارے لڑکے تو سارا دن مسجد میں ہوتے ہیں ناں؟ ان کے ہاتھوں میں تو تسبیح ہوتی ہے۔ سارا دن روزے رکھتے ہیں اور ساری رات تہجد پڑھتے ہیں۔ لڑکی دیکھیں تو نظریں جھکا دیتے ہیں۔ بیوی کے علاوہ سب کو بہن سمجھتے ہیں۔ ہے ناں؟'' پودوں کی بیلوں کے اوٹ سے گل نے جھانک کے کروفر سے کہا۔

''چپ کر جا بے حیا لڑکی۔''

''ہاں میں بے حیا۔اس لنگور کو کیا کہیں گے آپ؟ جو مجھے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے؟ بتائیں؟'' بی جان نے جتنی تیزی سے ابتہاج کو دیکھا تھا اتنی ہی تیزی سے ابتہاج نے نظریں نیچے گرائی تھیں۔

''ایک کام کریں دادی۔بجائے اس کے کہ آپ اس اکیلے کے لیے دوسو عورتوں کو پردہ کروائیں، آپ اس کو ہی برقعے میں لے آیا کریں۔اس سے یہ ہوگا کہ ہم عورتوں کے کاموں میں رکاوٹ نہیں آئے گی اور اس کی چھچھوندر جیسی آنکھیں بھی چھپی رہیں گی۔'' اس نے نہایت خلوص سے مشورہ دیا۔

''تو رک..... تجھے بتاتی ہوں میں.....'' بی جان تخت سے اٹھنے لگیں۔وہ اندر بھاگ گئی۔

ابتہاج نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کے واپس بٹھایا۔''بیٹھیں۔اس کی تو عادت ہے غصہ دلانے کی۔آپ پرسکون ہوجائیں۔آپ کا بی پی بڑھ جائے گا۔''

''بی پی نہیں بڑھے گا۔ہم سب پاگل ہوجائیں گے۔پاگل۔اس لڑکی کی وجہ سے۔'' وہ سر پکڑ کے ماتم کناں انداز میں بولیں۔ابتہاج نے گہری سانس لی۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا وقت تھا۔وہ ہاتھ میں سیاہ ڈائری اٹھائے اپنے بنائے ہوئے نوٹس کو غور سے پڑھ رہی تھی۔اس نے زرد رنگ کی قمیص کے نیچے سفید چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔آستینوں میں بھی چونٹیں تھیں۔بالوں کی پونی بنائی ہوئی تھی۔

وہ طارق سر کو فون کر کے ان کو گھوڑوں کی علامات کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔وہ سینئر ڈاکٹر تھے ضرور کچھ مشورہ دے سکتے تھے لیکن سگنلز ہنوز بند تھے۔سو رابطہ نہیں ہوسکا۔احمد کو لے کر اس کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ اف یہ سگنلز بھی ناں۔

اس نے سر جھٹک کے فائل کو چہرے کے آگے کیا اور پڑھنے لگی۔اسی لمحے دروازے کے آگے

سے ریشم گزری، وہ آگے گئی، پھر یکدم پیچھے ہوئی اور اندر آ گئی۔

''عبادہ۔''

''ہاں۔'' وہ رک کے ایڑیوں کے بل گھومی۔

''زعفران توڑنے جائے گا ہمارے ساتھ؟'' اس نے پیشکشی نظروں سے دیکھا۔

''زعفران؟ کہاں سے؟'' اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

''نیچے کھیت سے۔ کچھ دنوں میں مہمان آنے والا ہے۔ ان کو شربت میں ملا کے دے گا۔ اگر تم کو جانا ہے تو بتاؤ۔ ہم سب بھی جا رہا ہے۔'' وہ مصروفیت سے کہہ رہی تھی۔ شاید جلدی میں تھی۔

''ٹھیک ہے آ جاتی ہوں۔'' اس نے ڈائری سرہانے کے نیچے رکھی، کراؤن سے اپنا دوپٹہ اٹھایا اور گردن میں لٹکا کے باہر آ گئی۔

زعفران چترال میں کثرت سے پیدا ہونے والی فصل ہے۔ عموماً یہاں کے رہائشی اسے گھر کے بالکل قریب کاشت کرتے ہیں تاکہ جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کے کھیت بڑے نہیں ہوتے بلکہ یہ کھیتیاں ہوتی ہیں، چھوٹے چھوٹے سلائس جس میں ان کی باریک ڈنڈیوں پر پھول اگتے ہیں۔ ان لوگوں نے حویلی کے پچھواڑے موجود کھائی سے نیچے قطعے میں زعفران لگایا ہوا تھا۔ اس قطعے تک سیمنٹ کی سیڑھیاں جاتی تھیں۔ یہ ایک کوہ دامنی قطعہ تھا۔ اس سے آگے بھی کھائی ہی تھی۔

وہ چھ لڑکیاں تھیں۔ وہ دونوں پیچھے تھیں جب کہ وہ چار آگے، انہوں نے کمر پر ٹوکریاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ سورج کی تیز تپش ان پر پڑ رہی تھی۔ قطعے میں پتلی پتلی ڈنڈیوں والے زعفران کے ہلکے جامنی پھول کھلے ہوئے تھے۔ کھیت میں پیر رکھنے کی جگہ نہیں تھی لیکن وہ پودوں کو ہاتھوں سے پیچھے کرتیں، پیر کے لیے مناسب جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہر طرف زعفران کے پھولوں

کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سبزے میں اُگے جامنی پھول ہوا کے دوش پہ لہلہا رہے تھے۔ وہ پہلی بار زعفران کے کھیت دیکھ رہی تھی۔

چاروں لڑکیوں نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی اور کھیت میں چاروں طرف پھیل گئیں۔ وہ ٹوکریوں کو کمر پہ لاد کے، بڑی نرمی سے پھول توڑتیں پھر اسے ٹوکری میں ڈال دیتیں۔ ریشم نے جھک کے پھولوں کی کئی ڈنڈیاں توڑیں اور گچھا سا بنا دیا۔ عبادہ نے دو انگلیوں سے ایک پھول توڑا پھر اسے ہتھیلی میں لیا اور نتھنوں کے قریب کیا۔ مہکتی ہوئی روئیدہ خوشبو نتھنوں میں داخل ہوئی۔

''خوشبودار ہے ناں یہ؟'' ریشم پھول اور ڈنڈیاں الگ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔

''یہ ہوتا ہے زعفران۔ پھول کے اندر یہ جو لمبی لمبی سی ڈنڈیاں ہیں۔ ان کو کہتے ہیں۔'' ریشم پھول کے کارپل کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے وہ پتلی پتلی تیلیاں توڑیں پھر انگوٹھے اور انگلی میں اسے مسلا۔ اس کی انگلیوں پہ زرد رنگ چڑھ گیا۔

ریشم عبادہ کو چھوڑ کے کھائی کی طرف آئی اور سرے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ڈنڈیاں پہلو میں رکھیں اور پھول گود میں۔ وہ ان سے کچھ بنا رہی تھی۔ عبادہ فون نکال کے کھیت کی تصویریں کھینچنے لگی۔ کھائی سے مری کی پہاڑیوں کی طرح چیڑ اور صنوبر کے درخت نکل رہے تھے۔ ان کی شاخیں اوپر تک آ رہی تھیں۔ یہاں سے حویلی کی طرف آتی ہوئی سڑک کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ نیچے درخت تھے اور کچا کچا راستہ بھی بنا ہوا تھا جس پہ شاید کم ہی لوگ چڑھتے ہوں گے۔

وہ چند تصویریں اتار کے ریشم کے پاس آئی اور اس کی گود میں جھانکا۔

''کیا بنا رہی ہو؟''

''تمہارے لیے تحفہ۔'' ریشم ڈنڈیوں سے گول فریم بنا رہی تھی۔

''کیسا تحفہ۔'' عبادہ اس کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔

''بننے پر خود دیکھ لینا۔'' وہ نرمی سے مسکرائی۔ عبادہ نے سر ہلایا اور نیچے دیکھنے لگی۔

وہ اس پرسکون اور روح افروز نظارے کو دیکھ رہی تھی جس میں نظر کی حد تک شاداب کھیتیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ قدرتی نظاروں اور دل موہ لینے والے شاہکار کو دیکھتے ہوئے آنکھیں نہیں تھک رہی تھیں۔ پہاڑوں کو چیر کے ان کے دامن میں لوگ آباد تھے، روئے فرش پر بنے اینٹ پتھر کے گھر ،خاموشی سے بہتے دریا، چہچہاتے ہوئے پرندے اور میٹھی خوشبو والے زعفران۔ دل مہک اٹھا تھا۔

''بہت حسین جگہ ہے یہ۔'' وہ کھل کے سانس لینے کے بعد بولی۔

''لاہور میں نہیں ہوتیں ناں ایسی جگہیں؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔ ایک تو اس کا لاہور اور چترال کا موازنہ۔ اس نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا۔

''نہیں۔''

''ویسے تم لاہور میں کہاں رہتا ہے؟'' وہ اب گول سے فریم میں پھول لگا رہی تھی۔

''ڈی ایچ اے۔''

''ایم ایم عالم روڈ دیکھا ہے؟''

''ہاں۔ کیوں؟'' عبادہ ٹھٹکی۔

''میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس لیے پوچھا۔'' وہ مسکرا کے بولی۔ عبادہ نے سر کو جنبش دی۔ ریشم نے سبز ڈنڈیوں کے فریم میں جامنی پھول لگائے پھر زعفران کو انگلیوں میں مسل کے فریم کی ڈنڈیوں پر رگڑنا شروع کیا تاکہ خوشبو بھی آئے۔

''ایک بات بتاؤ ریشم۔''

''پوچھو۔''

''یہاں تم لوگوں نے چاردیواری نہیں بنائی۔کوئی کانٹے دار تار بھی نہیں ہے۔جنگلی جانور نہیں آتے کیا؟''اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آتے ہیں لیکن وہ خوبصورت لڑکیوں کو کچھ نہیں کہتے۔'' یہ گمبھیر آواز کسی اور کی تھی۔اس نے چونک کے گردن پیچھے گھمائی۔وہی خوبرو نوجوان مسکراتا ہوان کی طرف آرہا تھا۔نیلی جینز پہ گہری سبز ٹی شرٹ پہنے،آستین کہنیوں تک فولڈ کیے،بال جیل سے جمائے۔لمبے لمبے ڈگ بھرتا قریب آگیا۔عبادہ کھڑی ہوگئی۔لڑکیوں نے فوراً سر پہ گھونگھٹ کھینچ لیے۔

''ہائے،میں ریشم کا بھائی۔غاذان خان۔پی ایچ ڈی ہولڈر ان اکنامس فرام لندن۔''اس نے روانی میں کہتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔اس کے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی میں سیاہ انگوٹھی تھی جس کے اوپر''G'' لکھا ہوا تھا۔

''ہائے۔آئی ایم عبادہ سلیم۔ویٹ ڈاکٹر فرام لاہور۔''اس نے مسکرا کے اسے ہاتھ دیا۔

''عبادہ؟''غاذان نے متاثر کن انداز میں دہرایا۔''یونیک.....کیا مطلب ہے اس کا؟''

''عبادت کرنے والی۔''

''نائس نیم۔''وہ سراہ کے بولا۔

''تھینک یو.....''عبادہ نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔اس کی پرفیوم کی خوشبو بہت تیز تھی۔وہ کوئی مہنگا اور برانڈڈ پرفیوم لگ رہا تھا۔اس نے زعفران کی خوشبو کہیں دبا دی تھی۔

''میں معذرت چاہتا ہوں عبادہ۔آئی ایم ریلی ویری سوری۔میں نے آپ کی گاڑی روکی۔دراصل مجھے آپ سے ملنا تھا۔مجھے آپ نظر آگئیں تو سوچا وہیں مل لیتے ہیں،مجھے اس کے بعد ڈیرے جانا تھا۔آئی ایم سوری۔آئی ایم ریلی سوری۔آئی جسٹ کانٹ ریلائز دیٹ کہ وہ سڑک ہے۔آئی ایکسٹریملی سوری۔''وہ بہت گلٹ سے کہہ رہا تھا۔عبادہ کو شرمندگی محسوس ہوئی۔

''اٹس اوکے۔کوئی بات نہیں۔آپ شرمندہ نہ ہوں۔''

''نہیں۔مجھے گھر آئے مہمان سے عزت سے پیش آنا چاہیے تھا۔میں نے بالکل لحاظ نہیں کیا۔آئی ایم ریلی سوری۔''اس کے لب و لہجے میں کوئی مقامی تاثر نہیں تھا۔وہ شفاف اردو بول رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔''وہ نرمی سے بولی۔

'' آپ ہمارے گھوڑوں کا علاج کرنے آئی ہیں۔ویٹس اپریشیٹڈ۔لاہور بہت دور ہے ایک اکیلی لڑکی کا یہاں آنا کمال ہے۔تھینک یو۔''وہ واقعی ممنون تھا۔عبادہ کی آنکھوں کے سامنے اماں کا جوتا لہرایا اور بازوؤں میں ان دیکھا سی ٹیس اٹھی۔

''یہ تو میرا فرض تھا۔آپ نے بلایا تو مجھے آنا ہی تھا۔''وہ زبردستی سے مسکرائی۔

''خان جی نے مجھے بتایا کہ آپ آنے والی ہیں آپ سے مل لوں۔سوری مجھے وقت نہیں ملا۔اتنی دیر بعد مل رہا ہوں۔ہوپ یو ول ناٹ مائینڈ۔''

''نہیں۔اٹس اوکے۔مجھے پہلے ہی بہت پروٹوکول مل رہا ہے۔''وہ شانے اچکا کے مسکرائی۔

''ریشم سے کہا تھا میں نے کہ آپ کو کسی قسم کی شکایت نہ ہونے دے۔آپ بہت دور سے آئی ہیں۔مہمان ہیں اور ہم مہمانوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔''وہ دل پہ ہاتھ رکھ کے مان سے کہنے لگا۔ریشم کھڑی ہوگئی۔

''میں محسوس کرسکتی ہوں۔''وہ دل سے بولی۔

''تو یہ بھی محسوس کرلو۔''ریشم نے اس کے سر پہ کچھ رکھا۔اس نے چونک کے ہاتھ لگایا۔وہ تاج تھا۔اس نے نرمی سے اتارا۔گول فریم میں جابجا پھول لگے ہوئے تھے۔یک لخت سبز ڈنڈیاں اندر کہیں چھپ گئی تھیں۔وہ بہت نفاست سے بنا گیا تھا۔

''اٹس بیوٹی فل۔تھینک یو۔''وہ مسحور ہوگئی۔

''مینشن ناٹ۔'' ریشم نے بے ڈھنگے انداز میں انگریزی بولی۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔ عبادہ نے فون کا کیمرہ کھولا، تاج سر پہ رکھا۔

''ریشم میری تصویر لو۔'' وہ زعفران کے کھیتوں کے سامنے سر پہ تاج رکھ کے کھڑی ہوگئی۔ ریشم اس کے سامنے فون سے کھچا کھچ تصویریں اتار رہی تھی۔ غاذان ذرا فاصلے پر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کافی زیادہ تصویریں لینے کے بعد اس نے ریشم سے فون لیا اور اسکرین پہ انگلی پھیرتے ہوئے تصویریں دیکھنے لگی۔

غاذان قدم قدم قریب آیا اور گلا کھنکارا۔

''ویل اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم گھوڑوں کے بارے میں بات کریں۔ مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ میں نے سوچا آپ سے بات کرتا ہوا جاؤں۔ بعد میں وقت ملے گا یا نہیں۔'' وہ نرمی سے مسکرایا۔

وہ اپنی حرکتوں پر خائف ہوگئی۔

''شور.....'' اس نے تیزی سے فون بند کر دیا۔

''اوپر لان میں چل کے بات کرتے ہیں۔ وہ جگہ مناسب ہے۔'' غاذان کہتے ہوئے آگے چلا گیا۔ وہ دونوں پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ سیڑھیوں تک آنے کے بعد ریشم لڑکیوں کے لیے رک گئی جب کہ وہ دونوں زنان خانے کے لان کی طرف بڑھ گئے۔

زنانہ لان کا قطعہ بڑا نہیں تھا لیکن خوبصورت تھا۔ چاروں طرف لکڑی کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور درمیان میں گول میز تھی۔ یہ لان صحن کے ایک دروازے کے پار کھلتا تھا جہاں سے کچن کی دراز کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ یہاں گلاب، چنبیلی اور زربلی پھول کی جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں پہ زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول کھلتے تھے۔ یہ جھاڑیاں اس قطعے کے چاروں طرف

اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ باڑ کا کام کرتی تھیں۔ یہاں سے ہندوکش کی پہاڑوں کی محض چوٹیاں ہی نظر آتی تھیں۔

غاذان نے اس کے لیے کرسی کھینچی، وہ چونکی (اتنی عزت؟ پڑھا لکھا لڑکا جو ہے) پھر مسکراتی ہوئے بیٹھ گئی۔

''شکریہ۔''

''نیور مائینڈ۔'' غاذان نے مسکرا کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ عبادہ اسے دیکھنے لگی جو ہلکی ہلکی داڑھی میں بے انتہا ہنڈسم لگ رہا تھا۔ آنکھیں ریشم جیسی ہی تھیں۔ لمبی اور ترچھی، پلکیں البتہ چھوٹی تھیں۔ جبڑے کی لائن پوری طرح ابھری ہوئی تھی۔

''آپ گھوڑوں کو دیکھ کے آ گئی ہیں۔ رائٹ؟'' اس نے پوچھا۔ عبادہ نے فوراً نظروں کا زاویہ بدلا۔

''جی..... معائنہ کر لیا ہے میں نے۔''

''پھر؟ کچھ سمجھ آیا کیا ہوا ہے؟'' غاذان نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''دیکھیں غاذان۔ اس طرح تو میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ میں گھوڑوں کے مرض سے واقف ہوں۔ جہاں تک مجھے سمجھ آ رہا ہے۔ یہ لیمنس (Lameness) کی کوئی ٹائپ ہو سکتی ہے۔ لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کیوں کہ یہ بیماری گھوڑوں کو اپاہج نہیں کرتی۔ وہ چل پھر لیتے ہیں لیکن بقیہ سرگرمیوں میں جیسے دوڑنا، کودنا اور چرنا وغیرہ۔ ان میں زیرو ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھیں جیسے لو بلڈ پریشر کی بیماری انسانوں میں ہوتی ہے ویسے یہ گھوڑوں میں ہوتی ہے لیکن میں اس طرح شور نہیں ہوں کیوں کہ آپ کے گھوڑے سنگل موومنٹ بھی نہیں شو کر رہے۔ وہ ساکت ہیں جیسے کوما کے مریض ہوتے ہیں۔ نہ ہل رہے ہیں نہ رسپانڈ کر رہے ہیں۔ مجھے یہ وبلر (Wobbler) کا اٹیک بھی لگ رہا ہے لیکن وہ پیدائشی ہوتا ہے۔ اس لیے فی الحال میں کچھ

نہیں کہہ سکتی۔ مگر میں رپورٹس دیکھ لوں پھر آپ کو تسلی سے بتاتی ہوں۔'' اس نے رسانیت سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کو مناسب لگے۔ لیکن آپ کوشش کیجیے گا۔ یہ کافی قیمتی گھوڑے ہیں۔ بڑی محنت سے سدھائے ہیں ہم نے۔''

''ڈونٹ وری۔ ایک بار مرض سمجھ آجائے پھر علاج میں ٹائم نہیں لگے گا۔''

''تایا جان اندر سے کٹ رہے ہیں۔ ان کے لیے ان کا مرنا بہت بڑا لاس ہوگا عبادہ۔ وہ شاید ہی سہہ پائیں۔''

''میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کا لاس نہ ہو۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

''ہوں۔'' غاذان نے تھکن سے ہنکار بھرا۔ ''چلیں آپ دیکھ لیں۔ میں ذرا حجرے کو دیکھ لوں۔ شندور کے مہمانوں کی میزبانی اس بار ہمارے قبیلے کے ذمہ ہے اور تایا جان نے سارا انتظام میرے سپرد کیا ہوا ہے۔'' وہ مسکرا کے اٹھنے لگا۔

''شندور؟ یہ لفظ میں نے یہاں آتے ساتھ سنا ہے۔ ہے کیا یہ شندور؟''

غاذان نے بھنویں اٹھا کے اسے حیرت سے دیکھا (شندور کے بارے میں نہیں جانتی؟ ہک ہا.....) پھر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے واپس بیٹھ گیا۔

''شندور..... ایک جگہ ہے جو یہاں سے بہت اوپر بابوسر ٹاپ پر واقع ہے۔ یہ کئی پہاڑوں کا سرسبز درمیان ہے جہاں پولو گراؤنڈ بنایا گیا ہے۔ وہاں ہر سال جولائی کے مہینے میں میلہ سجتا ہے جس میں پولو کے میچ ہوتے ہیں۔ گلگت اور چترال کے درمیان۔ اس میچ کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ ہمارے گلگتی، بلتی، شینی دوستوں سے یہ ایک ہفتہ خوب پررونق گزرتا ہے۔''

''اوہ.....'' وہ مسکرائی۔

''کچھ دنوں میں ہمارے مہمان یہاں آنے والے ہیں اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پورا

بلتی قبیلہ ہماری حویلی میں ٹھہرے گا۔ پورے اٹھارہ سال بعد ہمیں یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔'' غاذان کے لہجے میں فخر تھا۔

اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ (یعنی یہاں اور رش ہونے والا تھا۔)

''قبیلے کی خواتین بھی آتی ہیں۔ ان کے لیے زنان خانے کے بیشتر کمرے خالی کروائے ہیں تا کہ وہ پرسکون دن گزاریں۔ یہ لان کی کاٹ چھانٹ، یہ صاف صفائیاں اور سجاوٹ ان کے لیے ہیں۔ ہمارے لیے انتہائی اعزاز کی بات ہے۔ لیکن.....'' یکدم اس کا کا لہجہ دکھی ہو گیا۔'' ان گھوڑوں نے ہمارے سارے پروگرام کو سوگوار کر دیا۔''

عبادہ کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ ہمدردی سے آگے ہوئی۔'' آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے گھوڑے ٹھیک ہو جائیں۔''

''تھینک یو۔'' وہ اس ڈھارس سے ہلکا سا مسکرایا تھا۔'' چلیں پھر میں چلتا ہوں۔ حجرے میں انتظار ہو رہا ہوگا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''بیسٹ آف لک.....'' عبادہ نے کہا۔

''شکریہ.....'' اس نے مسکرا کے سر کو جنبش دی اور وہاں سے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کھانے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی۔ اس کو فون کی فکر تھی جس کے سگنلز ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ وہ احمد اور طارق دونوں کو فون کرنا چاہتی تھی لیکن اس وجہ سے کسی کو بھی فون نہیں کر پا رہی تھی۔ بیڈ پر آلتی پالتی مارے، وہ سامنے کھلی فائلز کو پڑھ رہی تھی۔ دوپہر سے اب تک وہ ساری رپورٹس پڑھ چکی تھی لیکن ان رپورٹس میں اسے وہ نہیں ملا، جو وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ یعنی بیماری کا کلیو۔

اس نے فائل بند کی۔ سائیڈ میز پہ رکھی پھر کھڑی ہوئی قدم قدم کھڑکی تک آئی۔ پردے ہٹا کے

اس نے کھڑکیوں کے پٹ وا کر دیے۔ باہر کالی سیاہ رات پھیلی ہوئی تھی۔ چاند نہیں تھا البتہ سرد ہوا کے جھونکوں سے درخت سرسرا رہے تھے۔

اس نے بازو سہلاتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ ایک درد سا آنکھوں میں چبھنے لگا۔ یہ درد تب ہی جاگتا ہے جب اپنوں سے دور کسی تنہائی میں انسان اپنی فراغت پالے اور پھر وہ سارے لمحے ایک کے بعد ایک آنکھوں میں پھیلنے لگے جن لمحوں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہو۔ ان کی جدائی یاد آجائے جس نے آپ کو بے انتہا ہنسایا ہو۔

وہ باہر دیکھتی رہی جب ریشم ہاتھ میں لالٹین اور ڈبیا لے کے کمرے میں آئی۔ اس کو یوں کھڑا دیکھا تو حیران ہوئی۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟'' ریشم نے لالٹین تپائی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونکی اور مڑ کے اسے دیکھا۔ وہ اس کے بستر کی رضائی کی تہہ کھول رہی تھی جیسے ماں اپنے بچوں کو سلانے سے پہلے بستر ٹھیک کر کے دیتی ہے۔

''ریشم.....''

''ہاں.....''

''مجھے فون چاہیے.....'' اس نے دھیرے سے کہا۔

ریشم نے پلٹ کے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے اس کے فون کو دیکھا پھر رضائی چھوڑ کے فون اٹھایا اور اس کے پاس آئی۔

''یہ لو۔''

''یہ نہیں۔ دوسرا۔ جس سے سگنلز آسکیں۔'' اس نے معصوم سی ریشم سے فون لے لیا۔

''کیوں؟ اس میں سگنلز نہیں۔'' ریشم نے استعجاب سے پوچھا۔

''نہیں ناں۔ میرا نیٹ ورک یہاں کام نہیں کر رہا۔''

''کونسا سم ہے؟''

''وارد.....''

''اوہ.....اس کا سگنلز گڑبڑ کرتا ہے۔ یہاں تو صرف ٹیلی نار چلتا ہے۔''

''وہ ہے کیا تمہارے پاس؟'' اس کی آنکھیں چمکیں۔

''نہیں۔ ہم عورتوں کے پاس پون (فون) نہیں ہوتا۔ مردوں کے پاس ہوتا ہے۔''

''کیا مجھے مل سکتا ہے؟ مجھے گھر بات کرنی ہے۔'' اس نے لجاجت سے پوچھا۔ اس کا دل دکھی تھا۔

''ام.....ابھی تو سب مرد حجرے گیا ہوگا۔ ابتہاج، غاذان، مبین اور غماز..... سب ہی ادھر ہوگا۔''

''یعنی فون نہیں مل سکتا۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

''ابھی تو مشکل ہے لیکن اگر تم صبح تک انتظار کرو تو میں لالہ سے لا دوں گی۔'' ریشم نے اس کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھ کے نرمی سے کہا۔

''صبح.....'' اس نے اداسی سے دہرایا پھر اپنے فون کو دیکھا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ کل بات کر لوں گی۔'' وہ جبراً مسکرائی۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''تم ٹیلی نار کا سم لے لو۔ جب تک یہاں ہے اس سے بات کرنا۔ یہ وارد شارد کبھی کام کرتا ہے کبھی نہیں۔ اس کا اپنا مرضی چلتا ہے۔ ہر وقت۔'' ریشم واپس بیڈ کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''ہوں.....'' اس نے سر ہلایا۔

ریشم نے اس کا بستر ٹھیک کیا۔ رضائی کھولی۔ پانی کا جگ دیکھا۔ موم بتیاں گنیں، ٹارچ دیکھی اور پھر میز کے قریب آئی۔ اس کی دراز کھولی، اندر سے ایک پیالا نکالا۔ اس پیالے میں کچھ جنگلی

جڑی بوٹیاں تھیں۔اس نے ان جڑی بوٹیوں کو آگ لگادی۔کچھ پل شعلے اٹھے پھر اس نے پھونک مار کے بجھادیے۔

اب اس پیالے سے تیزی سے سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ریشم اس پیالے کو پکڑے کمرے کے کونے کونے میں لے جانے لگی جیسے جادو کا اثر توڑ رہی ہو۔عبادہ نے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

''یہ کیا ہے ریشم؟''اس نے تجسس سے پوچھا۔

''مچھر آتے ہیں یہاں عبادہ۔یہ خبیث ہر وقت آجاتا ہے۔جتنا بھگاؤ اتنا اندر۔جینا حرام کردیا ہے۔یہ جڑی بوٹیاں تم کو ملیریا اور ڈینگی سے بچائے گا۔''وہ پیالے کو کھڑکی کی چوکھٹ میں رکھ کے پلٹ گئی۔پیالے سے ہر کونے کوچے میں وہ دھواں بھر رہا تھا۔دھویں کی خوشبو بری نہیں تھی، بلکہ ہلکی ہلکی زعفرانی خوشبو تھی۔عبادہ نے اپنا دوپٹہ اتار کے بیڈ پہ رکھا اور رضائی کے اندر گھس گئی۔

☆.....☆.....☆

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔باہر تیز ہوا کے چلنے سے کھڑکیوں کے درزوں سے ہوا اندر آرہی تھی۔سفید سلکی پردے کسی موسیقی کی دھن پہ تھرکتی دوشیزہ کی پشواز کی طرح آہستہ آہستہ جھول رہے تھے۔وہ کمبل گردن تک کھینچے، بازو گال تلے رکھے نیند کی گہری وادیوں میں اتری ہوئی تھی۔اس کے کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔دیواروں کے کونوں سے جڑی نیلی رنگ کی مصنوعی لائٹوں کی روشنی پورے میں پھیلی ہوئی تھی۔پیالے کا دھوں ختم ہوگیا تھا۔ہر چیز پرسکون تھی جیسے سردیوں کی راتوں میں ہوتی ہے کہ سانس زور سے لو تو ساتھ والے کمرے تک آواز جائے۔

اس نے کروٹ بدلی، دفعتاً آنکھ کھلی اور حلق خشک محسوس ہوا۔وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔پیاس لگ رہی تھی۔گرمیوں کی راتوں کا یہی تو رمز ہوتا ہے۔وہ پیر لٹکا کے جوتوں میں پیر اڑستی کھڑی ہوگئی

اور میز کے پاس آئی لیکن جیسے ہی اس نے جگ اٹھایا، جگ خالی تھا۔اس نے برہمی سے جگ کو دیکھا۔

''یہ ہمیشہ کیوں خالی ہوتا ہے۔'' اس نے کروفر سے سوچا۔ پیاس سے گلا خشک ہو رہا تھا اور سنسنان حویلی میں کون نیچے جائے گا؟ اس نے تنک کے سوچا۔ پیاس لگ رہی تھی، جانا تو تھا۔ نل کا پانی بقول ریشم کے پینے کے لیے نہیں تھا۔ سو وہ بادلِ نخواستہ دوپٹہ گردن میں ڈال کے جگ ہاتھ میں لیے باہر آ گئی۔ اس نے نادانستہ فون ہاتھ میں نہیں اٹھایا تھا۔

اتنے دن رہ کر اسے راہداریوں کا علم ہو گیا تھا۔ کچن کا راستہ، صحن اور مرکزی دروازے کا راستہ پھر لان کا راستہ۔ بس یہی ضروری راستے تھے۔ وہ خمار آلود قدم اٹھاتے ہوئے نیچے آئی۔ سیڑھیوں سے اتر کے بائیں طرف لابی میں آگے چل کے پھر بائیں طرف صحن تھا، صحن کی راہداری میں آگے چل کے، دائیں طرف مڑ کے کچن آتا تھا۔ بڑے گھروں کے یہی تو مسئلے ہوتے ہیں، کئی کئی میل صرف ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔

وہ بوجھل قدم اٹھائے پیر گھسیٹ رہی تھی جب یکدم لائٹیں بجھ گئیں اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ وہ گھبرا کر رک گئی۔ وہ صحن کی راہداری میں تھی۔ نہ آگے دیکھ سکتی تھی نہ پیچھے۔ کسی مجسمے کی طرح جگہ پر جم گئی۔

کیا کرے؟ آگے جائے یا پیچھے؟ فون تو وہ لائی نہیں تھی کہ ٹارچ آن کر لیتی۔ ادھر ہی صحن کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی اور ٹانگوں کے گرد ہاتھ باندھ لیے۔ خوف سے آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ حویلی بالکل سنسان تھی۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا یہاں تین سو لوگ رہتے ہیں۔ ہلکی سی آواز بھی نہیں تھی۔ یا خدا۔ یہ کہاں پھنس گئی؟ اس نے دل میں سوچا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟ کسی نے کچھ کر دیا تو؟ کوئی جن، کوئی بھوت۔ اس نے ہراساں سی نظر ادھر ادھر ڈالی۔ اندھیرے میں موجود ہر چیز جن

بھوت لگ رہی تھی۔اس نے سر گھٹنوں میں دے دیا۔

شاید کچھ دیر میں بجلی آجائے،شاید کوئی جنریٹر لگانے کے لیے جاگ جائے،شاید کوئی کسی کو الہام ہوجائے ایک چھوٹی سی بچی بہت سہم کے صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہے۔کاش کسی کو وحی اتر جائے۔وہ ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کر دعا کرنے لگی۔

کچھ دیر گزری جب کسی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''عبادہ.....''

اس نے دلخراش چیخ ماری اور سپرنگ کی طرح اچھل کے صحن میں کود گئی۔

''میں ہوں۔گل۔گل لالہ۔'' گل نے تیزی سے کہا۔عبادہ کی حالت غیر ہورہی تھی۔گل سرعت سے اس کے پاس آئی۔عبادہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔''کیا ہوا ہے؟ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' گل نے پوچھا۔یکدم وہ اس کے گلے لگ گئی۔اس کا دل ایک سواسی کی سپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔گل نے اسے خود میں بھینچ کے اس کی پشت سہلائی۔وہ سمجھ گئی تھی کہ عبادہ اندھیرے سے گھبرا گئی ہے۔

''ریلیکس۔لائٹ آتی جاتی رہتی ہے یہاں۔ابھی آجائے گی۔'' گل کے کہنے کی دیر تھی،ساری لائٹیں چمک اٹھیں۔روشنی دیکھتے ہی عبادہ کا بلڈ ریٹ جگہ پہ آنے لگا۔اسے گل اندھیر نگری میں کسی مسیحا کی طرح نازل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔اس نے دل و جان سے شکر ادا کیا تھا۔گل نے اسے پیچھے کیا۔وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

''ڈر گئی تھیں؟'' گل نے اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھی۔''میں نے مذاق کیا تھا اس دن۔یہاں کچھ نہیں ہوتا آپ نے سچ تو نہیں سمجھ لیا کہیں؟'' گل نے بغور اس کی آنکھیں دیکھیں۔عبادہ ایک قدم پیچھے ہوئی،بال کان کے پیچھے اڑسے اور خود کو کمپوز کیا۔

''میں وہ..... پا..... پانی.....''

''پانی؟..... پیاس لگی تھی؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''کمرے میں پانی نہیں رکھا تھا کسی نے؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''ختم ہو گیا تھا۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''اوہ۔'' گل سیڑھیوں کے پاس آئی اور جگ اٹھایا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں پانی لے آتی ہوں۔''

''میں بھی آتی ہوں۔'' وہ اس کے پیچھے لپکی۔

پانی لینے کے بعد گل اسے کمرے میں چھوڑنے کے لیے آئی۔ عبادہ نے غور نہیں کیا کہ گل نے کاؤ بوٹس پہنے ہوئے ہیں۔ رات کو کاؤ بوٹس کون پہنتا ہے؟ گل نے جگ میز پر رکھا، عبادہ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی بھی ہراساں تھی۔

''چل کرو۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ کوئی جن بھوت، جنگلی جانور یا درندہ نہیں ہے۔ ہماری حویلی ہے۔ تمہیں لگتا ہے ہم یہاں کسی چیز کو رہنے دیں گے؟''

''نہیں وہ..... اندھیرا.....''

''آئی نو۔ حویلی بڑی ہے۔ اندھیرے میں تمہیں کچھ نظر نہیں آیا تو تم گھبرا گئیں۔'' وہ مصلحانہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''ڈرو نہیں کسی چیز سے عبادہ۔ ڈر انسان کو کمزور کرتا ہے۔ یہ انسان سے ہمت، جرأت اور طاقت چھین لیتا ہے۔ کبھی میں بھی ڈرا کرتی تھی پھر میں نے ڈر کو ہی ڈرا دیا۔ سی۔ میں اب کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔'' وہ دھونس سے بولی۔

''میں نے کبھی حویلی میں رات نہیں گزاری تو.....'' اس نے وضاحت دینی چاہی۔

''آئی نو دیٹ۔ تم شہریوں کو تو آلریڈی حویلی ہانٹڈ لگتی ہے۔ ہے ناں؟'' اس نے ہنس کے

پوچھا۔عبادہ نے بودہ سا سر ہلایا۔"کم آن۔جہاں تین سولوگ رہتے ہوں۔وہ ہائجنڈ کیسے ہوسکتی ہے ۔خودسوچو۔"

"رات کوکہاں چلے جاتے ہیں یہ تین سولوگ؟"وہ شکایتی انداز میں بولی۔

"ہماری خواتین..... پورے دن جتی رہتی ہیں بے چاریاں۔کتنے بڑے بڑے کام کرتی ہیں۔دیکھاتو ہوگا۔اس لیے جب رات ہوتی ہےتو ساری بستر میں دبک جاتی ہیں۔پھرسونے کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا انہیں۔"وہ ہنسی۔عبادہ نے گہری سانس لی۔

"چلواب سوجاؤ۔میں چلتی ہوں۔نیندآرہی ہے۔"وہ اٹھنے لگی۔

"کہاں جارہی ہو؟"وہ تیزی سے بولی۔

"اپنے کمرے میں....."

"گل....."عبادہ نے کچھ سوچتے ہوئے اس کا نام لیا۔

"ہاں؟"

"کیاتم میرے ساتھ اس کمرے میں سوسکتی ہو؟"اس نے معصومیت سے پوچھا۔اگرگل اس کے ساتھ رہےتو اسے کسی قسم کا ڈرنہیں لگے گا۔وہ بہادراورنڈرلڑکی تھی۔گل خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"بیڈبڑا ہے۔ہم دونوں یہاں آجائیں گی۔"وہ تیزی سے بولی۔

"اوکے۔کوئی مسئلہ نہیں۔"گل نے پرسکون سی سانس خارج کی۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ صبح تیار ہوکے نیچے آئی۔اسے اصطبل جانا تھا۔اس نے ریشم کو بتادیا تھا تاکہ وہ صبح گاڑی کا بندوبست کردے۔تنگ سفید جینز پہ نیلی شرٹ کے اوپر اوورآل پہنے،گردن سے

سٹیتھوسکوپ لٹکائے، کلائی میں گھڑی باندھے وہ اصطبل جانے کے لیے تیار تھی۔

حویلی میں عجیب سی ہلچل تھی۔ عورتوں کے ہاتھ پیر ان کاموں میں جُتے ہوئے تھے جن کو دیکھ کے یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ صحن میں رضائیوں، تلائیوں اور چادروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ راہداریوں میں اعزازی اشیاء کو سجاوٹ کے لیے باہر نکالا گیا تھا۔ دیواروں کی جھاڑ پونچھ اور فرش کی صفائی ہو رہی تھی۔

کچھ چنچل لڑکیاں مل کے صحن میں بیل پودوں کی کٹائی کر رہی تھیں۔ وہ قدم قدم لیتی سب کو دیکھ رہی تھی۔ آگے چل کے اسے خواتین کا بڑا گروہ نظر آیا جو چینی اور کانچ کے برتنوں کو بڑے بڑے ٹبوں میں دھو رہی تھیں۔ انہوں نے آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ موٹی چچی ایک ایک کے پاس جا کے سب دیکھ رہی تھیں۔

آج حویلی میں ضرورت سے زیادہ ہلچل تھی اور اس ہلچل میں بے شمار آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ گل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ اس کے ساتھ ساری رات سوتی رہی۔ اس کا خیال رکھتی رہی۔ اسے تسلی دیتی رہی۔ صبح ناشتہ بھی اسی نے کرایا تھا اور اب جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔

وہ راہداری میں غیر دلچسپی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

''ڈاکٹرنی؟'' چلتے چلتے وہ آواز پہ رک گئی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ ابراہیم بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

''غاذان بھائی کہہ رہا ہے وہ تم کو اصطبل لے جائے گا۔ تم باہر آ جاؤ۔'' ابراہیم نے کہا۔

''اچھا۔'' اس نے سر ہلایا۔

حویلی کی اس سمت جہاں سے منیب خان اسے لایا تھا۔ وہاں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے

غاذان کھڑا تھا۔کالی پینٹ پہ سفید شرٹ پہنے، آنکھوں پہ گاگلز لگائے فون پہ جھک کے جلدی جلدی کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔بال سمٹے ہوئے تھے اور کلائی میں سفید ڈائل کی گھڑی چمک رہی تھی۔

وہ بیگ گھسیٹتی ہوئی آئی تو بیگ کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔

''اسلام علیکم.....''اس نے دھیرے سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔بڑی دیر کردی مہرباں آتے آتے۔ہم کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔میں تو تایا جان سے دس کالز بھی سن چکا ہوں۔'' غاذان فون بند کر کے خوشگواریت سے بولا۔وہ تکلف سے مسکرائی۔

''لائیں ادھر دیں۔'' غاذان نے اس کا بیگ اٹھایا اور پیچھے رکھ دیا۔پھر گھوم کے اگلی طرف آیا اور اس کے لیے دروازہ کھولا۔

''بیٹھیں۔''اس نے جینٹل مین کی طرح کہا۔وہ آہستہ سے چل کے اندر بیٹھ گئی۔غاذان نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ آ کے اسٹیئرنگ سنبھال لی۔

''ویل۔میری ڈرائیونگ اتنی اچھی نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ آپ کو اصطبل ہی پہنچاؤں۔'' وہ مسکراہٹ دبا کے گاڑی ریورس کرتا ہوا بولا۔''میں نے لندن کی گاڑیاں چلائی ہیں۔ان کی اسٹیئرنگ بائیں طرف ہوتی ہے اور یہاں دائیں طرف۔پہلے پہل مجھے چلانے میں کافی دقت ہوئی لیکن اللہ کا شکر ہے میں نے سیکھ لی۔بقول تایا جان کے مرد کو ڈرائیونگ، سوئمنگ، کوکنگ اور شوٹنگ آنی چاہیے۔یہ وہ چیزیں ہیں جو اس کی جان بچاتی ہیں۔ہر بار، ہر جگہ۔''

اس کے چہرے پہ نرم مسکراہٹ تھی۔عبادہ خاموش تھی، سر میں ٹیس پہ ٹیس اٹھ رہی تھی اور شاید اس کی خاموشی غاذان نے بھانپ لی تھی۔اس نے گردن موڑ کے اسے دیکھا، وہ شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔چہرہ بجھا ہوا تھا۔

''لگتا ہے آپ رات کو سوئی نہیں ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ نئی جگہ میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگتا ہے۔ میں بھی لندن میں پہلا ایک مہینہ نہیں سو پایا تھا۔ یونو۔ وہاں کا موسم، ماحول، شور اور لوگوں کا تنگ کرنا مجھے سونے نہیں دیتا تھا۔ مجھے لگتا کہ میرے اچانک کچھ ہو نہ جائے لیکن یہ سب وقتی تھا۔ آہستہ آہستہ میں ایڈجسٹ ہو گیا۔''

وہ آہستہ سے اونچائی سے گاڑی نیچے لے جا رہا تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ وہ انگوٹھی والی انگلی عادتاً اسٹیئرنگ پر ٹیپ کر رہا تھا' عبادہ کا ردعمل نہ پا کر اس نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

''آپ بتائیں..... دن کیسے گزر رہے ہیں؟'

''اچھے.....'' اس نے تکلف سے جواب دیا۔

''صرف اچھے؟'' غاذان شرارت سے بولا۔

''ہمم.....''

''ویل گزرنے بھی چاہئیں۔ آخر آپ گھر میں جو قید ہیں۔ آپ باہر نکلیں گی۔ چترال، ایون، کالاش کو ڈسکور کریں گی تو آپ کا موڈ بدل جائے گا۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''ویسے میں آپ کو ابھی چترال لے جاتا لیکن مجھے وہاں کچھ ضروری کام ہے جو محض بوڑھے مردوں کے ٹولے کے ساتھ ہے۔ جن کو لمبی، آہستہ اور رک رک کے گفتگو کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ آپ وہاں بہت بور ہو جائیں گی۔ اس لیے پھر کبھی۔''

عبادہ نے سر گھما کے اسے دیکھا۔

''آپ چترال جائیں گے؟ کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''چترال یعنی چترال۔'' غاذان مسکرایا۔

''یہ چترال نہیں ہے کیا؟''

''اونہوں۔یہ ایون (Ayun) ہے۔ایون ویلی۔یہ چترال سے پینتیس کلومیٹر دور ہے۔ چترال وہاں ہے جہاں آپ کا جہاز لینڈ ہوا تھا۔وہ دریا کے پار کا علاقہ ہے۔پل کے اس طرف ایون ہے۔''

''اوہ.....''اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

''آپ غالباً کنفیوز تھیں۔ہے ناں؟''

''مجھے لگا یہ سب چترال ہے۔''

'' چترال ایک ضلع ہے ۔ایون۔کالاش۔کرکالر۔رمبور۔عوی۔یہ سب یہاں کے گاؤں ہیں۔ہر گاؤں ایک دوسرے سے بڑھ کے خوبصورت ہے۔میرے خیال سے آپ کو وقت نکال کے چترال کو ایکسپلور کرنا چاہیے۔''اس نے موڑ کاٹتے ہوئے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ہوں۔''اس نے سر ہلایا۔آج سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔کہیں کہیں تیز دھوپ تھی تو کہیں کہیں چھایا سی گر رہی تھی۔آسمان پہ لاتعداد بادل بھیڑوں کی اون کی مانند چھائے ہوئے تھے۔

''چترال پاکستان کے شمالی علاقے میں گلگت کے پڑوس میں واقعہ ہے جہاں ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ ہے۔چترال کا مطلب ہوتا ہے''زمین کا ٹکڑا یا پھر قطعہ''۔کھوار زبان میں کہتے ہیں۔ چترال سے کئی خوبصورت گاؤں منسوب ہیں۔ایون۔یہ سب سے حسین گاؤں ہے۔پھر کالاش آتا ہے۔کالاش نام سنا تو ہوگا۔کالاشی لوگوں کے بارے میں بہت ساری متھس ہیں جن کو سن کے کوئی بھی عقل والا آدمی یقین نہیں کرے گا لیکن وہ سب.....سچ ہیں۔''

وہ ہنس پڑا۔عبادہ نے نوٹس کیا وہ کافی فرینک تھا۔کھل کے بات کرتا تھا۔اس کی آنکھوں میں

''لڑکی'' کو دیکھ کے آنے والی چمک نہیں تھی جو مردوں میں ہوتی ہے۔ وہاں اعتماد تھا اور دوستانہ خوشگواریت تھی۔

''یہاں کے لوگوں کا لباس، رہن سہن، طور طریقے، رسمیں، رواج سب ایک جیسا ہے۔ بولیوں میں البتہ فرق ہے۔ آپ کو پتہ ہے بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ شمالی علاقہ جات میں صرف پشتو ہی بولی جاتی ہے لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ یہاں چترال میں کھوار بولی جاتی ہے یہ پہاڑی لہجہ ہے اور پشتو کے مقامی لہجے سے بہت مختلف ہے۔ یہ ہندو آریائی زبان ہے۔ یہ چترال کے علاوہ گلگت کے کچھ علاقوں، اپر سوات، مٹلتان گاؤں وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔''

اور اسے لگا کہ وہ سب پشتو بولتے ہیں۔ ہک ہا.....

''میں آپ کو یہاں کے کلچر کے بارے میں بتا دیتا ہوں تا کہ آپ لاہور جائیں تو ہمیں اچھی اچھی چیزوں سے یاد کریں۔'' وہ ہنس کے کہنے لگا۔ عبادہ کو اس کی فطرت پسند آئی تھی۔ کم از کم ابتہاج کے معاملے وہ قابل قبول شخصیت رکھتا تھا۔

''ہم یہاں قبیلوں کے طور پر رہتے ہیں۔ قبیلے کو ہم خاندان کہتے ہیں۔ ہم کھوواری ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں شبگلی، وخی، تاجر، گجر، دمیلی، پٹھان، افغان اور کالاشی بھی ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے خاندان تھے جن کے سربراہ مختلف علاقوں سے آ کے یہاں آباد ہوئے۔ سو یہ ان کے نام سے ہی مشہور ہوئے ہیں۔ یہاں کا سب سے مضبوط قبیلہ دمیلی ہے جو کہ چترال سے بیس میل کے دوری پر آرندو کے علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو گروہ بن گئے ہیں۔ شیخناری اور سواتی۔ شیخناریوں کا کہنا ہے کہ وہ یہاں کے اوریجن ہیں۔ اس علاقے کی پیداوار۔ لیکن اس بات میں کہاں تک سچائی ہے معلوم نہیں۔ کیوں کہ پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو مسلم ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ سکھ بھی ایک بڑی تعداد میں موجود تھے اس لیے یہ کنفرم نہیں کہ یہاں کا اوریجن کون ہیں۔'' وہ دھیرے

دھیرے کہہ رہا تھا اور وہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔اس کے پاس اپنے علاقے کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔

''بابوسر ٹاپ پہ ہندوکش کی پہاڑیوں کے درمیان موجود شندور ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ یہاں سے اصل پولو کی ابتدا ہوئی تھی۔ یونو وہاٹ۔ میں جب لندن میں تھا تب وہاں میرے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو باقاعدہ پولو کھیلتے تھے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ یہ کھیل انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ وہ جب جب ایسا کچھ کہتے، میرا خون کھولنے لگا۔ پولو کی ابتدا ہم نے کی ہے۔ ہم چترالیوں نے۔ یہ ہماری سرزمین کا کھیل ہے۔ یہاں کے بچے بچے کو آتا ہے پولو اور وہ کہہ رہے تھے انہوں نے بنایا ہے۔ مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔''

''آپ بتا دیتے کہ یہ آپ لوگوں کا کھیل ہے۔''

''آپ کو کیا لگتا ہے میں نے نہیں بتایا ہوگا۔ ارے میں نے تو پوری تاریخ نکال کے دے دی تھی لیکن وہ لوگ..... وہ لوگ ایشیاء کے لوگوں کا کم ہی یقین کرتے ہیں۔ خاص طور پر برصغیر کے لوگوں کا۔''

عبادہ ہنسنے لگی۔ گاڑی دریا کے کنارے چل رہی تھی۔ دریا کے کنارے قطار میں درخت اگے ہوئے تھے جن کی چھایا پانی پر گر رہی تھی۔ پانی کے بہنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ہوا سے اس کے بال اڑ اڑ کے کندھوں پر لگ رہے تھے۔

''آپ شندور دیکھتے ہوئے جایئے گا۔ ہمارا ثقافتی میلہ ہے۔'' غازان نے بڑی اپنائیت سے گزارش کی۔

''میں کوشش کروں گی۔'' اس نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

''ویل گزارش تو میں ایک اور بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن یونو کہیں اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہ

ہو جائے۔'' وہ ہچکچایا۔ عبادہ اس کی طرف پلٹی۔

''شندور کے بعد میری دستار پوشی ہے۔ دستار پوشی یہاں کی رسم ہے جس میں نیا سردار چنا جاتا ہے۔ میں چترال کا نیا سردار بننے والا ہوں۔ اگر آپ وہ تقریب بھی دیکھتی جائیں تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

عبادہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، وہاں انجانی سی خوشی رقصاں تھی۔ ''مبارک ہو۔''

''تھینک یو.....'' اس نے ممنونیت سے سر کو خم دیا۔

'' ایک بات بتائیں.....'' عبادہ نے شرارت سے کہتے ہوئے کہنی شیشے میں رکھی اور اسے دیکھنے لگی۔ ''تم چترالی ہر کسی سے ایسے ہی پیش آتے ہو؟''

''ایسے کیسے؟''

''ایسے جیسے وہ کوئی بہت پرانا عزیز ہو جو کسی میلے میں بچھڑ گیا ہو۔ آئی مین۔ میں نے کوئی تکلف نہیں دیکھا ابھی تک کسی کے چہرے پر۔''

''ویل اسے آپ ہماری ثقافت اور وراثت دونوں کہہ سکتی ہیں جو ہمیں ہر کسی سے یونہی پیش آنے پر مجبور کرتی ہیں۔''

''نائس۔ اپریشیٹڈ۔'' وہ متاثر ہو گئی تھی۔

وہ فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ غازان ایک طرف گاڑی روک دی اور سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔

''ویل میں آپ کو بذات خود دکھا دیتا کہ ہم چترالی کس قدر خلوص اور محبت کرنے والے ہیں لیکن بندے کے لیے سردار نے شرط ہی اتنی ظالم رکھی ہے کہ اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔'' وہ گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے واجبی افسوس سے بولا۔

''کیا مطلب شرط رکھی ہے؟'' وہ الجھن سے پوچھتی باہر آئی۔

''مطلب یہ محترمہ کہ یہاں کا قانون ہے۔ موجودہ سردار آنے والے سردار کے لیے سردار پوشی سے پہلے کچھ شرائط رکھتا ہے۔ اگر وہ سردار شرائط پہ پورا اترتا ہے تو اسے سردار بنایا جاتا ہے۔'' وہ اس کا بھاری بیگ نیچے اتارتے ہوئے بولا۔ ''میری شرط یہ ہے کہ مجھے شندور کے مہمانوں، حویلی کے مسائل، اور کچھ قبیلوں کے ساتھ ناراضگی وغیرہ چل رہی ہے ہماری، ان کو منانا ہے اور کھیتوں کے مسئلے حل کرنے ہیں جو جانے کب سے ہیں۔ اس لیے میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہوں۔'' وہ شانے اچکاتے ہوئے ہنس دیا۔

''شرط پوری کرنا لازمی ہے کیا؟''

''لازمی کیا ہوتا ہے؟ اٹل ہے۔ پل صراط کی طرح۔''

''اور اگر کوئی شرط پوری نہ کر سکے..... تو؟'' وہ اپنے معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔

''اسے سرداری نہیں ملتی، کسی اور کو سردار بنا دیا جاتا ہے۔''

''اوہ.....''

غاذان نے اس کا بیگ اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس سے آگے نہیں تھا اور اگر یوں سمجھ لیں کہ وہ ''اس'' کے ساتھ قدم ملا رہا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔

''اس کا مطلب موجودہ سردار بھی شرطوں پر پورا اترا تھا؟'' وہ اصطبل کے اندر داخل ہو رہے تھے جب عبادہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ موجودہ سردار ہنگامی صورتحال میں بنا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''موجودہ سردار میرے تایا ہیں۔ وہ بچپن سے جسمانی طور پر سرداری کے لیے نااہل ہو گئے تھے۔ میرے بابا اور گل کے بابا کے درمیان سرداری کے لیے مقابلہ ہوا تھا۔ داجی میرے دادا،

انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو مخالف ٹیم میں رکھا تھا۔ میرے بابا بلتی ٹیم میں تھے اور چچا چترالی۔ دادا جی نے شرط رکھی کہ جس کی ٹیم جیت گئی، میرا وہ بیٹا سردار بنے گا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا میچ ڈرا ہو گیا۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

"دونوں برابر ہو گئے؟"

"ہاں۔"

"پھر انہوں نے تیسرے بیٹے کو بنا لیا؟"

"کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ شانے جھٹکتے ہوئے بولا۔

"ویسے انہوں نے آپ کے لیے پولو کھیلنے کی شرط کیوں نہیں رکھی؟" عبادہ نے سوال کیا۔

اس نے اس کا بیگ اس کمرے کے سامنے رکھا۔ "کیوں کہ مجھے پولو کھیلنا نہیں آتا۔"

میدان میں آج بہت رش تھا۔ ملازم، گھڑ سوار اور گھوڑوں کی کثیر تعداد نظر آ رہی تھی۔ وہاں طوفان بدتمیزی برپا ہوا تھا لیکن اس طرف خاموشی تھی کیوں کہ ان کی آوازیں یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

"آنا تو چاہیے۔ آفٹر آل آپ کا بچہ بچہ کھیلنا جانتا ہے۔" عبادہ نے پچکارا۔

"ابتہاج کھیلتا ہے ناں۔ کافی ہے۔ مجھے گھوڑے اتنے خاص اچھے نہیں لگتے۔ میں گاڑی چلا لیتا ہوں اور ابتہاج صاحب کو گاڑی چلانا نہیں آتا۔ اسی طرح مجھے گھوڑے چلانے نہیں آتے اور ابتہاج اچھی گھڑ سواری کر لیتا ہے۔"

"ابتہاج عجیب ہے۔" وہ بدمزہ ہو گئی۔ غاذان ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے پر آنے والی کلفت کو دیکھا پھر فکرمندی سے اس کے قریب آیا۔

''کچھ کیا ہے کیا اس نے؟''

''نہیں۔بس ایسے ہی۔'' وہ کیا بتاتی کہ اس کی نظریں کتنی عجیب ہیں اور لہجہ ایسا گویا زبان پر ہر وقت ببول اگاتا ہو۔

مہابت خان وہاں موجود ایک ٹریکٹر ٹرالی کے ساتھ کھڑا تھا جسے کچھ لوگ گودام کے اندر موجود سامان سے بھر رہے تھے۔غالباً چارہ تھا۔ان کو دیکھ کے وہ بھاگتا ہوا اس طرف آنے لگا۔ بھاگتے ہوئے اس کے کندھے پہ رکھی شال اٹھ اٹھ رہی تھی۔

''غاذان.....'' اس نے نرمی سے نام لیا۔

''ہوں۔'' وہ گہری سوچ سے چونکا۔

''مجھے وہ.....''

''سم چاہیے۔ہے ناں؟'' وہ تیزی سے بولا۔عبادہ خوشگواریت سے چونکی۔

''جی۔''

''ریشم نے بتا دیا تھا مجھے۔میں چترال سے لیتا ہوا آؤں گا۔آپ فکر مت کریں۔'' وہ بے پناہ اپنائیت سے بولا۔

''بہت شکریہ۔'' اس نے ممنونیت سے سر خم کیا۔غاذان نے گھڑی میں وقت دیکھا تو اس کی بھنویں یکجا ہو گئیں۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔میں چلتا ہوں۔اللہ حافظ۔'' وہ ہڑبڑا کے دو قدم پیچھے لیتے ہوئے پلٹا پھر وہاں سے چلا گیا۔جاتے جاتے وہ کسی کو فون بھی ملا رہا تھا۔اس کی پشت کو وہ تب تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔اس کا دل جانے کیوں بجھ گیا۔

اس نے گہری سانس خارج کر کے مہابت خان کو دیکھا۔وہ منتظر کھڑا تھا۔اس نے بیگ کے

ہینڈل میں ہاتھ ڈالا۔

''چلیں کاکا۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

گھوڑے اپنی کوٹھڑیوں میں تھے۔ وہ اسی پوزیشن میں فرش پہ لیٹے ہوئے تھے مگر آج ان کی ہنہناہٹ میں وہ دم نہیں تھا جو اس دن تھا۔ آج وہ قدرے سست اور خاموش تھے۔ اس نے اپنا بیگ دروازے کے ساتھ کھڑا کر کے گلوز پہننا شروع کیے۔ مہابت خان اس کے پیچھے تھا۔

''کاکا! اس دن میں نے معائنہ کیا تھا۔ آج میں علاج کروں گی۔''

''تم کو بیماری سمجھ آ گیا؟'' مہابت خان چمک کے آگے آیا۔

''نہیں۔'' اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ لیے۔ ''ابھی تک معاملہ الجھا ہوا ہے لیکن میں ایسی علامات کا کچھ علاج جانتی ہوں۔ اگر اس علاج سے فرق پڑا تو بیماری کی تشخیص ہو جائے گی اور اگر نہیں پڑا تو مجھے اس میں سے ایک گھوڑا کلینک لے کے جانا ہوگا۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی اور بیگ سے دوائیاں نکالنے لگی۔ وہ بینامائن (Banamine) نامی ایک دوا کو موٹی اسرنج میں بھر رہی تھی۔ اگر تو گھوڑے لیمنس کا شکار تھے تو یہ ایک طرح سے سنگین خطرہ تھا۔

کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ پہلے دو گھوڑوں پہ سورج کی روشنی براہ راست پڑ رہی تھی۔ وہ اوور آل کی آستین کہنیوں تک موڑ کے گھوڑے کے پاس آئی۔ انجکشن ہاتھ میں پکڑے، اس نے گھوڑے کی ریڑھ کی ہڈی کو انگلیوں اور انگوٹھے کے بیچ دبانا شروع کیا۔ گھوڑے قدرے کمزور ہو گئے تھے جس سے جسم میں ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

اسے لیمنس نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹیسٹ کے دوران ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑے کے جس پیر میں لیمنس ہوتا ہے وہ اس مخالف پیر میں پرکھ کے معلوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں لیمنس ہوگی تو بائیں کلائی کو دبا

کے دیکھا جائے گا۔وہ اس لیے کیوں کہ گھوڑا بول نہیں سکتا۔وہ صرف رسپانس شو کر سکتا ہے۔اس کے بائیں اور دائیں پیر کی کارکردگی کا موازنہ کر کے اندازہ لگا جاتا ہے کہ کونسی خرابی کہاں ہے؟

عبادہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور گھوڑے کی ریڑھ کی ہڈی کے ایک مخصوص جوڑ کو انگوٹھے سے اندر کی طرف دبایا پھر وہاں موجود گوشت کو انگوٹھے اور انگلی میں چٹکی کی طرح دبایا۔انجکشن اس کے دوسرے ہاتھ میں تھا۔اس نے گوشت چھوڑا اور انجکشن کو ایسے پکڑا جیسے ہاؤن کے دستے کو پکڑتے ہیں پھر ایک زوردار جھٹکا دے کے سوئی کو گھوڑے کی اسکن کے اندر ٹھونس دیا۔گھوڑا ہنہنا اٹھا۔

اس نے پین کی طرح انگوٹھے کے سرے سے سرنج کو دبانا شروع کر دیا۔محلول اندر داخل ہونے لگا۔ملازم کھڑے دیکھ رہے تھے اور مہابت خان کے چہرے پر امید بھرا تاثر تھا۔انجکشن ختم ہوا تو اس نے سوئی باہر نکالی۔

''یہ کس چیز کا ٹیکا ہے ڈاکٹرنی؟'' وہ جو سرنج نیچے رکھ رہی تھی،آواز پہ چونک کے سر اٹھایا۔سرخ شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس،سر پہ ہیلمٹ رکھے،کہنیوں اور گھٹنوں پر سیفٹی بیلٹ لگائے ابتہاج کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں پولو کی سٹک تھی۔

''لیمنس کا.....'' وہ سرد مہری سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ابتہاج کے چہرے پر تنفر ابھرا۔

(ہونہہ.....ایک لڑکی ہو کر کیا علاج کرے گی۔)

عبادہ دوسرے گھوڑے کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ کے اس کی ریڑھ کی ہڈی کا اس طرح معائنہ کر رہی تھی،جیسے پہلے کا کیا تھا۔ابتہاج ضبط سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ کو لگتا ہے ان گھوڑوں کو لیمناس ہو گا؟'' ابتہاج نے سوال نہیں پوچھا۔مذاق اڑایا۔

''مے بی.....''

''نہیں ہے۔'' ابتہاج کا لہجہ پر یقین تھا۔

عبادہ نے رک کے اسے دیکھا۔ ''آپ لیمنس کے بارے میں جانتے ہیں۔''

'' بالکل۔ لیمناس ایک ایسی بیماری ہے جو گھوڑوں میں زخم، وائرس، زخم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب گھوڑے دوڑتے ہیں تو ان کے ''کھروں (ہوف)'' میں زخم ہو جاتا ہے اور پھر یہ انجری نشوونما پانے کے بعد ان کے جوڑوں، ٹین ڈنز، لیگامنٹس اور یہاں تک کہ پھٹوں تک پھیل جاتا ہے اور ان کی کارروائی روک دیتی ہے۔ اس سے گھوڑے دوڑ نہیں پاتے۔ بیشتر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس زخم کا درد پیروں سے رانوں اور رانوں سے ریڑھ کی ہڈی میں داخل ہوتا ہے اور جب یہ ریڑھ کی ہڈی میں داخل ہو جاتا ہے تو گھوڑوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے کہ ان گھوڑوں کی ہے۔ وہ بھاگنا، دوڑنا تو درکنار، کھڑے بھی نہیں ہو پاتے۔''

عبادہ ہاتھ میں دوسرا انجیکشن لیے ہکا بکا کھڑی تھی۔ ابتہاج اتنا سب جانتا تھا؟ کیسے؟

''آپ ویٹ ہیں؟'' اس نے دھیرج سے پوچھا۔

''نہیں۔'' جواب سپاٹ تھا۔

''پھر آپ کو یہ سب کیسے پتہ؟'' اس نے تعجب سے بھنویں سکیڑیں۔

''کئی سال پہلے ہمارے کچھ گھوڑوں کو یہ بیماری ہوئی تھی۔ اس وقت جس ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے بتایا تھا۔ خیر مجھے نہیں لگتا ان کو کسی قسم کی کوئی لیمنس ہے۔'' اس نے شانے اچکا کے کہا۔

''اچھا۔'' وہ استہزائیہ سے مسکرائی۔

''آپ سے پہلے جو ڈاکٹر آیا تھا اس کا خیال تھا اس کو ڈون سٹاک ہوا ہے۔ اس نے مجھے سارے علامات بتائے جن میں بیشتر ان سے مل رہے تھے۔ میرا خیال ہے آپ کو وہ دیکھنا چاہیے۔''

''کک..... کیا ہوا ہے؟''

''ڈون سٹک۔''

عبادہ الجھی پھر کچھ دیر سوچا تو بھنویں اٹھ گئیں۔ ''آپ کا مطلب ڈاؤن یا سٹک (Down and Stuck)۔''

ابتہاج خائف ہوگیا۔ ''ہاں وہی۔''

''ڈاؤن اینڈ سٹاک کی وجہ نہیں بتائی انہوں نے۔''

''بتائی تھی۔ ہرپاز۔''

''ہرپیز..... ہرپیز ہوتا ہے۔'' وہ پچکار کے کہتی کھڑی ہوئی۔

''جو بھی ہے۔'' وہ اب برہم ہوگیا تھا۔ (اتنی اصلاح اہم ہے کیا؟)

''لیکن میں نے پورٹس میں ڈاؤن اینڈ سٹاک یا ہرپیز کی رپورٹ نہیں دیکھی۔'' وہ جز بز سی کھڑی ہوگئی۔ ''انہوں نے ٹیسٹ نہیں کرائے تھے کیا؟ کاکا؟'' عبادہ نے مڑ کے مہابت خان کو دیکھا۔

''بیٹی میں ان پڑھ جاہل۔ مجھے نہیں پتہ۔ میں نے سارا کاغذ دے دیا ہے۔'' مہابت خان عاجزی سے بولا۔ وہ فوراً سے بیشتر ابتہاج کی طرف مڑی۔

''آپ بتائیں کیا انہوں نے ٹیسٹ کرائے تھے؟''

''نہیں۔'' ابتہاج خود کو سنبھال کے بولا۔ ''مجھے بتایا تھا۔ صرف۔''

''عجیب بات ہے جب ان کو ہرپیز کی علامات نظر آئیں تو انہوں نے ٹیسٹ کرائے نہ علاج؟ کیوں؟'' وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

''مجھے کیا معلوم؟'' ابتہاج نے بھنا کر کہا۔

''کاکا.....'' عبادہ تیزی سے مہابت خان کے قریب آئی۔ ''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ان گھوڑوں کو جب یہ بیماری ہوئی، اس وقت ان کی کیا علامات تھیں؟ کیا ان کو زکام، بخار، کمزوری یا

پھر ایسا کچھ ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ سر کو نہ ہلا سکتے ہوں؟''

''بخار، زکام؟ نہیں نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔''

''ٹھیک سے یاد کریں کاکا۔'' اس نے مہابت خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ابتہاج لب بھینچ کے دیکھ رہا تھا۔ (کچھ تھا جو اسے اچھا نہیں لگا تھا۔)

''نہیں بیٹی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔''

عبادہ نے دھیرے سے ہاتھ ان کے کندھے سے ہٹایا۔

''اگر ایسا کچھ نہیں تھا تو اس ڈاکٹر کو ہر پیز کیسے نظر آیا؟'' وہ خالی خالی چہرہ لیے ابتہاج کو دیکھنے لگی۔ انجکشن اس کے ہاتھ میں تھا۔ میدان میں گھوڑے ہنوز بال کے پیچھے دھڑ دھڑا رہے تھے۔

''ہم ڈاکٹر نہیں ہیں بی بی۔'' ابتہاج کا لہجہ یکدم بدل گیا۔ وہی کاٹ دار، زہریلا۔ ''آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ اب ہم سے کیسے پوچھ سکتی ہیں؟''

عبادہ کو حیرت ہوئی۔ (اس سے تو نہیں پوچھا تھا۔ وہ کیوں برا مان رہا تھا؟)

''نہیں۔ دراصل مجھے ہر پیز کا کچھ نہیں ملا۔ ہر پیز ہوتا تو گھوڑے کھانستے، ان کو ڈپریشن ہوتا اور یورینشن میں مسئلہ آتا۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اس دن پورا دن گزارا تھا۔ گھوڑوں نے کھایا بھی اور نکالا بھی۔ دونوں پراسیس میں کوئی مشکل انہیں پیش نہیں آئی۔ آئی تھنک اس ڈاکٹر نے غلط تشخیص کی ہے۔'' وہ گھوڑے کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر بے چارگی تھی۔

''مجھے نہیں لگتا یہ ہر پیز ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔ کچھ ایسا جو نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''خیال رکھیے گا ڈاکٹرنی۔ بہت قیمتی گھوڑے ہیں یہ۔ ایسا نہ ہو آپ بغیر بیماری کا پتہ لگائے علاج کرنا شروع کر دیں اور ہم اپنے گھوڑوں سے محروم ہو جائیں۔'' ابتہاج نے استہزائیہ سے ہنس کے کہا تو ملازم بھی ہنس پڑے۔

وہ مسکرائی۔ ''بے فکر رہیں ابتہاج صاحب، آپ کے گھوڑوں کو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا مگر وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ کچھ تھا جو اسے بری طرح کھٹک رہا تھا۔

عبادہ نے دوسرے گھوڑے کی موٹی اسکن میں انجکشن ٹھوک دیا۔ مائع اندر جانے لگا۔ گھوڑا ہنہنا رہا تھا لیکن کوئی رسپانس نہیں دے رہا تھا۔ اس کی پلکیں ساکت تھیں جیسے بقیہ وجود تھا۔ محلول اندر داخل ہوا تو عبادہ نے سرنج باہر کھینچ لی۔ ابتہاج جب تک کھڑا اسے ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی خلش تھی۔ ایسی خلش جو کسی بڑے ضبط کی نشانی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، صبر کا گھونٹ بھرا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''کاکا!'' وہ کھڑی ہوئی۔ ''پرانے ڈاکٹروں نے کوئی ایکسرے، ایم آر آئی، سی ٹی سکین یا الٹراساؤنڈ کرایا تھا تو مجھے دکھا دیں؟''

''وہ کیا ہوتا ہے بچے؟'' مہابت خان نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''وہ.....وہ.....'' عبادہ اٹک گئی۔ مہابت خان کو کیسے سمجھاتی؟ اسے ایم آر آئی اور الٹراساؤنڈ کے بارے میں کیا معلوم؟ وہ تو اللہ کا بندہ تھا۔ سیدھا سادھا۔ گھوڑوں کا خیال رکھنے والا۔ میدان میں گھڑسوار اب قطار میں کھڑے تھے۔ ان کا لباس بھی ابتہاج جیسا ہی تھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑا تھا جیسے جنگ سے پہلے سپہ سالار جنگجو دستوں کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ دائیں سے بائیں جاتے ہوئے کچھ تلقین کر رہا تھا اور جھک جھک کے گھوڑوں کے پیر کو بھی چھو کے دیکھتا۔

''کیا گھوڑوں کو ہسپتال لے کر گئے ہیں آپ لوگ؟'' اس نے سوال تبدیل کیا۔ اگر ہسپتال لے کر گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ سارے ٹیسٹ ہوئے ہوں گے کیوں کہ یہ بڑی بڑی مشینیں صرف ہسپتال میں لگی ہوتی ہیں۔

''ہم ہسپتال نہیں لے کے جا سکتے۔'' مہابت خان نے زیرِ بڑبڑایا۔

''کیا کہا؟'' عبادہ نے ٹھیک سے نہیں سنا تھا۔

''نہیں لے کے گئے۔'' وہ آنکھوں میں ویرانی لیے کہنے لگے۔

''لیکن کیوں؟'' وہ بری طرح چونک گئی۔

''ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہسپتال لے کے جانے کی ضرورت نہیں ہے گھوڑے مرنے والے ہیں۔''

اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ ''کہاں سے پکڑ کر لائے تھے ایسے ڈاکٹروں کو آپ لوگ؟ ڈگریاں دیکھی تھیں ان کی؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''غاذان خان جی لائے تھے۔''

''غاذان؟'' اس نے تعجب سے دہرایا۔

وہ تو اتنا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس نے کیسے غلطی کر لی؟ نا تجربہ کار ڈاکٹر، موت کا فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ چار موت کے فرشتوں کو کیسے پکڑ کر لایا تھا؟ اسے تھوڑی بہت جانچ پڑتال تو کرنی چاہیے تھی۔ ایک ذمہ دار اور ہمدرد ڈاکٹر کبھی یہ نہیں کہتا کہ مریض مرنے والا ہے۔ وہ ہمیشہ امید دلاتا ہے اور پھر گھوڑے ایک ماہ سے یہاں ہیں۔ اب تک زندہ ہیں، اگر وہ مر رہے تھے تو اب تک کیوں نہیں مرے؟

ابتہاج اب ان کو گول دائرے میں کھڑا کر کے، بال ہاتھوں میں اچھالتا کچھ بتا رہا تھا۔ لڑکے مستعدی سے سن رہے تھے۔ گھوڑوں میں دوائی لگنے کے بعد بھی کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہنوز اسی طرح لیٹے تھے۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ غاذان سے اس بارے میں بات کرے گی۔

''کاکا۔ مجھے پانی کا پائپ لگا دیں۔ میں ان گھوڑوں کو نہلانا چاہتی ہوں۔'' جانے کیوں اس

کے ذہن میں آیا۔گھوڑے صاف تھے۔مہابت خان انہی چیزوں کا تو خیال رکھتا تھا۔ پانی،کھانا،مالش،نہانا۔

لیکن اس کا دل چاہا وہ خود گھوڑے کے سر پہ پانی ڈال کے اٹیگزیہ کی نشاندہی کرے۔بعض اوقات دماغ کے کچھ سیل ہیٹ اپ ہوتے ہیں جیسے لوگتی ہے۔ویسے ہی اور یہ مہینہ بھی جون کا تھا سو ممکن تھا کہ گھوڑوں کو پانی سے فریش محسوس ہو اور ان کے جسم میں جنبش ہو جائے۔مہابت خان نے اس کی بات سن کے ملازموں کو بلایا۔بڑا سا نیلے رنگ کا ہوز (پائپ) نکالا اور موٹر چلا دی۔زیر زمین موجود ٹھنڈا ٹھنڈا پانی عبادہ نے گھوڑوں پر ڈالنا شروع کر دیا۔

پانی پڑنے سے گھوڑوں کو تقویت ملنا شروع ہوئی جیسے گرمیوں میں ٹھنڈا پانی پینے سے انسانوں کو ملتی ہے۔اس نے سکرب اٹھا کے بڑی نرمی سے گھوڑوں کو رگڑنا شروع کیا۔گھوڑے اس خدمت سے خاصے مسرور نظر آنے لگے تھے۔

اس نے صبح سے شام تک ان چھ گھوڑوں کی اچھی طرح خدمت کی۔ان کا چارہ اپنی نگرانی میں بنوایا اور اس میں ادویات ملا کے دیں پھر اس ملغوبے کو اس ٹیوب کے ذریعے گھوڑوں کے معدے میں پہنچایا جس کے ذریعے مہابت خان ان کو کھانا کھلاتا تھا۔ایک بڑی سی پچکاری جس میں کھانے کا ملغوبہ بھر کے اس پائپ میں انڈیلا جاتا جو گھوڑوں کے معدے تک پہنچتا تھا۔

یہ محنت طلب کام تھا۔اس میں کافی وقت لگ رہا تھا لیکن عبادہ اپنے پیشے کو ''کام'' سے زیادہ ''خدمت'' سمجھنے والوں میں سے تھی۔اس سارے عمل نے اس کا پورا دن لے لیا،وہ بری طرح تھک گئی تھی لیکن اس نے ہار نہیں مانی اور نہ ہی بقیہ ڈاکٹروں کی طرح بریک،ٹی ٹائم وغیرہ وغیرہ کی ضد کی۔وہ اپنے کام میں جتی رہی۔

اس نے سارے گھوڑوں کو نہلا دیا تھا۔آج وہ اپنی دوا کا اثر دیکھنا چاہتی تھی۔بیماری اسے کچھ

حد تک سمجھ آ گئی تھی۔ وہ کل اس کی تشخیص کے بارے میں یوسف خان سے بات کرلے گی تا کہ گھوڑوں کو ہسپتال لے جائے۔ ان کو واقعتاً ہنگامی نگہداشت کی ضرورت تھی۔

اصطبل عصر کے وقت بالکل خالی ہو گیا تھا کیوں کہ سارے کھلاڑی، سارے ملازم (مہابت خان اور مدثر) کے علاوہ سب حویلی چلے گئے تھے۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ جانے لگی تھی۔ اپنا سامان بند کر کے، اوور آل کو بازو پہ ڈال کے، قدم قدم باہر آ گئی اور کمرے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اس کی سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں کانوں میں دمک رہی تھیں۔ چہرے پر تھکن تھی اور شانے ڈھیلے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے باہر منڈیر میں زرد رنگ کا بلب لگا تھا جس کے اوپر ہیٹ تھی۔ پروانے اڑ اڑ کے اس کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔

''آج بہت محنت کی ہے تم نے بچے۔ اللہ تم کو اجر دے۔'' مہابت خان نے خلوص سے دعا دی۔ وہ واقعی اس کا احسان مند تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور مسکرائی۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ کچھ انتہائی عجیب سا۔

''اللہ ہر قسم کی مشکل آسان کرے۔ بہت دیر ہو گیا ہے بچے۔ منیب خان آیا ہے تم کو لینے۔ اس کے ساتھ جاؤ۔ حویلی سے تو کوئی نہیں آپائے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں منیب خان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس نے قدم مرکزی دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا لیکن تب ہی اسے کچھ کھٹکا۔ اصطبل کے اندر جیسے کسی کو دیکھا ہو۔ کوئی نفسانی وجود۔ کوئی لڑکی۔ اس کے قدم ٹھہر گئے۔

اصطبل کی کھڑکیاں اس طرف کھلتی تھیں وہاں سیاہ گھوڑے پر کوئی بیٹھا ہوا تھا جس کا محض عکس نظر آیا تھا۔ محض جھلک۔

''کیا ہوا بچے؟'' مہابت خان اس کو رکتا دیکھ کے بولا۔

''اصطبل میں کوئی ہے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

مہابت خان نے اندر دیکھا۔ اصطبل کے اندر بھی زرد روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکیاں کچھ کھلی تھیں اور کچھ بند۔ چوں کہ وہ تھوڑا دور تھا تو واضح نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ اندر کوئی ہے۔

''نہیں تو۔ مجھے تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔'' مہابت خان نے کہا۔

''ہوں۔ شاید میرا وہم ہو۔'' اس نے سر جھٹک دیا لیکن ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹک گئی تھی۔

''بچے! میں تم کو چھوڑ آتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔'' مہابت خان کو لگا کہ شاید وہ ڈر رہی ہے اس لیے اس کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ اصطبل کے باہر منیب خان گاڑی کے اندر بیٹھا، کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھا تو چوکس ہو گیا۔

عبادہ نے سامان پچھلی نشست پہ ڈال دیا اور خود بھی پیچھے ہی بیٹھ گئی۔

منیب خان نے فون کندھے اور کان کے درمیان پھنسایا اور دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ پکڑ کے گاڑی ریورس کی۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی زرد روشنی سڑکوں پر پھینکتی تیزی سے چل رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج رات کا کھانا اس نے ضرورت سے زیادہ کھا لیا تھا۔ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ لان میں آ گئی تھی تاکہ کچھ دیر ٹہل کے معدہ ہلکا کر لے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی لیکن زیادہ کھانے کی وجہ سے اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی ہاں البتہ پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ لان میں لڑکے چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ ان میں ابراہیم اور ماحد بھی موجود تھے۔ ابراہیم نے آنکھوں پر پٹی چڑھا رکھی تھی اور وہ نابینوں کی طرح بازو پھیلا پھیلا کے اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے ساتھی بچے مختلف آوازیں پیدا کر کے اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

یہاں روشنی تھی۔ وہ اکیلی ہوتی تو یہاں نہ آتی۔ اندھیرے کا اتنا ڈر تو اس کے دل میں بیٹھ ہی

گیا تھا کہ وہ حویلی میں اکیلے یہاں وہاں جانے سے عاجز آ گئی تھی۔ وہ بازو سینے پر باندھے، ہلکی سی مسکراتی دھیرے دھیرے پنڈول کی طرح ٹہلنے لگی۔

''شور مت کرو خانہ خرابو۔ اندر جا کے کھیلو۔ جاؤ۔'' گل کی آواز پر وہ تیزی سے مڑی۔ وہ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے اس طرف آ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کے بچے رک گئے۔ ابراہیم نے بھی ٹھہر کے آنکھوں سے پٹی ہٹائی۔

''گُلے! ہم کھیل رہے ہیں۔'' وہ میکانکی آواز میں بولا۔

''یہاں سے جاؤ کہیں اور کھیلو۔ تھوڑا اس حویلی میں سکون رہنے دیا کرو۔ جب دیکھو تم لوگوں نے مینا بازار لگایا ہوتا ہے۔'' وہ لکڑی کی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بے زاری سے بولی۔

''کھیلنے دو گل۔ بچے ہیں۔'' اس نے گزارش کی۔

''تو فوارے والے لان میں جائیں۔ یہ ہم خواتین کا عرشہ ہے۔ یہاں ہم لوگ بیٹھتے ہیں۔'' وہ انگشت اٹھا کے سختی سے بولی۔ عبادہ سر جھٹک کر پھر سے ٹہلنے لگی۔

بچوں نے ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھا، ان کے چہرے بدمزہ ہو گئے۔ ابراہیم نے پٹی لان میں پھینکی اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ باقی بچے بھی بادل نخواستہ روانہ ہو گئے۔ پل بھر میں لان خالی ہو گیا۔ گل نے پیر لمبے کر کے میز پہ رکھے اور انگلی کی مدد سے پلیٹ میں موجود حلوہ کھانے لگی، جیسے کھیر کھاتے ہیں۔

''تم سارا دن اصطبل میں تھیں؟'' گل نے حیرانگی سے پوچھا۔ اس کی پشت پہ حویلی کے دروازے کی منڈیر سے جڑا بلب لگا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔

''ہاں ادھر ہی گزرا پورا دن۔'' اس نے بازو کھینچ کے انگڑائی لی۔

''اتنی دیر کیوں لگائی؟ آپریشن کر رہی تھی گھوڑوں کا؟'' گل نے چوٹ کی۔

''اونہہ۔بس کچھ ٹریٹ منٹ دینا تھی۔اس میں وقت لگ گیا۔'' وہ تھکن سے کہتی اس کے پاس آئی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اچھا.....یہ لو.....تمہارے لیے.....غاذان نے دیا ہے۔'' گل نے ایک خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔وہ چونکی پھر یاد آیا اس نے غاذان کو سم کا بولا تھا۔اس نے خاکی لفافہ لے لیا اور اس کو کھول کے دو انگلیوں کی مدد سے کارڈ باہر نکالا۔وہ سم کارڈ تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''غاذان بہت اچھے انسان ہیں۔'' اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔

گل ٹھٹک گئی۔''تم ملی ہو اس سے؟''

''بالکل۔صبح انہی کے ساتھ گئی تھی اصطبل۔باقی مردوں سے کافی مختلف پایا ہے میں نے اسے۔میرا بھائی ہے ناں احمد۔اس جیسی شخصیت ہے۔دھوپ چھاؤں جیسی۔'' گل نے احتیاط سے اس کا چہرہ دیکھا۔ایک حسد بھرا تاثر اس کے چہرے پر چھا گیا۔

''مجھے لگتا ہے یوسف خان نے بہترین فیصلہ کیا ہے۔غاذان جیسا سویٹ انسان ہی سردار بننا چاہیے۔اس کے اندر وہ سحر ہے جو ایک سردار میں ہونا چاہیے۔وہ رعب والی شخصیت نہیں ہوتی، اونچی لمبی، کسرتی؟ بالکل ویسی ہی ہے۔''

''ہوگی۔مجھے کیا۔میں اندر جا رہی ہوں۔تم نے آنا ہو تو آجانا۔'' وہ سرد لہجے میں کہتی اٹھ گئی۔عبادہ نے چونک کر اسے دیکھا۔(اسے کیا ہوا؟)

☆.....☆.....☆

وہ اور گل ساری رات باتیں کرتی تھیں۔گل اسے اپنے بابا کے بارے میں بتاتی اور عبادہ اسے اپنی فیملی کے بارے میں جس میں زیادہ تر احمد اور اس کی شرارتوں کی تفصیل ہوتی تھی۔گل ہر قصے پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔چوں کہ اکلوتی تھی، اس لیے بھائی اور بہن کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی تھی۔

جب وہ اپنے بابا کے بارے میں بتانے لگتی تو اس کی نیلی آنکھوں میں چمک ہوتی اور چہرے پر مسکراہٹ۔ وہ ایسے ہاتھ لہرا لہرا کر بتاتی جیسے وہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو اور بڑی ایل ای ڈی پر وہ اسے دیکھ رہی ہو۔ عبادہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے اس کی طرف کروٹ لیے اس کو غور سے سنتی۔ کبھی کبھار اسے لگتا جیسے گل کو پہلی بار کوئی سننے والا ملا ہو جس سے وہ دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔

''وہ مجھے پولو پلیئر بنانا چاہتے تھے۔'' اس نے اس رات باتوں ہی باتوں میں کہا۔

''اچھا؟'' عبادہ کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

کمرے کی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ صرف سائیڈ لیمپ آن تھا۔ مچھر دانے کے کپڑے بیڈ کے چاروں طرف لٹکے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا وہ کسی خیمے میں سوئی ہوئی ہیں۔

''مگر چچا نہیں بننے دے رہے۔ کہتے ہیں جتنا پڑھایا ہے۔ اتنا ہی بہت ہے۔ مزید فرمائشیں نہیں کرنیں۔'' وہ کہتے ہوئے اداس ہوگئی۔

''مگر پولو پلیئر بننے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لڑکیاں بھی پولو کھیلتی ہیں۔''

''جانتی ہوں لیکن شندور میں کوئی نہیں کھیلتی ناں۔ مجھے شندور میں پولو کھیلنا ہے۔ بابا کی طرح مگر یہاں اسی سال سے کسی لڑکی نے شندور میں پولو نہیں کھیلا۔ ان کے لیے تو یہی مثال ہے۔ یہ سمجھتے ہیں یہاں کوئی نہیں کھیلتا تو پوری دنیا میں کوئی لڑکی پولو نہیں کھیلتی ہوگی۔ اس لیے ان کے ذہنوں کو بدلنا بہت مشکل ہے۔'' اس نے کروٹ بدلی اور سیدھے لیٹ گئی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے جو پیچھے تکیے پر گر رہے تھے۔ لحاف سینے تک لیا ہوا تھا۔ ''یونو۔ میں نے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کوشش کی ہے کہ ان کی دقیانوسی کو بدلوں مگر میں وہ نہیں بدل سکی۔ ان کی سوچ پتھر کی لکیر جیسی ہے۔ بدلتی ہی نہیں۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''پاکستان میں بھی لڑکیاں پولو نہیں کھیلتیں گل۔'' عبادہ نے ناخن دانتوں میں دبایا۔

''جانتی ہوں۔لیکن کوئی لڑکی پولو کھیل نہیں سکتی، یہ کہنا غلط ہے۔ہمارے ملک میں بنیادی سہولیات نہیں ہیں۔صائمہ افتخار، اگر تم جانتی ہو، وہ پاکستان کی لڑکی ہے لیکن وہ انگلینڈ کی ٹیم میں ان لوگوں کے لیے پولو کھیل رہی ہے۔کیوں؟ کیوں کہ پاکستان میں کوئی نہیں کھیلتا۔اب تم خود بتاؤ، میں ان گدھوں کو کس کی مثال دوں؟ جو بھی کہوں، آگے سے ایک جواب آتا ہے، پاکستان میں کوئی نہیں کھیلتا، جیسے پاکستان انتہائی مذہبی ملک ہو۔''

وہ ناک چڑھا کے بولی۔

''مگر گل، اگر تم پولو پلیئر بننا چاہتی ہو تمہیں بھی صائمہ افتخار کی طرح باہر جانا ہوگا۔پاکستان میں کوئی ٹیم نہیں ہے۔''

''کون باہر جانا چاہتا ہے۔'' وہ جھنجھلا کے بولی، پھر اس کی طرف مڑی۔''میں شندور میں کھیلنا چاہتی ہوں۔اپنی سرزمین پہ، اپنے چترال کے لیے۔میرے بابا کا خواب یہیں تک تھا۔''

''پھر ان لوگوں کو کیا مسئلہ ہے؟ شندور تو تم لوگوں کی جگہ ہے۔'' عبادہ نے ماتھے پر بل ڈالے۔

''ان کے ذہنوں کا مسئلہ ہے۔کہتے ہیں کھیلنے کے لیے تمہیں پینٹ شرٹ پہننی ہوگی، چھوٹے چھوٹے کپڑے ہمارے قبیلے کی لڑکیاں نہیں پہن سکتیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ ہر کھیل کا اپنا یونیفارم ہوتا ہے۔چھوٹے کپڑے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔''

''اور سنو۔تم ہنسو گی۔میں ہر سال پولو کی مقامی سلیکشن ٹیم کو درخواست لکھتی ہوں کہ ایک بار میرا کھیل دیکھ لیں، وہ ہر بار جانتی ہو کیا لکھتے ہیں؟''

''کیا؟'' عبادہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کہ ہم ایک لڑکی کو پولو کھیلتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔بہتر ہوگا آپ درخواست نہ بھیجیں۔'' وہ ہنس پڑی۔

''لڑکی کے کھیلنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہونہہ۔''

''ان کی عزتوں کو خطرہ ہوتا ہے۔ وہ عزتیں جو نظر بھی نہیں آتیں۔'' اس نے عبادہ کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

''واؤ۔ آئی مین۔ اٹس سو سٹیریوٹائپ (یہ بڑی دقیانوسی چیز ہے۔)''

''اگزیکٹلی۔''

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ کھیلو گی یا چھوڑ دو گی؟''

''اپنا خواب ہوتا تو چھوڑ دیتی لیکن بابا کا خواب ہے۔ میں ضرور پورا کروں گی۔ میں ہر سال درخواست بھیجوں گی۔ ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن جواب ضرور آئے گا جس میں لکھا ہوگا، مس گل، ہم آپ کو شندور میں شمولیت اختیار کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ آپ چترال کی ٹیم کا حصہ ہیں، فلانے دن، فلانی تاریخ کو شندور پولو پہنچ جایئے گا۔'' وہ ایک امید سے بولی۔

''تمہیں یقین ہے ایسا ہوگا؟'' عبادہ نے اس کا حوصلہ پست نہیں کیا، بلکہ کچھ کھوجنا چاہا۔

''ضرور ہوگا۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔ عبادہ نے سر ہلا دیا۔

''یقین۔ یہ وہ واحد چیز ہے جس کے گرد پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اگر آپ پتھر پہ یقین کریں گے تو وہ خدا ہو جائے گا اور اگر آپ خود پہ یقین کریں گے تو امر ہو جائیں گے۔ ریس شروع ہونے سے قبل جب کھلاڑی ہاتھوں کی انگلیوں کو نیچے رکھتے، گھٹنا ٹکائے، سیٹی کی آواز سننے کے لیے الرٹ ہوتے ہیں، اس وقت ان میں سے بہت سوں کے لیے میدان بڑا ہوتا ہے۔ کھلاڑی چوکس ہوتے ہیں، وقت کم ہوتا ہے، اپنی توانائی کمزور ہوتی لیکن ان میں صرف وہی جیتتا ہے جسے خود پہ یقین ہوتا ہے کہ نہ توانائی کم ہے اور نہ میدان بڑا ہے۔ بڑا ہے تو بس حوصلہ اور اپنی طاقت پہ یقین۔ غزوات مسلمانوں نے اسلحے سے نہیں جیتے تھے، حوصلے اور ثابت قدمی سے جیتے تھے۔ یقین اور ایمان سے

جیتے تھے۔صبر اور استقامت سے جیتے تھے۔اس دنیا میں جب بھی جس بھی لشکر نے فتح پائی، طاقت کے بل بوتے پر نہیں، حوصلے کے دم پہ پائی ہے۔'' وہ رسانیت سے بولی پھر جب پلٹ کے گل کو دیکھا۔وہ خراٹے لیتے ہوئے سو رہی تھی۔اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹک دیا۔

☆.....☆.....☆

اس دن اس کی آنکھ کمرے میں ہونے والے شور کی وجہ سے کھلی۔وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے اٹھ گئی۔کمرے میں ریشم اور پلوشہ صفائی کر رہی تھیں۔پلوشہ کے ہاتھ میں جھاڑو تھا اور ریشم کے ہاتھ میں جالے اتارنے والا برش۔وہ سٹول پہ چڑھ کے چھت کے کونوں میں برش پھیر رہی رہی تھی۔پلوشہ نیچے گر کے ''نا نظر آنے'' والی گرد کو صاف کر رہی تھی۔ایک ہاتھ سے اس نے سٹول بھی پکڑا ہوا تھا۔

''پلوشی، ٹھیک سے پکڑو۔میں گرا تو تم کو کچل ڈال دے گا۔سمجھا۔'' ریشم نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔پلوشہ نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

''ایک تو سمجھ نہیں آتا جو کمرہ صاف ہے۔تم اس کو کیوں صاف کر رہا ہے؟''

''پاگل، جو گندے کمرے ہیں وہ باقیوں کو کرنے دو۔میرا دل نہیں ہے آج خوار ہونے کا۔اس لیے ادھر ہی ٹھہر جاؤ۔''

پلوشہ نے افسوس سے سر دائیں سے بائیں ہلایا۔تو ریشم بھی کام میں ڈنڈی مارتی تھی۔

انٹرسٹنگ.....!

اس نے بانہیں پھیلا کے چند انگڑائیاں لیں۔کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔باہر بارش رک چکی تھی۔سورج نکل آیا تھا۔اس کی روشنی عین اس کے بیڈ پہ پڑ رہی تھی۔یہاں مہمانوں کی بہت عزت تھی لیکن دیر سے اٹھنے پر مہمانوں کے ساتھ بھی سمجھوتا نہیں کیا جاتا تھا۔وہ سوئیں یا

مریں۔ان کے کام مؤذن کی بانگ کے ساتھ شروع ہو جاتے تھے۔

ریشم کی نظر اس پہ اچانک پڑ گئی۔اس نے برش نیچے کیا اور اس کی طرف پلٹی، اسی وقت اس کا ہیل والا جوتا پلوشہ کے ہاتھ پہ پڑ گیا۔پلوشہ کی چیخ گلے میں اٹک گئی۔

''دوپہر بخیر۔لگتا ہے تم رات کو نہیں سویا۔'' ریشم نے مسکرا کے پوچھا۔لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''ہوں۔'' اس نے مسمسی سی آواز میں ہنکار بھرا۔اب اس کو کیا بتاتی تھی کہ کتنی دیر تک سونے کی عادی ہے۔

''چلیں پھر آپ اٹھ جائیں میں آپ کے لیے ناشتہ لے کے آتا ہوں۔'' وہ فوراً سے بیشتر چہک کے بولی لیکن اسی لمحے اسے ٹھوکا پڑا، وہ سٹول سے جھٹکے سے پھسلی اور منہ کے بل عبادہ کے سامنے بیڈ پہ جا گری۔عبادہ تیزی سے اس کی طرف لپکی لیکن ریشم بیڈ پہ گر چکی تھی۔بیڈ کی سطح سپرنگ کی طرح اچھل گئی تھی۔

''پلوشی.....'' وہ تیزی سے اٹھی۔پلوشہ منہ کھولے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔اس کی آواز ابھی بھی نہیں نکل رہی تھی۔ریشم گڑبڑا گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کے قریب آئی۔پلوشہ ہاتھ ہوا میں جھلا رہی تھی۔

''میوٹ کیوں ہو گیا ہے؟ ''پاز'' بٹن نکل لیا ہے کیا؟'' ریشم کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔عبادہ بھی فکرمندی سے کھڑی ہو گئی۔پلوشہ نے ہاتھ کی پشت پکڑ کے ریشم کو دکھائی جہاں ہیل دھنسنے کی وجہ سے گڑھا بن گیا تھا۔

''سس.....'' ریشم یکدم پشیمان ہو گئی۔''معاپ کر دو۔دھیان نہیں تھا۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے سہلانے لگی جس سے پلوشہ کو اور درد ہونے لگا۔اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''ظلم کرنے کے لیے سب کو میں ملا ہوں۔مت کر مجھ پہ تشدد۔میں بھی انسان ہوں۔'' وہ رو

پڑی۔اٹھارہ سالہ پلوشہ روتے ہوئے بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔اس کا گلہ ویسے بجا تھا۔

''دیکھا نہیں میں نے.....''

''دوزخ میں جاؤ۔'' وہ اس پہ لعنت بھیج کے باہر نکل گئی۔ریشم نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ جا چکی تھی۔وہ لاچاری سے پلٹ کے عبادہ کو دیکھنے لگی۔عبادہ نے گہری سانس لے کے شانے اچکا دیے۔

☆.....☆.....☆

فریش ہونے کے بعد وہ نیچے آ گئی۔آج بلتی قبیلے نے آنا تھا اس لیے حویلی میں معمول سے ہٹ کر ہلچل تھی۔راہداریوں میں لڑکیاں ستونوں سے پھولوں کی لڑیاں چپکا رہی تھیں۔وہ اسٹول پہ کھڑی تھیں۔باقی ہاتھوں میں لیے بڑے بڑے پراتوں میں موجود مالائیں انہیں پکڑا رہی تھیں۔صحن میں نیچے پیڑھیوں پر لڑکیاں بیٹھی تھیں جو تخت پر براجمان گاؤں کی خواتین اور مہمان خواتین کے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگا رہی تھیں۔

موٹی چچی نے بھی شلوار ٹخنوں سے اوپر چڑھا رکھی تھی۔آستین بھی کہنیوں تک فولڈ تھیں۔انہوں نے پیروں پر مہندی لگائی ہوئی تھی البتہ ہاتھ دو لڑکیوں کے ہاتھ میں تھے جو ان کی انگلیوں کے بالائی پوروں کے گرد گول گول مہندی لگا رہی تھیں۔

صحن میں کچھ ٹین ایجر لڑکیاں ایک طرف دائرہ بنا کے کھڑی تھیں۔ان کے لباس ایک جیسے تھے۔قد ایک جیسے تھے۔جیولری ایک جیسی تھی۔وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے گول دائرے میں کھڑی تھیں جیسے میچ شروع کرنے سے پہلے تمام فیلڈرز اکٹھے ہوتے ہیں۔

وہ ایک ستون کے ساتھ شانے جوڑ کے کھڑی ہو گئی۔وہ اداس تھی لیکن وہ خوش بھی تھی۔وہ یہاں سے خالی ہاتھ ضرور جا رہی تھی لیکن یہاں کی ثقافت کے بارے میں اسے بہت کچھ پتہ چل گیا

تھا۔ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، ریتی رواج، موسم، مزاج سب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"سنو....." یکدم کسی نے آواز لگائی۔ اس نے چونک کے اوپر دیکھا، وہاں ثمامہ کھڑی تھی جو ہاتھ میں ایک لمبی مالا لے کے نیچے لٹکانے لگی تھی۔ مالا کا نچلا حصہ نیچے آتا تو عین عبادہ کے منہ پہ لگتا۔

"پیچھے ہو جاؤ..... چوٹ لگ جائے گا....." وہ نرمی سے بولی۔ عبادہ پیچھے ہو گئی۔ وہاں اوپر راہداریوں میں لاتعداد لڑکیاں کھڑی تھیں۔ وہ نیچے مالائیں پھینک رہی تھیں۔ نیچے کھڑی لڑکیاں انہیں کیچ کر کے دیواروں، ستونوں پر سجا رہی تھیں۔

اس کا ناشتہ روشانے کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ روشانے جلدی اٹھتی تھیں لیکن آج وہ اپنے بیٹے کی وجہ سے ناشتہ نہیں کر پائی تھی۔ وہ کالاش میں شاہ سردار کی بہو تھیں۔ آج کل حویلی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دستار پوشی کے بعد گھر جانا تھا۔ رشتے میں وہ یوسف خان اور موٹی چچی کی بیٹی تھی۔

وہ اسی لان میں ناشتہ کر رہی تھی جہاں اس رات غاذان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میز لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ روشانے مکھنی چائے سے ایسے لطف اندوز ہو رہی تھی جیسے اسی سوغات کے لیے وہ جیتی ہوں۔ جب کہ اس سے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا جا رہا تھا۔ ریشم نے اس کے لیے سادہ چائے نکالی تھی۔ وہ سر جھکائے ناشتے میں مصروف تھی۔ وہ ناشتہ جس کے تمام کھانے "کیلوریز" سے بھرے ہوئے تھے۔

بلیک جینز پہ اس نے گھٹنوں تک آتی کلیوں والی فراک پہنی تھی۔ دوپٹہ البتہ گردن میں تھا۔ بالوں کو سامنے سے "پف" بنا کے پیچھے کیچر میں جکڑا تھا۔ چہرے پہ آج کسی قسم کا کوئی میک اپ نہیں تھا۔ اس کا اوور آل کرسی پہ پڑا تھا اور سٹیتھوسکوپ میز پہ ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ جب سے وہ ناشتہ کر رہی تھی، روشانے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جیسے اس کے نین نقش حفظ کر رہی ہو۔

ریشم ایک طرف اپنی ہم عمر لڑکی کے ساتھ روشانے کے بیٹے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ

آپس میں باتیں کر رہی تھیں جب کہ پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا وہاں موجود پودوں کی بڑی قینچی سے کٹائی کر رہا تھا۔ قینچی کی کٹ کٹ کی آواز سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پودوں کے ٹوٹتے پتے اور ٹہنیاں نیچے گر رہی تھیں۔

''تم کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟ کچھ چاہیے ہو تو ہم کو بتانا۔'' روشا نے خلوص سے کہنے لگی۔

''جی ضرور۔'' وہ نرمی سے مسکرائی۔

''غاذان سے ملی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔''

''کیسا ہے؟'' روشا نے جانے کیا اخذ کرنے کے موڈ میں تھی۔

''اچھے ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ روشا نے اپنی پیالی اٹھائی اور لبوں سے لگائی، ایک گھونٹ لینے کے بعد اس نے پھر عبادہ کو تسلی سے دیکھا۔ وہ اپنے ناشتے میں مگن تھی۔

''اس کو پڑھا لکھا بہو پسند تھا۔'' وہ دھیرے دھیرے کہنا شروع ہوئیں۔ ''یہ گل لالہ ہے ناں۔ اس نے پڑھا ضرور ہے لیکن ابھی تک جاہل، گنوار، نالائق اور بدتمیز ہے۔ ذرا سا اس کو لحاظ نہیں ہے بڑوں کا۔ سب سے قینچی کی (انگلیوں سے قینچی بنائی) طرح زبان چلاتا ہے۔ چک چک چک چک۔ مسفرہ ہوتا، تو اس کے بارے میں سوچتا لیکن کون بنائے گا اس ہٹ دھرم کو اپنا بہو؟ جو بھی بنائے گا۔ لوہے کا کلیجہ ہوگا اس کا۔'' اپنے بھائی کی ساری بھڑاس نکال دی۔ عبادہ نے بمشکل ہنسی روکی۔

''تمہارا تو کوئی رشتہ وشتہ نہیں ہوا۔'' اب وہ مدعے کی بات پر آئیں۔ عبادہ کے دل پر گھونسا پڑا، حلق میں لقمہ اٹکتے اٹکتے رہ گیا۔

''نہیں۔'' اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر لقمہ اندر اتارا۔

''مسفرہ چچی ہوتا تو تم کو ضرور بہو بناتا۔تم بہت پیارا ہے۔'' وہ وارفتگی سے بولی۔عبادہ تکلف سے مسکرائی۔سارہ مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔کہاں غاذان اور کہاں وہ۔زکوٹے اور بتوڑی والی جوڑی تھی۔استغفراللہ۔

''ویسے وہ ہیں کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''اللہ کے پاس۔چھ ماہ پہلے ٹی بی سے فوت ہوگیا۔'' روشانے نے افسردگی سے کہا۔اس نے گردن موڑ کے ریشم کو دیکھا جو بلتی لڑکی کے ساتھ ہنس ہنس کے باتیں کررہی تھیں۔اس کو دیکھ کے اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کا غم اتنا تازہ ہے۔وہ سوچتی رہی تھی کہ ریشم جیسی ہنس مکھ بیٹی کی ماں اس سے ملنے کیوں نہ آئی اور گل کی ماں بریخنہ اس سے مل چکی تھی اور اکثر گزرتے ہوئے بھی وہ اس سے سلام دعا کرلیتیں۔

وہ گہری سانس لے کر ناشتے کو دیکھنے لگی۔

''وہ ہوتی تو اپنے بیٹے کے لیے تمہیں چن لیتا۔اس کو پڑھی لکھی لڑکیاں اچھا لگتا تھا۔اپنا گل کو دیکھو۔وہ اس کا پسندیدہ لڑکی تھا۔اسی لیے تو.....'' وہ کہتے کہتے رکی۔ان کی نظر مالی لڑکے پہ پڑی۔

''اوئے کم بختا۔سارا پودا گنجا کردیا۔کیا کررہا ہے خانہ خرابہ؟''

'خود کرلیں پھر۔'' لڑکے نے قینچی روک کر ان کو جل کے دیکھا پھر واپس کام میں لگ گیا۔روشانے نے گھورا۔بدلحاظ۔

اسی لمحے سیڑھیوں پہ گل آتی نظر آئی۔

گلابی کیلاشی پشواز پہ سرخ آنچل لیے،پیروں میں جوگرز پہنے،ہاتھوں میں سرخ سیب لیے۔منہ ہلاتے ہوئے اس طرف آرہی تھی۔سیب کا رنگ اس کے آنچل کے ساتھ مل رہا تھا اور اس کے جوڑے کا رنگ اس کے گالوں کے ساتھ۔

کیا امتزاج تھا!

چلتے چلتے وہ ریشم کے پاس سے گزری اور جب ہی ریشم نے اسے کہنی سے پکڑ کے اپنی طرف کھینچا۔ وہ لڑکھڑا کے اس کے سامنے آئی۔ سیب کا ٹکڑا منہ میں تھا۔

''تین راتوں سے کہاں سو رہا ہے تم؟'' ریشم نے آنکھیں سکیڑ کے پوچھا۔ انداز جاسوسانہ تھا۔

''اپنے کمرے میں۔'' اس نے گردن اکڑا کے کہا۔

''وہاں عبادہ سوتا ہے۔ کیا تمہیں.....'' ریشم کہتے کہتے رکی۔ ''ایک منٹ۔ تم وہاں کیسے سو رہا ہے؟''

''عبادہ نے کہا تھا اسے ڈر لگتا ہے اس لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ سونے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا مہمان کو کیوں منع کروں؟ تم جانتی ہو ناں ہم چترالی مہمان کو نہ نہیں کرتے۔ اس لیے بس۔'' اس نے معصومیت سے کہتے ہوئے سیب میں دانت گاڑے۔

''ڈر؟ کس چیز سے؟''

''اندھیرے سے.....''

''نہیں۔ نہیں۔ تم..... تم نے کچھ کیا۔ تم نے مجبور کیا ہے اس کو۔''

''ہاں کیا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ کچن جا رہی ہے تو میں نے مین لیڈ نکال دی کیوں کہ مجھے پتہ تھا وہ روشنی کی کوئی چیز نہیں لائی اس لیے ڈرے گی اور وہ ڈر گئی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''میں بتاتی ہوں اس کو..... رکو ایک منٹ۔'' ریشم نے جارحانہ انداز میں پیر رپٹے تو گل نے اطمینان سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کوشش بھی مت کرنا ریشم نعیم اللہ ورنہ میں سب کو بتا دوں گی کہ تم اور تمہاری چچیاں غاذان کا فون لے کر رات کو فلمیں دیکھتی ہو۔'' اس نے ہلکا سا دھکا دے کر اسے پیچھے کر دیا۔

ریشم کے تلوؤں سے لگی، سر میں بجھی۔ ''کک..... کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ثبوت؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک قدم آگے آئی۔

''ہہہ .....ہاں.....'' وہ ہکلائی۔

''میرا ثبوت پندرہ سال کا ہے، پانچ فٹ نو انچ کا ہے، آنکھیں نیلی ہیں، رنگ گورا ہے اور جانتی ہو اس کا نام کیا ہے؟'' اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔''اس کا نام ابراہیم ہے۔'' آخری لفظ وہ ذرا غرا کے بولی۔ ریشم نے بے ساختہ آنکھیں بند کر لیں، گل کے منہ میں موجود سیب کے چند ٹکڑے اس کے منہ پر پڑے۔ اس نے آنچل کو مٹھی پر لپیٹ کر چہرہ پونچھ لیا۔

''جل ککڑی ریشمے۔ کھٹل کے بستر پر سونے والی جل ککڑی جو میرے کمرے سے جلتی ہے۔ سڑتی ہے۔ سیخ کباب بنتی ہے۔'' وہ مزے سے لہرا لہرا کے کہتی سر جھٹک کے پلٹ گئی۔ اسی لمحے عبادہ اٹھ گئی۔ اس نے سٹیتھوسکوپ گردن میں پہنا پھر اوور آل اٹھایا۔

''تم ایک نمبر کی بے شرم ہو..... میں چھوڑوں گی نہیں۔'' ریشم نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن بچے کی وجہ سے کر نہیں پائی اور پیر پٹختی رہ گئی۔

''جا رہا ہے؟'' روشانے نے اسے اٹھتا دیکھ کے پوچھا۔

''جی۔ جانا ہوگا۔ گھوڑے انتظار کر رہے ہیں۔ ان کو میری بے حد ضرورت ہے۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔ اسی اثنا نظر گل پہ پڑی جو مالی لڑکے کے سر پر کھڑی اس کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز استاد والا تھا۔

''خانہ خرابہ، پہلے گدھوں کے بال کاٹتے تھے تم؟ تم کو پودے کاٹنا نہیں آتا؟'' گل نے کہنی اٹھا کے بیچارے لڑکے کی کمر میں ٹھونک دی۔ وہ فرش پہ جھٹکا کھا کے گر گیا۔ روشانے نے سکون کا سانس لیا۔ (اچھا ہوا)

گل نے بچے ہوئے سیب کا ٹکڑا گیند کی طرح لان سے باہر اچھال دیا پھر ہونٹ ہاتھ کی پشت

سے صاف کیے اور نیچے لڑکے کے پاس پنجوں کے بل بیٹھی۔ معصوم سے سرخ لڑکے نے گال پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

''تم کو کام سکھا کے بھیجا گیا ہے یا پھر کسی نے کہا تھا کہ گل لالہ سے سیکھ لینا؟''

''باجی کر تو رہا تھا۔'' لڑکے نے ہونٹ لٹکائے۔

''کرنا نہیں ہوتا۔ یہ پودے ہیں تمہارے بال نہیں جو جانوروں کی طرح اکھاڑ رہا ہے۔ ایڈیٹ۔'' وہ کھڑکی ہوگئی۔ ''میں تم کو بتاتی ہوں کہ پودے کی کاٹ چھانٹ کیسے کرتے ہیں۔'' اس نے آستین فولڈ کیں اور آنچل کے کونوں کو پیچھے سے اٹھا کے کندھوں کے آگے سے گزار کے گرہ لگا دی۔

''پودے کو کاٹنے کے لیے پہلے اس کے زاویے لینے پڑتے ہیں۔ حجام کی طرح۔ وہ تمہارے سارے بال نہیں کاٹتا۔ وہ ایک طریقے سے تمہارے بالوں کو کنگھی میں پکڑ کے تھوڑے تھوڑے سرے کاٹتا ہے۔ اس لیے کاٹنے سے پہلے دیکھو کہ پودے کی کونسی شاخیں باہر نکل رہی ہیں اور باہر نکل کے پودے کو خراب کر رہی ہیں۔ جیسے اس کو دیکھو۔'' اس نے ایک پودے کی شاخیں درمیان میں سے دائیں بائیں کھینچیں۔ ''اندر گہرے سبز رنگ کے پتے ہیں۔ ان پتوں تک کاٹنا ہے پودا۔ سمجھے۔''

اس نے جھک کے موٹی اور بھدی قینچی اٹھائی۔ ''قینچی کی نوک زمین کی طرف کر کے پودہ کاٹنا شروع کرنا ہے۔'' ''تم نے نائی کی طرح سیدھی پکڑی ہوئی تھی۔ جاہل۔''

گل نے کسی تجربہ کار مالی کی طرح قینچی سے پودے کو کاٹنا شروع کیا۔ عبادہ سینے پہ ہاتھ باندھ کے اس کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گل نے پہلے پودے کی اوپری سطح کو برابر میں کاٹ دیا یوں کہ وہ کسی میز کی طرح چکور ہوگیا پھر قینچی کا رخ زمین کی طرف کر کے خود پودے کے بالکل اوپر ہوگئی اور

یوں زاویہ سجایا کہ باہر نکلنے والی ٹہنیاں اور پتے اسے اچھی طرح نظر آنے لگے۔ اب وہ کمال مہارت سے ٹہنیاں کاٹ رہی تھی اور پودہ اپنی شکل میں واپس جا رہا تھا۔ اس نے دس منٹ میں سارا کام کر دیا۔ پودے کو چکور شکل میں تبدیل کر کے وہ آگے آئی۔

''ہمم..... یہ لو..... اور ایسے کرتے ہیں کٹنگ.....'' اس نے قینچی لان میں پھینکی اور بے ترتیب سانسوں کو بحال کرتے ہوئے پیشانی سے پسینہ انگوٹھے سے صاف کیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

لڑکے نے ہونٹ لٹکا کے قینچی اٹھائی۔ (آئی بڑی بائنسٹ۔ مجھے سکھائے گی۔ ہونہہ۔ سمجھتی کیا ہے خود کو؟)

''ویل ڈن۔ تم تو ملٹی ٹیلنٹڈ ہو۔'' عبادہ نے تالی بجاتے ہوئے اسے پورے خلوص سے سراہا۔

''تم نے میرے باقی ٹیلنٹ بھی دیکھے ہیں کیا؟'' گل نے شوخ ہو کے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تمہیں سب آتا ہے۔''

گل نے میز پہ پڑے جگ سے گلاس میں پانی بھرا اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ عبادہ پلٹ کے اس کو دیکھنے لگی۔ گل نے چند گھونٹ بھرے پھر چہرہ گھما کے اس کو دیکھا۔

''میرا ایک اصول ہے۔ سننا چاہیں گی؟''

''کیوں نہیں۔ ضرور۔''

''آپ کو ایک چیز کے بارے میں سب کچھ آنا چاہیے اور ہر چیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ آنا چاہیے۔''

عبادہ چونکی۔ ''یہ تو کوٹ ہے۔ آ آ۔ تھامس۔ تھامس۔''

''تھامس ہوزلے کا Try to know something about everything and everthing about somethin''

''ہاں.....صحیح کہا.....'' عبادہ مسکرائی۔

''اصطبل جارہی ہو۔'' گل نے اس کی تیاری دیکھی۔لڑکا واپس پودے کاٹنے لگ چکا تھا۔

''ہوں۔''

''ہوں۔چلو۔بیسٹ آف لک۔'' وہ انگوٹھا اٹھا کے خلوص سے بولی۔

''تھینک یو۔'' وہ تائیدی انداز میں سر کو خم دیتی آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ منیب خان کے ساتھ اصطبل آئی تھی۔آج کل وہی اس کو پک اینڈ ڈراپ سروس دے رہا تھا۔دو دن پہلے اس نے گھوڑوں کو ٹیکے لگائے تھے،سم آنے کے بعد وہ وقفے وقفے سے مہابت خان کو فون کر کے گھوڑوں کی صورتحال معلوم کر رہی تھی۔اگر گھوڑوں کو لیمنس ہوتا تو ان انجیکشنز سے اب تک کوئی نہ کوئی بہتری سامنے آچکی ہوتی۔وہ کافی پُر اثر ٹیکے تھے لیکن بدقسمتی سے اس نے ابھی تک کوئی خوشخبری نہیں سنی تھی۔مطلع ابر آلود تھا۔آسمان پر دودھیا بادل چھائے ہوئے تھے۔اپنے بیگ کو خود گھسیٹتی وہ متعلقہ کمرے میں آگئی۔

آج اصطبل میں لڑکے نہیں نظر آرہے تھے۔اکا دُکا ملازم تھے جو اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔وہ جب جب یہاں آتی تھی۔مہابت خان کسی فرماں بردار ملازم کی طرح اس کے ساتھ ہوتا تھا۔مہابت خان کو گھوڑوں سے بے انتہا انسیت تھی۔وہ ایک لمحے کے لیے بھی گھوڑوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا مگر آج وہ اس کمرے میں اکیلی تھی۔

اس نے بیگ نیچے رکھا اور اوورآل کی آستینیں فولڈ کیں۔اس نے جن دو گھوڑوں کو ٹیکے لگائے ہوئے تھے۔وہ نیم مردہ پوزیشن میں لیٹے ہوئے تھے۔اس نے پھر سے سارا چیک اپ کیا،جہاں ٹیکے لگائے وہاں بھی سنسیشن چیک کی۔گھوڑوں کو ذرا فرق نہیں پڑ رہا تھا۔وہ آج پھر گھوڑوں کو نہلانا

چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہوز لگانے کے لیے اٹھتی، وہ ٹھٹک گئی۔اس نے طارق سر کو بھی ساری معلومات پہنچا دی تھیں۔طارق سر نے لاہور کے مشہور ویٹس پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی بنائی تھی، اسی میں یہ معاملہ زیرِ غور چل رہا تھا۔

کیا پتہ اب تک انہوں نے کچھ معلوم کر لیا ہو؟

وہ سوچتے ہوئے کھڑی ہوئی، جیب سے فون نکالا، کھڑکی تک آئی اور طارق سر کا نمبر ملا دیا۔ گھنٹیاں جا رہی تھیں۔وہ اپنے آفس میں لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھے ہوئے تھے، ان کی کافی کا کپ ساتھ پڑا تھا جس سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔معلوم ہوتا تھا وہ کچھ دیر پہلے آفس آئے تھے۔ان کے دائیں طرف کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔باہر مرکزی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ان کا سائیڈ پہ رکھا فون تھرتھرایا۔لیپ ٹاپ چھوڑ کر انہوں نے فون اٹھایا پھر قدرے پیچھے ہوئے۔

''ہیلو مس سلیم۔کیا حال ہے؟'' انہوں نے بشاشت سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں سر۔'' وہ مسکرائی۔

''پیشنٹ کیسے ہیں؟''

''وہی حالت ہے۔لیمنس کے انجکشن سے کوئی فرق نہیں پڑا۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''اوہ۔'' ان کی تاسف بھری آواز آئی۔

''آپ بتائیں سر۔کمیٹی کسی نتیجے پر پہنچی یا نہیں؟'' وہ تذبذب سے پوچھنے لگی۔میدان کے عین اوپر بادل آ گئے تھے۔اس طرف چھایا سی پڑنے لگی تھی۔

''مس سلیم، آپ نے جو جو علامات بتائیں اور جو معلومات فراہم کیں، ان کو دیکھتے ہوئے ہم نے ایک Deduction (مشاہدے سے حاصل ہونے والا نتیجہ) کی ہے۔''

''کیا سر؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

''میں جو کچھ آپ سے پوچھوں، آپ مجھے بتائیں، پھر میں ڈیڈکشن بتاتا ہوں۔'' طارق نے لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر کچھ ٹائپ کیا، اسکرین پر ایک بڑی سی فائل کھلی، وہ سکرال کرتے ہوئے نیچے آئے، اس فائل میں گھوڑوں کی مختلف بیماریوں کی علامات اور صورتحال لکھی ہوئی تھیں۔

''جی سر۔'' وہ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے گھوڑوں کے پاس آ گئی۔ طارق سر نے دراز سے ڈائری نکالی، ہولڈر سے پین اٹھایا پھر فون کان اور کندھے کے درمیان پکڑ لیا اور ڈائری کا سفید صفحہ کھولا۔

''مس سلیم..... کنڈیشن کیا ہے؟''

''نو موومنٹ۔ نو پاور۔''

''سنسیشن ہے کیا؟ درد درد محسوس ہو رہا ہے ان کو یا نہیں۔'' وہ نوٹس لے رہے تھے۔

''سر سنسیشن ہے۔ درد فیل کر سکتے ہیں اور ری ایکشن بھی شو کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ری ایکٹ نہیں کر پاتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے جسم میں رسپانس کی جان نہ ہو لیکن فیلنگ ہوں۔'' وہ ناخن گھوڑے کی جلد میں چبھو رہی تھی، گھوڑے کی آنکھ میں ردعمل نظر آ رہا تھا۔

''یعنی پین فیلنگ ہے۔''

''یس سر۔''

''کھانے کی صورتحال کیا ہے؟'' وہ لیپ ٹاپ پر نظر ڈال رہے تھے۔

''سر کھانا چبا نہیں سکتے۔ دانتوں کی موومنٹ نہیں ہے لیکن یہ ان کو سٹامک فیڈنگ کرا رہے ہیں تھروہول (سوراخ کے ذریعے)۔ جس کی وجہ سے گھوڑے ابھی تک زندہ ہیں۔'' اس نے نرمی سے گھوڑے کا سر سہلایا۔

''لیمنس تھی؟''

''نوسر۔ٹانگوں میں سنسیشن ہے اور کوئی جوڑ ہٹا ہوا نہیں ہے۔سب ٹھیک ہے۔''

''ایکوئین لیمینائٹس؟''

''نوسر۔ہوف وال (کھر) ٹھیک ہیں۔''

''ای پی ایم؟''

''نوسر۔رسپانس نہیں ہے تو ای پی ایم نہیں ہوسکتا۔''اس نے قطعی انداز میں تردید کی۔

''وہ کھڑے نہیں ہو سکتے؟ سنسیشن ہے،فیلنگ نہیں،ری ایکشن نہیں مگر سانس لے رہے ہیں۔''وہ لیپ ٹاپ سے ڈیڈکشن کو پڑھ رہے تھے۔''اٹس لائک آلو بلڈ پریشر پیشنٹ (کم فشار خون والے مریض کی طرح) جو اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر چکرا کر گر جاتا ہے۔''

''جی سر.....''

طارق پیچھے ہو گئے اور پین انگلیوں میں گھمانے لگے۔''یہ چیک کریں کہ گھوڑوں کو جس دن سے یہ بیماری ہوئی ہے۔اس دن زیادہ دوڑایا تو نہیں گیا تھا؟ آئی مین کبھی کبھار ضرورت سے زیادہ دوڑانے سے مصنوعی طور پر گھوڑے اپنا توازن کھو دیتے ہیں۔''

''سر،وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے پھر گھوڑے دوڑنے لگتے ہیں۔ان کو مہینہ ہو چکا ہے۔یہ مصنوعی نہیں،دائمی مرض ہے۔''

''ابھی بھی آپ کو نہیں پتہ چلا کہ یہ کیا ہے؟''انہوں نے بڑی شفافی سے پوچھا۔

''نوسر۔''اس نے صاف صاف کہا۔

''مجھے لگا تھا میں نے ایک ہونہار ویٹ کو وہاں بھیجا ہے۔آپ نے مجھے مایوس کر دیا۔''انہوں نے شرارت سے کافی کا کپ اٹھا کے لبوں سے لگایا۔دوسری طرف عبادہ کا چہرہ بجھ گیا۔

''میں پتہ کرتی ہوں سر۔''وہ مسمسی آواز میں بولی۔

''ضرورت نہیں ہے مس سلیم اپنی انرجی ضائع کرنے کی۔ہم نے اخذ کرلیا ہے۔''انہوں نے گہری سانس نکالتے ہوئے کپ میز پر رکھا۔

''کک.....کیا سر؟''وہ بے قراری سے بولی۔

''مس سلیم۔آپ کے مریضوں کو سیلبرل اٹیزیہ(Celeberal Ataxia) ہوا ہے۔''

''وہاٹ۔''اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔''نہیں سر۔سیلبرل اٹیزیہ نہیں ہے۔''اس نے بے دردی سے تردید کی۔

''مس سلیم یہ ہے۔''انہوں نے دھونس سے کہا۔

وہ تیزی سے گھوڑے کے منہ کی طرف بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔جیسے بائے بائے کرتے ہیں۔گھوڑا ہنوز اسی پوزیشن میں تھا۔اس نے پلکیں نہیں ہلائی تھیں۔پلکیں ساکت تھیں۔بالکل پتھر جیسی۔وہ ایک ایک کرکے سارے گھوڑوں کے پاس گئی اور یہی کیا۔سارے گھوڑوں نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔وہ بے یقینی سے کھڑی ہوئی۔

''سر.....اٹس ایمپوسبل۔''اس نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا۔''ایک ساتھ چھ گھوڑوں کا دماغ ڈیج نہیں ہوسکتا۔نو۔ناٹ پوسیبل۔''

''ویل مس سلیم۔کمیٹی کے چار لوگوں نے اپروول دیا ہے۔میرا نہیں خیال،اس میں کوئی شک ہوگا۔''

''سر اٹیزیہ کس چیز سے ہوسکتا ہے؟''وہ دبے دبے لہجے میں برہم ہوئی۔

''اٹیزیہ کے ممکنات میں کیا کیا شامل ہے؟مس سلیم؟''انہوں نے وائیوا لینے والے ٹیچر کی طرح ٹھنڈا سوال کیا۔

''انفیکشن،نیوٹریشن کی کمی،بھاری دھاتوں سے سامنا،ہسٹیریا،زہر.....وغیرہ۔''

''بیکٹیریا بھی تو ہوتا ہے۔'' وہ نرمی سے مسکرائے۔

''بیکٹیریا؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''چوں کہ چترال پہاڑی علاقہ ہے تو ممکن ہے کہ جانور تالاب، چشموں یا جھرنوں سے پانی پیتے ہوں۔ بسا اوقات پانی میں کچھ بیکٹیریا ہوتے ہیں جو ان کی ناک کے ذریعے دماغ میں داخل ہو جاتے ہیں اور اٹیزیہ کر دیتے ہیں۔ کیا پتہ آپ کے پانی میں ایسے جرمز ہوں یا پھر چارے وغیرہ میں؟ ہے ناں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ تشخیص کرالیں۔ ہم نے صرف ڈیڈکشن کی ہے۔ آپ ہائپوتھیسز بنا کر تجربہ کریں۔ آپ کے سامنے سب آجائے گا۔''

''بلڈ ٹیسٹ رپورٹس میں تو ایسا کچھ نہیں آیا۔''

''آپ ایم آر آئی کرالیں، آپ کو پتہ چل جائے گا۔'' انہوں نے کافی کا کپ پھر سے اٹھایا۔

''ایم آر آئی؟'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

''انہوں نے کرایا تو نہیں ہے؟''

''میرے پاس جو رپورٹس تھیں۔ ان میں نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب نہیں کرایا۔ آپ ان سے اجازت لے لیں اور ایم آر آئی کے لیے گھوڑوں کو پشاور روانہ کر دیں۔ وہاں ان کے ٹیسٹ بھی ہو جائیں گے اور ان کا علاج بھی شروع ہو جائے گا۔'' انہوں نے چائے کا کپ واپس رکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

اسے فوراً ایکشن لینا چاہیے۔ سیلبرل اٹیزیہ دماغ کو کھانے والی بیماری تھی۔ اگر کچھ عرصہ گھوڑے اسی طرح پڑے رہے تو ممکن تھا کہ ان کی جان چلی جاتی اور جیسے کہ سر نے بتایا کہ پانی یا چارے میں بیکٹیریا ہو سکتے ہیں تو اسے بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس تالاب سے اور بھی گھوڑے

پانی پی رہے تھے۔ان کو بھی کچھ ہوسکتا تھا۔اس نے فون کی فیڈ نکالی،اس کے پاس صرف غاذان کا نمبر تھا۔سم ڈالنے کے بعد سب سے پہلے اسی کا میسج ملا تھا۔اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے جلدی سے اس کا نمبر ملایا۔

☆.....☆.....☆

وہ دریائے چترال کے کنارے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ان کے آگے دریائے چترال کا ٹھنڈا پانی گزر رہا تھا۔پانی اس قدر شفاف تھا کہ دریا کی تہہ میں موجود پتھر اور چھوٹی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔اس سمت وہ سست روی سے بہتا تھا۔اس کا شور ہلکی ہلکی موسیقی کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ پیچھے کچی سڑک پہ غاذان کی گاڑی کھڑی تھی۔اس نے نیلی پینٹ پہ سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔سر پہ پکول (چترالی ٹوپی) تھی جس میں مور پنکھ لگا ہوا تھا۔وہ آستین کہنیوں تک موڑے،عبادہ کی بات غور سے سن رہا تھا۔دریا کے کنارے لگے درختوں کا سایہ پانی میں گر رہا تھا۔پیچھے کھیت میں جن میں غالباً کوئی فصل لگی ہوئی تھی وہاں عورتیں اور مرد نری دوپہر میں کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

''اس کا مطلب چھ گھوڑوں کے دماغ کے شریانوں میں کوئی مسئلہ ہے۔'' اس نے ٹھوڑی سہلاتے ہوئے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔انگلی میں سیاہ رنگ کی ''G'' والی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

''اٹیزیہ اسی کو کہتے ہیں لیکن میں سر کی بات تب تک اپروو نہیں کرسکتی جب تک میرے پاس ٹیسٹ رپورٹس نہ ہوں۔سائنس میں کوئی بھی بیماری کھوجنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ Problem,Obsrvation,Deduction,Hypothesis,Experime and Result۔انہوں نے مجھے ڈیڈکشن بھیجا ہے۔آگے ہائپوتھیسز اور ایکسپیریمنٹ پہ مجھے خود کام کرنا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب میں ٹیسٹ کراؤں گی۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''مگر آپ عنقریب بیماری تک پہنچ گئی ہیں؟'' اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا۔

''کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''آئی ایم امپریسڈ مس سلیم۔ ایک ہفتے میں آپ نے بیماری کا پتہ کرالیا اور ہم ایک مہینے سے بلاوجہ خوار ہو رہے تھے۔ ہمیں آپ کو پہلے بلا لینا چاہیے تھا۔'' وہ دل سے بولا تو عبادہ مسکرائی۔ یکدم اسے کچھ دیا آ گیا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے پیشانی پر بل ڈالے اور تیورا کے غاذان کو دیکھا۔ ''آپ کے یہ پچھلے جتنے بھی ڈاکٹرز آئے، انہوں نے ایم آر آئی، ایکسرے، الٹرساؤنڈ یا سی ٹی سکین کے لیے آپ کو یہ نہیں کہا کہ گھوڑوں کو ہسپتال لے کر جانا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹک گیا۔

''آپ کے ''ان'' ڈاکٹروں نے گھوڑوں کے صرف بلڈ سی مین کی رپورٹس لی ہیں، ان کی یورین، فاسل اور زبان کی تشخیص کی ہے۔ اس کے علاوہ دماغ، چارے، پانی کسی بھی چیز کا ٹیسٹ نہیں کرایا۔ وہ لوگ اتنے سیریس مسئلے کی رپورٹس لینے کی بجائے ہتھیار پھینک کر فرار ہو گئے اور آپ لوگوں نے بھی نہیں پوچھا۔ بس ایک کے بعد ایک ڈاکٹر کو لا رہے ہیں۔ بندہ کم از کم یہ تو پوچھ لیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو کیا لگتا ہے؟ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ آپ کی سوچ کیا کہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن نہیں آپ لوگ بھی ہانک کے ساتھ ہانک گئے۔'' وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔

''ہمیں کیا پتہ عبادہ۔ انہوں نے جو سی مین لیبارٹری لے جانے کا کہا۔ ہم لے گئے اور رپورٹس ان تک پہنچائیں۔ رپورٹس دیکھنے کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' وہ تیزی سے کہنے لگا۔

''کہاں سے پکڑ کے لائے تھے ان کو؟'' اس نے ہونٹ بھینچے۔

''میں لایا تھا۔ میں نے ان کا ڈیٹا، ڈگریاں اور تجربہ دیکھا تھا۔''

''تو ان تجربے کار اور مایا ناز ڈاکٹروں نے ہسپتال کا مشورہ کیوں نہیں دیا؟'' اس نے بری طرح ٹونٹ کی۔

''انہوں نے کہا گھوڑے مرنے والے ہیں۔''

''اور آپ نے یقین کرلیا؟'' وہ صدمے سے بولی۔ غاذان نے بیچارگی سے سر ہلایا۔

''غاذان! انسان کی آخری سانس چل رہی ہو تو لوگ ہسپتال کی امید کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کے مریض پچھلے ایک ماہ سے یہاں پڑے ہیں، خود آپ لوگوں کے دماغ میں بھی یہ خیال نہیں آیا؟ کتنے بڑے بڑے ہسپتال ہیں جہاں باقاعدہ یہ سارے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ جانوروں کو انتہائی نگہداشت دی جاتی ہے۔ ان کو ایک انسان کی طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے ہسپتال میں یہ سب ہے۔''

''اگر وہ ذرا سی امید دلاتے تو ہم کیوں نہیں لے کر جاتے؟ یہ تو میں ہوں جو یہ سوچ کر ڈاکٹر بدل رہا ہوں کہ کیا پتہ کسی کو بیماری سمجھ آجائے ورنہ جہاں ہم درجن درجن ڈاکٹر لا رہے ہیں وہیں ہم ہسپتال بھی لے کر جا سکتے تھے۔'' وہ دھونس سے کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے پھر۔'' اس نے گردن اکڑالی۔ ''میں دو دن میں گھوڑوں کو پشاور لے کر جاؤں گی۔ آپ انتظامات کر دیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں خان جی سے اجازت لیتا ہوں۔'' وہ پرعزم لہجے میں بولا۔

''ہوں۔'' اس نے سر کو خم دیا۔

پیچھے کھیتوں میں لوگ اسی طرح کام کر رہے تھے۔ دریا دھیمے دھیمے بہہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

حویلی کی سڑک پہ گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ بلتی قبیلے کا قافلہ پہنچ گیا تھا۔ اوپر تک گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں۔ شور ہی شور تھا۔ گاڑیوں کی چھتوں پہ لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ ڈیکوں میں گانے گونج رہے تھے۔ آسمان میں پھلجھڑیاں جل رہی تھیں۔ شوووں..... ٹھاہ..... ٹھاہ..... اور آسمان کئی چمکتے رنگوں سے جگمگا اٹھتا۔ سارے میں چیخوں، سیٹیوں اور تالیوں کا شور گونج رہا تھا۔

وہ اصطبل سے حویلی جا رہی تھی۔ اسے لگا وہ کسی بارات کے ساتھ آئی ہے۔ منیب خان کا شیشہ کھلا ہوا تھا۔ سارا شور وہیں سے آ رہا تھا۔

حویلی کی چوٹی پہ گاڑی چڑھتے وقت کئی بار رکی۔ وہ گاڑی کی پشت سے سر ٹکائے، آنکھیں موندے، اس تھکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو سارا دن گھوڑوں کو نہلاتے دھلاتے چڑھی تھی۔ اس کے سر میں بے آرامی کی وجہ سے ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اس کا سٹیتھوسکوپ اور اوورآل ایک طرف سیٹ پر پڑے ہوئے تھے۔

منیب خان ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''خان بہت رش ہے۔ آپ جلدی جلدی ان گاڑیوں کو ہٹاؤ تاکہ میں آؤں۔ اس طرح تو میں نہیں آ سکے گا۔'' وہ بے زاری سے کہہ رہا تھا۔ اس کی گاڑی رینگ رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی ساعتوں سے اس شور کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''منیب کیا کر رہے ہیں یہ لوگ؟'' بالآخر وہ جھنجھلا کے بولی۔ شور سے اس کا سر مزید پھٹا جا رہا تھا۔

''جشن کر رہے ہیں یہ لوگ مادام۔ ہماری حویلی میں اٹھارہ سال بعد جو آ رہے ہیں۔''

''کیوں اٹھارہ سال سے یہ سڑک بن رہی تھی؟'' وہ جل کے بولی۔

''نہیں مادام۔ ان کے ساتھ ہمارا دشمنی چل رہا تھا۔''

''اب چترال پہ حملہ کرنے آئے ہیں کیا؟''

''نہیں مادام۔یوسف خان کی کوششوں سے دشمنی ختم ہوگیا ہے۔یہ لوگ اسی کا جشن منا رہے ہیں۔''

بلتی جشن والے اور اپنی روایت کو منانے اور برقرار رکھنے والے زندہ دل لوگ تھے۔ان کا روایتی رقص،ان کا انداز،ان کے ریت رسموں کا یہی تو موقع تھا۔وہ اپنی گاڑیوں میں گلگت کے مختلف گاؤں سے یہاں آئے تھے صرف اس لیے کہ ان کے ساتھ شندور میں شامل ہوسکیں۔وہ مہمان تھے اور یہ میزبان اور مہمانوں کا استقبال کیسے کرنا ہے۔انہیں پروٹوکول کیسے دینا ہے۔ان کی خاطر مدارت اور ان کی ناز برداریاں کیسے اٹھانی ہیں۔اس سے چترالی بخوبی واقف تھے۔عبادہ کو وہ تیاریاں کبھی نظر نہیں آئی تھیں جو اندر ہی اندر ہو رہی تھیں۔اسے وہ نظر آرہا تھا جو دکھائی دے رہا تھا اور ہم صرف وہ دیکھ سکتے ہیں جو نظر آتا ہے۔

''ہم کب تک پہنچیں گے منیب خان؟''اس نے جھنجھلا کے پوچھا۔

''مادام،سب سے آخری گاڑی ہماری ہے۔خود سوچ لو۔''منیب خان نے ناک سے مکھی جھٹکی۔اس نے بے اختیار سر سیٹ پہ پھینک دیا۔

☆.....☆.....☆

ایک گھنٹے بعد منیب خان نے گاڑی حویلی کی پارکنگ میں کھڑی کی تو وہ سو رہی تھی۔

''مادام۔''اس نے بیک ویو میں دیکھ کے اسے پکارا۔اس کی آنکھیں بند تھیں۔منیب خان بیلٹ ہٹا کے باہر نکلا اور اس کا دروازہ کھولا۔

''مادام!اٹھیں۔''وہ اونچی آواز میں بولا۔اس کو اس کا کوئی خان بلا رہا تھا۔اسے جلدی تھی۔پارکنگ ایریا کافی بڑا تھا۔وہاں وقفے وقفے سے گاڑیاں رک رہی تھیں۔ایک طرف مردوں کا ٹولہ سا تھا۔دوسری طرف جہاں سے حویلی کے زنان خانے جاتے تھے وہاں عورتوں کا جم غفیر لگا

ہوا تھا۔ایسا لگ رہا تھا وہ کسی ٹورنامنٹ میں آئے ہیں۔عبادہ کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

''مادام.....'' اب کی بار منیب خان نے سر اندر کر کے آواز دی۔وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔اعصاب ایک لمحے کے لیے چکرا گئے۔منیب خان گاڑی کا دروازہ پکڑے منتظر سا کھڑا تھا۔اس نے کئی بار پلکیں جھپکیں۔کچی نیند جانے نہیں دے رہی تھی۔

''مادام،اٹھیں ہم پہنچ گئے ہیں۔''

اس نے سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اپنے اعصاب بحال کرنے کی کوشش کی۔نیند ٹوٹنے سے سر میں ناقابل برداشت درد کی ٹیس اٹھی تھی۔منیب خان نے اس کا سامان باہر نکالا تو وہ بھی باہر آ گئی۔اوور آل بازو پہ تھا اور سٹیتھوسکوپ ہاتھ میں۔آنکھیں نیند کی وجہ سے گلابی ہو رہی تھیں۔

منیب خان اس کا سامان ہاتھ میں اٹھا کے آگے بڑھ گیا۔وہ بھی بوجھل سے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چل پڑی۔یہاں بے حد رش تھا۔کچھ جا رہے تھے۔کچھ آ رہے تھے جیسے بارات جاتے وقت پارکنگ ایریا میں ہوتا ہے ویسا ہی۔

حویلی کی اس سمت کو برقی قمقموں سے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔سرخ پتھر کی اس حویلی کی رونق کو چار چاند لگ گئے تھے۔آسمان میں ہنوز فائر ورک ہو رہا تھا۔چمکتی روشنیاں کئی پیغام لا رہی تھیں۔

وہ آگے جا رہی تھی جب چلتے چلتے یکدم رک گئی۔

ڈھول کی دھن پہ کئی پیر تھرک رہے تھے۔لڑکوں کا ہریپ (گروہ جو گول گول گھوم کے ناچتا ہے جیسے پشتو ڈانس) ہو رہا تھا۔ڈھول اور باجے والے بھی آئے تھے۔نوجوان لڑکوں کے سروں پر کلغی ''پر'' والی ٹوپیاں تھیں۔انہوں نے سفید شلوار قمیصیں پہنی ہوئی تھیں۔یہ گلابی سفید سی عوام تھی جن کے گالوں میں سرخی دیکھ کے ان کے فشار خون کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ڈھول والا درمیان میں تھا۔وہ

اس کے گرد اپنے مقامی رقص میں گول گول گھوم رہے تھے۔ ڈھول کی تھاپ اور ان کے پیروں کی تھرک کا انداز ایک جیسا تھا۔ منیب خان آگے نکل گیا تھا جب وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے فون نکال کے کیمرہ آن کیا اور ویڈیو بنانے لگی۔ نیند کب آنکھوں سے چھٹ گئی، اسے پتہ بھی نہیں چلا۔

پارکنگ ایریا بڑا تھا۔ یہ لڑکے گول دائرے میں وقفے وقفے سے کھڑے ہو کے رقص کر رہے تھے۔ تماشائیوں کی بھیڑ ارد گرد جمع ہو گئی تھی۔ کچھ ایسے لڑکے بھی تھے جن کو اس رش میں نمائندگی دی گئی تھی۔ وہ سب تقریباً ایک ہی قد اور جسامت کے مالک تھے اور پانچوں کے پانچوں نے سفید شلوار قمیصوں کے اوپر سیاہ ویسکوٹ اور سر پہ گلگتی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ وہ ہر یپ نہیں کر رہے تھے وہ مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایسے میں وہ عین اس گروہ کے سامنے کھڑے ہو کے ویڈیو بنا رہی تھی۔ گلگت زبان میں چلتے گانے کی سمجھ اسے نہیں آ رہی تھی لیکن دھن اتنی مزے دار تھی کہ وہ اس میں محو ہو گئی۔ آس پاس سے بالکل بیگانہ کہ لوگ اسے کتنی تنفر سے دیکھ رہے ہیں۔

اس کا لباس ایسا بھی چست نہیں تھا لیکن وہاں کے لوگوں کے لیے یہ چیز کسی عجوبہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ بیشتر اسے ٹورسٹ سمجھ رہے تھے لیکن اس کا اوور آل اور سٹیتھوسکوپ کام بگاڑ رہا تھا۔

اسی اثنا میں کچھ چترالی اور کچھ گلگتی لڑکے میدان میں آ گئے یوں کہ وہ عبادہ کے اطراف سے گزر گزر کے آگے چلے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف اور رائفلیں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے عبادہ کی سانس رک گئی۔ (کیا وہ لوگ فائرنگ کرنے والے تھے؟)

عبادہ سے تھوڑا دور وہ ڈھول والے کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور اپنے کلاشنکوف اور رائفلوں کے منہ آسمان کی طرف کر دیے۔ عبادہ نے ایک قدم پیچھے لیا۔ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دفعتاً فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ ایسی تڑتڑاہٹ جیسے اسٹیل کی پلیٹ پر ژالہ باری برس رہی

ہوں۔ ٹخ..... ٹخ..... اس نے کئی قدم پیچھے لیے، یہاں تک کہ وہ ایک گاڑی کی پشت سے جا لگی۔

کلاشنکوفوں کے مونہوں سے آگ نکلتی اور ایک دھواں خارج ہوتا۔ ان کے خام کارتوسوں کے ٹکڑے دھڑ دھڑ گر رہے تھے۔ وہاں ایک عجیب سا جنگ کا ماحول بن گیا تھا۔ آسمان پھلجھڑیوں سے جگمگا رہا تھا۔ زمین گولیوں سے اور عین درمیان ڈھول کی تھاپ پہ گولیوں کی پرواہ کیے بغیر ان نوجوان لڑکوں کے پیر اور ہاتھ رقص کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

وہاں بچے بھی موجود تھے اگر گولی کسی کو لگ جائے تو..... اوپر جانے والی گولیاں کشش ثقل کے باعث نیچے بھی تو آتی ہیں۔ یا خدا!

اس نے ہراساں نظروں سے یہاں وہاں دیکھا۔ کیا ان کو کوئی روکنے والا نہیں تھا؟ ان کو کوئی منع کرے۔ یہ خطرناک تھا۔ جان لیوا تھا۔ اس نے بے اختیار منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ گولیاں اسی طرح چل رہی تھیں۔ کارتوسوں کے ٹکڑے ہنوز گر رہے تھے۔

''عبادہ.....'' یہ کوئی آشنا آواز تھی۔ اس نے بے پناہ شور میں یہاں وہاں دیکھا۔ سامنے سے غاذان چلا آ رہا تھا۔ اس کے سر پہ گلگتی ٹوپی تھی اور کندھوں پہ چادر۔ یقیناً کسی نے مروت سے پہنائی ہوگی۔ اس کے قریب آ کے وہ رک گیا۔ وہ بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ زنان خانے جائیں۔ ان کے شوق میں آپ کو کچھ ہو جائے گا۔'' وہ فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

''اور یہ بچے؟ ان کا کیا۔ پلیز غاذان یہ روکو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ فائرنگ از ناٹ سلیبریشن (فائرنگ جشن منانا نہیں ہے۔)'' وہ حواس باختہ انداز میں بولی۔ گولیوں کے شور میں اس کی ضعیف آواز گھو گئی۔

''میں روکتا ہوں۔ آپ یہاں سے جائیں اور بچوں کی فکر نہ کریں۔ میں انہیں ہٹا لوں گا۔'' وہ

کمال ظرفی سے کہتا ایک طرف ہو گیا۔ عبادہ تیزی سے وہاں سے نکلی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس لان میں اتر گئی جہاں سے آگے زنان خانہ شروع ہوتا تھا۔

غاذان فائرنگ کرنے والوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ وہ رسم تھی۔ ریت تھی۔ وہ انہیں روکتا تو وہیں پہ جنگ کی کتھا کھل جاتی لیکن بچوں کو وہاں سے ہٹا سکتا تھا۔ اس نے چترالی اور گلگتی بچوں کے ٹولے کو وہاں سے مردان خانے میں بھیج دیا۔

وہ بھاگتے ہوئے اس طرف آئی تھی۔ یہاں خاموشی تھی۔ عورتیں اندر جا چکی تھیں۔ یہ حویلی کی پچھلی سمت ہونے کی وجہ سے اتنی نہیں سجائی گئی تھی جتنی کہ اگلی سمت۔ البتہ راستے کے کناروں پر رنگ برنگے بلبوں کی دیے ضرور رکھے گئے تھے۔ یہاں مردانہ آوازوں اور ڈھول کی تھاپ کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ خراماں خراماں حویلی کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ابھی تک کچھ عورتیں دروازے میں ہی کھڑی تھیں۔ وہ بھی تک اندر نہیں گئی تھیں۔ وہ چل کے ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ عورتوں کی استقبال کے لیے حویلی کی خواتین آگے آتے ہوئے ان کے گلے مل رہی تھیں اور یہ ایسی گرمجوشی تھی جو عبادہ نے آج سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ہر چترالی عورت ہر گلگتی عورت سے گلے لگنے میں پہل کر رہی تھی۔ لڑکیاں پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

کچھ دیر بعد سب حویلی کے اندر آ گئیں اور دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ صحن عورتوں اور لڑکیوں سے بھر گیا تھا۔ گلگت اور چترال کی ثقافت کا اس سے زیادہ خوبصورت رنگ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گلگت کی خواتین کے لیے صحن میں بیٹھنے کے لیے تختوں پر نرم گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے جن پر بیشتر خواتین بیٹھ چکی تھیں۔ لڑکیاں راہداری کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں جہاں وقفے وقفے سے رنگ برنگ کشن رکھے ہوئے تھے تاکہ مہمان خواتین وہاں بیٹھ سکیں۔ اس نے آج سے پہلے یہ

کشن وہاں نہیں دیکھے تھے۔

فوارہ کی منڈیر کے گرد دیے رکھے ہوئے تھے اور پانی کے اندر گلاب اور زعفران کی پتیاں تیر رہی تھیں۔ وہ یہاں سے سیدھا کمرے میں جانا چاہتی تھی لیکن راستہ بری طرح بلاک تھا۔ صحن میں ایک شاہی کرسی رکھی گئی تھی جہاں بی جان براجمان تھیں۔ گلگت کی خواتین ان کے پاس جا رہی تھیں، وہ جھک کے سلام کرتیں اور ان کے ہاتھوں کی پشت چومتیں۔ بی جان ان کے کندھے اور ماتھے کو چوم کر دعا دیتیں۔ اتنا ادب، اتنا احترام؟

کیا کمال روایت تھی!

عبادہ بھی ایک ستون سے کندھا جوڑے، ہاتھ سینے پہ باندھے ان کو دیکھے گئی۔ یہاں کی عورتیں اپنے بڑوں کی بہت عزت کرتی تھیں۔ ایک ماہ بھی کوئی بڑا ہوتا تو اس کو بھی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایسے اخلاق اس نے شہر والوں میں کم ہی دیکھے تھے۔

بالک بچیاں اپنی چترالی سہیلیوں سے جا ملی تھیں۔ وہ کونے کھدروں میں کھڑے ہو کے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ گلگت کا روایتی لباس چترال سے زیادہ الگ نہیں تھا مگر گلگت والوں کے لباس میں ''سفید رنگ'' اور ''چاندی'' کے زیورات کی نمائش قدرے زیادہ تھی۔ ان میں بیشتر خواتین نے سفید فراکیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے سروں پہ ایسی ٹوپیاں تھیں جن سے چاندی کی ماتھا پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ انہوں نے انہی ٹوپیوں پہ دوپٹے پہن رکھے تھے۔ چترال کی خواتین (کالاش) کے علاوہ سر پہ محض دوپٹہ جماتی تھیں۔ ٹوپی کم تر ہی نظر آتی۔

وہ مسکرا کے سب کو دیکھ رہی تھی جب اس کی نظر کسی پہ جم گئی۔ وہ ایک خاتون تھی جو سیاہ فراک اور سرخ آنچل میں ملبوس تھی۔ ان کے پر سرخ ٹوپی تھی اور سیاہ چاندی کی ماتھا پٹی ان کے ماتھے پر سجی ہوئی تھی۔ ان کے کانوں سے بڑے بڑے آویزے لٹک رہے تھے۔ وہ گول چہرے کی سفید سی

خاتون تھیں۔ان کی عمر موٹی چچی کے لگ بھگ ہوگی لیکن چچی موٹی تھی جب کہ یہ دبلی پتلی اور اونچی تھیں۔ان کی گردن اتنی صراحی دار تھی اور زرد لائٹ میں ایسے چمک رہی تھی کہ بے ساختہ عبادہ کے منہ سے ''واؤ'' نکلا۔

کوئی اتنا حسین بھی ہوسکتا تھا۔انہوں نے اپنے سفید ہاتھوں کی انگلیاں کے پوروں پر مہندی لگا رہی تھی جو اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ عبادہ مبہوت ہو کے دیکھ رہی تھی۔ان کی گردن میں پھولوں کا ہار تھا،وہی ہار جسے صبح کچھ خواتین بنا رہی تھیں۔وہ بی جان کے ساتھ شاہی کرسی پر براجمان تھیں اور ان کی شان میں ایسی ٹھاٹ تھی جو عبادہ نے کسی میں نہیں دیکھی تھی۔

گل کہاں تھی؟ وہ عجوبہ کدھر تھا۔اس نے چونک کے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔گل کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور یقیناوہ یہاں نہیں تھی کیوں کہ وہ غازی کا پھٹا ہوا ڈھول تھا۔بلند آواز۔اس کی آواز تو باہر سے آتی پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے بھی اونچی تھی۔وہ یہاں ہوتی تو اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتی۔

پل بھر میں سب اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور سارا شور اور ہنگامہ تھم گیا۔۔ریشم اور دیگر لڑکیاں ٹرے میں گلاس بھر بھر کے مہمان خواتین کو پیش کر رہی تھیں۔ماحول ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔سب ہنس رہی تھیں۔ریشم کے چہرے پر ایک بڑی سی مسکراہٹ تھی۔وہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی۔

ریشم ایک گلاس اس کے لیے لائی۔

''یہ لو.....'' اس نے ٹرے سے گلاس اٹھا کے اس کی طرف بڑھایا۔''دودھ اور زعفران کا شربت ہے۔موڈ اچھا ہو جائے گا۔'' ریشم نے آنکھ کا کونا دبا کر کہا اور چلی گئی۔

موڈ؟

تو کیا اس کا موڈ خراب تھا؟ واقعی؟ وہ سیدھی ہو گئی۔گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔سفید دودھیا

محلول جس میں سرخ رنگ کے دھاگے تیر رہے تھے، جھلملا رہا تھا۔اس کا موڈ آف ہی تو تھا لیکن وہ جبراً مسکرائی اور گلاس لبوں سے جوڑ دیا۔وہ اتنا ذائقہ دار اور ٹھنڈا تھا کہ اس کا دل میں روئیدگی اتر گئی۔ریشم نے صحیح کہا تھا۔موڈ پہ اثر پڑا تھا۔اس نے گلاس لیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔راستہ صاف ہو گیا تھا کیوں کہ بیشتر خواتین بیٹھک میں چلی گئی تھیں۔

وہ چھوٹے چھوٹے تھکاوٹ سے چور قدم لیتی کمرے میں آ گئی۔یہاں اس کی پہلی نظر گل پر پڑی، وہ بالکونی میں تھی۔اس نے روایتی کپڑے نہیں پہنے تھے۔آج وہ کھلی شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔اس کا دوپٹہ بیڈ پر پڑا تھا۔وہ گوتم بدھ کے انداز میں جھولے پر بیٹھی، ران پر بڑا سا کیرم بورڈ کی طرح تختہ رکھے، پین ہاتھ میں پکڑے، اس پر کچھ بنا رہی تھی۔عبادہ نے ادھ پیے شربت کا گلاس میز پہ رکھا، اوور آل اور سٹیتھوسکوپ صوفے پہ پھینکا (عادتاً) اور باہر آ گئی۔اس نے ہاتھ پشت پہ باندھ کے گردن کچھوے کی طرح اٹھائی اور بورڈ پہ جھانکا۔گل کسی کا چہرہ بنا رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' اس نے تمکنت سے پوچھا۔

گل نے آہستہ سے چہرہ اٹھایا۔اس کی آنکھوں میں ٹھنڈا تاثر تھا۔یخ.....سرد.....بے رحم.....نہایت ہی آہستہ سے بورڈ کو عبادہ کی طرف موڑا۔

''پائیروگرافی (Pyrography)۔''

''اچھا۔'' وہ خوشگوار حیرت سے کہتی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔گل واپس کام میں جت گئی تھی۔

پائیروگرافی لکڑی کو جلاتے ہوئے مختلف نقش و نگار بنانے کا ایک فن ہے۔لکڑی کو جلانے کے لیے پین کا استعمال کیا جاتا ہے جس میں مختلف نبیں لگتی ہیں۔اس کا پلگ ساکٹ سے جوڑ کر اس کی نب کو گرم کیا جاتا ہے بالکل استری کی طرح اور جب نب گرم ہو جاتی ہے تو بورڈ پہ پنسل سے بنائے ہوئے نقوش کو داغا جاتا ہے جس سے وہ نقش ادھر ثبت ہو جاتا ہے۔)

''نائس۔'' وہ متاثر کن انداز میں بولی۔ ''حویلی کی ساری لکڑیوں پہ تم نے نقش بنائے ہیں؟''

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ تھا۔ وہ کام میں محو تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ دل سے نہیں، کسی خیال کو بھگانے کے لیے یہ کر رہی ہو۔ اس کے پن کی نب پنسل سے بنے نقش پر پڑتے ہوئے کپکپا رہی تھی۔

''بلتی مہمان آگئے ہیں۔ باخدا اتنی ڈھیر سارے لوگ آئے ہیں مجھے لگا جیسے کوئی لشکر ہے جو حویلی پر چڑھائی کرنے کے لیے آرہا ہے۔ ہمارے لاہور میں اتنے لوگ بارات پر بھی نہیں ہوتے جتنے یہاں صرف شندور دیکھنے آئے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''یونو وہاٹ گل۔ میں نے پہلی بار اتنی ساری عورتیں مقامی لباس میں دیکھی ہیں۔ چترال ورسز گلگت۔ سفید ورسز سرخ۔ (وہ ہاتھوں پر تول رہی تھی۔) قبیلہ ورسز قبیلہ۔ مرد ورسز مرد اور خواتین ورسز خواتین۔ ہے نا امیزنگ؟''

''ہوں۔'' وہ پھر ہنکاری۔ عبادہ ٹھٹکی، اس نے ذرا فکر سے گل کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا ہوا گل؟ سب ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ''سب ٹھیک ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔'' لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ محتاط سا۔ جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔ عبادہ نے کریدا نہیں، ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''میں ذرا چینج کر لوں۔ تھک گئی ہوں پھر ویسے بھی کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے اور مجھے بھوک بھی لگی ہے۔'' وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھ گئی۔ گل نے کچھ نہیں کہا، وہ اندر چلی گئی لیکن جانے سے پہلے اس نے پلٹ کے گل کو دیکھا جس کے ہاتھوں میں بدستور کپکپاہٹ تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے کھانے کے لیے اس کو بیٹھک میں بلا لیا گیا تھا۔ بیٹھک جو حویلی کا سب سے بڑا کمرہ تھا۔ لمبائی اور چوڑائی میں ہال جتنا، وہاں لمبے لمبے دسترخوانوں کے کناروں بڑے بڑے چکور تکیے رکھے ہوئے تھے۔ گلگت کی خواتین وہاں براجمان تھیں۔ ان کے سامنے مختلف انواع واقسام کے کھانے رکھے ہوئے تھے جنہیں وہ باتیں کرتے ہوئے کھا رہی تھیں۔

اس ہال میں ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ نرم، ملائم اور جس پہ پیر رکھو تو اندر دھنس جائے۔ کھڑکیوں سے ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ہر طرف چمچوں اور پلیٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ چھت سے قیمتی فانوس وقفے وقفے سے لٹک رہے تھے جس سے سارے ہال میں سفید سفید روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ریشم اسے لیے تیسری قطار کے آخر میں بیٹھ گئی۔ اس قطار کے شروعات میں گلگت کی وہ نفیس خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی انگلیوں میں موجود نگینوں کی موٹی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ ان کے سامنے بی جان اور موٹی چچی براجمان تھیں۔

دسترخوان سجا ہوا تھا۔ بیف بریانی (جس میں میوے ملے ہوئے تھے)، غلمندی (ایک خاص قسم کی روٹی)، بچی، بکرے کا شوربہ، دنبے کا صرف بھنا ہوا گوشت جس میں ہری مرچیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ تل والے نان اور ایک خاص قسم کا حلوہ جو دیکھنے میں ہلکا بھورا تھا بالکل کھیر کی طرح۔

عبادہ نے دن کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ زعفرانی شربت نے اس کی بھوک مزید بڑھا دی تھی۔ وہ اکڑوں بیٹھ گئی اور آستین کف سے موڑ لی۔ وہ گلابی شارٹ فراک اور سفید جینز میں ملبوس تھی۔ ایک مفلر اس کے گردن سے لٹک رہا تھا۔ بال جوڑے میں مقید تھے لیکن چند باغی لٹیں کانوں کو چھو رہی تھیں۔

ریشم اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی سی گول پلیٹ میں بریانی نکال کے اس کے

اوپر بکرے کا شوربہ ڈال رکھا تھا۔ وہ ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کے کھا رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں دوسری کوئی پلیٹ نہیں تھی۔ وہ ریشم کے قریب ہوئی۔

''ریشم۔''

''ہوں۔'' ریشم نے گردن گھما کے اسے دیکھا۔

''میری پلیٹ۔''

''پلیٹ؟'' ریشم نے چونکتے ہوئے یہاں وہاں دیکھا۔ ''اوہ۔ میں بھول گیا۔ تم تو اکیلا کھاتا ہے ناں۔ رک جاؤ میں لے کے آتا ہے۔'' ریشم انگلیوں کو چاٹتی کھڑی ہوگئی۔ وہاں سب ایک ہی پرات سے کھا رہے تھے۔ تین تین ایک سے یا پھر دو دو ایک سے۔ اسے عجیب سا لگا۔ ان کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ کیا وہ اکیلی کھائے گی؟ الگ نکال کے؟

ریشم اس کی پلیٹ لے آئی۔ ''یہ لو۔ ڈال لو۔'' اس نے پلیٹ عبادہ کے سامنے رکھ دی۔

عبادہ نے جز بز ہو کے پلیٹ کو دیکھا۔ ایک پلیٹ سے کھانا سنت تھی لیکن لاہور میں وہ ہمیشہ الگ الگ پلیٹوں میں کھاتے تھے۔ ہاں البتہ وہ کبھی کبھی ابا کی پلیٹ سے کھا لیتی تھی لیکن سب نے ایک پرات میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ اسے عادت نہیں تھی۔ اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے کے بعد وہ خاموشی سے کھانے لگی۔

بی جان اور وہ گلگتی خاتون ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھیں جیسے دوست کرتے ہیں (بچھڑے ہوئے دوست)۔ وہ ایک ہی پلیٹ سے کھا رہی تھیں۔ وہ ملکائیں تھیں۔ شہزادیاں۔ سردارنیاں لیکن ان کی ذات میں گھمنڈ نہیں تھا۔ صرف عاجزی تھی۔

''ریشم۔'' اس نے نوالہ لیتے ہوئے اسے پکارا۔

''ہوں۔''

''یہ عورت کون ہے؟'' وہ اس خاتون کو دیکھ رہی تھی۔

''کون؟'' ریشم نے پہلے اسے دیکھا پھر اس کی نظروں کی تعاقب میں اس عورت کو۔

''وہ.....وہ عالیہ خاتون ہیں۔بلتی قبیلے کے سابقہ سردار محمد رحمان کی بیوی۔''

''کافی خوبصورت ہیں۔''اس نے بے ساختہ کہا۔

''یقیناً۔محمد رحمان کی محبت ہیں۔یہ اپنے قبیلے کی سب سے پیاری عورت ہے۔اتنی پیاری کہ اس کے لیے انگریزوں کے رشتے بھی آئے ہیں۔اپنے وقت میں۔کہتے ہیں ان سے شادی کے لیے دس مردوں نے جان کی بازی لگائی تھی۔''

''کیا؟'' وہ بری طرح چونکی۔

''ہوں۔پچپن کی ہے۔لیکن شباب ابھی بھی قائم ہے۔اس کی جوانی تو تم نے دیکھی ہی نہیں۔ایک قہر تھا وہ بھی جو گلگت نے سہا۔پھر اللہ ویسے بھی غموں کو حالات کی نذر کر کے مرہم کا بندوبست کر دیتا ہے۔جوانی سدا نہیں رہتی۔وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ان کی بھی ختم ہو گئی۔اب یہ اتنی حسین نہیں دکھتا جتنا بی جان کے بقول جوانی میں تھا۔بی جان نے تو خود یوسف خان کے لیے ان کا رشتہ مانگا تھا لیکن یہ اپنے کزن محمد رحمان سے منسوب تھا سو انکار ہو گیا۔''

''اوہ۔''

''لیکن بی جان کے ساتھ ان کا دوستی نہیں ٹوٹا۔دوستی ابھی بھی برقرار ہے۔''

''نظر آ رہا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''یہ اس دفعہ شندور سے زیادہ بھائی کے دستار پوشی کے لیے آئے ہیں۔تھوڑا بہت چترال بھی گھوم لیں گے اور بھائی کی سرداری بھی دیکھ لیں گے۔''

''میں نے سنا ہے یہ قبیلہ اٹھارہ سال بعد یہاں آیا ہے۔آپ لوگوں کی کوئی دشمنی.....''

''شش.....'' اس نے تیزی سے اسے ٹوکا۔عبادہ ٹھٹک گئی۔ریشم احتیاط سے یہاں وہاں دیکھنے لگی کہ خدانخواستہ کسی نے سن نہ لیا ہو مگر سب کو اپنے کھانے میں مصروف پا کر وہ اس کے قریب کھسک گئی۔

''یہاں دشمنی کا ذکر مت کرو پاگل لڑکی۔ہمارا یہاں جب جھگڑا ختم ہو جائے تو اس کا ذکر نہیں کرتے۔'' وہ سرگوشیانہ انداز میں پچکارنے لگی۔

''سوری۔'' عبادہ شرمندہ ہوگئی۔''مجھے اندازہ نہیں تھا۔''

''کوئی بات نہیں مگر آئندہ خیال رکھنا۔'' وہ اپنی جگہ پہ واپس آ گئی۔عبادہ نے جھینپتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

''بھائی کا سرداری تو سب سے الگ سرداری ہے۔اس کے ساتھ مقابلے والا کوئی نہیں۔تم اگر ٹھہرا تو دیکھنا، پورا گلگت اور چترال مل کر اس کو دستار پہنائے گا۔'' وہ آنکھوں میں چمک لیے کہہ رہی تھی۔

''ان شاءاللہ۔'' عبادہ نے زیرلب کہا۔''ویسے یہاں سردار بننے کے لیے کیا کیا ہونا چاہیے؟''

''قابلیت ہونا چاہیے۔سرداری کے لیے دس مرد تھا لیکن کوئی اس قابل نہیں تھا۔یوسف خان جی نے خود کہا تھا۔انہوں نے سب کو پرکھا۔مبین، غماز، ابتہاج سب کو۔کوئی اس عہدے کو سنبھالنے کا اہل نہیں تھا۔پھر جب بھائی لندن سے آیا اور آتے ہی زمینوں، ملکیتوں، ذمہ داریوں کو سنبھال لیا تو یوسف خان کو سردار نظر آ گیا۔غاذان بھائی وہ پڑھ کے آیا ہے ناں۔وہ کیا کہتے ہیں.....''

''اکنامکس.....''

''ہاں۔وہی۔اس لیے اس کو معاملات سنبھالنا آتا تھا۔اس نے اپنے ولایتی تجربے کو کام میں لایا اور خان جی کا دل جیت لیا۔دو مہینہ پہلے ہی یوسف خان نے اس کی سرداری کا اعلان کیا ہے۔زیادہ پہلے کی بات نہیں ہے۔''

''اور باقی سب کو تو بہت برا لگا ہوگا؟'' عبادہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ہاں۔ ابتہاج کو لگا تھا۔ وہ یوسف خان کا بیٹا ہو کے سردار نہیں بن سکا۔ ورنہ ازل سے ہوتا آیا ہے کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ اور سردار کا بیٹا سردار بنتا ہے مگر ابتہاج اس قابل نہیں تھا۔'' وہ پرات سے ہاتھ پیچھے کھینچ کے انگلیاں چاٹنے لگی۔ وہ کھانا کھا چکی تھی۔

''کیوں؟ اس میں کیا خامی تھی؟'' عبادہ کو تجسس ہوا۔

''وہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ سرداری کا اصول ہے کہ سردار کم از کم بارہ جماعتیں پاس ہو۔ ابتہاج جی نے تو صرف دس جماعتیں پڑھی ہیں۔ اس لیے وہ نااہل ہو گئے لیکن یہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر بار دو کا مقابلہ ہوتا ہے، ایک یا تو نااہل ہوتا ہے یا پھر ہار جاتا ہے۔'' ریشم مسکرا کے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

بیشتر خواتین کھانا کھا چکی تھیں۔ دسترخوان آہستہ آہستہ خالی ہو رہے تھے۔ بی جان اور عالیہ ابھی تک بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی اپنی پلیٹ صاف کی اور ٹشو سے انگلیاں پونچھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ کمرے میں موجود واحد بک ریکس میں گل کی ناول کلیکشن دیکھ رہی تھی۔ گل کے پاس بے شمار انگریزی ناول تھے جس میں ہر قسم کا ٹیسٹ موجود تھا۔ رومانس، ڈرامہ، ہسٹری، ینگ فکشن، سائنس، ایڈونچر وغیرہ۔ ہیری پوٹر سے لے کر لٹل وومن تک ساری کتابیں موجود تھیں اور اتنی نفاست اور خیال کے ساتھ وہاں رکھی ہوئی تھیں کہ کسی پر بھی پھونک برابر گرد نہیں تھی۔

آج اس نے نارنجی رنگ کی کھلی پٹیالہ اور شارٹ سفید قمیص پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کی چٹیا بنا رکھی تھی لیکن کانوں کے اطراف پہ باغی لٹیں لٹک رہی تھیں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں اور کلائی میں سفید ڈائل کی گھڑی تھی جو خراب تھی۔ قمیص کے ساتھ جا رہی تھی تو اس نے پہن لی۔

گل کیاریوں کے پودوں میں نئی مٹی ڈال رہی تھی۔اس کے ساتھ ابراہیم بھی تھا جو جھولے پر بیٹھا کتاب کھولے گل کو سبق سنا رہا تھا۔

"instead of emphasizing learning,curro.....ros"..

ابراہیم کے پاس "اٹامک ہیبٹ (Atomic Habbit)" کی کتاب تھی۔وہ وہیں سے ریڈنگ کر رہا تھا۔

"curiosity....." گل نے درستگی کی۔

"curiosity and critical thinking". وہ روانی سے پڑھنے لگا۔

وہ انگلی سے کتابوں پر لکیر بناتے ہوئے جا رہی تھی جب ایک کتاب کے پاس ٹھہر گئی۔انگلیوں کی مدد سے وہ کتاب باہر کھینچی۔وہ گھڑ سواری پر کسی قدیم رائٹر کا لکھا ہوا ایک ناول تھا۔عبادہ اسے لیے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی،سائیڈ میز پر پڑے گل کے ڈرائی فروٹس کی ٹرے اٹھائی (جو وہ ہر رات کھاتی تھیں) اور سامنے رکھ دی،اب وہ ایک ایک بادام منہ میں ڈالتے ہوئے کتاب پڑھ رہی تھی۔

"گلے بس۔اور نہیں پڑھوں گا۔" ابراہیم نے اکتاتے ہوئے کتاب بند کر دی۔

"تھوڑا سا رہتا ہے چیپٹر ختم کر لو۔" وہ کھرپی سے مٹی اکھیڑ رہی تھی۔ہاتھ گندے ہو گئے تھے۔

"نہیں دل کر رہا۔بعد میں پڑھوں گا۔"

"ابھی پڑھو۔"

"نہیں پڑھوں گا بول دیا ناں۔" وہ برہم ہوا۔

"کیوں نہیں پڑھو گے؟ ادھر جانا ہے۔ان تماش بینوں کے پاس۔" گل نے برہمی سے سر اٹھایا۔"وہ کچھ نہیں دیں گے تمہیں۔ڈھول کی تھاپ پہ تھرکنے والے نچ بلیے ہیں وہ۔صرف ناچنا جانتے ہیں۔تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔یہ کتاب۔یہ کتاب تمہیں انسان بنائے گی۔"

''مگر.....''

''ابراہیم.....'' بریخنہ نے اس کا نام لیا تو وہ چپ ہو گیا پھر اس نے گردن گھمائی۔ وہ دروازے میں نکھری نکھری کھڑی تھیں۔ عبادہ نے بھی چونک کے اس طرف دیکھا۔ انہوں نے سنہری پشواز پہ سیاہ آنچل لیا ہوا تھا۔ بالوں میں تیل اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ آج وہ پوری فرصت سے تیار ہوئی تھیں۔ وہ قدم قدم چل کے بالکونی میں آئیں۔ گل نے پلٹ کے دیکھا، ایک تنفر بھری نظر ڈالی اور سر جھٹک دیا۔

''تم باہر جاؤ اور گل۔ میرے ساتھ آؤ۔ مہمانوں سے ملو۔'' وہ سادے لفظوں میں کہتے ہوئے مڑنے لگیں جب ہی وہ بول اٹھی۔

''نہیں ملنا کسی سے۔'' وہ ایڑیوں کے بل واپس گھوم گئی۔ ابراہیم ان کے پہلو سے نکل کے باہر چلا گیا۔

''مہمان تم سے ملنا چاہتے ہیں گل۔'' انہوں نے آرام سے کہا۔

''ان سے کہیں گل نہیں ملنا چاہتی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''وہ اٹھارہ سال بعد آئے ہیں گل۔ کوئی ہنگامہ مت کرو۔ چلو میرے ساتھ۔''

''میں نے نہیں کہا کہ اٹھارہ سال بعد آئیں۔ اب بھی نہ آتے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تم کیا چاہتی ہو میں سب کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں؟'' وہ تیزی سے بولیں۔ گل بدستور سر جھکائے مٹی کرید رہی تھی۔ ''گل خدارا۔ میری عزت کا خیال کرو۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ ساری حویلی نے مل لیا، تم نہیں آئیں۔''

''مجھے پرواہ نہیں۔''

''مگر باقی سب کو ہے۔ تمہارا ملنا اہم ہے۔ سمجھتی کیوں نہیں ہو تم۔'' وہ برہم ہوئیں۔ دونوں

مقامی زبان میں بات کر رہی تھیں۔عبادہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''میں نے کہا میں نہیں ملوں گی۔اگر آپ کو اپنا وقت ضائع کرنے کا شوق ہے چچی تو کیجیے۔میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔اسی لمحے بریخنہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی،اسے بازو سے کھینچ کے اٹھایا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' اسے گھسیٹنے لگیں۔عبادہ ہاتھ میں کتاب لیے باہر آ گئی۔

''چھوڑیں مجھے۔'' اس نے پوری طاقت سے ہاتھ چھڑا لیا۔''میں نہیں جاؤں گی۔'' اب کی بار وہ چلا اٹھی۔

''مجھ پہ رحم کرو گل۔خدا کے لیے۔ترس کھاؤ میری ذات پہ۔'' وہ لجاجت سے بولیں۔

''مر جاؤں گی میں ان کے سامنے۔تھوڑا سا میری عزت کا خیال کرو۔''

''کونسی عزت؟'' وہ کھرپی پھینک کے سیدھی ہوئی۔''کس عزت کی بات کر رہی ہیں آپ؟ وہ عزت جو اس کے مرنے کے پانچ ماہ بعد آپ نے نیلام کر لی یا وہ عزت جو کبھی تھی ہی نہیں۔''

''تمیز سے بات کرو۔'' وہ برہمی سے بولیں۔

''میں تمیز ومیز نہیں جانتی چچی۔جا کر ان کو کہہ دیں،میں نہیں مل رہی۔اگر میں گئی،تو میں اپنی زبان میں سمجھاؤں گی۔''

''کیا کرو گی تم؟ دوبارہ وہ حالات پیدا کرو گی؟ کیا کر لو گی پیدا کر کے؟ اکیلی لڑ لو گی ان سب سے؟ اتنی طاقت ہے ان بازوؤں میں؟'' بریخنہ نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔''اتنی جان ہے تمہارے اندر؟''

''ہاں ہے۔'' وہ سختی سے بازو جھٹک کے بولی۔''ہے ہمت۔میں جان سے مار ڈالوں گی سب کو۔ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی سب کے۔''

اسی لمحے بریخنہ کا ہاتھ اٹھا اور اس سے پہلے کہ عبادہ انہیں روکتی، وہ اس کے گال پہ چٹاخ کے لگا۔ گل بری طرح لڑھک گئی۔

"کیا کہا؟ دوبارہ کہو۔ میں سننا چاہتی ہوں گل لالہ۔ دوبارہ بولو۔" وہ اسے سیدھا کر کے جھنجوڑنے لگیں۔ گل گال پہ ہاتھ رکھ کے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرخ متورم آنکھیں دیکھ کے بریخنہ موم ہوگئی۔ انہوں نے اس کا چہرہ نرمی سے ہاتھوں میں بھرا۔

"تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ کچھ بھی نہیں۔ اگر تمہیں لگتا ہے ان سے نہ مل کے تم انہیں دھمکا لوگی تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انہیں ذرا فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ وہ پورا قبیلہ ہے اور تم اکیلی ہو۔ تن تنہا۔ تم کس کس کو مارو گی۔ کس کس سے بدلہ لوگی؟ یہ سارے مل کے تمہیں کچل دیں گے۔ تمہارے باپ کی طرح۔ سمجھی تم۔"

گل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"چلو میرے ساتھ اور ملو ان سے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتے ہوئے باہر لے گئیں، وہ بادل نخواستہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ بریخنہ اسے پکڑ کے نیچے لے جانے لگی تو عبادہ تیزی سے باہر آئی اور راہداری کی طرف چلی گئی، بالائی منزل میں منڈیر کے پاس رک کے اس نے نیچے دیکھا۔ صحن میں تخت پر کچھ خواتین براجمان تھیں جن میں عالیہ خاتون بھی تھیں۔ وہ مختلف تحائف کھولے لڑکیوں کو پکڑا رہی تھی۔

گل سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی، صحن میں جانے سے پہلے اس نے آنسو پونچھ لیے اور خود کو پرسکون کیا۔ بریخنہ اسے لیے مہمانوں کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ مجرموں کی طرح عالیہ بیگم کے مقابل جا رکی۔

انہوں نے چونک کے دیکھا۔

''گل لالہ۔'' بریخنہ نے کہا۔صحن میں موجود خواتین میں بے چینی دوڑ گئی۔سب نے چونکتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''گل لالہ؟'' عالیہ بیگم خوشگوار حیرت سے کھڑی ہوئیں اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔گل نے اپنی مٹی سے اٹکے ہاتھ ان کے آنچل کے گرد باندھ لیے اور دبا دبا کے رگڑے۔پیچھے موجود بی جان نے اس کی حرکت دیکھی پھر کھسیانی سی مسکرائیں۔

''کتنی بڑی ہوگئی ہو۔'' وہ پیچھے ہوئیں اور اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے پکڑا۔'' اور ماشاء اللہ خوبصورت بھی۔بی جان۔اٹھارہ سال پہلے دیکھا تھا اس کو،شندور میں۔اس کے بعد نہیں دیکھا۔ماشاءاللہ۔بہت اچھا قد کاٹھ اور رنگ روپ پایا ہے۔'' وہ مسکرا کے کہہ رہی تھیں جب کہ گل سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''بچیاں جلدی بڑی ہوجاتیں ہیں عالیہ۔آج کل زمانہ ہی ایسا ہے۔''بی جان خفیف انداز میں بولیں۔وہ گل کے ری ایکشن سے بری طرح ڈر رہی تھیں۔موٹی چچی بھی سانس روک کے کھڑی تھیں جب کہ بریخنہ پرسکون تھی۔وہ گل کے پرکاٹ کے آئی تھیں۔

''تم تو پڑھنے بھی گئی تھیں۔کتنا پڑھ لیا ہے خیر سے۔'' وہ پوچھنے لگیں۔

''سولہ.....''

''اتنا کہ لوگوں کو پڑھ سکتی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ بی جان کچھ کہتیں،وہ درشتی سے بولی۔عالیہ بیگم ٹھٹک گئی۔

''مطلب؟''انہوں نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹائے۔

''مطلب یہ کہ اچھے برے کی سمجھ آگئی ہے۔اچھائی اور برائی کا فرق کرسکتی ہے۔تعلیم یہی تو سکھاتی ہے۔بڑوں کی.....تمیز اور چھوٹوں سے شفقت.....کیوں بی جان۔'' موٹی چچی نے بات

سنبھالتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''بالکل۔'' بی جان نے کھسیاتے ہوئے حمایت کی۔

''پھر تو اچھی بات ہے۔ ہماری گل کو اچھائی اور برائی کا فرق سمجھ آ گیا ہے۔'' وہ اس کا گال چھوتے ہوئے بولیں۔ گل اسی طرح پیچھے ہوگئی کہ ان کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ وہ پلٹ کے تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ بی جان نے خفت سے نظریں جھکا دیں۔ وہ قبیلے کے کسی اور فرد سے نہیں ملی تھی۔ عالیہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ ان کی آنکھوں میں ایک سایہ سا گزرا۔ ایک بے چین سا سایہ مگر وہ زبردستی مسکرائیں۔

''چلو لڑکیو، اور تحفے نکالو۔ کھڑی کیوں ہو۔'' عالیہ حالات کی تلخی کا اثر زائل کرتے ہوئے واپس بیٹھ گئی۔ ہونق بنی لڑکیاں تحفوں پر جھپٹ گئیں۔ اوپر کھڑی عبادہ نے رخ موڑ کر سیڑھیوں کو دیکھا جہاں سے گل چڑھ کے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

عبادہ بھاگ کے اس کے پیچھے آئی۔ وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی رو رہی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ کتاب میز پر رکھتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ پائنتی پر بیٹھ کر اس کے بال چھوئے۔

''گل..... مت رو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

گل نے اپنے آنسو پونچھے اور جھٹ سے بیٹھ گئی۔ ''جانتی ہوں۔'' اور کہتے ہی باہر نکلی، کنارے میں پڑی کھرپی اٹھائی اور واپس پودوں کی مٹی کریدنے لگی۔ عبادہ نے دکھ سے اسے دیکھا تھا۔ نیچے کیا ہوا، دونوں کے درمیان کیا بحث ہوئی، گل کو تھپڑ کیوں پڑا، اسے کچھ سمجھ نہیں آئی، اسے بس اتنا پتہ تھا کہ گل تکلیف میں ہے اور یہ یقیناً جائز تکلیف ہوگی۔

باہر وہ کھرپی سے مٹی کریدتے کریدتے کب پودا اکھاڑ گئی، اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

☆.....☆.....☆

اس دن کی بات ہے.....

یہ عصر کا وقت تھا۔شام کی چائے کے لیے مہمان خواتین لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔چترالی لڑکیاں ٹرے میں لوازمات لا رہی تھیں۔مکھنی چائے کے ترش ذائقے کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔عالیہ بیگم موٹی چچی کے ہاتھ کے بنے نان خطائی کھاتے ہوئے تعریف کر رہی تھیں۔ایک نرم سی اور دھیمی سی گہما گہمی تھی۔

مردان خانے میں بھی یہی سلسلہ چل رہا تھا۔اوسط اور ادھیڑ عمر کے مرد چائے نوش فرما رہے تھے جب کہ جوان مرد اور لڑکے ہجوم سے ہٹ کے کھائی کے قریب ''نشانہ بازی'' کا مقابلہ کر رہے تھے۔یہ مقابلہ چترال اور گلگت کے درمیان تھا۔انہوں نے کھائی کے پار دوسری کھائی کی چوٹی پر چار بڑے بڑے پتھر قدرے فاصلے سے رکھے تھے۔ٹارگٹ یہ تھا کہ ان چاروں میں سے کسی ایک کو رائفل سے گولی مارنی تھی۔

یہ باقاعدہ روایت نہیں تھی مگر قبائل کے درمیان طاقت کی نمائش کے لیے ایسے چھوٹے چھوٹے مقابلے ہوتے تھے جن کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا بلکہ دوسروں پہ محبت سے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس بار وہ جیتے ہیں، اگلی بار وہ جیت کر دکھائیں۔اس صحت مند مقابلے میں جیتنے کے لیے دونوں قبائل کی ٹیمیں خود تیاریاں کرتی تھیں۔

گلگت والے اپنے رائفل لائے تھے جب کہ چترالیوں نے اپنی رائفلیں نکال لی تھیں۔یوسف خان سنہری مسند پہ گاؤ تکیے سے کہنی ٹکائے بالک لڑکوں کو پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔انہوں نے مصنوعی ہاتھ چڑھا رکھا تھا۔سفید دستار ان کے سر پہ تھی۔ان کے ساتھ بلتی قبیلے کے دو بڑے مشران (سردار) بیٹھے ہوئے تھے۔

''دیکھ لیجیے گا یوسف خان۔اس بار نشانہ بازی بھی ہم جیتیں گے اور شندور بھی۔'' ان میں سے

ایک دوستانہ انداز میں للکارتے ہوئے بولا۔

''آپ ہمارے بالکوں کو کم مت سمجھیے۔ان کے نشانے نہ رائفل سے چوکتے ہیں اور نہ ہی شندور کی سٹک سے۔''یوسف خان نے دھونس نہیں کھائی،انہیں اعتماد سے جواب دیا۔

''دیکھتے ہیں پھر۔''وہ چیلنج کرتے ہوئے بولے۔

''ضرور۔''یوسف خان نے پیش کش کی۔

کھائی کے سرے میں جمع لڑکوں کے ٹولے میں سے بیشتر نے کارتوسوں کا کمر بند پہنا ہوا تھا۔میگزین گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔جو منجھے ہوئے اور چوکس نشانے باز تھے وہ قدم بھر آگے تھے۔مقابلہ چھ چھ کے درمیان تھا۔چھ لڑکے گلگت سے اور چھ لڑکے چترال سے تھے۔ان میں ابتہاج بھی تھا۔نشانہ دیکھنے کے لیے بہت سے بالکوں نے دوربین بھی اٹھائی ہوئی تھی۔پتھر دور تھے لیکن واضح تھے۔گولی کے نشان نظر آسکتے تھے۔

غاذان یوسف خان کے ساتھ کھڑا تھا۔وہ نشانے باز نہیں تھا اور اپنی طبیعت کی وجہ سے ایسی سرگرمیوں سے دور ہی رہتا تھا۔اس کا مقابلہ پڑھائی،بزنس ڈیلز اور جرگے کے مسائل تک تھا۔ایسے شوق اس نے اس وقت بھی نہیں پالے تھے جب وہ لندن نہیں گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''گلے!تم کہاں مرجاتا ہے۔تم کو پتہ ہے ناں ہم کتنا خطرناک کام کرنے جارہا ہے؟''ابراہیم نے اس کے قریب آتے ہی جھڑکتے ہوئے کہا۔

''اب آگئی ہوں ناں تو چلو۔''وہ خشک لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی،ابراہیم سر جھٹکتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔زنان خانے میں وہ اچھے سے چل رہے تھے۔سکون سے،بنا ڈرے لیکن جیسے وہ مردان اور زنان خانے کے درمیان آگئے،گل گھبرا گئی۔

''سنو! تم پہلے جاؤ..... دیکھ کے آؤ کوئی مرد تو نہیں پھر میں آتی ہوں.....''

''گلے! کوئی بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ کے آیا ہوں۔ سب باہر ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے آگے لے آیا۔

گل نے پلٹ کے پیچھے دیکھا، اس طرف کوئی نہیں تھا۔ مردان خانے کی رکھوالی کے لیے کچھ ملازم تھے لیکن ان کو مردان خانے کی کھڑکیوں کے باہر پہرا دینے کی اجازت تھی۔ وہ اندر نہیں آسکتے تھے۔ اندر صرف گھر کے مرد آتے اور شادی شدہ مردوں کے کمرے زنان خانے میں تھے، دوسری منزل پہ۔ غیر شادی شدہ مرد مردان خانے میں رہتے لیکن ان دنوں شادی شدہ مرد کم ہی اس طرف آرہے تھے۔

گل ابراہیم کے ساتھ تو چل رہی تھی لیکن اس کے اندر کچھ کھٹک رہا تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ کسی کو پتہ چل گیا تو؟ وہ ڈر رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''یہ لو۔ آ گئے.....'' ابراہیم نے اطلاعی انداز میں کہا۔ (اس کا انداز ایسے جیسے، تم ایویں ڈر رہی ہو۔ دیکھو دریا پار ہو گیا۔ ہاں جی۔ ابراہیم تو مرد تھا ناں۔ لڑکی تو وہ تھی۔ ہونہہ.....)

''اندر وہ ہے تو نہیں؟'' گل نے محتاط ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ہے۔ باہر ہے اس وقت۔ تم جاؤ اندر۔ دیکھ لو۔'' ابراہیم نے تسلی دی۔

''پکا ناں؟ ایسا نہ ہو۔ وہ اندر ہو۔ میں جاؤں اور میری مرمت ہو جائے۔''

ابراہیم نے گہری سانس لی پھر نروٹھے انداز میں اسے دیکھا۔ ''ٹھیک ہے مت جاؤ۔ میں جا رہا ہوں واپس.....'' ابراہیم نے یکدم واپسی کی ہانکی۔

''نہیں نہیں رکو.....'' گل نے اسے بازو سے تھام کے واپس کھینچا۔ ''رک جاؤ۔ جا رہی ہو میں۔ بس تم ادھر ہو۔ دھیان دو کوئی آئے نہیں۔''

ابراہیم کسی چوکیدار کی طرح دروازے کے ساتھ لگ گیا جب کہ اس نے دروازے کے پٹوں پر ہاتھ رکھ کے زور دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ دبے قدموں سے اندر آئی اور آتے ہی ایک طائرانہ نظر اطراف میں گھمائی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ہر چیز اسی طرح تہہ کر کے پڑی ہوئی تھی۔ لائٹیں جل رہی تھیں۔ کھڑکیاں البتہ بند تھیں۔

وہ وقت ضائع کیے بغیر اس عرشے کی طرف آئی جہاں اسے کام تھا۔ یہ جگہ باقی کمرے سے تھوڑی کٹی ہوئی تھی، اس میں تین طرف سے کھڑکیاں تھیں۔ درمیان میں ایک بڑی سربراہی باس کرسی رکھی تھی، اطراف میں ٹیپ ریکارڈر، آرکیسٹرا اور بانسری پڑی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پوری فوٹو فریم سے بھری ہوئی تھی۔ اوپر نیچے، تصویریں تھیں۔ بچپن، لڑکپن، جوانی اور اب بھرپور جوانی کی.....شارٹس میں، بندوق کے ساتھ، ابا کے ساتھ، تایا کے ساتھ، عید پہ، شادی پہ، شال میں، شلوار قمیص میں۔

جب کہ دوسری دیوار پہ جا بجا بندوقیں ہی بندوقیں تھیں۔ چھوٹی بڑی، ہر سائز کی۔ وہ جو اپنی مرضی سے کوئی بندوق اٹھانے آئے تھی، ایک رائفل کو دیکھ کے بری طرح چونک گئی۔ وہ رائفل درمیان میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بٹ اور نال کے قریب لگی لکڑی سرخ تھے اور سرخ ہی سٹریپ اس پہ لگی ہوئی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی چمچما رہی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتے ہوئے قریب آئی اور بندوق کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس رائفل کو اس نے کتنا تلاش کیا تھا۔ چچی، بی جان، پلوشے، ریشم یہاں تک کہ یوسف خان سے بھی پوچھا، کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ رائفل کو نیچے اتارا۔ اس کی سیاہ نال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ اچھی، بری، میٹھی کڑوی سب یادیں۔ چہرے کے رنگ میں پیلاپن ملنے لگا تھا۔

''گلے بچے! تمہارا نشانہ بہت کچا ہے۔ تم کو مزید محنت کا ضرورت ہے۔'' ابا کی باتیں ماضی کے پردوں میں گھومنے لگیں۔ اس کے آنکھوں کے سامنے سیاہ سرخ سائے چلنے لگے۔ ایک سات سال کی بچی، اس کا کزن اور اس کا خوبرو باپ۔

(وہ کسی کھائی کے اوپر نصب ایک نقشے کو دس میٹر دور سے غلیل سے نشانہ لگا رہی تھی۔ اس کے پاپا پیچھے کھڑے تھے۔ ان کے پاس بھی غلیل تھی اور غاذان کے پاس بھی۔ ان دونوں کو اس کے پاپا یہاں لائے تھے۔ گل کا نشانہ لگ کے نہیں دے رہا تھا جب کہ غاذان چھ بار نشانہ لگا کے اب اس کو چھیڑ رہا تھا۔

''بابا غلیل کا پتھر موٹا تھا۔ میں کر سکتا ہوں۔'' وہ جھک کے اب چھوٹی کنکری ڈھونڈ رہی تھی۔

''چچا! یہ بہانے کر رہا ہے۔ اس کا نشانہ اس کی طرح ہے ڈھیلا اور بھدا.....'' غاذان نے ایک بار پھر غلیل کے ربڑ میں کنکری دبا کے اسے کھینچا اور پتھر چھوڑ دیا۔ پتھر ٹھاہ کر کے نشانے پہ لگا۔

''دیکھا..... ایسے مارتے ہیں۔'' وہ پھر اسے چڑانے لگا۔

''بابا..... اس کو دیکھو..... یہ مجھ کو تنگ کر رہا ہے۔'' وہ چڑ گئی۔

''غاذان.....'' بابا نے اپنی گمبھیر آواز میں غاذان کو پچکارا۔

غاذان ہنس کے پیچھے ہو گیا۔ گل جس نے کھلی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور بالوں پہ تکونی سکارف باندھا ہوا تھا، ایک کنکری ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی، ننھا سا قدم پیچھے لے کے اس نے غلیل کے ربڑ میں کنکری رکھی، نقشے کا نشانہ باندھا اور ربڑ پیچھے کھینچا، اس نے ایک آنکھ بند کی، پورا فوکس کیا، اگلے ہی لمحے اس نے کنکری چھوڑ دی۔ کنکری نقشے سے ایک انچ دائیں طرف لگی۔

''اف۔'' اس نے بے زاری سے سانس باہر نکالی۔ یہ انتیس بار تھا۔ وہ پھر فیل ہو گئی تھی۔

''ہاہاہا..... گلے بھدی..... گل پھوہڑ.....'' غاذان اسے بری طرح چھیڑنے لگا۔ گل کے

ہونٹ لٹک گئے۔ بابا اس کے پاس آئے، گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، اس کو خود کے آگے کھڑا کیا۔

''ایسے نہیں کرتے گلے ..... میرے جگر کے ٹکڑے..... یہ دیکھو۔'' انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے غلیل لی، اس میں کنکری رکھی۔ ''اسے پکڑو شاباش اور میں جیسے کہوں، ویسا کرنا۔ ٹھیک ہے؟'' بابا اسے بتانے لگے۔

اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

''اس طرح کنکری کو دو انگلیوں میں پکڑو، ربڑ پیچھے تب کھینچتے ہیں جب دستے والا ہاتھ بہت سختی سے آگے ہو۔ تمہارے اس بازو میں (بازو کو دبایا) لچک نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ٹھہرا ہوا، ساکت ہونا چاہیے۔ دستے (جس کی شکل انگریزی حرف Y کی طرح ہوتی ہے۔) کے درمیان سے اپنے نشانے کو جھانکو اور چار اصول یاد رکھو۔ اینگل، ٹارگٹ، فوکس، شوٹ..... یہ نشانہ لگانے کے اصول ہیں۔ یہ آ گئے تو بڑے سے بڑا نشانہ لے پاؤ گی۔ سمجھیں۔'' انہوں نے اس کے ننھے ہاتھوں پر دباؤ ڈالا اور ربڑ پیچھے کھینچا۔

''اینگل لو..... دستے کے درمیان ہے نشانہ.....''

''جی بابا.....''

''ٹارگٹ کا فاصلہ کتنا ہے؟''

''بیس قدم.....''

''اب فوکس کرو۔ بھول جاؤ تمہارے آس پاس کچھ ہو رہا ہے۔ یوں سمجھو تم اکیلا ہے اور یہ ٹارگٹ ہے۔''

''جی بابا.....''

''لمبی سانس لے کے روک لو.....''

اس نے گہری سانس لی۔

''ایک آنکھ بند کرو.....دھیان.....زور.....''

''شوٹ.....''

اس نے کنکری چھوڑ دی۔ کنکری نقشے پہ ٹھاہ کر کے لگی، وہاں سے اچھلی اور دور جا گری۔ گل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ کچھ دیر وہ بالکل ساکت کھڑی رہی پھر یکدم اچھلی۔

''میں نے کر دیا۔ میں جیت گیا۔ بابا میں نے کر دیا۔'' اس نے ہاتھ بلند کیے، بانہیں کھول لیں اور ایڑیوں پہ اچھلنے لگی۔ ''بابا تم نے دیکھا۔ میں نے مار دیا۔ میں نے۔ گلے نے نقشہ مار دیا۔'' وہ پلٹ کے بابا کو دیکھنے لگی۔ بابا نے بانہیں اس کے گرد حمائل کیں اور اسے خود میں بھینچ لیا۔

بابا کی پشت پہ غاذان کھڑا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ گل نے نقشہ مار لیا تھا۔ وہ کڑھ رہا تھا۔ گل نے زبان نکال کے اسے چڑایا۔ غاذان نے منہ جھٹک دیا۔

''گلے.....گلے.....''

ابراہیم کی آواز کھائی سے آئی۔ اس کے گرد بنا سوچوں کا محور چھناکے سے ٹوٹا۔ وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ ابراہیم پیچھے کھڑا تھا۔ تیورا کے دیکھ رہا تھا۔

''بندوق لینے آیا تھا یا بنانے؟''

''ہاں.....'' وہ جیسے لمبی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔

''بندوق لے لو۔ ملازم اس طرف آ رہے تھے۔ ہم کو دیکھ لیں گے۔'' ابراہیم نے افراتفری سی مچائی۔

''کیا.....'' گل سٹپٹا گئی۔

اپنی سوچوں کو توڑ کے اس نے وہی رائفل اٹھایا، اسے اپنے لمبے، گہرے آنچل میں چھپا لیا۔

''چلو.....'' وہ تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی۔ دروازہ کھولا، باہر آئی۔ راہداری خالی تھی

البتہ کھڑکیوں کے کھڑے پہریدار ملازم نظر آرہے تھے۔وہ رائفل کو چھپاتی، کمرے کا دروازہ بند کر کے زنان خانے کی طرف بھاگی۔

☆.....☆.....☆

پہلا نشانہ گلگت کی طرف سے تھا۔ان کا ممبر آگے آیا، باقی لوگ پیچھے ہوگئے۔جنہوں نے دوربین پکڑی ہوئی تھیں، انہوں نے دوربین کے گرد ہاتھ مضبوط کر لیے۔ہر کھلاڑی کے پاس چار مواقع تھے۔ان چاروں میں ایک گولی نقشے کو لگنی چاہیے تھی۔گلگت کے کھلاڑی نے دھونس جماتے ہوئے ،سینہ ابھار کے اور رائفل لہرا کے سب کو دیکھا۔اس کے ساتھیوں نے بے شمار تالیاں بجائیں۔وہ فخر سے سرخم کرتا ہوا کھائی کے سرے پہ آیا اور ایک گھٹنا نیچے ٹکا دیا (جیسے کسی کو پرپوز کر رہا ہو۔)اسی گھٹنے پر کہنی ٹکا کے رائفل کو بانہوں میں ایڈجسٹ کیا اور نال کے اوپر لگی چھوٹی سی ٹک کو دیکھا۔(یہ ٹک جب نشانے کے سامنے آجائے تو گولی صرف نشانے پر لگتی ہے۔)

اس نے ٹریگر میں دی ہوئی انگلی کو ٹریگر پہ رکھا اور آنکھ میچ لی، ایک گہرا سانس لیا۔باقیوں کا سانس رک گیا۔

اس نے ٹریگر کھینچا، گولی چھوٹی اور پہلے پتھر پہ لگنے کی بجائے اس کی سائیڈ سے نکل گئی۔ چترالوں کا ٹولہ ایڑیوں پہ اچھل گیا۔پہلا نشانہ چوک گیا تھا۔یوسف خان نے سر کو خم دیتے ہوئے گلگت کے سردار کو دیکھا جس نے پہلو بدلا تھا۔

''چھے۔''اس کھلاڑی نے سر پیچھے کیا اور دوسرا نشانہ باندھنے لگا۔

اب اگر زنان خانے کی طرف آئیں تو گولی کی آواز پہ عالیہ بیگم چونک گئیں۔

''لگتا ہے نشانے بازی شروع ہوگئی ہے۔''انہوں نے محظوظ انداز میں سر ہلایا۔

''ہاں۔ابتہاج کہہ رہا تھا کہ عصر کے وقت ہوگی۔اچھا ہے۔پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔''

بی جان نے تکلف سے مسکراتے ہوئے کہا۔اسی اثنا میں وہ چھت کی منڈیر کے پاس نظر آئی۔اس نے ایک نظر زنان خانے کے لان پہ ڈالی اور دوسری نظر مردان خانے کے۔دونوں طرف چائے نوش فرمائی جا رہی تھی۔مردان خانے میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج رہی تھی۔ایک کے بعد ایک کھلاڑی آ کے نقشے مار رہا تھا۔

وہ منڈیر سے پیچھے ہوئی،ابراہیم میگزین لے کر آیا تھا۔

''صرف ایک ملا ہے۔''اس نے میگزین پکڑاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔میری چار گولیاں کافی ہوں گی۔''وہ میگزین لگاتے ہوئے بولی۔

''لیکن وہ تو بہت زیادہ ہیں۔''ابراہیم یکدم پریشان ہو گیا۔

''کون؟''

''آپ کے دشمن۔''

''میں دشمنوں کو نہیں مار رہی پاگل لڑکے۔میں صرف ڈراؤں گی۔''اس نے رائفل اٹھا کے سامنے واجبی سا نشانہ لیا۔

''اگر انہوں نے مزاحمت میں آپ پہ گولیاں چلائیں تو؟''

''اس لیے تو یہاں سے حملہ کرنا چاہتی ہوں۔تاکہ جلدی سے چھپ جاؤں۔ویسے بھی ان کے منہ دوسری طرف ہیں،جب تک وہ پلٹ کے دیکھیں گے،میں اپنا کام کر چکی ہوں گی۔''وہ ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے منڈیر کے قریب چلی گئی اور نیچے بیٹھ گئی۔چھت کی دیوار چار فٹ اونچی تھی،اگر وہ کھڑی ہوتی تو اس کا دیدار آسانی سے ہو سکتا تھا۔اس لیے وہ صحیح وقت کے لیے رائفل لوڈ کر کے بیٹھی رہی۔

چترال کا تیسرا کھلاڑی چلا گیا تھا۔اب تک کسی نے نشانہ نہیں لگایا تھا۔دونوں طرف عجیب سی

مایوسی چھا گئی تھی۔ یوسف خان بھی تشویش اور دبے دبے غصے سے اپنے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا جب کہ بلتی سردار بھی برہم تھے۔ جو جو کھلاڑی ہار رہا تھا، وہ بہت دور جا کے کھڑا ہو رہا تھا۔ غاذان دلچسپی سے یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔

اب گلگت کا آخری کھلاڑی آ گیا۔ گلگت کی ٹیم کے سارے لڑکے اس کے گرد نصیحتوں اور واسطوں کے لیے جمع ہو گئے۔ اگر اس نے ایک نشانہ لگایا تو چترال کو ٹارگٹ مل جائے گا اور اگر اس نے نہیں لگایا تو چترال آٹو میٹکلی جیت جائے گا۔

آخری کھلاڑی نے سب کی باتیں سنیں، کسی کی دماغ میں گھس گئیں تو کسی کی نہیں۔ لیکن وہ سر سب ہی کو ہلاتا رہا۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ۔'' بلتی سردار کے بیٹے نے اس سے کہا۔ وہ گہری سانس لیتا ہوا اپنی جگہ کی طرف بڑھ گیا جب کہ وہ سب دعائیں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہو گئے۔ چترال خوش بھی تھا اور فکر مند بھی مگر بہر حال مقابلہ دلچسپ ہو گیا تھا۔ چترال کا آخری کھلاڑی ابتہاج تھا جو بے نیازی سے ایک طرف کھڑا اپنی رائفل چمکا رہا تھا، جیسے وہ کوئی مایہ ناز چیز ہو۔

''بی جان۔ میں دیکھ رہی ہوں، آپ کی ساری لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں۔ ان کی شادیوں کا کیا ارادہ ہے؟'' عالیہ بیگم نے بات چھیڑی تو کنواری لڑکیاں منہ میں آنچل دیتیں اندر بھاگ گئیں، لان میں موجود خواتین ہنس پڑیں۔

''گھر میں بہت جگہ ہے عالیہ۔ ذرا دستاری ہو جائے، اس کے بعد ہم اس بارے میں سوچیں گے۔'' بی جان نے مسکرا کے کہا۔ عالیہ چائے پی رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک تاثر تھا محتاط سا تاثر۔

''ایک بات پوچھوں؟'' وہ گھونٹ بھر کے سیدھی ہو گئیں۔

''پوچھو۔''

''گل لالہ کی نسبت تو نہیں طے کی؟''

ان کے سوال پہ سب کے ایک دوسرے کو ٹھٹک کے دیکھا۔ بریخنہ جو بی جان کے پیچھے بیٹھی تھی، بے چین ہوگئی۔

''میں نے کہا ناں گھر میں جگہ ہے۔ اس کا بھی ہو جائے گا۔'' بی جان نے تحمل سے کہا۔

''یعنی نسبت طے نہیں کی۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ بی جان اور بریخنہ ان کے تاثرات سے کچھ کھوج رہی تھیں۔ وہ بس ہلکی ہلکی مسکرا رہی تھیں۔ یہ بات تو وہ سب جانتی تھیں کہ عالیہ نے اگر بات چھیڑی ہے تو ایسے ہی نہیں چھیڑی۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

گلگت کے آخری کھلاڑی کا تیسرا نشانہ، دوسرے پتھر پہ چٹاخ کر کے لگا۔ بلتی سردار بے یقینی سے آگے ہوا۔ گلگت کے لڑکے پہلے ٹھٹک گئے پھر دوربین والوں نے شور مچایا تو چیختے ہوئے اچھلنے لگے۔

''لگ گیا..... لگ گیا.....'' وہ مقامی زبان میں اونچا اونچا کہہ رہے تھے۔ ان کا شور سن کے منڈیر سے لگی گل نے نیچے جھانکا، بس آخری کھلاڑی رہ گیا تھا۔ بلتی سردار نے یوسف خان کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ یوسف خان نے گہری سانس لی۔

چترال کے کھلاڑیوں میں اضطراب دوڑ گیا۔ اب ٹارگٹ مل گیا تھا۔ اگر وہ نہیں مار سکے تو چترال جیت جائے گا۔ وہ ابتہاج کے پاس جا کے اس کی ہمت بندھانا چاہتے تھے لیکن ابتہاج ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اس کا تکبر، غرور اور گھمنڈ ہی اس قدر تھا کہ اللہ معافی۔

گلگت کے چوتھے کھلاڑی کا آخری نشانہ چوک گیا لیکن وہ امید سے اٹھا۔ ایک نشانہ وہ لگا چکا تھا۔ اس کی ٹیم اس کو شاباشی دینے کے لیے آگے آئی اور اس کے سر، کندھوں اور چہرے پر تھپکیاں دینے لگی۔ وہ رائفل پکڑ کے پیچھے ہو گیا کیوں کہ اب ابتہاج آگے آ رہا تھا۔

اس نے سیاہ شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سینے پر میگزین بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ پیروں میں کھیڑیاں تھیں اور سر پہ پکول۔ وہ بے نیازی سے چلتا ہوا مقررہ جگہ پہ بیٹھ گیا۔ یوسف خان نے سانس روک لیا۔ جانے ان کا لاڈلہ کیا کرنے والا تھا۔

''میرے چھوٹے لڑکے کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ گل کا ہم عمر ہی ہے۔ میں آج کل اس کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہوں۔ میں چاہ رہی تھی کہ اگر گل لالہ.....''

''گل لالہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' بریخنہ نے تیزی سے بات کاٹی۔

''کیوں؟''

''غاذان سے نسبت طے ہے اس کا۔'' بی جان نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔ (موٹی چچی نے چونک کے دیکھا۔ کب؟)

عالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''غاذان؟''

''ہونے والا سردار۔'' بی جان نے تصحیح کی۔

''مگر اس کے لیے تو پلوشہ.....'' وہ کہتے کہتے رکیں۔ ''میں نے سوچا آپ لوگ وٹہ سٹہ کریں گے۔''

''پلوشے غاذان سے بارہ سال چھوٹا ہے۔ اس کی چھوٹی بہنوں جیسا ہے۔'' بی جان نے باور کرایا۔

ابتہاج کے پہلے دو نشانے چوک گئے لیکن آخری دو ٹھاہ کر کے لگے تھے۔ وہ فخر سے کھڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھی اپنا جشن منانے سے زیادہ گلگت کے لڑکوں پر چڑھائی کر رہے تھے۔ گلگت کے لڑکے دلبرداشتہ انداز میں رائفل پھینکتے ہوئے کھائی سے دور ہو گئے جب کہ یوسف خان نے چائے کی پیالی اٹھا کے ''چیئرز'' والے انداز میں بلتی سردار کو دکھائی پھر مسکرا کے گھونٹ بھرا۔ بلتی سردار اپنی

جگہ جل کے رہ گیا۔

وہ لوگ کھائی سے دور ہو گئے تو گل نے رائفل کی نال کو چھت پہ رکھا اور اس کے پیچھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔

''گلے! سوچ لو۔'' ابراہیم جو اس کے ساتھ دبک کے بیٹھا تھا، ڈرتے ہوئے بولا۔

''تم جاؤ یہاں سے۔ تمہیں گولی لگ جائے گی۔ میں ان کو خود ہی دیکھ لوں گی۔'' وہ اپنی پوزیشن مستحکم کرتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چاہے گولی لگ جائے۔'' وہ اس کے پلو سے چمٹ گیا۔ گل نے پلٹ کر اسے دیکھا، وہ اس کے آنچل میں سر چھپا رہا تھا۔ اس نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بے فکر رہو کچھ نہیں ہوگا۔''

وہ لوگ کھائی سے بیس قدم دور آ گئے تھے۔ دوربین والے بھی پلٹ گئے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور آنکھ میچ لی، رائفل کی نال کو نقشوں کی طرف گھمایا اور اپنے ہاتھوں کا لرزہ ختم کیا۔ اس نے ٹریگر میں انگلی دینے کے بعد، تھوک نگل کے حلق تر کیا۔

''چترال زندہ باد..... چترال زندہ باد.....'' چترال کے لڑے گلگت کو چڑانے کے لیے نعرے بازی کر رہے تھے اور ابتہاج جا کے اپنے باپ کے سامنے بیٹھ گیا تا کہ وہ دیکھ سکے کہ یہ کارنامہ اس کا ہے جسے وہ کسی چیز کے قابل نہیں سمجھتے لیکن یوسف خان کی سرد مہری میں کمی نہیں آئی تھی۔ بلتی سردار ہر نعرے پہ زہر کا گھونٹ پی رہا تھا۔ لڑکے نعرے بازی کے ساتھ ساتھ حصہ لینے والے کھلاڑیوں کو بھی لتاڑ رہے تھے۔ بے چارے کھلاڑی، سر جھکائے مجرموں کی طرح ان کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔

گل نے پہلے نقشے کا نشانہ لیا۔ ابراہیم خوفزدہ انداز میں اس کے آنچل میں سمٹ رہا تھا۔

''تمہارے بازو میں کپکپاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ساکت ہونا چاہیے۔''

اس نے ٹریگر دبایا۔ سنسناتی ہوئی گولی پہلے نقشے کے درمیان پیوست ہوگئی، نقشے کا پتھر جگہ سے اکھڑ کے دور جا گرا۔ گولی کی آواز سن کے نعرہ لگاتے لڑکے اور مہمان بری طرح چونک گئے۔ انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دفعتاً ایک اور گولی آئی، دوسرا نقشہ اڑا۔ ابراہیم نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ کھائی کے سرے پہ کھڑا، دوربین پکڑے گلگت کا آدمی دیدے پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔

''کون ہے؟ کون کر رہا ہے۔'' محفل میں ہلچل مچ گئی۔ سب یہاں وہاں چھپنے لگے۔

''اڑا۔ دوسرا نقشہ بھی اڑا۔'' دوربین والا آدمی کہہ رہا تھا۔

''نقشہ؟'' محفل میں چہ میگوئی ہوئی۔ ''کون اڑا رہا ہے؟'' وہ بے چینی سے کھائی کے پاس گئے۔

''معلوم نہیں۔ پیچھے سے آ رہی ہے گولی۔'' دوربین والا بولا۔ گل نے گہری سانس لی۔ تیسری گولی آئی، تیسرا نقشہ اڑ۔

''تیسرا بھی گیا۔''

اس نے خود کو حوصلہ دیا۔ ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھا اور دوبارہ نشانہ لیا۔

''گلے.....'' اس کے پہلو سے بندھا ابراہیم منمنایا۔

''ڈرو نہیں۔ آخری بھی جائے گا۔'' اس نے آنکھوں میں عزم لیے، نال کو نشانے پہ رکھا۔ نیچے موجود مرد یہاں وہاں دیکھ رہے تھے۔ ابتہاج اور غازان بھی محتاط ہوگئے تھے۔ یوسف خان کو بری طرح تشویش ہونے لگی۔ وہ بلتی سرداروں کے ہمراہ کھائی کے طرف چلے گئے۔

اس نے چوتھا نشانہ لیا لیکن دل دھڑکا۔ وہ سب وہاں جمع ہوگئے تھے لیکن وہ چوتھا گرائے گی۔ وہ جھکے گی نہیں۔ اس نے خود کو ڈھارس بندھاتے ہوئے سوچا مگر ٹریگر پہ رکھی انگلی کانپ رہی تھی۔

''تمہارے بازو میں کپکپاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ساکت ہونا چاہیے۔''

اس نے سانس نکالی۔ جانے کیوں دل جکڑا جا رہا تھا۔

''اینگل.....ٹارگٹ.....فوکس.....شوٹ.....''

اس نے چوتھی گولی داغی لیکن پھر فوراً نیچے ہوگئی اور سطح پر لیٹ گئی۔ گولی سرسراتی ہوئی چوتھے نشانے پہ لگی تھی، نشانہ چٹاخ کر کے جگہ سے اچھلا تھا۔

''چوتھا بھی گیا۔'' دوربین والے نے دوربین آنکھوں سے نیچے کر دی۔

''کس نے مارا ہے یہ؟ کون ہے؟'' ابتہاج اونچا اونچا چلانے لگا۔ اس کی آواز اوپر تک آ رہی تھی۔

''گلے.....'' ابراہیم بری طرح گھبرا گیا۔

''ڈرو نہیں۔ سب کو مار دیا ہے۔'' وہ مستحکم سے لہجے میں کہتی اٹھی، جب ہی اس کے سر کا سبز آنچل چار دیواری سے چھلکا۔ وہ جو پہلے ہی تنقیدی نظروں سے یہاں وہاں دیکھ رہے تھے، اس کو وہاں دیکھ کے ٹھٹک گئے۔ وہ رائفل اٹھائے کھڑی ہوگئی۔ اس کی رائفل بھی نظر آ گئی اور یہ نظارہ زنان خانے اور مردان خانے دونوں نے دیکھا تھا۔ گل نے رائفل کا بٹ ہوا کی طرف کیا۔ وہ جانتی تھی، سب اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ دکھانا ہی تو چاہتی تھی۔ اپنی بھڑاس۔

اس نے ایک ساتھ کئی فائر کیے۔ ہوا میں گولیوں کی دھڑ دھڑاہٹ گونج گئی۔

''ہم تو اپنی عورتوں کو چوڑیاں پہناتے ہیں۔'' خاموش اور ساکت ماحول میں ایک بلتی سردار کی شیطانی آواز گونجی۔ ''تم لوگوں نے بندوقیں بھی پکڑا دیں۔ کیا تم لوگوں کے پاس مرد ختم ہوگئے ہیں۔'' وہ کمینگی سے بولا۔

یوسف خان کے سر لگی، ابتہاج کے دل پر لگی، غاذان کو کچھ نہیں ہوا۔ یوسف خان نے سنسناتی ہوئی نظروں سے ابتہاج کو اشارہ کیا۔ ابتہاج نے سر کو تائیدی انداز میں خم دیا اور رائفل پھینک کے خونخوار انداز میں اندر کی سمت بھاگا۔

عالیہ بیگم جگہ پر جم کے کھڑی ہوئی تھی۔ گردن اٹھی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں چائے کی پیالی تھی۔

وہ یک ٹک گل کو دیکھ رہی تھیں۔ بریخنہ کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ ان کو آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گل دونوں طرف استہزائیہ مسکراہٹ اچھال کے پیچھے ہوگئی اور پلٹ گئی۔

بی جان قدم قدم قریب آئیں اور عالیہ کے کان کے پاس جھک گئیں۔

''تمہارے بیٹے نے گل کو دیکھا ہوا تو ہے ناں؟''

عالیہ نے تیورا کے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سرخ ہلکورے تیر رہے تھے۔

''گل لالہ کو صرف ہم سنبھال سکتے ہیں۔ صرف ہم۔'' وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بولیں۔ عالیہ بیگم نے زہر کا تھوک نگل لیا۔

بریخنہ نے کپکپاتے ہوئے پیالی نیچے رکھی اور اندر کی طرف بڑھیں۔ موٹی چچی بھی اندر آگئیں۔

☆.....☆.....☆

''واہ گلے واہ.....تم نے کمال کردیا۔'' ابراہیم کی ساری گھبراہٹ ہوا ہوگئی تھی۔ وہ اس کو داد دیتے ہوئے نیچے آرہا تھا جب کہ وہ رائفل کو کندھے پر لادے ایسے چل رہی تھی جیسے پورا ملک فتح کرلیا ہوا۔

نیچے سے ابتہاج وحشی درندوں کی طرح اوپر آرہا تھا۔ وہ دونوں چھت کی سیڑھیاں اتر رہے تھے اور اس سب میں عبادہ مکھنی چائے جو ثمامہ غلطی سے دے کر آئی تھی، اس کی پیالی لیے کمرے سے نکل رہی تھی۔ موٹی چچی اور بریخنہ صحن میں آرہے تھے۔ یہ سب ایک انجان احساس کے تحت ہو رہا تھا۔

''مجھے لگا تم نہیں کر پائے گا۔ میں بہت ڈر گیا لیکن تم نے تو حیران کردیا مجھ کو۔'' وہ پہلی منزل کی سیڑھیاں اتر آئے تھے۔ اسی لمحے ابتہاج نے آخری منزل کی سیڑھیاں چڑھ لیں۔ عبادہ بھی قدم قدم آگے آگئی تھی۔

''گلے! کھیتوں میں بہت ساری نئی چڑیاں آئی ہیں۔ میں نے کل دوپہر میں دیکھی ہیں۔ میں منیجر لائے گا پھر ہم لوگ غلیل سے نہیں.....'' اور یکدم اسے بریک لگ گئی۔ سامنے ہانپتا ہوا ابتہاج کھڑا تھا اور دوسری طرف متذبذب سی عبادہ جسے علم ہی نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ابراہیم کی آنکھیں پھٹ گئیں جب کہ گل پرسکون انداز میں مسکرائی۔

''خوش آمدید ابتہاج صاحب۔'' وہ خراماں خراماں قدموں سے نیچے اتری۔

''ذلیل عورت.....'' ابتہاج حملہ آور ہونے کے انداز میں آگے بڑھا، پل بھر میں اس نے گل کی گردن کی پشت کو جکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا چاردیواری کے پاس لایا۔ اس کی گردن نیچے جھکائی۔ عبادہ کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کے نیچے گری، ابراہیم سسک کے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

''خبیث عورت..... بند کرو اپنی بے حیائی.....''

''کیوں کیا ہوا؟ ڈر گئے تھے؟'' گل طنز سے بولی۔

''ابتہاج..... چھوڑو اسے کیا کر رہے ہو۔'' عبادہ آگے بڑھی۔ ابتہاج نے بازو جھٹک کے عبادہ کو دھکا دیا، وہ پیچھے جا لگی۔ نیچے موجود بریخنہ نے آواز پر سر اٹھایا۔ ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ابتہاج پیٹھ پہ گل کو بری طرح تھپڑ مار رہا تھا۔

''ابتہاج نہیں.....'' وہ مزحمت کے لیے آگے بڑھیں جب ہی موٹی چچی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہا جا رہی ہو بریخنے۔''

''ابتہاج اسے مار رہا ہے۔''

''نہیں تو۔ وہ تو بس اس کا شوق نکال رہا ہے۔'' چچی کمینگی سے بولیں۔

''ہاتھ چھوڑیں میرا بھابھی۔''

''چھڑا سکتی ہو تو چھڑا لو۔'' انہوں شانے اچکا کے کہا۔ بریخنہ دبلی پتلی سی خاتون تھیں۔ وہ کیسے

اپنی نازک کلائی ان کے موٹے بھدے ہاتھوں سے چھڑا سکتی تھیں۔ وہ اپنی جگہ مچل کے رہ گئیں۔

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے بے غیرتے..... تجھے مہمانوں کا خیال ہے یا نہیں..... دشمنی کو ختم ہوئے وقت کتنا ہوا ہے۔ تو پھر بدمعاشی دکھا رہی ہے۔'' اس نے گل کا چہرہ گھمایا۔ کھینچ کے گل کا جبڑا اپنی انگلیوں میں میچا۔ گل کے جبڑے ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ ''ہر بار ہمیں بدنام کرتی ہو۔ نہ گاؤں کے آگے سر اٹھانے کے لائق چھوڑا نہ مہمانوں کے آگے؟ تیری لگام اتنی ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ہاں.....''

''جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟'' گل نے اکساتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ایک لڑکی سے ڈرتے ہو، ابتہاج عرف گیدڑ خان۔''

''کیا کہا تو نے؟''

''عقل کے ساتھ ساتھ لگتا ہے کان بھی چلے گئے ہیں۔'' وہ ڈھیٹوں کی طرح ہنسی حالانکہ جبڑے دکھنے سے اس کے آنسو نکل آئے تھے۔

''ابتہاج! اسے چھوڑ دو۔'' عبادہ پھر مزاحمت میں آگے آئی۔

''تم.....'' ابتہاج اسے دیکھ کے غرایا۔ ''آگے آئی تو اسے نیچے پھینک دوں گا۔''

''کیا بگاڑا ہے اسے نے تمہارا۔ چھوڑو اسے۔''

''یوسف خان کا بیٹا ہو کے سردار نہیں بن سکا یہ عبادہ۔ ان پڑھ جاہل اور گنوار جو ہے۔ اس لیے غاذان سے اپنی حسد نکالنے کے لیے مجھ پر غصہ اتارتا ہے۔ یہ بزدل اور ناکارہ انسان ہے۔'' گل حواس باختہ انداز میں ہنسی۔ ابتہاج نے اپنی انگلیاں مزید اس کے گالوں میں دھنسا دیں۔

''ابتہاج! جانے دو اسے۔ چھوڑ دو۔ مت مارو.....'' بریخنہ منت کر رہی تھیں۔ موٹی چچی نے کلائی لال کر دی تھی لیکن چھوڑی نہیں تھی۔

''تمہیں نہیں لگتا لڑکی..... تمہیں کسی مرد کو نہیں آزمانا چاہیے؟'' ابتہاج اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کہنے لگا۔ ''ہر بار، ہر جگہ، ہر کسی کے سامنے یوں نہیں للکارنا چاہیے؟'' عبادہ اس کو چھڑانے کے لیے کھینچ رہی تھی لیکن ابتہاج کا دایاں ہاتھ تھا اور بے حد مضبوط گرفت تھی۔

''ایک لڑکی ہو۔ معمولی، کمزور اور یتیم جس نے پورے خاندان سے دشمنی مول لی ہے۔ اچھا کیا خان جی نے تمہارے ساتھ۔ کیوں کہ اگر وہ نہ کرتا تو آج تمہارا یہ حال ہے۔ اس وقت کیا ہوتا؟ تم تو ہمیں چوڑیاں پہنا دیتی، نہیں؟''

''بی جان..... بی جان.....'' بریحنہ اونچا اونچا چلانے لگی۔ ''بی جان اندر آئیں۔ بی جان جلدی کریں۔''

''چپ کرو۔'' موٹی چچی نے اب کی بار ان کا منہ بند کر دیا۔ راہداریوں سے جھانکتی لڑکیاں اندر دبک گئی تھیں۔ سب بری طرح ڈر گئی تھیں۔ گل کے ہونٹوں سے خون باہر ابل پڑا۔

''تم مجھ سے پنگا لیتی ہو۔ اپنی حیثیت کیوں بھول جاتی ہو؟ چھوئی موئی سی لڑکی۔ میں چاہوں تو تمہیں مسل دوں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ ہو کون تم میرے آگے ہاں؟''

گل کھانسنے لگی۔

''ابتہاج! پلیز چھوڑ دو اسے.....'' عبادہ نے التجا کی۔

''دیکھ لو خود کو..... کتنی بے بس ہو تم؟ لاچار۔ تنہا۔ ایسی ہی بے بس رہو گی۔ ہمیشہ۔ اکیلی جو .....''

اور ابتہاج کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ گل نے ٹانگ گھما کے اس کے معدے میں دے ماری اور جبڑے چھڑا لیے۔ ابتہاج لڑکھڑا کے پیچھے ہوا۔ گل کا منہ خون سے بھر چکا تھا۔ وہ جھک کے زور زور سے تھوک پھینکنے لگی۔ عبادہ بجلی کی تیزی سے گل کی طرف لپکی۔ نیچے موجود بریحنہ تڑپ تڑپ

کے بے حال ہو چکی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' بی جان کی گمبھیر آواز آئی۔ موٹی چچی نے تیزی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ آزادی پاتے ہی وہ بھاگ کے بی جان کے پاس گئی۔

''بی جان..... بی جان.....''

''کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟'' وہ اس کی اڑتی ہوائیاں دیکھ کے پریشان ہو گئیں۔

''وہ گل..... ابتہاج.....'' اور جب ہی بریخنہ نے اپنا توازن کھو دیا، وہ بی جان کے کندھے پر غش کھاتے ہوئے گر گئیں۔

''بریخنے.....'' بی جان نے بمشکل اسے تھاما لیکن وہ دھیرے دھیرے ان کے ساتھ فرش پہ لڑھک گئی۔ بی جان کے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ چھوٹا اور وہ بے دم ہو گئیں۔ ''بریخنے! کیا ہوا۔ اٹھو۔'' بی جان کے دل پہ گھونسا پڑا۔ موٹی چچی بادل نخواستہ قریب آئی۔

''ثمینہ، دیکھو اس کو کیا ہوا ہے۔'' بی جان گھبرا کے بولیں۔ وہ زہر کا گھونٹ بھر کے پنجوں کے بل بیٹھ گئیں اور اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

''بریخنے۔ اٹھ جاؤ۔ سب ٹھیک ہے۔'' وہ کڑوی تھیں۔ بے حد کڑوی۔

گل کے ہونٹ، دانت، زبان اور ٹھوڑی خون سے بھر گئی تھی۔ عبادہ نے تیورا کے اس جانور کو دیکھا۔

''وحشی درندے..... کیا کیا تم نے؟''

عبادہ کی چیخ پر بی جان نے اوپر دیکھا، انہیں قہقہہ لگاتا ہوا ابتہاج نظر آیا۔ وہ چونکیں، پل بھر میں ساری کہانی سمجھ آ گئی۔ وہ آہستہ سے کھڑی ہوئیں۔

''ہونہہ.....'' ابتہاج اس پہ ایک استہزائیہ نظر ڈال کے پیچھے ہوا اور جب ہی اس کی نظر رائفل

پر پڑی۔ وہ ٹھٹکا۔ وہ رائفل اس کے کمرے میں تھی۔ وہ یہاں کیسے؟ اس کا مطلب..... اب کی بار جو وہ پلٹا جوشہ رگ پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''تم نے میرا رائفل کیسے اٹھایا؟ ہاں۔'' اس نے جھک کے کھانستی گل کے بال پکڑ لیے اور اسے جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ اس کا چہرہ پھر سے اپنے سامنے کیا۔ ''تم میرے کمرے میں گئی تھیں؟'' وہ شعلہ بار آنکھوں سے پوچھ رہا تھا۔ بی جان کو اب گل نظر آ گئی اور اس کے ساتھ گل کو چھڑاتی عبادہ بھی۔

''ہاں..... گئی تھی.....'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''خبیث عورت..... آوارہ..... بدچلن.....'' اس نے رائفل پھینک کے ایک زوردار تھپڑ گل کو مارنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مارتا، عبادہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنا ہاتھ رکتا دیکھ کے ابتہاج نے منڈی کو روبوٹ کی طرح گھمایا۔

''سوچنا بھی نہیں.....'' عبادہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے خبردار کیا۔

''ہاتھ چھوڑو میرا.....''

''گل کو چھوڑ دو.....''

''یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے پیچھے ہو جاؤ۔ میں لحاظ نہیں کروں گا۔'' چبا چبا کے کہا۔

''گھر کا معاملہ تھا۔'' عبادہ نے ناخنوں کی دھاری اس کے بازو پہ چھوڑتے ہوئے اس کا ہاتھ نیچے جھٹک دیا۔ ابتہاج کے بازو پہ بلی کے پنجوں جیسا چیر دیا۔ درد کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ عبادہ نے اس کے دوسرے بازو جس سے اس نے گل کے بال پکڑے تھے، اس پہ زور سے اپنے ہاتھ مارے، ابتہاج کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ عبادہ نے گل کو چھڑایا اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری تو.....'' وہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

''ابتہاج.....'' بی جان کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ وہ ٹھہر گیا۔ اس نے تیزی سے نیچے دیکھا۔

بی جان پشت پہ ہاتھ باندھے، ایک سردارنی کی طرح گردن اکڑا کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''مردان خانے میں جاؤ۔'' حکم نہیں تھا۔ وارننگ تھی۔

''بی جان اس نے فائرنگ.....''

''فائرنگ کیا ہاں؟'' عبادہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ (بس بہت ہو گیا تھا ڈرنا۔)

''بیچ میں مت آؤ۔ میں نے بہت سہہ لیا ہے۔ اب مزید برداشت نہیں کروں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں جانے کی۔'' وہ گل پہ جھپٹتے ہوئے بولا۔

''کیوں تمہارے کمرے میں قارون کا خزانہ ہے؟ یا اتنا پاک ہے کہ اس کے چھونے سے اچھوت ہو گیا ہے۔'' عبادہ نے اس کے سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا۔ ''کچھ دفنایا ہے وہاں؟ غصہ کس بات کا ہے؟'' ایک اور دھکا پڑا۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔'' وہ پیچھے ہو رہا تھا۔ عبادہ آگے آ رہی تھی۔

''کیوں؟''

''نامحرم ہو تم۔'' وہ غرایا۔

''گل سے نکاح ہوا ہے کیا جو اسے چھوا؟''

''وہ گھر کی عورت ہے۔''

''حلال ہے کیا؟''

''چپ کر جاؤ۔'' وہ بری طرح چڑ گیا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ تلخی سے بولی مگر آواز مدھم تھی۔ ''مردانگی وہاں دکھاؤ جہاں ضرورت ہو۔ عورت پہ بس نہ چلاؤ۔ اپنی طاقت کے لوگوں سے مقابلہ کرو۔'' وہ اسے پیچھے کرتی سیڑھیوں تک لا چکی تھی۔ اب وہ پیچھے ہوتا تو گر جاتا۔ وہ ایک قدم نیچے لے کے سیڑھی پہ آ گیا۔

''مجھے نہیں پتہ اس نے کیا کیا ہے۔لیکن مار پٹائی سے کس نے معاملہ حل کیا ہے؟ عورت پہ ہاتھ کون اٹھاتا ہے ابتہاج؟ وہ بھی گھر کی عورت پہ؟ اگر وہ کچھ غلط کر بھی رہی تھی تو پیار سے، مصلحت سے، محبت سے سمجھاؤ۔مار سے کیا ہوگا؟ چلو مار دو بھی۔لیکن پہلے ہی مار کیوں؟ پہلے تو محبت سے سمجھانے کا حکم ہے ناں؟ پھر پہلا مانع تھپڑ کیوں؟ بچی ہے وہ؟ تم اسے مارنے کے لیے ہی کیوں آگے بڑھتے ہو ہاں؟ کبھی پیار سے سمجھایا ہے؟'' وہ سرد لہجے میں بول رہی تھی۔تاثرات میں شدید پتھراہٹ تھی۔

''اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔یاد رکھنا۔''

''جو کرنا ہے کرو۔شوق سے کرو لیکن میرے سامنے تم نے گل کو ہاتھ لگایا تو میں بھول جاؤں گی کہ تم اور تمہارا یہ قبیلہ عزت کا کتنا بڑا پجاری ہے Domestic Violence کی دفعہ درج کرا کے میں رپورٹ کر دوں گی پھر میں دیکھتی ہوں کہ دی کوو ول مسٹر ابتہاج خان خود کو کیسے بچاتا ہے۔''

''بہت پچھتاؤ گی تم.....''

''بیسٹ آف لک۔''لعنت کے انداز میں کہتی وہ پیچھے ہوگئی۔ابتہاج نے مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔

اگر بی جان نہ دیکھ لیتیں تو آج اسے ابتہاج کو یوں دھکے دینے کا انجام بتا دیتا۔وہ زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے نیچے اتر گیا۔عبادہ تیز تیز چل کے گل کے پاس آئی، گل نیچے بیٹھ کے پلو سے خون صاف کر رہی تھی۔

''گل! تم ٹھیک ہو.....''اس نے گل کے سر پہ ہاتھ رکھ کے نرمی سے پوچھا۔گل جس کی سانس اٹک اٹک رہی تھی، اس نے ہلکا سا سر اٹھا کے اسے دیکھا۔عبادہ کی آنکھوں میں فکر تھی۔وہ فکر اور وہ تشویش جو اسے صرف ایک بندے کی آنکھوں میں نظر آسکتی تھی۔بابا..... ہاں..... بابا کی آنکھوں

میں..... جب جب وہ ٹھوکر کھا کے گرتی، اسے تھامتے ہوئے ان کی آنکھیں، اس کی کہنی رگڑتی۔ اسے سہلاتے ہوئے ان کی آنکھیں..... ہاں..... گل لالہ کو یہ آنکھیں اٹھارہ سال بعد نظر آئی تھیں۔

''چلو اٹھو..... کمرے میں جاتے ہیں۔'' اس نے نرمی سے اس کے گرد ہاتھ حمائل کیے اور اسے اٹھایا۔ اگر ابتہاج نے اس کا منہ نہ پکڑا ہوتا تو گل بھی ایک آدھ اسے جڑ دیتی لیکن اس کی انگلیوں کی گرفت بہت مضبوط تھی اور پھر ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک عرصے کی بھڑاس اس اس نے نکال لی ہو۔ بہن کی، ماں کی اور خود کی بھی!

ابراہیم نے ان کے جانے کے بعد آنسو پونچھے اور فرش پہ گرا گل لالہ کا رائفل اٹھالیا۔

☆.....☆.....☆

وہ سرخ چہرہ لیے، پھولے ہوئے نتھنوں کے ساتھ مردان خانے میں داخل ہوا۔ اس کا تنفس بگڑا ہوا تھا۔ اس کو جارحانہ انداز میں اس طرح آتا دیکھ کے لابی کے عین آغاز میں کھڑے بلتی لڑکے اسے چڑانے کے لیے کھڑے تھے۔ اس ٹولے کو دیکھ کے ابتہاج کے قدم وہیں زنجیر ہو گئے۔

''لگتا ہے آج اپنی عورتوں کو لگام ڈالنے کا خیال آیا ہے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''نہیں بھائی۔ انہوں نے کام بانٹ لیے ہیں۔ عورتیں مردوں کا کام کرتی ہیں اور مرد عورتوں والے۔'' دوسرا بولا تو سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ابتہاج ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرنے لگا، جب وہ تین لڑکے اس کے سامنے آ گئے اور اس کا راستہ روک لیا۔

''کہاں جا رہے ہو ابتہاج؟ غصہ ٹھنڈا کرو۔ تھوڑی سی بے عزتی ہی تو ہوئی ہے۔'' وہ انتہائی معصومیت سے بولے۔

''راستہ چھوڑو میرا۔'' وہ چبا کے بولا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں دوڑتی ڈوریاں دیکھ کے ان میں سے ایک لڑکے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔

''باخدا۔ اتنا غصہ؟ ہم تو تمہارے مہمان ہیں۔ ہمیں آنکھیں نہ دکھاؤ۔''

''یہ کیا آنکھیں دکھائیں گے۔ ان کی آنکھیں تو ان کی عورتوں نے شرم سے جھکا دی ہیں۔''

دوسرا استہزائیہ انداز سے ہنسا۔

''بے غیرت۔'' پہلا رکھائی سے بولا۔

''اور تم لوگوں کی غیرت کی انتہا کیا ہے میری زبانی سنو گے۔'' یہ غاذان کی آواز تھی جو ہجوم کے پیچھے سے ابھری۔ وہ لوگ راستہ بناتے ہوئے ایک طرف ہوئے تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

''تم لوگ اتنے غیرت مند ہو کہ تم لوگوں کو چترال کی ایک لڑکی نے ہرا دیا۔''

لڑکوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آ گیا۔ لڑکوں نے سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے طنطنے پر قابو کیا۔

''تم جاؤ ابتہاج۔ ان کو میں ٹھیک کرتا ہوں۔'' وہ اپنی آستین فولڈ کرتے ہوئے بولا۔ ابتہاج نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کے لابی میں آگے بڑھ گیا۔ جب تک غاذان نے آستینیں چڑھا لی تھیں۔

''ہاں..... کس کو مسئلہ تھا؟'' اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سب گم صم ہو گئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ ہونے والا سردار تھا۔ اس کا رعب ابھی نہیں بنا تھا لیکن طنطنہ سلامت تھا۔ وہ لوگ اس سے بگاڑے بغیر وہاں سے کھسک گئے۔

☆.....☆.....☆

بریخنہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے، ثمامہ کے ہاتھ سے پانی پی رہی تھیں۔ انہیں دس منٹ پہلے ہوش آیا تھا۔ وہ گل کی بلکتی، سسکتی آواز کی تاب نہیں لاتے ہوئے غش کھا گئی تھیں۔ موٹی چچی اور

بی جان ان کے سامنے صوفوں پر براجمان تھیں جب کہ عالیہ ہمدردی جتانے کے لیے اس کے ساتھ پائنتی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ان کے انداز میں دکھ تھا جسے بریخنہ محسوس کر رہی تھیں لیکن انہوں نے زہر منہ میں رکھ لیا۔بی جان بریخنہ کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں تھیں۔

''ٹھیک کہتا ہے اللہ۔اولاد آزمائش ہوتی ہے۔اللہ سب کو نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے۔'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔بی جان نے جل کر پہلو بدلا جب کہ موٹی چچی بولیں۔

''آمین۔''اور منہ پر ہاتھ پھیر لیے۔

ثمامہ نے ان کے منہ سے گلاس پیچھے کر کے میز پر رکھ دیا پھر ان کی پشت کو تکیے پر دراز کیا۔بریخنہ کا مسئلہ تھا کہ ان کا بلڈ پریشر بہت جلدی گر جاتا تھا۔اکثر کام کے دوران اور اٹھتے بیٹھے وہ چکرا جاتی تھیں اور ایسے خاطر خواہ موقعوں پر تو ان کی جان نکل جاتی تھی۔ان کی دائیں کلائی سرخ تھی،جلد پہ جگہ جگہ انگلیوں کے نشان تھے۔اگر موٹی چچی نے پکڑا نہ ہوتا تو وہ گل کی جان بچانے کے لیے کوئی بڑی مزحمت ضرور کرتیں۔

بریخنہ نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

''عالیہ!تم ہمارا ساتھ چلو۔نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''موٹی چچی کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

''ہوں۔تم آرام کرو بریخنے۔تم کو اس وقت سکون کی ضرورت ہے۔''عالیہ نے اسے سینے تک چادر اوڑھانے کے بعد نرمی سے کہا پھر اس پر دوستانہ نظر ڈالتی ہوئی موٹی چچی کے ساتھ باہر نکل گئیں۔بی جان نہیں گئیں۔وہ کافی دیر سے بریخنہ کو گھورے جا رہی تھیں۔شاید کچھ سوچ رہی تھیں۔کچھ گہرا اور بے حد ضروری۔بریخنہ نے ردعمل نہیں دیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

یہ دو دن بعد کا قصہ ہے۔

وہ کان سے فون لگائے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر جا رہا تھا۔اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''میں جا رہا ہوں۔تم رکو۔کچھ خود سے نہیں کرنا۔'' وہ کال والے کو تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔ تیسری منزل تک وہ ہانپتے ہانپتے چڑھا پھر راہداری میں تیزی سے آگے بھاگ گیا۔عبادہ کے کمرے کے سامنے اس کے قدم تھم گئے۔اس نے فون دوسرے کان پہ منتقل کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔رات کی خاموشی میں ایک خوفناک آواز دوڑ گئی۔

اندر بیڈ پہ سوئی عبادہ کی آنکھ فوراً کھل گئی۔وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔اس کے ساتھ سوئی گل بھی الجھی الجھی سے اٹھی۔دروازہ بے رحمی سے بج رہا تھا۔دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اس وقت کون آ گیا؟'' عبادہ نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' گل نے تکیے پہ پڑی چادر اٹھائی پھر پیروں میں جوتے اڑسے اور چادر کو شانوں پہ پھیلاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''گل دھیان سے۔'' عبادہ بے ساختہ بولی۔

''یہ میری حویلی ہے عبادہ۔ریلکس۔'' وہ مسکرا کے کہتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔باہر سے غاذان دوبارہ دروازے بجانے والا ہی تھا کہ گل نے پٹ کھول دیے۔غاذان کا ہاتھ ہوا میں رہ گیا۔اسے اس پہر یہاں دیکھ کے گل بری طرح چونک گئی۔

''آپ؟'' گل نے ایک نظر راہداری کی ویرانی پہ ڈالی۔''اس وقت؟ خیریت ہے؟''

''عبادہ ہے؟ اس کو جگاؤ۔فوراً۔ہمیں اصطبل جانا ہے۔'' وہ ہڑبڑا کے بولا۔فون ابھی بھی کان سے جڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟'' گل یکدم پریشان ہو گئی۔

''تم سے جتنا کہہ رہا ہوں۔ وہ کرو۔ عبادہ کو اٹھاؤ۔ ایمرجنسی ہے ہمیں.....'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔ عبادہ اصطبل کا نام سن کر قدم قدم چلتی دروازے میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ غاذان کی نظر پڑی تو گل کو چھوڑ کے اندر آ گیا۔

''عبادہ! ہمیں اصطبل جانا ہوگا۔ ابھی اسی وقت۔ دو گھوڑوں کی حالت تشویش ناک ہو رہی ہے۔ وہ بری طرح جکڑ رہے ہیں۔'' وہ ہراساں انداز میں بتانے لگا۔

''کیا ہوا ہے؟'' عبادہ کے اعصاب پوری طرح بیدار ہو گئے۔

''کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔'' وہ مڑتے ہوئے بولا۔ عبادہ نے رک کے گل کو دیکھا۔ وہ بھی الجھی الجھی کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں جوتے پہن لوں۔'' وہ پلٹ کے بیڈ تک گئی، پائنتی کے نیچے پڑے جوتے پیروں میں اڑس لیے۔ وہ ننگے پیر ہی اٹھ آئی تھی۔ جوتے پہننے کے بعد اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اپنا کیچر اٹھایا، منہ میں پکڑا اور بالوں کو سمیٹنے لگی۔ ''میرا سامان.....'' اس نے کیچر بالوں میں لگانے کے بعد غاذان کو اشارہ کیا۔ غاذان نے اس کی ایک طرف پڑی ڈاکٹر سوٹ کیس کو ہینڈل سے پکڑا اور اسی اثنا ایک ملازم بوکھلائے انداز میں اندر آیا۔

''صاب جی.....وہ.....خان جی.....'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔ غاذان نے گھبرا کے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا خان جی کو؟'' وہ پریشانی سے اس تک آیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کو فون کر رہا ہے۔''

''فون؟'' وہ ٹھٹک گیا۔ اس کا فون اس کے ہاتھ میں تھا جس پہ وہ مہابت خان سے بات کر رہا تھا۔ اس کی لائن بزی جا رہی تھی۔ اس نے فون کاٹا۔ وہاں خان جی کے کئی فون آئے ہوئے تھے۔ ساتھ اس کے دیگر کزن بھی پے در پے کال کر رہے تھے۔ اس نے چھوٹتے ہی خان جی کو کال

بیک کی۔

''یہ پکڑو۔گاڑی میں رکھو۔'' اس نے ملازم سے کہا۔پھر عبادہ کی طرف مڑا۔''آپ چلیں پلیز۔جی خان جی۔میں جارہا ہوں۔آپ فکر مت کریں۔''

عبادہ اسی طرح چل پڑی۔غاذان فون پہ بات کررہا تھا۔پیچھے دروازے میں کھڑی گل دھواں دھواں کھڑی رہ گئی تھی۔

''جی۔میں لے کے جارہا ہوں۔میرے ساتھ ہی ہیں۔ہم پہنچ جائیں گے۔جی۔آپ فکر مت کریں۔میں پوری کوشش کروں گا۔کچھ نہیں ہوگا۔آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ تیز تیز قدم لیتے ہوئے راہداری میں آگے بڑھ گیا۔عبادہ اس کے ساتھ قدم ملانے لگی۔

وہ دونوں سیڑھیاں اتر کے نیچے آگئے۔ملازم اس کا بیگ لے کے جاچکا تھا۔غاذان اسے زنان خانے کے راستے باہر لانے کی بجائے سیڑھیوں کے پچھواڑے لگے ایک مخصوص دروازے سے نکال کے مردان خانے لے آیا۔مردان خانے کی لمبی، کھلی اور روشن راہداری کے ایک سمت شیشے کی قدآدم کھڑکیاں تھیں جن کے پردے اس وقت برابر تھے اور باہر چلتی ہوا سے ہلکے ہلکے ہل رہے تھے اور دوسری سمت فاصلے فاصلے سے کمروں کے دروازے بنے ہوئے تھے۔وہ اس راستے پہلی بار جارہی تھی۔چند ہی منٹ چلنے کے بعد وہ ٹھیک وہاں آگئی جہاں گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔اس آسان راستے کو دیکھ کے وہ چونک گئی تھی۔بڑی بڑی حویلیوں کے سب ہی راستے لمبے نہیں ہوتے، کچھ شارٹ کٹ بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں صرف ''مکین'' جانتے ہیں۔

باہر موسم کی تیوریاں بدل رہی تھیں۔آسمان گھنگھور سحاب سے بھر رہا تھا۔چاند اور تارے چھپ گئے تھے۔تیز ہوائیاں چل رہی تھیں۔گاڑی تک جاتے وقت ایک ٹھٹھراتی ہوا نے اسے کپکپا دیا۔اس نے بے ساختہ بازو سہلائے۔وہ لانگ شرٹ اور کھلی شلوار کے علاوہ کچھ پہن کے نہیں آئی

تھی۔ نہ چادر نہ دوپٹہ اور نہ ہی اوور آل۔ پیروں میں روزمرہ استعمال کے جوتے ہی تھے۔ اسے کچھ گرم نہ پہننے کا بری طرح احساس ہوا۔

غاذان ایک کال بند کرتا تو دوسری اٹھاتا۔ اسے بہت کالز آرہی تھیں۔ وہ رف ٹی شرٹ اور ڈھیلی پتلون پہ شال لیے ہوئے تھا۔ اسے سردی گرمی کا ہوش نہیں تھا۔ حویلی سے اصطبل تک وہ لگاتار فون میں ہی لگا رہا۔ اصطبل کے سامنے جیسے ہی گاڑی رکی، وہ نیچے اترا اور اندر بھاگا۔ عبادہ بھی اس کے تعاقب میں اندر بھاگی۔ اصطبل سے اس مخصوص کمرے تک کا راستہ ویران تھا لیکن جیسے ہی وہ اصطبل سے باہر نکلی، اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ اس دروازے کے آگے موجود ہجوم کو دیکھ کے اس کا دل ڈوب کے ابھرا۔

اس نے قدم تیز کر دیے۔

''سامنے سے ہٹو۔ راستہ دو۔ ڈاکٹر آ گئی ہے۔'' غاذان کھوواری زبان میں کہہ رہا تھا۔ ہجوم میں موجود مرد اور لڑکے ایک طرف ہو گئے۔ اس کے لیے جگہ بن گئی۔ وہ اندر آ گئی۔ دونوں گھوڑے اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں فرش پہ پڑے تھے۔ مہابت خان، کچھ اور ملازم ان پہ جھکے ہوئے تھے۔ وہ گھوڑوں کے سر اور ٹانگیں اٹھا کے انہیں رمق دینے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے تھے۔

''پلیز ہٹ جائیں۔ مجھے دیکھنے دیں۔'' آتے ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور گھوڑے کا سر اٹھایا۔ ملازم اور مہابت خان کھڑے ہو گئے۔ ابتہاج ایک کونے میں کھڑا تھا۔ سفید شلوار قمیص پہنے، منہ بھینچے خود پہ مکمل ضبط کیا ہوا تھا۔ اس کے جبڑے دانتوں کے کچلنے سے ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

گھوڑے کی آنکھیں ہل کے نہیں دے رہی تھیں۔ وہاں غشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح ہنہنا رہے تھے ان کی فریاد سے بھری آوازوں نے پورا اصطبل سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔ عبادہ نے فوراً اپنی کٹ

کھولی اور اپنا سٹیتھوسکوپ باہر نکالا۔اس نے گھوڑے کے دل پہ خوردبین رکھی۔گھوڑے کا دل ضرورت سے زیادہ تیز دھڑک رہا تھا۔اسے کہیں نہ کہیں خطرے کی گھنٹیاں سنائی دیں۔گھوڑے کا جسم بے حد گرم تھا اور اس کے اندر کی تکلیف نے اس کی سانس کو جکڑ لیا تھا۔اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔وہ گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔دونوں گھوڑوں کا تقریباً یہی حال تھا۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔دونوں کا مکمل جائزہ لینے کے بعد وہ کھڑی ہوئی۔غاذان اندر نہیں آیا تھا۔وہ اصطبل کے باہر ہی فون پہ بات کر رہا تھا۔اس کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

''کاکا! ہسپتال لے کے جانا ہوگا۔مجھے ان کی حالت ٹھیک نہیں لگتی۔'' وہ کہتے کہتے بھاگتی ہوئی باہر آئی۔غاذان دروازے کے پاس ہی موجود تھا۔''غاذان.....'' اس نے تیزی سے پکارا۔وہ پلٹ کے اسے دیکھنے لگا۔''ہمیں گھوڑوں کو ہسپتال لے کے جانا ہوگا۔ان کی حالت بہت خراب ہے۔''

غاذان کے چہرے پر ایک رنگ سا گزر گیا۔

''پلیز جلدی کریں۔گاڑی منگوائیں۔میں طارق سر کو فون کرتی ہوں۔ان کے کچھ دوست ہیں پشاور میں۔ان کا بڑا ہسپتال ہے۔ہم انہیں وہاں لے جاتے ہیں لیکن پلیز آپ فوراً گاڑی نکلوائیں۔'' اس نے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے فون ٹٹولا اور جب اسے احساس ہوا کہ فون تو وہ حویلی ہی چھوڑ کے آ گئی تھی۔

شٹ!

''فون دیں اپنا۔میں کال کرتی ہوں۔'' اس نے فی الفور غاذان سے فون مانگا۔غاذان گومگو کھڑا اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''غاذان! مجھے فون دیں۔'' اب کی بار وہ ذرا جھڑک کے بولی۔

''ہم گھوڑوں کو ہسپتال لے کے نہیں جا سکتے عبادہ۔خان جی نے اس کی اجازت نہیں دی۔'' وہ

دھیرے سے بولا۔

''وہاٹ.....'' عبادہ بری طرح چکرا گئی تھی۔ ''کیوں؟''

''ہمیں گھوڑوں کو اصطبل سے نکالنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ یہیں رہیں گے۔ ان کا علاج یہیں ہوگا۔ یہ یہاں سے نہیں جا سکتے اور ان دنوں تو بالکل بھی نہیں۔ اس لیے آپ سے جتنا ہو سکے، کرلیں، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔'' کہیں سے بادل زور کے گرجے تھے۔ بجلی تیزی سے چمکی تھی۔ سارا پانی عبادہ کے اوپر آن گرا تھا۔

''لیکن کیوں؟''

''کیوں کہ معاملہ چھ گھوڑوں کا نہیں ہے۔ ہماری عزت اور ہمارے نام کا ہے۔'' وہ چبا چبا کے بولا۔

''کیسی عزت؟ بیمار گھوڑوں سے کونسی عزت جڑی ہے؟'' وہ مٹھیاں بھینچ کے بولی۔ بجلی کی تیز روشنی اس کا چہرہ چمکا رہی تھی۔

''یہ خلاص شندور کے گھوڑے ہیں۔ ان سے کھلاڑی پولو کھیلتے ہیں۔ اس کا علم آپ کو، مجھے، ابتہاج، ملازمین اور حویلی کی چند عورتوں کو پتہ ہے۔ بی جان بھی لاعلم ہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ اگر یہ خبر پھیل گئی کہ ہمارے اصطبل کے گھوڑے مر گئے ہیں تو سارے چترال میں ہم پہ تھو تھو ہوگی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ لوگ کہیں گے بیمار گھوڑوں کو چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ سو باتیں ہوں گی۔ سو قصے بنیں گے۔ اس لیے اگر آپ کچھ کر سکتی ہیں تو کریں نہیں تو خدا کے لیے (اس نے ہاتھ جوڑے، اس کا فون رومنگ پہ تھا) ہسپتال کی رٹ نہ لگائیں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ اصطبل کی کھڑکیاں ٹھاہ ٹھاہ دیواروں سے لگیں۔ آسمانی بجلی کے وحشت ناک فلیش اندر گرے۔

''وہ مر جائیں گے۔'' اس نے یاسیت سے کہا۔

''پھر مر جائیں۔'' غاذان سفاکیت سے بولا۔

عبادہ نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں دکھ تو تھا لیکن بے بسی بھی تھی۔ جہاں تکلیف تو تھی لیکن مجبوری بھی تھی۔ عبادہ کو اپنے ہاتھ بری طرح ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے ملے۔

''میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ میرے پاس مشینیں نہیں ہیں۔ میں ٹیسٹ کہاں سے کروں گی؟ میں دوائیاں کہاں سے دوں گی؟ میں صرف معائنہ کر سکتی ہوں اور وہ بھی ان آلات سے جو اس وقت میرے پاس موجود ہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ خدارا میرے ہاتھ کاٹ کے مجھے لڑنے کا نہ کہیں۔ مجھے کچھ تو ہتھیار دیں۔'' وہ رو دینے کو تھی۔ غاذان آگے آیا اور گہری سانس لی۔

''مہمان آ گئے ہیں عبادہ۔ وہ مہمان ہی نہیں ہیں۔ شندور میں ہماری مخالف ٹیم بھی ہے۔ یہ اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ ہمارے گھوڑوں کو کوئی بیماری ہے اور وہ مر رہے ہیں تو وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلیں گے بلکہ اس مقابلے کو بھی منسوخ کر کے یہاں سے چلے جائیں گے۔ نہ شندور ہو گا اور نہ ہی میلہ اور جتنے بھی سیاح دور دراز سے آئے ہیں جن میں انٹرنیشنل سیاح بھی ہیں۔ وہ سب مایوس ہو کر لوٹ جائیں گے اور یہ سب ہماری شرمندگی کا باعث بنے گا۔ ہمارا قبیلہ شرم سے زمین میں گڑ جائے گا۔ سالوں تک لوگ ہمارے بارے میں باتیں کریں گے۔ ہم پہ ہنسیں گے اور اس شاندار موقع کی منسوخی کی وجہ ہمیں بنا کے ہم پہ تھوکیں گے۔ تم شہری لڑکی ہو۔ میں بھی لندن سے پڑھا ہوں۔ میں جانتا ہوں ہمارے لیے یہ چیز بہت جاہلانہ ہے کہ ہم کسی کی موت پہ اپنی عزتوں کو ترجیح دیں لیکن تم اور میں، ہم دو ہو کے اس شہر، اس علاقے کے لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔ فی الحال ہمیں ان کے ساتھ چلنا ہے۔''

وہ آہستہ آہستہ رسان سے کہہ رہا تھا۔

بارش برسنے لگی تھی۔ قطرہ قطرہ۔ وہ باہر کھڑے تھے۔ تیز ہوا نے عبادہ کا جسم منجمد کر دیا تھا لیکن

وہ ہنوز کھڑی رہی۔ اندر سے گھوڑے اسی طرح محوِ فغاں تھے۔

وہ جانتی تھی گھوڑے اس نہج پر ہیں کہ جہاں ہسپتال اور بروقت امداد سے ان کی جان بچائی جا سکتی ہے اس کے چیک اپ سے نہیں۔ ان کے جسم حرکت میں آ گئے تھے وہ ایسے تڑپ رہے تھے جیسے ہجر کا عالم ہو۔ ان کی سانس ہچکیوں اور ان کی روح سسکیوں میں بدل رہی تھی۔ پیروں سے جان جا چکی تھی، اب سینہ اور گردن رہ گئے تھے۔ وہ بے بسی سے کبھی گھوڑوں کے سر پکڑتی، کبھی پیر، کبھی پیٹھ سہلاتی، کبھی منہ کھولتی۔ اس کے اعصاب جھنجھنا رہے تھے۔

''غاذان پلیز۔'' وہ رونے لگی۔ غاذان نے رخ موڑ لیا۔

وہ سب گول دائرے میں ایک زندگی کو موت کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ زندگی جس کے لیے جاندار ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ وہ تکلیف جوان کے رگ و پے میں تھی، وہ اب اس راستے ختم ہو رہی تھی۔ وہ سانس سے جان اور جان سے موت تک سفر کر رہے تھے۔ ان کے دل آخری بار دھڑک رہے تھے۔ جسم آخری بار گرم ہو رہا تھا۔

اگر بابا ہوتے تو کہتے۔ ''عبادہ۔ مرنے سے پہلے انسان ہمیشہ ''جی اٹھتا'' ہے۔ ہمیں جب لگتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے، تب وہ دنیا چھوڑ جاتا ہے۔ دنیا سے جانا مشکل نہیں ہے دنیا سے موت کا دروازہ پار کرنا مشکل ہے۔''

اس کے گھوڑے جو ایک ماہ سے بے جان اور بے سدھ پڑے تھے۔ موت کے وقت ان کی ٹانگوں میں جان آ گئی تھی۔ وہ ہلنے لگے تھے۔ دروازے کی چوکھٹ سے لگی من من آنسو آنکھوں میں لیے عبادہ سلیم اپنی زندگی کے بارہویں گھوڑے کو دنیا سے جاتا دیکھ رہی تھی۔

ہم نے آج تک کسی ڈاکٹر سے نہیں پوچھا کہ اس کے سامنے کتنے انسان دنیا سے گئے ہوں گے؟ مشین کی ''ٹوں ٹوں'' ان کے کانوں میں کتنی دفعہ پڑی ہوگی۔ کتنے انسانوں کی آخری

ہچکی ''ہک'' کی آواز ان کے گوش گزری ہوگی؟ وہ شاید ہی بتا سکیں لیکن کتنے جانوروں نے اس کے سامنے، اس کی بانہوں میں اس کے سینے میں جان دی تھی۔ اسے انگلیوں کے پوروں پہ یاد تھا۔

پانچ منٹ کے وقفے سے دونوں گھوڑے مر چکے تھے۔ وہ گھوڑے پر ہاتھ رکھے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا لیکن تکلیف کے پہلے مرحلے پر صبر اور دوسرے مرحلے پر ''یقین'' کھڑا تھا۔ وہ لاچار نہیں تھی۔ وہ بے بس تھی۔ وہ اپنے سدھ بدھ سے گھوڑوں کی حالت بتا سکتی تھی۔ کچھ ٹوٹکے آزما سکتی تھی لیکن علاج..... وہ علاج نہیں کر سکتی تھی۔ علاج کی سہولیات اس کے پاس ہسپتال میں ہی دستیاب تھیں اور ہسپتال وہ جا نہیں سکتے تھے۔

(عرصہ قبل رمضان میں عبادہ کو کسی کی فوتگی پہ جانا ہوا۔ ٹریفک میں پھنسنے کی وجہ سے سب کو افطار گاڑیوں میں کرنا پڑی جب کہ وہ گاڑی سے باہر آ گئے تھے۔ وہ رو رہی تھی کیوں کہ میت اس کی کلاس میٹ کی تھی۔ ابا نے افطار کے کی کھجور اس کی طرف بڑھائی لیکن اس نے روزہ نہیں کھولا حالاں کہ رو رو کے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

اسے ''نمی'' کی ضرورت تھی لیکن اس نے ایک گھونٹ بھی نیچے نہیں اتارا۔ اس وقت اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔ اسے روتا دیکھ ایک خاتون گاڑی سے اتری اور اس کے پاس آئی۔ خاتون نے اس کے رونے کی وجہ پوچھی۔ ابا نے بتایا۔ خاتون افسردہ ہو گئی اور اس کے پاس فٹ پاتھ پہ بیٹھ گئی۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ سڑک کنارے لگے لائٹس روشن تھیں۔ گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

''تم جانتی ہو بچے۔ یہ جو گئی ہے تمہاری دوست ہے۔ چھ سال پہلے جو مجھ سے بچھڑی تھی وہ میری پریگننٹ بیٹی تھی۔ میں اس وقت مکہ میں تھا۔ میں عمرے کے لیے گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ غلاف کعبہ کو پکڑ کے اللہ سے اس کی جان بخشی کی دعا کروں گی لیکن میں جس شام ہوٹل واپس

آئی۔ مجھے کال موصول ہوئی کہ میری بیٹی چلی گئی ہے۔ میں تڑپ کے رہ گئی۔ میں نے ہوٹل کی کھڑکی سے نظر آتے حرم کو دیکھا اور میرا دل کانپنے لگا۔ میں وجود پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مجھے شدید گلہ ہوا تھا۔ تب میں پاگلوں کی طرح حرم گئی۔ غازمین کے درمیان بھاگ رہی تھی۔ ننگے پیر، اڑتی چادر اور آس پاس سے بے پرواہ ہو کے۔ کعبے کے سامنے پہنچی تو فرش پہ گر گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ دہائیاں نہیں دیں، ایڑیاں نہیں رگڑیں، ماتم نہیں کیا۔ اس کے در پہ پڑ کے روتی رہی۔ روتی رہی۔ یہاں تک کہ دل ہلکا ہو گیا۔ تم بھی رو۔ رونا اچھی بات ہوتی۔ ہم میت پہ صبر کر سکتے ہیں لیکن رونے میں کیا حرج ہے؟ رونا اچھا ہے لیکن یہ سمجھنا کہ صرف میں ہی اس آزمائش میں گھر گئی ہوں۔ ایسا کہنا بری بات ہے۔ میں جب رو رہی تھی تب ایک امام میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دینے کے لیے اپنی کہانی سنائی تھی۔ ان کے تین بچے اور بیوی کا ایک کار حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ ان کی وفات کے ایک گھنٹے بعد ظہر کی نماز کا وقت تھا اور انہوں نے میتیں چھوڑ کے اذان دی تھی۔ تب انہوں نے مجھے ایک بات بتائی تھی۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔

''غم ٹھکانہ دیکھ کے نہیں آتا اور نہ ہی انسان دیکھتا ہے۔ یہ صبر اور برداشت دیکھ کے آتا ہے۔ اس لیے اللہ نے انسان کی بات نہیں کی۔ اس کی طاقت کی بات کی ہے کہ آزمائش انسان پہ اس کی طاقت دیکھتے ہوئے آتی ہے۔ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ دے کے نہیں آزماتا۔ اس لیے تم پہ یہ جو گھڑی ہے۔ تم اس کو برداشت کر سکتی ہو، اس لیے آئی ہے۔ اس کو سہہ جاؤ، صبر کرو اور اس صلے کا انتظار کرو جو اس کے بدلے ملے گا۔ میں تمہیں بھی یہی کہوں گی۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''عبادہ''۔ ابا نے بتایا تھا۔

''عبادہ۔ یوں سمجھو کہ یہ جو گھڑی آئی ہے صرف تم پہ نہیں ہے۔ اس ٹریفک میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے پیاروں کی میت کو دیکھنے جا رہے ہوں گے۔ غم ہر گھر میں ہوتا ہے۔ ہر انسان کا

ہوتا ہے۔ یہ انفرادی نہیں ہوتا، اجتماعی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی حاملہ بیٹی کو اس کی سات ماہ کے بچے کے ساتھ دفنایا ہے۔ میرا نہیں ہوتا۔ سب کا ہوتا ہے۔ اس لیے حوصلہ بڑا کرو اور صبر کرو۔")

☆.....☆.....☆

غاذان نے اکنامکس پڑھی تھی۔ ایگری کلچر اکنامس۔ اسے کھیتی کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بریڈنگ کے بارے میں بھی پڑھایا گیا تھا۔ اس نے گھوڑوں کی حالت دیکھی تو اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ نہیں بچنے والے۔ اس نے پیشگی ہی گھوڑوں کے لیے چھ قبریں کھدوا رکھی تھیں۔ چوں کہ شندور قریب آرہا تھا اس لیے وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ان دنوں چترال میں بہت رش ہو جاتا تھا۔ صحت افزاء مقام ہونے کی وجہ سے لوگ جون اور جولائی میں ہی یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ان دنوں یہاں کے مقامی لوگ گائیڈ بن کے سیاحوں کو گھماتے تھے۔ ایسے میں گاؤں کا ہر راستہ جاسوسوں سے بھرا ہوا ملتا۔ یہ معاملہ پچھلے ایک ماہ سے حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا تھا اور حویلی کی چند ایک خواتین اور مردوں کو اس کے بارے میں علم تھا اور جن کو علم تھا ان کو خاص تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ ایک لفظ بھی اگر ان کے منہ سے نکلا تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

اس لیے یہاں کے سب ہی لوگ خاموش تھے۔

گھوڑوں کے لیے بارہ بارہ فٹ گور مقامی آبادی سے دور ایک ویران اور بے آباد علاقے میں بنائے گئے تھے۔ یہ جگہ آدھا جنگل، آدھی چٹانوں اور کھردری کھائیوں پر مشتمل تھی۔ یہاں وقفے وقفے سے کھدائیاں ہوئی تھیں جن کے اوپر گھاس پھوس اور لکڑیاں ڈال کے مقامی آبادی سے چھپایا گیا تھا۔ ان کھدائیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ شاید یوسف خان یہاں کچھ بنوانے والا ہے۔ یہاں گھوڑے مدفن کیے جائیں گے، اس کی بھنک کسی کو نہیں تھی۔

وہ کھائیوں کے کنارے ڈھیر بنی مٹی پر کھڑے تھے۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ موسلا دھار۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں چمکتیں تو کہیں کہیں روشنی ہو جاتی پھر سارا جہاں اندھیرے میں نہا لیتا۔ ملازم رسیاں ڈال ڈال کے گھوڑوں کو کھائیوں کی جانب کھینچ رہے تھے۔ گھوڑوں کے جسم اکڑ گئے تھے۔ غاذان پلکیں جھپکے بغیر اس تاوان کو دیکھ رہا تھا جو جذباتی، نفسیاتی اور معاشی طور پر اسے ملا تھا۔ یہ گھوڑے تایا جان نے بہت چاؤ سے پالے تھے۔ ان کو خون میں پسینہ ڈال کے، انداز میں محبت پال کے بڑا کیا تھا۔ ان کا جو یارانہ تایا جان سے تھا، کسی اور سے نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے بیمار ہونے کے بعد ان کو دیکھنے اصطبل نہیں آئے تھے صرف اس لیے کہ ان میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کو اس طرح تڑپتا ہوا دیکھ سکیں۔

ابتہاج دونوں کے سامنے کھڑا تھا۔ کھائی کے دوسری سمت، اس نے چھتری نہیں تھام رکھی تھی۔ وہ اسی طرح بھیگ رہا تھا البتہ اس کی پتھریلی آنکھیں عبادہ کو چبھتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ تھا اس کی نظروں میں جسے دیکھ کے عبادہ کو پھر خطرے کی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''ہم انسان کے قتل کو صرف قتل سمجھتے ہیں غاذان..... ہمیں لگتا ہے کہ چیونٹی کو مار دینا، پرندوں کو مار دینا اور یہاں تک کہ بلی اور کتے جیسے جانور کو بھی بے رحمی سے قتل کر دینا ہمارے مفاد کے لیے ہوتا ہے۔ وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اس لیے ہم ان کو مار دیتے ہیں لیکن جانتے ہیں غاذان.....'' اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔ وہ کھائی میں اترنے والے گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔

چھتری اس نے بائیں ہاتھ سے پکڑی ہوئی تھی۔ چھتری کے گول کناروں سے پانی کے قطرے نیچے مٹی میں ٹپک رہے تھے۔ اس کے پیر مٹی سے اٹ گئے تھے۔

''ایک انسان دوسرے انسان کو جتنا نقصان پہنچاتا ہے کوئی نہیں پہنچا سکتا اور اگر یہی بات ہے تو

ہمیں ہر اس انسان کو مار دینا چاہیے جس نے ہمارا دل دکھایا ہو، ہمیں تھپڑ مارا ہو کیوں کہ ایک طرح سے وہ ہمارے لیے ٹاسک ہو جاتے ہیں لیکن ہم انہیں موقع دیتے ہیں۔ سدھرنے کا۔ ٹھیک ہونے کا۔ ہم جانوروں کو نہیں دیتے۔ ہمیں لگتا کہ وہ کبھی نہیں سیکھ سکتے، ہمیں انہیں سکھانا نہیں ہے، ہمیں انہیں سمجھانا بھی نہیں ہے۔ ہمیں انہیں ''موت'' کے علاوہ دوسرے طریقوں سے روکنا ہے۔ انہیں قید کر لینا چاہیے۔ ان کے دانتوں میں کچھ پہنا دینا چاہیے۔ ان کے منہ کو بند کرنا چاہیے۔''

ایک گھوڑے کو قبر میں اتار دیا گیا تھا۔ ملازم جنہوں نے ہاتھوں میں محض لالٹینیں پکڑی ہوئی تھیں، اب بیلچوں کی مدد سے اس پر مٹی ڈال رہے تھے۔ وہ مدفن ہو رہا تھا۔

''جب ہم انسان کسی جانور کو تنگ کرتے ہیں تو بدلے میں وہ اس ہتھیار کو استعمال کرتا ہے جو اسے اللہ نے لڑنے کے لیے دیا ہے۔ چاہے وہ مقابلہ کر سکتا ہو یا نہیں لیکن اپنی زندگی کی بقا کے لیے وہ اپنی آخری سانس تک لڑتا ہے۔ میں نے چیونٹی کو بھی اپنے لیے لڑتے دیکھا ہے۔ میں نے باز جیسے پرندے کو بھی ہارتے دیکھا ہے۔ میں ویٹ ہوں ناں۔ میرے پاس شیر جیسے خونخوار جانور بھی آئے ہیں۔ اپنی لاغری میں۔ اللہ ہر شے کو اس کی طاقت کا عروج بھی دکھاتا ہے اور اس کا زوال بھی۔ وہ کسی کو خالی نہیں چھوڑتا۔ اسے آسمان پہ پہنچا کے بھی آزماتا ہے اور زمین پر بھی اسے پٹخ کے بھی اس کا امتحان لیتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اس لیے ہمیں کسی بھی زندگی کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہر زندگی اپنی جگہ قیمتی ہوتی ہے۔ ان گھوڑوں کی موت پہ کوئی نہیں رو رہا سوائے مہابت خان کے..... اور ہم اپنے قربانی کے جانور کے لیے بھی تین دن تک ماتم کرتے تھے۔ دنیا سفاک ہو گئی ہے غاذان۔ اب کسی کو کسی کے جانے سے فرق نہیں پڑتا۔''

وہ زکام زدہ آواز میں بولی۔ اس کے آنسوؤں نے اس کا گلا رندھ ڈالا تھا۔

رات کی سیاہی..... گھنا جنگل..... جلتے لالٹین..... وہاں وہ فسوں تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

غاذان نے اپنی چادر دے دی تھی جسے اس نے شانوں پہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ خود انہی کپڑوں میں تھا۔ اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی یا شاید اس کا جسم بھی سو چکا تھا۔ گھوڑوں کی طرح۔ دو گھوڑے اس دنیا سے چلے گئے تھے۔ ان کے مہمانوں کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ رات ان کو دفنا بھی دیا گیا تھا۔ کوئی بھی نہیں جان پائے گا۔ صرف انہی چند لوگوں کو معلوم ہوگا۔

ابتہاج..... غاذان..... مہابت خان..... چھ سات ملازم..... اور وہ..... ہاں لڑکیوں میں صرف وہ.....

گھوڑوں کا جسم اب خاک تلے تھا۔ اس خاک تلے جہاں ان کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ جہاں ان کو کسی قسم کا درد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ہر درد سے نجات پا چکے تھے۔

غاذان اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے حویلی واپس لے آیا تھا۔ پو پھٹ چکی تھی۔ نیلگوں روشنی نے ہر چیز کو احاطے میں لے لیا تھا۔ بارش اسی طرح برس رہی تھی، موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ حویلی کی پارکنگ میں گاڑی روک کے غاذان نے گہری سانس لی اور پھر اس کی طرف پلٹا۔ وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ شیشے پہ دھند جم گئی تھی اور قطرے پھسل کے نیچے جا رہے تھے۔

"آپ گھوڑوں کی موت کا ذکر کسی سے نہیں کریں گی۔ گھر کی خواتین سے بھی نہیں اور....." وہ لمحے بھر کو ٹھہرا پھر جو بولا تو آواز مدھم تھی۔ "گل کو بھی نہیں۔"

"ہوں۔" اس نے کمزور سا ہنکارہ بھرا۔

دکھ اس کے روئیں روئیں میں دوڑ رہا تھا۔ ساری رات وہ خود کو تسلی دیتی رہی کہ اس سب میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ نہیں بچا سکی تو کوئی بات نہیں۔ اللہ نے دیکھا، اس نے پوری کوشش کی تھی۔ اس نے جتنا ہو سکا، کیا۔ اب اگر اس کو ہسپتال جانے سے روکا گیا تھا تو کیا کیا جا سکتا تھا۔ آمد و رفت کی سہولت اس کی ذات کے پاس نہیں تھی۔ وہ گاڑی سے اتری، چھتری اس کے ہاتھ میں تھی

لیکن اس نے نہیں کھولی۔ اسے یوں ہی پکڑے وہ چلتی رہی۔ زنان خانے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بھیگ چکی تھی۔ اس کے بال موٹی لٹوں کی صورت میں چہرے سے چپک گئے تھے۔

دروازہ گل نے کھولا تھا۔ وہ اسی حلیے میں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے بعد وہ سوئی نہ ہو اور بے چینی میں ساری رات یہیں کاٹتی رہی ہو۔ دروازہ کھول کے وہ اس کی طرف بے قراری سے لپکی تھی۔

''عبادہ.....'' اس کا مردہ بازو پکڑ کے اس نے ہلکا سا جھنجھوڑا۔ ''کیا ہوا۔ گھوڑے ٹھیک ہیں؟ کیا ہوا تھا ان کو۔ تم نے چیک کیا؟ اب کیسے ہیں؟'' سوال اور متواتر سوال۔ عبادہ نے کمزور سی نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اضطراب سے لب کاٹ رہی تھی۔

''گل سے تو بالکل بھی ذکر مت کرنا۔'' اسے یاد آیا۔ وہ جبراً مسکرائی۔ (اس کے جبڑے میں درد ہوا تھا۔)

''وہ ٹھیک ہیں گل۔ بس ٹھنڈ لگ گئی تھی۔'' اس نے کمال مہارت سے جھوٹ بولا۔

''اوہ.....''

''میں گئی تو بہت تکلیف میں تھے۔ کراہ رہے تھے۔ ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ اللہ نے ان کو اچھا کر لیا۔ ان کو ان کی تکلیف سے آزاد کر دیا۔'' وہ خالی خالی قدموں سے آگے چلتے ہوئی بولی۔ چھتری اس نے دروازے سے لگالی تھی۔

''مجھے پتہ ہے۔ یہ مرد ہیں۔ ان کو نہیں پتہ جانوروں کا خیال کیسے رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی تین گھوڑے مر چکے ہیں۔ ان کی بار بھی ان سے غلطی ہوئی تھی۔ ہر بار ان سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے اور پھر اس کا بھگتان ہمیں اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ ہیں ایسے۔ میں نے خان جی کو بارہا کہا کہ کسی عورت کو بھی اصطبل کی ذمہ داری دے دیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ عورت اچھا کام کرتی ہے۔''

''ہاں لیکن میں نے نہیں کیا۔'' وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''میں پھر بات کروں گی.....اس طرح کیسے چلے گا؟ گھوڑے ہیں۔کوئی بے جان چیز تھوڑے ہی۔'' وہ پچکار کے کہنے لگی۔''تم بھی میرے ساتھ رہنا۔ہم دونوں بات کریں گے تو شاید مان جائیں.....'' کہتے کہتے وہ رکی۔اس کی نظر عبادہ کی چادر تک گئی۔اس کی سانس اٹک گئی۔وہ سرمئی رنگ کی چادر جانی پہچانی تھی۔اس کے دل کو کچھ ہوا۔

عبادہ کمرے میں آئی تو چادر اتار کے بیڈ پہ رکھی اور خود واش روم کی طرف بڑھ گئی۔دروازہ بند کر کے وہ فوراً بیسن پہ جھکی، کناروں پہ ہتھیلیاں جما کے اس نے کئی گہری گہری سانسیں لیں۔اس کے آنسو اندر جوہڑ بن گئے تھے۔گندے اور بدبودار۔جھکے جھکے ہی اس کی آنکھیں جھڑ گئیں۔ایک بارش باہر ہو رہی تھی اور ایک اندر۔اس کا بند بند جو پشیمانی میں گرفتار تھا۔اب اپنی اذیت کو باہر نکال رہا تھا۔وہ سر جھکائے رونے لگی۔بیسن کے کنارے اس کے آنسو قطرہ قطرہ گر رہے تھے۔

''تم جانوروں کو بچاتے ہوئے ہمیشہ خود کو نقصان پہنچا دیتی ہو عبو.....'' سلیم صاحب کی بات اس کے کانوں میں گونجی۔

''بابا! آپ اس کو نہ سمجھائیں۔اس نے گلی کے کتوں کے لیے بھی جان دے دینی ہے۔اللہ نے انسانیت اس کے اندر کچھ زیادہ ہی ڈال دی ہے۔'' احمد کہتا۔

''آپ لوگوں کو صرف جانور نظر آتے ہیں اور میں زندگی دیکھتی ہوں۔'' وہ شانے اچکا کے کہہ دیتی۔سلیم صاحب مسکرا دیتے۔کم از کم ان کی بیٹی باقیوں سے تھوڑی سی مختلف تھی۔وہ بھی بڑے ٹھاٹ سے دوسرے جانوروں کو گھر لے آتی تھی۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گھر چڑیا گھر بن جاتا۔اماں اکثر ان کی آوازوں سے چڑ جاتیں۔

''عبادہ کی بچی! تمہارے میمنے نے مجھے نماز نہیں پڑھنے دی۔اس کو خاموش کراؤ ورنہ میں اسی کی بریانی بنا کے تمہیں کھلا دوں گی۔'' وہ چھری ہاتھ میں لے کے کچھ اس انداز سے کہتیں کہ عبادہ فی

الفوراس کمرے میں بھاگ جاتی۔میمنے کے آگے ہاتھ جوڑ کے بیٹھ جاتی اوراس کی منت سماجت میں لگ جاتی۔میمنا اورشور کرتا اور پھر عبادہ اس کو ہسپتال لے جاتی۔اس کے ہسپتال میں کام کرنے والے سب ہی ڈاکٹرز کے گھر ایسے ہی جانوروں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔

وہ کئی ساعتوں تک روتی رہی یہاں تک کہ دل ہلکا ہوگیا اور وجود پرسکون۔اس نے نل کھول کے کئی چھپاکے چہرے پر مارے پھر وہیں الماری سے جوڑا نکالا اور بدل کے باہر آ گئی۔اب اس کا چہرہ تھوڑا کم سوجا ہوا لگ رہا تھا اور آنکھوں کا گلابی پن بھی کم تھا۔

آستین ٹھیک کرتے ہوئے اس نے واش روم کا دروازہ بند کیا۔گل بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھ کے اس چادر کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ غاذان نے دی تھی۔میں کچھ پہن کے نہیں گئی تھی۔سردی لگ رہی تھی۔سو۔'' میز سے پانی کا گلاس لیتے ہوئے جانے اس نے کیوں وضاحت دی۔

''جانتی ہوں۔'' گل کی ہلکی سی آواز آئی۔''اس کے کنارے پہ ''G'' لکھا ہے۔اس کی ہر چیز پہ لکھا ہے۔سو پہچان لی جاتی ہیں۔'' گل نے اٹھتے ہوئے چادر بیڈ کے اونچے کراؤن پہ پھیلا دی تاکہ سوکھ سکے۔

عبادہ کو اس کے انداز میں کچھ عجیب سا لگا۔کچھ دکھ، کچھ گلہ اور کچھ غصہ۔

''تم چائے پیوگی؟'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''اس وقت؟'' عبادہ ٹھٹکی۔''نہیں۔اس وقت نہیں۔میں سونا چاہتی ہوں۔'' وہ گلاس واپس رکھ کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔

''ٹھیک ہے۔'' گل سر ہلا کے باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر میں جا کے اس کی آنکھ کھلی۔ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔وہ پچھلے سات گھنٹے سے سو رہی تھی۔اٹھنے کے بعد وہ اصطبل کے لیے تیار ہوئی تھی۔مہابت خان کی طبیعت کل رات سے بہت خراب تھی اور ان دو گھوڑوں کو یکا یک کیا ہوا تھا،اس کی پریشانی بھی لاحق تھی۔اگر وہ گھوڑے یوں اچانک مر گئے تھے تو ممکن تھا کہ باقی چار کی جان کو بھی شدید خطرہ ہو۔کل رات افراتفری اور ہلچل میں وہ فرصت سے باقی چار گھوڑوں کا معائنہ نہیں کر سکی تھی۔صبح اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور پھر غاذان بھی جنگل سے اسے اصطبل لے جانے کی بجائے حویلی لے آیا تھا،وہ بھی پریشان تھی، اس لیے اسے بھی خیال نہیں آیا۔

ابھی اٹھتے ہی وہ سیدھا نیچے آئی تھی تاکہ اصطبل جا سکے۔

پارکنگ میں لڑکیوں اور لڑکوں کا ہجوم تھا جو گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ان میں غاذان بھی تھا۔آج اس نے بھی بلیک جینز پہ بلیک ہی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔شرٹ کی آستین کہنیوں تک فولڈ تھیں۔وہ ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے،دوسرے سے بار بار ہاتھ جھلاتے ہوئے ڈرائیورز کو آہستہ آہستہ سے تنبیہہ کر رہا تھا۔اسے دیکھ کے عبادہ کی دل کی دھڑکن مس ہو گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے اسے روشانے کی بات یاد آ گئی۔اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔

گارڈز اور ڈرائیورز کو ہدایات دے کر وہ پیچھے ہوا اور گاڑیوں سے دور کھڑا ہو گیا۔سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔اس نے ہاتھ سے پہلی کھڑی گاڑی کو جانے کا اشارہ کیا جس کے تعاقب میں دوسری گاڑیاں بھی چل پڑیں اور قافلے کی شکل میں پارکنگ سے باہر نکل گئیں۔کچھ دیر وہاں شور رہا پھر آسیبی سی خاموشی چھا گئی۔

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے غاذان دھیرے سے پلٹا،یکدم نظر اس پہ پڑی۔

"گڈ آفٹرنون۔" عبادہ نے آہستہ سے کہا۔

''گڈ آفٹرنون۔'' وہ تکان سے مسکرایا۔

عبادہ نے گاگلز کے پیچھے سے اس کو دیکھا اور اس نے بھی۔ دونوں کی آنکھوں میں عجیب سا سایہ تھا۔ غاذان سب سے چھپا رہا تھا کہ کل رات کونسی قیامت گزری ہے اور عبادہ اپنے گلٹ میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ دونوں نے آنکھوں پر گاگلز چڑھا رکھے تھے۔ جذبات چھپانے کا اچھا طریقہ تھا۔ خاموشی اور تکلف کا ایک بڑا وقفہ آیا جس میں دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ کونسی بات کی جائے پھر عبادہ نے حالات پہ لعنت بھیجی اور گلا کھنکارا۔

''آپ کے..... مہمان..... چلے گئے؟'' یہ سوال گفتگو کے لیے اچھا تھا۔

''ہوں۔'' اس کی بات پہ وہ چونکا۔ عبادہ نے اس کو گہری سوچ سے باہر نکالا تھا۔

''مہمان.....''

''ہاں۔ وہ۔ وہ ترچ میر کیمپنگ کے لیے گئے۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ عبادہ کو کچھ انہونی محسوس ہوئی۔ لہجے سے نہیں، انداز سے۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے اصطبل جانا ہے۔ آپ منیب خان کو بلا دیں تو.....''

''آپ جانا چاہتی ہیں وہاں؟'' غاذان نے غیر متوقع سوال کیا۔

''جی۔ کیوں کیا ہوا؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' غاذان فوراً اپنے ''حال'' میں واپس آیا تھا۔ اس نے بیشتر خود کو سنبھالا۔ ''میں آپ کو لے جاتا ہوں۔''

وہ راستہ چھوڑ کے ایک طرف ہو گیا۔ عبادہ نے اس کے سامنے سے ہی قدم آگے بڑھا دیے لیکن گاڑی کے پاس پہنچ کے جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، وہ تھم سی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں گومگو کھڑی رہی پھر اس نے دھیرے سے پلٹ کے غاذان کو دیکھا۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ افسردہ آواز میں بولی۔

غاذان چونکا۔ ''کس لیے؟''

''کل رات کے لیے..... میں نے پوری کوشش کی یونو..... مجھے، یقین جانیں جتنا آتا تھا۔ میں نے کیا۔ مگر میرے پاس سہولیات نہیں تھیں۔ میں ہرگز ہرگز بھی ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میرے بس سے باہر تھا۔'' وہ روہانسی ہو کے بتانے لگی۔

''عبادہ! ڈاکٹر موت کا گارڈ نہیں ہوتا۔ وہ، وہ شخص ہوتا ہے جسے عام انسان کے مقابلے میں بیماریوں کے بارے میں زیادہ علم ہوتا ہے۔ وہ کوئی خدا نہیں ہوتا۔ موت اور زندگی اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ صرف کوشش ہوتی ہے اور وہ آپ نے پوری کی تھی۔ سو ڈونٹ فیل گلٹ۔'' غاذان نے نرمی سے کہا۔

''لیکن میرا دل پھٹ رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''یوسف خان جی مجھ سے متنفر ہو گئے ہوں گے۔ میرے باس مجھ پہ غصہ ہوں گے۔ میرا ٹریک ریکارڈ اور.....''

''آپ ایک بہترین ڈاکٹر ہیں۔ میں نے آپ کا ٹریک ریکارڈ دیکھا تھا۔'' غاذان اس کی بات کاٹ کے نرمی سے کہنے لگا۔ ''پنجاب کلب کے ریس گھوڑے جو حادثے کا شکار ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو بالکل ٹھیک کر دیا تھا اور لسبیلہ میں جو گھوڑوں کے فارم میں آگ لگی تھی۔ وہاں بھی آپ گئی تھیں اپنی ٹیم کے ساتھ۔ آپ ایک اچھی اور بہترین ڈاکٹر ہیں۔ نو میٹر لوگ کیا سوچتے ہیں۔ میں نے تایا جان کو کہہ دیا ہے کہ آپ سارا معاملہ اچھے سے دیکھ لیں گی۔ آپ کو جلد بیماری سمجھ آ جائے گی۔ آپ فکر مت کریں، وہ متنفر نہیں ہوں گے۔''

''لیکن دکھی ہوں گے۔ ہے ناں؟'' وہ بے چینی سے لب کاٹ رہی تھی۔

''وہ تو ہیں۔'' غاذان نے گہری سانس لی پھر زبردستی مسکرایا۔ ''لیکن بڑا دکھ یہ ہے کہ وہ

مہمانوں کے سامنے اظہار بھی نہیں کر سکتے۔یونو۔(اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا) دھس۔ایکٹنگ۔"

عبادہ نے ایک تکلیف دل میں محسوس کی۔مگر افسوس سے نکل کے، منطقی اعتبار سے سوچنا تھا۔جو ہوگیا تھا، سو ہوگیا تھا۔اب ان کو بچانا تھا جو بچ گئے تھے۔ان کو زندگی کی طرف لوٹانا تھا۔اصطبل آتے ہوئے اس کا ذہن اس پلان کو ترتیب دے رہا تھا جو اس کے گمان میں پچھلے دو دن سے چل رہا تھا لیکن وہ یوسف خان سے بات کرنے کا انتظار کر رہی تھی۔

اصطبل پہنچنے کے بعد اس نے سیدھا مہابت خان کے پاس جانے کا سوچا۔وہ اسی طرح چلتے ہوئے اینٹوں کی روش تک آئی۔آج میدان خالی تھا۔لان میں کوئی نہیں تھا۔گھوڑے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔اس نے آنکھوں سے گاگلز اتار کے حیرت سے یہاں وہاں دیکھا۔سب کہاں چلے گئے تھے؟

وہ متحیر سی چلتی اصطبل کے اندر چلی گئی۔وہاں بچے ہوئے چار گھوڑے موجود تھے لیکن مہابت خان وہاں بھی نہیں تھا۔وہ چونک گئی۔اسی لے میں چلتی باہر آگئی۔دفعتاً اسے مدثر دکھائی دیا، جو بانہوں میں چارے کی ٹوکری اٹھائے گودام سے نکل رہا تھا۔اس نے آستین کہنیوں تک چڑھائی ہوئی تھیں۔بہت مصروف لگ رہا تھا۔

"مدثر....."اس نے آواز دی۔اس کے ٹوکری میں چارہ مکس کرتے ہاتھ تھم گئے، چونک کے اس نے سر اٹھایا۔عبادہ روش پہ کھڑی اسے بلا رہی تھی۔وہ ٹوکری ایک طرف رکھ کے اس کے پاس آیا۔

"جی مادام....."

"مہابت خان کا کہاں ہیں۔مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"

"وہ تو بہت بیمار ہے۔اندر کمرے میں ہے۔ڈرپ لگا ہے۔رات سے اس کا حالت ٹھیک نہیں

ہو رہا۔'' مدثر نے دکھ سے بتایا۔

''کس کمرے میں ہیں۔'' عبادہ یکدم ہی پریشان ہوگئی۔

''ادھر۔ وہاں۔'' ملازم نے سرونٹ کوارٹر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سرعت سے اس طرف بڑھ گئی۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا مگر مقفل نہیں تھا۔ وہ بجانے کی بجائے، سیدھا کھول کے اندر آ گئی۔ کوارٹر چھوٹا تھا، دروازے کے بالکل بائیں طرف سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں جو بالائی منزل تک جاتی تھیں۔ سامنے ایک دوسرا دروازہ تھا جس کے آگے وقفے وقفے سے دو کمرے بنے تھے۔

''کاکا.....'' اس نے بے قراری سے یہاں وہاں دیکھا۔ کوئی آواز نہیں آئی، وہ سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے سامنے والے دروازے سے اندر چلی گئی۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے چوکھٹ پہ ہاتھ رکھ کے اندر جھانکا۔

کمرہ مستطیل تھا جہاں فاصلے فاصلے سے دیواروں سے بیڈ جڑے ہوئے تھے۔ مشرقی دیوار کے ساتھ مہابت خان دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے کمبل گردن تک تان رکھا تھا اور ہاتھ کی آستین جو کہنی تک چڑھی ہوئی تھی، وہاں ڈرپ لگی تھی۔

وہ قدم قدم چل کے ان کے پاس آئی۔ اس کے چہرے پر افسردگی تھی۔

''کاکا.....'' پائنتی کے ساتھ نیچے بیٹھ کے اس نے تڑپ کے پکارا۔

مہابت نے آواز پہ کروٹ بدل کے اسے نقاہت سے دیکھا۔ وہ پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ اتنی کمزوری اور لاغری اس نے آج سے پہلے ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بہت مشکل سے اٹھے اور کہنیوں پر زور ڈالا۔ عبادہ نے فوراً تکیہ ان کی کمر کے نیچے سیٹ کر دیا اور انہیں ٹیک لگانے میں مدد دی۔ انہوں نے گہری سانس خارج کر کے ٹیک لگا دی۔ یوں لگ رہا تھا ان کی کمر چیخ رہی ہو۔

عبادہ اسی طرح ان کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی اور ہاتھ ان کے ماتھے پر رکھا۔ مہابت خان کا ماتھا بہت گرم تھا۔ آنکھیں رونے اور غم کی وجہ سے سرخ متورم تھیں۔

''کاکا! خود کو کیوں اتنی تکلیف دے رہے ہیں۔ کل رات سے رو رہے ہیں۔ اب پلیز بس کردیں۔'' اس نے منت کی۔

عبادہ کی بات سن کے ان کی آنکھیں مزید بھیگ گئیں۔

عبادہ کا دل ایسے جکڑا جیسے کسی نے دکھتی رگ پکڑ لی ہو۔ پل بھر میں وہ تمام وجوہات اس کے آنکھوں کے سامنے دھواں بن کے اٹھنے لگیں جن کی وجہ سے وہ ویٹ بنی تھی۔ کرسٹی، آسٹریلین کرسٹی، اس کا سفید فر، نرم جسم اور نیلی آنکھیں اس کے سامنے گھوم گھوم گئیں۔ اسے لگا وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ ماضی میں چلی گئی ہے۔ وہ سلیم صاحب کے گلے لگی ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کرسٹی کا مردہ وجود تھا۔ ٹھنڈا۔ بے جان۔ وہ دھاڑیں مار رہی ہے۔

اس کی اولاد بھی قتل ہوگئی تھی۔ اس کا بچہ بھی جان سے گیا تھا۔ وہ بھی اسی طرح تڑپی تھی۔ تب سلیم صاحب بھی اسے یہی لفظی حوصلہ دیتے تھے۔ یہی بتاتے تھے کہ بس کردے لیکن اس نے بس نہیں کی، وہ روتی رہی یہاں تک کہ دل میں صبر اتر گیا اور دماغ کو یقین آ گیا کہ ہم اللہ کی مشیت کے آگے بے بس ہیں۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔ یہ نقصان میں کبھی پورا نہیں کرسکتی کاکا۔ یہ دکھ ہم سب کا ہے لیکن ہمیں حوصلہ کرنا ہے۔ وہ جا چکے ہیں لیکن چارا ابھی زندہ ہیں۔ ان کو آپ کی ضرورت ہے۔ آج کی فیڈنگ کے لیے وہ صبح سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ اٹھ جائیں۔ ٹھیک ہو جائیں۔ آپ کے اصطبل کو آپ کی ضرورت ہے۔'' وہ حوصلہ بندھا رہی تھی لیکن مہابت خان خالی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ ان کو دیکھ کے کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ اپنی پہلی والی حالت میں لوٹ جائیں گے۔

''ڈاکٹرنی.....'' دروازے میں کسی کی آواز ابھری۔اس نے بیٹھے بیٹھے گردن پیچھے گھمائی۔ وہاں ابتہاج کھڑا تھا۔سیاہ شلوار قمیص پہ سرمئی شال اوڑھے،اس کو ٹھنڈی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''باہر آؤ۔بات کرنی ہے۔''اس کا لہجہ سرد تھا۔وہ الجھی الجھی سی کھڑی ہوگئی۔اسے کچھ انہونی محسوس ہونے لگی تھی.....خیر.....وہ دبے قدموں چلتی باہر آ گئی۔ابتہاج لان میں ایک طرف کھڑا تھا۔سورج اس کے سر تھا اور تیز دھوپ چاروں طرف گر رہی تھی۔

''کہیے کیا بات ہے؟''وہ اس کے سامنے رک گئی۔ابتہاج نے ایک نظر اسے دیکھا پھر مسکرایا۔

''تمہارے لیے خان جی کا ایک پیغام آیا ہے۔''

''کیا؟''اسے تجسس ہوا۔

''وہ چاہتے ہیں اب تم یہاں سے چلی جاؤ۔تم نے جتنا علاج کرنا تھا کر لیا۔انہوں نے تمہارے ہسپتال سے بات کر لی ہے۔وہ تمہیں واپس کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ تم یہاں علاج کے قابل نہیں ہو۔تمہیں مزید سیکھنے کی ضرورت ہے۔''وہ جتنے سرد لہجے میں بولا تھا عبادہ کے تلوؤں میں لگ کے سر میں بجھی تھی۔

وہ بے یقینی سے آگے ہوئی۔''تم ہوش میں ہو؟تم کیا کہہ رہے ہو؟تم لوگ مجھے ایسے اچانک نہیں بھیج سکتے۔میں ابھی علاج کر رہی ہوں۔''

''جی.....آپ کے علاج کا.....مظاہرہ.....ہم رات کو دیکھ چکے ہیں۔آپ سے پہلے آنے والوں نے کم از کم یہ نہیں کیا تھا۔یہ پکڑیں ٹکٹس اور جائیں۔ہمیں بخش دیں۔''اس نے کاغذ عبادہ کی ہتھیلی پہ رکھے اور اپنی شال جھٹک کے وہاں سے چلا گیا۔

عبادہ کے پیروں تلے بارودی سرنگ پھٹ گئی۔اس نے دھواں دھواں چہرہ لے کے کاغذ کو دیکھا۔وہ واقعی اس کی واپسی کی ٹکٹس تھیں۔سارا جہاں اس کے گرد گھوم گیا۔

یہ کیا بات ہوئی؟ ایسے کیسے وہ یہاں سے جا سکتی تھی۔ اس کا کانٹریکٹ ہوا تھا۔ وہ ہسپتال کی طرف سے آئی تھی۔ کسی کلینک سے اٹھا کے نہیں لایا گیا تھا۔ کانٹریکٹ کے مطابق اس نے علاج کرنا تھا۔ علاج کے بعد اگر اسے لگا کہ وہ نہیں کر سکتی، اس صورت وہ واپس آئے گی۔ لیکن یہاں تو..... اس نے پلٹ کے اصطبل کو دیکھا۔ ابتہاج وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ یہ سب نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ یہاں کے گھوڑوں کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ علاج کرنے آئی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں سے لڑ کے آئی تھی۔ اس نے عزم باندھا تھا اب ایسے کمزوروں اور ڈرپوکوں کی طرح وہ کیسے ہار مان سکتی تھی؟

اس نے تھرتھراتے ہاتھوں سے فون پینٹ کی جیب سے نکالا اور غاذان کا نمبر ملایا۔

"السلام علیکم....." پانچویں گھنٹی پہ فون اٹھا لیا گیا۔

"یوسف خان نے مجھے واپس بھیجنے کا فیصلہ لیا ہے غاذان۔ تمہیں پتہ ہے۔" وہ چھوٹتے ہی بول پڑی۔ (سلام کا جواب ہی نظر انداز کر دیا۔) دوسری طرف ڈیرے میں موجود غاذان نے جو یوسف خان کے سامنے بیٹھا تھا گہری سانس لی۔

"جانتا ہوں۔"

وہ بری طرح چونک گئی۔ "تم جانتے ہو؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"کوشش کی تھی صبح....." وہ بڑبڑایا۔ عبادہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"کم آن! یہ کیسے کر سکتے ہیں وہ۔ کیا انہوں نے کانٹریکٹ نہیں پڑھا۔ میں لاہور سے ان کے پاس فی سبیل اللہ نہیں آئی۔ میں لڑکی۔ میں نے اتنا سفر اس کانٹریکٹ کی وجہ سے کیا تھا۔ وہاں میری سیکیورٹی اور میرے گولز درج تھے۔ میں ایسے نہیں جا سکتی۔ تم جانتے ہو۔"

"عبادہ.....ہم....."

''میری بات سنو غاذان، اپنے خان کو اپنی زبان میں کانٹریکٹ کا ترجمہ کر کے دو اور انہیں سمجھاؤ کہ میں نہیں جا سکتی۔ یہاں سے جانے کا فیصلہ اور کوٹ (Quit) کرنے کا آپشن میرے پاس ہے۔ وہ مجھے واپسی کا ٹکٹ پکڑا کے نہیں بھیج سکتے۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔

غاذان نے اپنے تاثرات چھپانے کی بارہا کوشش کی۔ وہ مجلس کے عین درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ یوسف خان کے ساتھ۔ اس کی دستار پوشی کی بارے میں وہاں بات کی جا رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی پہنچا تھا اور آتے ہی کالز۔ یوسف خان کو برا لگ رہا تھا۔

''عبادہ! میری بات سنیں۔ ہم اس بارے میں تحمل سے بات کرتے ہیں۔ ابھی وقت.....''

''وقت نہیں ہے؟'' وہ تیزی سے بولی۔ ''یاہ۔ رائٹ۔ آپ لوگوں کے پاس وقت نہیں۔ میں جو لاہور میں سارا ہسپتال اور اپنا خاندان چھوڑ کے پچھلے ایک ہفتے سے یہاں خوار ہو رہی ہوں۔ اس کے لیے تو میں بالکل فارغ ہوں۔ سمجھتے کیا ہیں آپ لوگ خود کو..... ہاں..... میری جاب کی کیا اہمیت ہے تم لوگوں کی نظر میں؟ ٹھیک سے میرا نام تو لے نہیں سکتے اور.....''

غاذان نے فون بند کر دیا۔

''ہیلو..... غاذان..... ہیلو.....'' اس نے سٹپٹا کے فون کی بجھی ہوئی اسکرین کو دیکھا۔ غاذان نے اس کی کال کاٹی تھی۔

''میرا فون کاٹ دیا؟ مجھے سمجھتے کیا ہیں یہ لوگ؟ کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔ ایک منٹ۔ ان کو تو ابھی پوچھتی ہوں۔''

اس نے اگلی فرصت میں طارق کا نمبر ملایا۔

دریائے چترال کے پانی کے غوطوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیز سورج میں چہچہاتے پرندوں اور دور کہیں سے ہنہناتے گھوڑوں کی آواز آ رہی تھی۔

''ہیلو مس سلیم.....کیسی ہیں؟'' طارق نے فون اٹھا کے حسبِ معمول پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا لیکن وہ برس پڑی۔

''سر! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا آپ نے ان سے پوچھ کے کانٹریکٹ نہیں بنایا تھا؟ انہوں نے مجھے واپسی کی ٹکٹ پکڑا دی ہے اور کہہ رہے ہیں وہ کسی اور ڈاکٹر کا بندوبست کر دیں گے۔ میں یہاں سے جاؤں۔ آپ ان کو بتائیں کہ جب تک معاہدہ ختم نہیں ہو جاتا اور میں ہار نہیں مان لیتی، میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔ مجھے علاج کرنا ہے۔ ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ مجھے آج گھوڑوں کے لیے کچھ اقدامات کرنے تھے۔ ان کو پشاور لے کے جانا تھا اور وہ کہہ رہے ہیں کہ.....''

''مس سلیم.....مس سلیم.....'' طارق نے جلدی جلدی کہا۔ ''ریلیکس۔ میری بات سنیں۔''

وہ ہانپنے لگی تھی۔ اسے غصہ آ رہا تھا اور رونا بھی۔

''یوسف خان نے مجھ سے بات کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ کل رات دو گھوڑوں کی موت ہو گئی ہے اور.....'' طارق کہتے کہتے رک گئے۔ عبادہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''اور.....''

''اور یہی کہ.....آپ.....آپ نے انہیں مرنے دیا ہے۔''

عبادہ کا مان چھناکے سے ٹوٹا۔ ''میں نے.....؟'' اسے اپنی سماعت پر گمان ہوا۔

''وہ آپ کے سامنے مر گئے اور آپ دیکھتی رہیں۔ آپ کو اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دینا چاہیے تھا مس سلیم۔ میں آپ کو فرض شناس اور قابل ڈاکٹر سمجھتا تھا۔ اس لیے آپ کو وہاں بھیجا لیکن آپ نے.....'' ان کا لہجہ افسوس میں بدلا۔ ''خیر۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آپ واپس آ جائیں۔ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کا بندوبست کر لیں گے۔ آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ حرکت سے ہسپتال کی ریپوٹیشن پہ سوال اٹھ رہے ہیں۔''

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں سب کو عزت اور غیرت کی پڑی ہے اور وہاں آپ کو؟ مجھے یہاں بھیجنے سے پہلے آپ دونوں پارٹیوں کو اپنی غیرتوں اور عزتوں کا کانٹریکٹ کرنا چاہیے تھا۔ یہاں بھیجنے کے بعد آپ لوگ مجھے درمیان میں پھنسا رہے ہیں۔ کل رات جو ہوا میری وجہ سے ہرگز نہیں ہوا۔ آپ تو مجھے جانتے ہیں ناں سر۔ میں کیوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھوں گی؟''

''دیکھیے مس سلیم ..... یوسف خان کا کہنا ہے کہ آپ کو مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو.....''

''سر! میری بات سنیں۔ مجھے سنیں۔'' وہ درشتی سے بولی۔ اس کا انگ انگ غصے سے بھر گیا تھا۔

''انہوں نے کل آدھی رات کو مجھے اٹھایا کہ گھوڑوں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ میں انہیں دیکھ کے آؤں۔ میں یہاں فارم آئی تو گھوڑے تکلیف سے مر رہے تھے۔ میرے پاس جتنے ٹولز تھے۔ جتنا تجربہ تھا میں نے اسے استعمال کیا لیکن گھوڑوں کی حالت بگڑی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں کہا ہمیں گھوڑوں کو ہسپتال لے جانا ہے۔ گاڑیاں نکالیں اور پشاور چلیں۔ آپ کے دوست کے ہسپتال۔'' وہ بغیر سانس لیے بولتی چلی جا رہی تھی۔ ''میں آپ کو فون کرنے والی تھی لیکن میں فون حویلی میں بھول گئی۔ میں نے ان سے فون مانگا۔ انہوں نے نہیں دیا اور کہا کہ وہ کسی بھی قیمت پر گھوڑوں کو اصطبل سے باہر نہیں نکالیں گے کیوں کہ ان کی عزت کو خطرہ ہے۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ سردار یوسف خان کے وہ گھوڑے مر رہے ہیں۔ اگر یہ بات اصطبل سے باہر چلی گئی اور سب کو معلوم ہو گیا تو ان کی عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اس لیے میں ایسی کوشش بھی نہ کروں۔ اگر جادو کی کوئی چھڑی ہے یا الہ دین کا چراغ ہے تو کوئی جن بھوت یا پریت بلا کے ان کے گھوڑوں ٹھیک کر دوں اور وہ میں ہوں نہیں۔'' وہ ہانپ کے رہ گئی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس سلیم؟'' طارق سر یکدم ہی چونک گئے تھے۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سر۔ یہ کسی کو علاج ہی نہیں کرنے دے رہے اور چاہتے ہیں کہ کوئی جادو سے گھوڑوں کو ٹھیک کردے۔ آپ خود سوچیں، ایک اکیلا ویٹ، جس کے پاس سامان نہیں ہے۔ مشینیں نہیں ہیں۔ دوائیاں نہیں ہیں۔ وہ کیسے علاج کرسکتا ہے؟ مجھے بتائیں، اس سب حالات میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟''

وہ بے بسی کی انتہا پر چلائی۔

''عبادہ.....عبادہ.....ریلیکس.....'' طارق مفاہمت سے کہتے کہتے رکے۔ ''مجھے تفصیل سے بتائیں، وہاں کیا ہوا؟''

وہ شروع ہوگئی۔ اول تا آخر یہاں جو کچھ جیسے جیسے ہوا۔ جس جس نے جو جو کیا۔ اس نے سب بتا ڈالا۔ کچھ دیر بعد اس کے اندر کا فرسٹریشن ختم ہو چکا تھا۔ وہ شانت ہوگئی تھی۔

''ہوں.....'' طارق کی آواز آئی۔ وہ سارا معاملہ سمجھ چکے تھے۔

''اب آپ بتائیں۔ میں جو سوچ رہی ہوں اس کی بات کروں یوسف خان سے یا پھر واپس آجاؤں؟''

طارق سر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرے خیال سے آپ کو سب چھوڑ چھاڑ کے واپس آجانا چاہیے۔''

''وہاٹ.....'' وہ سانس لینا بھول گئی۔

''اگر وہ ساری سہولیات نہیں دینا چاہتے جس کی ضرورت ایک ڈاکٹر کو ہوتی ہے تو آپ کو وقت پہ آجانا چاہیے۔ ہمارے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگا کے وہ ہمیں میدان جنگ میں نہیں اتار سکتے۔ اٹس بیٹر ٹو کم بیک (اچھا ہوگا کہ واپس آجائیں۔)''

''اور ان گھوڑوں کا کیا جو مر رہے ہیں۔ ان کو چھوڑ دوں؟'' اس کے کانوں سے دھواں اٹھا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟ بتائیں مجھے؟ آپ علاج کر سکتی ہیں؟ اگر وہاں یہ سب چل رہا ہے تو کیا آپ گھوڑے ٹھیک کر سکتی ہیں؟''

''ایٹ لیسٹ میں یوسف خان کو راضی کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہوں ناں۔''

''اور آپ کو لگتا ہے وہ ہو جائیں گے جب کہ وہ آپ کی واپسی کی ٹکٹ آپ کو دے چکے ہیں؟''

''میں کوشش کی بات کر رہی ہوں سر.....''

''مجھے بتائیں وہ مان جائیں گے؟'' انہوں نے خشک لہجے میں سوال دہرایا۔

عبادہ ٹھہر گئی۔ دریائے چترال امیدوں کے چھپاکوں کو لیے بہہ رہا تھا۔ ہوا کے دوش پہ اڑنے والے پرندوں کی پنکھوں میں آس تھی۔ سورج کی چمکتی کرنوں اور اندر لیٹے مہابت خان کی آنکھوں میں ایک کرن باقی تھی۔

اس نے گہری سانس خارج کی۔ ''میں پوری کوشش کروں گی۔''

''اور اگر نہ مانے تو؟'' یہ سوال مشکل تھا۔ اس کا جواب عبادہ کے پاس نہیں تھا۔ یہاں وہ گم صم تھی۔ اس نے نیچے اپنے پیروں کو دیکھا جو گھاس کو نوک سے رگڑ رہے تھے۔ ''بتائیں مس سلیم پھر.....؟''

اسے یکدم ہی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ یقیناً مدثر انہیں فیڈ کر رہا تھا اور اس درد سے وہ چلا رہے تھے۔ اس نے پلٹ کے اصطبل کو دیکھا۔

''آپ واپس آ جائیں گی۔ ٹھیک ہے؟ یہ میرا حکم ہے۔ میں کانٹریکٹ کینسل کر دوں گا۔ آپ آخری کوشش کر کے ان کو سمجھا لیں۔ وہ سمجھ گئے تو ٹھیک نہیں تو انہی ٹکٹس کے ساتھ واپس آ جایئے گا۔'' طارق کا لہجہ قطعی تھا۔

''گھوڑے مر جائیں گے سر.....'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''اس کا کیا حل ہوگا۔وہ میں سوچوں گا عبادہ۔آپ بے فکر رہیں۔میں ان کو ایسے نہیں چھوڑوں گا۔ان کے خلاف کچھ نہ کچھ ایکشن ضرور لوں گا۔ڈونٹ وری۔''

''میں علاج کرنا چاہتی ہوں۔میں بیماری معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے آپ ایسا کر سکتی ہیں لیکن اپنے اردگرد کو بھی دیکھیں مس سلیم۔اپنی جان کا خطرہ نہیں لینا آپ کو۔ٹھیک ہے۔حالات خراب ہو رہے ہیں تو واپس آجائیں۔میں نمٹ لوں گا ان سے۔'' وہ فکر مند تھے۔ان کی ٹیم کی لڑکی ایک انجان علاقے میں پھنس گئی تھی۔ان لوگوں کے درمیان جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔وہ سب بالکل اجنبی تھے۔

اس نے فون رکھ دیا۔وہ ابھی تک یوسف خان سے ملی نہیں تھا۔وہ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہوتے،کب ملتے ہیں،رہتے کہاں ہیں۔ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔لیکن ایک آخری کوشش وہ ضرور کرے گی۔بس ایک آخری بار۔

اس نے تہیہ کیا اور ملازم کوارٹر کے اندر آگئی۔مہابت خان اسی طرح لیٹے لیٹے چھت کو گھور رہے تھے۔ان کے چہرے پہ شدید ویرانی تھی۔وہ قدم قدم چلتی قریب آئی اور ان کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

''کاکا.....'' اس نے شکایت بھری سی آواز لگائی۔مہابت خان نے پژمردہ سی نظریں اٹھائیں۔

''کیا میں نے کل رات اپنی کوشش نہیں کی تھی؟ اپنی طرف سے؟ کیا میں نے گھوڑوں کو مر جانے دیا تھا؟ کیا میں واقعی سفاک ہوں؟'' جانے کیوں اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔

''نہیں بچے۔تم سفاک نہیں ہے۔یہ دنیا ظالم ہے۔ان کے لیے گھوڑا شوڑا کچھ نہیں ہوتا۔یہ تو تب آتا ہے جب سواری کا موڈ ہوتا ہے۔سوار ہوتا ہے۔گھوڑے کو سہلاتا ہے اور چلا جاتا ہے۔یہ

اولاد تو ہم جیسا کا ہوتا ہے۔ ہم ان کو کھلاتا ہے پلاتا ہے۔ ان کا بچوں کی طرح خیال رکھتا ہے۔ ہمیں ان کے جانے کا غم ہوتا ہے۔ یہ تو اور بھی لے آئے گا، کسی کا کیا جاتا ہے؟'' بات کڑوی تھی لیکن درست تھی۔

''مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے علاج کرنا نہیں آتا۔''

''تم کو آتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ تم کرسکتا ہے۔'' جانے کیوں مہابت خان نے تسلی دی۔

''پھر میں کیوں جارہی ہوں؟'' اس نے شکوہ کناں انداز میں پوچھا۔

''ان کو لگتا ہے رات گھوڑوں کو تم نے مارا۔ اب..... اس..... میں..... کیا..... منطق..... ہے..... اللہ..... جانے.....'' مہابت خان وقفے وقفے سے کہتے ہوئے کھانسنے لگا۔ اس کی جان بے دم تھی۔

عبادہ نے آنکھیں جھکا دیں۔ اب یہ کیا بات ہوئی بھلا؟

''میں یوسف خان سے ملنا چاہتی ہوں ابھی..... وہ کہاں ہوں گے.....'' کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''ابھی.....'' مہابت خان کو جھٹکا لگا۔

''جی ابھی..... میں زیادہ دیر نہیں کرسکتی۔ انہوں نے میری ٹکٹ کاٹ دی ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''ابھی خان جی ڈیرے میں ہوتے ہیں۔ تم کیسے ملے گا؟''

''کیوں؟ کیوں نہیں مل سکتی؟''

''ڈیرے میں عورت نہیں جاسکتا۔ سختی سے مانع ہے۔''

''لیکن میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھ پہ یہ اصول لاگو نہیں ہوتے۔''

''تم عورت تو ہے ناں.....''

''پھر بھی؟ میں مردوں کے درمیان اعتماد سے بات کر سکتی ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''مسئلہ تم کا نہیں ہے۔ ان کا ہے۔ ان کو اچھا نہیں لگے گا۔''

''پھر میں کیا کروں؟ وہ کب ڈیرے سے آئیں گے؟''

''وہ رات میں آتے ہیں اور رات کو بھی تم سے نہیں ملے گا۔ جب تک مہمان یہاں ہے۔ تم نہیں مل سکتا۔ خان جی بہت مصروف ہوتا ہے۔'' مہابت خان نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا لیکن وہ بددل نہیں ہوئی۔ وہ ایک عزم سے کھڑی ہوئی۔

''نہیں کاکا۔ میں انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے ابھی ملنا ہوگا۔ اسی وقت۔'' وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھی۔

وہ اور انتظار کیوں کرے؟ وہ ڈاکٹر تھی اور جب مریض سیریس ہوں تو ڈاکٹرز کی بھوک پیاس اڑ جاتی ہے کجا وہ لوگوں کے نخروں کے لیے وقت نکالیں۔ ان کا پہلا مقصد مریض ہوتا ہے۔ اس کے گھر والوں کی عزت یا غیرت نہیں۔

اصطبل کی پارکنگ میں آنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہاں تو کوئی گاڑی پارک نہیں تھی۔ جس گاڑی سے آئی تھی اسے بھی غاذان لے کے چلا گیا تھا۔ اب وہ ڈیرے کیسے جائے گی؟ اسے ایڈریس بھی معلوم نہیں تھا اور آمد و رفت کی سہولت بھی ندارد تھی۔ اس نے فوراً غاذان کا نمبر ملایا۔ آخر اس نے ہی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اس سب کا بندوبست بھی اسی نے کرنا تھا۔

''عبادہ.....آپ مجھے بار بار کال نہ کریں۔ اس وقت میں بے حد مصروف ہوں میں آپ سے.....''

''میں ڈیرے آ رہی ہوں یوسف خان سے ملنے۔ گاڑی بھجواؤ۔'' اس نے غاذان کی سماعتوں

میں بم پھوڑا۔

''کیا کہا؟ ڈیرے اور آپ؟ نہیں۔نہیں پلیز۔ایسا مت کیجیے گا۔خان جی بہت ناراض ہوں گے۔وہ پہلے ہی بہت غصہ ہیں۔آپ ان کا غصہ مزید مت بڑھائیں۔پلیز۔'' وہ منت پہ اتر آیا۔

''دیکھو غاذان! تم مجھے روک نہیں سکتے۔میں یوسف خان سے ملنا چاہتی ہوں۔مجھے اس بارے میں بات کرنی ہے۔اگر گاڑی نہیں بھجوانی تو مت بھیجو میں اسی طرح آجاؤں گی۔میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی اب۔'' وہ بری طرح غرائی تھی۔اس کی غراہٹ دیکھ کے غاذان کو یہ معاملہ نظر انداز کرنا مناسب نہیں لگا۔اس نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔''لیکن آج نہیں،ہم کل ظہر کے وقت ملیں گے۔میں خان جی کو شاہی مسجد لے آؤں گا۔آپ ادھر آجایئے گا۔''

''او کے۔لیکن دھیان رہے میں شاہی مسجد ہی جاؤں اگر تمہارا ڈرائیور مجھے ادھر ادھر لے گیا تو میں اپنی لاہوری طاقت ضرور دکھاؤں گی پھر چاہے وہ لاء سے ہو یا پولیس سے.....'' اس نے غاذان کو دھمکی دی۔

غاذان نے فون کان سے ہٹا کے اسکرین کو دیکھا۔(لڑکیوں کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔)

''جیسا آپ کا حکم.....'' وہ تابعداری سے بولا۔عبادہ نے کال کاٹ دی اور انتظار کرنے لگی کہ کب حویلی سے گاڑی آئے۔

(قسط نمبر: 3)

بریخنہ کچن میں تنور گرم کر رہی تھی۔ تنور کے اندر خشک لکڑیاں ڈالنے سے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ انہوں نے ماتھے پر دوپٹہ باندھ رکھا تھا جس کا پلوتر کی خواتین کی طرح پیچھے گر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے بنے تنور سلگ رہے تھے۔ کچن میں نیم سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

''بریخنہ چچی..... بریخنہ چچی.....'' پلوشہ آنچل کا پلو سنبھالتی پھولی سانسوں کے ساتھ کچن میں آئی۔ وہاں موجود خواتین اسے دیکھ کے ٹھٹک گئیں۔ اس نے عجلت سے ادھر ادھر دیکھا اور جب ہی بریخنہ پہ نظر پڑی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے گھٹے سے لکڑیاں نکال کے ران پہ رکھ کے چیخ رہی تھیں۔

پلوشہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتے ہوئے قریب آئی۔ چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''مجاہد خان جی بلا رہے ہیں..... آپ کو.....''

''کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے ران سے لکڑی ہٹائی۔

''گل کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

بریخنہ چونکی پھر انہوں نے گہری سانس لی۔ آخر کار ہر مردوں والے معاملے میں گل لالہ کا ہاتھ ہونا ایک عام بات تھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی خان جی انہیں مورد الزام ٹھہرا کے، ان کو کئی جلے کٹے طعنے دینے والے تھے۔ وہ نصیحت جو وہ بلتی قبیلے کے آنے سے پہلے ان کو باقاعدہ اپنے پاس بلا کے کر چکے تھے، اس کا گل پہ اثر ہوا نہ اس کی کارستانیاں رکی تھیں۔

انہوں نے لکڑیوں کا گٹو نیچے پھینکا، سنک میں ہاتھ دھوئے اور قمیص سے رگڑتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ خان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے قدم من من کے ہو رہے تھے اور ایک انجانا

ساڈر تھا جو دل میں اٹھ رہا تھا۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سب نے چونک کے سر اٹھایا۔

مجاہد خان بیڈ کی پائنتی پر براجمان تھے۔ سفید شلوار قمیص پر سیاہ ویسکوٹ پہنے، آستین کہنیوں تک موڑے، سر جھکائے بہت تشویش میں لگ رہے تھے۔ وہ کمرے میں اکیلے نہیں تھے۔ بی جان ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سامنے موٹی چچی صوفے پر تشریف فرما تھیں اور دروازے کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ ابتہاج کھڑا تھا۔ بھوری شلوار قمیص پہ سیاہ چادر گردن میں ڈالے، کھیڑیاں پہنے جن کے بکل کھلے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔

وہ کسی مجرم کی طرح بیڑیاں لگے پیروں سے اندر آئیں اور مجاہد کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

''آپ نے بلایا تھا خان جی؟'' انہوں نے کمزور سے آواز نکالی۔

''ہوں۔'' مجاہد خان نے سر کو جنبش دی۔ وہ ان کے شوہر تھے لیکن اس وقت ان کے سامنے کھڑا ہونا بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے تختہ دار کے سامنے مجرم کھڑا ہو۔ سانسیں اٹک رہی تھیں اور ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں۔

مجاہد خان کچھ لمحے خاموشی سے اس کو دیکھتا رہا۔ ''گل کہاں ہے؟'' کافی دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

''کمرے میں ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

''مجھے کل رات اس کی حرکت کے بارے میں معلوم ہوا۔ میں کیا سمجھوں اسے؟ کیا وہ انتقام لینا چاہتی ہے؟ ہمیں، ہمیں اپنی طاقت دکھا رہی ہے؟''

بریخنہ نے کرنٹ کھا کے سر اٹھایا۔ ''نہیں۔'' انہوں نے تیزی سے نفی میں ہلایا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔''

''پھر کل کی حرکت سے گل کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی؟''

''اسے غصہ آ گیا تھا۔ مجھ پہ۔ میں نے.....'' وہ رکیں، سانس لیں پھر مشکل سے تھوک نگلا۔

''میں نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ اس نے یہ سب اسی عتاب میں کیا ہے.....''

''تھپڑ؟''

''جی۔ وہ بدتمیزی کر رہی تھی تو میرا ہاتھ اٹھ گیا۔''

''یہ تمہارے تھپڑ کا ردعمل تھا؟'' مجاہد نے تحیر سے پوچھا۔

''جی.....''

''ردعمل کلیم کے رائفل سے۔ بلتی مہمانوں کے سامنے برسٹ مار کر۔'' ان کے لہجے میں تعجب تھا۔

''وہ میرا غصہ نکال رہی تھی۔'' وہ دکھ سے بولیں۔

''یہ کیسا غصہ ہوا بھائی جان؟ ہم نے مشکل سے جان بچایا ہے کل۔ بلتی مہمان تو لوٹنا چاہ رہے تھے اس سب کے بعد۔ ہم نے مشکل سے روکا۔ ان کے مردوں کو یہ بات پتہ چلا ہے ان کو لگتا ہے کہ خان کا بھڑاس ابھی تک ہمارے قبیلے میں باقی ہے اور شاید یہ سب جو امن کے لیے ہم کر رہا ہے ڈھونگ ہے دکھاوا ہے۔ برا مت ماننا بر تخنے۔ ہم تو تھک گئے قبیلے کی عزت رکھتے رکھتے لیکن تمہارا بیٹی دونوں ہاتھوں سے لٹانے پر تل رہا ہے۔'' موٹی چچی نے پہلو بدلتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''اس واقعے نے میری نیند اڑا دیا ہے مجاہد۔'' بی جان دھیرے سے بولیں۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ ''اٹھارہ سال پہلے میرا نیند اڑا تھا۔ وقت نے اس زخم کو آہستہ آہستہ بھر دیا۔ لیکن گل کی باغیانہ پیش قدمیاں مجھے اٹھارہ سال پہلے والے حالات پیدا کرتے ہوئے دکھائی دے رہی ہیں۔''

''وہ لڑکی اپنے اندر انتقام کی چنگاری رکھتا ہے مجاہد خان۔ میں اس کا ولولہ اور اس کا طیش دیکھتی رہتی ہے۔ قبیلے کے زنان خانے کی سربراہ ہونے کے ناتے میں تمہیں خبردار کر رہا ہے۔ یہ لڑکی بے شک تمہارا سوتیلا اولاد ہے لیکن بعد میں پوچھا تو تم سے ہی جائے گا۔ یہ لڑکی کسی نہ کسی بڑے انجام

کی حکمت عملی کر رہا ہے۔ عنقریب ہم کو وہ انجام دیکھنے کو مل سکتا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں بھابھی....." بریخنہ نے پلٹ کے موٹی چچی کو خفگی سے دیکھا۔ "وہ اپنے باپ کے بارے میں ہر چیز سے لاعلم ہے۔ اس وقت سات سال کی تھی۔ سات سال کے بچے کا حافظہ اتنا اچھا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ساتھ ہوئی ہر ناانصافی اور ہر زیادتی کو یاد کرے۔"

"زیادتی؟ کونسا زیادتی؟ دیکھا تم نے بی جان۔ سن لیا سب نے۔" موٹی چچی نے شیطان کا روپ دھارا۔ "جو ماں ایسی انتقامانہ بات کر سکتا ہے۔ اس کا بیٹی کیوں باغی نہیں ہوگا۔"

"وہ باغی ہے نہ انتقام کا سوچ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اتنے سال انتظار نہ کرتی۔ اپنے باپ کا بدلہ پل دو پل میں لے لیتی۔"

"اچھا.....اور یہ سب جو وہ کرتا ہے۔ بات مانتا ہے نہ حکم۔ ہر بار نافرمانی۔ لڑائی جھگڑا۔ ابتہاج سے منہ ماری۔ یہ کس بات کا نشانی ہے؟"

مجاہد خان، ابتہاج اور بی جان دونوں کو سن رہے تھے۔ بریخنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ موٹی چچی اوپر سے آ رہی تھیں۔

"ہاں میں مانتی ہوں وہ بدتمیز ہے لیکن وہ پڑھی لکھی ہے۔ پشاور سے پڑھ کے آئی ہے۔ چھ سال وہاں گزارے ہیں۔ اسے اس حویلی کی پابندیاں اچھی نہیں لگتیں۔ وہ بغاوت نہیں کر رہی۔ بس آپ کے ان اصولوں اور قاعدوں کو نہیں مان پاتی۔"

"کونسے قاعدے؟ کیا ہم اس پر ظلم کرتا ہے؟ ہم نے اس کو بیڑیاں لگایا ہوا ہے؟" چچی نے طنز کیا۔

"آپ جانتی ہیں وہ کیا چاہتی ہے۔" بریخنہ نے رکھائی سے کہا۔

"کیا؟ کیا چاہتا ہے وہ؟" چچی نے مکمل لاعلمی سے پوچھا۔

"شندور میں پولو کھیلنا چاہتی ہے وہ۔ سب جانتے ہیں۔"

''بریخنے .....'' مجاہد خان نے دھاڑتے ہوئے تنبیہہ کی۔

''تو یہ بات ہے۔ پولو کھیلنا چاہتا ہے وہ۔'' چچی نے عیاری سے کہا پھر بریخنہ کے قریب آئی اور انہیں ٹھنڈی نظروں سے دیکھا۔ ''تم سکھاتی ہو ناں اسے یہ سب؟ ہوں۔ تم اسے خود باغی بنا رہی ہوں ناں؟''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' بریخنہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تم اس کا دفاع بہت کرتا ہے۔ کل جو کچھ اس نے کیا۔ وہ کسی بھی طرح عام ردعمل نہیں ہوسکتا تھا۔ تم اس کا بھی دفاع کر رہا ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں پھر پلٹ کے مجاہد خان کو دیکھا۔

''آج یوسف خان جی نے تم کو یہاں بھیجا ہے مجاہد خان۔ میری بات ان تک پہنچا دو کہ لڑکی اور لڑکی کی ماں کا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ بلتی قبیلے کو حفاظت کی ضرورت ہے۔''

''بس کر دیں بھابھی۔ اس نے ایسا بھی.....''

''مجھے مت بتاؤ۔ کل کو کچھ اونچ نیچ ہوئی تو مجھ سے تفتیش ہوگی کیوں کہ بڑا میں ہے۔ تم لوگوں سے کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''لیکن آپ گل کے بارے میں ایسے.....''

''تم دونوں لڑنا بند کرو۔'' بی جان برہمی سے بولیں۔ ''بڑی بہو۔ خاموش ہو جاؤ۔ اس لڑکی کا کیا کرنا ہے۔ یہ ہم دیکھ لیں گے۔''

موٹی چچی نے کسمسا کر پہلو بدلا۔

''کیا کرنا ہے؟ کیا مطلب بی جان؟ آپ لوگ کیا کریں گل کے ساتھ؟'' بریخنہ کانپ گئی۔

''چچی! اس نے میرے کمرے سے رائفل چرایا ہے۔ پرانے گودام سے گولیاں لیں اور بلتیوں کو ہراساں کیا ہے۔'' ابتہاج چند قدم لیتا ہوا قریب آ گیا۔ ''اس لیے ہم مرد اس بات سے اب ہرگز

غافل نہیں ہوں گے کہ وہ لڑکی کچھ نہ کچھ ضرور کر رہی ہے۔آپ اور وہ اگر نہیں بتانا چاہتے تو مت بتائیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔'' ابتہاج کہتے کہتے رکا۔'' نقصان پہلے بھی آپ کا ہوا تھا۔اس بار بھی آپ کا ہی ہوگا۔''

بریخنہ کے روئیں روئیں میں کرنٹ دوڑ گیا۔

''لیکن اسے پرواہ کہاں ہے۔یہ تو اپنے باقی بچوں میں مصروف ہے۔پہلے شوہر کی بیٹی کیا کر رہی ہے۔اسے کیا۔ہونہہ۔'' چچی نے ببول اگلے۔

''عالیہ کو خوف لگ چکا ہے۔وہ چوکنا ہوگئی ہے۔'' بی جان نے تشویش ظاہر کی۔

''اور نہیں تو کیا۔اس لڑکی نے پرانی دشمنی کو نئی ہوا دی ہے۔ہمارے فیصلوں،قصاص اور جرگوں کے منہ پہ تھوکا ہے۔میں تو کہتی ہوں جب تک یہ سب ختم نہیں ہو جاتا۔اس لڑکی کو کہیں رفع دفع کر دو۔اس کی موجودگی امن خراب کر رہی ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔علاقائی امن بحال کرو تاکہ شندور پہ کسی قسم کا کوئی اثر نہ پڑے۔میں نہیں چاہتی کہ اس بار بھی میرا قبیلہ وہ بھگتے جو اٹھارہ سال پہلے بھگتا تھا۔تم،یوسف دونوں مل کر اس معاملے کو حل کرو اور مجھے فی الفور اطلاع دو۔'' انہوں نے حکم دیا۔

''میں بھائی جان سے بات کرتا ہوں۔'' مجاہد خان نے سر کو جنبش دی۔

''نہیں۔آپ مت کریں۔بلاوجہ معاملہ خراب ہو جائے گا۔میں بات کرتی ہوں گل سے۔میں سمجھاؤں گی اسے۔وہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گی۔'' بریخنہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ان کا دل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

''جیسے وہ ''تمہارا'' بہت بات مانتا ہے۔'' موٹی چچی نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''میں ماں ہوں بھابھی اس کی۔ماں سے ناراض ہوا جا سکتا ہے۔بدظن ہوا جا سکتا ہے۔غصہ

ہوا جاسکتا ہے لیکن نفرت نہیں کی جاسکتی۔وہ ایک بار نہیں سنے گی۔دو بار نہیں سنے گی لیکن تیسری بار وہ میری بات ضرور سنے گی۔'' وہ استحقاق سے کہنے لگیں۔آنکھوں میں مان تھا۔

''ہوں۔ میں امید کرتا ہوں تم اسے اچھے سے سمجھا دو گی۔'' مجاہد خان گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا ہوا کھڑا ہوا۔ان کا قد خاصا لمبا تھا۔اس وقت بریخنہ کو اپنا آپ ان کے آگے بہت چھوٹا محسوس ہوا۔''بھائی جان نے اس پر بہت محنت کی ہے۔تمہارے شوہر کے بعد بہت نازوں اور لاڈ سے پالا ہے اسے۔باپ کی کمی تک محسوس نہیں ہونے دی۔اس کی مرضی کی ہر چیز دلائی ہے۔وہ پڑھنا چاہتی تھی،سارے قبیلے اور خاندانی روایتوں کو پس پشت ڈال کے انہوں نے اسے پشاور بھیجا تاکہ پڑھ لکھ جائے۔ان کے بھروسے اور محبت کا مان رکھنا ہوگا اسے۔''

''وہ کچھ نہیں کرے گی۔آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔''

''گارنٹی دیتی ہو اس بات کی؟'' چچی نے سرعت سے پوچھا۔

''میں.....''

''ہاں تم؟ بتاؤ۔دعویٰ کرسکتی ہو گل کو جاننے کا؟''

وہ گل کو زیادہ جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھیں کیوں کہ انہوں نے مجاہد خان سے شادی کے بعد گل کو وقت دیا ہی نہیں تھا۔وہ تنہا رہی تھی۔وہ جو کہتی تھی،ویسا نہیں کرتی تھی یا شاید کرتی بھی تھی۔ایک وقت میں اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔اس کا اندازہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''وہ کچھ نہیں کرے گی.....بلتیوں کے آنے سے پہلے بھی ہم نے تمہیں سمجھایا تھا کہ گل کی حرکتوں پر نظر رکھنا بریخنے بی بی۔اس کو تو دیکھ نہیں پائی۔اب خاک سمجھاؤ گی.....ہونہہ.....'' چچی نے نخوت سے ہنکار بھرا۔

''تم میں سے کوئی بات نہیں کرے گا..... میں..... میں خود بات کروں گی۔'' بی جان نے قصد باندھا۔

''آپ؟'' مجاہد ٹھٹک گیا۔

''ہاں میں۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹال سکے گی۔'' انہوں نے پر یقین لہجے میں کہا۔ انہیں بریخنہ پہ یقین تھا کہ وہ گل سے بات کرلیں گی لیکن گل ماں سے ڈرتی نہیں تھی اور کسی بھی انسان کو برے کام سے روکنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

ڈر۔

بلیک میل۔

وہ ڈر کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' مجاہد خان سانس نکالتے ہوئے اٹھ گیا۔

''تمہارے سر پہ تو باورچی خانے کی ذمہ داریاں ہیں بریخنہ۔ مجھ پہ پورا حویلی ہے۔ مجھ کو یہ سارا معاملات دیکھنا ہوتا ہے۔ یہاں ذرا سا بھی غلطی کا جوابدہ میں ہوں۔ اس لیے مجھ پہ رحم کرو۔ خان جی کے سامنے میری نظریں نہ گراؤ۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے کہنے لگیں پھر ان پہ ایک اچٹتی نظر ڈالی اور وہاں سے چلی گئیں۔ بریخنہ نے آنسوؤں کے دھندلے دھاروں میں بی جان کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔ بی جان نے نظریں چرالیں۔ وہ اپنی اس بہو سے کبھی نظریں نہیں ملا سکتی تھیں اس لیے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑی ہوگئیں اور خراماں خراماں چلتی باہر نکل گئیں۔

بریخنہ نے آنکھیں میچ کے آنسوؤں کو چہرے پر بہنے دیا۔ جانے یہ حویلی کب تک ان کے زخم کھرچنے والی تھی۔ پہلے شوہر، اب بیٹی۔ جانے انہیں کس کس رشتے کا حساب دینا تھا۔ شوہر نے ان کی نہیں مانی، بیٹی نے کبھی سنی ہی نہیں۔ اپنا خون ہو کے بھی اس کا وجود پرایا پرایا لگتا تھا۔

وہ ہتھیلی سے رخسار پونچھ کے مڑیں تو ٹھہر گئیں۔

ابتہاج ہنوز وہاں کھڑا تھا۔ وہ انہیں آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کے دیکھ رہا تھا۔

''گل کل میرے کمرے میں گئی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا جب وہ زنان خانے سے مردان خانے جاتی ہے تو آپ سب کہاں ہوتی ہیں؟'' اس نے چبا چبا کے پوچھا۔

''اپنی ماں سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟''

ابتہاج کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے میں راکنگ چیئر پر براجمان تھے۔ دایاں ہاتھ کرسی کے ہتھے پر رکھا ہوا تھا اور مصنوعی ہاتھ گود میں تھا۔ ان کی راکنگ چیئر ہلکی ہلکی ہل رہی تھی جس سے کمرے میں عجیب اندوہناک آواز پیدا ہو رہی تھی۔

ان کے دائیں سمت کھڑکی کے پردے برابر گر رہے تھے۔ کمرے میں پرسکون خاموشی تھی۔ انہوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا رکھا تھا۔ ان کی دبیز دستار بیڈ پر لاوارث پڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ ''اہم'' نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی اسے اپنے سر پہ نہ رکھتے۔ کبھی کبھی چند پونڈز کی وہ ٹوپی اتنی بھاری ہو جاتی کہ کندھے تک اس کے بوجھ سے جھک جاتے اور ریڑھ کی ہڈی میں ایسی سنسناتی ٹیس اٹھتی کہ وہ کئی دنوں تک اس درد سے باہر نہ نکل پاتے تھے۔

رات دو گھوڑوں کی موت سے بھی ان کی کمر میں تاحال درد تھا۔ دل چاہ رہا تھا، اس دستار اور نمبرداری کو ٹھوکر مار کے دور پھینک دے، عزت و ناموس کی یہ جنگ جو کئی پشتوں سے ان کا خون جلا رہی تھی، کم از کم وہ تو ختم ہو جاتی۔ جانے سرور خان نے انہیں کس جال میں پھنسا دیا تھا۔ کاش کلیم اللہ کا قتل نہ ہوا ہوتا، تو آج وہ بھی مجاہد کی طرح صرف اپنے بچوں اور بیوی کی فکر کرتا، قبیلے، خاندان

اور چترال کی عزت اور اپنی سرداری کی بقا کے لیے یوں جان نہ مارنی پڑتی۔

دروازے کی چرچراہٹ ہوئی، تاریک کمرے میں روشنی آئی، کسی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اپنی سوچ کے محور سے نکلے۔ سائے نے دو قدم آگے لیے، دروازہ بند کیا اور قدم قدم چلتا ان کے ساتھ بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ کون آیا ہوگا۔

''خان جی.....'' غاذان کی تکلیف بھری آواز ابھری۔

ان کی کرسی آگے پیچھے بے چینی سے جھولتی رہی۔

''دو گھوڑے چلے گئے ہیں۔ چار رہ گئے ہیں۔ اب ہم چاہ کر بھی کھلاڑیوں کے لیے ان چاروں کی پیش کش نہیں کر سکتے کیوں کہ لوگ بقیہ دو گھوڑوں کے بارے میں سوال کریں گے جس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ سر جھکائے، نیم اندھیرے میں اپنے جوتوں کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے بہت کوشش کی، عبادہ نے بھی کی لیکن ہم گھوڑوں کو نہیں بچا سکے اور اگر (وہ ٹھہرا) یہی..... سلسلہ چلتا رہا تو عنقریب ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

یوسف خان آگے پیچھے جھولتا رہا۔ ہتھے پہ رکھا ہاتھ بے حد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ غاذان نے ذرا سی گردن گھما اپنے پہلو پڑی دستار کو دیکھا جس پر کھڑکی کے پردوں کے درز سے آنے والی روشنی پڑ رہی تھی۔ سیاہ ٹوپی پہ لپٹا یہ سفید کپڑا برائے نام عہدے کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا ذمہ داریاں اور مجبوریاں سمٹ کے آتی تھیں، شاید اس کے بارے میں ایک عام آدمی کا تخیل نا قابلِ رسائی تھا۔

اس نے گہری سانس خارج کی اور انہیں دیکھا۔

''خان جی کچھ کہیے..... میں حکم کا منتظر ہوں۔'' وہ تابعداری سے بولا تو ان کی کرسی کی چرچراہٹ میں کمی ہوئی۔

''غاذان.....'' ان کی آواز میں بلا کا کرب تھا۔

''جی خان جی.....'' وہ بے چینی سے آگے ہوا۔

''کچھ کرو۔ (التجا) اٹھارہ سال تک ہم نے مسلسل بدنامی سہی ہے۔ تمہارے باپ کی وجہ سے، میں سردار ہونے کے باوجود میں کسی سے نظریں نہیں ملا پایا ہوں۔ اس ایک خلش کے سبب میری گردن ہمیشہ جھکی رہی ہے۔ میں نے (ایک ٹھنڈی سانس لی) بڑی مشکل سے وہ حالات ٹھیک کیے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ میں ایک بار پھر وہ رسوائی سہوں اور وہ تمام طعنے تشنے سنوں جس کو اٹھارہ سال سے سنتا ہوا آرہا ہوں۔'' ان کی کرسی کی چرچراہٹ میں ان کی آواز معدوم ہو رہی تھی۔

''ڈیڑھ ماہ سے میں اس امید پر تھا کہ شاید گھوڑے ٹھیک ہو جائیں مگر اب.....اب حالات ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ کل دو گھوڑوں کی موت نے میری رہی سہی آس بھی روند ڈالی ہے۔ اس لیے (وہ سانس لینے کو رکے) تم اس کا سدِ باب کرو۔ لوگوں کو کیا کہتے ہو؟ کیا جواز دیتے ہو۔ کونسی مجبوری بیان کرتے ہو، کونسا جھوٹ بولتے ہو، کونسا وعدہ کرتے ہو مجھے بعید نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تم اس دلدل سے مجھے کیسے نکالتے ہو مگر تم (ذرا زور دیا) اس رسوائی سے ہمیں بچاؤ گے۔''

غاذان نے گہری سانس لی۔ یوسف خان ایک ناقابلِ برداشت بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال رہے تھے۔ ایسا بوجھ جسے وہ نہیں اٹھا سکتا تھا مگر یوسف خان کے لیے وہ ہر دم تیار تھا۔ اس کے لب پر انکار نامی کوئی فقرہ نہیں آتا تھا۔ آج بھی، اس نہج پر وہ منافی کرنے والا نہیں تھا۔

اس نے خشک گلا تر کیا اور عزم سے پیچھے ہوا۔ ''ٹھیک ہے خان جی۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

''کچھ ایسا کرنا کہ لوگوں کو اس پر کوئی چہ میگوئی یا تنقید کرنے کا موقع نہ مل سکے۔'' انہوں نے تنبیہہ کی۔

''جی خان جی۔'' اس نے تابعداری سے سر کو خم دیا۔ یوسف خان مزید کچھ کہے واپس اسی رفتار سے جھولنے لگے۔ کرسی کی چرچراہٹ میں اضافہ ہوا تو غاذان نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور اٹھنے لگا۔ دفعتاً اسے کچھ دیا آیا، وہ واپس بیٹھ گیا۔

''خان جی.....'' وہ ہچکچایا۔

''ہوں۔'' ایک مخمور سے ہنکار آیا۔

''وہ.....ڈاکٹر آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں مل سکتا۔'' وہ بے حد سرد لہجے میں بولے۔

غاذان نے خشک گلا تر کیا۔ عبادہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ جسے یہ کہا جائے کہ سردار نہیں ملنا چاہتے تو وہ ''اٹس اوکے'' کہہ کر چلی جائے گی۔ اس نے جس جارحانہ انداز میں بات کی تھی، وہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ قطعی یوسف خان سے ملے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ وہ جو سوال پوچھنا چاہتی ہے، وہ پوچھ کے ہی دم لے گی۔

''خان جی.....وہ بضد ہے آپ سے ملنے کے لیے۔ اگر آپ نہ ملے تو وہ ڈیرے آجائے گی اور اگر وہ ڈیرے آگئی.....'' وہ ٹھہرا، لفظوں میں ڈر امڈ آیا۔ ''ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ وہ لڑکی ہے اور میں اسے روک نہیں پاؤں گا۔ ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ہم ایک دفعہ اس کی بات سن لیں۔''

یوسف خان کی کرسی رک گئی۔ غاذان کا دل دھڑک گیا۔ اگلے ہی لمحے ان ہی گہری سانسوں کی آواز آئی جو صاف بتا رہی تھی کہ وہ کس قدر اشتعال میں آچکے ہیں۔ غاذان نے بے ساختہ ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں جو نم ہو گئی تھیں۔

کچھ لمحے وہ خاموشی سے ان کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، وہ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھے، کھڑکی تک گئے، چرچرا کے پردے ہٹائے۔ چھنچھناتی ہوئی روشنی اندر آئی۔ غاذان نے بے اختیار آنکھوں کے آگے ہاتھ کرلیا۔ تیز چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

''کہاں ملنا ہے؟'' وہ پشت پہ ہاتھ باندھے، کھڑکی سے نیچے دیکھتے ہوئے بولے۔

غاذان نے آہستہ سے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ ''میں نے شاہی مسجد کا کہا ہے۔ کل ظہر کی نماز کے بعد۔''

''بلالو اسے..... میں بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔'' ان کے انداز سے غاذان کو کچھ انہونی محسوس ہوئی۔

''جی خان۔'' وہ سر کو تائیدی انداز میں ہلاتا کھڑا ہو گیا۔

کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ کچھ گھنٹوں سے وہاں جمع تعفن اور حبس ختم ہو گئے تھے۔ اب ماحول ذرا خوشگوار لگ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شام میں اس نے گل کے کہنے پر چترالی لباس آزمایا تھا۔ اس نے نارنجی رنگ کی لمبی فراک اور کھلا پاجامہ پہنا۔ فراک پہ سیاہ دھاگے کی کڑھائی ہوئی تھی اور اس کا سامنے والا حصہ اتنا بھاری تھا کہ ایسا لگ رہا تھا اس نے دو کلو کا وزن اٹھایا ہو۔ سر پہ سیاہ آنچل دلہن کی طرح لے رکھا تھا۔

وہ کمرے میں کھڑے ہو کر پوز بنا رہی تھی جب کہ گل اس کی تصویریں اتار رہی تھی۔

''اس اینگل سے.....'' گل نے اس کی دائیں طرف جاتے ہوئے کہا۔ عبادہ نے آنچل کو لہرایا۔ کلک کلک۔ کئی تصویریں کھینچ گئیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ گو کہ یہ کپڑے اسے بہت کھلے تھے لیکن وہ مختلف اور خوبصورت لگ رہی تھی۔

''گل.....'' گمبھیر آواز پہ وہ دونوں چونک گئیں۔دروازے میں بی جان اپنی دو ملازماؤں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ہاتھ پشت پہ باندھے تھے،وہ گردن اکڑائے کسی تھانے دار کی طرح انہیں دیکھ رہی تھیں۔گل نے فوراً فون پیچھے چھپالیا اور عبادہ بھی خائف ہوگئی۔سر سے دوپٹہ اتار کے سیدھی طرح اوڑھ لیا۔وہ ثبت ڈگ بھرتی ہوئی قریب آئیں۔ان کی ملازمائیں باہر کھڑی رہ گئیں۔

''مجھے تم سے بات کرنا ہے گل۔'' انہوں نے تحکم سے کہا۔

''بولیے۔'' گل نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

''مجھے سنجیدہ بات کرنی ہے۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

''میں کونسا کہہ رہی ہوں لطیفہ سنانے آئی ہیں۔کریں بات۔'' اس کے چہرے پر بدلحاظی تھی۔انہوں نے زہر کا گھونٹ پی لیا۔

''میں تم سے.....''

''میں پانی لے کر آتی ہوں۔'' عبادہ کو اپنا آپ وہاں عجیب سا لگا۔اخلاق کا مظاہرہ پیش کرتے ہوئے اس نے میز سے بوتل اٹھائی اور باہر نکل گئی،نکلتے ہوئے اس نے دروازہ بند کردیا۔وہ بدستور بی جان کو سرد نظروں سے دیکھ رہی تھی۔وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت کیوں آئی ہیں۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ نرمی سے بولیں۔گل ڈھٹائی سے کھڑی رہی۔

''میں نے کہا بیٹھ جاؤ۔''

''سو دفعہ بھی کہیں گی تو مجھے نہیں بٹھا سکتیں۔'' وہ اکڑی۔

''میں نے حکم دیا ہے۔'' وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دھاڑیں۔

''پھر آپ مجھے ہمیشہ اپنے حکم کا نافرمان پائیں گی۔'' وہ تلخی سے کہتے ہوئے مڑی اور بیڈ کی پائنتی پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی،فون کھولا اور فون کی سکرین کو تکنے لگی۔بی جان نے زہر کا

گھونٹ پیا۔ان کو حویلی میں عزت ہی نہیں ایک مقام حاصل تھا۔وہ جہاں کھڑی ہوتیں، وہاں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ان کے رعب، طنطنے اور غیظ سے حویلی کا پتہ پتہ تھرتھراتا تھا اور یہاں گل انہیں زچ کر رہی تھی۔

وہ صبر کا دامن پکڑتیں، بڑا پن دکھاتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گئیں اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے براجمان ہوگئیں۔گل ٹانگ جھلاتے ہوئے بے نیازی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

''تم صلح کرنا چاہتی ہو یا بدلہ لینا چاہتی ہو؟'' انہوں نے خشک لہجے میں بات شروع کی۔گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ گنگنانے لگی۔''تم صلح کرنا چاہتی ہو یا بدلہ لینا چاہتی ہو؟'' انہوں نے دوبارہ تحمل سے پوچھا۔گل نے سیلفی کیمرہ آن کیا اور ''وی'' کی طرح ہونٹوں کے قریب انگلیاں رکھیں اور تصویر کھینچی۔اب بی جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھیں، تیزی سے آگے آئیں اور اس کے ہاتھ سے فون کھینچ لیا۔

اس نے غرا کے انہیں دیکھا۔''فون واپس کریں۔''

''کوشش بھی مت کرنا۔'' انہوں نے انگشت دکھائی۔گل تیورا کے رہ گئی۔انہوں نے فون صوفے پہ پھینکا اور اس کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

''کچھ پوچھا ہے میں۔تم صلح کرنا چاہتی ہو یا بدلہ لینا چاہتی ہو؟''

گل نے ہاتھ پیچھے بیڈ پہ رکھے اور محظوظ انداز میں مسکرائی۔''کیا کریں گی جان کر؟''

''تمہارا فیصلہ کروں گی۔'' وہ درشتی سے بولیں۔

''اچھا؟ مثلاً کیا؟ میری شادی کر دیں گی؟ نہیں۔مجھے قید کر لیں گی۔اوں۔نہیں۔آپ یقیناً مجھے غیرت کے نام پہ قتل کرائیں گی۔ہے ناں؟'' وہ بڑے ہی مزے سے بولی تھی۔

انہوں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔''تم صلح کرنا چاہتی ہو یا بدلہ لینا چاہتی ہو؟''

''میں پولو کھیلنا چاہتی ہوں۔'' گل نے عام سے لہجے میں کہا۔

''صلح یا بدلہ؟'' بی جان ایسے مسکرائیں کہ یہ والا جواب میں نے نہیں مانگا۔

''پولو۔'' وہ ضد سے بولی۔

بی جان نے گہری سانس لی اور سیدھی ہو گئیں پھر پلٹ کے صوفے تک گئیں اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھتے ہوئے گردان اکڑالی۔ (اگر وہ پوتی تھی، تو وہ دادی تھیں۔) کھڑکیوں کے پردے ہلکے ہلکے جھولنے لگے تھے۔ باہر شاید ہوا چل رہی تھی۔ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''جب تم چار سال کی تھیں تب تمہارے باپ نے اپنے بڑے موبائل میں مجھے ایک ویڈیو دکھائی تھی۔ اس ویڈیو میں ایک دبلا پتلا سا لڑکا اکیلے تیس لوگوں کو پیٹ رہا ہوتا ہے۔ میں اس آدمی اور ان لوگوں کی تعداد دیکھ کے حیران رہ گئی کہ وہ کمزور اور لاغر سا آدمی کیسے ان تیس لوگوں کو مار رہا ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ گل سینے پر ہاتھ باندھ کے، منہ چڑھاتے ہوئے سننے لگی۔

''میری حیرت دیکھ کر تمہارے باپ نے کہا کہ ماں جی یہ فلم ہے اور جو کچھ آپ دیکھ رہی ہیں۔ وہ جھوٹ ہے۔ اسے صرف کیمرے میں عکس بند کرنے کے لیے ایسا دکھایا گیا ہے ورنہ آپ خود سوچیں، ایک اکیلا آدمی تیس لوگوں سے مکوں اور گھونسوں کے زور پر لڑ سکتا ہے؟ مجھے تب سمجھ آئی کہ فلم میں اور حقیقت میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔'' وہ ذرا آگے ہوئیں اور اسے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ ''اس لیے گلِ لالہ..... یہ نہ تو فلم چل رہی ہے کہ تم اپنی طاقت سے سب پہ بھاری ہو جاؤ گی اور نہ ہی تمہارے آگے تیس لوگ ہیں۔ تم اکیلی ضرور ہو مگر تمہارے آگے (وہ سانس لینے کو رکیں۔) پورا گلگت ہے۔ کل ملا کے چھتیس لاکھ لوگ۔''

وہ فاتحانہ انداز مسکرائیں۔ گل بار بار تھوک نگل رہی تھی۔ اس کی اڑتی ہوئی رنگت کو دیکھ کے بی جان آگے ہوئیں۔

''میں پھر پوچھتی ہوں، تم بدلہ لینا چاہتی ہو یا صلح کرنا چاہتی ہو؟''

''پولو۔'' وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے قطعیت سے بولی۔

بی جان کے ماتھے پر بل پڑے۔

''تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے تم پولو پولو کی رٹ لگاؤ گی تو میں اس کے پیچھے چھپی تمہاری ناچاکی نہیں سمجھ پاؤں گی؟ گل لالہ میں تمہاری دادی ہوں۔ تمہاری جتنی عمر ہے، ان باتوں میں میرا اتنا تجربہ ہے۔ اس لیے ادھر ادھر کی مت ہانکو، میں جو پوچھنے آئی ہوں، مجھے اس کا جواب دو اور.....'' وہ ٹھہریں، پھر بولیں تو آواز میں رعب تھا۔ ''مجھے کھرا جواب چاہیے۔''

گل نے سینے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کے دل میں ایک برا انتقام سلگ رہا تھا۔ ایسا انتقام جو اس کے سارے اعضاء کھا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بی جان کس لیے آئی ہیں۔ ان کی باتوں کا مقصد کیا ہے لیکن فی الوقت وہ خاموشی سے سن رہی تھی، اسے پتہ تھا، اسے آگے کیا کرنا ہے۔

''جب انسان کم عقل تھا۔ تب وہ ہتھیار اور اوزاروں سے جنگ کرتا تھا۔ فوج اور لشکر بھیج کر علاقوں کو فتح کرتا تھا۔ اپنے مقابل کی زور آزمائی میدان جنگ میں تلواروں کے سائے میں ہوتی تھی۔ تب بادشاہ بھی جسم چیرتا تھا اور اس کی فوج بھی دشمن کے چیتھڑے اڑاتی تھی۔ کشت وخون، فریاد وفغاں اور آہ وبقا پر فتوحات کی جاتی تھیں مگر آج کل ایسا نہیں ہوتا گل۔ آج کا انسان سمجھ دار ہو گیا ہے۔ وہ درخت کو کلہاڑے سے کاٹنے کی بجائے، اس کی جڑوں میں جڑ کھانے والے کیڑے چھوڑ دیتا ہے اور جب جڑ ختم ہو جائے تو تناور سے تناور درخت بھی دھڑام سے گر جاتا ہے۔''

وہ اپنی سرخ انگلیوں کو لہرا لہرا کے کہہ رہی تھیں۔

''آج کا انسان عقل مند ہے گل۔ وہ دشمن کے ساتھ زور آزمائی نہیں کرتا، اس کی کمزوریوں کو

ہتھیار بناتا ہے۔ میں تمہیں مشورہ نہیں دے رہی، سمجھا رہی ہوں کیوں کہ تم نے کم عقلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہتھیار اٹھایا ہے۔"

"کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں اس سب سے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"یہی کہ تم اکیلی لڑکی اس پورے ٹولے سے نہیں لڑ سکتی۔ یہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ سمجھیں۔"

"آپ کو کس نے کہا کہ میں لڑ رہی ہوں؟" وہ محظوظ انداز میں بولی۔ بی جان ٹھٹک گئیں۔ "میں نے جو کچھ کیا، اپنا نشانہ آزمانے کے لیے کیا۔ بس۔" اس نے کمال بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"میں نے جیسا کہ پہلے کہا، میں تمہاری دادی ہوں۔ تم مجھے....."

اس نے درشتی سے ہاتھ اٹھایا۔ "آپ کو جو اخذ کرنا ہے، کر لیں۔ مجھے پرواہ نہیں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔ بی جان زیر لب مسکرائیں۔ کھڑکی کے پردے اب زور زور سے ہل رہے تھے۔ باہر کی ہوا اندر آ رہی تھی۔

"اگر یہ سچ ہے کہ تمہاری وہ حرکت انتقامانہ نہیں تھی تو تم کل ناشتے پر عالیہ گودائی سے معافی مانگو گی۔" انہوں نے اس پر بم پھوڑا۔ وہ سٹپٹا گئی۔

"کس چیز کی معافی؟"

"اپنی حرکت کی۔"

"وہ حرکت میں نے پچھتر لوگوں کے سامنے کی تھی۔ میں ایک سے معافی کیوں مانگوں؟" وہ بدکنے لگی۔

"تم سب سے مانگنا چاہتی ہو؟" بی جان نے ابرو اٹھائی۔ گل نے کسلمندی سے پہلو بدلا۔

''میں نے اس نیت سے کچھ نہیں کیا تھا۔''

''نیت جو بھی تھی، تمہاری حرکت عالیہ دیکھ چکی ہے۔اس لیے تم معافی مانگو گی تا کہ ان کے دل کو تسلی ہو جائے۔''

''کس چیز کی تسلی؟''

''یہی کہ تم صلح پر راضی ہو، انتقام نہیں لینا چاہتیں۔''

گل نے گہرا سانس خارج کیا۔وہ سب مل کر اس کے حواس پہ چڑھ رہے تھے۔وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بی جان کا مقصد کیا ہے۔کس کی آڑ میں، وہ کس کی طرفداری کرنا چاہتی ہیں۔بلتیوں کے سامنے اس کی معافی مانگنے سے محض ایک مسئلہ حل نہیں ہوگا، کئی مسائل حل ہو جائیں گے۔وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہی تھیں۔

اس نے گہری سانس لی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے ایک عزم سے اٹھی۔''ٹھیک ہے۔میں معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔''

بی جان نے رک کر اسے دیکھا۔''کیا کہا۔''

''میں معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔'' گل ہاتھ پشت پہ باندھے، خاموشی سے کھڑی تھی۔بی جان آہستہ سے اٹھیں۔

''کل ناشتے پہ میں تمہارے اس مذاق کا انتظار کروں گی اور اگر تم نے یہ سنجیدگی سے نہیں کیا تو تم بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی۔'' انہوں نے کھرے لہجے میں کہا۔گل زیر لب مسکرائی۔(دیکھ لیں گے۔)

بی جان اس پر ایک تنقیدی نظر ڈال کے دروازے کی طرف مڑیں اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

'میرے پاس جو کیڑے ہیں وہ ایک درخت کی جڑیں کھوکھلی نہیں کرتے، وہ اس کے ساتھ شامل ہر درخت کو دھڑام سے گرائیں گے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے صوفے سے عبادہ کا فون واپس اٹھالیا۔

☆.....☆.....☆

وہ بوتل تو لے آئی تھی لیکن بھری نہیں۔ وہ کافی دیر تک صحن میں بیٹھی رہی پھر جب اندازہ ہوگیا کہ اب تک دونوں کے مابین گفتگو ختم ہوچکی ہوگی۔ وہ بوتل بھر کے کمرے میں جانے لگی۔ رات ہوگئی تھی اور حویلی کی بیشتر خواتین سوگئی تھیں۔ ابھی وہ اوپر جارہی تھی جب پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی غاذان پہ نظر پڑی۔ مردان خانہ والی راہداری سے وہ اس طرف آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو رائفلیں تھیں۔ عبادہ رک گئی۔ غاذان نے ہلکی بھوری شلوار قمیص پہ سیاہ ویسکوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پہ پٹھانی ٹوپی تھی اور قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ عبادہ کے دل نے پہلی بیٹ مس کی۔

وہ اپنے ہی لے میں اندر آیا، زنان خانے میں داخل ہوا تو فوراً نظر عبادہ پہ گئی جو اسے مسحور ہو کے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی چونک گیا۔ عبادہ ان کپڑوں میں اپسرا لگ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی سی، تھوڑی جھجکتی، تھوڑی شرماتی، تھوڑی بے چین۔

''نائس.....'' غاذان قریب آگیا اور تہہ دل سے پذیرائی کی۔

''شکریہ.....'' عبادہ نے نظریں جھکادیں۔

(دھڑکنیں کب کسی کی سنتی ہیں؟ یہ وقت دیکھتی ہیں نہ حالات، جب جس کے نام پہ چھوٹ جائیں تو چھوٹ جاتی ہیں۔ دھڑکنیں کہاں کسی کے قابو میں ہوتی ہیں۔)

''مجھے اندازہ نہیں تھا آپ ہمارے ثقافتی لباس میں اتنی اچھی لگ سکتی ہیں۔'' وہ دونوں رائفلز کو

سیڑھیوں کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ایک نظر، محض ایک نظر میں اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ اچھی لگ رہی ہے لیکن وہ.....؟اسے تو شاید اس کے نین نقش حفظ کرنے میں دہائیاں لگ جائیں۔

''شکریہ.....''ایک ہلکی سی حیا نے اس کے چہرہ کو ڈھک لیا۔

''یہاں کیا کر رہی ہیں؟ سوئی نہیں.....''وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

''سونے جا رہی تھی بس وہ پانی لینے آئی تھی۔''

''ہوں۔''وہ نرمی سے مسکرایا۔

''چلتی ہوں میں.....''عبادہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔''گڈ نائٹ۔''وہ سرد سے انداز میں کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''عبادہ.....''اس نے رک کے پکارا۔

''ہوں۔''وہ اوپری سیڑھی سے پلٹی۔

''آپ کے باس کا فون آیا تھا مجھے۔وہ بہت ناراض ہو رہے تھے ہم پہ۔اگر ہم نے چھپانا ہوتا تو ہم آپ کو کیوں بلاتے۔راز کا رسک کون لیتا ہے؟ لیکن چلیں۔آپ کی بھی کم دل آزاری نہیں کی ہم نے۔ہم بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔امید کرتا ہوں۔یہاں سے جانے کے بعد آپ ہمیں اچھے لفظوں میں یاد کریں گی۔چترال کی شان کو عبادہ سلیم کے جانے سے نقصان نہیں پہنچے گا۔''کیا مان تھا۔کیا غرور تھا۔عبادہ کی گوت گویائی سلب ہوگئی۔وہ کیا جواب دیتی؟ اس کا دل دکھایا تھا چترال نے اور اس سے آہ بھی چھینی جا رہی تھی؟ کیسا ظلم تھا یہ؟

''یونو وہاٹ خان جی کو سمجھانا بہت مشکل کام ہے۔وہ دوسروں کی رائے سنتے ہیں۔مانتے نہیں۔کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے لیکن میں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ میرے سردار بننے تک اگر یہ گھوڑے اسی طرح رہے تو میں ان کو ہسپتال ضرور لے کے جاؤں گا۔یہ میرا وعدہ

ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔اس کے لفظوں سے اپنے گھوڑوں کے لیے دکھ جھلک رہا تھا۔

اس نے مضبوطی سے بوتل پکڑی ہوئی تھی۔وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔

''عبادہ۔'' وہ پریشانی سے قریب آیا۔اب فاصلہ کم ہوا تھا۔'' آپ ایک بہترین ڈاکٹر ہیں۔سو پروفیشنل۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔'' آپ جانتی ہیں جب اختیارات آپ کے پاس نہ ہوں تو آپ صرف مشورہ دے سکتے ہیں۔ایکشن نہیں لے سکتے۔''

عبادہ نے آنکھیں بند کرلیں۔اور یہ منظر دو لوگ اور دیکھ رہے تھے۔ایک پیچھے پردوں میں کھڑا ابتہاج اور دوسرا اوپر سے دیکھتی گل لالہ۔

''آپ خفا تو نہیں ہیں مجھ سے؟'' جانے اس نے کیوں پوچھ لیا۔گل کے دل کو کچھ ہوا۔

''آپ سے ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہے میرے پاس غاذان۔'' اس نے پلکیں اٹھائیں، نظریں ملائیں۔یہ نظریں بدلی ہوئی تھیں اور وہ نظریں ویسی تھیں۔ہمدردانہ اور دوستانہ۔

''مگر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔آپ کی عزت بجا ہے لیکن کسی کی زندگی پہلے آتی ہے۔عزت کے غم سے زندگی مدغم نہیں کی جاسکتی۔آبرو کے خوف سے محبت کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔لوگوں کی تو تو سے اپنی میں میں نہیں خراب کرنی چاہیے۔لوگوں کو حق نہیں ہونا چاہیے ہمارے زندگی کے فیصلے لینے کا۔چترال کو لوگوں کا غم نہیں ہونا چاہیے۔ایون کو گھوڑوں کے لیے عزت کی نیلامی نہیں کرنی چاہیے۔''

اس کی آنکھیں نم تھیں، دل مسوس رہا تھا۔

غاذان سے کچھ دیر کچھ نہیں بولا گیا۔وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''کوئی پاگل نہیں ہوتا جو جانوروں کا ڈاکٹر بنے۔انسانیت کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے اور جب آپ پہ اس انسانیت کے قتل کا الزام لگایا جائے تو آپ کو اپنے پیشے سے نفرت ہو جاتی ہے۔میں

نے گھوڑوں کو نہیں مارا۔ آپ گواہ ہیں۔ خدارا مجھے اس الزام کے ساتھ یہاں سے مت بھیجیں۔ میں خود سے آنکھیں نہیں ملا پاؤں گی۔"

"عبادہ....." بہت دور بادل زور سے گرجے تھے۔

"بس کر دیں..... مجھے لگا آپ اس وقت میرا ساتھ دیں گے۔ آپ تو میرے ساتھ تھے ناں؟ آپ کو لگتا ہے میں ایسا کر سکتی ہوں؟ ایک ڈاکٹر کبھی اپنے مریض کی جان نہیں لیتا۔"

"میں خان جی کو بتا چکا ہوں۔ اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے مگر اس وقت ان کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ ہر اس چیز کو نکال باہر کریں گے جس کی وجہ سے ان کے گھوڑے مرے۔ وہ کسی کی سچائی اور اچھائی کو اس وقت نہیں دیکھنا چاہتے اور آپ ان کو ایسا کرنے دیں عبادہ۔ یہ آپ کے لیے اچھا ہوگا اور ان کے لیے بھی۔ کیوں کہ کم از کم میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اتنی دور سے آئیں اور یہاں سے ہزیمت لے کے جائیں۔ خان جی اس وقت بہت پریشان ہیں۔ وہ غصے میں کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے ہم سب شندور کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ سب نارمل ہو جائے اور ان کا دماغ تھوڑا جگہ پہ آ جائے۔"

وہ اپنی وضاحت دے رہا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔

"جانتے ہیں علاج کے دوران سب سے زیادہ ضروری کیا ہوتا ہے؟" عبادہ نے آہستہ سے کہتے ہوئے سوالیہ نظروں سے غاذان کو دیکھا۔ غاذان کے چہرے پر الجھن ابھری۔

"تعاون..... مریض کا ڈاکٹر کے ساتھ..... اٹینڈنٹس کا ڈاکٹر کے ساتھ..... نرسز کا ڈاکٹر کے ساتھ....." کہتے کہتے وہ لمحے کو چپ ہو گئی پھر جو بولی تو آواز میں شکوہ تھا۔ "لیکن آپ لوگوں نے میرے ساتھ ذرا بھی تعاون نہیں کیا۔"

"اختیارات میرے ہاتھ میں آنے دیں۔ میں پورا تعاون کروں گا۔"

''اب کیا فرق پڑتا ہے؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ بلاوجہ اپنی توانائی ضائع مت کریں۔'' وہ زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ گل پیچھے ہٹ کے کھڑی ہوگئی۔

''عبادہ! بات سنیں.....'' وہ پیچھے لپکا.....ایک دو قدم.....لیکن وہ ایک ایک سیڑھی چھوڑتی اوپر چلی گئی۔ وہ رو نہیں رہی تھی۔ اس کا دل کھنچ گیا تھا۔ غاذان سیڑھیوں کے ساتھ بے بس سا کھڑا رہ گیا۔ وہ روتی بلکتی، آنسو چھپاتی کمرے میں جا گھسی۔

☆.....☆.....☆

نمازِ ظہر کی ادائیگی کے لیے شاہی مسجد کی طرف سرداروں کا قافلہ جا رہا تھا۔ چار گاڑیوں میں اگلی پچھلی سیٹوں پر سردار براجمان تھے اور دو گاڑیاں جن میں ایک آگے جا رہی تھی اور ایک پیچھے ان میں مسلح گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ غاذان اور یوسف خان کی گاڑی تیسرے نمبر پر تھی۔ وہ دونوں پچھلی نشست پر فاصلہ رکھ کے بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی سیٹ پہ ڈرائیور کے ساتھ ایک گارڈ بیٹھا ہوا تھا۔ غاذان فون پہ انگلی سے کچھ سکرول کر رہا تھا جب کہ یوسف خان تندرست ہاتھ کی انگلیاں بے چینی سے مروڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر کرخت تاثرات کے ساتھ ساتھ دبہ دبہ غصہ بھی تھا۔ گاڑی شاہی مسجد کی سڑک پہ چڑھی تو انہوں نے پہلو سے ایک نیلے رنگ کی فائل نکال کے غاذان کی طرف بڑھائی۔

وہ جو فون میں لگا تھا، فائل کو دیکھ کے ٹھٹک گیا۔

''یہ اس ڈاکٹر کو دکھا دینا.....میں نے اگر سخت بات کہی تو وہ شاید یقین نہ کرے۔'' وہ فائل پکڑانے کے بعد پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ غاذان نے الجھتے ہوئے فائل پکڑ لی، فون سیٹ پہ رکھا اور اسے کھولا۔ اندر سفید کاغذ پڑا تھا جس کے Header پر ایک بڑی لیبارٹری کا نام تھا۔ کاغذ کے عین درمیان کچھ عبارتیں لکھی تھیں۔

''یہ کیا ہے خان جی؟'' اس نے قدرے الجھن سے ان کو دیکھا۔

''مرے ہوئے گھوڑوں کی رپورٹس ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چونک گیا۔

''جو گھوڑے مرے ہیں، ان کو تمہاری معصوم اور بچگانہ ڈاکٹر (ایک طنز) نے ٹیکے لگائے تھے جو ان کے جسم میں زہر بن گئے اور وہ مر گئے۔ یہی لکھا ہے اس رپورٹ میں۔''

غاذان پر چترال کے پہاڑ آن گرے۔

''زہ.....زہر؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کورے کاغذ کی سیاہی، اپنے ہی لفظوں میں الجھ رہی تھی۔ وہ قدرے بے یقینی سے صفحے کو دیکھے گیا۔ عبادہ نے ٹیکے کب لگائے اور کس چیز کے ٹیکے تھے؟ اس نے بتایا کیوں نہیں؟

☆.....☆.....☆

اس کے لیے گاڑی جب آئی تب شاہی مسجد کے امام نے اذان کو ہوا کے لہروں پہ اٹھا دیا تھا۔ اس نے گردن میں لگے دوپٹے کو سر پر کر لیا۔ اس کے لیے ایک جیپ بھجوائی گئی تھی۔ چھوٹی سی چار لوگوں کی جیپ جوان چڑھائیوں پر ایسے چڑھ رہی تھی جیسے ٹینک چڑھتے ہیں۔ ایک بوڑھا ڈرائیور مہارت سے اسے چلا رہا تھا۔ وہ پیچھے بیٹھ کے احمد کو لمبا چوڑا میسج لکھ رہی تھی کہ یہاں وہ کس مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے اور شاید وہ کل آ جائے لہٰذا اس کا کمرہ صاف کیا جائے اور اگر اس نے وہاں ڈیرا جمایا ہے اور اس کی چیزوں کو چھیڑا ہے تو ان سب کو اپنی جگہ واپس رکھ دے، نہیں تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔

میسج ٹائپ کرتے ہوئے وہ کب شاہی مسجد پہنچ گئی، اسے پتہ ہی نہیں چل سکا۔

شاہی مسجد ایک اوسط مسجد تھی جو دریائے چترال کے بالکل کنارے واقع تھی۔ اس کی ساکھ

لاہور کی بادشاہی کی مسجد کی طرح تھی۔یعنی چاروں طرف سے دیواریں تھیں اور ایک بڑا سا دروازہ اندر کھلتا تھا۔شاہ بلوطی، فلک بوس سرد جس پہ نقش و نگاری ایسے خوبصورتی سے ہوئی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔

ڈرائیور نے اسے شاہی مسجد کے دروازے کے عین سامنے اتار دیا۔وہ باغ نما جگہ تھی جس کے آخر میں شاہی مسجد کے تین پیازی گنبد نظر آ رہے تھے۔وہ گاڑی سے اتری تو بے ساختہ گاگلز آنکھوں سے ہٹائے اور سر اونچا کر کے اس خوبصورت مسجد کو دیکھا جہاں سیاحوں کی بھیڑ سی لگی تھی۔ظہر کی اذان ہو چکی تھی جس کی وجہ سے نمازی وہاں سر پہ ٹوپی رکھے مرکزی دروازے پر جمع ہو رہے تھے۔

مرکزی دروازے تک ایک لمبی روش تھی جسکے گرد سفید رنگ کی ریلنگ لگی تھی۔اس ریلنگ کے دونوں اطراف گھاس کے قطعے تھے جن میں لمبے اور گھنے درخت اگے ہوئے تھے۔یہاں ایک ٹھنڈی سی چھایا گر رہی تھی۔وہ سرخ کپڑوں اور ہلکے دوپٹے میں ملبوس تھی۔انگریز سیاح اسے مسجد سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے۔یقیناً انہوں نے نمازیوں کی ذاتیات کا خیال کیا تھا۔

وہ قدم قدم مسجد کی طرف بڑھی۔اس کے اطراف سے کئی مرد گزر رہے تھے اور آج ضرورت سے زیادہ بھیڑ محسوس ہو رہی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ مرکزی دروازے سے اندر جاتی، کوئی یکدم اس کے سامنے آ گیا۔

وہ چلتے چلتے رک گئی۔

"مادام! یہاں سے ہٹ جائیں۔سردار آ رہے ہیں۔یہ جگہ خالی کریں۔" ایک لمبی داڑھی والا آدمی تیزی سے بولا۔

"میں ان سے....."

جب دروازے کے سامنے کئی گاڑیاں زن سے آ کے رکیں۔ باوردی گارڈ دھپ دھپ نیچے اترے اور ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیوروں نے اتر کے جھٹ سے گاڑیوں کے پچھلے دروازے کھولے۔ گاڑیوں سے معزز ہستیاں نیچے اتریں۔ ان کے لباس، لش پش انداز اور سر یا لگی گردنیں دیکھ کے عبادہ سمجھ گئی کہ وہی سردار ہیں۔ عبادہ دروازے کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ بس اس سے آگے وہی آدمی کھڑا تھا۔ وہ سب چلتے ہوئے اس سے آگے سے گزر کے مسجد میں داخل ہو گئے۔ غاذان نے ایک نظر اسے دیکھا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ وہ بھی اندر چلا گیا۔

وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اب باقی نمازی اندر جا رہے تھے۔ جگہ خالی ہو رہی تھی۔ وہ ریلنگ سے ہٹ گئی اور ایک طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد اسے اپنے سامنے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ غاذان تھا جس نے پینٹ کے پائنچے بالشت بھر فولڈ کیے ہوئے تھے اور سر پہ ٹوپی تھی۔ اس کے بازو اور چہرہ گیلا تھا یقیناً وہ وضو کر کے آیا تھا۔

''اس طرف آ جائیں.....'' وہ اسے عین راستے کے درمیان سے ہٹا کے بائیں طرف والے لان میں لے آیا جہاں کافی سیاح تصویریں اتار رہے تھے۔ غاذان کا چہرہ پرسکون نہیں تھا۔ وہاں اداسی تھی۔

''آ گئے ہیں تمہارے خان؟'' عبادہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ اس کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''آ گئے ہیں لیکن آپ کو پرسکون رہنا ہوگا۔ یہاں وہ اکیلے نہیں آئے۔ ان کے تمام بلتی دوست بھی آئے ہیں۔ یوں سمجھیں وہ اپنی عزت داؤ پہ لگا کے آئے ہیں اور اب سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' کہتے ہوئے غاذان نے گہری سانس خارج کر کے اسے پرامید نظروں سے دیکھا۔

''میرے کندھوں پہ اپنی عزت کا بوجھ ڈالنے سے قبل تم لوگوں کو ذرا سا بھی خیال نہیں آیا کہ میں کتنی دور سے آئی ہوں۔ میں علاج کر سکتی ہوں تو مجھے کس جرم کی سزا کے تحت یہاں سے بھیجا جا رہا ہے اور ادھر میرے ہسپتال کی ریپو خراب کرنے کی دھمکیاں بھی دی جا رہی ہیں۔ کیا کسی مریض کی موت ڈاکٹرز کی وجہ سے ہوتی ہے؟ اور اگر یہ بات ہے تو اب تک سارے ہسپتال زمانہ بدنام ہونے چاہئیں۔ ڈاکٹرز اور ہسپتال ''کوشش'' کی جگہ ہے ''بقا'' کی نہیں۔''

وہ پھر برس پڑی۔ سیاح رک رک کے اسے دیکھ رہے تھے۔ غاذان کو وہاں کھڑا رہنا اور معیوب لگ رہا تھا۔

''آپ یہیں رہیں۔ ابھی نماز ہو رہی ہے۔ کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے۔ میں جماعت کے بعد خان جی کو اکیلے میں لے جاؤں گا اور آپ کو بلا لوں گا۔ لیکن پلیز.....'' وہ لمحے بھر کو رکا۔ اس کی آنکھوں میں منت تھی۔ ''آپ ہنگامہ نہیں کریں گی۔ انہوں نے آپ کی بات سننی ہوئی تو تحمل سے بھی سن لیں گے اور نہ سننی ہوئی تو آپ جتنا چیخ لیں، وہ نہیں سنیں گے۔''

''تمہیں لگتا ہے میں یہاں سے ایسے ہی چلی جاؤں گی۔'' اس نے للکار کے اسے دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے حواس پہ اشتعال سوار تھا۔

''میں جماعت کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔'' وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا جتنا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں مسجد میں چلا گیا تو وہ بھی اعصاب ڈھیلے کر کے انتظار کرنے لگی۔

مسجد کے اسپیکر سے امامت کے کلمات بلند ہو رہے تھے۔ جو نمازی نماز سے رہ گئے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی چلتے ہوئے درختوں کے سائے تلے آن کھڑی ہوئی۔

وہاں سیاح میٹ بچھا کے کھانا نکال رہے تھے۔ یہاں چھوٹی سی پکنک منائی جارہی تھی۔ میٹ پہ مختلف لوازمات پڑے ہوئے تھے۔ انگریز سیاح گھٹنوں تک آتے شارٹس اور بغیر آستین والی جرسی شرٹس میں ملبوس تھے جب کہ ان کی خواتین نے مکمل کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مسجد کے ادب کے لیے عورتوں نے اپنے سکارف سر پہ کر رکھے تھے۔

شاہی مسجد ۱۹۲۴ء میں شجاع الملک نے بنائی تھی جو ایک دور میں اس علاقے کی سب سے بڑی مسجد تھی اور جہاں لوگ جوق در جوق نماز پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اب یہ مسجد ایک تاریخی ورثہ بن کے رہ گئی تھی جہاں نمازیں تو ہوتی تھیں لیکن اب یہاں سیاحوں کی تعداد نمازیوں سے زیادہ ہوتی تھی۔

وہ لان میں ٹہل رہی تھی۔ اسے اردگرد سے دلچسپی نہیں تھی حالاں کہ اس شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور مردہ جانوں میں زندگیاں دوڑ رہی تھیں۔ پرندے بھی آسمان پہ اڑ رہے تھے اور شاہی مسجد کی گنبدوں پہ موجود کبوتر بھی لان میں چگنے آتے اور پھر سے اڑ جاتے۔ یہاں کی فضا میں ایک الہامی سکون تھا۔ ایک قلبی اطمینان۔

نماز ہو چکی تھی۔ نمازی باہر نکل رہے تھے۔ جب رش ختم ہو گیا تو اس نے منیب خان کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا۔ وہ نیلی شلوار قمیص پہنے، شال کندھے پر رکھے، پیروں میں کھیڑیاں پہنے جن کے ہک کھلے ہوئے تھے۔ اس طرف آرہا تھا۔ اس کے قریب آ کے وہ رک گیا۔ ایک جاسوسی نظر یہاں وہاں ڈالی پھر اس کو دیکھا۔

''چلو مادام! پیچھے خان آپ کا انتظار کر رہا ہے.....'' منیب نے کہا۔ وہ اس کے تعاقب میں چل پڑی۔ وہ اسے سیدھا شاہی مسجد لے گیا۔ مسجد کے دہانے رک کے اس نے اپنے جوتے اتار دیے اور ننگے پیر مسجد میں داخل ہوئی۔ اس دہانے دروازے کے اوپر گنبد تھا اور یہ دیواریں جس قدر نقش و

نگار سے سجی ہوئی تھیں، دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نواب نے بنائی ہیں۔ مسجد کی سطح سفید سنگ مر مر کی تھی جن کی درمیانی لکیریں بہت واضح کھینچی گئی تھیں۔ سطح ٹھنڈی اور گرم بیک وقت تھی۔ جہاں چھایا پڑ رہی تھی وہ جگہ ٹھنڈی تھی اور جہاں دھوپ کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ وہ سطح دہک رہی تھی۔

مسجد کے سامنے، دائیں بائیں برآمدوں کی طرح راہداریاں تھیں جن کے پیچھے کمرے تھے۔ اس برآمدے کے ستون سبز رنگ کے تھے۔ وہاں ابھی تک نمازی موجود تھے۔ وہ منیب کے پیچھے چلتی مسجد کے صدر دروازے کے سامنے ایک مستطیل چھوٹے سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس طرف دریائے چترال کا شور بہت واضح سنائی دے رہا تھا۔

اسے دریا کے عین دہانے پر غاذان نظر آیا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہاں تین لوگ اور بھی تھے۔ ایک اونچی اور مضبوط شخصیت ہاتھ پیٹھ پہ باندھے، گردن اٹھا کے دریا کو دیکھ رہی تھی۔ اپنا مصنوعی ہاتھ انہوں نے پشت پہ باندھ رکھا تھا۔ وہ جز بز سی قریب آ گئی۔

''خان جی.....'' غاذان نے دھیرے سے ان کو مخاطب کیا۔ وہ آہستہ سے پلٹے۔ پیشانی تنی ہوئی تھی، جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں عجیب سا اشتعال تھا۔

''السلام علیکم۔'' وہ نروس ہوئے بغیر بولی۔

''وعلیکم السلام۔'' آواز انداز سے بھی زیادہ گمبھیر اور بھاری تھی۔ غاذان ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ پینٹ کے پائنچے ہنوز ویسے ہی اوپر تھے۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

''کرو.....'' وہ سرد مہری سے بولے۔ ان کے عقب میں دریائے چترال تک مسجد کی سیڑھیاں اتری ہوئی تھیں۔ شاید وضو کے لیے۔ دریا کا پانی ''شڑ شڑا'' بہہ رہا تھا۔ پیچھے آبادی تھی اور کہیں دور پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ نے مجھے واپس بھیجنے کا فیصلہ کیسے کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ میں کانٹریکٹ سے آئی ہوں۔ جب تک وہ پورا نہیں ہوتا۔ میں یہاں سے نہیں جاسکتی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔

یوسف خان نے نظروں سے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ ملازم آگے آیا، اپنے ویسکوٹ سے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ باہر نکالا اور عبادہ کی طرف بڑھایا۔

''یہ رکھ لو۔ تمہارے کانٹریکٹ کا دگنا پیسہ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

عبادہ کو لگا کسی نے زوردار تھپڑ مارا ہو۔ اس کی سفید آنکھوں میں یکا یک طیش اترا۔

''مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔'' اس نے لفافہ دور اچھال دیا۔ ''میں یہاں پیسے کمانے نہیں آئی تھی۔ میں علاج کرنے آئی تھی اور وہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''کل رات دو گھوڑوں کو مار کے تم نے اچھا علاج کیا ہے ڈاکٹرنی۔ شکریہ۔'' انہوں نے چوٹ کی۔

''کل رات گھوڑے میری وجہ سے نہیں مرے۔ کتنی بار بتاؤں؟'' وہ جھنجھلا گئی۔

یوسف خان کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ ''آپ نے ان دونوں گھوڑوں کو ٹیکے نہیں لگائے تھے؟''

عبادہ کا ماتھا ٹھنک گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟'' اس کے آنکھوں میں طیش اترا۔

''غاذان! سمجھاؤ انہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے رازدارانہ تحکم سے غاذان کو دیکھا۔ غاذان نے پہلو میں پکڑی فائل سے سفید کاغذ باہر نکالا اور بھاری قدموں سے ہوئے عبادہ کے پاس آیا، اس نے کاغذ آگے کیا۔ عبادہ نے الجھتے ہوئے کاغذ تھام لیا۔ غاذان تابعداری سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔

وہاں سفید قرطاس پر کالی روشنائی سے کچھ عبارتیں لکھی تھیں۔ انگریزی میں۔ بائیں سے دائیں

جاتی ہوئیں، ایک لمبا پیرا تھا۔ وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی، دل بے یقینیوں میں گرتا گیا، اپنا آپ، ایک گڑھے میں گرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ دبی دبی چلائی۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''کیا آپ نے گھوڑوں کو ٹیکے لگائے تھے؟'' انہوں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں مگر وہ.....''

''آپ کو بیماری معلوم تھی جو آپ نے ٹیکے لگائے؟''

''میں نے.....وہ.....'' وہ منمنائی۔

''معلوم تھی یا نہیں؟'' یوسف خان غرایا۔ ان کے ساتھ کھڑے ملازم گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ دور کہیں درختوں میں موجود پرندوں کی ڈار اڑی تھی۔ اس کا دل حلق کو اچھلا لیکن خود کو کمپوز کیا اور دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر آپ نے ٹیکے کیوں لگائے؟''

''لیمنس کے ٹیکے تھے وہ.....وہ گھوڑوں کو کچھ نہیں کرتے۔'' جواباً وہ تیزی سے بولی۔

''پھر میرے وہی گھوڑے کیوں مرے جن کو آپ نے ٹیکے لگائے تھے؟'' انہوں نے دوبدو پوچھا۔

''میں نہیں جانتی لیکن یہ کاغذ جھوٹ ہے۔'' اس نے کاغذ نمائشی انداز میں لہرایا۔ ''اس میں جو لکھا ہے غلط لکھا ہے۔ لیمنس کے ٹیکے کسی بھی گھوڑے کو کچھ نہیں کرتے۔''

''وہ لیمنس نہیں۔ زہر تھا۔ آپ چاہے جو کہیں مادام۔ آپ نے زہر کے ٹیکے لگائے ہیں۔''

''میں کیوں زہر کے ٹیکے لگاؤں گی؟'' وہ حواس باختہ ہوگئی۔ ''مجھے افسوس ہو رہا ہے خان صاحب۔ آپ اپنی غلطی نہیں دیکھ رہے۔ آپ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ میں اس صحت جرم کو

درست نہیں مانتی۔آپ اس طرح مجھ پہ الزام نہیں لگا سکتے۔'' وہ سخت لہجے میں بولی۔آنکھیں ہزیمت سے بھر گئی تھیں۔

یوسف خان نے گہری سانس لی۔وہ یہاں کوئی شور ہنگامہ نہیں کر سکتے تھے۔یہاں ان کے ساتھ بلتی مہمان میں تھے۔وہ عبادہ کو زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔اس لیے بات ختم کرنے کے لیے وہ مصلحت بھری آواز میں کہنے لگے۔

''آپ ابھی بچی ہیں۔ناسمجھ ہیں۔نابالغ ہیں۔آپ کو مزید مشق کی ضرورت ہے۔جب میں نے طارق سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ ایک قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر کو بھیج رہا ہے۔مجھے لگا کہ واقعی کوئی ایسا ہوگا جو اس نے اتنے پختہ یقین سے کہا ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ آپ تو ایک لڑکی ہیں جس کی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال ہے۔مجھے مایوسی ہوئی۔میں نے طارق کو فون کیا کہ اس نے کس کو بھیجا ہے۔اس نے آپ پہ پورا اعتماد ظاہر کیا تو مجھے بھی تھوڑی تسلی ہوئی لیکن آپ نے.....'' ان کی آہستہ آواز دب گئی۔''مایوس کر دیا۔اب تک گھوڑے زندہ تو تھے۔مجھے تھوڑی ہی سہی۔امید تو تھی کہ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن آپ نے میری امیدوں پہ پانی پھیر دیا ہے۔اب میں مزید خطرہ مول نہیں لے سکتا۔آپ گھوڑوں کا علاج چھوڑ دیں۔''

یہ بات سچ تھی کہ اسے بیماری مکمل معلوم نہیں تھی لیکن وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی، یہ بات بھی غلط تھی۔اس کے علاج کی مثال ایسی تھی کہ بخار والے مریض کو درد کم کرنے کے لیے پینڈول دی جائے۔اب پینڈول سے کس کی موت ہوگی؟ لیکن یہاں اس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے ثبوت نہیں تھے اور جن سے وہ ثابت کر سکتی تھی (یعنی ٹیسٹ اور تھیراپی) تو وہ سہولیات بھی نہیں تھیں۔اگر ہوتیں تو وہ اس مقام پہ آتی؟ اس کے تجربے پہ سوال اٹھتا؟

''میں نے بہت چاؤ، بہت مان، بہت لگن اور بہت ذمہ داری سے گھوڑوں کا علاج کیا ہے۔

میں نے سارے سارے دن گزارے ہیں ان کے پاس اور آپ لوگوں نے میری نیت اور میرے ارادوں پہ اتنا گھٹیا شک کیا، مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ میں لا کر دیتی ہوں وہ ٹیکے آپ کو۔ آپ کسی بھی ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ وہ لیمنس کے ٹیکے تھے۔ صرف لیمنس کے۔'' عبادہ کا وجود بکھر گیا۔ اتنی شرمندگی اسے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج یہاں، ان کے سامنے ہو رہی تھی۔

''وہ جس بھی بیماری کے ٹیکے تھے، آپ کو اس وقت تک نہیں لگانے چاہئیں تھے جب تک آپ کو ان گھوڑوں کی بیماری معلوم نہ ہو جاتی۔ بیماری جانے بغیر آپ نے خود سے جو ٹیکے لگائے، انہوں نے ان کی جان لی ہے۔''

''کیا معلوم وہ اس بیماری سے مرے ہوں جو پچھلے ایک ماہ سے ان کو ہے۔'' وہ تیزی سے اپنے دفاع میں بولی۔

''اگر ایسا ہوتا۔'' وہ ایک قدم آگے آئے اور تیز چبھتی نظروں سے عبادہ کو دیکھا۔ ''تو باقی چار کیوں بچے؟ مادام ویٹرنری؟''

عبادہ خاموش ہو گئی۔ یوسف خان کی بات ٹھیک تھی، جب سارے گھوڑے ایک رات، ایک مقام پر اس بیماری کا شکار ہوئے تھے تو تین دن پہلے، وہ دو گھوڑے ہی کیوں مرے؟ اصولاً تو سب کو مرنا چاہیے تھا۔

''کک..... کیا معلوم ان کی امیونٹی ہی اتنی..... ہو۔'' اس نے کمزور سا جواز پیش کیا۔

''ہونہہ..... امیونٹی..... مطلب اپنی غلطی چھپانے کے لیے بچی آپ اب ہمیں بے وقوف بنانا چاہتی ہیں؟'' انہوں نے سر کو خم دیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ برا مان کے تیزی سے بولی۔ ''میں گھوڑوں کو ہسپتال لے کے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے ان کی بیماری بہت موذی لگتی ہے۔ اگر آپ نے ان کو یہاں رہنے دیا تو یہ وقفے

وقفے سے مرتے چلے جائیں گے۔کوئی بھی ویٹ آ کے ان کو ٹھیک نہیں کر سکے گا۔"

یوسف خان کے ماتھے پر بل پڑے۔

"گھوڑے یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔" ان کا انداز دوٹوک تھا۔

"پھر علاج کیسے کریں گے آپ؟" عبادہ نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔ہوا سے اس کا دوپٹہ اڑ کے کندھوں پہ آ گیا تھا۔"یہاں ایک ویٹ کیا کیا لے کے آ سکتا ہے؟ پورا ہسپتال تو آپ لانے سے رہے۔کنویں کو پیاسے کے پاس کب تک لے کے جائیں گے؟ بتائیں مجھے؟"

"اس کی فکر آپ نہ کریں۔ہم....."

"میں ہی کروں گی۔" اس نے درشتی سے بات کاٹی۔"میں ہی فکر کروں گی خان صاحب۔ مجھے لگا تھا پہلے ویٹس بے وقوف ہیں جو انہوں نے ٹیسٹ نہیں کرائے اس لیے وہ چلے گئے۔مگر کل پتہ چلا کہ آپ نہیں کرانا چاہتے تھے تو میں حیران رہ گئی۔گھوڑوں کو آپ اپنی عزت اور نام سے جوڑ دیں گے۔اس کا اندازہ نہیں تھا مجھے۔میرے لیے یہ بات ناقابل یقین ہے۔"

"آپ کے یقین کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔آپ مت کریں یقین،آپ گھوڑوں کا علاج چھوڑ دیں۔" وہ قطعیت سے بولے۔

"میں ان کا علاج کرنا چاہتی ہوں کیوں کہ میرے لیے وہ گھوڑے اور ان کی زندگی عزیز ہے ۔" وہ لجاجت سے بولی۔غاذان نظریں جھکائے سن رہا تھا۔

"آپ کے لیے گھوڑوں کی زندگی عزیز ہوتی تو ان کی جانوں کا خطرہ لیتیں آپ.....؟"

عبادہ لب کاٹنے لگی،اس نے تجربہ ضرور کیا تھا لیکن وہ تجربہ پورے علم میں لا کر کیا تھا۔ایک ان پڑھ اگر کسی بیمار کو پینڈول دیتا ہے،تو ان پڑھ یہ جان کر دیتا ہے کہ یہ پین کلر ہے۔عبادہ کو بیماری معلوم نہیں تھی لیکن اسے اتنا یقین تھا کہ لیمنس اگر ہوا تو گھوڑے ان ٹیکوں سے ٹھیک ہو جائیں گے

اور اگر نہیں ہوا تو بھی یہ دوائی ان پر برا اثر نہیں کرے گی۔

''سر.....'' مصلحت سے کہتی وہ قریب آ گئی، پیچھے شاہی مسجد کے کبوتر اڑ رہے تھے۔ آسمان میں دور دور تک بادل چھائے ہوئے تھے۔

''لیمنس کے ٹیکوں سے گھوڑوں کی جان نہیں جاتی۔ یقین کریں۔ میں کم عمر ضرور ہوں لیکن میں نے اپنے کریئر کے سات سال انہی گھوڑوں کا علاج کیا ہے۔ میں نے ہر طرح کے گھوڑے، ہر طرح کی بیماری کا تجربہ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ کے گھوڑوں کو کیا ہوا ہے۔''

یوسف خان کی آنکھوں میں حیرت سی ابھری۔

''آپ کے گھوڑوں کو سلیبرل اٹیزیہ ہوا ہے۔ یہ ساری نشانیاں سلیبرل اٹیزیہ کی ہیں۔ اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم ہسپتال جا کر ان کے ٹیسٹ اور علاج شروع کر دیں گے۔'' اس نے پر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔

''آپ کو بیماری پتہ چل گئی ہے؟'' انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں۔ مگر میں اور میری ٹیم کو لگتا ہے کہ یہی بیماری ہے۔ ان کو۔'' وہ ہلکے ہلکے الجھن سے بولی۔

''بیماری ہے یا نہیں ہے؟'' انہوں نے دوٹوک سوال کیا۔

''ہمارا اندازہ ہے کہ یہ.....''

''مادام! آپ کے اندازے نے پہلے ہی دو گھوڑوں کی جان لے لی ہے۔ ہم آپ کے اندازے پر نہیں چل سکتے۔ ہمیں سپاٹ سا جواب دیجیے۔ گھوڑوں کو یہ بیماری جو آپ بتا رہی ہیں یہ ہے یا نہیں ہے؟ بس۔'' انہوں نے قطعیت سے پوچھا۔

''ہمیں گھوڑے ہسپتال لے جانے.....''

''گھوڑے ہسپتال نہیں جائیں گے۔'' انہوں نے رکھائی سے اس کی بات کاٹی۔

''آپ کو لگتا ہے کوئی ایسا ویٹ آئے گا جس کا تعلق کوہ قاف سے ہوگا اور وہ اپنے سلیمانی قالین پہ بیٹھ کے یہاں آئے گا اور گھوڑوں پہ جادوئی چھڑی گھما کے کہے گا ''ٹھیک ہو جا'' اور آپ کے گھوڑے دھنا دھن دوڑنے لگیں گے؟'' عبادہ تیورا گئی۔

''مادام! مجھ سے بحث مت کریں۔ آپ نے دو گھوڑوں پر تجربہ کر کے انہیں مار دیا ہے۔ ہمارے لیے یہی نقصان بہت تھا۔ اب آپ مہربانی کریں۔ یہاں سے جائیں، ہم کوئی اور ڈاکٹر لے آئیں گے۔''

عبادہ گھائل انداز میں مسکرائی۔

''میرا کیا ہے خان صاحب۔ گھوڑوں سے دور کیا رہنا، میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ میرے پاس میرے مریض بہت ہیں۔ آپ پیسوں کی بات کرتے ہیں۔ میرا بھائی بزنس مین ہے۔ ہم اتنے غریب نہیں کہ چند پیسوں کے لیے لاہور سے چترال کا سفر کریں اور آپ شاید اس بات پر یقین نہ کریں لیکن یہ سچ ہے کہ میں اپنی فیملی سے لڑ کر یہاں تک آئی ہوں۔ میرا باپ بھائی اس کے حق میں نہیں تھے لیکن میں نے منت کی، سماجت کی، مار کھائی۔ کوئی دوسرا ویٹ آپ کے لیے اس حد تک نہیں جائے گا۔ میں آپ کو اپنے احسان نہیں گنوا رہی۔ میں بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ پلیز۔ یہ انا اور یہ ضد چھوڑ دیں۔ گھوڑے مر جائیں گے تو یہ انا کس کام آئے گی؟ کل رات دو مر گئے ناں؟ کیا ملا آپ کو ان سے؟ کچھ نہیں۔ سوچیں۔ تحمل سے سوچیں آپ کیا کر رہے ہیں؟''

وہ رسان سے کہتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

''جب کہ آپ اس عزت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جو دوسروں کے ہاتھوں میں دے کے آپ اس امید پر بیٹھے ہیں کہ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ اس کو برقرار رکھیں گے۔ عزت دینے والا اللہ ہے۔ انسان نہیں۔ اگر انسان عزت دے سکتا تو سب ہی بادشاہ ہوتے۔ کوئی فقیر نہ

ہوتا۔اس لیے اپنی توانائی دوسروں پہ ضائع نہ کریں۔بیماری کسی کو بھی ہو سکتی ہے۔میرے بعد جو آئے گا وہ بھی یہی شکایت کرے گا کہ گھوڑوں کو ہسپتال لے کے جائیں۔تب آپ اس کو بھی بھیج دیں گے لیکن کب تک ایسا کریں گے؟ کتنے ڈاکٹرز کو واپس کریں گے؟ گھوڑے میرے ٹیکے سے بھلے نہ مرے ہوں لیکن ایسے بیٹھے بٹھائے مر جائیں گے۔آپ کے یہ گھوڑے بہت قیمتی ہیں۔ان کی قیمت کروڑوں میں ہے۔آپ خود کو کروڑوں کا نقصان دیں گے؟ چلیں پیسوں کی کمی نہیں ہوگی آپ کو لیکن اس خواری، اس اذیت اور اس کوشش کا کیا جو مہابت خان اور آپ کے ملازموں نے کی ہے؟ جنہوں نے ان چھوٹے سے گھوڑوں کو پال پوس کے بڑا کیا۔مہابت خان وہاں بخار میں تپ رہا ہے۔کہہ رہا ہے کہ آپ لوگوں کو فرق نہیں پڑتا۔آپ لوگ گھوڑوں پہ فراغت میں سوار ہونے والے لوگ ہیں۔لیکن اس کا کیا؟ اس نے تو بچوں کی طرح پالا تھا۔اس کا نقصان اور اس کے غم کو کونسا گھوڑا ریپلیس کرے گا؟"

عبادہ نے باری باری سب کو دیکھا۔

"ہم دوسرا ڈاکٹر ڈھونڈ لیں گے۔آپ اب گھوڑوں سے دور رہیں گی۔میں آپ کو شندور دیکھنے کی دعوت دیتا ہوں لیکن اگر آپ نہیں دیکھنا چاہتیں تو آپ چلی جایئے گا۔میں ٹکٹس بھجوا دوں گا۔"

"پھر مجھے بھیجنے والی بات....." اس کا جی بھرا گیا۔

"عبادہ....." غاذان اس کی طرف بڑھا۔"آئی ایم سوری۔"

"فار وہاٹ؟" اس نے متورم آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔"آپ کیوں سوری کر رہے ہیں۔انہوں نے صرف میری تضحیک نہیں کی، آپ کی کی ہے کیوں کہ آپ مجھے لائے ہیں۔یہ میری نالائقی نہیں ہے، آپ کی نالائقی بھی ہے۔آپ کو پہچان نہیں اچھے ڈاکٹرز کی؟ آپ نہیں لا سکتا لافانی قوتوں والے ڈاکٹرز جو منتر پھونک کر مریضوں کو ٹھیک کرتے ہوں؟"

''آئی ایم ریلی سوری۔ مجھے نہیں پتہ، یہ کس نے کیا ہے۔ ٹرسٹ می۔'' وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔

''جس نے بھی کیا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ میری بے عزتی تو ہوگئی ناں؟ جھوٹی رپورٹس لا کر آپ لوگوں نے میرے تجربے، میری ڈگری اور میری صلاحیتوں پر سوال تو اٹھا دیا ہے ناں؟ یا نہیں؟'' وہ گلہ کرنے والے لہجے میں بولی۔ گلا رندھ رہا تھا۔

''میں پتہ کرتا ہوں کس نے یہ کیا ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور غاذان کو چھوڑ کے آگے آئی۔ ''آپ نے میری خدمت کی۔ میری مدد کی۔ شکریہ۔ میں مشکور ہوں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا میں نے ان گھوڑوں کو نہیں مارا۔ میں نہیں جانتی کس نے آپ کو یہ بات کہی ہے لیکن جس نے بھی کہی۔ اس کے مفاد بالکل بھی مثبت نہیں ہیں۔'' وہ بتانے لگی۔ ''ایک لڑکی جو لاہور سے پہلی بار چترال آئی۔ پہلی بار اس علاقے، اس کے لوگوں سے ملی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس نے اپنے مفاد کے لیے گھوڑوں کو مارا۔'' وہ استہزائیہ انداز سے ہنسی۔ ''کونسا مفاد ملا مجھے؟ کیا..... کیا حاصل کر لیا ہے میں نے یہ سب کر کے؟ بتائیں مجھے؟''

یوسف خان گہری گہری سانسیں خارج کر رہا تھا۔

''خان صاحب۔ میرا آپ کو مشورہ ہے۔'' اس نے حلق سے زہر نیچے اتارا۔ ''بجائے اس کے آپ علاج پہ توجہ دیں۔ آپ اس بات کی کھوج لگائیں کہ گھوڑوں کو یہ بیماری ہوئی تو ہوئی کیسے؟ میرے خیال سے آپ کو علاج سمجھ آجائے گا۔'' کروفر سے کہتی پلٹ گئی پھر جاتے جاتے رکی۔ ''اور ہاں..... دوسرا جو بھی ویٹ آئے گا۔ اس کے آنے سے پہلے یہاں ایک ویٹ ہسپتال (اس نے انگلیوں پر گنا) ایک لیبارٹری اور ایک فارمیسی بنا دیجیے گا۔ اس کو آسانی ہوگی۔''

وہ ان پہ تنفر بھری نظر ڈال کے پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے اس کا دوپٹہ زمین چھو رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی

پشت سے آنسو صاف کر رہی تھی۔ سفید کاغذ کی جھوٹی رپورٹ غاذان کے قدموں میں مٹی سے اٹ چکی تھی۔ اس کی آواز وہاں کھڑے ہر فرد کو کئی ساعتوں تک سنائی دی تھی۔ پلٹ پلٹ کے، گونج گونج کے۔ جیسے ضمیر کی آواز ہو۔ غاذان نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا ور مٹی صاف کی پھر اسے فائل میں رکھا اور مڑا۔

یوسف خان دو انگلیوں سے پیشانی سہلا رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ''گھوڑے اب ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اگلے ہفتے شندور ہے۔ ہم خسارے میں جا رہے ہیں۔''

''خان جی!'' غاذان کو لگا ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ بے چینی سے ان کے قریب ہوا۔

''تم اب اس بدنامی کا سدباب کرو۔ کچھ کرو کہ یہ مصیبت ٹل جائے۔ ہم بلتیوں کے سامنے رسوا نہ ہو جائیں۔'' وہ بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ان کے اونچے شانے سکڑ گئے تھے۔

''خان جی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔''

''مجھے تسلی دو غاذان کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ بہت ٹوٹ گئے تھے۔

غاذان نے ان کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا خان جی۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ اس طرح تو آپ خود کو بیمار کر دیں گے۔ پلیز اپنی صحت کی پرواہ کریں، باقی معاملات میں دیکھ لوں گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا ناں؟'' بڑی ہی کمزور تسلی مانگی۔

''ان شاء اللہ..... بھروسہ کریں مجھ پر.....''

وہ گھائل انداز میں مسکرائے۔ ''تم پر ہی تو بھروسہ ہے میرے بچے۔'' انہوں نے نرمی سے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔ ''تم تو میری ڈھال ہو۔ تم نہ ہوتے تو آج میں بلتیوں کے سامنے سینہ تان کے کھڑا نہ ہوتا۔ یہ تمہاری دلیری ہے جو مجھے ہر بار خود پہ فخر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔'' انہوں نے اس کے

شانوں کے گرد ہاتھ حمائل کرتے ہوئے کہا۔ غاذان تکان سے مسکرادیا۔

☆.....☆.....☆

عصر کا وقت تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر نارنجی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ سرد مگر مدھم ہوا کی لہروں پر پرندے اڑتے ہوئے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس کی جیپ ایون کی کھنڈل سڑکوں پر چل رہی تھی۔ ڈرائیور بیک ویو میں اس کو روتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

وہ ٹوٹ چکی تھی۔ بکھر چکی تھی۔

یہاں سے جانا اس کے لیے ناکامی نہیں تھی، ایک شکست تھی۔ وہ میدان جنگ میں لڑے بغیر ہار مان کے واپس آنے والی وہ سپاہی تھی جس کے لیے اس کا قبیلے دروازوں میں ہار لیے نہیں کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے۔ وہ اس پر تھوک رہے تھے۔ اس کو کوس رہے تھے۔ اسے احمد کی آواز اپنی پشت پہ سنائی دی۔ وہ اس پہ ہنس رہا تھا۔ اس کے ہسپتال والے اس کو بزدل بزدل کہہ رہے تھے۔ وہ لاکھ صفائیاں دے رہی تھی لیکن وہ نہیں مان رہے تھے۔ مسجد سے حویلی تک کا سفر اس نے ایسے کیا جیسے پیروں میں بیڑیاں لگی ہوں اور یہ بیڑیاں اس کے گوشت میں چبھ رہی تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔

اماں ابا کی شدت سے یاد آرہی تھی اور خود پہ بے حد غصہ بھی۔ اگر وہ روک رہے تھے تو عبادہ کو رک جانا چاہیے تھا۔ اسے بات مان لینی چاہیے تھی۔ ماں باپ خدا نہیں ہوتے لیکن پتہ نہیں کیوں ہر بار مستقبل کی صحیح پیش گوئیاں کر لیتے ہیں۔ کیوں ہمارے ساتھ ہر بار وہ جاتا ہے جس سے وہ ہمیں بچنے کی ترغیب کرتے ہیں؟ وہ نازوں اور لاڈوں میں پلی لڑکی تھی۔ اس نے کبھی دنیا کی ٹھنڈی بے رحمی کا سامنا نہیں کیا تھا۔ سر طارق سے لے کر کمیونٹی کی جان پہچان والی لڑکیوں تک، سب کے لہجے عبادہ کے ساتھ نرم اور مدھم ہی تھے۔ مرد غراتے بھی ہیں، ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں اور مجبور بھی کر سکتے

ہیں، ان سب باتوں سے وہ پہلی بار آشنا ہو رہی تھی۔

وہ احمد کا شمار دنیا کے ظالم لوگوں میں کرتی تھی لیکن ظالم کیسے ہوتے ہیں، اسے یہاں آ کر پتہ چلا تھا۔ یہاں کی عورتیں کس طرح مشینوں کی طرح کام کرتی ہیں اور یہاں کے مرد کس طرح اسلحے کی نمائش کر کے اپنی طاقت اور غرور کی نمائش کرتے ہیں، اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

شاہی مسجد سے حویلی تک کا فاصلہ پینتالیس منٹ کا تھا۔ ان پینتالیس منٹوں میں ایک دفعہ بھی اس کے آنسو سوکھ نہ پائے تھے۔ حویلی پہنچ کر اس نے تیزی سے آنسو پونچھ لیے۔ وہ کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس پر کیا قیامت گزر رہی ہے۔ اس نے آنکھیں اتنی سختی سے دبائیں کہ بچے ہوئے سارے آنسو نچوڑ لیے۔

اپنے کمرے میں آئی تو اسے گل ملی جو صوفے پہ آڑی ترچھی لیٹی، ایک ہاتھ پہ پلیٹ رکھے، دوسرے ہاتھ میں کانٹا پکڑے، آم کے چکور ٹکڑے کھا رہی تھی۔ کتاب اس کی گود میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ پڑھتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ عبادہ کو آتا دیکھا تو مسکرائی۔

''خیریت؟ اتنی جلدی آ گئیں؟''

''ہاں..... میرا کام ختم ہو گیا ہے۔'' وہ تکلف سے مسکرائی۔

''اوہ..... گڈ.....'' گل نے تحسین بھرے انداز میں کہا۔ عبادہ خود کو کھینچتی ہوئی بیڈ تک لائی، اپنا دوپٹہ ہٹا کے بیڈ پہ رکھا، فون چارج پہ لگایا۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔

''عبادہ! آپ نے کولڈ کمفرٹ فارم (Cold Comfort Farm) ناول پڑھا ہے۔ سٹیلا گیبون (Stella Gibbon) کتنا اچھا ہے۔ فلورہ کا کردار کتنے مزے کا ہے۔'' وہ خوشی سے کہہ رہی تھی جب کہ عبادہ کو کسی اور چیز کی ٹینشن تھی۔

''ہاں پڑھ لیا ہے۔'' وہ مختصر جواب دیتی واش روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر وہاں رہنے کے بعد اس

نے اپنے بیگ باہر نکالے اور کھینچتے ہوئے بیڈ تک لائی۔گل نے چونک کے اسے دیکھا۔عبادہ الماری میں لٹکے اپنے تمام کپڑے بھی باہر لے آئی تھی۔اب بیڈ پہ بیٹھ کے انہیں تہہ لگا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ پیکنگ کر رہی ہو یا مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے؟'' گل نے تذبذب سے پلکیں جھپکیں۔

''پیکنگ کر رہی ہوں۔'' عبادہ نے ٹھنڈی سانس لی۔گل نے یکدم ٹانگیں سمیٹیں اور جھٹ سے سیدھی ہوگئی۔پلیٹ میز پہ رکھی اور اس کے پاس آئی۔

''کیا مطلب؟''

''میرا وقت ختم ہوگیا ہے۔یوسف خان کوئی اور ڈاکٹر ہائر کر رہے ہیں۔'' اس نے کپڑوں کو بیگ میں رکھتے ہوئے سرسری سا کہا۔

''مگر کیوں؟ آپ تو ابھی ابھی آئی تھیں۔'' وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

''ابھی آئی تو ابھی جا رہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''ایک.....ایک منٹ.....'' گل پزل ہوئی پھر اس کے ہاتھوں سے کپڑے لے کے ایک طرف رکھے، بیگ کو پیچھے دھکیلا، اپنے لیے اس کے برابر میں جگہ بنائی اور اس کی طرف رخ موڑ کے بیٹھ گئی۔''اب بتاؤ۔کیوں جا رہی ہو؟''

عبادہ کو لگا جیسے کسی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہو۔وہ گل کی آنکھوں میں دیکھ کے خود کو سچ بولنے سے باز نہیں رکھ سکی، اس نے نم سی سانس کھینچی۔

''وہ.....'' ایک کڑوا گھونٹ نگلا۔آنکھیں نم ہوگئیں۔

''کیا ہوا ہے بتاؤ مجھے۔'' گل پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔

''گھوڑوں کے بارے میں حویلی میں کسی کو نہیں بتانا۔گل کو بھی نہیں۔'' کہیں سے غاذان کی آواز آئی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے خود پہ قابو کرتے ہوئے واپس کپڑے اٹھائے اور تہہ لگانے لگی۔

''کچھ تو ہوا ہے۔ اس رات غاذان گھبرایا ہوا آیا تھا اور آج تم جا رہی ہو۔ کچھ ہوا ہے کیا تم دونوں کے بیچ؟ کیا اس نے تمہیں جانے کا کہا ہے؟''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سمجھ لیتی، اس نے تیزی سے کہا۔

''پھر؟'' گل بے قرار تھی۔

''بس ایسے ہی۔ کانٹریکٹ ختم ہو گیا ہے۔'' وہ آنسو روک کے بولی۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا۔ اس وقت ایک کندھا چاہیے تھا جس پہ وہ اپنی بے عزتی اور اپنی تضحیک کے سارے آنسو نکال لیتی۔ اسے ایک نرم اور ایک گرم تھپکی کی ضرورت تھی۔ گل اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے تاثرات کو نارمل رکھنے کی سعی کر رہی تھی۔ ایک جوڑا تہہ کرنے کے بعد اس نے بیگ میں رکھ دیا پھر دوسرے کو اٹھایا تو گل نے ہاتھ تھام لیا۔

''عبادہ؟'' وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''آپ نے آخری بار جھوٹ کب بولا تھا؟''

عبادہ نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''آخری بار جھوٹ کب بولا تھا؟''

''میں جھوٹ نہیں بولتی۔'' اس نے خفگی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

''میں بتاؤں کب بولا تھا؟'' گل نے سنجیدگی سے کہا۔ عبادہ جھینپ گئی۔

''کک..... کب؟''

''اس رات کو جب میں نے پوچھا گھوڑے کیسے ہیں۔''

اس نے تیزی سے اسے دیکھا۔ ''میں نے سچ ہی کہا تھا۔'' وہ برا مان گئی۔

''بلاشبہ..... لیکن ہیرا پھیری کر کے..... یہ چھپاتے ہوئے کہ دو گھوڑے مر چکے ہیں۔''

اس کا تہہ لگا تا ہاتھ ہوا میں معلق ہو گیا۔ چہرے پر ایک رنگ سا گزرا۔

''مس عبادہ۔ مجھے سب پتہ ہے۔ یوسف خان جی نے آپ پر گھوڑوں کو مارنے کا الزم لگایا ہے اور.....'' وہ کھڑی ہوئی، سائیڈ میز کی دراز سے ٹکٹس نکالیں۔ ''یہ دیے ہیں، واپسی کے لیے۔''

گل کو اپنے کمرے میں آنے والی ہر نئی چیز اور جانے والی ہر چوری شدہ چیز کا ہمیشہ علم ہوتا تھا۔ اس کی نظروں سے کوئی نہیں بچ سکتا تھا۔ عبادہ نے نظریں چرالیں۔ ''میں نے گھوڑوں کو نہیں مارا۔''

''آف کارس تم نے نہیں مارا۔'' گل نے ٹکٹ میز پہ رکھے اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی، اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''ڈونٹ بی سلی۔ آئی نو کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ان فیکٹ، ان لوگوں کی دقیانوسی ہے جو بیماری کو عزت سے جوڑ رہے ہیں۔ کل کو کسی عورت کو یا مرد کو کوئی ذاتی پیچیدگی ہو جائے گی تب بھی یہ ایسے ہی کریں گے۔ میں نے بتایا ناں۔ یہ لوگ ایسے ہی ہیں، ان سے نہیں لڑا جا سکتا۔''

''ٹھیک کہتی ہو تم۔'' اس نے ٹھنڈی سانس نکالی۔ ''کہتے ہیں بچوں کو بدلنا مشکل ہوتا ہے مگر میں کہتی ہوں بڑوں کو بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کی مثال چھالدار درخت جیسی ہوتی ہے۔ سخت اور مضبوط۔ ان کی سوچ اور ان کے نظریات، اس چھال کے پیچھے ہوتے ہیں۔ اب چھال کو کون کاٹ سکتا ہے۔ بتاؤ مجھے۔''

''کوئی بھی نہیں۔ اس لیے چھوڑ دو ان کو ان کے حال پر۔'' وہ نخوت سے کہتی واپس پائنتی پر بیٹھ گئی۔

''میں لعنت بھیجتی ہوں ان پہ مگر مجھے گھوڑوں کی فکر ہے۔ یہ ہسپتال نہ لے کر گئے تو وہ مر جائیں گے۔''

''تو مر جانے دو۔ کسے فرق پڑتا ہے۔ انہی کا نقصان ہوگا۔'' وہ سفاکی سے بولی تو عبادہ نے

خفگی سے چپت اس کے سر پہ ماری۔

''مجھے فرق پڑتا ہے۔میں جانوروں کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔''

''کیوں؟ ڈاکٹروں کے سامنے بھی تو مریض مرجاتے ہیں۔''

''ہاں مگر کوئی ڈاکٹر کبھی نہیں چاہتا کہ اس کے مریض مریں۔'' عبادہ نے پچکار کے کہا۔گل نے لپک کر اس کا بازو پکڑا۔

''اچھا جانے دو۔مجھے تو تمہارا سوچ کے پریشانی ہو رہی ہے۔تم چلی جاؤ گی تو میرا کیا ہوگا؟'' وہ چہرہ اتارتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''مگر تم نے تو چترال دیکھا ہی نہیں۔شندور تک رک جاؤ پھر چلی جانا۔'' اس نے منت کی۔

''میری ٹکٹس نہ کٹتیں تو میں رک جاتی لیکن بدقسمتی سے تمہاری یہ حویلی مجھے یہاں رکھے گی نہیں۔اس لیے میں نے سوچا، چلے جاتے ہیں۔وہاں بھی ہسپتال میں لاکھوں مریض میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ سارے کپڑوں کو تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔وہ گل کو نہیں بتا سکی کہ اس کی کس قدر تضحیک ہوئی ہے۔اسے بے غیرت کہا گیا ہے۔کیا وہ واقعی بے غیرت تھی؟ نہیں۔وہ نہیں تھی۔وہ جائے گی۔ضرور جائے گی۔

وہ جھکی ہوئی تھی اور گل گردن اٹھا کے اس کو اداسی سے دیکھ رہی تھی۔

''پھر کب آئیں گی؟''

''پھر؟'' وہ تنفر سے ہنسی۔''کبھی نہیں۔''

''کیوں؟'' گل نے برا منایا۔

''چترال نے دل توڑا ہے۔شاید ہی آنے کی ہمت کر پاؤں۔'' وہ جبراً مسکرا کے کہتی بیگ کی

زپ بند کرنے لگی۔

''میں نے تو نہیں توڑا ناں۔ میرے لیے آجائیں۔''

''تمہاری شادی پہ آؤں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کی ٹھوڑی چھوئی اور بیگ کو ہینڈل سے پکڑ کے نیچے اتارا۔

''میں تمہیں مس کروں گی۔'' اس کی آواز بچوں سی رندھ گئی۔ عبادہ نے دیوار کے ساتھ بیگ ٹکایا پھر اس تک آئی، اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔

''غلط بات۔ تم مجھے نہیں، ان قصے کہانیوں کو مس کرو گی جو میں تمہیں ہر رات سناتی تھی۔'' وہ آنکھ دبا کے بولی۔

''نہیں۔'' وہ جھینپ گئی۔ ''آپ کی موجودگی نے اس کمرے کو آباد کر دیا تھا۔ میں اسے مس کروں گی۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر جانے کیوں دل میں ایک کمینی سی خوشی ناچ رہی تھی۔ اس کے جانے کا دکھ ہو رہا تھا لیکن غم نہیں تھا۔ کل شام غاذان کے ساتھ عبادہ کو دیکھ کے اسے بری طرح جلن ہوئی تھی اور اگر عبادہ چلی جائے تو یہ جلن اور یہ حسد ختم ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا مگر اگلے ہی لمحے خود کو بری طرح ملامت کیا۔ وہ اس کی دوست تھی، دوستوں کی نیتوں پر شک نہیں کرتے۔

''اووو.....'' عبادہ نے نرمی سے اسے گلے لگایا۔ ''اٹس اوکے۔ زندگی میں ایسے لوگ آتے رہتے ہیں، ان کا ساتھ مصنوعی ہوتا ہے۔ وہ چند دن کے لیے ہماری خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں اور پھر اپنی زندگیوں میں لوٹ جاتے ہیں۔ اس میں اداس ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ نرمی سے سمجھانے لگی۔

گلے بھرائے دل سے پیچھے ہوئی۔

''میں نے جانے انجانے میں آپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کے لیے سوری۔''

''کونسا دکھ؟'' عبادہ متحیر ہوئی۔

''وہ.....'' اس نے نچلا لب کاٹا۔ ''وہ.....اس رات.....اس رات.....صحن کی لائٹ میں نے آف کی تھی.....آپ کو ڈرانے کے لیے.....''

''کک.....کیا؟'' عبادہ کے دل پہ گھونسا پڑا۔ ''کیوں؟''

''اس کمرے میں سونے کے لیے۔'' اس نے نظریں چرائیں۔ ''یہ کمرہ میرا ہے۔آپ کے آنے سے پہلے بی جان نے آپ کے لیے خالی کروایا تھا۔میں ریشم کے ساتھ اس کے کمرے میں فرش پہ سو رہی تھی اور مجھے فرش پہ سونے سے نیند نہیں آتی۔یونو۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''اس دن جب آپ پہلی بار پانی لینے کے لیے اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ آپ حویلی سے ڈرتی ہیں۔اس لیے میں نے چھوٹی سی چال چل لی مگر آئی ایم سوری۔آئی ایم رئیلی ویری سوری۔مجھے نہیں پتہ تھا آپ اتنا ڈر جائیں گی۔''

''تو تم مجھ سے کہہ نہیں سکتی تھیں۔'' عبادہ نے گھما کے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔

''آؤچ.....'' وہ پیٹ پکڑ کے بیڈ پہ ڈھے گئی اور بری طرح سسکاری۔ ''ظالم۔''

''اچھا ہوا ہے۔'' عبادہ نے کشن اٹھایا اور اسے مارنے لگی۔ ''بدماغ لڑکی۔میں مر جاتی تو؟ میری قبر پہ وضاحتیں دینے آتی تم؟ کہ سوری عبادہ۔میں نے سوچا تھا تم روز ریزیڈنٹ ایول (Resident Evil) دیکھتی ہوگی۔تمہیں آہٹ، سایہ، کوئی ہے جیسے ڈراموں کا تجربہ ہوگا مگر تم تو.....مر گئیں۔''

''آئی سوئیر مجھے نہیں پتہ تھا آپ اتنا ڈر جائیں گی۔'' گل نے اس سے کشن لے لیا۔

''بدماغ لڑکی۔'' عبادہ بال جھٹک کے پیچھے ہوئی۔ ''ایویں کوئی تمہیں پاگل نہیں کہتا، تم واقعی پاگل ہو۔''

''آئی ایم سوری۔'' گل نے مسمسی آواز نکالی۔

''بھاڑ میں جاؤ۔'' وہ پیر پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''عبادہ۔'' وہ کشن پھینک کے اس کے پیچھے لپکی مگر وہ دھڑام سے دروازہ بند کر چکی تھی۔ باہر نیلگوں اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ فوارے والے لان میں اکیلی دائیں سے بائیں پنڈولم کی طرح ٹہل رہی تھیں۔ ایک ہاتھ پہلو میں تھا جس کی مٹھی وہ بار بار دبا رہی تھیں اور دوسرے سے فون کان سے جوڑا ہوا تھا۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ ان کی چند ملازمائیں اور دو چترالی خواتین قدرے فاصلے پر کھڑی تھیں، وہاں سے وہ ان کی آواز نہیں سن سکتی تھیں۔

''تم نے دیکھا اسے۔'' وہ نفرت سے پوچھنے لگیں۔

''ہاں دیکھا ہے۔ ابھی ابھی آیا ہے۔'' ان کے شوہر نے کوفت سے کہا۔

''تم نے اس کو دیکھ کیسے لیا۔ اس کے ٹکڑے کیوں نہیں کیے۔'' وہ دانت چباتے ہوئے بولیں۔

''کیوں کہ ہم دو سال پہلے صلح کر چکے ہیں عالیہ بیگم۔'' انہوں نے جتایا۔

''صلح کی ہوگی تم نے..... میں نے نہیں کی۔ مجھ سے میرے بھائی کی گونجتی ہوئی چیخیں نہیں بھولتیں۔ سمجھے تم۔''

''تو عادت ڈال لو ان چیخوں کی۔ اب وہ گھر بھی آئے گا۔ سلام بھی کرے گا اور کھانا بھی ساتھ کھائے گا۔''

''میں زہر دے دوں گی اسے.....''

''شکر ادا کرو، سرور خان نے اسے عاق کر دیا تھا ورنہ آج وہ تمہارے سینے پر سانپ بن کے لوٹتا

اورتم کچھ نہ کر پاتیں۔'' وہ تلخی سے بولے۔

''میں کروں گی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''خدا کا واسطہ ہے عالیہ بیگم۔ مجھ غریب پہ رحم کر لینا۔ یہاں ہم امن اور سلامتی کا پیغام دینے آئے ہیں۔ ایسا کچھ مت کرنا جس سے یہ بکھیڑہ دوبارہ بن جائے۔ بہت مشکل سے یہ گند سمیٹا ہے۔'' وہ منت آمیز لہجے میں بولے۔

''آپ جو بھی کہیں۔ میں اسے آزاد نہیں دیکھ سکتی۔'' انہوں نے ضبط سے کئی آنسو اندر اتارے۔ دور کھڑی خواتین بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ تمہیں جیسا مناسب لگے تم کرو۔ آخر میں دشمنی میں مرتے تو ہم مرد ہی ہیں۔ تم عورتوں کا کیا جاتا ہے۔'' انہوں نے بے رخی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

''ہمارا کیا جاتا ہے؟'' وہ فون نیچے کر کے بڑبڑائیں۔ دل پہ منوں بوجھ آ کے گرا۔ کیا جاتا ہے۔ سہاگ، رشتے، کلیجے، بریدہ سر لعل، کہاں جاتے ہیں کشت وخون میں لپٹے وہ باپ بھائیوں کے وجود؟ کون سہتا ہے ان کا غم؟ کون روتا ہے ان تار تار لاشوں پہ؟ حمزہ کی پہچان اس کی بہن نے انگوٹھی سے کی تھی۔ کون تھی وہ؟ بہن تھی ناں۔ بھائی کا چیرا ہوا سینہ اور کٹا ہوا کلیجہ کیسے دیکھا ہوگا؟ شہید کی بے حرمتی پہ کیسے ماتم کیا ہوگا؟

انہوں نے برداشت سے آنکھیں میچ لیں، کئی آنسو گال پہ لڑھک گئے تھے۔

''ہمارا کیا جاتا ہے؟'' جیسے خود پہ ہنس رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے کمرے میں شب خوابی کے کپڑے پہنے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کے، پیروں پر کمبل ڈالے، احمد کا میسج پڑھ رہی تھا جو اتنا لمبا تھا کہ اس نے فرصت سے ٹیک لگا دی۔

''عبادہ!

میری جان کیا کہہ رہی ہو تم؟ مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا۔تم وہاں اس سب سے لڑ رہی ہو؟ دیکھو۔اس سب کی قطعی ضرورت نہیں،تم واپس آجاؤ۔میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ نیا علاقہ ہے۔ وہاں کے لوگ تم سے مختلف ہیں لیکن تم نہیں مانیں۔مجھے یقین ہے اب سمجھ آگئی ہوگی۔میں طارق سے کہہ کے تمہاری ٹکٹ کرواتا ہوں۔تم گھر آجاؤ۔ان لوگوں کو علاج نہیں کروانا تو مت کروائیں۔ ان کو اپنے جانوروں سے زیادہ اپنی عزت کی پرواہ ہے تو تم بھی اپنا آپ ضائع مت کرو۔چھوڑ دو ان کو ان کے حال پہ۔ٹھیک ہے۔تم واپس آؤ بس۔''

اس نے گہری سانس لی۔یہ درخواست نہیں تھی،احمد کا حکم تھا لیکن وہ اسے کیا بتاتی تھی کہ اس کے کہنے سے پہلے ہی وہ واپس جانے کا ارادہ کر چکی ہے۔لہٰذا اس نے میسج پڑھ کر جواب دینے کی بجائے فون رکھ دیا۔میز پر اس کی ٹکٹ بھی پڑی ہوئی تھی۔اس نے دھیرے سے ٹکٹ اٹھائی اور اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور ریشم دندناتے ہوئے اندر آئی۔

''عبادہ.....تم جارہا ہے؟'' وہ حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

''ہوں۔''اس نے ہلکا سا سر ہلایا۔

''اتنا اچانک کیوں؟ابھی تو شندور میں بہت وقت ہے؟''

''میں شندور کے لیے تھوڑے ہی آئی تھی۔گھوڑوں کے علاج کے لیے آئی تھی۔وہ ہوگیا تو مجھے چلنا چاہیے؟نہیں۔'' وہ ٹکٹ واپس رکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

''لیکن شندور دیکھنے تک تو رک جاؤ۔'' وہ خلوصِ نیت سے کہنے لگی تو وہ ہلکی سی مسکرادی۔

''ضرور رکتی لیکن بھائی امریکہ جارہے ہیں۔لاہور میں اماں ابا اکیلے ہیں۔مجھے جانا ہوگا۔'' وہ فکرمند تھی۔

''کیوں؟ تمہارا ماں باپ بیمار ہے؟'' وہ تشویش سے کہتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''نہیں۔ اللہ کا شکر ہے ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''پھر معذور ہیں کیا؟''

''ریشم.....'' اس نے بچوں کی طرح پچکارا۔ ''کیسے باتیں کر رہی ہو؟ اللہ کا کرم ہے صحیح سلامت ہیں۔''

''کھانا شانا بنا سکتا ہے؟''

عبادہ نے گہری سانس خارج کی۔ ''وہ ٹھیک ہیں۔ سلامت ہیں۔ کھانا بنا لیتے ہیں۔ کھا لیتے ہیں۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں لیکن میں..... پھر بھی جاؤں گی..... سمجھیں.....'' عبادہ نے انگلی سے اس کی ناک چھوئی۔

''شندور دیکھتا جاؤ۔ پھر تم کب آئے؟'' وہ معصوم سی شکل بنا کے بولی۔

''ہوں۔'' عبادہ نے گال پہ ہاتھ رکھا۔ ''بات میں دم تو ہے لیکن کیا ہے ناں کہ میں ٹرپ پہ نہیں آئی۔ ان شاء اللہ اگلی بار بھائی کے ساتھ آؤں گی۔ تمہاری حویلی میں ٹھہروں گی اور شندور بھی دیکھوں گی۔ ٹھیک ہے؟''

''وعدہ؟'' ریشم نے ہاتھ آگے کیا۔

''ان شاء اللہ.....'' اس نے ہاتھ پہ ہاتھ کے نرمی سے کہا۔

''لیکن تم ایسے نہیں جا سکتا۔ ہمارا کچھ تحفے تحائف لے کے جاؤ۔ اپنا امی ابو کو دکھانا۔ میں ابھی پیک کر کے لاتا ہے۔ تم نے اتنا دیر سے بتایا میں کچھ سوغات ہی بنا لیتا۔'' وہ اپنائیت سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ریشم۔ میں پھر آؤں گی ناں۔ تب لے جاؤں گی۔ تم صبح سے

کام کر رہی ہو۔ بہت تھک گئی ہو۔ جاؤ جا کے آرام کرو۔"

"یہ کام روز کا ہوتا ہے۔ ہم اس کا عادی ہے۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔ میں جا کے لے کے آتا ہے۔ تم سونا نہیں اور دروازہ بھی بند نہیں کرنا۔ وہ گل خانہ خراب ایک بار دروازہ بند کر لے پھر کسی کے لیے نہیں کھولتا۔ وہ آئے تو بتا دینا۔ ٹھیک ہے؟" وہ تنبیہی انداز میں کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔" عبادہ نرمی سے بولی۔

ریشم اپنا آنچل سنبھال کے جیسے ہی باہر نکلی، سامنے سے آتی گل سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، وہ سینے سے وہی کیرم بورڈ لگائے آ رہی تھی۔

"دیکھ کے چلو ریشم۔" وہ پچکار کے کہتی اندر آ گئی۔ ریشم نے "ہونہہ" میں شانے جھٹکے اور باہر نکل گئی۔

وہ قدم قدم اس کے پاس آئی اور دو قدم دور کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا ہے؟" عبادہ نے ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسا کر پیٹ پہ رکھا۔

"پہلے آنکھیں بند کرو پھر بتاتی ہوں۔" گل نے دبے دبے جوش سے کہا۔ عبادہ نے گہری سانس لی اور آنکھیں میچ لیں۔ گل نے کیرم بورڈ کو گھمایا اور بینر کے انداز میں پکڑ لیا۔ "کھولو آنکھیں۔"

عبادہ نے پہلے ایک آنکھ کھولی، تعجب سے اسے دیکھا، دوسری آنکھ بجلی تیزی سے کھل گئی۔ کیرم بورڈ پہ ایک لڑکی کا چہرہ تھا جس کے سر پہ پھولوں والا تاج تھا۔ گل نے بڑی مہارت سے زعفرانی کھیت والی تصویر کو یہاں کندہ کیا تھا۔

"بیوٹی فل۔" وہ لحاف ہٹا کے کھڑی ہو گئی اور مسحور کن انداز میں اس تک آئی۔ "اٹس سو امیزنگ۔ گل۔ اٹس۔ اٹس۔ بیوٹی پریز۔" وہ جذباتی ہو گئی۔ گل کے ہاتھوں کا ہنر اور اس کی صفائی، لکڑی کے اس تختے پر محبت سے پھیلی ہوئی تھی۔

''پسند آیا؟'' وہ جیسے تبصرہ مانگ رہی تھی۔

''بہت زیادہ۔ بہت بہت بہت زیادہ۔'' وہ فرطِ جذبات سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

''یہ ایک تحفہ ہے تمہارے لیے۔ آفٹر آل آپ کو ڈرایا تھا۔'' گل نے نچلا لب کاٹ کے کہا۔

''یہ اس کے بدلے ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا پھر دفعتاً چہرے پر ہزیمت در آئی۔ ''مجھے نہیں ڈرانا چاہیے تھا تمہیں۔ تم نے سچ کہا۔ اگر میں تم سے کہہ دیتی تو تم مجھے کبھی منع نہ کرتیں لیکن میں نے عادت سے مجبور ہو کے تشدد والا رویہ اپنا لیا۔'' وہ واقعی شرمندہ تھی۔

عبادہ نے بورڈ نیچے کیا۔ ''اٹس اوکے گل۔ اس تحفے کے لیے اتنا ڈر سہہ سکتی ہوں۔'' وہ مسکرا کے بولی تو گل کو ٹھنڈ پڑ گئی۔

''آئی ول مس.....''

اسی لمحے ابراہیم نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ''گلے.....'' وہ کہتے کہتے رکا، عبادہ کو دیکھا پھر گل کو۔ وہ دونوں مڑیں۔ ''شمشاد چچا کی گاڑی جا رہا ہے ڈیرے۔ بیس منٹ میں آ جاؤ۔ پھر کوئی گاڑی نہیں جائے گا۔'' ابراہیم نے حتمی اطلاع دی پھر وہاں سے چلا گیا۔

''شکر اللہ۔ کوئی تو مل گئی۔ عبادہ۔ چلو۔'' اس نے عبادہ کے ہاتھ سے بورڈ لیتے ہوئے میز پہ رکھا اور اسے کلائی سے پکڑ کے کھینچا۔ وہ لڑکھڑائی۔

''کہاں؟''

''اٹن دیکھنے۔''

''میرے جوتے۔'' اس نے ہڑبڑاتے ہوئے جوتے پیروں میں اڑسے۔ گل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ کے بالکونی میں لے آئی۔

''کہاں ہے اٹن۔'' وہ باہر آتے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

''اوپر دیکھو۔ چاند کے ساتھ ہو رہا ہے۔'' گل نے ڈرامائی انداز میں اشارہ کیا۔ عبادہ جز بز سی آسمان کو دیکھنے لگی جہاں ستاروں اور چودھویں کے چاند کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔

''نظر نہیں آ رہا۔'' کافی دیر بعد عبادہ نے دھیرے سے نظریں نیچے کیں۔ گل سینے پر ہاتھ باندھے، ضبط سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ گھور کیوں رہی ہو۔'' عبادہ برا مان گئی۔

''اٹن زمین پر ہوتا ہے۔ آگ کے الاؤ کے گرد مرد ڈھول کی تھاپ اور بانسری کے ساز پر ڈانس کرتے ہیں۔ اور وہ یہاں نہیں ہوتا۔ وہ ڈیرے میں ہو رہا ہے اور ہم دونوں اس وقت ڈیرے جا رہی ہیں۔'' وہ جل جل کے بولی۔ عبادہ کی عقل پہ ماتم تھا۔

''اتنی رات کو؟'' وہ سٹپٹا گئی۔

''ہاں۔ تم کل جا رہی ہوں ناں میں نے سوچا تمہیں رات میں تھوڑا سا ایون دکھا دوں۔'' گل نے کہتے ہوئے دیوار کے ساتھ فائر ایگزاسٹ کی طرح بھوری رسی گول گول فولڈ رسی کا کونا کھینچا اور نیچے پھینک دیا۔ رسی بل کھاتے ہوئے ریلنگ سے نیچے گئی۔

''لیکن ڈیرے پر تو عورتیں نہیں جا سکتیں۔'' عبادہ نے کمر پہ ہاتھ رکھا۔ (اب بتاؤ بچو!)

''ہم لڑکیاں ہیں۔'' گل نے مسکرا کے کہا۔ عبادہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گل اسے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے ریلنگ کے پاس لائی۔ ''یہ جو نیچے جا رہی ہے۔ اسے رسی کہتے ہیں۔ اس پر جگہ جگہ موٹی گانٹھیں لگی ہیں جہاں پیر رکھنے سے ہم نیچے اتریں گی۔ اس کو پکڑ کے نیچے جاؤ۔ میں بھی آتی ہوں۔''

عبادہ نے ریلنگ پر ہاتھ رکھ کے نیچے دیکھا۔اس کے دل میں ہوک اٹھی۔

''گل۔'' وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

''اگر زندگی میں کسی چیز کا رسک نہیں لیا تو زندگی نہیں جی۔'' گل نے اس کا شانہ تھپک کر ڈھارس بندھائی۔

''نہیں گل۔بہت رات ہوچکی ہے۔میں تھک گئی ہوں۔میں اور ایڈونچر نہیں کرسکتی۔آئی ایم سوری۔'' عبادہ ریلنگ سے دور ہو کے پلٹ گئی۔گل نے کلائی سے پکڑ کے واپس کھینچا۔

''چلنے کا بولا ہے تو چلو۔'' کیا زبردستی تھی!

''گل پلیز۔'' وہ منمنائی۔

''چل.....لو۔'' اس نے ہلکا سا دھکا دیا۔عبادہ نے گھبراہٹ سے واپس ریلنگ سے نیچے دیکھا۔لان زیادہ دور نہیں تھا لیکن اتنی چھلانگ بھی عبادہ نے نہیں لگائی تھی۔وہ جھینپ کے پیچھے ہوئی۔

''ہم.....دروازے سے نہیں جاسکتے؟''

''موٹی چچی مین دروازہ لاک کر دیتی ہیں۔اس راستے کے علاوہ ہر جگہ چوکیدار کھڑے ہیں۔ہم پکڑی جاسکتی ہیں۔''

''یہاں سے کوئی نہیں پکڑ سکتا؟''

''بالکل بھی نہیں۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟'' اس نے تھانے دار کی طرح پوچھا۔

''میں ہر رات جاتی ہوں۔'' وہ شانے اچکا کے بولی۔

''ڈیرے؟''

''نہیں۔''

''پھر۔''

''تمہیں کیا۔'' وہ چڑ گئی۔ ''تم اس وقت نیچے اترو۔ گاڑی نکل جائے گی۔ دیر مت کرو۔''

''میں گر جاؤں گی۔'' وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ جگہ دیکھی ہے تم نے؟ تم کیا چاہتی کل میں یہ ہاتھ، گلے میں لٹکاتی ہوئی جاؤں اور اماں ابا سے کہوں کوئی اور ٹھرا تو مار نہیں سکی، اپنی مرمت کروا کے آئی ہوں۔''

''میری جان۔'' گل نے انتہائی اپنائیت سے اس کے گرد ہاتھ حمائل کیے۔ ''یہ نیچے لان پہ جو سبز سبز چیز لگی ہے ناں۔ اسے گھاس کہتے ہیں اور یہاں سے نیچے تک فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس لیے (ا س نے تیزی سے عبادہ کو اپنی طرف گھمایا۔) اگر گر بھی گئیں تو کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ بے رحمی سے دھاڑی۔ عبادہ کو کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ اس نے ٹھنڈی ریلنگ کو اپنے گرم ہاتھوں سے پکڑا۔

''چلو شاباش۔ تم کر سکتی ہو۔ تم بہادر لڑکی ہو۔ شاباش میرا بچہ۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ غصے سے بولی۔ ریلنگ کی دوسری طرف پیر رکھنے کے لیے چھوٹی سی منڈیر تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی اور گہرا سانس لیا۔ ریلنگ کے گرد بندھے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ موٹر سائیکل کی طرح پیر گزار کے دوسری طرف آ گئی۔ رسی اس نے دائیں ہاتھ سے پکڑ لی۔ ریلنگ کے اس پار کھڑے ہو کے اس نے آخری بار امید سی نظر گل پہ ڈالی۔

''مجھے چوٹ لگ جائے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ مرو گی نہیں۔'' کیا سفاکیت تھی۔

''اب دونوں ہاتھوں سے رسی کو پکڑو اور ان گانٹھوں پر پیر رکھتے ہوئے نیچے جاؤ۔ آرام آرام سے جیسے فوجی اترتے ہیں۔''

''میں نے فوجیوں کو اترتے نہیں دیکھا۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''باؤلی.....تم نے فوجی بھی دیکھے ہیں۔''

''نہیں۔میں نے کچھ نہیں دیکھا۔'' وہ ٹھنک کے بولی۔سب کچھ تو آپ نے دیکھا اور اب مجھے زبردستی دکھا رہی ہو۔خوبصورت علاقوں میں لوگ اس لیے آتے ہیں تاکہ اپنی مرضی سے گھوم سکیں۔ یہ کیسی مخلوق تھی جو اپنا علاقہ، اپنی رسمیں زبردستی دکھا رہی تھی۔بالکل جبراً!

اس نے کلمہ شہادت پڑھا اور رسی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے خود کو نیچے لٹکایا۔اب زمین زیادہ دور نہیں لگ رہی تھی کیوں کہ خود اس کا قد پانچ فٹ سے زیادہ تھا۔

''میں گر جاؤں گی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''مجھے یقین ہے تم مرو گی نہیں۔''

''تم اتنی بے رحم کیسے ہو سکتی ہو گل؟'' وہ افسوس سے بولی۔

''بس زمانے کا کمال ہے۔'' اس نے بے نیازی سے شانے جھٹک دیے۔

وہ آنکھ میچ کے پہلی گانٹھ چھوڑ کے رسی سے پھسلی تو دوسری گانٹھ پہ ہاتھ اٹک گئے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' خود کو جھٹکے دے دے کے نیچے لائی۔گل سینے پر ہاتھ باندھے بہت برداشت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' اس نے دوبارہ کہا تو پیر لان پر پڑ گئے۔اس نے تیزی سے آنکھیں کھولیں۔وہ زمین پہ تھی۔اس کے ٹھنڈے جسم میں جان آ گئی۔وہ ایسی پرسکون ہوئی جیسے کوئی معرکہ سر کیا ہو۔تھوڑی دیر کے لیے اپنا آپ کمانڈو کمانڈو لگا۔

اس کے اترتے ہی گل سر جھٹکتی منڈیر پہ آئی، رسی پکڑی اور کسی کمانڈو کی طرح پھسلی، دھڑام سے اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔عبادہ کا منہ کھل گیا تھا۔گل دو سیکنڈ.....دو سیکنڈ میں وہ نیچے آئی تھی۔

''چلیں۔'' اس کی ٹھوڑی پکڑ کے اوپر والے ہونٹ سے ملاتے ہوئے گل نے پوچھا۔

''تت.....تم؟''

''عادت ہے۔''اس نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔

''تم مینٹل ہو۔''عبادہ نے سر کو دائیں سے بائیں ہلایا۔''تم واقعی بد دماغ ہو۔''

''او کے۔''گل نے مسکرا کے کہا پھر اس کی کلائی تھام کے وہ آگے کو بھاگی۔

دونوں بھاگتے ہوئے گاڑی کے پاس آ گئیں۔گاڑی باقی گاڑیوں کے عین درمیان پارک تھی جہاں سے بائیں طرف بیس قدم کے فاصلے پر لائٹ پول لگا ہوا تھا۔لائٹ پول کی مدھم روشنی وہاں پہنچ رہی تھی۔

گل نے گاڑی کے دروازے کھینچے تو پتہ چلا گاڑی لاک ہے۔اس نے پلٹ کے یہاں وہاں دیکھا۔پارکنگ خالی تھی البتہ گیٹ پر گارڈز کھڑے تھے۔اسی لمحے شمشاد تین آدمیوں کے ساتھ اس طرف آتا ہوا دکھائی دیا جس کو دیکھ کے گل کا رنگ فق ہوا تھا۔ابراہیم نے بتایا نہیں کہ شمشاد کے ساتھ تین آدمی اور بھی ہیں۔گاڑی چھوٹی تھی۔چھ لوگ آ سکتے تھے لیکن اگر دو آگے دو پیچھے بیٹھے تو ان کی جگہ مفقود ہو جانی تھی۔اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ دونوں.....وہ دونوں.....پیچھے جائیں۔

اور وہ آ بھی گئیں.....گاڑی کے پیچھے.....

''ایک بات بتاؤ عبادہ۔کیا بیس منٹ ایک تنگ سی جگہ پر کم آکسیجن کے درمیان کوئی شخص رہے تو مرے گا تو نہیں؟''اس نے کمال ہوشیاری سے بات چھیڑ دی۔

''کم آکسیجن ہو یا بالکل بھی آکسیجن نہ ہو؟''عبادہ نے جیسے سوال پر غور کیا۔

''کم آکسیجن.....''

''نہیں۔البتہ کچھ گھنٹے وہاں رہنے سے موت ہو سکتی ہے۔''اس نے رسان سے بتایا۔

''گھنٹوں کی نوبت نہیں آئے گی۔'' گل نے سر جھٹک کے کہا پھر ڈگی کا دروازہ پکڑا اور جھٹکے سے اوپر اٹھالیا۔ اندر اسٹپنی اور کچھ خالی بوتلیں تھیں۔ ایک رضائی نما چیز بھی سائیڈ پہ پڑی ہوئی تھی۔ ڈگی کا فرش کالا سیاہ تھا۔ گل نے اندر سے اسٹپنی نکالی، بوتلیں نکال کے باہر رکھ دیں۔ ڈگی خالی ہوگئی۔ فرش البتہ اسی طرح پٹرول سے چکنا پڑا تھا۔

''یہ ہے وہ جگہ جہاں آکسیجن کم ہوتی ہے اور ہم دونوں کو یہاں بیس منٹ رہنا ہے۔'' گل کے انکشاف پر عبادہ کا منہ کھل گیا۔

''کک..... کیا مطلب؟''

''مطلب وطلب کا ٹائم نہیں ہے بہن۔ بیٹھو اندر۔'' یہ کہتے ہی اس نے عبادہ کو دھکا دیا، وہ لڑکھڑا کے ڈگی کے فرش پہ جا لگی۔

''گل کی بچی.....'' عبادہ احتجاج کرتے کرتے رہ گئی۔ گل نے اس کے پیر پیچھے سے اٹھائے اور اندر ٹھونس دیے پھر خود بھی سمٹ کے اندر آ گئی اور ڈگی کا دروازہ بند کر دیا۔ اب دونوں اس پوزیشن میں تھیں گویا کسی نے دو بوریاں ایک دوسرے پر رکھ دی ہوں۔

''گل! میں یہاں مر جاؤں گی۔'' عبادہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کے ہانپ کے کہا۔

''ابھی تو تم نے بتایا کہ کم آکسیجن میں بیس منٹ میں کوئی نہیں مرتا۔''

''لیکن تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ آکسیجن کے ساتھ ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی ہوگی۔'' ڈگی سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے دوپٹے سے ناک ڈھانپ لی لیکن بدبو اس قدر تیز تھی کہ دوپٹے کے تین تہوں کے اندر سے بھی آ رہی تھی۔

''معافی چاہتی ہوں۔ میں بتانا بھول گئی کہ شمشاد چچا گاڑی صاف نہیں کرتے۔'' گل نے زبان دانتوں تلے دیتے ہوئے کہا۔

''اف، اللہ نہیں۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں جا رہی ہوں گل۔ میں تمہارے ایڈونچر میں مرنا نہیں چاہتی۔'' وہ مزاحمتی انداز میں کہتی ڈگی کا دروازہ کھولنے لگی۔ اسی لمحے شمشاد کی اور تین لوگوں کی گاڑی میں بیٹھنے اور گاڑی کے دروازوں کی ٹھک ٹھوں کی آواز آئی تو عبادہ نے نیم اندھیرے میں گل کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔ گل پراسرار سی مسکرادی۔ گاڑی چل پڑی تھی۔ عبادہ نے بے ساختہ سر پیچھے لگا دیا۔

اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

گاڑی پگڈنڈی جیسی سڑکوں پر چل رہی تھی۔ ٹائروں کے نیچے نوکیلے، کھردرے پتھر آرہے تھے جن سے ٹائر چرچراتے اور دونوں کو زوردار ٹھوکے لگتے۔ ہر ٹھدے پہ عبادہ لرز کے رہ جاتی اور ایک ناقابل ذکر گالی نکال کے گل کو دیتی۔ گل اس کے کی گردن پہ ہاتھ رکھ کے اس کی نبض ٹٹول لیتی۔ (شکر اب تک زندہ تھی)

پیچھے ڈگی کے دھندلے شیشے سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ چاند کی ہلکی سی روشنی تھی جس سے بھیانک پہاڑیاں سرمئی چاندنی میں نہا گئی تھیں اور اس طرح دیکھنے سے وہ کم وحشت ناک لگ رہی تھیں۔ گاڑی میں ناقابل برداشت بدبو سے عبادہ کو بار بار متلی آرہی تھی۔

''چترال تمہیں بہت کچھ سکھا دے گا عبادہ۔ مجھے یقین ہے تم دوبارہ آنے سے توبہ کرو گی۔'' گل اس کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''اگر تم مجھے انسانوں کی طرح گھماؤ تو اس کی نوبت نہ آئے لیکن تم نے تو قسم کھائی ہے کہ میری توبہ کروا کے ہی دم لوگی۔'' وہ اس کے شانے پر مکا رسید کرتے ہوئے تلخی سے بولی۔

''ہاہاہا..... مزہ آرہا ہے ناں؟'' وہ اسے چھیڑنے لگی۔ ''مائنڈ اٹ! یہ خوشبو تمہیں کسی عطر سے نہیں ملے گی۔''

''بالکل۔ایسی خوشبو صرف شمشاد چچا کی گاڑی کی ڈگی میں مل سکتی ہے کیوں کہ وہ گاڑی صاف نہیں کرتے۔'' وہ جل کے بولی۔

بدبو کسی مری ہوئی گلی سڑی چیز کی تھی۔عبادہ ویٹ تھی، بدبو سے اندازہ کر سکتی تھی لیکن اس کی حالت گھٹن سے غیر ہو رہی تھی۔جب گاڑی کسی اونچائی پہ چڑھنے لگی تو وہ دونوں دبک کے ڈگی کے دروازے میں جا گھسیں۔ایک دوسرے پر لاتیں، بازو، پیر بری طرح لگ رہے تھے۔

''پلیز تھوڑا سا دروازہ کھول دو۔تھوڑی ہوا آنے دو۔'' اس نے منت کی۔

''مادام! گاڑی اوپر چڑھ رہی ہے۔دروازہ کھولا تو دونوں کھائی میں پڑی ہوں گی۔'' گل نے منہ بسور کے کہا۔

''یا اللہ..... کب پہنچیں گے؟'' عبادہ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''بس پہنچنے والے ہیں۔'' گل نے اس چہرہ تھپک دیا۔

انہیں ڈیرے پر پہنچنے میں بیس منٹ کی بجائے پورے تیس منٹ لگے۔رات کا وقت تھا اور راستہ دشوار تھا۔شمشاد چچا اچھے ڈرائیور تھے لیکن بوڑھے ہو چکے تھے۔ان کی کھٹارہ گاڑی ڈیرے پہنچتے پہنچتے گل اور عبادہ کا بھرکس نکال چکی تھی۔ڈیرے کی پارکنگ میں شمشاد چچا اپنے آدمیوں کے ساتھ اتر کے وہاں سے چلے گئے۔اطراف میں سکون پڑا تو گل نے دھیرے سے ڈگی کا دروازہ کھولا اور کچھوے کی طرح سر باہر نکلا۔احتیاط سے یہاں وہاں دیکھا۔پارکنگ خالی تھی۔اس طرف کوئی نہیں تھا۔وہ آہستہ سے باہر آئی۔

''نکلو.....'' باہر آتے ہی اس نے عبادہ کی طرف ہاتھ بڑھایا، جس کا جسم چور ہو چکا تھا۔

''آہ.....'' باہر آتے ہی اس نے کمر کی ہڈیوں کو چٹخا دیا۔جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

پارکنگ میں خاصا اندھیرا تھا۔حویلی کی گاڑیاں وقفے وقفے سے کھڑی تھیں۔وہ دونوں

گاڑیوں سے نکل کے تھوڑا سا سائیڈ پہ ہو گئیں۔ یہاں ڈھول کی تھاپ، بانسری اور تالیوں کی آواز دب دب کے آ رہی تھی۔

''دیکھوں تو سہی، بدبو کس چیز کی تھی۔'' عبادہ فرصت سے ڈگی پہ جھکنے لگی تو گل نے پیچھے سے قمیص پکڑ کے کھینچا۔

''چپ کرو۔ بدبو ڈھونڈنے آئی ہو یہاں؟''

''مگر.....''

''شش۔'' گل نے آنکھیں دکھائیں۔ ''شرافت سے کھڑی رہو۔'' وہ اس کی قمیص چھوڑ کر سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگی۔

''تم بہت روڈ ہو گل۔'' وہ بڑبڑائی۔

''یہ ڈیرے کی بائیں سمت ہے۔ دائیں سمت ڈیرے کی عمارت ہے اور درمیان میں میدان جہاں اٹن ہو رہا ہے۔ دروازہ بائیں طرف لگا ہے۔ ہم یہاں سے تو نہیں جا سکتے..... تو ہم لوگ ایسا کرتے ہیں کہ.....'' گل کچھ سوچتے سوچتے ٹھہری۔ ''ہم دائیں طرف سے عمارت میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوگا پھر وہاں سے ایک کمرے کی کھڑکی کھول کے میدان میں جھانک لیں گے۔ سامنے سے گئے تو پکڑے جائیں گے اور جو عزت افزائی ہوگی۔ الامان الحفیظ!''

''اور اگر عمارت میں کوئی ہوا تو؟''

''اوں ہونہہ..... وہاں کوئی نہیں ہوتا۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''اپنا ڈیرہ ہے۔ مجھے پتہ نہیں ہوگا تو کیا تمہیں ہوگا؟'' وہ ٹھنک کے بولی۔ عبادہ چپ ہو گئی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کے بلی کی چال چلتے ہوئے دائیں طرف آئیں۔ عمارت کی کھڑکیاں اس

طرف بھی کھلتی تھیں لیکن وہاں نیچے خطرناک کھائی تھی جس میں پتھروں کے نوکیلے کونے نکلے ہوئے تھے۔ دراصل پہاڑی کے اس حصے کو بلڈوزر سے کاٹ کے ہموار کیا گیا تھا۔ اس لیے چٹانوں کے تراشیدہ کونے سطح سے جھانک رہے تھے۔ یہاں تاریکی تھی۔ عبادہ کے لیے قدم رکھنا مشکل ہو رہا تھا کیوں کہ وہ اندھیرے میں نیچے زمین کا اندازہ نہیں کر پا رہی تھی البتہ گل ایسے قدم بڑھا رہی تھی جیسے نیچے کوئی پلان روڈ ہو یا پھر ہموار سا میدان جہاں نشیب و فراز کا نام نہیں تھا۔

حویلی کے کمروں کی کھڑکیوں اور کھائیوں کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس طرف باڑ نہیں لگی ہوئی تھی۔ یہ جگہ کافی ڈھلوانی تھی۔ چاندنی میں کھائی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اندازہ نہیں۔

گل نے کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے وا کیے اور آنکھ کے کونے سے اندر نگاہ ڈالی۔ چھوٹی سی درز سے اندھیرا باہر نکلا۔ کمرے کی روشنی بجھی ہوئی تھی۔ یقیناً یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے دونوں پٹ کھول دیے۔ کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں تھیں اس لیے دونوں بے حد آہستہ سے چوکھٹ پار کر کے اندر چلی گئیں۔ گل دبے قدموں سے مخالف سمت لگی کھڑکی کی طرف آئی اور ذرا سی کھول دی۔ شور کا طوفان اندر آیا۔ لان میں خوب تقریب سجی ہوئی تھی۔

گل نے احتیاطاً دروازے کو اندر سے چٹخنی چڑھا دی اور پچھلی والی کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں ہنوز روشنی بجھی ہی رکھی کیوں کہ لان سے بہت تیز روشنی اس طرف آ رہی تھی۔

''آؤ ادھر۔ دیکھو کتنا اچھا لگ رہا ہے سب۔'' وہ چمکتی نظروں سے کہتی، ایک پٹ میں کھڑی ہو گئی اور عبادہ کو دوسرے پٹ میں کھڑا کر دیا۔ ان دونوں کا چہرہ باہر سے نہیں نظر آ رہا تھا۔

لان میں چاروں طرف چارپائیاں لگی ہوئی تھیں جہاں گاؤ تکیوں پر مہمان مرد اور چترال کے قبائل کے معزز ممبران موجود تھے۔ ان کے سامنے عمارت کا برآمدہ تھا جس کے ستون کے ساتھ یوسف خان، مجاہد خان اور دوسری طرف کوئی اور مرد بیٹھا ہوا تھا جس کا چہرہ سائیڈ سے تھوڑا تھوڑا نظر

آرہا تھا۔ان کی پشت تھی۔وہ سامنے دیکھ رہے تھے جہاں درمیان میں آگ کا الاؤ جل رہا تھا۔لمبی لمبی لکڑیوں کو تکون میں کھڑا کر کے،ان کو آگ سلگائی گئی تھی۔ہلکی ہلکی چنگاریاں ہوا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔اس آگ کے گرد بلتی قبیلے اور کھوار قبیلے کے نوجوان مرد ایک دائرے میں گھومتے ہوئے رقص کر رہے تھے۔یہ بالکل وہی رقص تھا جو عبادہ نے بلتیوں کے آمد والی رات دیکھا تھا۔

طبلے،بانسری،رباب اور ستار والے بائیں طرف ایک تخت پر قوال گروہ کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔وہ ان چاروں اوزاروں سے ایسے راگ پیدا کر رہے تھے جن پر نوجوان لڑکوں کی پیر اور ہاتھوں کے اسٹیپس پورے بیٹھ رہے تھے۔

اس سب میں اتنا کچھ خاص نہیں تھا پھر گل اسے کھینچتے ہوئے کیوں لائی تھی؟

اس نے تعجب سے گل کو دیکھا اور پھر.....پھر ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینا بھول گئی۔گل کھڑکی کی چوکھٹ پکڑے،پلکیں جھپکے بغیر سامنے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی ایسی چمک جو عبادہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔اس کی آنکھوں کا سیاہ بٹن تیزی سے بڑا ہو رہا تھا۔اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو کافی غور کرنے کے بعد محسوس ہوتی تھی۔

لیکن وہ کسے اتنی چاہت اور مان سے دیکھ رہی تھی۔

عبادہ نے آہستہ سے گردن گھمائی۔سامنے مردوں کے دائرے میں پہلا نمبر اس کا تھا۔اس نے سرمئی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جس پہ سرمئی ہی چادر گردن کے دونوں اطراف سے لٹک رہی تھی۔اس کے پیروں میں سرمئی کھیڑیاں تھیں اور سر پہ چترالی پکول ٹوپی پہن رکھی تھی۔وہ اس ٹولے کے ساتھ بالکل ان جیسا تھرک رہا تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس مسکراہٹ میں کچھ خاص تھا۔ایک انجانی سی خوشی کا احساس جھلک رہا تھا۔

گل کی نظر اس پہ فکس تھی۔وہ صرف غاذان کو دیکھ رہی تھی۔عبادہ کے معدے میں تتلیاں

گھومیں۔کیا گل غاذان سے محبت؟ .....اسے ڈھیروں ویرانیوں نے گھیر لیا۔یکدم اسے اپنا آپ ان سب میں بہت انجان بہت اجنبی محسوس ہوا۔وہ کھڑکی کی چوکھٹ کو تھام کے ایک قدم پیچھے ہوئی۔

''وہ بہت ہینڈسم ہے.....ہے ناں؟'' گل بہکے بہکے لہجے میں بولی۔اس کی آواز بہت مدھم تھی۔''کسی بھی لڑکی کا دل اس پہ آسکتا ہے۔وہ اتنا خوبصورت ہے کہ اسے دیکھ کے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مشرقی لباس میں زیادہ پُرکشش لگتا ہے یا پھر مغربی لباس میں؟اس پہ شلوار قمیص زیادہ اچھی لگتی ہے یا پینٹ شرٹ؟وہ ہڈی میں ہینڈسم لگتا ہے یا پکول میں؟وہ مسکراتا ہوا اچھا لگتا ہے یا پھر ڈانٹتا ہوا؟غصے میں اس پہ زیادہ پیار آتا ہے یا پھر شرارت میں؟اس کی سنجیدگی زیادہ بھاتی ہے یا اس کی شوخی؟''

اس نے دھیرے سے عبادہ کو دیکھا۔

''بتاؤناں؟وہ کب زیادہ اچھا لگتا ہے؟تم تو اس کے ساتھ پچھلے دو ہفتوں سے ہو۔تمہیں کیا لگتا کہ وہ کس وقت زیادہ حسین لگتا ہے؟'' وہ ایسے پوچھ رہی تھی جیسے شدید انتظار کے بعد کوئی عاشق محبوب سے پوچھے،بتاؤتم نے مجھے یاد کیا۔کب کب؟ کیسے کیسے؟ کہاں کہاں؟ کیا ہر لمحے؟ ہر پل؟ ہر لحظے کیا؟بتاؤناں۔

عبادہ جیسے ٹھہر گئی۔اس نے غاذان کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔اتنا قریب سے کہ اس کی پرفیوم کی خوشبو سے ہی وہ نہیں نکل پاتی تھی۔اس نے اس کے جوتوں، کپڑوں پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔وہ تو اس کی مسکراتی آنکھوں،مبہم چہرے اور گمبھیر سی آواز میں کھو جاتی تھی۔وہ تو کچھ بولنے سے پہلے، کچھ تول بھی نہیں پاتی تھی۔وہ کیا بتاتی؟ ہک ہا.....گل کیا پوچھ رہی تھی!

''تم بھی کنفیوز ہو۔میں بھی ہوتی ہوں۔اس کے لباس تک پہنچتے پہنچتے نگاہیں تھک جاتی

ہیں۔اس کا ایک ایک انداز ہی اتنا پیارا ہے۔اس کی لمبی ترچھی سی آنکھیں اوران میں اترتے مدو جزر جیسے پیالی میں طوفان۔پتہ ہے.....آئی نو اس بات کے بعد تم مجھے انتہائی گھمنڈی سمجھو گی لیکن .....اگر وہ چترال سے نہ ہوتا تو پیارا نہ ہوتا۔وہ چترال سے ہے جب ہی اتنا پیارا ہے۔'' وہ ذرا اکڑ کے بولی۔

عبادہ نے مسکرا کے سر جھٹک دیا۔بہت خود غرض واقع ہوئی تھی گل چترال کے معاملہ میں۔

''وہ کبھی رقص نہیں کرتا تھا۔بچپن میں۔بابا اور چچا اسے بہت کہتے تھے کہ سیکھ لو۔یہ ثقافت ہے ۔اس نے سیکھا لیکن کبھی کیا نہیں۔آج یہ پہلی اور آخری بار کر رہا ہے۔اس کے بعد یہ سردار بن جائے گا پھر نہیں کرے گا۔''

''کیوں؟ سردار رقص نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتے ہیں۔ممنوع نہیں ہے لیکن وہ سردار کی شان کے خلاف ہے۔یوسف خان کو دیکھ لو۔جانے آخری بار کب اٹن کیا تھا۔سردار بننے کے بعد بالکوں والے شوق ترک کرنے پڑتے ہیں۔''

''تو پھر آج کیوں کر رہا ہے؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟'' عبادہ نے الجھن سے پوچھا۔

''ہوں۔آج مقابلہ ہے۔''

''کس چیز کا؟''

''اٹن کا۔جب بلتی آتے ہیں تو ہمارے اوران کے مختلف مقابلے ہوتے ہیں۔دو دن پہلے نشانے بازی کا مقابلہ ہوا۔آج اٹن کا ہے اور پھر تیراکی اور شکار کا ہوگا۔جب تک شندور نہیں آجاتا۔یہ مقابلے وقفے وقفے سے ہوتے رہیں گے۔'' غاذان اٹن چھوڑ کے یوسف خان کے ساتھ بیٹھے آدمی سے جھک کے مل رہا تھا۔اس کا چہرہ گلابی پڑ چکا تھا۔آدمی اس کے شانے تھپک رہا تھا۔

''غاذان کو تھرکنا نہیں آتا لیکن وہ کوشش اچھی کر لیتا ہے۔سب اسے چڑاتے ہیں کہ وہ کیسا سردار ہے جسے نہ نشانہ لگانا آتا ہے اور نہ اٹن۔اسے چترال کے باسیوں کا ایک بھی شوق نہیں آتا۔لوگ تو اس کو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ لندن جا کے بدل گیا ہے۔'' گل نے ہنسی دبائی۔

غاذان اس آدمی کے داہنے ہاتھ کھڑا ہو گیا۔اس پشت ان کی طرف تھی۔ملازم اسے ٹرے میں مشروب پیش کر کے گیا تو اس نے گلاس اٹھالیا۔

''ہم دونوں بچپن سے ایک ساتھ بڑے ہوئے ہیں۔مجھے سکول یہی لے کر جاتا تھا۔یہ مجھے سے پانچ کلاس آگے تھا۔میں حویلی کی اکلوتی لڑکی تھی جو پڑھ رہی تھی۔میٹرک میں ہم دونوں کے ایک جیسے مارکس آئے تھے لیکن میں انگلش میں اس سے آگے تھی اور یہ میتھس میں۔میتھس میرے دماغ کا اندر آنے سے پہلے انتقال کر جاتی ہے۔'' وہ کھسیا کے مسکرائی۔

''میں پشاور چلی گئی اور یہ اسلام آباد۔اس نے ماسٹر کی ڈگری قائداعظم یونی ورسٹی اسلام آباد سے لی ہے۔ماسٹر کے بعد میں حویلی آ گئی اور یہ لندن چلا گیا۔میری اور ابتہاج کی ساری لڑائیوں میں یہی صلح کرواتا تھا۔تم تو جانتی ہو جتنا جذباتی ابتہاج ہے اس سے زیادہ میں ہوں۔ایک دفعہ بھڑک جاؤں پھر دماغ جگہ پہ آنے میں بہت وقت لیتا ہے۔یہ البتہ بہت پرسکون اور فہم رکھنے والا بچہ تھا۔اس نے کبھی مجھ سے نہ ابتہاج سے لڑائی کی۔وہ عام بچوں سے بہت مختلف تھا جو شاید تم نے اس کی پرسنیلٹی میں دیکھا ہوگا۔''

اس نے ان دیکھا سا سر ''ہاں'' میں ہلایا۔گل خاموش ہو گئی۔غاذان جس آدمی کے ساتھ کھڑا تھا،وہ آدمی فون پہ بات کرنے کے لیے دائیں طرف کونے میں چلا گیا تھا۔اس کا نیم رخ نظر آ رہا تھا۔گل کی نظروں میں شوخی تھی۔

عبادہ کو یکدم بے چینی ہونے لگی۔اپنی اس حالت سے وہ خود بھی کشمکش کا شکار ہو رہی تھی۔آخر

کیا وجہ تھی، اس اضطراب کی؟ کیا اسے گل کا غازان کو یوں دیکھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا؟ مگر کیوں؟ وہ دونوں کزن تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کا حق رکھتے تھے پھر؟ کیا وہ جل رہی تھی؟

نہیں۔ اس نے گھبرا کر سر نفی میں ہلایا۔ ہرگز نہیں۔ وہ کیوں جلے گی؟ استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ اس نے برے خیالات جھٹکتے ہوئے گہری سانس لی۔ اٹن ختم ہو رہا تھا۔ ڈھول والے شاید تھک گئے۔ تھرکنے والا مرد ٹولہ بے جان بے جان لگ رہا تھا۔ اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اسے سخت جمائیاں آنے لگیں۔ اب انہیں چلنا چاہیے تھا۔ اس کی کل فلائٹ تھی۔

وہ بات کرنے کی غرض سے گل کی طرف مڑی۔ وہ بدستور چوکھٹ کے گرد ہاتھ باندھے بہکی نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"گل..... میرے خیال سے اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"ہوں؟" عبادہ نے اسے کسی گہرے خیال سے نکالا۔

"میں نے کہا ہمیں چل....."

"اووں..... اووں....." اس سے پہلے کہ وہ کہتی، کمرے میں کسی کے رونے کی آواز گونجی۔ وہ دونوں بری طرح چونکتے ہوئے ایڑیوں کے بل گھومیں۔ کمرے میں کوئی تھا۔

"یہ بلی کی آواز تھی ناں؟" عبادہ نے گھبراتے ہوئے تسلی مانگی۔

"نہیں بچے کی ہے۔"

"بلی کے بچے کی؟"

"انسان کے بچے کی۔"

"انسان کا بچہ بلی کی آواز کیوں نکالے گا گل؟"

''انسان کا بچہ ہے اور رو رہا ہے۔''

''انسان کا بچہ بلی کی آواز میں کیوں روئے گا؟'' وہ زچ کرنے لگی۔

''انسان کا بچہ ہے اور انسان کی آواز میں رو رہا ہے۔'' گل نے بمشکل خود کو عبادہ کو تھپڑ لگانے سے روکا۔

''لیکن کیوں؟''

''مجھے کیا پتہ؟''

''اووں.....اووں.....امی.....'' بچے کی آواز قریب قریب سے آئی۔

''کہاں ہے یہ بچہ؟'' کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور شور بھی اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔

''دیکھتی ہوں۔'' گل کھڑکی سے ہٹی اور عبادہ کو بھی ہٹایا پھر سوئچ بورڈ کے پاس آئی اور لائٹ کا بٹن ٹٹولا۔ کچھ بٹنوں سے ٹک ٹوں کرنے کے بعد بالآخر انگلی متعلقہ بٹن پہ پڑ گئی۔ بٹن جیسے ہی نیچے ہوا، کمرے میں زیرو واٹ بلب کی مدھم سی روشنی دوڑ گئی لیکن سامنے کا منظر دیکھتے ہی دونوں بری طرح بوکھلائیں۔

وہاں بیڈ پہ بچے سو رہے تھے۔ یہ وہ بچے تھے جن کا اپنے باپ دادوں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا سو وہ انہیں اپنے ساتھ ہی ڈیرے لے آتے تھے اور پھر نیند آنے پر ان کے باپ دادا انہیں اس کمرے میں سلا دیتے تھے۔ جو بچہ رو رہا تھا۔ وہ چھ سال کا لڑکا تھا جو بیڈ پہ بیٹھا آنکھیں مسل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک گیارہ سال کا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ روتے بچے کی آوازیں سن کے سویا لڑکا بار بار کسمسا رہا تھا۔

گل نے ایک نظر بچے پہ ڈالی اور بچے نے دونوں کو دیکھتے ہی ایک زوردار چیخ ماری۔

''امی.....ابو.....امی.....ابو.....امی.....'' وہ بیڈ پہ اچھل اچھل کے ہانپنے لگا۔وہ ڈر گیا تھا۔

''ششش.....ششش.....'' گل اس کو خاموش کروانے کی غرض سے قریب آئی۔بچہ مزید بدک گیا۔اس نے بلند آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دیا جس سے ساتھ سویا ہوا بچہ آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''ششش.....چپ کرو.....میں ہوں.....'' گل اس کو کھواری زبان میں خاموش کروا رہی تھی۔ساتھ اٹھے بچے کے اعصاب جب بیدار ہوئے اور اس نے نیند سے بوجھل پڑتی آنکھوں کو کھول کے دائیں بائیں دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔اگلے ہی پل اس نے بھی ایک دلخراش چیخ ماری۔

''امی.....چڑیل.....بھوت.....چڑیل.....'' گیارہ سال کا لڑکا حواس باختہ انداز میں بیڈ سے اترا اور دروازے کی سمت بھاگا۔گل کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔وہ بجلی سی تیزی سے لڑکے کے پیچھے بھاگی۔اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا،گل نے اسے پکڑ لیا۔

''رک جاؤ.....رک جاؤ.....''

''آآآآآ.....ابو.....بچاؤ.....چڑیل.....امی.....'' لڑکے نے پوری جان کا زور گلا پھاڑنے پر لگا دیا۔اس کی آواز سن کے باہر کھڑے چند مردوں میں ہلچل ہوئی۔انہوں نے گردنیں موڑ کے پیچھے دیکھا،جن میں غاذان بھی تھا۔

''چپ کر جاؤ میرے باپ۔چڑیل کیوں کہہ رہے ہو۔اتنی بھیانک تو نہیں ہوں میں۔'' گل اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے خفگی سے بولی۔

''ابو.....''

''اووں.....اووں.....'' کمرے میں چیخنے چلانے کی آوازیں بری طرح گونجنے لگی تھیں

جنہیں سن کے باہر سے وہی مرد اندر کی جانب لپکے۔ کھڑکی کے درز سے عبادہ نے ان کو آتا دیکھا تو بری طرح سٹپٹا گئی۔

''گل! وہ اندر آ رہے ہیں۔'' اس نے چٹاخ سے کھڑکیاں بند کیں اور چٹخنی چڑھائی۔ زیرو بلب میں ایک دوسرے کو دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''کون؟''

''مرد!''

''کیوں؟''

''ہمیں ویلکم کرنے.....'' وہ جل کے بولی۔ ''ان کی آوازیں سن لی ہیں۔''

''کیا؟''

''ہاں..... چلو یہاں سے.....''

اسی لمحے کچھ مردوں نے جن میں غاذان بھی تھا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

''احسن..... دانش.....'' وہ مقامی لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

''اووں..... اووں.....'' بچے کے منہ پر ہنوز گل کا ہاتھ تھا۔ گل نے یکدم دھکا دے کر بچے کو بیڈ پہ پھینک دیا اور خود باہر والی کھڑکی کی طرف بھاگی۔ عبادہ اس کے پیچھے لپکی۔

''چڑیل..... ابو.....'' لڑکے نے موقع دیکھ کے دروازے کی چٹخنی کھولنے کے لیے ایڑیاں اوپر اٹھائیں۔ اس کا ہاتھ بمشکل پہنچ رہا تھا۔

''دروازہ کیوں بند کیا ہے؟ بیٹا دروازہ کھولو۔ کیوں چیخ رہے ہو۔''

''چڑیل..... بابا..... بھوتنی.....'' لڑکے نے دو انگلیوں سے چٹخنی کو تھام لیا اور نیچے گھسیٹا۔ دروازہ کھلا۔ اسی لمحے وہ دونوں کود کے باہر نکل گئیں لیکن نکلتے نکلتے کسی نے عبادہ کا پلو کھڑکی سے

نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"کیا ہوا....." بچے کی غیر ہوتی حالت پر مرد نے اس گلے لگا لیا جب کہ دوسرا شخص تیزی سے کھڑکی کے پاس آیا اور باہر جھانکا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ دونوں اندھیرے میں غائب ہو چکی تھیں۔

"چاچو..... چڑیل آئی تھی..... چڑیل....." گیارہ سال کا لڑکا بری طرح ڈر گیا تھا۔

"کونسی چڑیل؟ کیسی چڑیل؟"

"بھیانک چڑیل..... اتنے لمبے بال۔ کالا چہرہ..... بھوتنی جیسا....." وہ ہانپ ہانپ کے حلیہ بتا رہا تھا۔ غاذان نے اس شخص کو دیکھا جو کمرے میں تھا اور اس شخص نے اس غاذان کو۔ دونوں کے آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"میں دیکھتا ہوں سمیع....." غاذان پرعزم لہجے میں کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

وہ دونوں اندھا دھند بھاگ رہی تھیں۔ پارکنگ میں آنے کے بعد دونوں ٹھہر گئیں۔ گل نے گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ رکھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ عبادہ نے بھی قیام کرنے والے انداز میں گھٹنے پکڑ لیے۔ دونوں کو بری طرح سانس چڑھ چکا تھا۔

"ہم اتنے بھیانک ہیں کیا؟ ہم سے بچے ڈر رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" گل کو افسوس ہو رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں، میں ان کے نظریات سے اتفاق کرتی ہوں البتہ میرے بارے میں بھی ان کی یہ رائے ہوگی، یہ جان کر بہت برا لگ رہا ہے۔" عبادہ نے معصومیت سے کہا۔

"اچھا..... تو تم حور پری ہو....." گل نے یکا یک سینے پر ہاتھ باندھے۔

عبادہ گھٹنوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے سیدھی ہوئی۔ "دریں چہ شک (اس میں کوئی شک؟)"

"بالکل۔ تمہارا حسن میرے سامنے پھیکا ہے مادام....." گل نے فرضی کالر جھاڑے۔

''اس کا فیصلہ تو چھوٹے سے بچے نے کر دیا ہے۔ ہوں ہوں۔''

''اس نے تمہیں دیکھا نہیں تھا ناں اس لیے.....'' گل نے ''تمہیں'' پہ زور دیا۔

''مجھے دیکھا ہوتا تو دل کو سکون ہو جاتا ہے لنگور کے ساتھ حور بھی آئی ہے سو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے بالوں کو جھٹکا۔

''تمہیں میں لنگور دکھتی ہوں؟'' گل صدمے سے کہتی ہوئی آگے آئی۔

''خود سے پوچھو۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''شٹ اپ..... میرے حسن کے چرچے پورے چترال میں ہیں۔''

''اچھا وہ بچہ پھر لاہور سے آیا تھا کیا؟''

''وہ سو کر اٹھا تھا۔''

''دیکھو۔ پھر بھی اس نے تمہیں پہچان لیا۔'' عبادہ نے تالی پہ تالی بجائی اور ہنسنے لگی۔

''ہنسنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ڈر گیا تھا۔''

''وہ تم سے ڈر گیا تھا مس چڑیل.....''

''تم مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو؟ میں تمہیں اٹن دکھانے یہاں لائی، اپنی جان پہ کھیل کے۔ اتنا بڑا رسک لیا اور تم مجھ سے منہ ماری کر رہی ہو؟ کیا اس دن کے لیے پالا پوسا تھا تمہیں؟ کیا یہ سب دیکھنے کے لیے تمہیں سگی اولاد سے زیادہ پیار دیا تھا۔ کیا اس دن کے لیے میں نے تمہیں گود لیا تھا۔'' گل نے دل پہ مٹھی رکھی، ہونٹوں کو آپس میں پیوست کر کے رونے والی شکل بناتے ہوئے کمال کی اوورایکٹنگ کی۔

''اچھا ٹھیک ہے اماں جان۔ اپنی بیٹی کو معاف کریں۔'' عبادہ نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''اب یہ سوچو یہاں سے جائیں گے کیسے؟ میں بتا رہی ہوں میں اس ڈگی میں نہیں جاؤں گی۔'' عبادہ نے

اڑتے ہوئے کہا۔

''میں تم دونوں کے لیے رولز رائس بھیجتا ہوں، اس میں چلی جانا۔''

غاذان کی آواز سن کے دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ایسے الرٹ ہو گئیں جیسے ڈھیلے چلتے فوجی پہ اس کا افسر اچانک آ جائے اور وہ آسان باش والے انداز میں تن کے کھڑا ہو جائے۔ وہ بھی جہاں کھڑی تھیں، وہاں سے ہل نہیں سکیں جب غاذان قدم قدم چل کے دونوں کے سامنے آ گیا۔ پیشانی پر بل تھے، آنکھیں سکیڑی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس شال نہیں تھی۔

''کیا کر رہی ہو تم دونوں یہاں؟'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے دونوں کو باری باری دیکھا۔ دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک نے بھی جواب دینے کی ہمت نہیں کی۔

''میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔'' غاذان ذرا سختی سے بولا۔

''وہ.....وہ.....ہم.....'' گل منمنائی۔

''وہ.....وہ.....کیا؟''

''عبادہ کو اٹن دیکھنا تھا۔ اس بیچاری نے پہلے کبھی دیکھا نہیں ناں۔ اس نے کہا لاہور جانے سے پہلے چترال کی اچھی اچھی میموریز لے کے جانی ہیں۔ میں نے سوچا اس کو لے جاؤں۔ بیچاری پھر جانے کب آئے گی۔ ایک ہی دفعہ میں سب کچھ دیکھ لے۔'' گل نے دانت نکال نکال کے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

''آپ اٹن دیکھنا چاہتی تھیں؟'' اس نے عبادہ کو سنجیدگی سے دیکھا۔

''ہاں۔ بالکل۔'' گل نے جواب دیا۔ عبادہ البتہ خاموش تھی۔

''جہاں تک میرے علم میں ہے۔ عبادہ اٹن دیکھ چکی ہے۔ کیوں عبادہ۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' غاذان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا حالاں کہ اندھیرے میں کسی کا چہرہ واضح نہیں

نظر آ رہا تھا۔

عبادہ نے بودہ سا سر ہلا دیا مگر چہرہ پھیر لیا۔ وہ غاذان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا؟'' گل کی بتیسی گم ہوگئی۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ (بہت برا لگ رہا تھا) دیکھ لیں غاذان۔ ایسی ہے یہ۔ کچھ پوچھو تو بتاتی ہی نہیں۔ کتنی ہی کوئی میسنی .....''

''شٹ اپ گل۔'' غاذان برہمی سے بولا۔ گل گھبرا کے پیچھے ہوئی اور بونٹ سے جا لگی۔

''جب دیکھو تمہیں شرارت کرنی ہوتی ہے۔ پچیس کی ہو تم یا پانچ کی؟ کب بڑی ہوگی تم؟ میچورٹی آئے گی یا نہیں یا پھر ہم انتظار کریں گے کب گل لالہ دی گریٹ پڑھی لکھی باشعور اور عقل مند لڑکی بنے گی؟ تم سے زیادہ میچور تو ابراہیم ہے۔ کم از کم اسے اپنے حدود و قیود کا تو پتہ ہے..... نہ کہ تم، رات کے کسی بھی پہر اٹھ کے کہیں نکل جاتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے تمہارے لیے؟'' وہ بری طرح جھڑکنے لگا۔

''عبادہ کو اٹن.....'' اس کے منہ میں ہی لفظ ٹوٹ گئے۔

''عبادہ اٹن دیکھ چکی ہے۔ یہ بہانہ مت بناؤ اور شرارتوں سے باز آ جاؤ۔''

''میرا دل کر رہا تھا اٹن دیکھنے کا۔ اس لیے آ گئی۔'' غاذان کی ڈانٹ سے اس کے ہونٹ لٹک گئے۔

''کل کو کنواں اچھا لگے گا تو کیا کود پڑو گی؟ مردوں کے ڈیرے میں تمہارا کیا کام؟ تم جانتی ہو اگر یہاں کسی کو بھنک بھی لگ گئی تو تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟ خان جی تمہاری ٹانگیں تڑوا دیں گے۔ اس وقت میں گاڑی کر کے دے رہا ہوں۔ شرافت سے حویلی پہنچو۔ اگر آئندہ ایسی کوئی حرکت دوبارہ کی تو یاد رکھنا گل..... میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔'' وہ انگشت اٹھا کے اسے اچھی طرح وارن کرتے ہوئے بولا۔

گل کی گردن شرمندگی سے جھک گئی۔

غاذان نے دونوں کو گاڑی کر کے دی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ دونوں کو بحفاظت گھر پہنچا دے۔ گاڑی ویران سڑک پر چل رہی تھی۔ گل شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کا پارہ ہائی تھا جب کہ عبادہ کب سے ہنسی روک کے بیٹھی ہوئی تھی۔ بالآخر اس نے گل کو چھیڑ ہی دیا۔

''وہ ہڈی میں زیادہ اچھا لگتا ہے یا پکول میں؟''

گل نے کسلمندی سے پہلو بدلا لیکن کچھ نہیں بولی۔ گاڑی میں اندھیرا تھا تاکہ کسی کو دونوں کے آنے کی خبر نہ ہو جائے۔

''اس کی سنجیدگی زیادہ بھاتی ہے یا اس کی شوخ.....''

''شٹ اپ.....'' گل برہمی سے پلٹی۔ عبادہ کھی کھی کرنے لگی۔

''تم چپ کر رہی ہو یا میں تمہیں گاڑی سے دھکا دے دوں؟'' گل کو طیش چڑھا۔

''وہ شلوار قمیص میں اچھا لگتا ہے یا.....'' ہنس ہنس کے اس کے پیٹ میں درد ہو گیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

''چپ کرو.....'' گل نے چڑ کے کہتے ہوئے اسے دھکا دیا اور خود چہرہ دوسری طرف موڑ دیا۔ وہ بہت برا مان گئی تھی۔ عبادہ نے خود کو سنبھالا، سیدھی ہوئی، ہنسی بند کی، خود کو کمپوز کیا اور گل کے گرد بازو حمائل کیے۔ گل نے شانوں کی مدد سے جھٹک دیے۔

''او کے۔ سوری۔ میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔''

''پہلی بار ڈانٹا ہے اس نے مجھے۔ سمجھی تم۔'' وہ جتا کے بولی۔

''سننے سے تو لگ رہا تھا ہر روز ڈانٹتا ہوگا۔''

''وہ ابتہاج نہیں ہے۔''

''اچھا ناں.....سوری۔'' عبادہ نے پھر سے بازو حمائل کر لیے۔ ''دوست ہوں ناں تمہاری۔ برا مت مانو۔ میں مذاق کر رہی تھی۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم اگر مجھ سے نہ لڑتیں تو وہ مجھے پتہ چل جاتا کہ کوئی آ رہا ہے۔ تم نے میرا دھیان بھٹکا دیا۔''

''اچھا جی۔ لگاؤ سارے الزام مجھ پہ۔ لاہور سے آ کے غلطی کر لی۔'' اس نے بازو پیچھے کر لیے۔

''تم نہیں بتا سکتی تھیں کہ اٹن دیکھا ہوا ہے تم نے؟''

''اور جیسا میرے بتانے سے تم رک جاتیں۔'' عبادہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''او کے ٹھیک ہے لیکن بہانہ تو کوئی اور بنا لیتی۔''

''بہانہ یہاں آنے سے پہلے سوچنا تھا۔'' عبادہ نے ٹونٹ کیا۔

''جتاؤ نہیں مجھے۔ پہلی بار پکڑی گئی ہوں۔''

''اوہ.....یعنی اس سے پہلے بھی تم یہاں آتی رہی ہو؟''

''ہاں۔ کئی بار۔'' وہ تفاخر سے بولی۔

''پھر تو پکڑے جانا تھا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔'' عبادہ نے طنز کیا۔

''جب تک ہے جان۔'' گل نے سینے پر ہاتھ باندھ کے ڈھٹائی سے کہا۔ عبادہ نے آنکھیں گھما کے سر جھٹک دیا۔ دس بیس منٹ تک ڈرائیور گاڑی چلاتا رہا جب حویلی کی چڑھائی آئی تو گل نے سیٹ سے آگے ہوتے ہوئے ڈرائیور کو دیکھا۔

''کاکا.....گاڑی روک دو۔''

''ہائیں.....؟ کیوں؟'' عبادہ چونک گئی۔

''یہاں سے پیدل جائیں گے۔ تمہیں کچھ دکھانا ہے۔''

''میں اس وقت اپنی آرام گاہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھنا چاہتی مس گل لالہ!''

''اگر تم نے یہ چیز نہیں دیکھی تو تم نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔تم پچھتاؤ گی ساری زندگی یہ نہ دیکھنے پر۔'' وہ اس کو باتوں میں گھیرنے لگی۔

''اچھا کونسا عجوبہ ہے وہ؟''

''دکھاتی ہوں۔کاکا.....گاڑی روکو ناں.....''

ڈرائیور تابعدار تھا۔فوراً گاڑی روک دی۔گل نے پچھلا دروازہ کھولا اور باہر نکلی،ساتھ عبادہ بھی باہر آ گئی۔چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔چاندنی چھپی ہوئی تھی۔اس طرف گھنے درخت تھے اور ہرا بھرا سا جنگل تھا۔اوپر حویلی کی مینارین نظر آ رہی تھیں جہاں روشنیاں جل رہی تھیں۔

''کاکا!تم جاؤ۔ہم آگے چلی جائیں گی۔'' گل نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو الوداع کیا۔کچھ دیر وہاں گاڑی کی گڑگڑاہٹ گونجی پھر جیسے ہی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی،چاروں کھونٹ آسیبی سی خاموشی پھیل گئی۔یہ حویلی کی سڑک تھی۔سیدھی اوپر جاتی تھی۔بیس منٹ پیدل چلنا تھا۔پھر وہ دونوں پہنچ جاتیں لیکن گل سڑک پہ چلنے کی بجائے،دائیں طرف جنگل میں اتر گئی۔

''گل؟ کہاں جا رہی ہو؟'' عبادہ بوکھلا گئی۔گل نے پلٹ کے دیکھا۔

''تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔آؤ میرے ساتھ۔تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' وہ نرمی سے اسے بلانے لگی لیکن عبادہ کو اس کی دماغی حالت پہ شک سا گزرا۔وہ جنگل میں جا رہی تھی۔رات کے ایک بجے۔کیا وہ ہوش وحواس میں تھی۔

''گل!اٹس ناٹ سیف۔وہ جنگل ہے۔جانور ہوں گے۔''

''تمہیں لگتا ہے،ہم یہاں خونخوار جانور رہنے دیتے ہوں گے؟ کم آن۔یہاں کچھ بھی نہیں۔یہ سیف ہے۔'' وہ گھنی جھاڑیوں میں آگے جا رہی تھی۔عبادہ ویران سڑک پہ اکیلی کھڑی تھی۔اس نے

دائیں بائیں دیکھا، دور دور تک پہاڑیاں ہائیڈ لگ رہی تھیں۔ اسے اندھیرے سے خوف آتا اور تنہائی سے اور بھی زیادہ۔ اس لیے وہ تیزی سے گل کے پیچھے آئی۔

''یہ حویلی کا جنگل ہے۔ گنے چنے درخت ہیں باقی تو گھاس پھوس اور چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ یہاں سے میرے کمرے تک راستہ جاتا ہے۔ اوپر۔ کچا راستہ ہے لیکن عین بالکونی کے سامنے پہنچا دیتا ہے۔ میں تمہیں جو دکھانے لے کے جا رہی ہوں۔ اسے دیکھنے کے بعد ہم اسی راستے پہ اوپر جائیں گی۔''

وہ آگے چلتے ہوئے لائحہ عمل بتانے لگی۔ عبادہ کو خوف آ رہا تھا۔ جنگل سے چھچھوندروں اور جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چاروں طرف طلسماتی خاموشی تھی۔ بھیانک سا احساس ہو رہا تھا۔

''گل! تم مجھے مارنے تو نہیں لے کے جا رہیں ناں؟'' اس نے خفیف سا پوچھا۔

''بالکل لے کے جا رہی ہوں۔ مجھے لوگوں کو مارنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔'' وہ ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بولی۔

''بہت وحشت ہو رہی ہے۔''

''ظاہر ہے۔ شہر سے جو ہو۔ ہم پہاڑی لوگوں کے لیے یہ کھائیاں، یہ جنگل، یہ راستے، یہ اندھیرے کچھ بھی نہیں۔ میں تو اکیلی بھی آ جاتی ہوں یہاں۔''

''لیکن تم یہاں اکیلے کرنے کیا آتی ہو؟'' عبادہ نے تفتیشی افسر کی طرح سوال کیا۔

''ایک پرانی یاد دہرانے..... خود کو موٹیویٹ کرنے.....'' وہ رک گئی۔ سامنے جھاڑیاں نہیں تھیں۔ گھاس تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پہ پھیلا نرم، ملائم گھاس کا قطعہ تھا جیسے نرم مخملیں قالین بچھا ہوا۔

''یہ جنگل..... اور اس کی یہ جگہ میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں عبادہ۔ یہ وہ جگہ ہے

جہاں میں نے بابا سے آخری ملاقات کی تھی۔اس کی اگلی صبح ان کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔'' یکدم ہی اسے اداسی نے گھیر لیا۔وہ وہاں قطعے پہ کھڑی، سامنے دیکھنے لگی اور لمحوں میں وہ پیچھے چلی گئی۔بچپن میں.....اپنے بابا کے پاس.....سات سال کی گل لالہ اور اکتیس سال کا اس کا باپ۔

''میرے پاس اگر زندگی میں کچھ بیش بہا ہے تو وہ بابا کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے ہیں۔ان لمحوں کو محسوس کرنے کے لیے میں جس بھی تکلیف، پابندی یا رکاوٹ سے گزرتی ہوں، وہ مجھے کچھ نہیں لگتے۔کسی عاشق کی طرح۔جیسے وہ محبوب کے دیدار میں انگاروں پر چلنے سے بھی گریز نہیں کرتا بالکل اسی طرح میں بھی بابا کے ساتھ گزارے ان دھندلے لمحات کو دوبارہ محسوس کرنے کے لیے کسی بھی درد سے نہیں چوکتی۔''

اس نے جھک کے ایک جھاڑی پکڑی اور وہاں سے دو انگلیوں کی مدد سے کچھ چننے لگی۔چنتے چنتے اس نے وہ دانے اپنی ہتھیلی پہ رکھے پھر دوسری ہتھیلی کی مدد سے ان دانوں کو مسل دیا۔مسلنے سے دانے ٹوٹ گئے اور ان کے اندر سے عرق نکلا۔اس نے وہ عرق خود پہ عطر کی طرح مل لیا۔بازوؤں پہ، فراک کے دامن پہ، جھک کے جوتوں پہ بھی مل لیا۔سارا تریاق لگانے کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔

''یہاں اندھیرا ہے۔خاموشی ہے۔ویرانی ہے اور بقول تمہارے وحشت بھی ہے، لیکن تم غور سے دیکھنا عبادہ۔اب یہاں حویلی سے زیادہ روشنی ہونے والی ہے۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

عبادہ اسے توجہ سے دیکھنے لگی۔

گل نے فراک کا دامن دو انگلیوں کی مدد سے اوپر اٹھایا پھر نرمی سے گھاس کے قطعے پر پہلا قدم رکھ دیا۔اس نے جیسے ہی قدم اٹھایا، وہاں سے روشنیوں کی ان دیکھی پھواری پھوٹ پڑی۔ننھی ننھی جلتی بجھتی روشنیاں، اس کے قدموں کے ساتھ اٹھنے لگیں۔گل نے پیروں پر تھرکنا شروع کیا۔

ڈیزنی کی شہزادی کی طرح فراک کا دامن کونے سے اٹھائے، وہ گھاس پر پھدک رہی تھی اور ایسا کرنے سے ننھے ننھے جگنو اٹھ کے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

پل بھر میں وہاں پیلی روشنیوں کی بہار سی آ گئی۔ سارا جنگل ایسے منور ہو گیا جیسے دن کی روشنی ہو۔ جگنو ایک قطار میں گل کے پیچھے پیچھے اڑ رہے تھے۔ جلتے بجھتے۔ فضا میں محبت بکھیرتے۔ سبز گھاس پہ پیلے قمقمے جلاتے۔ عبادہ گنگ منہ سے یہ دیکھ رہی تھی۔

''بابا مجھے آخری ملاقات میں یہاں لائے تھے۔ اس جھاڑی کے دانوں کو ہتھیلی میں دبا کے اس کا عرق نکالا اور میرے اعضاء پہ مل دیا پھر مجھے کہا کہ اس گھاس پہ بھاگو۔ میں بھاگی۔ میں جہاں جہاں بھاگتی، میرے قدموں کے ساتھ گھاس پہ سوئے ہوئے جگنو اٹھ جاتے اور میرے پیچھے چلنے لگتے۔ یہ دیکھ کے میں بہت بہت خوش ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ جادو جیسا تھا۔ بالکل میجک۔'' وہ گھاس پہ گول گول گھوم رہی تھی۔ جگنو اس کے ساتھ ساتھ چکر کاٹ رہے تھے۔ وہ روشنیوں کے درمیان تھی۔ روشنیاں افشاں کی طرح پھیل رہی تھیں۔

''بابا نے کہا تھا کہ بیٹا تمہاری کتاب میں بلبل اور جگنو والی جو نظم ہے۔ اس میں بلبل جگنو کے تعاقب میں گھر پہنچتا ہے۔ تم نے وہ بلبل نہیں بننا جو جگنو کے پیچھے چلے۔ تم نے وہ لالہ بننا ہے جس کا تعاقب جگنو کریں۔ جب جب میں اداس ہوتی ہوں تو یہاں آ جاتی ہوں۔ یہ جگنو میرے تعاقب میں لگ جاتے ہیں اور مجھے خوب ساری توانائی مل جاتی ہے۔''

''خوبصورت!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

درویش کی طرح گھول گھول گھومتی وہ دھڑام سے گھاس پہ لیٹ گئی۔ اس کا سانس بے ترتیب ہو گیا تھا۔ جسم پسینے سے بھر گیا تھا۔ اس نے جہاں جہاں عرق لگایا تھا۔ جگنو وہاں وہاں بیٹھ گئے۔ وہ اس عرق کا رس چوس رہے تھے۔ عبادہ مسحور کن انداز میں اس کے پاس آئی اور پنجوں کے بل بیٹھ

گئی۔ جگنو گل کی فراک کے دامن، بازوؤں اور پیروں سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی نے برقی قمقمے اس پر لگا دیے ہوں۔

وہ جگنو کاٹتے نہیں تھے۔ وہ جگنو چمکتے تھے۔ ننھے ننھے موتیوں کی طرح..... راکھ میں جلتے انگاروں کی طرح..... گل نے نرمی سے ہاتھ بڑھا کے عبادہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں پہ لگا عرق، عبادہ کو لگا اور یوں جگنو اڑ اڑ کے دونوں کی ہتھیلیوں سے چمٹ گئے۔ دونوں کے ہاتھ بیضاء کی طرح چمکنے لگے۔ عبادہ نے ہاتھ چہرے کے قریب کیا۔ دفعتاً اس کے چہرے پر کچھ چمکا۔

''عبادہ.....'' گل بوکھلا کے پیچھے ہوئی۔

''کک..... کیا ہوا؟'' عبادہ نے فوراً ہاتھوں سے جگنو جھٹک دیے۔

''تمہارا چہرہ۔'' گل نے انگلی سے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

''کک..... کیا ہوا میرے چہرے کو؟'' اس نے گھبرا کر چہرہ چھوا۔ ''کوئی چیز لڑ گئی ہے۔ کیا ہوا؟ بتاؤ مجھے۔''

''کالا ہو گیا ہے۔''

''کک..... کالا؟ کیا مطلب؟''

گل نے اپنی ہتھیلی والے جگنو دیے کی طرح اس کے چہرے کے قریب کر لیے، پیلی روشنی چمکی، عبادہ کا چہرہ نظر آیا۔

''گل.....'' یکدم عبادہ بھی پیچھے ہٹی۔

''کیا ہوا؟'' گل نے ہڑبڑا کے ادھر ادھر دیکھا۔

''تمہارا چہرہ بھی کالا ہے۔''

''کک..... کیا؟'' گل نے بے ساختہ چہرہ چھوا تو جگنو بھی ادھر ہی چمٹ گئے۔ اس نے

کپکپاتے ہاتھوں سے چہرے پر انگلیاں لگائیں اور انگلیوں کو دیکھا، انگلیوں کے سروں پر کالک چپک گئی تھی۔ اس نے اس کالک کو نتھنوں کے قریب کیا۔ وہ پٹرول تھا۔ ڈگی کے فرش کا چکنا سیاہ آئل دونوں نے دھکم پھیل میں چہروں، کپڑوں، گردنوں پر مل لیا تھا جس سے چہرے کالے ہو گئے تھے۔ وہ بچے ان کے کالے چہروں سے ڈرے تھے۔

راز آشکار ہونے پر دونوں کا بلند و بانگ قہقہہ چھوٹ گیا۔ وہ دونوں گھاس پہ لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ آدھی رات، گھنے جنگل میں وہ اس طرح ہنستی چلی جا رہی تھیں جیسے خدانخواستہ واقعی کوئی چڑیلیں ہوں۔

''اور مجھے لگ..... لگا بچے نے میری..... میری انسلٹ کی ہے.....'' گل بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولی۔

''اور میں نے بھی تمہیں..... سنا دی.....'' عبادہ نے اٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ گل کو دیا، گل نے تھاما اور کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی ہنسنے کی وجہ سے جان بے جان ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا دونوں نے سستا نشہ کر لیا ہو۔ چند لمحوں میں سارا رس جگنو چوس کے لے گئے۔ رس ختم ہوا تو جگنو بھی اڑ گئے۔ کچھ پل پہلے جنگل چمک رہا تھا اور اب وہی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔

''آج..... آج..... کا دن میں ..... کب..... کبھی نہیں بھولوں گی..... چڑ..... چڑیل.....'' عبادہ اپنا سارا وزن اس کے کندھے پر ڈالتی ہوئی بولی۔

''میں بھی.....'' گل نے بھی اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر دونوں ہنستے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔

دوستی کی شروعات مشکل ہوتی ہے لیکن جب ایک دفعہ ہو جائے تو اس کا اختتام نہیں ہوتا۔

☆.....☆.....☆

میرا وقت آئے گا، میں خود ہی لوٹ جاؤں گی
مجھ کو تمہاری رخصتی کی کوئی حاجت تو نہیں ہے

صبح اس کی فلائٹ نو بجے تھی۔ وہ سات بجے اٹھی، نہائی، جینز شرٹ پہنی، جیکٹ لی، بیگز میں ریشم کے سوغات ڈالے۔ گل اس کے لیے ناشتہ بنا کے لائی تھی۔ وہی فیٹس اور آئلز سے بھرا ہوا ناشتہ جس میں عبادہ نے محض دو گھونٹ مکھنی چائے پی تھی۔ جاتے ہوئے اسے یہ چائے بری نہیں لگی تھی۔ اس کے پاس ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ اوپر سے منیب خان جو اس کا سامان گاڑی میں رکھوا چکا تھا بار بار اسے نیچے آنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک چیز اٹھاتی، باہر نکلتی پھر یاد آتا دوسری چیز تو اٹھائی ہی نہیں۔ اپنی ٹکٹس بھی اسے تب یاد آئے جب وہ سیڑھیاں اتر کے نیچے آ گئی تھی۔ اس نے گل کو دوڑایا تو وہ ٹکٹس لے آئی۔

گل کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور گردن پہ سرخ نشان۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ساری رات نہیں سوئی۔ وہ ائرپورٹ نکلنے سے پہلے بی جان اور موٹی چچی سے ملی۔ بی جان تو حیران رہ گئیں۔ انہوں نے پوچھا بھی کہ وہ تو شندور کے لیے آئی تھی پھر کیوں جا رہی تھی۔ اس نے جو جواب ریشم کو دیا تھا، وہی بی جان کو دیا۔

''اگر اماں ابا اکیلے ہیں تو چلی جائے ورنہ شاندور تک رک جاتا تو اچھا تھا۔'' بی جان نے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

گل اسے مرکزی دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے سادہ کاٹن کی شلوار قمیص اور ریشمی دوپٹہ شانوں پہ ڈال رکھا تھا۔ بال چٹیا میں گوندھے ہوئے تھے۔ ''شندور تک رک جاتی ناں۔'' اس نے پھر سے بچوں سا اصرار کیا۔

''نہیں یار۔ اب ضرورت نہیں ہے۔ پھر کبھی۔'' وہ دلبرداشتہ تھی۔

''وعدہ کرو آؤ گی۔'' گل نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔

اس نے نرمی سے ہاتھ رکھا۔''ان شاءاللہ۔''

اور پھر گل اس کے گلے لگ گئی۔کافی دیر تک وہ اس کے گلے لگی رہی پھر پیچھے ہوئی۔''آئی ایم سوری فار.....اس دن کے لیے.....''

''اوہ کم آن گل۔اب بھول بھی جاؤ۔'' عبادہ نے جھنجھلا کے کہا۔وہ کمزور سی مسکرائی۔

حویلی سے باہر نکلتے ہی اس نے آنکھوں پہ گاگلز چڑھا لیے۔آسمان پر سفید بادل چھائے ہوئے تھے اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ملک کے بیشتر شہروں میں مون سون کی بارشیں ہو رہی تھیں۔کل اماں ابا نے بھی لاہور میں موسلا دھار بارش کا بتایا تھا۔

اس کا سارا سامان منیب خان لے گیا تھا سوائے ایک بیگ کے جو اس نے کراس میں پہنا تھا۔اس میں اس کا ذاتی سامان تھا۔پارکنگ میں آتے ہوئے اس کی پہلی ہی نظر غاذان پہ پڑی تھی۔وہ وہاں دو گارڈز کے ساتھ کھڑا تھا۔اس کی طرف پشت تھی۔خاکستری جینز پہ آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ پہنے،ہاتھ میں موبائل پکڑے،سر پہ کیپ رکھے،گارڈز کو کچھ سمجھا رہا تھا۔اسے دیکھ کے دل نے بیٹ مس کی.....مگر اگلے ہی لمحے وہ ان خیالات پہ لعنت بھیجتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔وہ جا رہی تھی،تھوڑی دیر میں وہ لاہور ہوگی اور غاذان چترال۔کوئی میل تھا یہ؟ایک آسمان،دوسرا زمین اور پھر بیچ میں اوزون لیئر بھی تو تھی۔یعنی کون؟

بھئی گلِ لالہ.....

اس نے گاڑی میں قدم رکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ٹھنڈک کی لہر ختم ہوگئی۔اندر اب تپش تھی۔سکون دینے والی تپش۔اسے برا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ الگ ہو رہی ہے۔وہ دور جا رہی ہے کبھی نہ واپس آنے کے لیے اور نہ ہی اسے اس فراق پہ رونا آ رہا تھا۔اسے محبت تھوڑی ہی ہوئی تھی۔اسے تو سب

اچھے لگے تھے۔ہاں.....بس اتنا ہی.....

منیب خان نے گاڑی کا انجن سٹارٹ کردیا۔گاڑی تھرتھرائی۔کچھ دیر میں وہ یہاں سے چلی جائے گی،گاڑی ریورس ہوئی،گیٹ کی طرف،تھوڑا پیچھے چلی،پھر آگے ہوئی اور گیٹ کے پاس پہنچنے سے قبل رک گئی،اس کے ساتھ پچھلا دروازہ کھلا،کوئی اندر آیا،دروازہ بند کیا اور منیب سے کہا۔

''چلو.....'' وہ غاذان تھا۔وہ سانس روک کے اسے دیکھنے لگی۔وہ کیوں بیٹھا تھا؟لیکن اس سے پہلے کہ اس کی حیرت پکڑی جاتی،اس نے دھڑکنوں پر قابو کیا اور باہر دیکھنے لگی۔غاذان نے کچھ کہے بغیر اپنا فون نکالا اور میسج سکرال کرنے لگا۔

اس کی گاڑی اس راستے پہ چل رہی تھی جس راستے وہ آئی تھی۔وہ ایون سے چترال جارہی تھی۔وہی پہاڑوں کا تیر جیسا راستہ،وہی پل،وہی پانی اور وہی پتھر.....وہی نشیب وفراز۔

منیب خان گاڑی چلا رہا تھا۔آتے وقت اس کے ساتھ ابتہاج تھا اور جاتے وقت غاذان۔ ابتہاج آگے بیٹھا تھا اور وہ پیچھے۔اس نے دھیرے سے گردن گھما کے اسے دیکھا۔غاذان فون میں لگا ہوا تھا۔کیپ اسی طرح سر پہ تھی۔سفید ٹی شرٹ کے عین درمیان ''G'' لکھا ہوا تھا۔کیپ کے ایک طرف کونے میں بھی ''جی'' بنا ہوا تھا۔

''اس کی ہر چیز پہ ''جی'' کا نشان ہے۔'' جی یعنی غاذان۔انگریزی میں۔

اس نے پرس سے ہینڈ فری نکالی،اپنا پسندیدہ میوزک لگایا اور سر پیچھے ٹکا دیا۔سفر پینتیس کلومیٹر کا تھا۔یعنی چالیس پینتالیس منٹ لگنے تھے۔اس نے آنکھیں موند لیں،رات جو نہ سونے کے سبب، اسے بڑی تیزی سے نیند آئی تھی۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی گاڑی چترال ائیر پورٹ کے سامنے رک گئی۔اسے جھٹکا لگا تو فوراً ہی آنکھ کھل گئی۔ہینڈ فری کانوں سے ہٹاتے ہوئے اس نے باہر دیکھا،وہ پہنچ چکی تھی۔فون

اور ہینڈ فری بیگ میں ڈالتے ہوئے وہ باہر آ گئی۔ غاذان اتر چکا تھا۔ منیب خان اس کا سامان اتار رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے دونوں بیگ گھسیٹتا ہوا قریب لایا۔ غاذان اس کے ساتھ تھا۔ اس نے منیب خان سے اپنا بیگ جھپٹ لیا، وہ بری طرح دنگ رہ گیا مگر وہ کوئی بات کیے بغیر ٹرمنل کی طرف بڑھ گئی۔ غاذان نے منیب خان کو دیکھا، منیب خان نے نظریں جھکا دیں۔ اس نے گہری سانس لی۔

عبادہ ٹرمنل کے دروازے پہ گارڈز کو ٹکٹ دکھا رہی تھی۔ گارڈ نے ایک نظر دیکھی پھر اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا، وہ اندر چلی گئی۔ غاذان اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس کی فلائٹ میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ وہ ویٹنگ ایریا میں انتظار کرنے کی بجائے سیدھا مہمان خانے میں چلی گئی۔ مہمان خانہ ٹرمنل کے اندر موجود ایک بیٹھک تھی جہاں چائے اور کھانا دستیاب ہوتا تھا۔

مہمان خانہ ویسا ہی تھا جیسے سرد علاقوں میں ہوتا ہے۔ دھوئیں کی وجہ سے چھت کالی پڑی ہوئی تھی۔ ستون بھی سیاہ تھے۔ فرش البتہ صاف تھا اور میزوں کی سطحوں پر سفید پوش بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں سے فریم، پولو ہاکی کے ڈنڈے، ہیلمٹس وغیرہ لٹک رہی تھیں۔ ایک طرف چھوٹا سا دروازہ بنا تھا جہاں اندر کچن تھا۔ کچن سے دھواں اٹھ رہا تھا اور گوشت کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، شاید وہاں کھانا بن رہا تھا۔

وہ کھڑکی سے جڑی ایک علیحدہ میز کی طرف بڑھی، بیگ ایک طرف رکھا اور اپنی لیے کرسی نکال لی۔ اسے غاذان سے کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ وہ سخت ناراض تھی۔ اگر کل گل نے اس کی حالت کے پیش نظر اس کو تفریح نہ کروائی ہوتی تو جانے وہ اب تک کتنے آنسو بہا چکی ہوتی۔ اس کے ذاتی احترام پہ چوٹ لگی تھی۔ وہ ذاتی احترام جس کو پس پشت ڈال کر اس نے گھوڑوں کے علاج کی ہامی بھری، حالاں کہ ٹکٹ دیکھنے کے بعد، اسے یہاں سے بغیر کچھ بولے چلے جانا چاہیے تھا لیکن طارق

سر سے وعدہ کر کے اس نے اپنی عزت نفس کا سودا کیا اور اپنے ذاتی احترام کو نقصان پہنچایا، وہ اس سے بڑی قربانی نہیں دے سکتی تھی۔

وہ کہنیاں میز پر رکھے، ہاتھوں میں فون پکڑے بلاوجہ کچھ سکرول کر رہی تھی۔ یہ سامنے تکلف سے بیٹھے اور فکرمندی سے دیکھتے ہوئے غاذان کو مکمل نظرانداز کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی۔

جس کھڑکی کے پاس یہ بیٹھے تھے وہاں سے پارکنگ نظر آ رہی تھی۔ مہمان خانے میں اور بھی مسافر بیٹھے ہوئے تھے جو ان کی میز سے دور اپنے اپنے ناشتوں میں مصروف تھے۔ اکا دُکا ویٹرز وہاں سے ٹرے لیے گزر رہے تھے۔

اس نے فون کی اسکرین سے نظر ہٹا کے غاذان کو دیکھا، وہ بدستور اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ چلیں جائیں۔ آگے میں خود دیکھ لوں گی۔'' وہ کافی روکھے لہجے میں بولی۔

''جب تک آپ کا جہاز ٹیک آف نہ کر لے اور مجھے آپ کی سلامتی سے جانے کی تسلی نہ ہو جائے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔ عبادہ نے شانے اچکائے۔ (جو کرنا ہے کرو۔ مجھے کیا۔ ہونہہ) وہ کرسی پہ ترچھا سا ہو کے بیٹھا تھا۔ دایاں بازو میز پہ تھا جس کی انگلیاں وہ قدرے دھیرے سے میز کی سطح پر بجا رہا تھا۔ اس کی گاگلز شرٹ میں اٹکی ہوئی تھیں، وہ عبادہ کو بہت صبر سے دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ سے مجھ سے ناراضگی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' اس نے درشت لہجہ اپنایا۔

''نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''آپ جانتی ہیں، اس سب میں میرا قصور نہیں ہے۔''

''مجھے کون لے کر آیا تھا؟ غاذان؟ سارے ویٹس کے ڈیٹا تو آپ چیک کرتے ہیں ناں۔ مجھے بھی آپ لائے تھے پھر اتنی نااعتباری کی وجہ؟'' اس نے فون نیچے رکھ دیا۔ ''اگر میں عمر میں چھوٹی

ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پچھلے سات سال میں صرف اور صرف گھوڑوں کو ٹھیک کر رہی ہوں۔ میرا ڈیٹا اس کا گواہ ہے۔ آپ لوگ مجھ پر اتنا سنگین الزام کیسے لگا سکتے ہیں؟''

غاذان سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ''میں نے نہیں لگایا۔ میں خود خان جی کو یہ وضاحتیں دے دے کر تھک گیا ہوں کہ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ مگر وہ مان کے نہیں دے رہے۔''

''ٹیسٹ کس نے کرائے ہیں مجھے یہ بتائیں؟'' وہ سیدھا مدعے پہ آئی۔

''خدا گواہ..... مجھے اس کا علم نہیں۔ کل جب ہم لوگ شاہی مسجد آ رہے تھے تب خان جی نے مجھے وہ کاغذات دیے اور کہا کہ آپ یقین نہیں کریں گے تو ثبوت کے طور پر وہ کاغذات آپ کو دکھا دوں۔ میں تو خود دم بخود رہ گیا تھا۔''

''غاذان! ڈاکٹر میں ہوں۔ میں سیمپل دوں گی تو آپ لوگ اس کی رپورٹس لائیں گے۔ میری غیر موجودگی میں کسی نہ کسی نے تو یہ سیمپل لیے ہیں اور تب لیے جب میں نے ٹیکے لگا دیے۔'' وہ کروفر سے بولی۔

''عبادہ! میں نہیں جانتا آپ نے کب ٹیکے لگائے۔ آپ نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔''

''آپ ہر بار اپنی وضاحت کیوں دیتے ہیں؟'' وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

''کیوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ عبادہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گہری سانس لی۔

''او کے..... میں آپ کی بات نہیں کرتی۔ آپ نہیں جانتے اس سب کے بارے میں لیکن کوئی نہ کوئی تو ایسا ہے ناں جس نے یہ کیا ہے؟ کوئی تو ہے جو نہیں چاہتا کہ میں (سینے پہ ہاتھ رکھا) علاج کروں؟ کوئی تو ہے جو مجھے یہاں سے بھیجنا چاہتا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ غاذان کی آنکھوں میں لاعلمی اتری۔ عبادہ بھی الجھی ہوئی نظروں سے باہر دیکھنے لگی۔

کھڑکی کے پار کھڑا منیب خان اب ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا تھا، اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے تیزی سے اس کی سرخ ڈوریوں والی آنکھیں یاد آئیں، وہ ٹھنڈی نظریں، کڑوا لہجہ اور نفرت سے بھرا انداز۔ اس کی آنکھوں میں سایہ سا لہرایا جیسے اپنے اس خیال پر یقین نہ ہو۔ غاذان اس کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کے فکرمند ہو گیا۔

''خیال رکھیے گا ڈاکٹرنی۔ بہت قیمتی گھوڑے ہیں یہ۔ ایسا نہ ہو آپ بغیر بیماری کا پتہ لگائے علاج کرنا شروع کر دیں اور ہم اپنے گھوڑوں سے محروم ہو جائیں۔''

وہ تیزی سے آگے ہوئی۔

''غاذان۔''

''ہاں۔'' وہ بھی توجہ سے آگے ہوا۔

''مجھے ٹیکے لگاتے ہوئے صرف ایک آدمی نے دیکھا تھا۔''

''کس نے؟''

''ابتہاج نے۔''

''اچھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ عبادہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر عبادہ کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ جز بز سا اسے دیکھنے لگا۔ عبادہ کی آنکھوں میں کچھ اشارہ تھا۔ ایک خفیہ سا رمز جسے ذہن میں ابھار کے وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے تیزی سے سر نفی میں ہلایا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ اصطبل کا مالک ہے وہ۔ وہ کیوں نہیں چاہے گا کہ آپ علاج کریں؟ نہیں۔ نہیں۔ یہ اس نے نہیں کیا۔''

''اسی نے کیا ہے غاذان۔ یہ جھوٹی رپورٹس اسی نے بنائی ہیں کیوں کہ جس دن میں ٹیکے لگا

رہی تھی۔وہ عجیب عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔"

"کیسی باتیں؟"

"یہی کہ گھوڑوں کو لمنس نہیں ہوسکتا۔ان کو ہرپیز.....ڈاؤن اینڈ سٹاک ہے۔مطلب.....وہ مجھے روک رہا تھا علاج سے اور جب میں ٹیکے لگانے لگی تو اس نے کہا دھیان سے ڈاکٹرنی، ہمارے گھوڑوں کو مارمت دینا۔کچھ اس طرح اور پھر.....میری ٹکٹ بھی تو وہی لایا تھا۔کل اس نے مجھے دی تھیں.....مجھے پورا یقین ہے۔یہ اسی نے کیا ہے تاکہ میں علاج نہ کرسکوں۔" وہ پورے یقین سے کہہ رہی تھی۔

"مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟ کیا ملے گا اسے آپ کو روک کے؟" غاذان نے برہمی سے پوچھا۔

"یہ بات آپ اس سے پوچھیں۔مجھے کیا پتہ۔" اس نے شانے اچکا دیے۔

"ٹھیک ہے۔اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی فون کر کے اس سے پوچھتا ہوں اور اسپیکر پہ رکھوں گا تاکہ آپ بھی سن لیں۔" وہ اپنے کزن پر کسی بھی طرح شک نہیں کرسکتا تھا۔اس لیے اس نے عبادہ کو چیلنج کرنے کے لیے ابتہاج کا نمبر ملایا اور اسپیکر پہ کرنے کے بعد میز پر رکھ دیا۔

"آپ کچھ نہیں بولیں گے۔مجھے بات کرنے دیں۔" فون میں اس کی مشینی سی آواز ابھرنے پر غاذان نے اشارے سے کہا۔

"کیوں فون کیا؟" کھوواری زبان میں وہ درشتی سے چلایا۔

"ابتہاج کچھ راز کی چیزیں پوچھنی ہیں۔پلیز اردو میں بات کرو۔" اس نے دوستانہ سے لہجے میں گزارش کی۔عبادہ میز پر بازو رکھے آگے ہو کر فون کو دیکھ رہی تھی جو دونوں کے درمیان پڑا تھا۔

"بولو۔" اردو میں آواز آئی۔

"میں مانتا ہوں کہ ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔تم مجھ سے ناراض ہو مگر گھوڑوں کا معاملہ تو

ہم دونوں کا سانجھا ہے۔تم اگر اصطبل کے مالک ہو تو میں گھوڑوں کا Finance (لین دین) دیکھتا ہوں۔اگر گھوڑوں کو کچھ ہوا تو نقصان ہم دونوں کا ہوگا۔یہ کسی ایک کا گھاٹا نہیں۔"

"مدعے کی بات کرو۔تمہارا وعظ سننے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔" وہ تلخی سے بات کاٹتا ہوا بولا۔غاذان نے خائف نظروں سے عبادہ کو دیکھا،عبادہ نے تنفر سے سر جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہے۔تم یہ بتاؤ۔عبادہ کو کیوں واپس بھیجنا چاہتے ہو؟" غاذان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کون عبادہ؟" وہ چونک گیا۔

"ڈاکٹر جسے میں لایا تھا گھوڑوں کے علاج کے لیے۔"

وہ غصے سے بھڑک اٹھا۔"اس نے گھوڑوں کا علاج کیا ہے؟ وہ علاج تھا؟ یا اس بے حس انسان نے مار دیا ہے میرے گھوڑوں کو؟"

"اس نے گھوڑوں کو نہیں مارا۔اس نے صرف لیمنس کے ٹیکے لگائے تھے۔" غاذان نے گھرکا۔

"تم مجھے بچہ سمجھتے ہو؟ کیا ہوا اگر میں ان پڑھ ہوں لیکن اتنی سمجھ ہے مجھے۔اس کی رپورٹس چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ اس نے زہر کے ٹیکے لگائے تھے اور تمہارے کہنے پر لگائے تھے۔"

"میرے؟" غاذان کے دل پر گھونسا پڑا۔"تم ہوش میں ہو؟"

"ہاں ہوں۔تم ہی لائے ہو اس پنجابی کو جو دو لفظ پڑھ کر سمجھتی ہے کہ اسے سب آ گیا ہے؟ یہ چھوئی موئی سی لڑکی کچھ نہیں کر سکتی۔اسے علاج آتا ہے نہ گھوڑوں کی خدمت۔تم نے بابا کے کان میں پتہ نہیں کیا ڈالا کہ انہوں نے اسے بلا لیا۔میں بتا رہا ہوں غاذان۔میں تمہیں مزید گھوڑوں کو نقصان پہنچانے نہیں دوں گا۔اس کے بعد تم جو بھی ڈاکٹر لاؤ گے میں اسے بھیجوں گا نہیں۔اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

عبادہ نے کچھ کہنے کے لیے لب تھرکے لیکن غاذان نے روک دیا۔

''لگتا ہے تمہیں اپنا نشہ نہیں ملا۔اس لیے تو یہ بکواس کر رہے ہو۔میری ڈاکٹر نے گھوڑوں کو نہیں مارا۔''

''گھوڑے کیوں مرے پھر؟'' وہ بری طرح غرایا۔''تمہاری وہ (گالی) ڈاکٹر.....اس کی (گالی) نے مارا ہے۔میں نے خود اسے ٹیکے لگاتے دیکھا ہے.....خدا کی قسم اگر مجھے اس وقت پتہ چل جاتا تو میں اس کی.....''

غاذان نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔عبادہ ہونٹ موڑ کر اسے استہزائیہ انداز سے دیکھ رہی تھی۔

''تو یہ سب اس نے کیا ہے۔'' غاذان نے پیشانی کو انگلیوں سے رگڑتے ہوئے گہری سانس لی۔''ان بیلیو ایبل (ناقابل یقین) میرا اور اس کا سرداری کو لے کر جھگڑا ضرور ہے لیکن وہ اس حد تک گر جائے گا کہ میرے ڈاکٹرز پہ گھٹیا الزام لگانے کے بعد اسے یہاں سے بھیجے گا۔میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔اس سے اچھا تھا،وہ مجھے خود کہہ دیتا۔میں آپ کو عزت اور احترام کے ساتھ یہاں سے بھیج دیتا۔یہ کونسا طریقہ ہوا کسی لڑکی کو بدنام کرنے کا،اس کے ادارے کو رسوا کرنے کا؟'' وہ بہت دکھی تھا۔

''اس نے جس طرح گل کو نیچ نظروں سے دیکھا اور اس پر بار بار ہاتھ اٹھایا میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کس طرح کی ذہنیت رکھتا ہے۔اس کے باپ نے بھی مجھے کل امپیچور ہونے کا طعنہ دیا اور آج اس نے میرے جنس کی تضحیک کی جس طرح وہ آئے روز اپنے گھر کی عورتوں کی کرتا ہے۔اس کی سوچ ہی چھوٹی ہے غاذان۔یہ ہے ہی گھٹیا ذہنیت کا مالک۔'' وہ بہت تلخی سے بول رہی تھی۔

''میرا دماغ کھول رہا ہے۔'' غاذان پیچھے ہو گیا۔''میں فریش ہو کے آتا ہوں۔جسٹ ایکسکیوزمی۔'' وہ معذرت کرتا ہوا اٹھ گیا اور سر کو نفی میں جھٹکتا مہمان خانے سے باہر نکل گیا۔عبادہ کا

دل چھریوں سے کٹ رہا تھا۔

''چھوئی موئی سی لڑکی۔ پنجابی۔ ہونہہ۔ دو جماعتیں پڑھی ہوتیں تو اسے پتہ چلتا ہے ذات اور نسل کے امتیاز سے دنیا کتنی آگے نکل گئی ہے۔ ٹھیک کہتی ہے گل۔ وہ ہے ہی ان پڑھ جاہل اور گنوار۔'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھے اور پیچھے ہوگئی۔ روح کو کھرچا گیا تھا۔ ہر بار دوسروں کو زخمی کرنے کے لیے چھری یا چاقو کی ضرورت نہیں ہوتی، بس کچھ الفاظ۔ ہاں کچھ الفاظ ہی کافی ہوتے ہیں اور پھر ایسے زخم لگ جاتے ہیں جن سے خون نکلتا ہے نہ گھاؤ لگتا ہے لیکن ان کی تکلیف تا عمر کم نہیں ہوتی۔ اس کو بھی یوسف خان نے ایک ایسا ہی زخم دیا تھا۔ کاش، اس کے پاس موقع آجائے اور وہ دونوں باپ بیٹے کو دل کھول کر مزہ چکھادے۔ یکدم اسے اپنے اندر ایک نفرت پھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

کچھ دیر گزری تھی جب مہمان خانے کے مسافر ایک ایک کر کے اٹھ گئے اور باہر چلے گئے۔ مہمان خانہ خالی ہوگیا۔ وہ کھڑکی سے باہر نیب خان کو دیکھتے ہوئے پیر جھلا رہی تھی۔ اس اثنا غاذان واپس آیا، اس کے تاثرات میں دبی دبی خوشی تھی۔ قریب آکے وہ رکا اور اس کا بیگ پکڑ لیا۔ جنبش پر عبادہ نے سر اٹھایا۔

''کسٹم آفس کھل گیا؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ خفیف سا مسکرایا۔ ''البتہ آپ کی فلائٹ کینسل ہوگئی ہے۔''

وہ کرنٹ کھا کر کھڑی ہوگئی۔ ''کک..... کیا مطلب؟''

''ابھی انتظامیہ نے بتایا مجھے کہ آگے موسم مون سون کی بارشوں کی وجہ سے بہت خراب ہے۔ ٹیک آف نہیں کیا جاسکتا۔''

''مگر یہاں تو موسم ٹھیک ہے۔''

''مادام آگے۔آگے خراب ہے۔'' وہ نرمی سے بولا۔عبادہ کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

''اگلی فلائٹ کب ہے؟''

''جب تک موسم ٹھیک نہیں ہوجاتا۔'' غاذان نے شانے اچکائے اور اس کا بیگ گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔تو کیا وہ واپس جارہے تھے؟ حویلی؟ ابتہاج کی رسائی میں؟ نہیں۔

''غاذان.....میں حویلی واپس نہیں جاؤں گی۔'' وہ تیزی سے بولی۔ وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔''آپ بیگ مجھے دے دیں، میں یہاں کسی ہوٹل میں رہ لوں گی۔'' وہ آگے آئی۔غاذان نے بیگ پیچھے کیا۔

''ہرگز نہیں۔آپ میری مہمان ہیں، میں نے آپ کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔جب تک دوسری فلائٹ نہیں مل جاتی، آپ حویلی میں رہیں گی۔'' وہ دوٹوک لفظوں میں بولا۔

''نہیں۔کانٹریکٹ ختم ہوگیا ہے۔میں اب واپس نہیں جاسکتی۔پلیز۔'' وہ التجا کرنے لگی۔

''کانٹریکٹ تب ختم ہوگا.....جب آپ ختم کریں گی۔'' غاذان نے اس کی بات اس کو لوٹادی۔

وہ پیچھے ہوئی اور سینے پر ہاتھ باندھے۔''ٹھیک ہے مسٹر غاذان۔میں اپنا کانٹریکٹ ابھی، اسی وقت ختم کرتی ہوں۔''

''میں پھر بھی نہیں جانے دوں گا۔'' وہ اڑ گیا۔

''کیوں؟ میں کسی ہوٹل میں رک جاؤں گی۔یہ سیاحتی علاقہ ہے۔یہاں لاکھوں ہوٹل ہوں گے۔''

''عبادہ! اس وقت ان لاکھوں ہوٹل میں سے کوئی ہوٹل نہیں ملے گا آپ کو۔شندور میں چند دن رہ گئے ہیں۔یہ سارے ہوٹل، سارے گھر کرائے پہ چڑھ چکے ہیں۔میں آپ کو بائے روڈ بھی نہیں بھیج سکتا۔آپ میری ذمہ داری ہیں اور میں کبھی بھی اپنی طاقت یا اختیارات آزما کر آپ کے لیے کسی سیاح سے کمرہ بھی نہیں چھینوں گا۔میں اچھا ضرور ہوں مگر اتنا نہیں۔'' وہ مسکراہٹ روک کے بولا۔

''مجھے نہیں چاہیے آپ کے اختیارات۔ میں اپنا کمرہ خود ڈھونڈ لوں گی۔'' اس نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے پھر سے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ غاذان نے بیگ پیچھے کر دیا۔ عبادہ نے جھنجھلا کے اسے دیکھا۔

''میں مانتا ہوں کہ آپ کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچی ہے۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یقیناً یہی کرتا مگر اس وقت ایک چیز ضرور سوچتا۔'' وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے رکا۔ ''میں اپنا لڑکی ہونا سوچتا۔ آپ بہادر ہیں مگر اتنی نہیں کہ یہاں تن تنہا کسی ہوٹل کے کمرے میں ٹھہریں۔ یہ اس صورت ممکن تھا جب ہم آپ کو ذاتی سکیورٹی فراہم کرتے۔ مگر ساری سہولیات ہونے کے باوجود ہم نے آپ کو حویلی میں رکھا۔ صرف آپ کی حفاظت کے لیے۔ آپ پلیز میرے ساتھ چلیں۔'' وہ بے حد اصرار کرنے لگا۔

''غاذان، بات عزت نفس کی نہیں ہے۔ بات غیرت کی ہے۔ یوسف خان نے مجھے جلی کٹی سنائیں، اس سب کے بعد میں اس کے گھر کا نوالہ کیسے کھا سکتی ہوں؟ بتائیں مجھے؟''

''خان جی غصے میں تھے عبادہ۔ انہوں نے جو کہا اپنے بیٹے کی باتوں میں آ کے کہا۔ ابتہاج نے ان کو بھڑکایا تھا۔''

''آپ ان کا دفاع کر رہے ہیں؟'' وہ غش کھا گئی۔

''ہاں کیوں کہ وہ مہمانوں کی بہت قدر کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے آپ کو شندور میں شامل ہونے کی پیش کش کی۔''

''مجھے شندور وندور کچھ نہیں دیکھنا۔ اس وقت میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔'' وہ بہت تکان سے بولی۔

''عبادہ خان، جی نے آپ کو گھوڑوں کے قریب جانے سے منع کیا ہے۔ حویلی میں ٹھہرنے

سے تھوڑی ہی۔ پلیز ضد مت کریں۔ میں کتنی محبت سے کہہ رہا ہوں۔ رک جائیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مان سے بولا۔ ''پلیز۔''

''اگر ابتہاج نے مجھے کچھ کر دیا تو؟''

''وہ کچھ نہیں کر سکتا عبادہ۔ میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔'' اس نے تسلی دی۔ عبادہ نے سر پیچھے پھینک دیا۔ اس کا دل اور سر دونوں پھٹ رہے تھے۔ وہ اپنی تضحیک کے بعد واپس نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں، زہر کا پیالہ پیا اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

''دشمن سے صلح ضرور کرنی چاہیے لیکن اسے دوسرا موقع نہیں دینا چاہیے۔''

ناشتہ کا وقت تھا۔ مہمان بڑے ہال میں ناشتے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ ہال میں ٹرے میں ناشتے کے لوازمات لڑکیاں لا رہی تھیں۔ بی جان، چچیاں، دوسری خواتین ہال کے اندر جا رہی تھیں۔

گل نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اب اس نے سرمئی رنگ کا چترالی جوڑا پہنا تھا۔ کانوں میں آویزے تھے اور آنکھوں میں کاجل۔ وہ ہشاش بشاش تر و تازہ نیچے آئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو بریخنہ اس کی روئیدگی اور تمکنت پر بھونچکی رہ گئی تھی۔ کیا سوچ رہی تھی یہ لڑکی!

ہال میں عالیہ خاتون مسکراتے ہوئے اپنی جگہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نیچے جہاں ان کی جگہ تھی، وہاں پہنچ کے بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے موٹی چچی نے بیٹھنا تھا مگر اس سے پہلے کہ چچی اپنا پشواز سنبھالتیں اور براجمان ہوتیں، کسی نے ان کا نام لیا۔

''ثمینہ چچی!'' وہ گل تھی۔ چچی جو بیٹھ رہی تھیں، سیدھی ہو گئیں اور اسے دیکھنے لگیں۔

''گلے؟''

''کیسی ہیں آپ؟'' گل مسکراتے ہوئے قریب آئی۔خیریت تھی؟ موٹی چچی کی بجائے، ثمینہ؟ ہمم؟

''میں؟'' چچی نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''جی جی آپ۔'' گل نے کمال مہارت سے انہیں الجھا کے عالیہ کے سامنے والی جگہ لے لی۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم.....'' وہ کہتے کہتے رکیں، تیزی سے نیچے دیکھا۔گل ان کی جگہ پر براجمان ہو کے اپنے لیے چیزیں نکال رہی تھیں۔ان کی کن پٹیاں سلگ اٹھیں۔تو یہاں بیٹھنے کے لیے.....اف!

وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئی لیکن عالیہ بیگم کے بائیں طرف براجمان خاتون ان کے بالمقابل ہو گئیں۔عبادہ کو بریخنہ چچی کے ساتھ جگہ مل گئی جو زیادہ دور نہیں تھی۔وہ وہاں سے گل کا چہرہ دیکھ سکتی تھی۔گل، عالیہ کی پیالی میں چھوٹے سے چینی کے چینک سے چائے ڈالنے لگی۔ وہ دلچسپی سے گل کا رویہ دیکھ رہی تھیں۔گل کے چہرے پر نرم مسکراہٹ تھی۔

گل نے کپ بھر کے چینک پیچھے کیا۔

''ہماری سوغاتیں پیٹ بھر کے کھایئے گا۔تکلف مت کیجیے گا۔ہمارے ہاں ان کی پیداوار وافر مقدار میں ہوتی ہے۔'' وہ بہت خلوص سے بولی۔

''ضرور۔'' عالیہ نے کا جواٹھایا۔

''بلتی مہمان نواز ہوتے ہیں لیکن احسان فراموشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔'' چینک ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ٹونٹ کی۔

''جس سے بھی یہ بات سنی ہے۔کم ظرف ہوگا۔'' عالیہ بیگم نے سر ہلایا۔

''اگر خود تجربہ کیا ہو تو؟'' گل نے ان کی آنکھوں میں دیکھا جہاں واضح ناگواری تھی۔

''غلط تجربہ کیا ہے۔'' وہ پیالی اٹھا کے آہستہ سے بولیں۔ دونوں کی آوازیں بے حد آہستہ تھیں۔ ہال مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ پیالیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

''انسان کے محسوسات کبھی غلط پیغام نہیں دیتے عالیہ باجی..... خیر..... ناشتہ کیجیے۔'' اس نے شانے جھٹک کے اپنے لیے پراٹھا اور مکھن آگے کھینچا۔ عالیہ چائے پیتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کافی غور سے، کافی گھور کے۔

''تمہارے بارے میں جو میرے محسوسات کہتے ہیں۔ کیا وہ بھی ٹھیک ہے؟''

''خود سے پوچھیں۔'' وہ ادا سے مسکرائی۔

''پوچھا ہے۔ خود کہتا ہے تم دونوں قبیلوں کے مابین سلامتی معاہدے پر خوش نہیں ہو۔ تم اب بھی، اپنے باپ کو یاد کرتی ہو۔'' ان کا انداز جاسوسانہ تھا جیسے کچھ کھوجنا چاہتی ہوں۔ نظریں گل کے چہرہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ وہ مسکرائی۔

''وہ میرا باپ تھا عالیہ گودائی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی لیکن ہاں۔ سلامتی معاہدے پر میں..... سب سے زیادہ خوش ہوں۔''

''مجھے وہ خوشی نظر تو نہیں آرہی۔'' انہوں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''آپ کو نظر چیک کروا لینی چاہیے۔ اس عمر میں ایسا مسئلہ ہو جاتا ہے۔'' وہ بہت ہی خیر خواہی سے بولی۔

''فی الحال میں چاہتی ہوں تم تنقید کا چشمہ لگاؤ اور جو اٹھارہ سال پہلے تمہارے باپ کے ساتھ ہوا، اس کا تجزیہ کرو تاکہ تمہیں سچائی کا پتہ چل جائے۔''

''آپ چاہتی ہیں میں گڑے مردے اکھاڑوں؟''

''اس میں برائی ہی کیا ہے؟''

''پرانی دشمنی کو ہوا مل جائے گی۔''

''پرواہ کسے ہے۔'' انہوں نے شانے جھٹکے۔ ''تمہیں انصاف مانگنا چاہیے۔''

''عالیہ باجی! اگر انصاف پہ آئی تو آپ کا دہرا نقصان ہوگا۔ اٹھارہ سال سے آپ ایک بھائی کا غم لے کے بیٹھی ہیں۔ اگلے اٹھارہ سال تک دوسرے کا غم منائیں گی۔ کیا آپ.....'' وہ آگے ہوئی، ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''اس کے لیے تیار ہیں؟''

عالیہ بیگم کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے پیالی نیچے رکھی پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی پلیٹ اپنی طرف کھینچی جس میں ادھ کھایا پراٹھا اور مکھن تھا۔ عالیہ بیگم نے پراٹھے کا نوالہ بنایا۔ گل ٹھٹک گئی۔ (ہک ہا..... دوسروں کو بتانے کے لیے کہ ہم میں کتنا پیار ہے۔ ایک دوسرے کا جھوٹا بھی کھالیتی ہیں۔) اس نے پراٹھے پہ پڑے فروٹ میں سے کاجو اٹھا کے ہتھیلی پر رکھے۔

''میرے رویے سے آپ لوگ ڈر گئے تھے۔ میں نے سنا۔'' کاجو کو ہتھیلی پر ادھر ادھر کرتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ ''وہ آپ کو ڈرانے کے لیے ہرگز نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی۔ خیر۔ میں آپ سے معذرت کرتی ہوں۔ چار دیواری میں موجود مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔'' گل نے ملتزم لہجے میں کہا۔ عالیہ بیگم کی کالقمہ حلق میں پھنستے پھنستے رہ گیا۔ انہوں نے تیزی سے پانی کا گلاس اٹھا کے لبوں سے لگایا۔

''تم.....''

''میرا قصور تھا۔ اس لیے معذرت کر رہی ہوں۔'' اس نے فوراً سے صفائی دی۔

عالیہ بیگم نے کچھ دیر اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا پھر ذرا سی پیچھے کھسکیں، فاخرانہ مسکرائیں۔ ''سن رہی ہیں بی جان.....'' وہ اونچا سا بولیں۔ یکدم چمچوں، پلیٹوں اور پیالیوں کی

آواز تھم گئی۔سب نے الجھ کے عالیہ بیگم کو دیکھا۔

''آپ کی پوتی اپنے رویے کے لیے معافی مانگ رہی ہے۔'' ان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔گل کو برا نہیں لگا۔معافی اکیلے میں مانگی جائے یا سب کے سامنے، مانگنا ہی بڑی چیز ہے۔

عالیہ بیگم کی بات سن کے سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔گل لالہ اور معافی؟ وہ بھی اپنے باپ کے قاتلوں سے؟ ہال میں عجیب سی سرگوشیاں سنائی دیں۔وہ لاپرواہی سے بادام کھا رہی تھی جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

سب ہی پھیکا سا مسکرا دیے۔جیسے اس انہونی پر یقین کرے بھی تو کون؟

''ماننا پڑے گا گلِ لالہ.....تم واقعی بڑی ہوگئی ہو۔'' انہوں نے آہستہ لہجے میں بتایا۔

''ابھی آپ نے میرا بڑا پن دیکھا ہی کہاں ہے۔'' اس نے دل میں سوچا لیکن ان کے سامنے جبراً مسکرائی۔''اب آپ کو نظر آگیا ہوگا کہ میں واقعی صلح و سلامتی کے اس معاہدے سے خوش ہوں۔''

عالیہ مسکرائی اور سر ہلایا۔''دیکھتے ہیں۔'' پھر انہوں نے پیالی اٹھائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔

☆.....☆.....☆

کسی نے لکھا ہے۔

بارش کی برستی بوندوں نے جب دستک دی دروازے پر

معلوم ہوا تم آئے ہو، انداز تمہارے جیسا تھا

وہ جو کہہ رہی تھی کہ موسم بالکل ٹھیک ہے، ایون کا پل کراس کرتے کرتے تیز بارش شروع ہوگئی، اتنی تیز کہ پہاڑ تک اس بوچھاڑ میں چھپ گئے۔غاذان نے شرارت سے ابرو اٹھا کے اس کی

طرف دیکھا، اس نے گہری سانس لی اور شیشے پر قطروں کے پھسلنے سے جو دھندلا گیا، ایک حرف لکھا۔ ''عبادہ۔''

آٹھ بج رہے تھے جب وہ واپس حویلی پہنچے۔ پارکنگ میں گاڑی رکی تو غاذان نے اترنے سے منع کیا۔ منیب خان پہلے اترا، اس نے بھاگ کے ڈگی سے چھتری نکالی اور غاذان کے شیشے کے پاس آ کے کھول دی۔ غاذان نیچے اترا، چھتری تھامی اور دوسری طرف گھوم کے عبادہ کے پاس آیا۔ وہ نیچے اتری تو اس نے فوراً چھتری اس پر کر دی۔ وہ دونوں حویلی کے اندر ایک ہی چھتری تلے آئے تھے۔

صحن پر تڑاتڑ بارش برس رہی تھی۔ لکڑیوں کے تختوں کو برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس وقت سرخ اینٹوں کا فرش بالکل خالی تھا۔ گل سامنے سیڑھیوں پر بیٹھا ہوئی تھی۔ اس کے پیروں پہ منڈیر کا پانی گر رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے ہولے ہولے گھونٹ بھر رہی تھی۔ مرکزی دروازے سے اسے اندر آتے دیکھا تو چونک گئی۔ عبادہ قدم قدم راہداری میں آئی، عین اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ گل سانس روک کے ہکا بکا دیکھ رہی تھی جیسے خدانخواستہ کوئی عجوبہ دیکھ لیا۔ (یہ غاذان کے ساتھ پھر سے؟ دل کو کچھ ہوا۔)

غاذان راہداری سے ہوتا سیدھا بی جان کے پاس چلا گیا۔ ان کے آگے جھکا، ہاتھ کی پشت چوم کے آنکھوں سے لگائی۔

''میرا بچہ۔'' بی جان نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ ان کا ہاتھ لیے تخت پر بیٹھ گیا۔

''میں نے سوچا شندور دیکھتی جاؤں.....'' عبادہ مسکرا کے بولی۔ گل کی آنکھیں دھیرے سے پھیل گئیں پھر اگلے ہی لمحے اس نے پیالی نیچے رکھی، ایک جست لگائی اور زور سے اس کے گلے سے جا لگی۔ عبادہ پیچھے گرتے گرتے بچی۔ (بھاڑ میں جائے یہ حسد کے جذبات۔ وہ پہلے دوست تھی۔)

''تھینک یو.....تھینک یو سو مچ.....'' گل کھلکھلانے لگی۔غاذان نے چونک کے گل کو دیکھا۔

(اتنی دوستی؟)

''بس بس۔'' عبادہ نے اسے پیچھے کیا۔''اتنا پیار بھی مت دکھاؤ،لوگ شک کرلیں گے۔''

گل نے گردن اکڑالی۔''کرتے ہیں تو کریں۔گل لالہ کو پرواہ نہیں۔''

عبادہ ہنسنے لگی۔بارش سبز بیلوں پر قطرہ قطرہ پھسل رہی تھی۔سیڑھیوں پر پڑتے قطرے،اچھل اچھل کے چھینٹے مار رہے تھے۔اوپر کی راہداریوں میں لڑکیوں،ہم جھولیاں کھڑی،بارش کی بوندوں کو ہتھیلیوں پر چن رہی تھیں۔

''یہ واپس کیوں آگیا؟''بی جان نے تعجب سے پوچھا۔

''فلائٹ کینسل ہوگئی۔موسم خراب ہے۔''

''ہاں.....اچانک ہی بارش شروع ہوگیا۔چلو اچھا کیا جو لے آیا۔ائیر پورٹ میں کہاں رہتا بیچارہ۔اگلا فلائٹ کب ہے اس کا؟''

''شندور کے بعد۔''

''ابھی تو کافی دن ہیں۔''

''ہوں۔''اس نے ہلکا سا سر ہلایا۔وہ بدستور گل کو دیکھ رہا تھا۔

''بارش.....'' عبادہ نے ہتھیلی باہر نکالی،بارش کی بوند بوند اس پہ پڑنے لگی،ہتھیلی،کلائی اور آستین لمحے بھر میں نم ہوگئیں۔

جانے بارش کے قطروں میں ایسی کونسی کشش ہوتی ہے کہ جس کا کچھ نہیں بچھڑا ہوتا،کچھ نہیں کھویا ہوتا،وہ بھی اپنے اندر اداسی محسوس کرتا ہے۔ان ننھی ننھی بوندوں میں جو محبت اور جو رومانس ہے،وہ شاید قدرت کی دوسری کسی چیز میں نہیں۔یہ سخت سے سخت انسان کے جذبات بھی جگا دیتا

ہے۔اس نے ہاتھ پیچھے کھینچا اور گہری سانس لی۔

''چلو کمرے میں چلتے ہیں۔جاؤ، میرا سامان اٹھاؤ۔'' اس نے حکم سا دیا۔گل تیزی سے بیگ کی طرف لپکی اور ہینڈل سے کھینچا۔

''چلو۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔عبادہ اس کے پیچھے چل دی۔

☆.....☆.....☆

شیخ سعدی کہتے ہیں۔

''حسد کرنے والے کو بددعا مت دو، وہ پہلے ہی حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔''

عصر تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔پہاڑوں پر بادل نیچے تک اتر آئے تھے۔دور سبز وادیاں پانی میں نہا رہی تھیں۔ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔حویلی میں شام کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی اور وہ دونوں بالکونی کے دروازے میں آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔پیروں پر کمبل تھا۔درمیان میں میوے رکھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں کافی کے بڑے بڑے کپ تھے۔یہ گل کی کرامات تھیں ورنہ عبادہ کو ان پہاڑوں میں کافی جیسی چیز ملنے کی قطعی امید نہیں تھی۔

عبادہ نے آتے ہی اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔وہ نفرت جو گل پہلے ہی ابتہاج سے کرتی تھی، اس میں قدرے اضافہ ہوا تھا۔عبادہ کو اس انسان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔جو بندہ منفی ہوتا ہے، وہ سب کے ساتھ منفی ہوتا ہے، یہاں تک کہ خود کے ساتھ بھی۔اسے اس بارے میں نہیں سوچنا تھا۔اگر وہ عبادہ کو اس لائق نہیں سمجھ رہا تھا تو کوئی ایسا ڈاکٹر لے آئے جو گھوڑے ٹھیک کر دے۔اسے گھوڑوں کی پرواہ ضرور تھی لیکن اسے یہ بھی دیکھنا تھا کہ اب ابتہاج کونسا ڈاکٹر لاتا ہے۔

گل برستی بوندوں کی ٹپ ٹپ کو محسوس کر رہی تھی، اس کی کافی کے کپ سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ماضی ہر وقت یاد نہیں آتا، وہ اس وقت یاد آتا ہے جب دل شدید اداس ہو جاتا ہے۔گل کا دل

میں ویرانیوں میں گھرا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' عبادہ نے کافی دیر سے اسے چپ دیکھا تو پوچھا۔

''مجھے بارش میں نہانے کا بہت شوق تھا عبادہ۔ میں اور بابا بارش میں نہاتے تھے، ہمیں یہ بوندیں بہت پسند تھیں۔'' اس نے ہاتھ پھیلایا۔ چند بوندیں اس کی ہتھیلی پہ موتیوں کی طرح گریں۔

''تم اپنے بابا کو بے تحاشہ مس کرتی ہوگل۔ آئی کین فیل اٹ۔'' اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

''ان دِنوں وہ شدت سے یاد آتے ہیں۔ ان کی برسی جو قریب ہے۔'' اس نے زبردستی مسکرا کے کہا مگر آنکھوں میں دور دور تک ویرانی تھی۔ باہر تیز ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے بارش کے قطرے اب سرسرا رہے تھے۔

''کب ہے ان کی برسی؟'' عبادہ نے ایسے ہی پوچھا۔

''سولہ جولائی۔''

''آج تین جولائی ہے۔ تیرہ دن رہ گئے ہیں۔''

''تیرہ دن، سولہ گھنٹے، پینتیس منٹ بعد ان کی انیسویں برسی ہوگی۔'' وہ بہت مشکل سے بولی تھی۔ گلا رندھ گیا تھا۔ پھر دفعتاً چہرے پر گہری فکر چھا گئی جیسے بزرگوں کے چہروں پر چھا جاتی ہے۔ ''پتہ نہیں حویلی میں کسی کو یاد ہوگا یا نہیں۔ جشن تو تم دیکھ رہی ہو۔ نہیں۔ (فوراً سر نفی میں ہلایا) کسی کو یاد نہیں ہے۔''

''تمہاری امی کو ضرور یاد ہوگا، کسی کو یاد ہو نہ ہو۔'' عبادہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

وہ استہزائیہ انداز سے ہنسی۔ ''امی؟''

''ہاں۔''

''چچی ہے وہ میری۔ میری امی میرے بابا کے ساتھ مر گئی تھی۔ میں دونوں طرف سے یتیم

ہوں۔'' وہ دیوانوں کی طرح ہنسی۔

عبادہ نے کپ ایک طرف رکھا اور آگے ہوئی۔

''گل.....تم باقی سب کے ساتھ چاہے جو بھی سلوک کرو۔اپنی امی کے ساتھ ٹھیک سے رہو۔ماؤں سے ناراض نہیں ہوا کرتے۔وہ فی الوقت ڈانٹ دیتی ہیں، مار دیتی ہیں، گالیاں یہاں تک کے طعنے اور تشنے بھی دے دیتی ہیں لیکن وہ جو کرتی ہیں، دل سے نہیں کرتیں۔خود سے پیدا کو وہ کوس نہیں رہیں اور پھر بریحنہ چچی تو خود بہت سویٹ ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

گل نے تیورا کے اسے دیکھا۔

''سویٹ؟ یہ (کپ کی طرف اشارہ کیا) کافی بھی اس سے زیادہ سویٹ ہے عبادہ۔'' وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

''شش.....ایسی باتیں نہیں کرتے۔شی از یور مم (وہ تمہاری ماں ہے۔)'' عبادہ نے پچکارا۔

''وہ میری چچی ہے۔میرے چوتھے چچا کی بیوی دیٹس اٹ۔'' وہ انتہائی رکھائی سے بولی۔اس سے آگے عبادہ کے لیے فل سٹاپ تھا۔ایک بورڈ کہ اب میں مزید ان کے بارے میں نہیں سننا چاہتی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' عبادہ مصلحت سے پیچھے ہوئی۔''مجھے یہ بتاؤ۔اس دن انہوں نے تم پہ ہاتھ کیوں اٹھایا تھا؟ آئی نو کہ تم بدتمیزی کر رہی تھیں مگر تم نے ایسا کیا کہہ دیا کہ ان کو اتنا طیش آ گیا؟''

''سن لوگی؟'' گل نے چیلنج کیا۔

''کیوں؟ کوئی بری بات تھی؟'' عبادہ جھینپ گئی۔

''نہیں۔بری نہیں تھی۔کڑوی تھی۔'' اس نے گھونٹ لیا۔

''مطلب؟''

''تمہیں میرے بابا کی موت کے بارے میں کتنا پتہ ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہی کہ ان کا گھوڑے سے گر کر انتقال ہوا تھا۔'' اس نے شانے اچکائے اور کپ ہونٹوں سے جوڑا۔

''ان کا انتقال نہیں ہوا تھا۔'' گل گھائل لہجے میں بولی۔ یکدم اس کی نیلی آنکھوں میں ایک سایہ سا اترا۔ ''ان کا قتل ہوا تھا۔''

عبادہ کی کافی منہ سے پھوار بن کر نکلی۔ اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گل کو دیکھا۔ وہ بالکونی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ انگلی کافی کے کپ کے گرد گھوم رہی تھی اور سفید سے چہرے پر کرب ہی کرب تھا۔ وہ نقاہت سے پلکیں جھپک رہی تھی۔

''اٹھارہ سال پہلے.....''

اور اس نے کہنا شروع کیا۔ بعض اوقات کہنا، بول دینا اچھا ہوتا ہے۔ دل میں چھپے ہوئے غم اور تکلیفوں کو ہمیشہ ایسے انسان کے سامنے بیان کرنا چاہیے جس کا کوئی مفاد نہ ہو۔ ریل گاڑی کے سفر میں سامنے بیٹھے مسافر سے کہہ دینا۔ بس میں ساتھ بیٹھے اجنبی سے کہہ دینا یا پھر کسی ویٹنگ ایریا میں کسی پرائے کو اپنا سامع بنالینا۔ دکھ اور شکوے، اس انسان کے سامنے رکھنے چاہئیں جس کا دل نجس اور مفاد سے پاک ہو۔ دنیا کے دو مختلف کونوں میں رہنے والے، مختلف ثقافت کے باسی، مختلف خاندانوں اور نسلوں کے افراد جب اپنی باتیں بانٹتے ہیں تو دکھ کم ہو جاتے ہیں۔ بوجھ اتر جاتے ہیں۔

بارش برستی رہی، گل کے ہونٹ ہلتے رہے، عبادہ کا دل دکھ سے بھرتا رہا۔ جیسے ایک جام سے دوسرے جام میں کوئی مشروب منتقل ہو رہا ہو۔ عصر کی روشنی چھٹ گئی، مغرب کا نیلگوں اندھیرا پھیل گیا۔ پرندے لوٹ گئے، جگنو جاگ گئے۔ حویلی میں نماز مغرب کا وقت ہوا۔ کھانے کا دور

چلا۔ گھنٹہ در گھنٹہ۔ گھڑی در گھڑی۔ ان کے کمرے کی بتیاں نہیں جلیں۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔ ساری حویلی روشن ہوگئی۔

بارش تھم گئی۔ وقت بدگیا۔ دن سے رات ہوگئی۔

یکدم ابراہیم نے کمرے کی لائٹ جلائی تو دیکھا، گل عبادہ کی گود میں سر رکھے، نم چہرہ لیے فرش پہ سوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

غم کیسا نہ کروں؟ یہ رات، شبِ تاب سے نکلی ہے
میرے دکھ کی جو دھن ہے بڑے رباب سے نکلی ہے

وہ بیڈ پہ بال کھول کے لیٹی ہوئی تھی۔ عبادہ اس کے پاس اکڑوں بیٹھی، اس کے بالوں میں پٹھانوں کی طرح پتلی پتلی چٹیاں بنا رہی تھی۔ کمرے کی لائٹ بند تھی۔ صرف لیمپ کی روشنی جل رہی تھی۔ گل کچھ دیر پہلے سو کر اٹھی تھی۔ اس کا دل یوں ہلکا ہوگیا تھا جیسے کبھی بھاری تھا ہی نہیں۔ تنکے سے ہلکا، سائے سے ہلکا، محض چند ملی گرام۔ عبادہ نے مسیحائی نہیں کی تھی لیکن وہ ایک بہترین سامع بنی تھی اور بعض اوقات سامنے والا تسلی، مشورہ، حوصلہ یا ہمدردی نہیں مانگتا، وہ چاہتا ہے، اسے صرف سنا جائے تاکہ وہ اپنے دل کا آتش فشاں نکال سکے۔

"کل کالاش جانا ہے۔ رمدین کاکا کا انتقال ہوگیا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

(رمدی کاکا کالاش کے ایک بڑے بزرگ تھے جنہوں نے سو سال کی زندگی پائی تھی۔ آج اچانک ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ کالاشی جو بلتیوں سے ملنے آئے تھے، کل وہ فوری طور پر کالاش واپس جا رہے تھے۔)

"جنازہ کس ٹائم ہے؟" عبادہ نے معصومیت سے پوچھا تو گل اس معصومیت پر جان وار گئی۔

''جنازہ؟''اس نے لاڈ سے دہرایا۔وہ چٹیا بنانے میں مگن تھی۔

''ہاں۔''

''کالاشیوں کے جنازے نہیں ہوتے مادام۔وہ مسلمان نہیں ہیں۔''

''کک.....کیا؟''اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ کافر ہوتے ہیں۔یاما اور رام نام کے جو ہندو بت ہیں۔ان کو پوجتے ہیں۔''

''پھر وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''وہ دم بخود رہ گئی۔

''ہجرت کے وقت یہاں سے گئے ہی نہیں۔یہاں رہ گئے۔یہاں آبادیاں قائم کیں،خاندان بنائے۔''

''اوہ.....ٹھیک ٹھیک.....''اس نے چٹیا بنا کے ایک طرف رکھی پھر دوسرے بال اٹھائے اور تین میں تقسیم کر دیے۔

''تمہارے بال بہت پیارے ہیں۔''وہ پذیرائی کرنے لگی۔

''شکریہ۔''

''کس پہ گئے ہیں؟''

''پتہ نہیں۔''اس نے مسکرا کے ابرو اچکائی۔

''مجھے پتہ ہے۔تمہاری ماما پہ گئے ہیں۔میں نے ان کے بال دیکھے تھے جب وہ تندور میں روٹیاں لگا رہی تھیں۔یہ لمبی چوٹی ہے۔گھٹنوں تک جاتی ہے۔''وہ جس محبت سے بولی تھی اسی قدر ناگواری سے گل نے اس کے ہاتھ سے اپنے بال لیے اور اٹھ کے بیٹھ گئی۔

''مجھے ان سے کمپیئر مت کیا کرو۔مجھے غصہ آتا ہے۔''وہ بالوں کو سمیٹنے لگی۔

عبادہ ششدہ رہ گئی۔''گل وہ تمہاری ماں ہے۔خون ہے ان کا تم میں۔''

''بس یہی تو کسک ہے۔اپنی رگوں سے ان کا خون نہیں نکال سکتی۔'' وہ بالوں کا جوڑا بنا کے کیچر لگاتے ہوئے تلخی سے بولی۔

''بہت غلط بات ہے۔تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔'' عبادہ نے فوراً ٹوکا۔

''اگر تمہیں مزید ان کا دفاع کرنا ہے تو میں یہاں سے جا رہی ہوں۔''

''لیکن میں.....''

''میں چلی ہی جاتی ہوں۔'' وہ بیڈ سے اتر گئی۔

''گل.....میری بات تو سنو.....''

''گڈ نائٹ۔'' وہ بالکونی میں چلی گئی، دروازہ باہر سے بند کر دیا۔عبادہ کلس کے رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

حویلی میں دبی دبی ہلچل تھی۔کالاشی خواتین تیار ہو رہی تھیں۔بی جان اور عالیہ صحن میں براجمان میں تھیں۔وہ دونوں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔عبادہ نے سیاہ پینٹ پہ سرخ شرٹ پہنی ہوئی تھی، پیروں میں سنکیرز تھے جب کہ گل نے سفید رنگ کی فراک، کلیجی رنگ کے دوپٹے کے ساتھ پہنی ہوئی تھی۔دونوں کالاش جانے کے لیے تیار تھیں مگر اس کے بارے میں غاذان کو علم نہیں تھا۔وہ مصروف سا صحن میں ٹہل رہا تھا۔

''ہری اپ عبادہ۔وہ چلے جائیں گے۔'' عبادہ جو جھک کے اپنا فون چارجر سے ہٹا رہی تھی، اس کی آواز پہ گڑبڑا گئی۔پھرتی سے فون بیگ میں ڈالا اور اپنا سکارف لیے باہر آ گئی۔گل پہلے ہی راہداری میں آگے آگے چل رہی تھی۔وہ دونوں ایک ساتھ نیچے آئیں تب ہی کالاشی خواتین ایک راہداری سے باہر نکلیں۔وہ ان کے ساتھ ہی نیچے آ گئیں۔ان کو آتا دیکھ کے غاذان ایک طرف ہو گیا۔اسی اثنا عبادہ کو اپنے جوتے کی لیس نظر آئی جو کھلی ہوئی تھی۔وہ چار و ناچار صحن کی سیڑھیوں پر

بیٹھ گئی اور لیس باندھنے لگی۔کالاشی خواتین بی جان اور عالیہ سے الوداع کر رہی تھیں۔گل بھی ان کے ساتھ تھی۔

غاذان کی نظر اس پہ پڑی تو قدم قدم چل کے اس کے سامنے آ گیا۔وہ سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھا۔شرٹ کی آستین کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھی۔سر پہ پی کیپ تھی۔گاگلز گریبان میں اٹکی ہوئے تھے۔اس نے مکا سا بنا کے ہونٹوں پہ رکھا اور کھنکارا۔

عبادہ نے جھٹ سے سر اٹھایا۔

''کالاش جائیں گی؟'' وہ آنکھوں میں چمک لیے پوچھ رہا تھا۔

''بالکل۔'' عبادہ مسکرا کے کھڑی ہو گئی۔

''اور مجھے تو مروت کے مارے بھی نہیں پوچھیں گے؟ ہے ناں؟'' گل کی آواز پہ وہ چونک گیا۔وہ عبادہ کے پیچھے ستون کے ساتھ کمر پہ ہاتھ رکھے، ناک سکوڑے کہہ رہی تھی۔

''تم بھی جانا چاہتی ہو؟'' اس نے مسکراہٹ دبائی۔

''ہا۔مجھ سے پوچھا جا رہا ہے اور عبادہ کو آفر کی جا رہی تھی۔'' وہ جل کر کباب ہو گئی۔

''تم جانا چاہتی ہو تو چلو۔اٹس ویل اینڈ گڈ۔عبادہ کو پارٹنر مل جائے گا۔''

''آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔میں پہلے سے ہی تیار تھی۔'' وہ شانے اچکا کے عبادہ کے قریب آئی۔غاذان نے گہری سانس کھینچی۔

کچھ دیر میں بلتی مہمان اور کالاشی لڑکیوں کا ٹولہ ان کے ہمراہ چلتا ہوا پارکنگ میں آ گیا جہاں دو بڑی پک اپس اور ایک چھوٹی جیپ رینگلر روبیکان تیار کھڑی تھیں۔کالاشی لڑکیاں ایک پک اپ، بلتی لڑکیاں اپنے قبیلے کے لڑکوں کے ساتھ دوسری میں جب کہ وہ، عبادہ اور غاذان چھوٹی جیپ میں بیٹھ گئے۔چھوٹی جیپ کی چھت نہیں تھی۔گل آگے بیٹھ گئی، غاذان کے ساتھ اور اس نے

پچھلی سیٹ چنی۔ آج موسم صاف تھا۔ سورج نکلا ہوا تھا اور بھیڑوں کی اون کی طرح آسمان پر کہیں کہیں بادل پھیلے ہوئے تھے۔ عبادہ نے ہمیشہ کی طرح رج کے سن بلاک لگایا تھا جب کہ گل تو اس سورج اور اس کی تپش کی عادی تھی۔

غاذان جب ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا تو بیلٹ لگاتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پیچھے دیکھا۔

''عبادہ! آپ آگے بیٹھ جاتیں۔ گل.....'' ساتھ ہی اس نے گل کو آنکھیں دکھائیں۔

''نہیں۔ میں نے خود یہ جگہ لی ہے۔ آئی ایم گڈ۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''آر یو شور؟'' وہ بیک ویو میں دیکھ کے فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

''شور۔'' وہ مسکرائی۔

گل نے برہمی سے غاذان کو دیکھا لیکن کڑوا گھونٹ بھر کے رہ گئی۔ غاذان نے اس کی بات پہ یقین کرتے ہوئے جیپ کا انجن گرمایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ پک اپس آگے تھیں جب کہ ان کی گاڑی پیچھے۔

کچھ دیر میں ان کی گاڑی ہوا کے لہروں پہ سوار تھی۔ وہ ایک پہاڑ کے درمیان میں بنی سڑک پہ چل رہے تھے۔ بائیں طرف نیچے، بہت نیچے دریائے چترال ٹھاٹھیں مارتا ہوا، پتھروں سے سر پٹختا ہوا بہہ رہا تھا جب کہ دائیں طرف پہاڑ تھا۔ دریا کے پار کوہ ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ آسمان پہ ہنوز سفید بادل چھائے ہوئے اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راستہ بہت خطرناک تھا۔ اگر وہ تھوڑے سے بھی ڈھلتے تو سیدھا کھائی میں جا گرتے۔ سڑک سنگل تھی، موڑ کے علاوہ دو گاڑیاں کراس نہیں لے سکتی تھیں۔

دریا کے ساتھ چترال کی آبادی تھی۔ کنارے پر درختوں کے جھنڈ اور کہیں کہیں ایک لمبے قطعے پر دریا کے کنارے صرف پتھر نظر آتے تھے۔ لوگوں کے چھوٹی چھوٹی کھیتیاں ہر طرف پھیلی ہوئی

تھیں۔ہلکی سبز کھیتیاں اور گہری سبز کھیتیاں۔درمیان میں کہیں کہیں تکونی چھتوں والے گھر تھے۔فضا خاموش تھی، ہوا سرسرا رہی تھی۔کھائیوں اور کھنڈروں سے پرندوں کی مدھر مدھر آوازیں آرہی تھیں۔

گل کہنی دروازے میں رکھے، دلچسپی سے اترتی چڑھتی سڑک کو دیکھ رہی تھی جو مری کی سڑکوں کی طرح کبھی نشیب میں جاتی تو کبھی فراز میں۔عبادہ نے البتہ ہاتھ میں فون پکڑ رکھا تھا۔وہ ویڈیو بنا رہی تھی۔اس کے بال پیچھے اڑ رہے تھے۔

اسی اثنا غاذان نے ڈیش بورڈ کھولا اور سیاہ رنگ کا کیمرہ باہر نکالا۔گل نے گردن موڑ کے اسے دیکھا، وہ ہاتھ پیچھے کر کے اسے عبادہ کو پکڑا رہا تھا۔گل یہ ساری صورتحال دیکھ رہی تھی۔

''اس سے بنائیں تصویریں.....ایچ ڈی میں آئیں گی.....''

عبادہ ٹھٹکی پھر بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کیمرہ تھام لیا۔اس نے اپنا فون نیچے رکھا، کیمرہ کا اسٹریپ گردن میں پہنا اور ہاتھوں میں کیمرہ پکڑ لیا۔غاذان سٹیئرنگ پکڑے قدرے دھیان سے گاڑی چلا رہا تھا۔اس کی انگلی میں موجود سیاہ انگوٹھی دمک رہی تھی۔

''خان جی.....وہ ہماری مہمان ہے۔'' گل نے جتانے والے انداز میں کہا۔لہجہ کھوواری تھا۔

''ہوں؟'' غاذان چونکا۔

''میں نے کہا وہ صرف.....صرف ہماری مہمان ہے۔'' لہجے میں حتی المقدور اپنی حسد چھپانے کی کوشش کی۔

''اس لیے تو خاطر تواضع کر رہا ہوں کہ اسے اچھا لگے۔'' وہ مسکرا کے بولا۔آنکھوں پہ سیاہ گاگلز تھے سو آنکھوں کی کہانی چھپ گئی۔

''تصویر بنانا مجھے بھی آتا ہے۔میرے خیال سے آپ کو گھر والی لڑکی کو اس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے ہاتھ گود میں رکھ لیے تھے۔غاذان نے مڑ کے اس کا چہرہ دیکھا۔

''آپ جل رہی ہیں؟'' انداز چونکنے والا تھا۔

''نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ (جلنا کیا ہوتا ہے؟ بات حسد..... حسد تک پہنچ گئی تھی۔)

''آپ کو اس کے کئی موقع ملیں گے۔ اس نے تو چلے جانا ہے۔ اچھا ہے ایچ ڈی تصویریں اتار لے۔ اس سے کم از کم ہمارے چترال کے بارے میں اچھی خبریں مشہور ہوں گی۔''

''آپ چترال کی فکر میں یہ ناز برداریاں اٹھا رہے ہیں؟'' اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ عبادہ اپنے کام میں مگن تھی۔

''تو آپ کو کیا لگتا ہے؟ میں ہر لڑکی کے ساتھ ایسے پیش آتا ہوں؟'' وہ برا مان گیا۔

''مجھے کیا پتہ؟'' وہ جل کے بولی۔ وہ لوگ ایون بازار سے گزر رہے تھے۔ دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جو سڑک سے چند سیڑھیاں اوپر تھیں۔ وہاں کے باشندے غازان کو پہچانتے ہوئے آگے آ آ کے سلام کر رہے تھے۔

''آپ شک کر رہی ہیں مجھ پہ۔ میں بے چارہ تو بس..... میزبانی کر رہا ہوں۔'' وہ سلام کے جواب میں ہاتھ ہلا رہا تھا۔

''یہ میزبانی ہے یا آپ کو محبت ہو رہی ہے خان جی.....''

غازان کا پیر بریک پہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ ''تم ہوش میں ہو گل؟''

''بالکل ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ سختی سے بولا۔

''ہے۔ میں واپس جا کے بی جان کو بتاؤں گی آپ کے بارے میں۔'' وہ دھمکانے لگی۔

''کیا بتاؤ گی؟''

''یہی کہ آپ کو لاہور کی پنجابن اچھی لگی ہے آپ کی شادی اسی سے کرا دیں۔'' وہ بھنا کے بولی۔

''تم مجھے پٹوانا چاہتی ہو۔'' غاذان نے صدمے سے اسے دیکھا۔

''اچھا ہے ناں۔ آپ کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا۔''

''تم سے کوئی نہیں جیت سکتا گل۔'' غاذان نے ہار مانتے ہوئے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

''غاذان غاذان..... گاڑی روکیں ایک منٹ.....'' اس نے غاذان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پرجوش سے لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا؟'' غاذان نے گاڑی سڑک کے ایک طرف کرتے ہوئے بیک ویو میں دیکھا۔

''مجھے یہاں کچھ تصویریں لینی ہیں۔''

''یہ ایون بازار ہے۔ کالاش ابھی بہت دور ہے۔'' گل تیزی سے بولی۔

''کوئی بات نہیں گل۔'' غاذان نے نچلا لب کاٹ کے اسے دیکھا۔ گل کے دل پہ گھونسا پڑا۔ غاذان نے واپس بیک ویو میں عبادہ کو دیکھا اور مسکرایا۔

''آپ لے لیں عبادہ۔ ہم یہاں انتظار کر رہے ہیں۔'' گل کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' عبادہ اچھل کے جیپ سے اتری اور بھاگ کے دکانوں کے پاس گئی۔ وہاں دکاندار اور مقامی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کیمرہ آنکھ پہ لگا کے ''کلک'' پہ ''کلک'' کرنے لگی۔ گل نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ (یہ جگہ بالکل بھی پیاری نہیں تھی لیکن شہر والے کہاں سمجھیں گے؟ انہیں تو ایک پہاڑ بھی بہشت لگتا ہے۔)

دس منٹ بعد وہ سینکڑوں تصویریں کھینچ کے واپس بیٹھ گئی تھی۔

''چلیں؟'' غاذان نے پوچھا۔

''ہاں جی.....'' وہ ہلکی ہلکی ہانپ رہی تھی۔ غاذان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''تمہارا شہر بہت خوبصورت ہے گل، ہمارے لاہور میں ایسے منظر نہیں دیکھنے کو ملتے۔'' وہ

کیمرے میں تصویریں دیکھتے ہوئے سحر زدہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''ہوں۔'' گل نے جبراً سر ہلایا۔

''ویسے کالاش کتنا دور ہے یہاں سے؟'' وہ دونوں کے سیٹ کے درمیان آگے ہوئی۔ایک ہاتھ غاذان کی سیٹ پہ تھا، دوسرا گل کی سیٹ پہ۔

''تقریباً بیس کلومیٹر۔سڑک سیدھی ہو تو بندہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتا ہے لیکن یہ سڑک بہت بمپی اور دشوار ہے۔اس پہ گاڑی رولر کوسٹر بن کے چلتی ہے۔اس لیے وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم پہنچ سکتے ہیں۔''

ان کے ٹائر کے نیچے اب ایک چھوٹا سا پل آ گیا تھا۔پل کے دائیں بائیں سرخ سریے کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔نیچے دریائے چترال بہہ رہا تھا۔یہاں اس کا بہاؤ قدرے زیادہ تھا۔پانی کی بلند آواز آ رہی تھی۔

''اب ہم کالاش کی سرزمین پہ داخل ہونے والے ہیں۔'' غاذان نے پل کراس کر کے بتایا۔

''یہ ہم دریا کی دوسری طرف آ گئے ہیں ناں؟'' وہ پیچھے رہ جانے والے پل کو گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

''بالکل.....کالاش اور ایون دریا کے مخالف سمت پر واقع ہیں۔''

''نائس.....'' وہ مسکرا دی۔بال ہنوز اڑ رہے تھے۔وہ پیچھے ہو گئی۔سیٹ سے ٹیک لگا دی۔

آس پاس ریتیلے پہاڑ تھے جن پر وقفے وقفے سے کچھ درخت اگے ہوئے تھے۔پہاڑ کی سطح ایسی تھی جیسے وہاں سے ریت پھسل پھسل کے نیچے آ رہی ہو اور یقیناً پھسلتی بھی ہو گی۔غاذان شرارت سے بیک ویو میں بار بار دیکھ رہا تھا۔عبادہ کا دھیان تو نہیں تھا البتہ گل کے روئیں روئیں میں آگ لگ رہی تھی۔ایک واحد کزن تھا جو اسے اچھا لگتا تھا اور وہ بھی.....

''تم یہاں پہلی بار آئی ہو؟ ہے ناں؟'' گل نے جل کے بیک ویو کو اپنی طرف موڑ دیا یوں کہ وہ عبادہ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ غاذان نے لبوں پہ امڈتی مسکراہٹ کو دبا لیا۔

''ہاں جی۔ یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ حالاں کہ میں کئی شہروں میں گئی ہوں جاب کے سلسلے میں لیکن چترال کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ ابا اماں تو نہیں مان رہے تھے۔ بھائی بھی بہت غصہ ہو گئے تھے۔ لیکن میں نے چوبیس گھنٹے کے لیے خود کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ مجبوراً ہی ان کو راضی ہونا پڑا۔'' وہ افتخار سے کہہ رہی تھی۔

''تم نے یہاں آنے کے لیے خود کو کمرے میں بند کر دیا تھا؟'' گل حیران رہ گئی۔

''بالکل اور اماں کے.....'' وہ کہتے کہتے رکی۔ ''جوتے.....بھی کھائے۔''

''کیا؟'' گل نے قہقہہ لگایا۔ ''کیوں؟''

''اماں میری پنجابی ہیں اور پنجابی مائیں سب برداشت کر سکتی ہیں سوائے بچوں کی ضد اور نخروں کے۔ میں نے یہاں آنے کی ضد کی تو انہوں نے اپنے جوتے سے میری پٹائی کی۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ میرا کلوتا بھائی مجھ پہ اس وقت ہنس رہا تھا۔ کتنی غلط بات ہے ناں۔'' وہ چہرے کو بچوں کی طرح ہاتھوں میں گراتے ہوئے کہنے لگی۔

''اس عمر میں بھی مائیں مارتی ہیں؟ سیریسلی؟'' غاذان حیران رہ گیا۔ (گل نے ہاتھ گال پہ رکھا پھر تیزی سے ہٹا دیا۔)

''بالکل۔ پنجابی مائیں عمروں کا لحاظ نہیں کرتیں۔ نیور۔ وہ تو شادی شدہ بچوں کو بھی جوتے جڑ دیتی ہیں۔ ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کا ضمیر بھی نہیں۔'' عبادہ نے مبالغہ آرائی سے کہا۔

''سیڈ.....''

''اور تو اور میں شرط لگا کے بھی آئی تھی بھائی سے..... کہ میں اچھے سے رہوں گی۔ ڈروں گی

نہیں۔اکتاؤں گی نہیں اور.....'' یکدم اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔وہ خاموش ہوئی تو غاذان نے بیک ویو اپنی طرف موڑ کے اسے دیکھا۔عبادہ کی نظریں بھی اس سے ملیں۔ان میں دبا دبا احتجاج تھا۔

''اٹس آل رائٹ۔ضروری نہیں کہ ہم جیسے منصوبے بنائیں۔سب کچھ اس کے مطابق ہو۔اللہ کی مشیت الگ ہوتی ہے اور ہوتا وہی ہے تو اس کی مشیت ہوتی ہے۔'' غاذان نے نرمی سے کہا۔عبادہ پھیکی سی مسکرادی۔

خوبصورت چترال نے اسے برے تجربے دیے تھے۔بری یادیں دی تھیں۔یہاں کے لوگوں کے لاہور کی پنجابن کو اداس کیا تھا۔وہ ظاہر نہ بھی کرتی تو ہو جاتا۔اس کا خلیہ خلیہ بتا رہا تھا کہ اسے چترال کے باسیوں نے خوب ستایا ہے۔گل اور غاذان دونوں یہ بات سمجھ سکتے تھے۔اگلے ایک گھنٹے تک وہ کچھ نہیں بولی۔اداسی سے باہر دیکھتی رہی۔اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ایک بری باد اور سب برباد۔

کالاش کی سرزمین کا پہلا گاؤں ''ریحان آباد'' کہلاتا ہے۔اس کا بورڈ جیسے ہی آیا۔غاذان کہنے لگا۔

''ہم کالاش میں داخل ہو چکے ہیں۔''

عبادہ جو افسردہ سی بیٹھی تھی،سیدھی ہو گئی کیوں کہ ریحان کی گلیوں میں کالاشی لباس پہنے لڑکے اور لڑکیاں پھدک رہی تھیں۔وہ گاڑی کو دیکھ کے ہاتھ ہلا رہے تھے۔عبادہ نے بھی موڈ ٹھیک کر کے ہاتھ ہلایا۔ہاتھ میں کیمرہ تھا،سو جاتے جاتے ہی ان کی تصویریں بھی اتار رہی تھی۔

کالاش تین وادیوں پر مشتمل ہے۔بمبور،بریر اور بمبورت۔تینوں کے درمیان چند چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔بمبورت پہلے آتی ہے اور یہ کالاش کی سب سے بھری ہوئی ثقافتی وادی ہے۔اس کی

حدود میں گاڑی ایک علاقے تک داخل ہوسکتی ہے اس کے بعد یہاں پیدل ہی چلنا پڑتا ہے۔ گلیاں تنگ ہیں۔ قدیم ہیں اور دونوں اطراف میں گلی سے کئی فٹ اونچے پتھروں اور لکڑیوں کے گھر ہیں۔ کالاش کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ ''کیلاش'' لکھا جاتا ہے جب کہ درحقیقت یہ لفظ ''کالاش'' ہے لیکن آپ اسے کیلاش کہیں یا کالاش کوئی فرق نہیں پڑتا۔

غاذان نے بمبورت کے اندر آ کے ایک خاص مقام پہ گاڑی روک دی۔ جو مہمان آئے تھے، وہ کچھ بریر سے تھے، کچھ بمبورت اور کچھ بمبور سے۔ بمبور اور بریر والے آگے بڑھ گئے جب کہ بمبورت والے یہاں اتر گئے۔ البتہ بلتی مہمان بھی گاڑی یہیں روک کے نیچے اتر رہے تھے۔

وہ لوگ بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔

''یہ رہا جی کالاش.....'' غاذان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بتایا۔ عبادہ نے گردن اونچی کر کے چاروں طرف دیکھا۔ کوہ ہندوکش نے اس وادی کو ہر طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ کھردرے سیاہ پہاڑوں کی چھایا سی گر رہی تھی۔ جس جگہ انہوں نے گاڑی پارک کی تھی، وہاں اور بھی گاڑیاں پارک تھیں۔ کچھ مقامی اور کچھ سیاحوں کی۔

''سو لیڈیز تم لوگ بمبورت گھومو۔ مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ میں تم لوگوں کو دو تین گھنٹے بعد جوائن کروں گا۔'' غاذان نے اپنا لائحہ عمل بتایا۔ عبادہ کے دل پہ گھونسا پڑا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''خان جی نے مجھے یہاں کے سردار سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ دعوت دینا تھی ان کو میری سرداری کی اور شندور کے میلے کے لیے کچھ مہمان بھی چاہیے تھے۔ ان کی بات کرنی تھی۔ میں ان سے مل لیتا ہوں اور ظاہر ہے کالاشی ہیں تو مجھے جلدی تو فارغ کریں گے نہیں۔ وقت لیں گے۔ اس لیے تم دونوں بمبورت گھوم لو۔ جب تک میں کام نمٹاتا ہوں۔''

''لیکن ہم اکیلے کیسے گھومیں گے؟'' عبادہ پریشان ہوگئی۔

''کیا مطلب؟ اکیلے کہاں ہو تم لوگ۔ یہ سب ہیں ناں۔'' اس نے بلتی مہمانوں کی طرف اشارہ کیا جن کے ساتھ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ بھی تھے۔

''ان کو میں نہیں جانتی۔'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔ اسے غاذان کا جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا اور گل کو اس کا اس طرح پیش آنا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

''آپ کے ساتھ گل ہے۔ گل خیال رکھنا ہے ان کا۔'' وہ گل کو تنبیہہ کرتا ہوا بولا۔

''مگر ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں ناں۔ ہم بھی سردار کو دیکھ لیں گے؟'' وہ دبے دبے جوش سے آگے ہوئی۔

''نہیں۔ یہاں کا سردار تمہارے سردار (ہائے صدقے) جیسا نہیں ہے۔ وہ تھوڑا روڈ ہے۔ تم دونوں کو لے کے گیا تو کہے گا عورتوں کو بھی ساتھ لایا تھا۔ زیادہ نہ سہی مگر میری بھی تھوڑی بہت غیرت ہے۔ اس لیے جتنا کہا ہے، اتنا کرو تم دونوں۔ او کے؟'' وہ اب استاد کے انداز میں بول رہا تھا۔ عبادہ نے بادل نخواستہ سر ہلا دیا۔

غاذان مسکرا کے واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''فارغ ہونے کے بعد میں آپ کو کال کروں گا عبادہ۔ گل ان کو ادھر ہی لے کے آنا ہے۔ ہم یہاں سے بمبور جائیں گے اور پھر واپسی۔ سمجھ گئیں۔''

''آپ فکر نہ کریں خان جی۔ ہم ادھر ہی ملیں گے آپ کو۔'' گل نے تسلی بخش جواب دیا۔

غاذان نے سر ہلایا، جیپ سٹارٹ کی اور یورس کرتا ہوا مڑ گیا۔ عبادہ حسرت سے اس کو دور جاتا دیکھنے لگی۔ اس کے دور جاتے ہی اس کا دل کھنچ گیا تھا۔

''اٹس آل رائٹ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' گل نے ہمدردانہ انداز میں اس کے کندھوں پہ

ہاتھ رکھا۔

''لیکن وہ ہوتے تو کیا ہو جاتا؟'' وہ ہونٹ لٹا کے بولی۔

''کیوں؟'' گل اس کے سامنے آ گئی۔ باقی مہمان گاڑی چھوڑ کے بمبورت کے اندر جا چکے تھے۔ وہ دونوں وہاں اکیلی تھیں۔

''مطلب، یہاں تک لانے کے بعد چھوڑ دیا۔''

''ان کو کام تھا۔''

''اب ایسا بھی کیا کام؟'' گل نے اس کے چہرے کی اداسی بھی دیکھ لی اور غاذان کے چہرے کی گلابی بھی۔ دونوں کے بیچ کیا چل رہا تھا؟ وہ ٹھٹک گئی۔

''خیریت ہے عبادہ؟ ہوں۔'' گل نے کھوجنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ عبادہ گڑبڑا گئی۔ اس نے تیزی سے گردن موڑی۔

''ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔'' وہ جھینپ گئی۔

''مجھے لگ تو نہیں رہا۔'' گل کا انداز تفتیشی تھا۔

''نہیں تو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ آدمی ہے۔ وہ ہوتے تو ہم لاپرواہی سے گھوم سکتے تھے۔ بنا ڈرے۔''

''تم اکیلی گھومو یا کسی مرد کے ساتھ۔ اگر تم یوسف خان کی گھر والی ہو تو تمہیں کوئی نظر اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔ ڈونٹ وری۔''

''اچھا؟ اور گائیڈ؟ گائیڈ کون ہوگا۔ میں یہاں آئی ہوں۔ مجھے یہاں گھومنے کے ساتھ ساتھ یہاں کی معلومات بھی حاصل کرنی ہوں گی۔ تاریخ، ثقافت، رسمیں، رواج، تہوار وغیرہ اس کے بارے میں کون بتائے گا؟ غاذان کے پاس تو بہت ساری معلومات ہوتی ہیں۔ وہ اچھے سے

سمجھاتے ہیں۔" اس نے تیزی سے جرح کی۔

"میں ہوں ناں۔ میں سمجھاؤں گی۔ فکر مت کرو۔ میرے علاقے کے بارے میں، میرے پاس بھی بے حد معلومات ہیں۔" اس نے مسکرا کے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ عبادہ بے دلی سے مسکرادی۔ جانے والا تو جا چکا تھا۔ اب جو بچا تھا، وہی غنیمت۔

"ٹھیک ہے پھر۔"

"چلیں؟" گل نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ عبادہ سر ہلا کے اس کے ساتھ چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

کالاش بھی ایک قوم ہے۔ ایک ایسی قوم جو رہتی تو چترال میں ہے لیکن اس کے رہن سہن، مذہب، عقائد، رسم رواج سب مختلف ہیں۔ ان کے بھی سردار تھے۔ اس قبیلے کے حکمران جو بمبوریت میں ایک اونچے ٹیلے پر موجود دو کنال کے گھر میں رہتے تھے۔ چوں کہ کالاشیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اس لیے ان کے قطعہ اراضی اور ان کی آبادی کے لحاظ سے ان کا معاشی استحکام ہے۔ ان کے سردار تو ہیں لیکن یہ سردار اتنے امیر اور جاگیردار نہیں جتنے چترال کے باقی قبیلوں کے تھے۔

غاذان ان کے ہی سردار سے ملنے آیا تھا۔

وہ گاڑی ٹیلے سے دور پارک کر کے، گھر کی طرف پیدل چلنے لگا۔ ہاتھ اس نے پینٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ پی کیپ سر پہ الٹی کر کے پہنی ہوئی تھی۔ گھر اونچائی پہ تھا لیکن اس کے بائیں طرف نیچے زینوں کی شکل میں کھیت بنے ہوئے تھے جہاں کالاشی کاشتکاری کرتے تھے۔ کھیت میں جو گھر ہوتا، وہ کھیت اسی گھر کے ہوتے۔ یہ ذیلی گاؤں کی جغرافیائی انفراسٹرکچر تھا۔

وہ اس کچے راستے پر قدم قدم اوپر چڑھ گیا۔ گھر کے دروازے کے سامنے آنے سے پہلے اس

نے بائیں جانب کھیت میں سردار کو دیکھا جو اپنے دو گھوڑوں کو نہلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹے دو بچے بھی تھے جو بالٹی سے مگ میں پانی بھر بھر کے ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔

اس نے گھر میں جانے کی بجائے، کھیت کی طرف جانے کا رخ کیا۔ سردار نے آستین اور پائنچے فولڈ کیے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے جسموں پر جھاگ ہی جھاگ تھی جسے وہ دھو رہے تھے۔ گھوڑے گہرے بھورے اور چکنے تھے۔ ان کے قد اونچے تھے۔ دم اور گردن پہ ضرورت سے زیادہ بال تھے۔ وہ ہنہناتے تو کالاش کی پہاڑیوں میں آواز گونج گونج جاتی۔

''میرا خیال ہے ایک سردار کو ملازموں والے کام نہیں کرنے چاہئیں۔'' اس کی دوستانہ آواز ابھری تو سردار نے آواز پہ پلٹ کے اس طرف دیکھا۔ غازان چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پائنچے فولڈ تھے اور پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ سردار کے چہرے پر ناگواری آئی۔

''لائیے سردار۔ میں کر دیتا ہوں۔'' وہ قدم قدم قریب آیا، اس سے مگ اچک لیا۔ سردار اس کی حرکت سے جل اٹھا۔

''میرا خیال ہے ہونے والے مہتر کو بھی ملازموں والے کام نہیں کرنے چاہئیں۔'' اس نے ٹونٹ کی۔

''مہتر کہاں۔ ہم تو کالاش کے ملازم ہیں۔'' وہ گھوڑوں کے اوپر پانی ڈالتے ہوئے بولا۔ پانی سے جھاگ مٹنے لگی تھی۔ گھوڑے صاف ہو رہے تھے۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں خان؟'' سردار کے لہجے میں برہمی تھی۔

''آپ سے ملنے آیا ہوں شاہ صاحب۔ اتنا دور میں تفریح کے لیے تو آنے سے رہا۔''

''کھوواری سردار کسی سے ملنے جائے اور کوئی مقصد نہ ہو۔ میں نہیں مانتا۔'' وہ طنز سے بولے۔

غازان نے دھیرے سے سر اٹھا کے انہیں دیکھا۔

''ہر کھوواری سردار برا نہیں ہوتا شاہ صاحب۔ٹرسٹ می۔'' اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔
بچے پانی کے چھپاکے ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔انہوں نے خود کو بھیگا دیا تھا۔
''میری پینسٹھ سالہ زندگی میں دو خان آئے اور کوئی بھی ہمدرد اور غمگسار نہیں تھا۔میں کیسے مانوں کہ سب برے نہیں ہوتے؟'' انہوں نے گھوڑے کی گردن کے بالوں کو سہلاتے ہوئے جتایا۔
غاذان نے جھک کے پانی سے مگ بھرا۔''تیسرے خان پہ اعتماد کرلیں۔یہ یقین دلاتا ہے کہ آپ کی جتنی بھی خلش ہے دور کردے گا۔''
''دیکھو خان.....میرے قبیلے.....''
''یہاں بات کریں گے کیا؟'' غاذان نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔''میرا مطلب اپنی بہو کے میکے والوں کو تھوڑی سی بھی عزت نہیں دیں گے؟''
شاہ نے لب بھینچ کے اسے دیکھا،ضبط سے سانس لی اور پھر اگلے ہی لمحے وہ دونوں بیٹھک میں چارپائیوں پر آمنے سامنے براجمان نظر آئے۔غاذان نے کیپ اتار کے سامنے میز پر رکھ دی تھی۔پائنچے اسی طرح فولڈ تھے البتہ پیروں میں جوتے پہن لیے تھے لیکن تسمے نہیں باندھے تھے۔وہ مکمل ریلیکس تھا جیسے اپنا گھر ہو۔
شاہ اور اس کے دو بیٹے اس کے دائیں بائیں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ان کے تیوریوں پر بل تھے جو یقیناً اس کے یہاں آنے کے سبب آئے تھے۔
''شاہ صاحب!اپنوں سے دوریاں نہیں بڑھاتے۔دو اپنوں کی دشمنی کا فائدہ تیسرا پرایا لیتا ہے اور پھر ہم تو سمدھی بھی ہیں۔روشانے آپا آپ کی بہو ہے۔میری کزن ہے۔ہمارا تو قریبی رشتہ ہے۔آپ کی اس طرح ناراضگی اور خلش ہمیں اچھی نہیں لگ رہی۔اس لیے میں یہاں خود چل کے آیا تاکہ آپ کو منا سکوں۔میری دستار پوشی آپ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔کالاش چترال کا ایک اہم

حصہ ہے۔'' وہ نہایت محبت اور اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

''صرف اس لیے کہ آپ کی دستار پوشی میں ہر قبیلے کے سردار کا حاضر ہونا اہم ہے۔ آپ ہماری اس طرح خوشامد کر رہے ہیں؟'' شاہ کا ایک بیٹا زہر خند لہجے میں بولا۔ غاذان نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

''میں خوشامد کروں یا نہ کروں۔ تعریف کروں نہ کروں۔ آپ کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کالاش سراپا حسن ہے۔ اس کو کسی کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ خود جانتے ہو چترال محض نام ہے۔ اس کی اصل پہچان تو کالاش ہے۔ آپ لوگ ہیں۔ آپ کی ثقافت ہے اور پھر چترال کا سردار آپ ہی کے لیے تو بنتا ہے۔ آپ کے ثقافتی ورثے کو بچاتا ہے۔ آپ کو سہولتیں دیتا ہے۔ سردار اپنے لیے تو ہرگز نہیں بنتا۔''

''یہ سیاسی مراعات ہمیں مت سکھائیں۔ بڑے نہ سہی مگر چھوٹے موٹے سیاسی حربے ہمیں بھی آتے ہیں۔''

''میں سیاست کیوں کروں گا..... میں تو.....''

''آخری بار یوسف خان یہاں گیارہ سال پہلے آیا تھا جب یونیسکو کی ٹیم نے ہمارے گاؤں کا دورہ کیا تھا۔'' شاہ نے دانت کچکچاتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ''اس ٹیم نے تم لوگوں کو باور کرایا تھا کہ تمہاری حکومت نے کالاش کو کھا لیا ہے۔ تمہاری بے دھیانی اور خود غرضی اس علاقے، اس قبیلے اور اس ثقافت کو ختم کر رہی ہے۔''

''یوسف خان کا آنا گن رکھا ہے آپ لوگوں نے۔ میرا کیا؟ میں یہاں کتنی بار آیا ہوں۔ مجھے چھ ماہ ہوئے ہیں لندن سے آئے اور ان چھ ماہ میں، میں نے آٹھ بار یہاں کا چکر لگایا ہے۔ سردار ہر جگہ نہیں جاتا۔ اس کے وزیر، اس کے مؤکل، اس کے لوگ جاتے ہیں اور آپ لوگ اس بات سے

انکار نہیں کر سکتے کہ کھوواری قبیلے کے کسی فرد نے آپ کا حال احوال نہیں پوچھا۔"

"حال احوال تو بندہ راہ چلتے دشمن کا بھی پوچھ لیتا ہے؟ تو کیا اس سے وہ اس کا ہمدرد بن جاتا ہے؟ نہیں۔ اور آپ آنے کی کیا بات کرتے ہیں خان؟ آپ آٹھ بار آئے ہیں لیکن اپنے کام سے اور پھر ہماری طرف آ گئے یہ دکھانے کے لیے کہ آپ کو ہماری پرواہ ہے۔ آج بھی آپ کل کی تہوار میں شامل ہماری بچیوں کو چھوڑنے آئے ہیں کیوں کہ یہاں فوتگی ہوئی ہے۔ ہے ناں؟" شاہ کے بیٹے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ غاذان ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔

"اور تو اور بھائی جان۔ دو عورتوں کو بھی لے کے آیا ہے اپنے ساتھ۔" شاہ کا دوسرا بیٹا کمینگی سے بولا۔ غاذان کے چہرے پر ناگواری ابھری۔

"وہ ٹورسٹ لڑکیاں ہیں۔"

"میں کلیم خان کی بیٹی گل لالہ کو نہیں پہچانتا خان۔ میری نظر کمزور ہے۔" اس نے بھرپور اداکاری کرتے ہوئے بے پر کی سی اڑائی۔ غاذان نے لب بھینچ لیے۔

"مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ تم کسے لے کے آئے ہو۔ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ تم بھی اپنے مقصد سے آئے ہو خان جیسے باقی آئے تھے اور تمہارا مقصد تو میں خوب جانتا ہوں۔" شاہ نے داڑھی کو مٹھی میں سہلاتے ہوئے اسے پتلیاں سکیڑ کے دیکھا۔

غاذان نے گہری سانس لی پھر آگے ہوا، بازو گھٹنوں پر رکھے۔ "میری امید اور میرے مان کو اگر آپ مقصد کہتے ہیں تو میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ میں عورتوں کو لے کے آیا ہوں کیوں کہ وہ ٹورسٹ لڑکی ہماری خاص مہمان ہے اس لیے گل اس کے ساتھ ایک گائیڈ کے طور پر ہے۔ ہمارا ان سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟ دشمن کے علاقے میں گھر کی عورتوں کو کون چھوڑتا ہے؟" شاہ کا بیٹا ہونٹ کی

پرت پھیلتے ہوئے مسکرایا۔اس کی مسکراہٹ میں شیطانیت تھی۔

''تمہاری زبان پہ یہ فقرہ آیا بھی کیسے؟'' شاہ نے بیٹے کو تیورا کے دیکھا۔

''میں نے عام بات کہی ہے۔جن سے تعلق اچھا نہ ہو،وہاں عورتوں کو اکیلے نہیں جانا دینا چاہیے۔''

''تو پھر میرے مان اور بھروسے کی حد دیکھ لو اجمیر۔'' غاذان نے چبا چبا کے کہا۔''تمہارے علاقے میں اپنی عورتوں کو اکیلا چھوڑا ہے۔''

''محفل میں عورتوں کو موضوع یا تو شاعر بناتے ہیں یا بے حیا مرد۔تم یہاں جو مانگنے آئے ہو،جو کہنے آئے ہو وہ کہو۔ہم سن رہے ہیں۔'' شاہ کا بڑا بیٹا بات کو دوسرا رخ دیتے ہوئے بولا۔غاذان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

اس نے گہری سانس خارج کی۔

''میں آج آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے دیں گے۔'' وہ مان سے کہنے لگا۔تینوں کے چہرے پر الجھن ابھری۔

''کھوواری کے جتنے بھی خان آئے،آپ سب کی دستار میں شریک ہوئے کیوں کہ یہ ایک لازم شرط ہے۔ہر قبیلے کا سردار دستار پوشی میں شامل ہوگا۔اسی لیے بلتستان اور گلگت سے بھی قبیلوں کے سردار آئے ہیں۔جہاں اتنے دور سے لوگ آئے ہیں وہاں اتنے قریب والے لوگ نہیں ہوں گے تو میری دستار پوشی کس کام کی؟ میری سردار کو اتنا متنازعہ مت بنائیں۔میری لاج رکھیں۔''

''ہر بار اپنے ناپسندیدہ قوم کو اپنا سربراہ چننا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔تم خان نہیں سمجھ سکتے۔تم لوگوں نے کالاش کو کھا لیا ہے۔ہمیں مذہب اور کفر کی بھینٹ چڑھا کے ہماری تقدس کو پامال کیا ہے۔ہم ایک الگ قوم ہیں۔ہماری شناخت الگ ہے لیکن تم لوگوں نے ہمیں سراہنے اور قبول

کرنے کی بجائے ہمارے ورثے کو کھایا ہے۔ہم کیوں بار بار ایک ہی سوراخ سے خود کو ڈسیں؟'' شاہ کے لہجے میں شکوہ اور غصہ دونوں تھے۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس بار میں سارے چترال کی Stretegies بدلوں گا۔ ہر قبیلے کو ایک نئی پہچان دوں گا۔ میرے چچا اور میرے دادا اس گاؤں کے سادے لوگ تھے۔ بندوق، نیزوں اور جنگ سے حکومت کرنا جانتے تھے۔ ڈر، خوف اور پیسہ ان کی طاقت تھی لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔ میرے لیے سب برابر ہیں۔ میں نے لندن سکول آف اکنامکس میں یہی تو سیکھا ہے۔ مساوات اور انصاف۔ میں نے کھیتوں کی پڑھائی کی ہے۔ زراعت کو سمجھا ہے۔ معیشت سیکھی ہے۔ آپ کو نہیں لگتا ایک لڑکا جو مغرب کا طور طریقہ اور طرز دیکھ کے آیا ہو وہ ہمارے لیے وہ خود غرضی نہیں دکھا سکتا جو پرانے سرداروں نے دکھائی ہے؟''

غاذان نے باری باری تینوں کو دیکھا۔

''میں آپ کی اور آپ کے قبیلے کے ساتھ چترال تو کیا عوامی سطح کی ناانصافیاں جانتا ہوں۔ آخر میں اس مٹی کا بیٹا ہوں۔ یہاں کے لوگ میرے اپنے ہیں۔ میں آپ کی تکلیف سمجھوں گا۔ دوسرا بندہ نہیں سمجھے گا۔ کالاش میرا خطہ ہے۔ میری سرزمین۔ میں آپ کو بالکل بھی مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ پریقین لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''دیکھو خان۔ کالاش کے آنے یا نہ آنے سے تم کو اور تمہارے سردار کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم لوگوں کو جو کرنا ہے کرو۔ ہم تو پہلے قطع برید ہیں۔ ہمیں بار بار اپنے جھوٹے وعدوں اور لاروں کے سبز باغ مت دکھاؤ۔ یہاں سے جاؤ اور دوبارہ نہ آنا۔ ہم نہیں آنا چاہتے۔'' شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں انکار سننے تو نہیں آیا تھا۔ کھووار کو آپ کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ شندور اور چترال کو ہے۔ کھوواری آپ کے احسان مند ہو بھی نہیں سکتے لیکن برسوں سے چلی آرہی ہمارے آباؤ اجداد کی یہ

روایت کہ ہر قبیلے کا سردار آئے گا، ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ یہ آپ کی بھی توہین ہوگی اور میری دستار بھی متنازعہ ہوگی۔"

شاہ کا پوتا، اس کے لیے چترالی قہوہ اور سوکھے میوہ جات کے ساتھ ششتر (ایک خاص قسم کیا کیک جو میدہ سے بنتا ہے) اور بسکٹ ٹرے میں سجا کے لایا۔ اس نے گھڑ سواری کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کاؤبوائے کے بوٹ دیکھتے ہی بے ساختہ غاذان نے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کے میز پر سوغات رکھ رہا تھا۔

پوتے کی موجودگی تک سب خاموش رہے۔ لڑکے نے چائے کی پیالی اٹھا کے غاذان کو پکڑائی۔

"گھڑ سواری کرتے ہو؟" اس نے پیالہ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ میں نے ریسنگ کا ٹیسٹ کے لیے جانا ہے دو دن بعد اسکردو۔ وہاں میری ریس ہے۔"

چودہ پندرہ سال کا لڑکا مسکرا کے بتانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو جگمگا رہے تھے۔

"اچھا..... مبارک ہو۔ بتایا نہیں تم نے۔" غاذان کو خوشگوار حیرت کے ساتھ شکوہ بھی ہوا۔

"وہ....." لڑکے نے پلٹ کے دادا کو دیکھا پھر باپ کو۔

"ہر جیت کھو واریوں کے نصیب میں نہیں لکھی۔ کچھ کالاشیوں کی بھی تقدیر میں ہوتی ہے۔" شاہ کا چھوٹا بیٹا طنز سے بولا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے پلیٹ سے کاجو اٹھائے۔ "روشانے نہیں بتایا ہوگا کہ ان کے جیٹھ کا بیٹا دوڑ میں حصہ لے رہا ہے۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں۔ میرا بھتیجا اس دفعہ کالاش کو Represent کرے گا اسکردو ہارس ریس Skardu Horse Race میں۔"

"میرے لیے اس سے بڑھ کے فخر کی بات کیا ہوگی اجمیر کہ میرے کالاشی ہمارا نام روشن کر

رہے ہیں؟'' غاذان ایسے مسکرایا کہ اجمیر کا طعنہ ہوا میں گل ہو گیا۔

''میرا گھوڑا فرسٹ آیا تھا پریکٹس ریس میں۔ انہوں نے مجھے خوب داد دی اور مجھے سلیکٹ کرلیا۔ یہ سب میرے گھوڑے کا کمال ہے۔ اس دفعہ میں وہی گھوڑا پھر سے لے کے جاؤں گا اور دیکھنا، وہ مجھے پھر جتوائے گا۔''

''ہوں۔ بیسٹ آف لک۔'' غاذان نے اس کا شانہ تھپک دیا۔

''آپ.....'' لڑکے نے پرامید نظروں سے اس کی طرف یکھا۔ ''آپ..... آئیں گے ریس میں؟'' وہ دبی دبی آواز میں دعوت دے رہا تھا۔

''میں؟''

یکدم لڑکے کا چہرہ بجھ گیا۔ ''آپ کیوں آئیں گے۔ سردار کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔ خیر۔'' وہ بے دلی سے کہتے ہوئے پلٹ کے باہر نکل گیا۔ ایک دم ہی غاذان کو برا لگا۔ لڑکا اتنی محبت سے پوچھ رہا تھا۔

''تمہیں برا لگا ہوگا۔ ہے ناں۔ اس بار چترال کا فخر کھو واری نہیں کالاشی بن گئے ہیں۔'' اجمیر نے زیرلب ہنسی دبائی۔

غاذان پرسکون انداز میں مسکرایا۔ ''چترال کی پہچان ہمیشہ سے ہی کالاش رہی تھی اجمیر۔ میرا چترال آگے آرہا ہے تو میں کیوں پریشان ہوں گا۔ ہاں البتہ مجھے ایک بات کا دکھ ہے۔'' اس نے پیالی میز پہ رکھ دی اور پیچھے ہوا۔

''آپ نے ہمیں لاعلم رکھا۔ خان جی کو معلوم ہوا تو ان کو برا لگے گا۔''

''اب علم ہو گیا ہوگا۔ جا کے بتا دینا۔'' اجمیر تلخی سے بولا۔

''میرے سالے ہو کر تمہیں اتنی زہریلی باتیں نہیں کرنی چاہئیں اجمیر۔ میرا مان رکھنا چاہیے۔''

''روشانے کی وجہ سے جو رشتہ بنا ہے۔اس کا فائدہ مت اٹھاؤ خان۔'' شاہ سردار نے تیزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔''بیٹی بہو اپنی جگہ مگر ہم اب مزید کالاش کو سرداروں کے رحم و کرم پر نہیں رہنے دیں گے۔ہم دستاری میں نہیں آئیں گے۔''

''مجھے مایوس لوٹا رہے ہیں اور پھر کہتے ہیں خان برے ہیں۔'' غاذان کا لہجہ گھائل ہو گیا۔

''ہم مجبور ہیں۔'' انہوں نے بے رحمی سے چہرہ پھیر لیا۔

''ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرنا چاہتے آپ؟''

''آپ ضرورت مند نہیں ہیں۔ضرورت مند ہوتے تو ہم آپ کی مدد کے لیے پہلے صف میں کھڑے ہوتے۔'' سردار نے دھیرے سے کہا پھر ٹون میں استہزا عود آیا۔''آپ تو محتاج ہیں..... بے حد محتاج۔''

غاذان کے دل پہ گھونسا پڑا۔شاہ صاحب اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔محتاج ضرورت مند سے پہلے مستحق ہوتا ہے حق دار ہوتا ہے۔شاہ صاحب واجبی محتاجی کو ابدی تنگی کی دلیل سمجھ رہے تھے۔وہ زیر لب مسکرایا۔

''وقت کی محتاجی ہے دور ہو جائے گی شاہ صاحب۔'' وہ جھکا اور جوتوں کے تسمے بند کرنے لگا۔''برا وقت امتحان ہوتا ہے۔انسان کا نہیں۔اس انسان سے جڑے لوگوں کا۔ان کے ساتھ اور محبت کا۔ہم شندور کی وجہ سے مجبور ہیں لیکن جلد یہ مجبوری ختم ہو جائے گی۔ہر مشکل وقت گزر جاتا ہے۔جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ اس مشکل وقت میں لوگوں کے رویے ہوتے ہیں۔مجھے بذات خود اس بات کا خلش رہے گا کہ آپ نے مجھے مایوس لوٹایا ہے لیکن بے فکر رہیں۔'' وہ جوتے بند کرتے ہوئے سیدھا ہوا۔''میری سرداری آپ کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی کیوں کہ یہاں اس وقت میں ایک مجبور انسان بن کے آیا تھا ایک مجبور سردار بن کے نہیں۔اس لیے یہ نفع نقصان میرا ذاتی ہے۔اس

کی خلش بھی ذاتی ہی رہے گی۔ میں آپ کی قدر کرتا ہوں۔ عزت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ آپ کا قبیلہ ہمارے لیے ہمیشہ معزز ہوگا۔ اللہ حافظ۔"

اس نے جھک کے اپنی ٹوپی اٹھائی، سر پہ پہنی اور باہر نکل گیا۔ وہ بہت مایوس اور اداس ہو گیا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ کالاش اور چترال کی چلتی یہ ناراضگی کافی دور تک جانے والی ہے۔

☆.....☆.....☆

اس کا دل کیوں اداس تھا وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ غازان کی غیر موجودگی کی وجہ سے اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ کالاش جب تک پیارا لگ رہا تھا، جب تک وہ ساتھ تھا۔ وہ جیسے ہی چلا گیا، کالاش کی ساری خوبصورتی ختم ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا، یہ دنیا، یہ پربت اور یہ نظارے صرف اس لیے حسین لگ رہے تھے کیوں کہ وہ آس پاس تھا۔ وہ چلا گیا تو ہر چیز کا حسن پھیکا پڑ گیا۔

پورے سفر اس نے کیمرے کو آنکھ سے نہیں ہٹایا تھا لیکن اب کیمرہ اس کی گردن سے لٹک رہا تھا۔ وہ منہ لٹکائے گل کے ساتھ کالاش کی مقامی آبادی کی گلیوں میں چل رہی تھی۔ وہ دونوں گھروں کے درمیان پتھروں کی روش والی چھوٹی سی تنگ گلی میں سے گزر رہی تھیں۔

وادی میں خاموشی تھی البتہ دور دور سے کہیں کسی کے مقامی آواز میں بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہاں گھروں کے سانچے مختلف تھے کیوں کہ یہاں گھر کسی میدانی علاقے کی طرح ہموار سطح پر تعمیر نہیں کیے گئے تھے بلکہ پہاڑیوں کے سینے چیر کے وقفے وقفے سے بنائے گئے تھے جیسے مری میں ہوتے ہیں۔ یہاں بھی گھر لکڑی کے تھے۔ فرش اور چھتیں تک لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ماحول نم تھا۔ کل کی بارش نے یہاں ٹھنڈ اور خنکی دونوں بڑھا دی تھی۔ گھروں کی لکڑیاں گیلی تھیں جن کی مہکتی ہوئی خوشبو وادی میں رچ رہی تھی۔

"گلیوں میں موجود لڑکیوں کی تصویریں تم نہیں اتار سکتیں کیوں کہ یہ برا مان جاتی ہیں اور ان

سے تم بات بھی نہیں کر سکتیں جب تک وہ خود تم میں دلچسپی نہ لے لیں۔'' گل اس کے ہم قدم چلتی اسے بتا رہی تھی۔ گلی کے کونوں کھدروں میں کالاشی لباس زیب تن کیے چھوٹی لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔

''کالاش گھومنے کے لیے زیادہ جگہیں نہیں ہیں۔ تین چار ہی ہیں جہاں عموماً سب ہی ٹورسٹ جاتے ہیں۔ غاذان تمہیں گھپا گھپی میں لے کے آیا ہے اس لیے ہم کچھ پلان نہیں کر سکے کہ پہلے کہاں جائیں اور بعد میں کہاں۔ اس لیے میں نے چلتے چلتے ہی تمہارے لیے سب ترتیب دے دیا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اگر یہی بات غاذان کرتا تو اس کے کان بھی کھلے ہوتے اور دل بھی مگر اس وقت وہ انتہائی بے توجہی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ بمبوریت کے گاؤں کے عین درمیان ایک میدانی جگہ ہے جہاں گاڑیوں کے شیلٹر کی طرح لکڑی کے بڑے ستونوں والے شیلٹر لگے ہیں، وہاں پہ کالاشی اپنا مذہبی تہوار ''چیلم جوسٹ'' مناتے ہیں۔ چیلم جوسٹ دراصل بہار کو خوش آمدید کرنے کے لیے منایا جاتا ہے جس میں تمام کالاشی اس مقام پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں، ہم جولیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ حمائل کیے، فٹ بال کو کِک کرنے والے انداز میں تھرک رہی ہوتی ہیں۔ اس لمحے اصل کالاشی ثقافت ابھر کے سامنے آتی ہے۔ کالاشی لڑکے کسی قسم کا لباس نہیں پہنتے۔ وہ مقامی کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں لیکن ان کا رقص اور ان کی تھرک بھی عورتوں کے شغل کے یکساں ہوتی ہے۔

''تو پہلے میں تمہیں یہاں کے مقامی کلچر کے بارے میں بتاؤں گی۔ یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ انفراسٹرکچر کیسا ہے، کھانے کیسے ہیں، لباس کیسا ہے، اس کے بعد میں تمہیں بمبوریت کے اس مندر میں لے جاؤں گی جہاں کالاشی اپنے میتیوں کی رسمیں کرتے ہیں پھر قبرستان لے کے

جاؤں گی اور دکھاؤں گی کہ یہ لوگ اپنے مردوں کو کیسے دفناتے ہیں۔"

وہ اپنے ہی لے میں کہہ رہی تھی۔ چوں کہ وہ آگے تھی اس لیے وہ پیچھے دیکھ ہی نہیں سکی کہ عبادہ اس کو سن بھی رہی ہے یا نہیں۔

آج یہاں فوتگی ہوئی تھی اور گل کے مطابق اگر کوئی بزرگ ہستی فوت ہو جائے تو کالاش کی تینوں وادیاں اس میں شرکت کرتی ہیں مگر یہاں درپردہ کالاشیوں کا ہجوم سے نظر آ رہا تھا۔ کہیں سے بھی ماحول سوگوار نہیں لگ رہا تھا۔

وادی میں اور سیاح بھی گھوم رہے تھے۔ گلیوں میں چلتے ہوئے کئی دفعہ غیر ملکی سیاح ان سے ٹکرائے تھے۔ کالاش شاید گل لالہ کو جانتا تھا، اس لیے ہر قدم پہ چھوٹی لڑکیاں اور بزرگ خواتین جو بالکونیوں میں یا ڈیوڑھیوں میں بیٹھی ہوتی تھیں، وہ گل کو ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کرتیں۔ چیلم جوسٹ کی جگہ سے اوپر وادی کی طرف آتے ہوئے اچانک ایک خاتون نے اپنے گھر کا بوسیدہ دروازہ کھولا اور باہر آئی، اسی لمحے وہ دونوں نیچے روش پر گزر رہی تھیں۔ بوڑھی خاتون نے دونوں کو دیکھا تو ذرا سی چونک گئی، پھر تیزی سے ریلنگ کے قریب آئی۔

"گل لالہ!" انہوں نے کچھ اس انداز سے پکارا کہ وہ گل ہوئی تو جواب دے دے گی، نہ ہوئی تو آگے بڑھ جائے گی۔ گل ان کی آواز پر رک گئی اور پلٹ کے اس طرف دیکھا۔

"زرمیم دادی۔" وہ مسکراتے ہوئی سیڑھیاں چڑھ کے ان کے پاس گئی۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" ان کی آنکھوں میں بے یقینی کی چمک تھی۔ وہ گل کو چھونے لگیں۔ سیاہ کالاشی پشواز پہنے، سر پہ سرخ ٹوپی رکھے، گردن میں مالائیں لٹکائے، وہ سرخ سفید خاتون تھیں جن کی گردن اور چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں۔

گل نے نرمی سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "رو کیوں رہی ہیں۔ میں گل لالہ ہی ہوں۔"

انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور سر دھیرے دھیرے ہلایا۔ ”جان گئی تھی۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا۔“ وہ نم آواز میں کہنے لگیں۔

”کافی سالوں بعد آئی ہوں ناں، اس لیے۔ کیسی ہیں آپ۔ دریچ باجی کیسی ہیں اور سفاح؟ کدھر ہیں سارے۔“ وہ بے قراری سے کہتے گھر کی کھڑکی، دروازوں سے یہاں وہاں جھانکنے لگی۔ نیچے کھڑی عبادہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ باقی گھروں سے بھی خواتین جھانک رہی تھیں۔ وہ اس لڑکی کے باپ کی انتہائی مشکور تھیں۔ یہ گل کی نہیں، اس کے باپ کی محبت تھی۔

”اندر ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ کھانا کھالو۔“ انہوں نے محبت سے اصرار کیا۔

گل نے پلٹ کے عبادہ کو دیکھا۔ ”کچھ کھاؤ گی؟“

عبادہ کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ”نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے اشارہ کیا۔

”میری تائی بہت اچھے لوبیا چاول بناتی ہیں۔ ایک دفعہ کھاؤ گی تو انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ گی۔“ اس نے حرصی لہجے میں کہا۔ عبادہ نے گہری سانس لی۔

”ٹھیک ہے۔“

وہ تو صرف تکلف سے منع کر رہی تھی۔ اب کسی وادی میں جا کر وہاں کے باشندوں کو تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ یہ گاؤں میں رہنے والے غریب لوگ تھے البتہ ان کے دلوں میں دنیا سموئی جا سکتی تھی لیکن پھر بھی کسی کی غربت میں آکے اس پر بوجھ بن کر اس کی مہمان نوازی کا امتحان لینا اخلاق سے گری ہوئی انتہائی بری حرکت ہے۔ عبادہ بس یہ نہیں چاہتی تھی۔

زرمیم دادی کا گھر چھوٹا سا تھا۔ تین کمرے تھے جن میں ایک کمرے میں وہ اور ان کی بیوہ بیٹی دریچ رہتی تھیں جب کہ دوسرے میں سفاح ان کا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ تیسرا کمرہ بیٹھک

تھی۔ وہاں مہمانوں کے لیے کارپٹ بچھایا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے صندوق پڑے تھے جن پر سفید پوش بچھا ہوا تھا۔ لکڑی کی دیواروں میں جگہ جگہ کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں جہاں کچھ نہ کچھ لٹک رہا تھا۔

وہ بیٹھک کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''زرمیم دادی میرے بابا کی چوتھی ماں ہیں۔ چترال میں ہر تیسری بزرگ عورت ان کی ماں تھی۔ تم جانتی ہوں عبادہ۔ ہمارے یہاں ایک خوبصورت رواج ہے۔'' گل جو اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھی تھی، بتانے لگی۔ ''ہم کسی اجنبی عورت سے ملتے ہیں تو اس کی عمر کا اپنے کسی قریبی رشتے سے موازنہ کرتے ہیں۔ فرض کرو زرمیم خاتون میرے بابا کی ماں ہے تو میری کیا ہوئی؟''

''دادی۔''

''بالکل۔ اگر زرمیم دادی کی عمر موٹی چچی جتنی ہوتی تو میں ان کو کیا کہتی؟''

''چچی۔''

''ہاں۔'' وہ مسکرائی۔ ''یہاں ایسے ہوتا ہے۔ ہم ہر کسی کو خالہ، پھوپھو، تائی نہیں کہتے۔ ہم موازنہ کرتے ہیں اس کا اپنے کسی رشتے سے پھر اپنی عمر سے اس کے بعد ان کو مخاطب کرتے ہیں۔''

عبادہ مسکرائی۔ کم از کم باقی پاکستان میں یہ رواج نہیں تھا۔ اپنے سے بڑی ہر خاتون آنٹی اور اپنے سے بڑا ہر مرد انکل تھا۔ آنٹی اور انکل جو انگریزی کے لفظ ہیں، ان میں وہ تاثیر کہاں جو پھوپھو جان، خالہ جان یا چچی جان کہنے میں ہے۔

زرمیم دادی نے دونوں کی خوب پیٹ پوجا کرائی۔ چائے سے لے کر کھانے تک انہوں نے لوازمات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کی بیوہ بیٹی نے دل کھول کر دونوں کے لیے مختلف انواع واقسام کے کھانے بنائے۔ وہ دونوں اتنی زحمت نہیں دینا چاہتی تھیں لیکن کالاشی بہت مہمان نواز تھے۔ وہ

کسی طرح مہمانوں کو خالی پیٹ نہیں جانے دیتے تھے۔ خالی پیٹ مطلب جس میں ایک نوالے کی گنجائش بھی نہ چھوڑتے تھے۔ یہ زیادہ نہیں کھلاتے تھے، یہ زیادہ بناتے تھے۔ مثلاً آپ کے سامنے اگر دو کھانے ہوں تو دونوں کو پورا کھا کے آپ کا پیٹ فل ہوگا لیکن اگر آپ کے سامنے دس کھانے پڑے ہوں، آپ ایک دو لقمے لیں گے تو بھی پیٹ بھر جائے گا۔ اس لیے یہاں کے لوگ زیادہ کھانے بناتے تھے تاکہ ایک ایک نوالہ تکلف اور زبردستی سے مہمان کو کھلا کو ان کا پیٹ بھر لیں گے۔

دوپہر کی پیٹ پوجا وہیں ہوگئی تھی۔ عبادہ نے نکلتے وقت، دسترخوان کے نیچے کچھ پیسے رکھ دیے تھے جو ان کھانوں کا بل تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کالاش کا کل سرمایہ ان کا سیاحتی بجٹ ہے۔ جو ان کو ملتا ہے، انہی سیاحوں سے ملتا ہے۔ اس لیے وہ غیرت اور خودداری سے خود تو کچھ نہیں مانگتے لیکن ان کو پیسوں کی حاجت ضرور ہوتی ہے۔

نیم دوپہر تک وہ دونوں گلیوں میں بھٹکتی رہیں۔ عبادہ کی ٹانگیں تھک گئی تھیں۔ گل البتہ چوکس تھی۔ یہ وادی ساری چڑھائی تھی اور چڑھائی مسلسل چڑھنے سے گھٹنے جواب دے جاتے ہیں۔ یہ تو عبادہ کی وِل پاور تھی جس نے ابھی تک اسے زندہ رکھا تھا۔

گل اسے انگوروں کے خوبصورت باغ دکھانا چاہتی تھی جو اس کے بابا کا عزیز ترین باغ تھا اور انگوروں کے موسم میں وہ بارہا یہاں آتے تھے اور اپنے دوست حسین مگسی کے ساتھ پوری دوپہر انگوروں کی سبز بیلوں کے نیچے گزارتے تھے۔ تب گل لالہ بھی ان کے ساتھ آتی تھی۔

''تم نے یہاں گھر دیکھے۔ یہ پہاڑی گھروں جیسے ہی ہیں۔ کچھ مختلف نہیں سوائے اس کے کہ یہاں جگہ جگہ سیڑھیاں دیکھنے کو ملیں گی اور ایسی سیڑھیاں جو سیمنٹ اور گارے سے نہیں بنی ہوتیں بلکہ.....'' وہ رک گئی اور پلٹ کے اسے دیکھا۔ ''دیکھنا چاہو گی کیسی ہوتی ہیں؟'' وہ ایسے بولی جیسی سرپرائز دیتے وقت بولتے ہیں۔

عبادہ نے تکان سے سر ہلایا۔

یکدم ہی گل ایک طرف ہوگئی۔ سامنے چھ فٹ کی چار دیواری تھی جس کی منڈیر سے زمین تک ایک موٹی لکڑی ٹکی ہوئی تھی۔ اس لکڑی کے تنے میں جگہ جگہ پیر رکھنے کے لیے گڑھے سے بنائے گئے تھے۔ ایک کے بعد ایک۔

''یہ سیڑھی ہے؟'' وہ ٹونٹ کرنے لگی۔

''جی جی۔ سیڑھی ہی ہے۔ چلو تمہیں چڑھنا سکھاؤں۔'' گل نے لکڑی کا تنا پکڑا اور گڑھے میں ایک پیر رکھ دیا۔

''سکھانے کی ضرورت نہیں۔ آسان ہے چڑھنا۔'' عبادہ کندھے اکڑا کے بولی تو گل جو چڑھ رہی تھی ٹھہر گئی اور پلٹ کے اسے دیکھا۔

''آر یو شور؟''

''اینی ڈاؤٹ؟''

''تم چڑھ سکتی ہو؟'' گل کے انداز میں چیلنج تھا۔

''بالکل۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم چڑھو گی۔'' وہ اسے للکارتے ہوئے نیچے اتر آئی۔

''او کے۔'' عبادہ نے آستین فولڈ کی اور جارحانہ انداز میں لکڑی کی طرف بڑھی۔ اس نے لکڑی کو دونوں طرف سے پکڑ لیا اور گڑھے میں پیر رکھا لیکن جیسے ہی اس نے گڑھے والے پیر پہ زور ڈال کے زمین والا پیر اوپر اٹھایا، لکڑی ہل گئی۔ وہ دھڑام کر کے نیچے کود دی۔

''یہ ہل رہی ہے۔'' وہ کسی بچے کی طرح شکایتی انداز میں تیزی سے بولی۔

''نہیں تو۔ بالکل بھی نہیں ہلتی۔ تم کوشش کرو۔ تم چڑھ سکتی ہو۔'' گل نے سینے پر ہاتھ باندھتے

ہوئے طنز کیا۔ عبادہ نے گہری سانس لی اور پھر سے لکڑی پکڑ لی۔ اس بار بھی وہ لڑکھڑائی، گرنے کے خوف سے وہ واپس زمین پہ کود گئی۔

''ہاہاہاہاہا.....'' گل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہنسو نہیں۔ میں کر سکتی ہوں۔'' عبادہ کو اس کا ہنسنا برا لگا۔ گل نے ہنسی روک لی۔ گل جانتی تھی کہ وہ نہیں کر سکتی۔ گل پھرتیلی تھی۔ پہاڑی لڑکی تھی۔ اسے چڑھنا آتا تھا جب کہ عبادہ لاہور کی بیچاری سی لڑکی تھی جو گھوڑے پر چڑھتے ہوئے بھی گر جاتی تھی، وہ کہاں اس سیڑھی پہ چڑھ سکتی تھی۔

وہ ایک پیر رکھتی، لکڑی ہلتی، وہ نیچے کود جاتی اور یہ منظر گل کو ہنسا ہنسا کے پاگل کر چکا تھا۔

''رہنے دو۔ میں چڑھ کے دکھاتی ہوں۔ تمہارے سہارے رہی تو شام تک یہ چھ فٹ کی دیوار بھی نہیں چڑھ پاؤں گی۔''

''میں چڑھ سکتی ہوں مگر یہ ہل رہی ہے۔'' عبادہ نے ٹھوڑی سینے سے جوڑ دی۔

''آپ بارے۔ بہو کے مارے۔'' گل زیر لب کہتی سیڑھی کے قریب آئی۔ وہ کسی فوجی کی طرح رینگتے ہوئے، گڑھے میں پیر رکھتی، اوپر سے لکڑی کا توازن بناتی دھیرے دھیرے چڑھ گئی۔ دیوار کے پار ہموار زمین کا قطعہ تھا جہاں خالی سا میدان تھا۔ وہ منڈیر پر کھڑی ہوئی اور نیچے جھانکا۔ ''آؤ۔''

عبادہ نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا پھر دونوں لب آپس میں کچلے اور لکڑی کا تنا اسی طرح پکڑ لیا۔

''اچھا یہ کیمرہ مجھے دو۔ میں تمہاری ویڈیو بناؤں۔'' گل نے شرارت سے کہہ کے ہاتھ نیچے لٹکایا اور اس کی گردن سے کیمرہ نکال لیا۔ اب وہ اوپر کھڑے ہو کے اسے نیچے سے اوپر آتے ہوئے کیمرے میں عکس بند کر رہی تھی۔

عبادہ کے لیے پہلے دو گڑھے مشکل تھے۔ تیسرے گڑھے پہ پیر پڑا تو وہ سمجھ گئی کہ لکڑی صرف

نیچے سے ہل رہی تھی۔اوپر سے وہ دیوار میں نصب کی گئی تھی، ہلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔وہ چند ثانیے میں ہی اوپر آ گئی۔اوپر آتے اس نے ہاتھ جھاڑے، گل اس کی ویڈیو بنا رہی تھی۔

''اب بس بھی کرو۔آ گئی ہوں میں اوپر۔'' وہ کیمرے پر ہاتھ رکھ کے برا منا کے بولی۔اسے سانس چڑھا گیا تھا۔وہ ہانپ رہی تھی۔

''کتنا آسان تھا ناں۔'' گل نے ایک بار پھر شرارت سے لب کاٹے۔''سانس تو ایسے چڑھ رہا ہے جیسے دس کلو وزن بھی اوپر لے کے آئی ہو۔موٹی۔''

''موٹی؟'' عبادہ گھوم گھوم گئی۔''تمہیں میں موٹی لگتی ہوں؟ ڈاکٹر کو دکھاؤ آنکھیں۔'' وہ جل کے بولی۔

''اچھا اچھا تم پتلی میں موٹی۔خوش؟''

عبادہ نے اس سے کیمرہ چھین لیا۔گل کی ہنسی رک نہیں رہی تھی۔

''تم یہ ویڈیو اپنے گھر والوں کو دکھانا۔وہ تمہاری بہادری دیکھ کے بہت سراہیں گے۔''

''شٹ اپ.....'' اس نے کیمرے سے ویڈیو ڈیلیٹ کر دی۔

کالاش کے لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔گرمی تھی۔دھوپ تیز تھی۔گاؤں میں لوگ گیارہ بجے کھانا کھا کے ظہر تک سوتے ہیں۔یہاں بھی غالباً سب سو رہے تھے۔میدان جہاں وہ چڑھی تھیں کے سامنے کچھ باغات تھے۔انگور اور خوبانیوں کے باغات۔ان باغوں کے گرد ایندھن کی باڑ لگی ہوئی تھی۔

عبادہ نے ہاتھ کا چھجا بنا کر بھنوؤں پر رکھا۔''یہ ہیں وہ باغ؟''

''ہاں۔'' وہ پورے مان سے بولی۔''آزاد باغ۔بابا کے دوست حسین مگسی کے باغ۔''

عبادہ کی نظروں نے دائیں سے بائیں اس باغ کی وسعت کا اندازہ کیا۔وہ کوئی معمولی رقبے

کا چند درختوں والا باغ نہیں تھا۔ وہ طویل قطعہ اراضی پر پھیلا، نگاہوں کے اوجھل ہونے پر جاری رہنے والا باغ تھا۔ جس میں اونچے اونچے درخت لگے تھے اور انگور کی بیلیں اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ اندر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ مسحور انداز میں قدم اٹھاتی باغ کی باڑ کے قریب آئی۔

باڑ چھوٹی سی چار دیواری تھی جس کے سرے پر ایندھن لگائی ہوئی تھی۔ کیکر کے نوکیلے کانٹے جگہ جگہ سے جھانک رہے تھے۔ گل اس کے شانے کھڑی ہوگئی۔ باغ کے اندر شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کی بھنبھنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بل کھاتی بیلوں سے انگور کے خوشے لٹک رہے تھے، سبز، سرخ، سیاہ اور جامنی انگور۔ عبادہ نے زندگی میں پہلی بار انگور کا باغ دیکھا تھا۔

''کیا ہم اسے توڑ سکتے ہیں؟'' عبادہ نے پوچھا۔

''کوئی نظر تو نہیں آرہا۔ اس طرح توڑا تو چوری ہوجائے گی۔'' گل نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے بتایا۔

''ہوں۔'' عبادہ کا چہرہ مایوس ہوگیا۔ گل نے اس کے لومڑی جیسے تاثرات دیکھے۔ (انگور کھٹے ہیں والی لومڑی کے)

''چوری کرنا بری بات ہوتی ہے لیکن جب مجبور ہوجائیں تو نہ صرف چوری جائز ہے بلکہ قتل بھی.....'' گل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ کس کا قول ہے؟'' وہ غصے سے بولی۔

''شیطان بن ابلیس کا۔''

عبادہ اس کی طرف مڑی۔ ''کچھ زیادہ نہیں سنتی تم اپنے پیر و مرشد کی؟''

''کیا کروں؟ پیٹ کا سوال ہے۔'' اس نے آنکھ کا کونا دبایا۔ عبادہ ہنس پڑی۔ دونوں اس مکالمے کے بعد کچھ دیر تک خاموش رہیں۔ باغات کو دیکھتی رہیں جہاں سے بچوں کی آوازیں آرہی

تھیں جو شاید نیم دوپہر میں چھاؤں تلے کھیل رہے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہونے کی وجہ سے پسینہ آ گیا تھا۔ ماتھے پر چند بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

''میرے پاس پیسے.....''

''تمہارے پاس پیسے.....''

دونوں نے بیک وقت کہا پھر ٹھہر گئیں۔ جب لحظے بھر میں کچھ سمجھ آیا تو قہقہہ چھوٹ گیا۔ پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے دونوں لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ ان کی آواز سن کے باغ میں موجود بچے باہر نکل آئے اور اب وہ درختوں کی اوٹ سے جھانک جھانک کے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ حیران تھے کہ جہاں پورا گاؤں سویا ہوا ہے وہاں یہ دونوں کون ہیں جو اتنا اونچا اونچا ہنس رہی ہیں۔

''ہاں۔ پیسے ہیں میرے پاس۔ پرس میں۔ چلو۔ چوری نہیں کرتے۔ خرید لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' عبادہ نے جھٹ سے کہا۔

''ہوں۔'' گل نے سر ہلایا پھر دیوار پہ ہاتھ رکھ کے ایڑیاں اٹھائیں اور ایندھن کے آر پار دیکھا جہاں درختوں کی اوٹ سے کچھ بچے جھانک رہے تھے۔ ان میں ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا بھی تھا جس کے تاثرات میں بہت تلخی نظر آ رہی تھی۔ درختوں کے پتے ہل رہے تھے۔ ہلکی مگر گرم ہوا چل رہی تھی۔

''سنو۔ پھل بیچو گے؟'' گل نے ذرا زور سے اسے مخاطب کیا۔ وہ بڑا لمبا سا لڑکا قریب آ گیا۔

''نہیں۔ ہم بیچ نہیں سکتے۔ یہ آرڈر کے لیے ہیں۔'' لڑکا جس کی سنہری مسیں بھیگ رہی تھیں، ذرا کروفر سے بولا۔

''مگر ہمیں بھوک لگی ہے ہمیں چاہئیں۔''

''تم کھوواری اپنا کھانا ساتھ لے کے آیا کرو۔ ہمارے باغ تمہارے باپ کی ملکیت نہیں۔''

لڑکا بھڑک اٹھا۔

''کیا کہا؟'' گل ایک لمحے کے لیے بھونچکی رہ گئی۔

''وہی جو تم نے سنا۔ ہم اپنے پھل نہیں بیچیں گے۔ جاؤ یہاں سے۔''

''تم اپنے گاہک سے اسے طرح پیش آؤ گے؟'' گل نے صدمے سے اسے دیکھا۔ ''ہم خریدیں گے۔ تم جتنے کا بیچنا چاہو۔ ہم چھین نہیں رہے اور اگر نہیں دینا چاہتے تب بھی مرضی تمہاری لیکن اس سب کی آڑ میں نسل پرستی اور ذات پات کی نفرت دل میں پالنا اچھی بات نہیں ہے۔ ہم قبضہ مافیا نہیں ہیں۔ تمہارے منتخب کردہ سردار ہیں۔ تمہارے خیر خواہ ہیں۔'' وہ اب کی بار بولی تو لہجے میں نرمی تھی۔ عبادہ کو مقامی بولی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''ہم نے تمہیں منتخب نہیں کیا اور نہ ہی کریں گے۔ تم سردار ہو لیکن بدنام.....''

''خلیل .....'' اس سے پہلے کہ وہ لڑکا مزید کوئی عتاب دکھاتا، ایک زنانہ آواز نے اس کو بری طرح ٹوکا۔ وہ ایک کالاشی خاتون تھیں جو یہ سب سن رہی تھیں۔ وہ جتنی تیزی سے لڑکے کے پاس آئی تھیں، عبادہ چونک گئی تھی۔

''تمہیں کس نے حق دیا ہے بدتمیزی کرنے کا؟ جاؤ اندر جا کے اپنی پڑھائی کرو۔ نری دوپہر سکول سے آتے ہیں اور باغ میں چھپ جاتے ہیں۔ جاؤ گھر جاؤ۔ چلو۔'' وہ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے ،اسے دھکا دیتے ہوئے بولیں۔ لڑکے کا طیش کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ گل کو لہو فشاں نظروں سے دیکھتا ہوا بادل نخواستہ وہاں سے ہٹا تھا۔

''معذرت سردار۔ معذرت، بچہ ہے۔ غلطی ہوگئی۔ اسے معاف کر دیں۔'' خاتون پشیمانی سے بولی۔

''معافی کی کوئی بات نہیں ہے لیکن اپنے بچوں کے دل میں ایسی باتیں کیوں ڈال رہے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں؟ کیوں انہیں یہ بتا رہے ہیں کہ ہم ان کے دشمن ہیں؟ ہم نے

کالاش کو نقصان پہنچایا ہے؟'' وہ پچکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اسے لڑکے کے لہجے سے مایوسی ہوئی تھی۔

''حقیقت کچھ بھی نہ ہو سردار تو کچھ نہ کچھ ہوتی ہے۔'' وہ طنز بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔ ''ساری دال نہ سہی، کچھ نہ کچھ تو اس میں کالا ہوتا ہی ہے۔ خیر۔ آپ اندر آئیں۔ پھل میں دیتی ہوں۔''

''نہیں چاہئیں۔'' گل نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ''ہم نہیں لیں گے۔ آپ زحمت نہ کریں۔ شکریہ۔ ہم چلتے ہیں۔''

''نہیں سردار۔ ایسے نہ جائیں۔ میرے بیٹے کو معاف کر دیں۔ بچہ ہے، غلطی ہو گئی ہے۔'' خاتون ایندھن کے پار تھیں، اس طرف نہیں آسکتی تھیں، اس لیے تیزی سے بولیں۔

''نہیں۔ ہم کہیں اور سے لے لیں گے۔ شکریہ۔ چلو عبادہ۔'' وہ عبادہ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ باغ کے نشیبی راستے لے گئی جو نیچے جا رہا تھا۔ راستہ ڈھلوانی تھا جہاں دونوں طرف پتھروں کی پانچ پانچ فٹ کی چار دیواری تھی۔ یہ راستہ کالاشی بازار جاتا تھا۔ گل کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے؟'' تھوڑا دور جا کے عبادہ نے پوچھا۔

''ہوں۔'' گل نے قطعیت سے کہا۔

''پھل کیوں نہیں دیے انہوں نے؟''

''کیوں کہ ہم خریدنے تھوڑے ہی گئے تھے ہم تو پورا باغ ہڑپ رہے تھے۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔''

گل نے گہری سانس لی اور ٹھہر گئی۔ ''کالاش۔ یہ وادی صرف ٹورسٹ کے لیے ہے۔ وہ لوگ جو باہر سے آئیں۔ یہ چترال کے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ ہمارے قبیلے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور یہ پچھلے کچھ چند سالوں سے ہو رہا ہے۔ حالاں کہ چچا جان نے روشانے آپا کا رشتہ

یہاں کے سردار قبیلے میں دے کر اس خلش کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ لوگ پھر بھی ویسے ہی خیالات رکھتے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیوں کہ ان کو لگتا ہے کہ ان کی وادی، ان کا کلچر، ان کے لوگ اور ان کی ثقافت کو ہم نے نقصان پہنچایا ہے اور چوں کہ ہم سردار ہیں تو ہمیں ان کے ورثے کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں جو ان کے خیال سے ہم نہیں کر رہے۔"

"ان کو ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"پتہ نہیں۔ حالاں کہ یوسف خان جی اور بابا نے ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ یہ پل جس سے ہم گزر کے آئے ہیں یہ بھی بابا نے منظور کروایا تھا۔ ان کے قبرستان اور میوزیم کی منظوری بھی بابا نے دی تھی۔ اس کے علاوہ باقی مسائل جو وقت کے ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ہم سب کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ دل میں ہمارے لیے عزت نہیں رکھتے۔" وہ افسوس سے بولی۔ وہ دیوار کے قریب درخت کی چھاؤں میں کھڑی تھیں۔

"تم لوگ بات کرو یہاں کے سردار سے۔ ان کو بٹھاؤ اور پوچھو ان کو کیا تحفظات ہیں۔ وہ جو کرانا چاہتے ہیں، وہ اقدامات کرو۔"

"مسئلہ یہ نہیں ہے عبادہ۔" اس نے تھکی تھکی سانس نکالی۔ "مسئلہ کچھ اور ہے۔ یہ ڈومیسٹک پالیٹکس ہے۔ گھریلو سیاست۔ یہاں مسئلہ اور خلش کچھ اور ہوتی ہے، اسے رنگ کسی اور چیز کا دیا جاتا ہے اور بھڑاس کہیں اور سے نکلتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ....." یکدم وہ رک گئی، ٹھنڈی سانس لی۔ "پہلے کچھ کھا لیتے ہیں پھر بتاتی

ہوں۔'' اس کا شاید موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے کھٹے دل سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن کھائیں گے کہاں سے؟'' عبادہ نے اس ویرانے میں یہاں سے وہاں نگاہ دوڑائی۔

''ریستوران میں.....'' گل نے واپس راستے ناپتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں کالاش بازار کے ایک ریستوران میں لکڑی کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عین بازار کے درمیان چھوٹی سی دکان تھی جہاں پردہ کر کے ایک طرف عورتوں اور دوسری طرف مردوں کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ عبادہ کا چہرہ سڑک کی طرف تھا جب کہ گل کی پشت تھی۔ باہر گلی میں شور تھا۔ لوگ گزر رہے تھے۔

کھانا سرو تھا۔ وہ دونوں روغنی نان کے ساتھ بچھڑے کی کڑاہی کھا رہی تھیں۔ بچھڑے کا وہ گوشت جسے تین ماہ پہلے سکھایا گیا تھا۔ نمک اور مرچ تیز تھی لیکن ذائقہ اچھا تھا۔

''کالاش کا دوسرا نام کافرستان ہے۔ یعنی کافروں کے رہنے کی سرزمین۔ یہ ہندو آریائی لوگ ہیں۔ ویدک فلسفوں کو مانتے ہیں۔ براہمن اور براہما تما پر یقین رکھتے ہیں جیسے ہندو رکھتے ہیں۔'' گل کے بتانے پر اس نے دھیان بھٹکا دیا۔ ''یہی ان کا مذہب ہے جیسے چترال کی زیادہ تر آبادی کا مذہب اسماعیلی ہے۔ اس طرح جیسے اسلام ہے لیکن مسلمان انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، ان کے رسوم، ان کے تہوار اور ان کے رواجوں کو برا مانتے ہیں جس کی وجہ سے یہ سائیڈ پہ ہو گئے ہیں۔ ان کی آبادی کم ہونے کی وجہ بھی یہی نظر اندازی ہے۔''

''ان کو لگتا ہے سردار ان کو نظر انداز کرتے ہیں؟'' عبادہ نے تعجب سے پوچھا۔

''کم آن عبادہ۔ سردار کوئی نمبردار نہیں ہوتا جس کے پاس حکومت کی طرف سے پیسہ آ رہا ہو

اور وہ مقامی ضرورتوں پر خرچ کرتا ہو۔ یہ قبائلی انعام ہوتے ہیں جو صرف اس انسان کو ملتے ہیں جس کے پاس پیسہ اور پاور ہوتا ہے۔ ہم کالاش پہ خرچ کرتے ہیں لیکن ان کے ورثوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ قانونی طور پر جائز نہیں۔ اس کے لیے حکومتی اقدامات کی جاتی ہیں۔ اوپر سے پیسہ آتا ہے مگر یہ بات کالاشی نہیں سمجھتے۔ ان کو لگتا ہے کہ ہم جان بوجھ کر ان پر خرچ نہیں کرتے اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہم غیر مسلم ہیں اس لیے.....'' گل نے تمسخر سے شانے اچکائے۔

اسی لمحے عبادہ کی نظر باہر پڑی جہاں سامنے والی دکان جو کہ جوتوں کی تھی وہاں کوئی بیٹھا ہوا تھا جو بالکل اس طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ڈاکٹر ماسک تھا۔ اس کی ترچھی نظریں شیشے کے پار سے اندر آ رہی تھیں۔ اس نے سیاہ شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے عبادہ جھنجھلا گئی۔

'UNESCO' نے حکومت پاکستان سے اس کے بابت شکایت کی تھی کہ ہماری وفاق کی عدم توجہ کی وجہ سے کالاش کی آبادی اور اس کی ثقافت ختم ہو رہی ہے۔ ہمیں اس کا سدِ باب کرنا چاہیے مگر کوئی اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دیتا۔ بھٹو وہ پہلا حکمران تھا جس نے کالاش پر توجہ دی تھی۔ اس کے بعد سے کسی نے اس طرف دھیان نہیں کیا۔'' وہ بوٹی سے گوشت نوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مجھے بھی یہ گلیاں، گھر اور یہ وادی بہت پرانی لگیں۔ حکومت پاکستان کو اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ یہ ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔'' وہ رسان سے بولی۔ شیشے کے پار بیٹھا لڑکا بدستور دیکھ رہا تھا۔ (کیا اس نے کبھی پینٹ شرٹ والی لڑکی نہیں دیکھی؟)

''تمہیں پتہ ہے اس وقت کتنے کالاشی رہ گئے ہیں اس دنیا میں؟'' گل نے نوالہ نگلتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''کتنے؟'' وہ ٹھٹکی۔

''صرف چار ہزار.....''

''وہاٹ.....''

''یس۔ بے یقینی بات ہے لیکن سچ ہے۔'' گل کے لہجے میں تاسف تھا۔

''اتنی کم کیسے ہوگئی یہ آبادی؟'' وہ حیران رہ گئی۔

'' کالاش کی آبادی کے کم ہونے کے اسباب بہت ہیں۔ یہاں کے لوگ اسلام میں داخل ہورہے ہیں خصوصاً عورتیں۔ وہ مسلمان مردوں سے شادی کرلیتی ہیں۔ کچھ یہاں سے ہجرت کر لیتے ہیں۔ باہر ملک چلے جاتے ہیں۔ کالاش کا خیال ہے یہ ہماری وجہ سے کم ہورہے ہیں حالانکہ اگر ان کی رسمیں دیکھی جائیں تو پتہ چلے یہ ان کی خواتین اور لڑکیاں خود بھاگ جاتی ہیں بلکہ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہاں بھاگ کر شادی کرنے کا رواج ہے۔ نارمل شادیاں یہاں نہیں ہوتیں۔ لڑکیاں تہواروں پہ لڑکوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں اور یہ اتنا نارمل ہے کہ کوئی غیرت یا کسی عزت کا مسئلہ نہیں بنتا۔ ماں باپ خوش، خاندان خوش، قبیلہ خوش۔''

''ان بلیوایبل!'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''ایگزیکٹلی .....ان فیکٹ یہ لوگ نکاح کرتے ہیں پھر واپس قبیلے میں آجاتے ہیں اور یہیں رہنے لگتے ہیں۔ ہماری کزن روشانے آپا بھی یہیں بیاہی گئی ہیں۔ ان کے شوہر اجمیر شاہ مسلمان ہوگئے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''اس سب سے ان کے خاندان یا قبیلے کو فرق نہیں پڑتا۔''

''نیور۔''

''پھر تو یہ ہم سے اچھے ہیں۔ ہم تو غیرت پہ مار دیتے ہیں۔'' وہ بوٹی نوچتے ہوئے خوشگوار

حیرت سے کہنے لگی۔

''ویل۔ بھاگ کے شادی کرنا اچھی بات ہرگز نہیں ہے۔ ولی کی رضامندی ہونی چاہیے۔ بعض اوقات ہم جذبات میں اتنے بہہ جاتے ہیں کہ ہمیں وہ نہیں دکھائی دیتا جو ہمارے ماں باپ یا ہمارے خاندان کو دکھائی دیتا ہے۔ ہم غلط قدم اٹھا لیتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں۔ یہ کالاشی لڑکیاں بھی واپس آجاتی ہیں پھر زیادہ برا لگتا ہے۔ عزتیں بھی رل جائیں، خوشی بھی نہ ملے، پچھتاوے بھی پیچھا نہ چھوڑیں، زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ اس لیے بھاگ کے شادی کرنا برا ہے۔''

''اگر ماں باپ نہ مانیں تو؟'' عبادہ نے گل کے خیالات جاننے کے لیے پوچھ لیا۔

''دیکھو عبادہ۔ ایک مرد جس کے ساتھ آپ بھاگ جاتے ہیں۔ اس نے آپ کے ساتھ کتنا عرصہ گزارا ہوگا۔ دس سال؟ پندرہ سال؟ نہیں۔ میں نے زیادہ بتا دیا ہے۔ صرف چار تین دو سال ہوتے ہیں۔ ان دو سالوں میں ایک لڑکی خود کو اس کی عزت بنا دیتی ہے اور ان بیس پچیس سال کا کیا؟ جب وہ ماں باپ کی عزت ہوتی ہے؟ اس پرورش کا کیا؟ جسے وہ روند لیتی ہے؟ اس مان، اس بھروسے، اس محبت کا کیا جسے وہ ہمیشہ کے لیے داؤ پہ لگا دیتی ہے؟ بھاگی ہوئی لڑکی اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دوبارہ اپنی عزت بحال نہیں کر سکتی۔ لکھ لو مجھ سے۔''

وہ بے حد سمجھداری سے بولی تھی۔ عبادہ شاک سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گل کتنی عجیب تھی۔ پل میں شعلہ اور پل میں پانی۔ کل رات گل سے زیادہ کوئی تلخ نہیں لگا تھا اور آج دوپہر اس سے زیادہ پرسکون اور قدامت پسند کوئی نہیں لگ رہا تھا۔ کتنی دھوپ چھاؤں جیسی تھی وہ۔

''تم..... عجیب ہو..... گل..... تمہیں سمجھنا مشکل ہے۔'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

''ہوں کیوں کہ میں نفسیات کی کتاب کے جس چیپٹر میں تھی تم نے اس چوائس پر چھوڑ دیا تھا۔''

وہ ہنس پڑی۔

''شاید۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''اس کے بعد ہم کہاں جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''بازار گھوم لیتے ہیں۔ کچھ خریدنا ہو تو دیکھ لینا کیونکہ بعد میں ہم اس راستے سے نہیں آئیں گے۔''

''ہوں۔'' اس نے سر کو جنبش دی۔ نظر واپس اس آدمی پہ پڑی، وہ ہنوز دیکھ رہا تھا۔

''میرے خیال سے مجھے غاذان کو فون کر دینا چاہیے۔'' وہ پرس کی زپ کھولتے ہوئے بولی۔'' اس کا کام ہو گیا ہوگا۔ باقی جگہیں ہم ساتھ میں گھوم لیتے ہیں۔'' اس نے فون باہر نکالا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' گل نے اس کے ہاتھ سے فون لے کے واپس پرس میں ڈالا۔

''اس کو ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائے گا تو خود ہی آ جائے گا۔''

''لیکن اب تک تو.....''

''کم آن۔ اس کی ضرورت نہیں ہمیں۔ ہم کافی ہیں۔'' وہ پچکار کے بولی۔ عبادہ بے دلی سے مسکرا دی۔ گل کو معلوم تھا غاذان آئے گا تو وہ پس منظر میں چلی جائے گی۔ اسے ان دونوں کے درمیان اپنا آپ کسی اجنبی سے کم نہیں لگے گا۔ اس لیے بہتر تھا غاذان نہ ہی ہو۔

عبادہ کے دل میں ہوک اٹھی۔ اس نے دوبارہ اس آدمی کو دیکھا، اب کی بار وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے کھانے پہ سر جھکا دیا۔ کیا مسئلہ تھا اس کو؟ کیوں گھور رہا تھا؟ کیا کبھی کوئی ٹورسٹ لڑکی نہیں دیکھی تھی اس نے؟ کچھ دیر کھانا کھا کے وہ باہر نکلیں۔ عبادہ نے تیزی سے اس دکان کی طرف دیکھا لیکن وہ آدمی وہاں نہیں تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بازار میں لوگ تھے لیکن رش نہیں تھا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟

دائیں طرف بلند و بالا پہاڑ تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف میں دکانیں تھیں لکڑی کی دکانیں

جہاں کالاشی پشوازیں اور دیگر ثقافتی اشیاء لٹک رہی تھیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ریستوران اور کیفے بھی تھے۔ لوگوں کا زیادہ رش نہیں تھا البتہ کہیں کہیں ٹورسٹ دکھائی دے رہے تھے۔ عبادہ نے پرس کراس میں پہنا، آنکھوں پر گاگلز لگائے، کیمرہ اوپر اٹھایا اور تصویر اتارنے لگی۔ ٹھیک کہا تھا غاذان نے یہ کیمرہ واقعی ایچ ڈی تصویریں لے رہا تھا۔ وہ عین بازار کے درمیان تھیں۔

''میں تمہیں کچھ انتہائی مزیدار جگہیں دکھاؤں گی جو مجھے یقین ہے تم نے پہلے نہیں دیکھی ہوں گی۔ سنا بھی نہیں ہوگا ان فیکٹ۔ ویسے تو یہاں آنے والے سیاح چند جگہیں گھومتے ہیں لیکن تینوں وادیوں کو کیسے ایکسپلور کرنا ہے۔ یہ میں تمہیں بتاؤں گی۔'' گل نے تفاخر سے شانے جھٹکے۔

''ہم تینوں وادیاں دیکھیں گے؟ وقت نہیں لگے گا؟''

''تو لگ جائے؟ کسے پرواہ لیکن یہاں آ کے کچھ جگہوں کو مس کر دینا غلط بات ہے۔ ویسے بھی یہ گاؤں جڑے ہوئے ہیں۔ دو اوپر ہیں ایک ذرا پستی پر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''او کے۔'' اس نے کیمرہ آن سے جوڑ رکھا تھا۔ وہ کسی فوٹوگرافر کی طرح تصویریں اتار رہی تھی۔ اس نے خفیہ طور پر گل کی کئی تصویریں لیں۔ کسی خاص مقصد کے لیے۔ اب وہ دونوں درمیان میں کھڑے ہو کر کیمرے کی اسکرین میں تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ آس پاس لوگ گزر رہے تھے۔ دکاندار دکانوں میں کھڑے ہو کر دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''کافی اچھی تصویریں لی ہیں۔'' گل نے پذیرائی کی۔

''شکریہ۔'' عبادہ نے واپس کیمرہ گردن میں لٹکا دیا۔

دفعتاً اس کی نظر سامنے دکان پہ پڑی جس کے باہر ہینگرز میں کالاشی پشوازیں اور ٹوپیاں، پرس وغیرہ لٹکے ہوئے تھے۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی، اس نے کچھ نہیں خریدا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے سیدھا اندر چلی گئی۔ گل اس کے پیچھے آئی۔ دکان میں پہلے ہی دو انگریز سیاح موجود تھے۔ ایک لڑکی

اور ایک لڑکا۔لڑکے نے شارٹس اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔اس کی کمر پہ بیگ پیک لدا ہوا تھا۔لڑکی البتہ کاٹن کے ٹخنوں تک آتے گاؤن میں ملبوس تھی۔وہ لڑکے کے بازو میں ہاتھ ڈالے پریشان کھڑی تھی۔وہ دونوں شاید میاں بیوی تھے۔وہ دکاندار جو کالاشی عورت تھی اس سے ایک کالاشی ٹوپی خریدنے پر بحث کر رہے تھے۔انگریز ٹوٹی پھوٹی اردو میں خاتون کو پیسے کم کرنے کا کہہ رہے تھے۔

دکان کے اندر دیواروں سے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزیں لٹکی ہوئی تھیں۔یہ چیزیں یہاں کی مقامی عورتیں اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں،ان کے گاہک مقامی لوگ نہیں ہوتے تھے، ان کا ٹارگٹ ہمیشہ سیاح ہوتے تھے۔قومی سیاح،ان کی قیمتوں اور چیزوں کی بناوٹ کے تاوان سے واقف تھے جب کہ غیر ملکی سیاح چونکہ ان چیزوں کی قیمتوں سے ناواقف ہوتے تھے،اس لیے یہاں کے دکاندار اُن کے نرخوں کو آسمان پر پہنچا دیتے۔

عبادہ انگریز کو نظر انداز کر کے دیواروں سے لٹکی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں دیکھنے چلی گئی۔جب کہ گل دروازے کے پاس کھڑے ہو کر دلچسپی سے دونوں انگریزوں کو دیکھنے لگی۔

''دس ہزار۔دو ہزار پاؤنڈز۔نو نو۔بہت زیادہ۔کم کم۔''لڑکا انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

''نو.....نو.....ٹین.....لاسٹ.....''خاتون اڑی ہوئی تھی۔

''ایٹھ.....لاسٹ.....''انگریز لڑکی بولی۔''دس مینگا اے.....''

''یس۔ایٹھ۔کنفرم۔''جس تھکن اور ہار کے ساتھ لڑکا کہہ رہا تھا،ایسا لگ رہا تھا بارگیننگ کی یہ جنگ پچھلے کئی ساعتوں سے چل رہی تھی۔دونوں انگریز بیچارے تھک گئے تھے اور خاتون کو اچھا گاہک مل رہا تھا تو وہ پیچھے کیوں ہٹتی؟

''ٹین۔لینا ہے تو لو نئی تے جاؤ۔''خاتون ٹوپی واپس رکھتے ہوئے قطعیت سے بولی۔

لڑکی نے اداس شکل بنا کر اپنے شوہر کو دیکھا۔دونوں کو ٹوپی بہت پسند آئی تھی لیکن واقعی وہ بہت

مہنگی تھی۔لڑکے کو بیوی کا اداس چہرہ اچھا نہیں لگا۔اس نے گہری سانس لی اور بادلِ نخواستہ پینٹ کی جیب سے بٹوہ نکال کے پیسے گننے لگا۔اس نے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کے عورت کو پکڑائے۔

''قیمت کیا ہے اس کی؟'' گل نے دکاندار خاتون سے پوچھا۔

''دس ہزار۔'' خاتون رکھائی سے بولی۔

''بنانے کی قیمت پوچھ رہی ہوں؟''

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' خاتون پیسے گنتے ہوئے برا منا کے بولی۔

''مجھے گلِ لالہ کہتے ہیں۔کلیم اللہ خان کی بیٹی ہوں۔'' گل نے کہنی کاؤنٹر پہ رکھی اور لاڈ سے کہا۔خاتون نے جیسے ہی پہچانا، سٹپٹا گئی۔

''پندرہ سو کا بنایا تھا۔'' وہ پیسے نیچے رکھتے ہوئے جھٹ سے بولی۔

''دس ہزار کی بچی ہے؟ ہوں۔گڈ۔'' گل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''اچھی قیمت لگائی ہے۔ان لٹیروں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' پھر اس نے انگریز جوڑے کو دیکھا اور زبردستی مسکرائی۔''کمینو۔ہمارا برصغیر کھا گئے۔ہم تمہارے باپ کی ملکیت تھے یا ماں کی؟ ہاں۔ادھر آئے ہمیں چاک کیا۔ہمارے دادا، پردادا سب کو قتل کیا۔تمہیں ہم بے وقوف لگتے ہیں کہ جہاں ہمارے پیارے دفن ہیں، وہیں آ کے تم ثقافت کی سیر کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے ہی تو بنایا ہے یہ سب۔ احسان جتانے والو۔''

انگریز ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''گل.....'' عبادہ نے تنبیہی انداز میں ٹوکا۔

''چپ کرو تم۔میں بات کر رہی ہوں ناں۔اچھا کیا خاتون۔دس تو کیا بیس میں بیچو۔ان کے ساتھ ایسا ہی کرو۔لٹیرے۔''

''ہمیں سمجھ نہیں آرہی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' انگریز لڑکا الجھن سے بولا۔

''ماں کے لاڈلے کہہ رہی ہوں کہ اچھی سستی قیمت پہ خریدا ہے۔ یہ بہت محنت طلب چیز ہے۔ اس لیڈی کے لیے دعا کرو۔ اس نے ہاتھوں سے بنائی ہے۔'' پہلے تین لفظوں کے علاوہ گل نے باقی بات انگریزی میں کہی تھی۔

''اوہ۔ تھینک یو۔ تھینک یو سو مچ۔ مجھے لگا قیمت زیادہ ہے۔'' لڑکے کے چہرے پر تسلی نظر آئی۔ خاتون نے اسے خاکستری بیگ میں ٹوپی ڈال کے دی جسے وہ لے کے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''تم کتنی میسنی ہو۔'' عبادہ نے اسے بازو پہ چپت لگائی۔

''میسنی مطلب؟''

''اندر سے برا۔ جو باہر سے اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے۔''

''ویری فنی۔'' گل نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''کیا فنی؟ تم نے بیچاروں کو کھری کھری سنا دی۔ اگر ان کے ساتھ کوئی Translator ہوتا تو؟'' عبادہ نے باور کرایا۔

''یہ یوٹیوبرز ہیں محترمہ۔ ان کے پاس سیلفی سٹک، بیگ پیک اور ایک عدد کیمرے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ ناک چڑھا کے بولی۔

''تمہیں کیسے پتہ؟'' عبادہ نے کمر پر ہاتھ رکھے۔ ''وہ کوئی نیوز اینکر، ٹورسٹ کمپنی یا.....''

''تم نے کچھ خریدنا ہے؟'' گل نے سرد مہری سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں۔ یہ موتیوں والا جھومر اچھا لگا ہے مجھے۔'' اس نے جھومر اٹھا کے کاؤنٹر پہ رکھا۔ ''مگر تم بات مت بدلو۔ اچھا نہیں کیا تم نے۔''

گل کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ دکاندار خاتون کو دیکھنے لگی جو جز بز کھڑی تھی۔

''چلو بی بی دیکھ کیا رہی ہو؟ اس کو پیک کر دو۔''

خاتون سٹپٹا کے خاکستری بیگ اٹھانے کے لیے نیچے جھکی۔

''پیسے کتنے ہوئے۔''

''دو ہزر.....''

''اوں ہونہہ۔ ان کو دس ہزار میں لوٹا ہے۔ ہمیں مفت میں دینا ہوگا۔'' گل نے تنبیہہ کی۔

''نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ مفت کی چیز نہیں لیتی میں۔ آپ قیمت بتائیں۔''

''دو لاکھ، اکیاون ہزار دو سو چوالیس روپے۔'' گل ڈرامائی انداز میں ہانک کے بولی پھر ٹھہر کے اسے دیکھا۔ ''ہیں کیا تمہارے پاس مس سلیم؟''

''اتنے تو نہیں ہیں لیکن جتنے کا یہ ہے۔ اتنے ضرور ہیں۔'' وہ بھی گردن اکڑا کے بولی۔ ''آپ قیمت بتائیں۔''

''پندرہ سو روپے۔'' خاتون نے کاغذ کا بیگ نکال کے جھومر اس کے اندر رکھ دیا۔

عبادہ نے پیسے نکال کے کاؤنٹر پہ رکھے اور جھومر کا بیگ پرس میں ڈال دیا۔ گل نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں سمجھا سکتی تھی۔ دو سو کی چیز پندرہ سو میں لے لی۔ اس سے اچھے تو انگریز تھے جنہوں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بارگیننگ کر لی تھی۔

اور شیطان کو یاد کیا۔ شیطان حاضر۔ وہی انگریز دوبارہ شاپ کے اندر آئے۔

''ایکسکیوزمی؟'' انہوں نے گل کو مخاطب کیا۔ وہ پلٹی۔

''یس؟''

''کیا آپ ہمیں بتا سکتی ہیں قبرستان کا راستہ کہاں سے جاتا ہے؟'' انہوں نے اسے خیر خواہ

مان لیا تھا۔

''پائی یان۔ فیر تے تینوں مرن دی لوڑ پے گی۔'' وہ پنجابی میں بڑبڑائی پھر قدرے تکلف سے جبڑوں کو تکلیف دیتے ہوئے مسکرائی۔ ''قبرستان جانا ہے۔ بمبور کے قبرستان؟''

''یس یس۔'' لڑکے نے تیزی سے سر ہلایا۔

''وہ یہاں سے۔ امم۔ باہر آؤ۔'' وہ انگریز کو باہر لے گئی عبادہ ساتھ باہر آئی۔ گل اشاروں، کنایوں سے قبرستان کا راستہ بتانے لگی۔ راستے میں کیا کیا آئے گا۔ پہچان کیسے کرنی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

''سمجھ گئے؟'' اس نے نہایت خیر خواہی سے پوچھا۔

''یس۔ تھینک یو۔'' انگریز ممونیت سے کہتا بیوی کو لے کے چلا گیا۔

''پہاڑوں کے دامن میں..... دریا کے پاس..... جنگل کے کنارے کونسا قبرستان ہے گل؟'' عبادہ نے ایک آنکھ بند کر کے گال پہ انگلی سے دستک دی۔ گل اس کے کان کے پاس جھکی اور سرگوشی میں کہا۔

''کوئی بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''یہاں ایسا کوئی قبرستان نہیں ہے۔ میں نے انہیں بھٹکا دیا ہے۔'' وہ عیاری سے مسکرائی۔

''مگر کیوں؟'' عبادہ کو برا لگا۔

''کیا مطلب؟ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھول گئیں۔ کس طرح انگریزوں نے ہم پہ قبضہ کیا تھا۔'' وہ صدمے سے اسے دیکھنے لگی۔ ''ہماری مغل بادشاہت ختم کی گئی تھی؟ ایسٹ انڈین کمپنی۔ ریڈکلف۔ ماؤنٹ بیٹن۔ اتنی جلدی بھول گئیں۔ ابھی تو سو سال بھی نہیں ہوئے۔''

اس نے جذباتی انداز میں آنکھ کا کونا صاف کیا۔ عبادہ نے اس کی اداکاری پر سر کو دائیں بائیں

جنبش دی۔

''ناقابلِ مرمت!''

☆.....☆.....☆

عصر کا وقت ہو رہا تھا جب وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے بمبوریت کے اس مندر پہنچیں جہاں کالاشی اپنی میتوں کو رکھتے ہیں اور ان کے رسوم ادا کرتے ہیں۔ یہاں کافی لوگ نظر آرہے تھے۔ یقیناً میت کی رسومات کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان لوگوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ سب مقامی لباس میں موجود تھے۔ یہاں بھی ہال تک جانے کے لیے وہی لکڑی کے زینے بنائے گئے تھے۔ عبادہ کالاش میں ان زینوں پر جتنی بار چڑھی تھی، شاید ہی کوئی چڑھا ہوگا اور اس مشق کے دوران اس نے خوب چوٹیں کھائی تھیں۔ وہ جب جب ایسا زینہ دیکھتی، بے ساختہ رک جاتی اور کہتی۔

''یہاں کے لوگوں کو سیمنٹ، بجری کا علم ہے؟''

گل کہتی۔ ''نہیں۔ اس لیے یہاں صرف لکڑی استعمال ہوتی ہے۔''

''میں بتادوں ان کو؟''

''ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ پھر بھی لکڑی ہی استعمال کریں گے۔'' گل شانے اچکا دیتی۔

''تو تم لوگ بنادو۔ تم تو سردار ہو۔'' وہ جتاتی۔

''جب میں سردار بنی تو بنادوں گی۔'' آگے چلتے ہوئے گل بات ہی ختم کر دیتی۔

میت کا ہال (مندر) بالائی منزل پہ تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے سیڑھیاں لگی تھیں مگر فی الوقت وہاں بہت رش تھا۔ ان دونوں نے سیمنٹ سے بنی سیڑھیوں پہ چڑھنے کی بجائے، ایک لمبے راستے چھت در چھت ٹکی لکڑی کے زینوں کا انتخاب کیا۔ یہاں بھی لوگ کا ہجوم تھا لیکن وہ سب تمیز

سے چڑھ رہے تھے۔ان کے چڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بندر لٹک لٹک کے ٹہنیاں پکڑتا ہوا چڑھ رہا ہو۔وہ دونوں بھی لوگوں کے ساتھ قطار میں لگ گئیں۔

''تمہیں لگتا یہ لوگ ہمیں اندر جانے دیں گے اور ہمیں کچھ نہیں کہیں گے؟'' عبادہ نے گل کے جو آگے کھڑی کان کے قریب ہو کے دھیرے سے پوچھا۔

''مجھے تو کچھ نہیں کہیں گے کیوں کہ میں سردار کے گھرانے سے ہوں البتہ تم.....'' وہ کہتے کہتے مڑی،عبادہ سانس روکے کے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں کیا؟''

''کالاشی سیاحوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور انہیں محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اس لیے مجھے شاید منہ بھی نہ لگائیں لیکن تمہاری خدمت یہ اچھے سے کریں گے۔'' وہ اسے خوفزدہ کرنے لگی۔

''میرے خیال سے ہمیں بعد میں آنا چاہیے تھا۔یہاں فوتگی ہوئی ہے۔یہ لوگ غم میں ہوں گے۔ہم مندر پھر کبھی دیکھ لیتے۔گل۔'' وہ فوراً سے پیشتر پشیمان ہونے لگی۔گل نے اس کی بات سن کے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔اس کے قہقہے کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ ہال تک جانے والے لوگ پلٹ کے اسے دیکھنے لگے۔عبادہ سب کی نظروں سے خائف ہوتی اس کے قریب آئی۔

''چپ کرو۔کیوں ہنس رہی ہو۔یہاں میت پڑی ہے۔'' وہ اسے بازو سے جھنجھوڑ کے بولی۔

''اوہ میری ناقص العقل ٹورسٹ۔'' گل نے ماتم کناں انداز میں کہتے ہوئے اپنا بازو چھڑایا۔'' تم نے کالاش کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا کیا؟ یہ لوگ کسی کی فوتگی پر غم زدہ نہیں ہوتے بلکہ یہ لوگ تو فوتگی کو مناتے ہیں۔بینڈ باجوں کے ساتھ۔''

''کیا مطلب؟'' اسے صدمہ لگا۔

''مطلب یہ کہ یہاں عورت کے لیے ایک دن اور مرد کے لیے ڈھائی دن کی سلیبریشن رکھتے

ہیں جہاں یہ لوگ میت کے اردگرد کھڑے ہو کے مقامی ناچ گانا کرتے ہیں اور اس کی موت پر خوشی مناتے ہیں۔"

"میت پہ خوشی؟" عبادہ چکرا سی گئی تھی۔

"تم خوش نصیب ہو جو تمہیں یہ سب یہاں آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ کالاشیوں کی زندگیاں کافی لمبی ہوتی ہیں۔ یہ لمبی عمر میں مرتے ہیں۔ اس لیے کم ترین ہی کسی کو یہ رسومات دیکھنے کا موقع ملتا ہے لیکن تم اچھی قسمت لائی ہو۔"

وہ مندر تک جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھیں۔ مندر بالائی منزل پر تھا۔ لکڑی کے بڑے ستونوں کے ساتھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ کالاش ویدک مذہب کے پیروکار ہیں۔ یہ رگ وید کی تعلیمات مانتے ہیں جو ہندوؤں کی عظیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں اہلِ رگ وید فطرت کو پوجتے ہیں۔ فطرت میں پیش آمدہ عذاب جیسے طوفان، آندھی، سونامی وغیرہ اور نعمتیں جیسے بارش، غلہ مال مویشیوں کی پوجا کرتے ہیں۔

"تم لائیو دیکھو گی کہ کس طرح کالاش اپنی فوتگیوں کو مناتے ہیں۔ حیرت سے پھٹنا نہیں کیوں کہ شاید ایسا منظر تم نے پہلے نہ دیکھا ہو۔ لیکن یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو اپنے پیاروں کے بچھڑنے پر خوشی مناتی ہے۔"

اوپر آ کے گل تاسف سے بولی۔ عبادہ کو سانس چڑھ چکا تھا۔

ہال مستطیل تھا۔ فرش، چھت اور دروازے سب لکڑی کے تھے۔ مرکزی دروازہ بڑا تھا جس کے دونوں طرف لکڑی سے بنے گھوڑے کے سر لٹکے ہوئے تھے۔

گھوڑے کالاشیوں کی قدیم ترین ثقافت ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ان گھوڑوں کو بوجھ اٹھانے، کھیل، لڑائی اور سالمیت کی نشانی کے طور پر استعمال کرتے۔

یہاں عورتوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ دروازہ بالکل بلاک تھا۔ ہال کے آگے بنے چھوٹے سے برآمدے میں بچوں اور مردوں کا خاص رش تھا۔ وہ عبادہ کا ہاتھ پکڑ کے جمِ غفیر کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے جا رہی تھی۔ سب لوگوں کے لب ہل رہے تھے۔ وہ اس گانے کے ساتھ گا رہے تھے جو ہال میں میت کے سامنے گایا جا رہا تھا۔

وہ ہجوم کے ریلے کے ساتھ بہتے ہوئے ہال کے اندر آنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ ہال کے اندر جا بجا سیاہ ستون لگے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے، جو روشندانوں جیسی تھیں، روشنی عکس کی طرح اندر آ رہی تھی۔ دیواروں پر جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ہال کی چھت میں نصب پنکھے اور سفید لائٹیں آن تھیں۔

ہال کے عین درمیان میت کی چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ میت کو گردن تک رنگ برنگی چادر سے چھپایا ہوا تھا۔ چارپائی پر رنگین بستر بچھا ہوا تھا۔ میت کے سر پہ جڑاؤ اور جواہرات سے سجی پگڑی تھی۔ اس کے گرد کچھ کالاشی لڑکیاں کھڑی تھیں اور کچھ پائنتی کے ساتھ نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ مقامی زبان میں کچھ گا رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے گل؟ میں رو دوں گی۔" وہ برا سا چہرہ بنا کے گل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا تھا۔

"شش....." گل نے تیزی سے ٹوکا۔ "یہاں میت پہ آنسو بہانا منع ہے۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔" گل نے ٹوک کے کہا۔ عبادہ کا دل بھر گیا تھا۔ یہ کیسی سنگدلی تھی؟ کوئی مر چکا ہو اور آپ اس کے لیے ناچ گانے لگائیں۔ ڈیک لگائیں۔ اونچی آواز میں شادی بیاہ کی طرح سیلیبریشن کریں۔ یہ تو مرنے والی کی توہین تھی۔ ان کا کیسا مذہب تھا۔ واللہ!

مرد یک آواز ہو کے اونچی سیٹیاں سی بجاتے، ہاتھوں کے ذریعے لڈی ڈالتے اور ایسا کرتے

ہوئے وہ میت کے اردگرد گھومتے تھے۔

''پتہ ہے یہ کون ہے؟'' گل نے بدقسمت میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔عصر کا سورج سرخ پڑ رہا تھا۔زردی ختم ہوگئی تھی۔لمبے دن کا سورج ڈوب رہا تھا۔گرمی کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ہلکی سی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔

''کون؟''

''ان کے بزرگ۔سو سال جیے ہیں۔''

''کیا؟''

''ہوں۔یہ سب ان کے مذہب میں شامل ہے۔یہ لوگ مرنے والے کا غم نہیں مناتے۔بلکہ ان کو خوشی ہوتی ہے کہ اس کی جان اس دنیا سے چھوٹ گئی اور وہ دوسری دنیا میں ان کے خدا کے پاس چلا گیا ہے۔ان کا خدا اس بندے کا انتظار کر رہا تھا۔خدا کا انتظار ختم ہوا۔یہ دونوں مل گئے۔اب اس میں غم والی کوئی بات نہیں ہے۔یہ خوشی کی بات ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے سے ملنے چلا گیا۔''

''اوہ.....مگر یہ گا کیا رہے ہیں؟'' عبادہ جز بز تھی۔

''یہ جو گا رہے ہیں یہ توصیفی قصیدے ہیں جو اس آدمی کی ذات کے حوالے سے پڑھے جا رہے ہیں۔اس نے یہاں جو نیک کام کیے ہیں۔یہ ان کاموں کا دہرا رہے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ یہی وہ کام ہے جس کے سبب خدا نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا ہے۔'' گل عورتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔آج رسومات کی آخری رات تھی۔کل اس میت کو دفنانا تھا۔جب میت کسی بڑے بندے کی ہو تو کالاش کی تینوں وادیاں بمبور، بریر اور بمبوریت شریک ہوتی ہیں البتہ کسی بچے یا عورت کی ہو تو صرف وہی گاؤں شرکت کرتا ہے۔

عبادہ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیمرہ آن کر لے اور اس تاریخی لمحے کو قید کر لے۔اس کے روئیں روئیں میں کرنٹ سا دوڑ رہا تھا۔مرنے والے کی روح کی تسکین کے لیے لوگ عبادتیں کرتے ہیں۔تسبیح پڑھتے ہیں۔روتے ہیں کہ اب جانے کب ملاقات ہو۔اپنے نقصان پہ بلبلاتے ہیں۔یہاں کے لوگ غم تو دور ایک آنسو تک نہیں گرا رہے تھے۔سب خوش تھے۔خوشی منا رہے تھے۔اس سے بڑھ کے بدقسمتی کیا ہوگی؟

اس نے شکر ادا کیا کہ وہ مسلمان ہے۔کم از کم اس کی موت پہ لوگ اداس ہوں گے۔اس کی روح کے ثواب کے لیے ختم کرائے جائیں گے،موسیقی نہیں بجے گی۔اس کی میت کے چاول بنٹیں گے۔اس کی لاش کے آگے بھنگڑے نہیں ڈالے جائیں گے۔

''چلو۔اتنا کافی ہے۔میرا خیال ہے تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔'' گل فکرمندی سے کہتے ہوئے اسے باہر لے آئی۔وہ گم صم سی باہر آ گئی۔اسے یہ سب بہت برا لگا تھا۔کاش یہاں تبلیغی جماعتیں آ جائیں اور ان کو اس کفر سے نکالیں۔ان کو ان کی اصل کی طرف لوٹا دیں۔

''قبرستان چلتے ہیں۔وہ دیکھ لیں گے پھر شام ہو جائے گی۔غازان کو کال کر کے پوچھ لیں گے کہاں ہے۔وہ آتا ہے تو چلتے ہیں۔'' وہ ہال سے نیچے اترتے ہوئے کہنے لگی۔عبادہ نے سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

گل اسے بمبور کے قبرستان لے آئی۔بمبور کے قبرستان کا داخلی دروازہ ایک ہلکی کریم رنگ کی لکڑی کا تھا جس کے آگے لکڑی کا ہی پل بنا ہوا تھا جو قبرستان کے درمیان سے گزرتا ہوا دوسری سمت ختم ہو رہا تھا۔یہ پل پہلے نہیں تھا۔اسے ابھی ابھی تعمیر کیا گیا تھا جس کا مقصد قبرستان کو توہین سے بچانا تھا۔قبرستان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔سایہ سا ہر طرف گر رہا تھا۔بائیں طرف لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے تابوت نظر آ رہے تھے اور کہیں کہیں قبریں تھیں جن پر چارپائیاں الٹی کر کے پڑی ہوئی

تھیں۔ساری قبریں وقفے وقفے سے بنی تھیں۔روش نرم اور چکنی تھی۔جگہ جگہ لکڑیوں کی خشک شاخیں پڑی تھیں اور سوکھے پتے گرے ہوئے تھے۔

''کافی بھیانک ہے۔ہے ناں؟'' چلتے چلتے گل نے پلٹ کے اسے دیکھا۔وہ سہمتے ہوئے آس پاس دیکھ رہی تھی کیوں کہ یہاں پڑے ٹوٹے پھوٹے تابوت کھلے ہوئے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی انگریزی فلم میں دکھائے جانے والے سیاہ،سنسان قبرستان آگئے ہوں۔ وحشت ہی وحشت تھی۔

''تم ذرا نیچے آؤ۔پل سے اترو۔قریب سے ان تابوتوں اور قبروں کو دیکھو۔ان کی بناوٹ بھی بہت مختلف ہے۔'' گل ریلنگ کود کے دوسرے طرف قبرستان میں اتر گئی۔عبادہ بھی کیمرہ کھولتے ہوئے نیچے آئی۔اب روش کھردری اور ناہموار ہوگئی تھی۔ چلتے وقت لکڑیاں پیروں تلے چرچرا رہی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے گل؟'' اس نے چند تصویریں لینے کے بعد خشک حلق سے پوچھا۔

''کیا؟'' گل نے رک کے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

''یہ قبریں۔یہ کیسی قبریں ہیں؟'' اس نے زندگی میں ایسی قبریں نہیں دیکھی تھیں جن کے اوپر چارپائیاں پڑی ہوں۔

''یہ لوگ جس چارپائی پر میت کو لٹاتے ہیں،اس چارپائی کو میت کو دفنانے کے بعد اس کی قبر کے اوپر رکھ دیتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ لوگ اس چارپائی کو کبھی استعمال نہیں کرتے۔ان کو لگتا ہے کہ وہ اس میت کی تھی۔اس کے آس پاس رہنی چاہیے۔'' گل نے جھک کے ایک سوکھی ٹہنی اٹھائی اور اس کے پتلے پتلے تنکے نوچنے لگی۔

سورج کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ رات آ رہی تھی۔ قبرستان بڑا نہیں تھا البتہ درختوں کی وجہ سے گھنا ضرور تھا۔ روشنی چھن چھن کے درختوں کی ٹہنیوں سے نکل کے نیچے پڑ رہی تھی۔ اس پل کے درمیان بائیں طرف بیٹھنے کے لیے بنچ بنائے گئے تھے۔ وہاں فی الوقت کوئی آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی پشت تھی۔ وہ ہاتھ اٹھائے دعا کر رہا تھا۔

ایک تازہ قبر بھی نظر آ رہی تھی جس کے گڑھے کے پاس تازہ مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ یقیناً وہ مرنے والے کے لیے بنائی گئی تھی۔ کدال، بیلچہ وغیرہ بھی ادھر درخت کی اوٹ کے ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ قبرستان کے عین درمیان آ کے وہ کھڑی ہو گئیں۔ وہاں اس طرف کھلے لکڑی کے تابوت پڑے ہوئے تھے۔

''یہ تابوت کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کالاشی پہلے پہل اپنے مردے دفناتے نہیں تھے۔ انہیں سجا دھجا کے یہاں ان کے تابوت لا کے رکھ دیے جاتے۔ یہ تابوت کھلے ہوتے۔ یہ یہیں پڑے رہتے یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے، بیکٹیریا، فنجائے اور ڈیکمپوزرز ان کا گوشت، ہڈیاں گلا نہ دیتے۔ لیکن اب یہ لوگ دفنانے لگے ہیں۔ اس زمانے میں تو کوئی سیاح اس طرف بھٹکتا بھی نہیں تھا۔ کون بھلا انسانی گوشت کے گلے سڑے چیتھڑے دیکھ سکتا ہے؟ کس کی اتنی ہمت؟ ہوں۔''

''یہ ان کا کلچر ہے؟'' اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔

''بالکل۔ لیکن ان کا قصور نہیں۔ ہر ثقافت مذہب کے احکامات سے بنتی ہے۔ اب ہندوؤں کو لے لو۔ وہ اپنے مردے جلاتے ہیں۔ کون اپنا پیارہ راج دلارا جلا سکتا ہے لیکن یہ ان کی مذہبی احکامات ہیں۔ وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ جیسے ہم کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب اور اپنے عقیدے کی پابندی کرتا ہے۔'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

''کسی نے ان کو اسلام کی طرف نہیں بلایا۔''

'' کیوں نہیں۔کافی تبلیغی جماعتیں یہاں آئی ہیں۔انہوں نے ان کو تبلیغ دی۔ایک دفعہ تو حکومت نے بھی پریشر ڈالا تھا۔لیکن کالاشی کافی فراخ سوچ کے لوگ ہیں۔یہ کسی پابندی کو برا سمجھتے ہیں۔اس لیے جس جس کے پلے تعلیمات پڑیں۔وہ مسلمان ہو گئے اور جس کے پلے نہیں پڑیں وہ آج بھی مُردوں کے آگے بین بجاتے ہیں۔خیر۔جانے دو۔یہ لمبی بحث ہے۔''

گل نے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی ایک طرف اچھال دی۔

''مجھے جان کر حیرت کم،افسوس زیادہ ہو رہا ہے۔''

''ضرورت نہیں ہے۔سب کی اپنی قبر ہو گی عبادہ۔ہم دوسروں کو نصیحت کر سکتے ہیں۔ان کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔یہاں آنے والا ہر شخص یہ سب دیکھ کے بوکھلا سا جاتا ہے۔ظاہر ہے سب ہی غیر فطری عوامل ہیں لیکن پھر یہ سوچ کے جانے دیتا ہے کہ اللہ جسے چاہے توفیق دے اور جسے چاہے نہ دے۔یہ تو اللہ کی تقسیم ہے۔ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' وہ شانے اچکا کے مسکرائی۔

''یہاں بہت گھٹن ہے گل۔میں لاہور میں قبرستان جاتی ہوں۔وہاں دادا دادی دفن ہیں لیکن مجھے وہاں کبھی ایسی وحشت یا گھٹن کا سامنا نہیں ہوا،یہاں بہت عجیب سی حبس ہے۔'' وہ گردن کا سامنے والا حصہ پکڑ کے سہلانے لگی۔

''ہوں۔چلو چلتے ہیں۔یہ لوگ کچھ بھی کریں ہمیں کیا۔ہمیں صرف ثقافت سے کام ہے۔ان کی ثقافت منفرد اور مختلف ہے۔اس لیے لوگ یہاں آتے ہیں۔تم دل پہ مت لو۔انسان سب کچھ نہیں بدل سکتا۔وہ سامنے والا راستہ سڑک کی طرف جاتا ہے۔اس سے نکل جاتے ہیں۔''

وہ جس راستے قبرستان آئی تھیں،قبرستان کو درمیان سے چھوڑ کے دوسری طرف والے راستے کی طرف بڑھنے لگیں۔قبرستان ختم ہو گیا تھا۔گل آگے تھی اور عبادہ پیچھے۔کچھ قدم چلنے کے بعد عبادہ

کو کچھ غیر مرئی سا احساس ہو۔

وہ ٹھہر گئی اور پلٹ کے دیکھنے لگی۔ قبرستان میں ہلکا ہلکا اندھیرا ہو رہا تھا۔ کوئی بھی ذی النفس نہیں تھا۔ سوائے اس آدمی کے جو ہنوز دعا مانگ رہا تھا۔ دور دور تک ساری ویرانی تھی۔ اس نے قدم تیز کر دیے یہاں تک کہ وہ گل سے دو قدم دوری پر چلنے لگی۔

''میرے خیال سے غاذان کو فون کر دیتے ہیں۔ وہ آ جائے۔ حویلی چلتے ہیں۔ تھکن ہو رہی ہے۔ تم فون کرو ذرا اسے۔ پوچھو کہاں ہے۔ ہمیں لے جانے کا ارادہ بھی ہے یا نہیں۔'' اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

''ہوں۔'' عبادہ نے سر ہلایا۔ اس نے چلتے چلتے بیگ کی زپ کھولی اور موبائل ٹٹولنے لگی۔ اسی لمحے اس کے بائیں پیر کے نیچے کچھ آیا۔ کچھ عجیب سا۔ وہ رک گئی، پیر ہٹایا۔ ایک دل خراش چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

''کیا ہوا؟'' گل تیزی سے اس کے پاس آئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چیز کو دیکھ رہی تھی جس کو اس کے پیروں نے روندا تھا۔ وہ چھوٹی سی ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ شاید کسی بچے کی تھی۔

''ریلیکس۔ ریلیکس۔'' گل نے اس کی پشت سہلائی۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''یہ تابوت کھلے چھوڑتے ہیں۔ کتنے بلیاں آ جاتی ہیں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ یہ تو بس ایسے ہی۔'' گل نے نادانستہ ہی تسلی دینی چاہی۔ عبادہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

''میں تمہیں غلط وقت پہ یہاں لے آئی۔ ہمیں کسی اور وقت آنا چاہیے تھا۔'' گل پشیمانی سے بولی۔ ''میں بھی ناں۔ چلو آؤ۔ ڈرو نہیں۔ یہ تو ہوگا ہی۔ آخر انسان کو یہ دفناتے تھوڑی ہی ہیں۔'' وہ

نخوت سے کہتی اسے قبرستان سے باہر نکل آئی۔ وہاں دور دور تک چھوٹے چھوٹے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ آنکھ کے اوجھل ہونے پر گھر نظر آرہے تھے۔

''لاؤ مجھے پرس دو..... میں غاذان کو فون کرتی ہوں۔'' اس نے عبادہ کے پرس کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ عبادہ نے گردن سے پرس کی اسٹریپ نکال کے پرس اسے پکڑایا۔ زپ کھلی ہوئی تھی، گل نے ہاتھ اندر ڈالا اور فون نکالنے لگی۔

عبادہ نے آنکھیں بند کر کے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ وہی ابا والا عمل جو وہ ہر گھبراہٹ کے بعد کرتی تھی۔ چند گہری سانسیں، تھوڑا سا مراقبہ اور یہ سوچنا کہ سب ٹھیک ہے۔ دماغ کی نسوں میں ذرا تحمل سے خون پہنچاتا ہے اور آپ کے ردعمل میں آئے ہوئے تمام سسٹم پرسکون ہو جاتے ہیں۔

اس نے خود کو بند آنکھوں سے پرسکون کیا پھر دھیرے سے آنکھیں کھولیں لیکن جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ زنجیر ہو گئی۔ گل کے پیچھے..... عین پیچھے..... کوئی کھڑا تھا۔ وہی شخص جو کچھ دیر پہلے اندر تھا۔ چہرہ ڈھکا ہوا تھا لیکن آنکھیں نظر آرہی تھیں اور یہ وہ آنکھیں تھیں جسے وہ دیکھ چکی تھی۔ یہ حلیہ وہی تھا۔ گل فون میں سے نمبر نکال رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اسکرین کی روشنی پڑ رہی تھی۔

''یہاں تو سگنلز ہی نہیں آرہے۔ ہمیں ٹیلے کے اوپر جانا ہوگا۔'' گل بے دھیانی میں کہہ رہی تھی۔ عبادہ کا سانس رک چکا تھا۔

''گل.....'' اس نے کپکپاتے لبوں سے اس کا نام لیا۔

''ہوں۔'' گل نے فون بند کر کے اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟'' اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ عبادہ کی آنکھیں پیچھے کھڑے بندے پر فکس تھیں۔ گل نے اس کی آنکھوں کے تعاقب میں پلٹ کے جیسے دیکھنا چاہا۔ اسی لمحے ہیولہ آگے بڑھا اور گل کے ہاتھ میں موجود پرس پہ جھپٹ پڑا۔

''گل.....'' عبادہ نے جیسے خبردار کیا اور جست لگا کے پرس کی اسٹریپ کو لڑکے کے پکڑنے سے پہلے ہی تھام لیا۔اب پرس عبادہ کے پاس آچکا تھا۔

''اے لڑکی! یہ ہم کو دو.....'' لڑکے نے قمیص کی جیب سے چاقو نکالا اور قدم بھر اس کی بڑھتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولا۔

''کون ہو تم؟'' گل تلملا کے آگے آئی۔لڑکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چاقو کو لہرا کے گل کے بائیں کندھے سے گزرا۔گل نے فوراً ہاتھ کندھے پر رکھا۔ایک سسکی اس کے منہ سے نکلی۔چند سرخ بوندیں اس کے شانے پہ بہہ گئیں۔لڑکے نے اس کا کندھا سامنے سے چیر دیا تھا۔ساتھ ہی وہ عبادہ پہ جھپٹا اور پرس کھینچا۔

''گل.....'' عبادہ نے اذیت سے پکارا۔

پرس کی اسٹریپ ایک طرف سے اس کے ہاتھ میں تھی اور دوسری طرف سے لڑکے کے ہاتھ میں۔

''دو ہم کو۔'' وہ چیخ پڑا۔

عبادہ نے بادلِ نخواستہ پرس چھوڑ دیا اور زمین پہ گرتی پڑتی گل کو تھامنے کے لیے آگے بڑھی۔گل نیچے بیٹھ کے سسک رہی تھی۔لڑکے نے پرس اٹھایا اور مسکراتا ہوا پیچھے ہٹا پھر گنگناتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔

''گل ریلکس .....میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے گل کا ہاتھ نرمی سے کندھے سے ہٹایا لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ایک نمی سی تھی جو گل کے کندھے سے بھل بھل کے نکل رہی تھی۔گل نے ہاتھ میں پکڑا فون اسے پکڑایا کہ ٹارچ آن کر سکے۔عبادہ نے فون لیا، فلیش آن کی اور روشنی اس کے کندھے پہ پھینکی۔لڑکے نے گردن سے تھوڑا نیچے، بیوٹی بان سے دو سینٹی میٹر

اوپر کندھے کو ایک لکیر کی صورت میں چیرا تھا۔ جلد کی تہہ سی کٹ گئی تھی۔ گہری، عمیق۔

''بہت گہرا کٹ ہے گل۔ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔'' وہ تشویش سے کہتی کھڑی ہوگئی۔

'' یہاں کونسا ڈاکٹر ہے عبادہ؟'' وہ مردہ سی آواز میں بولی۔ عبادہ نے رک کے اسے دیکھا۔ واقعی اس وادی میں کونسی ڈسپنسری تھی؟ کونسا ہسپتال تھا؟ یہ تو چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لاہور تھوڑے ہی؟ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں کچھ کرتی ہوں۔'' اس نے اپنی گردن سے سکارف ہٹایا اور گل کے کندھے پر رکھا۔ اس کے کندھے سے خون بھل بھل کے قمیص کے دامن میں جذب ہو رہا تھا۔

''اسے پکڑو تاکہ باقی خون زیادہ نہ بہے..... میں غاذان کو کال کرتی ہوں۔'' اس نے فون کی اسکرین آن کی، سگنل بند تھے، وہ گل کو وہیں چھوڑ کر ٹیلے کی طرف بھاگی، وہاں دو سگنل آ گئے، اس نے جلدی جلدی اس کا نمبر ملایا لیکن بے چینی سے پیچھے دیکھا، گھٹنوں پہ بیٹھی گل گہرے سانس لے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ کچھ دیر پہلے ان تک پہنچا تھا۔ یہاں سے دونوں کو لے کے بریر کے ایک شفاخانہ لایا تھا جو دراصل ایک پنسارن کی دکان تھی۔ وہ گل کے زخم کے لیے جڑی بوٹیاں ہاون دستے میں کوٹ رہی تھی۔ گل روئی کا گول سا ٹکڑا جسے ہلدی اور سرسوں کے تیل میں بھگویا گیا تھا کندھے پر رکھے ہوئے تھی۔ اس کی سفید قمیص خون سے بھر چکی تھی۔ وہ دونوں باہر تھے۔ باہر چھوٹا سا لکڑی کی چھت والا برآمدہ تھا جہاں زرد رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ بلب کے کنارے پتنگے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور پہاڑیوں کے بیچ کہیں کہیں گھروں میں روشن لائٹیں نظر آ رہی تھیں۔

''پھر اس نے گل پر حملہ کر دیا اور ہم چونکہ اس حملہ کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے بری طرح ڈر گئے۔'' وہ اپنے آنسو روک کے بتا رہی تھی۔ غاذان نے سارا قصہ تحمل سے سنا۔

''وہ دوپہر سے تم لوگوں کا پیچھا کر رہا تھا اور جیسے ہی تم لوگوں کو اکیلا پایا۔ اس نے پرس چھیننے کی کوشش کی۔''

''دوپہر میں وہ صرف گھور رہا تھا۔ مجھے لگا شاید وہ ایسے ہی گھور رہا تھا۔ یونو۔ میں سیاح ہوں۔ دوسرے علاقے سے آئی ہوں۔ میرے کپڑے اور میرا ڈیل ڈول الگ ہے۔ شاید اس لیے وہ مجھے دیکھے جا رہا ہے مگر اس کی نظر میرے پرس پہ ہوگی، مجھے اس کا قطعی اندازہ نہیں تھا۔'' وہ نم سانس کھینچ کے بولی۔

''ہوں۔'' غاذان ساری صورتحال سمجھ گیا۔ ''یہاں چور اچکے نہیں ہوتے۔ یہ جو بھی تھا، کوئی نشئی یا پوڈری تھا جسے اپنے نشے کے لیے پیسے چاہیے تھا۔ اس نے تم لوگوں کو مرد کے بغیر دیکھا تو حملہ کر دیا۔ خیر۔ آپ فکر مت کریں۔ میں نے پولیس اور یہاں کے سردار کو آگاہ کر دیا ہے۔ وہ جیسے ہی پکڑا جائے گا۔ ہم اسے کڑی سے کڑی سزا دیں گے۔''

''ہوں۔'' اس نے تسلی سے سر ہلا دیا۔

باہر سردی بڑھ رہی تھی۔ ہوا تیز تھی۔ اس کے بال شانوں پہ اڑ رہے تھے۔ غاذان اندر چلا گیا۔ وہ برآمدے کی ریلنگ کے پاس آئی۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھے اور آگے دیکھنے لگی۔ آسمان صاف تھا۔ تارے چمک رہے تھے۔ یہ گھر اونچائی پہ بنا تھا۔ نیچے پتھریلی روش پہ ان کی گاڑی پارک تھی۔

پنسارن نے دوا بنالی تھی۔ وہ گل کے کندھے پر لیپ لگا رہی تھی۔ غاذان دوزانو بیٹھا تھا۔

''یہ گولی لے لو۔ درد کے لیے۔'' پنسارن نے پینا ڈول اس کی ہتھیلی پر رکھی اور جام میں مٹکے سے پانی نکال کے دیا۔ گل نے گولی زبان پہ رکھی اور پانی پیا۔

''یہ باقی لیپ میں باندھ کے دے رہی ہوں، اس کو تم نے دن میں ایک بار لگانا ہے۔ خدا نے چاہا تو زخم کا نشان بھی نہیں رہے گا۔'' پنسارن نے جام واپس تھامتے ہوئے نرمی سے کہا۔ اس کے بعد اس نے خاکستری لفافے میں لیپ پیک کر کے دی۔ ایک آدھ پٹی بھی ساتھ ڈال دی۔

''یہ لے لو۔'' اس نے چھوٹا سا پیک غاذان کو پکڑا دیا۔

''درد تو نہیں ہو رہا؟'' غاذان نے فکرمندی سے پوچھا۔

''اوں ہوں۔'' گل نے آہستہ سے سر نفی میں ہلایا۔ غاذان نے پنسارن کو پیسے دیے اور گل کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لایا۔ عبادہ بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ ہنوز آسمان کو دیکھتے ہوئے جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

''چلیں۔'' غاذان کی آواز پہ وہ چونک کے مڑی اور جب ہی نظر اس ہاتھ پہ گئی، جس نے گل کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ اس کے دل پہ منوں بوجھ آ گرا۔ اپنے تاثرات کو بمشکل چھپاتی وہ سر جھکاتے ہوئے چل پڑی۔ رات کوکالاش سے ایون کے لیے نکلنا جان کا خطرہ لینے کے مترادف تھا لیکن وہ مزید وہاں نہیں رک سکتے تھے۔ گل کو آرام کی ضرورت تھی۔ راستہ تاریک تھا۔ گاڑی کی فرنٹ لائٹوں کی روشنی ہی جل رہی تھی۔ دوپہر کو نظر آنے والے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں اس وقت کسی بھیانک اور سنسان گھاٹی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

شاہ سردار گھر کے صحن میں لب بھینچ کے کھڑا تھا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گردن تنی تھی، آنکھوں کی پتلیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا کبیر ان کو گل پہ ہوئے حملے کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔

''غاذان خان کے جملوں سے لگ رہا تھا کہ وہ حملہ آور کو زندہ کھا جائے گا بابا.....'' کبیر نے

مارے دہشت کے بتایا۔

''کلیم کی بیٹی پہ کالاش میں حملہ ہوا ہے۔'' وہ بے یقینی سے کہتے صحن میں موجود موڑھے پر بیٹھ گئے اور سر پکڑ لیا۔ وہ کلیم اللہ خان کے دوست تھے۔ ان کی بیٹی، ان کی بیٹی جیسی تھی۔ بھلا اس پہ حملہ کیسے ہو گیا؟ وہ بھی ان کی سرزمین پہ؟

''وہ ٹھیک ہے بابا۔ کمیلا ماسی نے علاج کیا ہے۔ کٹ لمبا لگا ہے لیکن گہرا نہیں ہے۔ اندر سے کوئی نس نہیں کٹی۔ ماسی کہہ رہی تھی کہ ایک، دو ہفتے میں زخم بھر جائے گا۔''

''زخم کے بھرنے کی پرواہ کسے ہے کبیر؟ غم تو یہ ہے کہ زخم لگا ہی کیوں؟ ہم اتنے غافل کیسے ہو سکتے ہیں؟'' وہ خود پہ ماتم کناں تھے۔ صحن میں موجود ان کے بیوی اور بہو افسردہ سی کھڑی ان کو دیکھ رہی تھیں۔

''بابا خان نے تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ اس نے بتایا کہ گل کے ساتھ جو ٹورسٹ تھی، اس حملہ آور نے اس کا بیگ چھینا ہے۔ نیز اس نے بتایا کہ آزاد باغ کے حسین مگسی کے چھوٹے لڑکے نے گل لالہ سے بدتمیزی بھی کی تھی اور اسے برا بھلا کہا تھا۔ ان کو شک ہے کہ کہیں اس ہی نے.....'' کبیر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاہ سردار نے تیزی سے سر اٹھایا۔

''بدتمیزی؟''

''جی۔ وہ تو کافی مشتعل ہو گیا تھا۔ وہ آزاد باغ کے انگور خریدنے آئی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں آزاد باغ کلیم خان جی کا پسندیدہ باغ تھا۔''

شاہ سردار کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑ پھڑائیں، وہ پورے قد سے کھڑے ہوئے۔

''کبیر.....'' انہوں نے حکمیہ آواز لگائی۔

''جی بابا.....'' وہ پھرتی سے آگے آیا۔

''حسین مگسی کو پیش کرو۔فوراً.....!''

بیوی اور بہو نے ایک دوسرے کو دیکھا۔شاہ سردار کیا کرنے والا تھا؟

''جی بابا.....'' کبیر نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہا ہے مور جان۔شاہ سردار بابا کو ایسے بھی تو بلا سکتا ہے۔'' خلیل جو چارپائی پہ بیٹھ کے رات کا کھانا کھا رہا تھا،اپنی ماں کو صحن میں بے چینی سے ٹہلتا دیکھ کے گویا ہوا۔اس کی ماں دوپہر گل لالہ کے ساتھ کیے سلوک پر نادم تھی اور پھر جب اس پر حملے کی بات سنی تو یہ ندامت خلش اور پچھتاوے میں بدل گئی۔اس وقت وہ ہراساں لگ رہی تھی کیوں کہ کبیر نے ان کے شوہر حسین مگسی کو بلایا تھا۔

''شاہ سردار بلاوجہ کسی کو نہیں بلاتا خلیل۔شاہ سردار کو ہم پہ شک ہوگا۔'' وہ دانتوں میں انگلیاں دے کر سراسیمگی سے بول رہی تھیں۔خلیل کے لقمہ بناتے ہاتھ تھم گئے۔اس نے استعجاب سے ابرو اٹھائی۔

''کیسا شک؟''

''وہی حملے کے بارے میں۔ان کو ہم پہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یا مارا جا شاید ہم اس کے پیچھے ہیں۔''

''ہم یعنی کہ.....میں؟'' وہ چونک گیا۔ماں نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' پھر انہوں نے کمزور سے سر ہلایا۔

''میں حملہ کیوں کروں گا مور جان؟ مجھ پہ سردار شک کیسے کر سکتا ہے۔'' وہ بھنا گیا۔روٹی کی چنگیر اس نے ایک طرف دھکیلی اور کھڑا ہو گیا۔''میں خود بات کرتا ہوں سردار سے۔مجھ پہ بے بنیاد الزامات نہ لگائیں۔''

''خلیل.....'' ماں نے تیزی سے ٹوکا۔ ''تمہارا باپ آنے والا ہے۔ وہ جا کے بات کر لے گا۔''

''بابا نے سردار کی بات مان جانی ہے مور جان۔ بابا سردار سے ڈرتا ہے۔'' وہ صحن کی دیوار کی کھونٹی سے لٹکی اپنی ٹوپی کو اٹھاتے ہوئے تلخی سے بولا۔

''تم اکیلا مت جاؤ خلیل۔ تمہارا باپ ہے ناں۔ وہ ساتھ جائے گا۔'' ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ میں اپنے مسئلے خود حل کروں گا۔'' وہ جذباتی انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا لیکن ابھی چند قدم ہی لیے تھے جب سامنے سے حسین مگسی آتا ہوا دکھائی دیا۔ حسین مگسی کے چہرے پر دبا دبا سے اشتعال تھا۔ باپ کو دیکھ کے اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔

''تم شام کہاں تھے؟'' انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر ایک دکھتی رگ پکڑی۔

''شاہ سردار کے پوتے کے ساتھ گھڑ سواری کر رہا تھا۔''

''کب تک؟''

''ابھی ابھی آیا ہوں۔''

''یہاں سے کتنے بجے گئے تھے؟''

''پانچ بجے۔''

''کیا یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' انہوں نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

''تو اور کیا جھوٹ بول رہا ہے؟'' ماں بگڑ کے بولیں۔ خلیل نے استہزائیہ لب بھینچ لیے کہ دیکھا، ہمیشہ مجھ پہ شک کرتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں ان سے۔''

''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔'' وہ فوراً سے بیشتر بولا۔

''نہیں۔تم نہیں جاؤ گے۔یہ بڑوں کے مسئلے ہیں۔انہی کو حل کرنے دو۔تم جذبات میں بہت کچھ بکواس کرو گے اور پھر میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔'' وہ اس پہ حملہ کرتے کرتے رک گئے۔ماں نے خلیل کو دھکا دے کے اپنے پیچھے کر دیا۔

''کیا کر رہے ہیں جوان بیٹے پہ ہاتھ اٹھائیں گے؟''

''میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا اگر اس نے پھر ایسی بکواس کی جو دوپہر میں کی ہے۔کیا یہ اس لڑکی کے باپ کی کرامات بھول گیا ہے۔اس نے کیا کیا نہیں کیا تھا ہمارے لیے؟ شام کو تو میں نے اسے کچھ نہیں کہا لیکن ہمیشہ کچھ نہیں کہوں گا۔اس غلط فہمی میں مت رہنا۔'' وہ انگشت اٹھا کے وارن کرتے ہوئے بولے۔

''میرے بیٹے سے دور رہیں حسین صاحب۔اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔خلیل،تم جاؤ اندر۔میں کھانا لے کے آتی ہوں۔'' وہ بیٹے کی پشت پناہی کرتے ہوئے اسے اندر لے گئیں۔حسین مگسی نے لب بھینچ لیے۔اس کی بیوی اس کے بیٹے کو خراب کر رہی تھی۔یہ لاڈ،یہ پیار اور اس طرح کی حوصلہ افزائی قطعی اچھی بات نہیں تھی آخری اولاد ہونے کا یہ مطلب تھوڑے ہی تھا کہ خلیل کو بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگنے دیا جائے؟ پچھی مخصوص عمر میں قید ہوں تو برے نہیں لگتے۔دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

شاہ سردار اپنے لان میں پلاسٹک کی کرسی سے ٹیک لگائے،ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے براجمان تھے۔کریم رنگ کی چادر شانوں پہ لپیٹی ہوئی تھی۔سر پہ پٹھانوں کی اونی ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔یہ وہی لان تھا جہاں وہ صبح اپنے گھوڑوں کو نہلا رہے تھے۔

ان کے سامنے حسین مگسی کرسی سے آگے کو ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔اس کی نظریں اپنے جوتوں پر

تھیں۔کبیر شاہ اپنے چار سالہ بیٹے کو گود میں اٹھائے، اسے سے توتلی زبان میں بات کر رہا تھا۔ان دونوں کے درمیان کافی دیر سے تناؤ چل رہا تھا۔شاہ سردار لب بھینچ کے اسے دیکھ رہے تھے۔

''شاہ سردار! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔میرا بیٹے نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''کیسی غلط فہمی؟''

''خلیل شام آپ کے پوتے کے پاس تھا۔وہ دونوں گھڑ سواری کر رہے تھے۔ابھی لوٹے ہیں۔وہ بمبور گئے ہی نہیں۔وہ تو بمبوریت میں تھے۔یہاں آپ کے قطعوں میں۔''

''کیا کہا؟'' وہ چونک کے آگے ہوئے۔

''خلیل اور ولید ساتھ ساتھ تھے۔وہ ابھی لوٹے ہیں قطعوں سے.....''

اس بات پہ شاہ سردار نے بیٹے کو دیکھا، کبیر باپ کی نظر کا اشارہ سمجھ گیا۔اس نے بیٹے کو نیچے بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ سردار کا پوتا بھی تھا۔

''ولید.....شام خلیل تمہارے ساتھ تھا؟'' انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''جی داجی۔ہم گھڑ سواری کر رہے تھے۔ابھی ابھی آئے ہیں۔'' ولید نے بتایا۔کچھ لمحے شاہ سردار کچھ کہہ نہیں پایا پھر اس نے ہاتھ سے ''تخلیہ'' کا اشارہ کیا۔اس کا پوتا، وہاں سے چلا گیا۔اس کے جاتے ہی شاہ سردار کرسی سے ذرا آگے ہوا۔

''اگر یہ تمہارا بیٹا نہیں تھا تو کون تھا؟ کون تھا جس نے کالاش کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے؟''

''جس نے حملہ کیا، اس کی عمر پچیس چھبیس سال بتائی گئی ہے اور آنکھیں نیلی تھیں۔وہ ٹورسٹ لڑکی جو گل لالہ کے ساتھ اس نے حلیہ بتایا ہے بابا۔خلیل کی آنکھیں سیاہ ہیں اور وہ صرف پندرہ سال کا ہے۔'' کبیر نے سمجھداری سے کہا۔

''وہی تو۔شاہ سردار میرا بیٹا جذباتی ضرور ہے لیکن اتنا بہادر نہیں ہے کہ محض تلخ کلامی پر کسی کو

چاقو سے کاٹ دے۔ میں اس کا باپ ہوں میں جانتا ہوں۔"

"کون ہے پھر جس نے یہ جرأت کی؟" شاہ سردار سوچ میں پڑ گئے۔ پیشانی پر تشویش بھری لکیریں ابھریں۔

"میں پتہ کراتا ہوں بابا۔ کسی نہ کسی نے تو اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ آخر بمبور کتنا بڑا گاؤں ہے؟ محض چند گھر ہی تو ہیں۔ کدھر جا سکتا ہے۔ ادھر ہی کہیں چھپا ہوگا مردود۔" وہ تلخی سے بولا۔

شاہ سردار نے گہری سانس لی۔

"کلیم اللہ خان کا لاش کے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں۔ اس نے ہماری بہتری اور ہماری بھلائی کے لیے عدالتوں کے مقدمے جیتے، ہمیں حقوق دلانے کے لیے اس نے اپنے قبیلے کی مخالفت کی، اپنے خاندان سے ناتا توڑا، اپنی قوم، مذہب اور فرقوں سے لڑا صرف اس لیے کہ کالاشی پاکستان میں فخر سے جی سکیں۔ میں بھی اس کے کرامات نہیں بھول سکتا پھر تم حسین....." انہوں نے افسوس سے اسے دیکھا جس کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ "تم تو اس کے چہیتے دوست تھے۔ تمہارا آزاد باغ تو اس کا لگایا ہوا ہے۔ تمہیں تو اس کی بیٹی کو پلکوں پر بٹھانا چاہیے۔ ہاتھ تھام کر، عزت سے، محبت سے گھر لانا چاہیے تھا۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں سردار۔ جب وہ آزاد باغ آئی میں اس وقت گھر نہیں تھا۔ اگر میں گھر ہوتا تو میں اس کو ہرگز اپنی دہلیز سے یوں نہ لوٹاتا۔" اس سرمئی داڑھی اور سبز آنکھوں والے آدمی کے لفظوں میں ملامت تھی۔

شاہ سردار نے سر کی پشت کرسی سے لگائی۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ چاند چمک رہا تھا۔ رات اندھیری نہیں تھی، روشن تھی۔ سرمئی سی۔

☆.....☆.....☆

گل کمرے میں پائنتی پر بیٹھی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی قمیص شلوار پہنے، ہاتھوں میں ایک لمبی پولوسٹک پکڑے، تپائی پر پڑی کلیم اللہ خان کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ کلیم اللہ خان کی یہ تصویر سیاہ کوٹ اور سفید شرٹ میں تھی۔ انہوں نے چھوٹا سا بریف کیس تھاما ہوا تھا۔ یہ پشاور ہائی کورٹ کے باہر لی گئی تصویر تھی۔

کس نے سوچا تھا کہ اچانک وہ کسی کے عتاب کے شکار ہو جائیں گے؟ زندگی کی روشنی لحظے میں چھین لی جائے گی؟ باپ جو بیٹیوں کا ہیرو ہوتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پوچھتا ہی کون ہے کسی کو؟ باپ تو لاڈ اٹھانے والی وہ مشین ہوتی ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتی۔ جو کچھ بھی خواہش پوری کرنے سے پہلے وجہ نہیں معلوم کرتے۔ جو ہر بات پہ ''اوکے'' کہہ کر ایسے نوٹ کرتے ہیں جیسے کوئی روبوٹ ہوں اور جب یہ روبوٹ چلے جائیں تو زندگی دربدر ہو جاتی ہے۔ ماں لاڈ نہیں اٹھاتی، پیار کرتی ہے۔ نخرے نہیں سہتی، تڑپتی ہے۔ باپ ہر تکلیف میں ساتھی ہوتا ہے۔

اس نے قمیص کے اوپر زخم کو ہلکا سا چھولیا۔

''زخم کیوں لگتے ہیں بابا؟'' یہ سوال اس نے تب کیا تھا جب کلیم اللہ خان اسے کالاش لے کے گیا تھا۔ جس باغ کے باسیوں نے اسے دھتکارا تھا، اس وقت انہی لوگوں نے انہیں انگور توڑنے کا کہا تھا۔ انگور کے خوشوں کو توڑتے ہوئے ان کی انگلی پہ زخم آیا تھا۔ جب نیچے گھاس کے ساتھ وہ انگلی رگڑ رہے تھے گل نے پوچھا۔

''زخم ہماری غلطیوں کی وجہ سے آتے ہیں گل۔ ہماری کم عقلی، ہماری جلد بازی، ہماری لاشعوری کی وجہ سے۔'' انہوں نے گھاس سے انگلی کو رگڑنے کے بعد رومال سے باندھتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہو جائے گا؟''

''ہر زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ٹھیک نہیں ہوتا تو وہ چھاپ ہوتی ہے جو دماغ میں کہیں رہ جاتی

ہے۔'' وہ نادانستہ طور پر کہہ رہے تھے۔ یہ ان کی وفات سے ایک ماہ پہلے کا قصہ تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کالاش کبھی نہیں آسکیں گے؟

''بابا! آپ اس بیل کو کاٹ دیں۔ یہ کسی اور کو بھی زخمی کر دے گی۔'' اس نے سر اٹھا کے لٹکتی انگور کی بیل کو دیکھتے ہوئے تنفر سے کہا تھا۔

''زخم دینے والے کو کاٹنا اس کا علاج نہیں ہے گل۔ اسے جانے دینا علاج ہے۔''

''اگر اس نے کسی اور کو زخمی کر دیا تو؟''

''تو ہر کوئی اسے معاف نہیں کرے گا۔ کوئی ایسا ضرور آئے گا جو اسے کاٹ ڈالے گا۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''آہ۔'' ایک دل خراش سی سسکی پر وہ باپ بیٹی چونک کے پلٹے تھے۔ باغ کے باسیوں کا ایک لڑکا، اسی بیل سے زخمی ہوا تھا۔ لڑکے کا عتاب عمیق نکلا۔ اس نے بیل کو پکڑا اور اپنے آہنی بازوؤں سے اسے کھاڑ کے پھینک دیا۔ گل نے گردن گھما کے بابا کو دیکھا۔ بابا نے مسکرا کے ابرو چکا دی۔

وہ پولوسٹک کو دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرانے لگی۔ اس کے بابا کم ہی کسی کو تکلیف دیتے تھے۔ وہ خاموشی سے سہہ جانے والوں میں سے تھے۔ اپنی تکلیف کا بدلہ وقت پہ چھوڑ دیتے تھے۔ ان کو لگتا تھا کہ آج مجھے کھروچ دینے والے کو کل خود کھروچ آئے گی، اسی سوچ کے پیش نظر تو انہوں نے کبھی بدلہ نہیں لیا اور پھر ایک دن اپنی زندگی ہار گئے۔

کیا اچھا ہوتا بابا کہ آپ اس دن کالاش نہ جاتے؟ کیا ہو جاتا اگر وہ گھر میں ہی رہتے؟ س نے دکھ سے سوچا۔ اسی لمحے عبادہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے، ہاتھ میں کتاب پکڑے اندر آئی، اسے گومگو دیکھ کے وہ ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا؟ کہیں جا رہی ہو؟'' وہ اس کی تیاری دیکھ کے پوچھنے لگی۔

''ہاں۔اصطبل۔'' اس نے گہری سانس لی اور تصویر سے نظریں ہٹائیں۔

''کس لیے؟''

''مہابت خان کاکا نے کہا آج اصطبل میں کوئی نہیں۔سب جلندھر کی زمین پر تیراکی کا مقابلہ دیکھنے گئے ہیں۔میں نے سوچا آج جا کے پولو کھیل لیتی ہوں۔کمیٹی کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔اگر اچانک آ گیا اور میری پریکٹس نہ ہوئی تو؟''

''ہاں۔اللہ کرے کمیٹی کا جواب مثبت آئے۔''

''آمین۔چلو۔پھر میں چلتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔اس کا جمناسٹک بیگ (Gymenastic Bag) بیڈ پہ پڑا ہوا تھا۔یہ لمبا اور گول سا بیگ تھا جو عموماً کھلاڑیوں کے پاس ہوتا ہے۔

''گل! مہابت کاکا کی طبیعت اور گھوڑوں کی حالت پوچھ کے آنا۔'' اس نے جاتے جاتے گزارش کی۔

''تم بھی چلو۔اصطبل خالی ہے۔'' گل نے بیگ کو کندھے پر لادا۔

''میں؟'' وہ چونکی۔''نہیں۔نہیں۔مجھے منع کیا گیا ہے گھوڑوں کے قریب جانے سے۔''

''بیمار گھوڑوں کے قریب جانے سے منع کیا ہے۔مجھے پولو کھیلتے ہوئے دیکھنے سے نہیں۔''

''اگر انہوں نے برا مان لیا تو؟'' وہ گھبرا گئی۔

''کیوں مانیں گے؟ بیمار گھوڑے اصطبل کی دوسری سمت ہیں۔ہم سے کئی فٹ دور۔ہم وہاں تھوڑے ہی جائیں گے۔ہم تو پولو گراؤنڈ جائیں گے۔''

عبادہ سوچ میں پڑ گئی۔ابتہاج اور یوسف خان نے بے شک منع کیا تھا گھوڑوں کا علاج کرنے سے لیکن اصطبل جانے سے تو نہیں روکا تھا اور پھر وہ تو گل کے ساتھ اس کا کھیل دیکھنے جا رہی

تھی۔اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔میں جوتے پہن لوں۔'' وہ میز پر کپ رکھتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر میں وہ دونوں نیچے آ گئیں۔غاذان نے گاڑی بھیج دی تھی۔عالیہ بیگم اور بی جان صحن میں تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔بی جان نے گاؤ تکیے پر ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ان کے ہاتھ میں حقے کی نال تھی جس سے وہ ہلکا ہلکا کش لگا رہی تھیں۔عالیہ بیگم پیر نیچے لٹکائے،بلتی لباس میں ملبوس،شانوں پہ چادر ڈالے قدرے گردن اکڑا کے بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ بیگ کندھے سے لٹکائے،ہاتھ میں پولو اسٹک پکڑے صحن کی راہداری میں آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک سے بریخنہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے کچن سے باہر نکلیں۔ٹرے میں چائے کے کپ اور کچھ لوازمات رکھے ہوئے تھے۔وہ گل کو بیگ کے ساتھ دیکھ کے ٹھٹک گئیں۔

(اب سو سوال پوچھیں گی.....اف)

''بیگ لے کے کہاں جا رہی ہو گل؟'' بریخنہ الجھن سے قریب آئی۔

گل کی بھنویں تن گئیں۔''کیا میں آپ کو جوابدہ ہوں؟''

''اصطبل جا رہی ہو؟'' انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔ان کے دل میں ہوک اٹھی،انہوں نے گل کو التجائیہ نظروں سے دیکھا۔''مت جاؤ گل۔''

''آپ مجھے روکیں گی؟'' اس نے للکارا۔

''میں درخواست کر رہی ہوں گل.....'' (اس کے پچھلے دنوں کا رویہ دیکھ کے بریخنہ مزید محتاط ہو گئی تھی اوپر سے مجاہد خان نے بھی تنبیہہ کی تھی۔وہ کسی بھی طرح گل سے سخت بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔)

''چچی.....جانے دیں.....میں ساتھ ہوں اس کے.....'' عبادہ تیزی سے حمایت میں آگے

آئی مبادا ماں بیٹی کے درمیان پھر سے تلخی نہ بڑھ جائے۔اس کی بات سن کے چچی کو ڈھارس بندھ گئی (وہ اچھی دوست بن گئی تھیں اور عبادہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ گل کی خُوب مل گئے تھے۔)

''اس کا خیال رکھنا۔'' انہوں نے نرمی سے نصیحت کی۔عبادہ نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔بریخنہ بوجھل سے قدم اٹھاتیں دونوں کے سامنے سے ہٹ گئیں۔گل نے سر جھٹک دیا۔

راہداری کافی لمبی تھی۔اتنا لمبا راستہ کاٹنے کی بجائے، دونوں صحن کے بیچ سے جانے لگیں لیکن وہ ابھی عالیہ بیگم کے سامنے سے گزری ہی رہی تھیں کہ گل کو ہلکا سا ٹھوکا لگا۔اس کے ہاتھ سے پولو اسٹک چھوٹ کے عالیہ بیگم کے قدموں میں جا گری لیکن اس سے پہلے کہ وہ جھکتی، اس نے عالیہ بیگم کے ہاتھوں کو چھڑی کو چھوتے پایا۔انہوں نے مٹھی سے ڈنڈا اٹھایا، کچھ دیر اس سرخ سفید لکڑی کو دیکھتی رہیں جیسے کوئی پہچان کر رہی ہوں.....اور پھر انہوں نے پہچان لیا۔ایک ہلکی مسکراہٹ ان کے لبوں پہ ابھری پھر سٹک انہوں نے گل کی طرف بڑھا دی۔ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔گل نے سٹک جھٹ سے چھین لی اور مضبوطی سے پکڑ لی۔(یہ عالیہ بیگم کی طرف اشارہ تھا کہ وہ چیزوں کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔)

عالیہ بیگم اس کی ادا پہ نرمی سے مسکا دیں۔

گل نے کاٹ دار نظر ان کے مسکراتے چہرے پہ ڈالی پھر پیر پٹختے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔پیچھے اس نے بی جان کو خود کو پکارتے سنا، وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔(یقیناً وہ اسے اصطبل جانے سے منع کر رہی تھیں۔اس نے کان بند کر لیے۔)

☆.....☆.....☆

آسمان صاف تھا۔سورج نکلا ہوا تھا۔بادل البتہ ایک کونے سے سر اٹھائے پہاڑوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔پہاڑوں کے پہلو میں بہتے دریا کے کنارے اس وقت ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔چترال

کے تمام قبائل یہ دلچسپ مقابلہ دیکھنے آئے تھے۔

جلندھر کی زمین پر دریائے چترال پھیل جاتا تھا۔اس پھیلاؤ کے سبب اس کے پانی کی روانی بہت مدھم ہو جاتی تھی۔ ہر سال چترال اور گلگت کا تیراکی مقابلہ دریا کے اس مقام پر ہوتا تھا۔ پانی کے آر پار سرخ رنگ کی دو موٹی رسیاں لگائی گئی تھیں، دریا کے اگلے کنارے کچھ لوگ لائف جیکٹ پہنے کھڑے تھے اور کچھ اس طرف۔لڑکے جو تیراکی میں حصہ لے رہے تھے وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں ملبوس، سر پہ پلاسٹکی ٹوپی رکھے، دریا کے کنارے پر اپنی اپنی ٹیم سے حوصلہ افزا ہدایات سن رہے تھے۔گلگت کی ٹیم نے گہرا نیلا اور چترال کی ٹیم نے گہرا سرخ کاسٹیوم پہنا تھا۔

شائقین اور سرداران کی گاڑیاں پیچھے قطار در قطار پارک تھیں۔زمین سے پیچھے کھیت تھے جہاں فاصلے فاصلے سے درخت اگے ہوئے تھے۔یہیں پہ رستم کھڑا تھا۔رستم کو یہاں لانے والا ابتہاج تھا۔جس دن سے وہ بچھڑ گیا تھا، اس دن سے ابتہاج اسے ہر جگہ ساتھ رکھتا تھا تاکہ وہ اس کے لمس کا عادی ہو جائے۔خود وہ دریا کے پاس گلگتیوں کو ورغلا رہا تھا۔

یوسف خان، چترالی قبائل کے سرداران اور گلگت کے سردار کھیتوں میں پگڈنڈیوں پر دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ان کے چوکس گارڈز اور ملازم ان سے دو قدم کا فاصلہ رکھ کے ان کے تعاقب میں تھے۔ابھی تیراکی کے مقابلے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔یہ دونوں گروپوں کے مابین آخری مقابلہ تھا۔کل شکار بازی کا مقابلہ گلگت نے جیتا تھا۔دونوں گروپ ایک ایک سے برابر ہو گئے تھے۔تیراکی کے بعد فائنل مقابلہ شندور کا تھا۔شندور میں اصلی سکندر کا امتحان ہونا تھا۔

غاذان رستم کے پاس تھا۔وہ جھک کے رستم کی گردن کے بال سہلا رہا تھا۔اس کا باپ ایک فالتو انسان کی طرح شائقین کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔فخرالدین نے فصل کی ڈلی توڑی، اس کے دانے چیک کیے اور نتھنوں کے قریب کر کے خوشبو لی۔

''جلندھر کی زمین کی فصل تو بہت کمال کی ہے خان صاحب۔اس دفعہ بھی اچھی پیداوار ہوگی۔'' انہوں نے ستائشی انداز میں تبصرہ کیا۔

''یہ تو غاذان کا کمال ہے۔اسی نے ادویات لاکر دی تھیں۔وہ پڑھا لکھا بچہ ہے۔کھیتوں کی سائنس جانتا ہے۔'' وہ فخر سے بولے۔

''مجھے بھی وہ دوائیں بتا دیجیے گا۔اس دفعہ ہماری فصلیں کافی زیرو بم کا شکار ہیں۔اللہ جانے کیا مسئلہ ہے۔'' وہ فکر مند تھے۔

''ضرور۔ان شاء اللہ۔وہ کوئی نئی بیماری آئی ہے۔غاذان بتا رہا تھا۔خیر میں مجاہد سے کہہ کر آپ کو وہ سارے نام لکھوا دوں گا۔آپ بھی آزما لیجیے گا۔'' وہ قدم قدم چلتے رستم کے قریب آگئے تھے۔غاذان ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے ایک طرف ہوگیا۔

''سلام خان جی۔'' اس نے ادب سے کہا۔

''وعلیکم السلام برخوردار.....مقابلہ شروع ہوا یا نہیں.....'' انہوں نے دور ویرانی پہ نظر ڈالی جہاں کوئی شور شرابہ نہیں ہو رہا تھا۔

''ابھی تھوڑا وقت ہے سردار۔کچھ کھلاڑی ڈیرے سے پہنچ رہے ہیں۔وہ آتے ہیں تو مقابلہ شروع کرتے ہیں۔''

''دریا کی حالت کیسی ہے؟''

''دریا میں طغیانی نہیں ہے۔روانی سے بہہ رہا ہے۔'' وہ کسی سیکرٹری کی طرح بتا رہا تھا۔وہ ایسے کھڑے تھے کہ رستم ان کے سامنے منہ جھکائے گھاس چر رہا تھا۔فخر الدین کافی دلچسپی سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔

''اور.....(شرارت سے ساتھ سرداروں کو دیکھا) ہمارے کھلاڑی کیسے ہیں۔''

''دنیا کے بہترین تیراک ہیں۔'' غاذان نے شرارت میں ساتھ دیا۔ چترالی سرداران ہنس پڑے۔ گلگت کے سرداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہمارے کھلاڑی بھی کسی سے کم نہیں۔ اس دفعہ ہم گلگت کے ٹھنڈے دریاؤں میں غوطے لگانے والے تیراک لائے ہیں۔''

''مگر ہمارا دریا تو گرم ہے۔'' غاذان تیزی سے بولا۔ یوسف خان کا قہقہہ بلند ہوا۔ گلگت کے سردار پہلو بدل کے رہ گئے۔

''یہ رستم ہے ناں؟ وہ نایاب گھوڑا؟'' فخرالدین جسے روایتی تنک تناؤ والے مکالموں میں دلچسپی نہیں تھی، رستم کو دیکھ کے ٹھٹکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''جی، ہاں۔ یہ ہمارا شیر بچہ ہے۔'' یوسف خان نے فخر سے رستم کی پیٹھ سہلائی۔ اس کی پیٹھ ان کے کندھوں تک آ رہی تھی۔

''بہت کمال کا گھوڑا ہے۔ بالکل اپنی ماں جیسا ہے۔ اونچا، چمکیلا اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والا۔ (ایک ٹھنڈی سانس لی) اس کی شان ہی الگ ہے۔'' وہ ایسے بولے گویا الفاظ نہیں تھے۔

غاذان نے گلہ کھنکارا۔ ''فخر کاکا..... یہ ہمارا گھوڑا تھا۔ اب نہیں رہے گا۔''

یوسف خان نے بجلی سی تیزی سے اسے دیکھا۔ غاذان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔ لمحے بھر میں مجمع میں ایک بے چینی دوڑ گئی۔ سب نے ایک دوسرے کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

''سب پریشان نہ ہوں۔ دراصل یہ بات ہم نے علی الاعلان نہیں کی۔ ابھی تک خود تک رکھی تھی لیکن اب وہ مقام آ گیا ہے کہ ہم اس کا اظہار سرِ عام کر لیں۔'' وہ قدم قدم چلتا رستم کے پیچھے اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ہمارے قبیلے میں شندور کی واپسی پورے اٹھارہ سال بعد ہوئی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں میرے تایا جان نے شندور جیتنے والی ٹیم کو چھ گھوڑے دینے کا اعلان کیا تھا۔ وہ چھ گھوڑے ہمارے اصطبل کے بہترین گھوڑوں میں سے بہترین گھوڑے تھے مگر ان کی قدر و قیمت سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے، اگر وہ چھ جا رہے تھے تو باقی چھ آ جائیں گے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہمیں ایک معمولی انعام رکھ کر اس قصے کو ایک دو سال کے لیے ازبر نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں کچھ ایسا انعام رکھنا ہے جو سو دو سو سال تک ازبر ہو جائے۔"

وہ مدھم لہجے، نرم انداز میں رسانیت سے کہہ رہا تھا۔ یوسف خان کے اعصاب البتہ تن رہے تھے۔

"کچھ ایسا ہے جو ہمارے دلوں کے قریب ہو، کچھ ایسا جو کوہِ نور سے زیادہ بیش بہا ہو۔ جو ہماری دوستی، ہمارے امن اور ہمارے چترال کی خوشحالی کے آگے کوئی معنی نہ رکھے۔ جس کی مثال آنے والے ہر سردار قبیلے کے دل پر مہر کی طرح لگ جائے۔"

یوسف خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ غازان کو تنبیہی نظروں سے دیکھ کے اسے روکنا چاہتے تھے لیکن فی الوقت وہ ان سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

"ہم نے بہت سوچ بچار کی اور بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اب چھ گھوڑوں کی بجائے....." وہ سانس لینے کو رکا۔ یوسف خان نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا۔ "ہم..... رستم کو انعام کے طور پر وقف کریں گے۔"

مجمع میں کرنٹ دوڑ گیا۔ چہروں پر الجھن، پریشانی، حیرت اور تعجب ایک ساتھ ابھرا۔

"تم لوگ رستم کو وقف کر رہے ہو؟ شندور کے لیے؟" سب کے چہروں پر بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

"جی۔ ہم رستم کو وقف کریں گے۔" وہ ٹھاٹ سے بولا۔

"کھووار قبیلہ نے پھر میدان مار لیا سردار۔ مقابلے سے پہلے ہی جیت حاصل کر لی۔ یوسف خان۔ (فخر اس کے قریب آیا۔) آپ کا ظرف بلند ہے۔ آپ کا ظرف کمال کا ہے۔ آپ جیسا سخی

اور بلند حوصلہ سردار چترال کو نہیں مل سکتا۔ آپ نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔'' وہ اپنی لے میں کہہ رہا تھا اور ادھر یوسف خان کے دل پہ ہتھوڑے پڑ رہے تھے۔

'جیتنے والی ٹیم کو رستم ملے گا۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؟'' دوسرا سردار بولا۔

''جیتنے والی ٹیم نہیں کا کا.....'' غاذان نے نرمی سے تصحیح کی۔ ''جیتنے والا کھلاڑی۔ رستم اس کھلاڑی کو ملے گا جو آخری گول کرے گا۔''

''آخری گول؟''

''آخری دفعہ بال جس بھی کھلاڑی نے ستونوں کے آر پار کی۔ وہ رستم کا حقدار بن جائے گا۔'' اس نے مسکرا کے کہا۔

''واہ..... کمال..... ایک ٹیم کو نہیں..... ایک کھلاڑی کو یہ مایہ ناز گھوڑا ملے گا..... سردار یوسف خان کا ظرف بلند ہو۔ ہمیں تو پریشان کر دیا ہے۔ ہمارے پاس ایسا گھوڑا دینے کا قطعی ظرف نہیں ہے۔ ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔''

وہ کہتے ہی رستم کے قریب آ گئے۔ یوسف خان نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ یقیناً آج غاذان کی خیر نہیں تھی۔ اسے اس بدنامی کا حل تلاش کرنے کا کہا تھا اس کو مزید پیچیدہ بنانے کا نہیں۔ وہ کیسے سب کے سامنے یہ اعلان کر سکتا تھا۔ وہ تمام کے تمام سرداران تھے۔ اگر اب یوسف خان نے حکم کی تعمیل نہیں کی تو یہ اعلیٰ ظرفی کا نعرہ، کم ظرفی اور بخل میں بدل کر تا عمران کے سینے پر بدنامی کی طرح چسپاں ہو جائے گا۔

اوہ خدا غاذان کیا کر دیا!

(قسط نمبر: 4)

اصطبل میں خاموشی تھی۔ ملازمین نہیں تھے۔ سب ہی تیراکی کا مقابلہ دیکھنے گئے تھے۔ ایسا دن کہ اصطبل خالی ہو، میدان میں کھلاڑی نہ ہوں، گل کی زندگی میں بہت کم کم آتا تھا۔ یہ میدان ہمیشہ گھڑ سوار اور گھڑ شوقین لڑکوں سے بھرا ہوتا تھا۔ پورے چترال کے بالک اپنی مشقیں کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ چوروں کی طرح رات میں وقت نکال کے یہاں آجایا کرتی تھی اور پھر مہابت خان اسے حویلی چھوڑنے جاتے تھے۔

وہ دونوں اندر آئیں تو مہابت خان کو لان کے قطعے پر چلتے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں بڑا سا انجکشن لیے بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی سرمئی قمیص گندی تھی۔ زرد رنگ کا کوئی ملغوبہ اوپر گرا ہوا تھا۔ وہ جھنجھلا کے ہاتھ سے دامن صاف کر رہا تھا جب اچانک اپنے سامنے چار پیر دیکھے۔ اس نے سر اٹھایا۔ عبادہ اور گل کھڑی تھیں۔ گل کے چہرے پر شرارت تھی۔

''تم بوڑھا ہو چکا ہے مہابت خان۔'' گل نے اسے چھیڑتے ہوئے بیگ کندھے سے اتارا۔

''تم گھوڑوں کو کھانا وانا کھلانا بند کرو اور تسبیح پکڑ کے اللہ اللہ کرو۔ جانے کب تمہارا بلاوا آجائے اور تم پرلوک سدھار جاؤ۔''

مہابت خان کی تیوری چڑھی۔ ''ہمارا بلاوا سے پہلے تم سب کا آئے گا۔ ماشاء اللہ مہابت خان دوسو سال کی زندگی لکھ کر لایا ہے۔'' اس نے چڑ کا جواب دیتے ہوئے انجکشن نیچے پھینک دیا۔ گل اور عبادہ ہنسنے لگیں۔

مہابت خان نے روئیدہ سی کھڑی عبادہ کو دیکھا پھر ایک دم ان کا چہرہ بجھ گیا۔

''تم علاج کے لیے آئی ہوناں بچے مگر تم گھوڑوں سے نہیں مل سکتی۔ وہاں ابتہاج خان جی نے دو باوردی گارڈ کھڑے کیے ہیں جن کی ذمہ داری ہے کہ آپ کو گھوڑوں کے پاس نہ جانے دیں۔'' انہوں نے بہت اداسی سے مطلع کیا۔ عبادہ نرمی سے مسکرائی۔

''جانتی ہوں کاکا۔ میں نے علاج کرنا چھوڑ دیا ہے۔ دیکھیں، آج میں اوورآل میں نہیں آئی۔ میں تو گل کا پولو میچ دیکھنے آئی ہوں۔''

''پولو؟''

''کاکا۔ چونک تو ایسے رہے ہو جیسا پہلی بار دیکھ رہے ہو۔'' گل نے ٹونٹ کی۔

''مگر رستم نہیں ہے یہاں۔''

''کہاں ہے؟'' وہ ٹھٹک گئی۔

''ملازم لے کر گئے ہیں۔''

''اوہ.....''

وہ جانتی تھی کہ چترال میں چاہے کچھ بھی چل رہا ہو، جو رستم کی روٹین ہے وہ کبھی نہیں بدل سکتی۔ اسے صبح، دوپہر اور شام میں جو چیز دی یا کرائی جاتی تھی۔ اس میں قطعی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر اسے ملازم لے کر گئے تھے تو وہ اپنے وقت پہ ہی واپس آئے گا۔ اس لیے رستم کا انتظار کرنا بے معنی تھا۔

''کاکا.....اور گھوڑے ہیں اصطبل میں؟''

''ہاں.....باقی تو سب ہیں۔''

''پھر آپ گھوڑا لے آئیں۔''

''ٹھیک ہے بچے میں لاتا ہے.....'' وہ مسکرا کہتے اصطبل کی طرف بڑھنے لگے جب ہی گل ضبط سے چیخی۔

''کاکا! گھوڑے کو میں لے آؤں گی..... تم جا کے نہالو اور کپڑے بدل لو۔ واللہ عالم بہت گندی بدبو آرہی ہے تم سے۔'' گل نے ناک پکڑ کے ہاتھ جھلائے۔ انہوں نے اپنے لباس کو دیکھا جہاں ان کے دامن پہ مکھیاں بیٹھ رہی تھیں۔ ان کے ماتھے پر بل پڑے۔

''یہ خانہ خراب مدثر تیراکی کے لیے بھاگ گیا ہے۔ گھوڑا سنبھالنا ہمارا بس کی بات تھوڑا ہے۔ ہم کو تو اس کا معدے کا پائپ بھی نہیں نظر آتا۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کروفر سے بولے۔

''فکر مت کرو کاکا۔ میں کلاس لیتی ہوں اس کی۔'' گل ہنستے ہوئے بولی۔

مہابت خان انداز چلا گیا تو وہ پھر پلٹ کے عبادہ کو دیکھنے لگی۔

''میں گھوڑا لے کر آتی ہوں۔ تم ادھر ہی رہو۔'' وہ اصطبل کی طرف بڑھ گئی۔ عبادہ منتظر سی وہاں کھڑی رہ گئی۔

(باوردی گارڈز۔ ایک بھی المیہ تھا۔ لوگ جس کے پاس علاج کے لیے جاتے وقت سارے پہرے، ساری رکاوٹیں اور ساری سرحدیں توڑ دیتے ہیں، وہاں عبادہ سلیم کو مریض کے پاس جانے سے روکنے کے لیے کئی سرحدیں بنائی گئی تھیں۔ سوچنے کی بات تھی۔ کیا وہ اس قدر اس سے ڈر گیا تھا؟ مگر کیوں؟ مرے ہوئے گھوڑوں کی رپورٹس تو جھوٹی تھیں۔)

کچھ دیر میں گل گھوڑے کی لگام پکڑے میدان میں آگئی۔ اس نے جیسے ہی لگام چھوڑی، گھوڑے نے دبک کر منہ گھاس میں ڈال دیا۔ وہ گھاس جسے صرف رستم کھا سکتا تھا مگر خیر.....

وہ عبادہ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھی اور بیگ کی زپ کھول لی، اندر سے دو ہیلمٹ نکالے (دو کیوں؟)، پولو بال نکال کے آگے پھینک دی۔ سیفٹی بیلٹس نکالے، سرخ گول کالر والی ٹی شرٹ نکالی جس کے پیچھے انگریزی میں ''چترال'' درج تھا۔ نیچے اس کے بابا کا نام تھا۔ ''کلیم اللہ۔''

اس نے شرٹ لہرائی۔

''عبادہ! تمہیں پتہ ہے چترال کی شرٹ کا رنگ سرخ ہے اور گلگت کا ہلکا نیلا۔ یہاں شرٹ پہ کھلاڑیوں کے نام نہیں لکھے ہوتے لیکن بابا نے لکھوایا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ وہ میرا بھی لکھوائیں گے .....'' اس نے اپنائیت سے شرٹ پہ درج نام پہ ہاتھ پھیرا، پھر اسے نتھنوں کے قریب کیا اور خوشبو اندر اتاری۔ اس نے شرٹ پہ بابا کا پرفیوم چھڑکا تھا۔ اس نے شرٹ پہن لی، سیفٹی بیلٹس کہنیوں اور گھٹنوں کے گرد باندھنے لگی۔

''یہاں کا پولو فری سٹائل پولو ہے یہاں کھلاڑی ہیلمٹ نہیں پہنتے اور نہ ہی سیفٹی بیلٹس لگاتے ہیں مگر بابا لگاتے تھے کیوں کہ انسان کی سلامتی ہی اصل چیز ہوتی ہے۔ سوچتی ہوں اس دن اگر گلگت کے اس بندے نے یہ سب پہنا ہوتا تو وہ کیوں اتنی بے دردی سے روندا جاتا؟'' وہ افسوس سے کہنے لگی۔ ''اس لیے کہتے ہیں کھیل ہو یا جنگ، اپنی زرہ پہننی چاہیے۔ یہ لو۔''

ساتھ ہی اس نے چند چیزیں عبادہ کی طرف پھینکیں۔ عبادہ نے ٹھٹک کے ان کو دیکھا۔ وہ سیفٹی بیلٹس اور ہیلمٹ تھا۔

''یہ..... یہ کیا ہے..... گل؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ کہیں نہ کہیں خطرے کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔ اپنے پاس رکھو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''پتہ ہے عبادہ گھڑ سواری میں سب سے زیادہ کیا ضروری ہوتا ہے؟'' وہ ہیلمٹ ایک ہاتھ میں پکڑے گھوڑے کے قریب آئی اور اس کی گردن سہلانے لگی۔ گھوڑا نیچے چر رہا تھا۔

''کیا؟''

''گھوڑے کا آپ سے اور آپ کا گھوڑے سے مانوس ہونا۔''

وہ گھوڑے کے آگے آئی، اس کا منہ اٹھایا، اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کچھ نا آشنا زبان میں

بولنے لگی۔ گھوڑے ایک قدم پیچھے اٹھاتا، ایک آگے جیسے وہ اس کی بات سمجھ رہا ہو۔ ''اگر گھوڑا آپ سے مانوس نہیں تو وہ میدان میں آپ کو گرا سکتا ہے اور آپ کو مار بھی سکتا ہے۔ یہ پکڑو۔''

اس نے ہیلمٹ عبادہ کو پکڑایا۔

''کاٹھی صحیح نہیں باندھی کا کا نے۔ نیچے والی رسی ڈھیلی ہے۔ میں بیٹھی تو کاٹھی کھسک جائے گی۔'' وہ جھک کے گھوڑے کے پیٹ اور کمر کے گرد لپٹی رسی کو کھینچ کے ٹائٹ کرنے لگی۔ ''زین کا لوہا نکل رہا ہے، اس سے گھوڑے کو چوٹ لگ سکتی ہے۔ یہ دیکھو۔'' اس نے زین کے لوہے کو پکڑ کے اوپر کیا۔ ''یہ کٹس ہیں۔ جب ہم گھوڑے پہ ہوتے ہیں تو ہمارے پیروں کی وجہ سے گھوڑے کے پیٹ میں زور زور سے لگتے ہیں، اگر زین کے لوہے کے کٹس نکلے ہوں تو یہ گھوڑے کو زخمی کر سکتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے لگ رہا تھا وہ گھوڑوں کی ٹریننگ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ عبادہ متاثر ہوئی تھی۔

اس نے گھوڑے کی مرصع لگام پکڑی، زین میں پیر دیا اور بائیک پہ بیٹھنے والے انداز میں دوسری ٹانگ لہرا کے اگلی طرف اتاری اور دھڑام سے بیٹھ گئی۔ گھوڑا ایک دو قدم آگے پیچھے ہلا۔

''لاؤ دو۔'' اس نے جھک کے عبادہ سے ہیلمٹ لیا، سر پہ ایڈجسٹ کر کے پہنا اور نیچے سے ہک باندھ لی۔ اس کی نیلی آنکھیں ہیلمٹ سے جھانکتے ہوئے بھلی لگ رہی تھیں۔ کندھے کا زخم ابھی تازہ تھا۔ عبادہ نے اسے پولو سٹک پکڑائی۔ اس نے اسٹک کی سٹریپ کو کلائی میں پہنا اور ہینڈل سے سٹک تھام لی۔ اسی اثنا مہابت خان بھی کپڑے بدل کر آ گیا۔

گھوڑا اس کے نیچے ہل رہا تھا جیسے دوڑنے کے لیے تیار ہو۔

''تیار ہو عبادہ۔ ڈرو گی تو نہیں؟'' اس نے آنکھ کا کونا شرارت سے دبایا۔

''اگر تم نے گھوڑا میرے اوپر نہ چڑھایا تو بے فکر رہو۔نہیں ڈروں گی۔'' وہ مسکراہٹ دبا کے بولی۔گل نے قہقہہ لگایا۔

''چلو میرے شیر.....''اس نے گھوڑے کا رخ گیند کی جانب موڑ دیا جو میدان میں دور پڑی ہوئی تھی۔اس نے گھوڑے کو چابک دیا۔گھوڑا زور سے ہنہنایا۔اس نے دوسرا چابک دیا، گھوڑا دوڑنے لگا۔ پھدک..... پھدک..... پھدک.....تیسرا چابک پڑنے کی دیر تھی، گھوڑا تیزی سے آگے بھاگا۔گل نے بائیں ہاتھ میں لگام پکڑی تھی اور دائیں ہاتھ میں اسٹک۔اس نے گھوڑے سے ہلکا سا دائیں طرف جھک کے، نیچے سے بال کو سٹک ماری، بال دوڑتی ہوئی آگے گئی۔گھوڑا آگے بھاگا۔

عبادہ نے فوراً فون نکالا اور ویڈیو بنانے لگی۔

گل کا گھوڑا فراٹے بھر رہا تھا۔اس کے پیچھے گرد کا غبار اٹھ رہا تھا۔میدان میں شور سا ہو گیا تھا۔بال ایک ہی ہٹ سے دور اچھل جاتی اور طویل فاصلہ طے کر لیتی۔تین ہی جستوں میں گل نے بال گول باؤنڈری کے پار کر لی تھی۔وہ وہاں سے پلٹی اور یوں پلٹی کہ گھوڑے کے نہ پیر رپٹے اور نہ مڑے، وہ گھوڑے کو مہارت سے موڑنا جانتی تھی اور شاید یہی چیز اہم تھی۔گھوڑا گاڑی کی طرح نہیں ہوتا کہ اسٹیئرنگ گھمایا اور گاڑی کے پہیے مڑے، گھوڑے کو گھمانے کا آرٹ ہوتا ہے جو لگام میں چھپا ہوتا ہے، وقت پہ کہاں سے گھوڑا کس سمت میں موڑنا ہے، یہ بہترین گھڑسوار ہی جانتا ہے۔

گیند اب عبادہ کی طرف آ رہی تھی۔گل پوری اسپیڈ میں تھی۔گھوڑا دھڑ دھڑ بھاگ رہا تھا۔عبادہ نے فون کی اسکرین میں دیکھا، پھر سر ہلکا سا اوپر اٹھایا، گھوڑا چند قدم دور تھا۔وہ سٹپٹا گئی۔لرزتی ٹانگوں سے ایک قدم پیچھے لیا، بھاگنے کے لیے مڑی، گھوڑا قریب آیا، عبادہ نے چیخ ماری، گل نے اس سے ایک فٹ دور زن سے گھوڑا گھما دیا۔گھوڑے کے پیروں تلے گرد کا غبار اٹھا۔عبادہ دھڑام

سے لان میں اوندھے منہ جا گری۔اس کے ہاتھ سے فون دور اچھل گیا۔گل گھوڑے کی لگام کھینچ کے پلٹی۔عبادہ اٹھ کے کہنیاں جھاڑ رہی تھیں۔گل کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

''تم کتنی ڈرپوک ہو عبادہ سلیم۔مجھے تو آج پتہ چلا۔اتنا ڈر لگتا ہے گھوڑوں سے؟'' وہ اس کے اردگرد گھوڑا گھماتے ہوئے پوچھنے لگی۔عبادہ کیا بتاتی کہ راولپنڈی پولو کلب میں گھوڑے سے گرنے کے بعد وہ پھدکتے ہوئے گھوڑوں سے کس قدر ڈرتی ہے خاص طور پر جب وہ فل رفتار میں آپ کی طرف آرہے ہوں جیسے خدانخواستہ کسی جنگ کے میدان میں دشمن کا گھوڑا ہو۔

''چلو آؤ۔تمہیں بٹھاتی ہوں۔تمہارا ڈر ختم ہو جائے گا۔'' گل نے سٹک نیچے پھینک دی،اس ہاتھ سے لگام پکڑی اور دوسرا ہاتھ جھک کے عبادہ کو دیا۔عبادہ کے دل پہ گھونسا پڑا۔

''جی نہیں۔بالکل نہیں۔مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ بدک کے پیچھے ہوئی۔

''کاکا۔سنیے۔گھوڑوں کی ڈاکٹر کو گھوڑوں سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ مہابت خان کو بتانے کی غرض سے اونچا بولی۔مہابت خان مسکرایا۔

''اٹھو مس ویٹ۔کچھ نہیں ہوتا۔ہاتھ دو۔دیکھنا تمہیں بہت مزہ آئے گا۔''

''نہیں گل۔مجھے مزے نہیں لینے۔تم پریکٹس کرو۔'' وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور اپنے فون کے پاس آئی،جھک کے اٹھایا۔اس کی اسکرین پہ گھاس لگی ہوئی تھی۔اس نے پینٹ سے اسکرین رگڑ کے صاف کی۔مہابت خان مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا۔وہ فون کی اسکرین دیکھ رہی تھی۔

''تم ٹھیک ہو بچے؟'' انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''جی کاکا ٹھیک ہوں۔یہ گل کی بچی۔بدتمیز۔ڈرا دیا مجھے۔'' وہ فون بند کر کے پینٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''اسے گھوڑا چلانا آتا ہے بچے۔بھروسہ رکھو۔''

''مجھے کچلے نہیں تو پورا بھروسہ ہے۔'' وہ ہنسی۔ مہابت خان مسکرادیا۔

''عبادہ..... وہ ہیلمٹ اور وہ بیلٹس تمہیں ایویں نہیں پکڑائے۔ جاؤ جا کے پہن کے آؤ۔ میں تمہارا ڈر ختم کروں۔'' وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئی تھی۔ وہ کرنٹ کھا کے پلٹی۔

''نہیں گل..... ہرگز نہیں.....'' وہ بے حد گھبرا گئی۔

''کاکا..... جا کے بیگ پہ پڑا وہ سامان لائیں۔ میں دیکھتی ہوں، یہ کیسے گھوڑے پہ نہیں بیٹھتی۔'' اس نے اپنی آستین پیچھے کیں۔ عبادہ کے دل حلق میں اچھلا۔

''گل! میں گھوڑے سے بہت زور کی گری ہوں اور ٹخنہ ٹوٹ گیا تھا میرا۔ میں تین مہینے تک چل نہیں پائی تھی۔ میں دوبارہ یہ رسک نہیں لوں گی۔'' وہ بچوں کی طرح منمنائی۔ گل سفاکیت سے مسکرادی۔

''جب میں بابا سے کہتی تھی کہ مجھے گھوڑے سے ڈر لگتا ہے تو وہ مجھے ڈانٹ دیتے تھے۔ جھڑک دیتے تھے۔ اس لیے اگر تم نے بھی رونا دھونا شروع کیا تو میں تمہیں بھی بری طرح ڈانٹوں گی اور تمہارے جانے تک تم سے بات بھی نہیں کروں گی۔ گل لالہ اپنی ضد کی بہت پکی ہے۔ اگر میں نے ایک دفعہ تم سے ناراضی بنالی تو قیامت تک تم اسے ختم نہیں کرسکو گی۔ سوچ لو۔'' اس نے بری طرح عبادہ کو اپنے جال میں گھیر لیا۔ عبادہ نے چارو ناچار اسے دیکھا۔

مہابت خان سامان لے آیا تھا۔ گل نے سیفٹی بیلٹس ہاتھوں میں لہرائے۔ ''سوچ لو..... عبادہ سلیم..... میں یا ڈر؟''

(ابا ہوتے تو وہ کہتی۔ ڈر۔ مگر یہاں تو اماں کی بھی اماں آگئی تھی۔ اس سے دوستی نہ ہوتی تو وہ کب کا لعنت بھیج کے یہاں سے جا چکی ہوتی۔ میسنی کہیں کی۔)

اس نے سیفٹی بلیٹس اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیے۔

''اگر میں گری نا گل.....تو یہی والا انداز میں اپناؤں گی۔ساری عمر تم سے بات نہیں کروں گی۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔اب جلدی کرو۔پہنوا سے۔'' وہ ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بولی۔

عبادہ بادلِ نخواستہ نیچے بیٹھی اور گھٹنوں پر بلٹس باندھنے لگی۔کہنیوں پر خول اور سر پہ ہیلمٹ رکھنے کے بعد گل گھوڑے کی لگام تھامے قریب آ گئی۔عبادہ پیچھے پیچھے ہو رہی تھی۔

''ڈرو نہیں۔یہ تمہیں کھائے گا نہیں۔'' گل نے مسکراہٹ دبائی۔

''چپ کرو۔'' وہ برا مان گئی۔اسے رونا آ رہا تھا۔گھوڑا بار بار جھول رہا تھا۔آگے پیچھے۔ٹک کے تو دے نہیں رہا تھا۔اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ گھوڑے کی کاٹھی پر ہاتھ رکھا، جب ہی گل ایک چپت رسید کی۔

''بھول گئیں، پہلا قانون؟ کیا سمجھایا تھا کچھ دیر پہلے؟'' وہ ٹیچر بن کے ڈانٹنے لگی۔عبادہ کو یکدم یاد آ گیا۔وہ کاٹھی چھوڑ کر گھوڑے کے منہ کے پاس آئی اور نرمی سے اس کے بال سہلانے لگی۔ایسا کرتے وقت وہ گھوڑے سے صرف ایک گزارش کر رہی تھی۔

''گرانا مت.....گرانا مت.....''

گھوڑا تابعداری سے سر ہلا رہا تھا۔(فکر کیوں کرتی ہیں۔ایک دفعہ بیٹھیں تو سہی۔)

چند ثانیے بعد گھوڑا لمس سے مانوس ہو گیا۔اب گل نے اسے بیٹھنے کا کہا۔عبادہ گھوڑے پہ بیٹھنا جانتی تھی لیکن وہ گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے سے ڈرتی تھی۔اس نے کاٹھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا، زین میں پیر ڈالا اور بیٹھ گئی۔کاٹھی گرم تھی۔گھوڑے کی لگام بدستور گل کے ہاتھ میں تھی۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' گل نے چمک کے پوچھا۔

''موت کی دہلیز پہ بیٹھی ہوں۔'' وہ آنسو روک کے بولی۔

''شٹ اپ..... کتنا پیارا گھوڑا ہے۔تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔''

''پیارے گھوڑے مجھے گرانا نہیں۔ یہ عورت میری دشمن ہے۔اس نے میرے یہ چند دن نرک بنا دیے ہیں۔تم جانتے ہو میں نے وہ کام کر دیے ان دنوں میں جن کو میرے آباؤ اجداد نے بھی نہیں کیا تھا۔ میں کہاں کہاں نہیں گھومی۔ رات کے اندھیرے سے لے کر خوفناک قبرستان تک سب دکھا دیا اس ظالم خاتون نے..... اور اب تم پہ بٹھا کر..... یہ عورت (انگلی سے گل کی طرف اشارہ کیا) میری موت کا تماشا دیکھنے آئی ہے۔''

''بس بس.....'' گل نے اکتا کے کہا۔''زیادہ ڈرامے مت کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھوں گی۔''

یہ کہتے ہی گل نے اسے لگام پکڑائی اور خود گھوڑے پر چڑھ گئی، اس کے پیچھے بیٹھ کے گل نے اس کے ہاتھ سے لگام لے لی۔اب عبادہ کو اصلی والا ڈر لگا تھا۔اس نے بے ساختہ تھوک نگلا۔گل نے گھوڑے کو ہانک لگائی، وہ میدان کی طرف مڑا۔

''گل.....'' وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

''ایک ریس تو بنتی ہے۔'' گل نے پرجوش لہجے میں کہا۔

''نن.....نن.....نہیں.....نہیں گل.....نہیں.....پلیز.....نہیں.....''

''کس کے بیٹھو۔'' گل نے دونوں ہاتھوں سے لگام پکڑی اور لہرائی۔''چل میرے شیر۔''

گھوڑا ہنہنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرپٹ دوڑنے لگا۔عبادہ کا دل پیٹ میں چلا گیا۔اس نے جھک کے گھوڑے کے گردن کے بال پکڑ لیے اور آنکھیں بند کر دیں۔

''جل تو جلال تو.....آئی بلا کو ٹال تو.....جل تو جلال تو.....آئی بلا کو ٹال تو.....''

گھوڑے کے بھاگنے سے دونوں کے دوپٹے اور کپڑے مخالف سمت اڑ رہے تھے۔وہ اچھل رہی تھیں۔گل نے نیچے دیکھا تو عبادہ نے گھوڑے کو گردن سے گلے لگایا ہوا تھا۔اس نے سر کو دائیں

بائیں ہلا دیا۔

''عبادہ اٹھو۔ دیکھو۔ دنیا کتنی حسین ہے۔ فطرت کتنی قریب ہے۔'' اس نے خود آنکھیں بند کر دیں۔ گھوڑا دمادم بھاگ رہا تھا۔ عبادہ جل تو جلال تو کرتی رہی۔ اب کی بار گل نے ہاتھ کی مدد سے اسے ہیلمٹ سے پیچھے کھینچا، وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

''دیکھو..... کتنا پیارا نظارہ ہے۔ ایسی آزادی تمہیں دوبارہ نہیں ملے گی۔ محسوس کرو اس ہوا کو، دیکھو یہ فضائیں کتنی حسین ہیں۔''

عبادہ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔

وہ لوگ اصطبل میں نہیں تھے بلکہ وہ لوگ دریائے چترال کے کنارے تھے۔ وہ ایک پتھریلی روش تھی، لمبی، بے حد لمبی، ساتھ ساتھ دریائے چترال بہہ رہا تھا۔ دائیں بائیں سرسبز وادیاں تھیں، سامنے بلند و بالا پہاڑ تھے اور دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ گل نے باہیں کھول دی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے، اس آزادی کو محسوس کر رہی تھی۔ گھوڑا دھڑ دھڑا رہا تھا۔ زمین سے گرد اٹھ رہی تھی۔

خوشی، محبت اور آزدی..... یہ تینوں جذبے اس کے دل میں ایک ساتھ جاگ گئے۔ اس نے پوری آنکھیں کھول لیں۔ وہ گر نہیں رہی تھی۔ گل اس سے چند انچ پیچھے تھی مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے گھوڑے پر صرف وہی بیٹھی ہو۔ گھوڑا اپنے شعور میں بھاگ رہا تھا۔ اسے ہانکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی اسمات سے واقف تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے منہ پر لگ رہے تھے۔ جسم میں نئی روح ڈالی جا رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے باہیں کھول لیں اور زندگی کو محسوس کر لیا۔

☆.....☆.....☆

''تم بلاوجہ ڈر رہی تھی۔ دیکھا کتنا مزہ آتا ہے گھوڑے پر بیٹھ کے۔'' گھوڑے کو اصطبل میں

لانے کے بعد، اس سے اترتے ہوئے گل نے کہا۔ عبادہ کچھ نہیں بولی۔ وہ محض مسکرا رہی تھی۔ گل نے اسے ہاتھ دیا تو وہ نیچے کود گئی۔ مہابت خان جو دونوں کا انتظار کر رہا تھا، آگے بڑھا اور گھوڑے کی لگام تھام لی۔

''ایک بات تو بتاؤ..... تمہیں اس گھوڑے نے گرایا کیوں تھا؟'' گل نے ہیلمٹ کی ٹک کھولتے ہوئے پوچھا۔

''اسے لیمنس ہو گیا تھا۔ میں اس کا علاج کرنے گئی تھی۔''

''کہیں تم نے اسے علاج کے دوران تکلیف تو نہیں دی تھی؟'' گل نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''لیمنس بیماری ہی ایسی ہے۔ اس کے علاج کے دوران بھی گھوڑے کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

''پھر کیا شکایت کرتی ہو کہ اس نے گرا دیا؟ اگر سواری والے جانور کو ہم سے تکلیف پہنچے تو وہ ہمیں کبھی اپنے اوپر سواری نہیں کرنے دیتا۔'' اس نے ہیلمٹ کھول کر سر آزاد کیا۔ ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینہ تھا۔ عبادہ کے ابرو استعجاب میں اٹھے۔ اس نے ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر وہ کونسا گھڑ سوار تھی۔ وہ تو ڈاکٹر تھی۔

''تم جانتی ہو گل..... وہ گھوڑا کس کا تھا؟'' کوارٹر کی طرف ستانے کے لیے بڑھتے ہوئے اس نے دبے دبے جوش سے پوچھا۔

''کس کا؟'' کہنیوں سے سیفٹی بیلٹس ہٹاتی وہ غیر دلچسپی سے بولی۔

''صائمہ افتخار کا.....''

وہ جو چل رہی تھی، یکدم رک گئی، سر اٹھا کر بے یقینی سے عبادہ کو دیکھنے لگی۔

''صائمہ افتخار کا؟ سیریسلی؟''

''آہاں۔''

''تم ان سے ملی ہو؟'' وہ حیرت سے اس کے قریب آئی۔

''پورا ایک ہفتہ گزرا ہے ان کے گھر۔ پچھلے سال کی ہی بات ہے۔ وہ پاکستان آئی تھیں۔''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ہاں؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''تم نے پوچھا ہی نہیں۔'' عبادہ نے ابرو اچکائی۔ گل نے ایک چپت اس کے بازو پہ رسید کی۔

''تم بہت مسنی ہو۔''

''مسنی نہیں ہوتا..... میسنی ہوتا ہے۔ تم پنجابی نہ ہی بولو تو بہتر ہے۔'' اس نے ناک بسور لی۔

''تمہیں تو جیسے بہت کھوواری آتی ہے..... پہلے تم کھوواری.....''

''کھو..... وا..... ری..... بول دیا.....''

''یہ والی نہیں..... جو ہم بولتے ہیں.....''

''اچھا اچھا بس بس.....''

چلتے چلتے ان کی آوازیں پس منظر میں معدوم ہوتی گئیں۔ چترال کی پہاڑیوں پر سایہ آچکا تھا۔ اصطبل میں ٹھنڈ ہونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے مردان خانے والے کمرے میں بے چینی سے پنڈولم کی طرح ٹہل رہے تھے۔ دائیں سے بائیں پھر دائیں پھر بائیں۔ دونوں ہاتھ پشت پہ بندھے ہوئے تھے۔ دستار سر پہ نفاست سے جمی تھی۔ شال بائیں کندھے سے نیچے لٹک رہی تھی۔ وہ انتہائی ضبط سے لب بھینچے غاذان کا انتظار کر رہے تھے جسے ملازم بلانے گیا تھا۔

مجاہد خان صوفے پر براجمان فکرمندی سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔

''بھائی صاحب! پُرسکون ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے اس نے سوچ سمجھ کر ہی یہ اعلان کیا ہو گا۔'' مجاہد نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ سر کو ''نہ ماننے والے'' انداز میں دائیں سے بائیں ہلانے لگے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سا اشتعال تھا۔ انہوں نے غاذان سے حالات سنبھالنے کی بات کی تھی نہ کہ رستم کو سرعام نیلام کرنے کا کہا تھا۔ اس نے بتائے بغیر میڈیا میں یہ خبر چلا دی تھی کہ رستم جیسا نایاب نسل کا گھوڑا وہ شندور میں انعام کے طور پر دینے والے ہیں لیکن اس سب منصوبے کا مشورہ غاذان نے کسی سے نہیں کیا تھا۔ ان کو غاذان کی فہم پر اعتماد ضرور تھا لیکن کم از کم وہ انہیں بتا تو سکتا تھا۔

غاذان دروازے کی چوکھٹ پہ وارد ہوا تو یوسف خان کے قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آیا۔

''دروازہ بند کر دو۔'' انہوں نے خشک لہجے میں کہا، غاذان جو آگے آ رہا تھا، چونکتے ہوئے رک گیا پھر سر کو ''اوکے'' والے انداز میں خم کرتا پیچھے گیا، دروازہ اچھے سے بند کیا اور واپس ان تک آیا۔ چار قدم کے فاصلے پر وہ رک گیا۔

''آپ نے بلایا تھا خان جی؟'' وہ ایسے بات کرنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہوا۔ اس کے لاپرواہ انداز پر یوسف خان مشتعل سے اس کی طرف بڑھے۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ گھوڑوں کا مسئلہ حل کرو نہ کہ میرے لیے مزید مسائل کا بندوبست کرو۔ یہ تم نے کیا کیا ہے۔ لاکھوں کے نقصان پر تم مجھے کروڑوں کا گھاٹا دے رہے ہو؟ تمہیں لگتا ہے میں یہ نقصان سہہ پاؤں گا؟'' وہ بری طرح تلخ ہو گئے۔ مجاہد خان بھائی کا طیش دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غاذان سمجھ گیا کہ اب اسے ساری وضاحت دینی ہے۔ وہ مصلحت سے آگے آیا۔

''بیٹھیں خان جی..... میں بتاتا ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا غاذان؟ تم جانتے ہو رستم گل لالہ کا ہے۔ ہم اسے شندور میں نہیں دے سکتے۔ تم نے کس سے پوچھ کے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا۔'' وہ برہمی سے پوچھ رہے تھے۔ غاذان پرسکون تھا۔

''آپ بیٹھیں تو خان جی۔ میں بتاتا ہوں۔''

''مجھے نہیں بیٹھنا۔ مجھے کھڑے کھڑے جواب دو۔''

''آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے؟'' اس نے ان کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھا۔ ''ہے ناں؟''

یوسف خان چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے گہری سانس نکالی اور جواب دیے بغیر صوفے پر بیٹھ گئے۔ بھائی کو دیکھتے ہوئے مجاہد خان بھی الجھا الجھا سا بیٹھ گیا۔

''میں نے جو کیا ہے۔ سوچ سمجھ کر کیا ہے اور ہم سب کے فائدے کے لیے کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ لوگ مجھ پر غصہ ہیں کہ میں نے آپ کو نہیں بتایا مگر سچ تو یہ ہے خان جی کہ مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کل سارا دن کالاش میں شاہ سردار کے ساتھ گزرا، پرسوں عبادہ کے ساتھ۔ خان جی (ایک تکلیف بھری نظر ان پہ ڈالی) سرداری کے لیے آپ کی مختص کردہ شرائط میری جان لے رہی ہیں۔ میں ایک ساتھ میں کئی جگہ ہاتھ پیر مار رہا ہوتا ہوں۔ کالاش کو سنبھالوں تو شندور میں مسائل آجاتے ہیں۔ ایون کو سنبھالوں تو چترال میں مسائل۔ ایک قبیلے کو راضی کروں تو دوسرا ناراض۔ دوسرے کو راضی کروں تو پہلا خفا۔ اس سب کے بیچ میں گھن چکر ہو گیا ہوں۔''

وہ بہت ضبط سے کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر کا برداشت اور صبر ختم ہو رہا تھا۔

''میں آپ کو خود بتانے آرہا تھا۔ ساری تفصیلات تسلی سے بتانا چاہتا تھا لیکن میں کئی مسئلوں میں گھرا ہوا ہوں۔ شندور میں چار دن رہ گئے ہیں۔ اس کے انتظامات کی وجہ سے میں ٹھیک سے سو نہیں پارہا۔ یاد نہیں پڑتا آخری دفعہ بے فکر اور پرسکون نیند کب سویا تھا۔ اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی فوجی ہوں جو راتوں کو پہرہ دیتا ہے یا پھر کسی ملک کا وہ نہتا وزیراعظم جس کے ملک پر دوسرا

ملک چڑھائے کرے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔'' وہ اپنی ہی حالت پر ہنس پڑا۔

یوسف خان کے چہرے پر چھایا اشتعال قدرے کم ہو گیا۔

اس نے گہری سانس لی۔ وہ کمزور نہیں تھا مگر یہ حالات اسے تھکا رہے تھے اور اگر جنگ کے میدان میں کوئی تھک جائے تو وہ..... مار دیا جاتا ہے۔ غازان کو مرنا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سب مشکلات پر لعنت بھیجی اور دونوں چچاؤں کے آگے اپنی تکلیفوں کا اشتہار لگانے کی بجائے وہ خود کو پرسکون کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے جو کیا ہے خان جی۔ اس کا مقصد چترال کو اور ہمارے قبیلے کو بدنامی سے بچانا ہے۔ رستم ایک ایسا پردہ ہے جس میں ہمارے سارے عیب اور ہماری ساری خامیاں چھپ جائیں گی۔ آپ نے دیکھا آج؟ کس طرح رستم کی بات سن کے کسی سردار نے چھ گھوڑوں کے متعلق نہیں پوچھا۔ کسی کے ذہن میں ''کیوں اور کس لیے'' جیسا سوال نہیں آیا۔ کسی نے نہیں کہا کہ رہنے دیں، چھ گھوڑے ٹھیک ہیں۔ سب نے خان جی آپ کو سراہا۔ آپ کی تعریف کی۔''

''مگر غازان رستم ہم نہیں دے سکتے۔ تم جانتے ہو۔'' وہ سختی سے بولے۔

''جانتا ہوں۔'' اس نے شانے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ ''مگر میں اس وقت رستم کو کسی اور طرح سے سوچ رہا ہوں۔''

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو ناسمجھی سے دیکھا۔

''کس طرح سے؟'' مجاہد الجھا۔

''چچا! اس دفعہ چترال کی ٹیم کا کپتان ابتہاج ہے۔ اگر ایسا ہو کہ آخری داؤ ابتہاج کھیل لے تو؟ اگر رستم ابتہاج کو مل گیا تو ہماری عزت بھی بچ جائے گی اور رستم بھی کہیں نہیں جائے گا۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''اور ابتہاج نے آخری داؤ نہیں کھیلا تو؟ یہ تو ایک خطرہ ہے۔ آخری داؤ تو کوئی بھی کھیل سکتا ہے۔'' یوسف خان بولا۔

''اور اگر کھلاڑیوں کو پتہ چلا کہ رستم انعام میں ملے گا تو کون ابتہاج کو آخری داؤ کھیلنے دے گا؟ کون اتنا بے وقوف ہوگا۔'' مجاہد نے بے پر کی سی اڑائی۔

''اور رستم کے بابت جان کر ہر کھلاڑی جان لگائے گا۔ مجھے فخر الدین نے بتایا کہ چھ گھوڑوں کے انعام کا سن کر اس دفعہ ان کے کھلاڑیوں نے سارا دن ساری رات مشقیں کی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ ابتہاج آخری داؤ کھیل پائے گا۔'' یوسف خان نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کھیلے گا تایا جان دونوں ٹیمیں اسے مجبور کریں گی ایسا کرنے کے لیے.....''

یوسف خان آگے ہوا۔ ''کیسے؟''

''ہم دونوں ٹیموں کو دھمکائیں گے۔ ان کو ڈرائیں گے کہ اگر کسی نے ابتہاج کو آخری داؤ نہ کھیلنے دیا تو وہ ہمارا کھلے عام دشمن ہوگا اور ہم جب چاہیں اس کی جان لے لیں۔''

یوسف خان کے تلوؤں سے لگی، سر میں بجھی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم غاذان۔ تم ہوش میں ہو؟'' وہ بری طرح برہم ہوئے۔

''چچا جان! ہم صرف دھمکائیں گے۔ چترال تو پہلے ہی آپ کے دبدبے کا شکار ہے۔ آپ نے بوڑھی گھوڑی کے سلسلے میں جیل کی کال کوٹھڑی میں ڈالے ان سات ملازموں کی وجہ سے آج تک چترال کے قبائل کا فرد فرد آپ کے نام سے خوف کھاتا ہے۔ ہماری ٹیم سے کوئی ایسی غداری نہیں کرے گا اور دھمکانے ڈرانے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ رہی بات گلگت کی تو وہ..... خود دیکھ لوں گا..... وہاں کا کوئی بھی کھلاڑی..... غداری نہیں کرے سکے گا۔'' وہ پر اعتماد تھا۔

''میں کیوں کسی کو ناحق ڈراؤں گا غاذان۔ وہ بیچارے بچے، گلگت سے بڑی چاؤ سے شندور

کھیلنے آئے ہیں، میں انہیں کیسے.....'' یکدم ان کا دل تڑپنے لگا۔

''خان جی! ہم حقیقت میں تھوڑی ہی نقصان پہنچائیں گے۔ ہم صرف ڈرائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا آپ کے ڈرانے کے بعد کوئی اپنی جان کا سودا کرے گا۔''

''نہیں .....نہیں.....'' وہ وہ مچلتے ہوئے پیچھے ہو گئے۔ ''ایسا نہیں کرو۔ بچے ڈر جائیں گے مجھ سے۔ انہوں نے بڑی محبت سے مشقیں کی ہیں، بڑی چاہت سے شندور کھیلنے آئے ہیں ہمارے ساتھ۔''

''اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو رستم چلا جائے گا اور اس کے بعد.....زیادہ مسائل بنیں گے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے باور کرایا۔ یوسف خان نے بیچارگی سے اسے دیکھا۔ رستم گلِ لالہ کا تھا۔ وہ گلِ لالہ کو علم میں لائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا رہے تھے۔ سرور خان نے یوسف خان کو ہدایت کی تھی کہ رستم صرف وصرف گل لالہ کا ہے کیوں کہ اس کی ماں بلوری کو کلیم اللہ لے کر آیا تھا۔ رستم پر کسی حویلی میں کسی کا حق نہیں۔ جہاں انہوں نے اپنے باپ کی ساری وصیتیں پوری کی تھیں، ان میں یہی رہ گئی تھی جسے وہ دستاری کے بعد پوری کرنا چاہتے تھے۔

''میرے خیال سے غاذان ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' مجاہد خان نے کچھ سوچتے ہوئے حمایت کی۔ یوسف خان نے سر پیچھے صوفے پر گرا دیا اور پیشانی کو انگلیوں سے مسلنے لگا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ غاذان ان کو یوں پریشان دیکھ کر آگے آیا اور صوفے کے کنارے پر جم گیا۔

''خان جی، ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ شندور میں چار دن رہ گئے ہیں۔ آج کھلاڑی بھی چلے گئے ہیں۔ شائقین، مہمان، انتظامیہ اور سیاح ہزاروں کی تعداد میں شندور پہنچ گئے ہیں۔ وہاں کے تمام انتظام مکمل ہیں۔ بڑی تعداد میں میڈیا اور دیگر صحافتی پلیٹ فارم سے تعلق رکھنے والے لوگ آ گئے ہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ ہم لوگ بھنور میں پھنسے ہوئے

ہیں۔میرے پاس ہم سب کو بچانے کا یہی واحد حل تھا جو میں نے آپ کو بتادیا۔'' وہ رسان سے بولتے ہوئے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

''اگر کسی نے موروثیت کا الزام لگا دیا تو؟'' انہوں نے پیشانی سے انگلیاں ہٹاتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔

''ابتہاج اچھا کھلاڑی ہے بھائی جان۔پچھلے سات سال سے وہ پولو کھیل رہا ہے۔وہ الگ بات ہے کہ شندور میں اسے موقع نہیں ملا لیکن ہمارے گراؤنڈ میں وہ ہر روز کھیلتا رہا ہے۔وہ گھڑ سواری اور پولو کا منجھا ہوا کھلاڑی ہے۔کوئی بھی اس کی قابلیت پر موروثیت کا شک نہیں کر پائے گا اور پھر یہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ہزاروں کیمروں کے سامنے۔سب لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔'' مجاہد خان کو تسلی تھی۔

''بالکل خان جی۔کوئی کیوں اس کی موروثیت پر شک کرے گا؟'' غاذان نے چمک کے ان کو دیکھا کہ شاید اب مان جائیں۔

''اور اگر کوئی ہماری دھمکی سے نہ ڈرا تو؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' غاذان نے سختی سے تردید کی۔'' آپ کو شاید اپنے رعب اور دبدبے پر یقین نہ ہو لیکن میں نے لوگوں کی نظروں میں آپ کا خوف اور آپ کا ڈر دیکھا ہے۔لوگ قطعی آپ کے خلاف نہیں جائیں گے اور نہ ہی آپ سے براہِ راست دشمنی مول لیں گے۔''

''نہیں غاذان۔ایسا نہیں ہے۔لوگوں میں سردار یوسف کی اب کوئی عزت نہیں ہے۔'' وہ دکھ سے بولے۔

''آپ کو پتہ ہے خان جی۔'' غاذان نے صوفے سے تھوڑا پیچھے کھسک کر خود کو ریلیکس کیا۔'' لوگوں کی چاہ حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔پہلا،محبت،دوسرا،تشدد۔اسی طرح کوئی بھی جنگ

جیتے کے دو قاعدے ہوتے ہیں۔اول، اپنی طاقت دشمن کے لشکر سے دُگنی کر دینا، دوم، دشمن کو اس کے کمزور پہلوؤں سے پکڑ لینا۔ میں نہیں جانتا یہ قول کس کا ہے مگر میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب سیاست میں الیکشن کے دن قریب آتے ہیں تو سیاسی لیڈر دو طرح ووٹ حاصل کرتے ہیں۔نمبر ایک، وہ رشوت دیتے ہیں، نمبر دو وہ اپنے کسی قریبی کو مروا کر لوگوں سے ہمدردی کا ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ہم اس وقت آخری حربہ آزمائیں گے۔"

کمرے میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"کیا کہا؟" یوسف خان کو سماعتوں پر گمان ہوا۔

"خان جی۔کل میں گل لالہ اور اس ڈاکٹر کو کالاش لے کر گیا تھا۔کالاش میں جمان چچا کے سوتیلے بیٹے کے لڑکے بہرام نے گلِ لالہ پر حملہ کیا ہے۔اس نے حملہ دراصل ڈاکٹر کا بیگ چھیننے کے لیے کیا تھا۔گل نے فطرت سے مجبور ہو کر مزاحمت کی، جس سے اس نے حملہ کرتے ہوئے گل کے کندھے پر کٹ لگا دیا۔میں نے تحقیقات کرائیں تو وہ صبح ہی پکڑا گیا ہے۔لوگوں نے بتایا کہ صرف ڈاکٹر کا ہی نہیں، اس بدمعاش نے کئی سیاحوں کو لوٹا ہے۔وہ نشئی ہے دن رات چرس پیتا ہے۔اپنی چرس کے لیے اب وہ یہ خطرناک کام کرنے لگا ہے۔کالاش کے لوگ اس پر نادم تھے اور ہمیں معلوم ہونے کے بعد اس کی سزا کے منتظر بھی ہیں۔"

وہ رسانیت سے کہتے ہوئے آگے ہوا اور ذرا دھونس سے بولا۔"خان جی.....آپ نے چترال میں ہر مجرم کو سزا دی ہے۔چاہے وہ جرگے سے ہو یا خود فیصلہ کر کے۔کل گل کے ساتھ جو ہوا، ہم اس کے بدلے بہرام کو تین جرائم کی سزا دیں گے۔(اس نے انگلیوں پر گننا شروع کیا) اول اس نے چوری کی، دوم، اس نے لڑکی پر حملہ کیا اور تیسرا (وہ ٹھہرا، آواز مدھم ہو گئی) اس نے گل پر حملہ کیا۔"

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' یوسف خان بری طرح برہم ہوا۔

''کیوں کہ ہر چیز کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ایک سیاسی لیڈر کی طرح سوچیں خان جی۔ ہم نے بہرام کو ویسے بھی سزا دینی ہے۔اگر ہم اسے ایسی سزا دیں کہ پورا چترال اور گلگت ڈر جائے تو میرا نہیں خیال کوئی ابتہاج کو آخری داؤ کھیلنے سے روکے گا۔'' وہ بڑی سمجھداری سے بولا تو مجاہد خان سر تسلیم خم کرتے ہوئے مسکرایا۔وہ تیس سال کا لڑکا واقعی بہت ذہین تھا۔اگر یوسف خان نے اسے سرداری کے لیے چنا تھا تو باخدا..... بالکل ٹھیک چنا تھا۔

یوسف خان کو کافی حد تک بات سمجھ آ گئی تھی اور امید کی حد تک وہ راضی بھی ہو گئے تھے۔

''رستم ہمارا آخری سہارا ہے خان جی۔آخری کسوٹی ہے۔اگر یہ ہاتھ سے گئی تو ہم بری طرح رسوا ہو جائیں گے۔سوچیں۔تحمل سے سوچیں اس بارے میں۔'' اس نے یوسف خان کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔وہ پھر سے پیشانی مسلنے لگے۔

''غاذان..... بہرام کہاں ہے؟'' مجاہد خان نے تلخی سے پوچھا۔

''ساجد خان کی تحویل میں ہے چچا۔میں نے اسے گرفتار کروا دیا ہے۔'' وہ تسلی سے بولا پھر یوسف خان کو دیکھا۔''اور خان جی۔ساجد خان آپ کے حکم کا منتظر ہے۔آپ حکم دیں تو وہ اپنا کام شروع کر دے۔''

''کل بلاؤ اسے جوسٹ میں۔تب تک میں اس مردود کی سزا کے بارے میں سوچتا ہوں۔'' وہ دانت پیس پیس کے بولے۔

''جی خان جی۔'' غاذان نے تائید سے سر ہلایا۔

''لیکن غاذان۔'' انہوں نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔''اس سارے منصوبے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔تم جانتے ہو یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ذرا سی اونچ نیچ ہوئی تو رستم بھی ہاتھ

سے جائے گا اور میں گل لالہ کے سامنے رسوا ہو کر رہ جاؤں گا۔ خان بابا کی وصیت کی عدم تکمیل مجھے قبر تک لے جائے گی۔ میں نے ان اٹھارہ سالوں میں بہت بوجھ اٹھائے ہیں۔ میں مزید کوئی بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا۔'' وہ تکان سے کہنے لگے۔ پھر سے دستار کا بوجھ بھاری ہو رہا تھا۔

''آپ فکر مت کریں خان جی۔ جس طرح میں نے باقی سب سنبھال لیا ہے اس طرح میں یہ معاملہ بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ مسکرایا اور اس پورے مکالمے میں یہ پہلی خفیف مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری تھی۔

یوسف خان نے سر ہلایا۔ انہیں تسلی نہیں ہوئی تھی، بس ایک کمزور سی امید بندھ گئی تھی۔ جس طرح سمندر میں ڈوبنے والا تنکے کو دیکھ کے مسکرانے لگتا ہے، اسی طرح یوسف خان بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ یہ امید ابتہاج سے نہیں تھی، یہ امید غاذان سے تھی۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے جس طرح اس نے معاملات سنبھالے تھے۔ ان کو خود کی حکمت عملیوں سے زیادہ غاذان کے منصوبوں پر بھروسہ ہو گیا تھا۔ اٹھارہ سال سے جو بوجھ وہ اٹھا رہے تھے، وہ بوجھ غاذان نے ڈیڑھ سال میں ان کے جھکے ہوئے کندھوں سے اتار لیے تھے۔ اب ان کے کندھے بھاری نہیں تھے، بس اٹھارہ سال سے لدے بوجھ کی وجہ سے ہمہ وقت درد کرتے رہتے تھے۔

''خان جی.....'' غاذان کہتے کہتے رکا۔ دونوں بھائیوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ پہلے والا مطمئن غاذان اب وہاں نہیں تھا۔ یوسف خان بے چینی سے آگے ہوا۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''شاہ سردار.....'' اس نے تھکی تھکی سی سانس نکالی۔ ''وہ نہیں مان رہے۔ میں نے بہت سمجھایا ہے۔ کل سارا دن میں وہاں رہا۔ شکار بازی میں، میں اسی وجہ سے شرکت نہیں کر سکا کہ شاہ سردار کو

منانے جانا تھا۔ میری اتنی منتوں، کوششوں اور ترلوں کے باوجود وہ نہیں مانے۔ یقین جانیے چچا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ میں دستاری سے دستبردار ہو جاؤں۔ نہیں چاہیے مجھے یہ عہدہ۔ اس قدر تضحیک، اس قدر مشکلات تو ڈاکٹر بننے والے بھی نہیں اٹھاتے جس قدر میں نے ان دو ماہ میں اٹھائی ہیں۔'' اس نے گہری سانس چھوڑ دی۔ آنکھیں بلاوجہ نم ہو رہی تھیں۔

''غاذان۔'' یوسف خان نے مچل کر اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالا۔ ''کسے فرق پڑتا ہے شاہ سردار کے آنے یا نہ آنے سے؟ چترال کی دستار کو نہیں پڑتا۔ وہ آئیں یا نہ آئیں، تمہاری دستاری ہوگی اور ضرور ہوگی۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ کونسا قبائلی سردار اسے متنازعہ بناتا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔

''مگر خان جی یہ سرداری کا اصول ہے۔ وہ نہیں آئے تو میری سردار قبول.....''

''تمہاری سرداری ضرور قبول ہوگی اور میں ان سے یہ سرداری.....قبول .....کروا کے ہی دم لوں گا۔'' وہ غاذان کی بات کاٹتے ہوئے دوٹوک لہجے میں بولے۔ غاذان نے ممنونیت سے انہیں دیکھا اور گھائل سا مسکرا دیا۔

''شاہ سردار ہمارا صبر آزما رہا ہے بھائی جان۔ ہم کب سے اسے نرمی اور محبت سے سمجھا رہے ہیں۔ وہ ہے کہ ضدی بچے کی طرح اڑا ہوا ہے۔'' مجاہد کرخنگی سے کہنے لگا۔

''وہ ہماری محبت اور ہماری نرمی کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے مجاہد۔ اسے لگتا ہے کہ شاید ہم مجبور ہیں۔ محتاج ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''میں صرف دستاری کا اس کا لحاظ کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ دستاری ہو جانے دو پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ کس طرح ہمارے لیے مشکلات بڑھاتا ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں کہ اسے سرداری سے برطرف کر لیں۔ جب آپ ہیں تو کالاش کو کسی نمبردار

کی کیا ضرورت۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا مجاہد۔ کالاش میرا حصہ ہے۔ اس کو ہر حال میں نمبردار چاہیے۔ خیر۔" وہ گفتگو ختم کرنے لگے۔ "تم غاذان یہ گھوڑوں والا معاملہ دیکھو۔ تمہاری دستاری والا معاملہ میں دیکھتا ہوں۔"

"جی خان جی۔" اس نے سر کو خم دیا۔

وہ جانتا تھا کہ ایک سردار کی مخالفت اس کی سرداری کو کچھ نہیں کرے گی لیکن وہ محبت اور مروت سے شاہ سردار کے پاس گیا تھا۔ ان کے دوٹوک انداز نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔

مجاہد خان نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔

"میں جوسٹ کی تیاری دیکھ لیتا ہوں۔ کل رات جشن ہے۔ کوئی کمی نہ رہ جائے۔" وہ فکرمندی سے کہتا کھڑا ہو گیا۔ غاذان بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا۔ "تم بیٹھو بیٹھو مت اٹھا کرو سب کے ساتھ۔" مجاہد اسے نرمی سے پچکارتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اس کے جاتے ہی غاذان یوسف خان کی طرف مڑا۔

"خان جی..... میں بھی چلتا ہوں۔" اس نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

یوسف خان اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "تم اپنے باپ سے کم کم کیوں مل رہے ہو غاذان؟" انہوں نے نرمی سے اسے لتاڑا۔ "اس نے جو کیا ہمارے ساتھ کیا۔ گل لالہ کے ساتھ کیا ہے۔ تمہارا تو وہ باپ ہے۔ تم تو کم از کم اس سے محبت سے ملو۔ عزت سے ملو۔ بہر حال وہ تمہاری دستاری کے لیے آیا ہے۔"

غاذان کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

"جی خان جی۔" کوئی بحث کیے بغیر اس نے تائید کی۔

☆.....☆.....☆

آج جوسٹ کی رقص و محفل کی رات تھی۔ یہ آخری تقریب تھی، اس کے بعد شندور تھا۔ حویلی

میں جوسٹ تقریب زنان خانے میں مردوں کے مقابلے زیادہ جوش وخروش سے منائی جاتی تھی۔ جہاں مردوں میں پے در پے مقابلوں کا رواج تھا، وہیں آج چترال اور گلگت کی خواتین کے مابین ٹپوں کا مقابلہ تھا۔ گل اسے ''چیلم جوسٹ، مٹن روسٹ'' کہتی تھی۔ بقول اس کے آج کی رات یہاں صرف روسٹ مٹن کھایا جاتا تھا۔

چیلم جوشی یا ''چیلم جوشٹ'' بہار کی آمد پہ کالاش اور مضافات میں منایا جانے والا ایک خوبصورت میلہ ہے۔ اس میں ثقافتی رقص ڈھول کی تھاپ پہ منعقد ہوتے ہیں جہاں لوگ جوق در جوق شرکت کے لیے دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں۔ سیاحوں کا ان دنوں بہت رش ہوتا ہے۔ ایک ہفتے تک وادی رقص وسرود اور موسیقی کی دھنوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس تہوار سے کئی رقص منسوب ہیں جن میں کالاشی خواتین کا رقص سرِ فہرست ہے۔ بعد اس کے جہاں بھی کالاشی رقص ہوتا ہے، اسے جوشی رقص سے منسوب کیا جاتا ہے۔

حویلی کے ہر حصے میں لگے برقی قمقمے جل اٹھے تھے۔ پھولوں کی لڑیوں کے ساتھ ساتھ جلتی روشنیوں کی مالاؤں نے ہر طرف روح کو پرسکون کرنے والی روشنی بکھیری ہوئی تھی۔ زنان خانے کا تہوار لان میں تھا جب کہ مردوں کا ان کی طرف والے لان میں۔ درمیان میں حویلی کے پچھواڑے کھانے اور مٹھائیاں بن رہی تھیں۔ چترال، ایون اور قریبی گاؤں کے ڈھیروں ڈھیر مہمان آئے ہوئے تھے۔ حویلی میں شادی کا سماں بندھا ہوا تھا۔

موسیقی والی لڑکیاں طبلے اور ستار بجا رہی تھیں۔ ان کے لیے لان میں مخصوص مسند بنائی گئی تھی۔ خواتین کے لیے گھاس پہ ایرانی نرم قالین بچھائی گئی تھی جس پہ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے جہاں مہمان خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔

گھر کی لڑکیاں، گاؤں کی ہم جولیاں، گلگت کی مٹیاریوں نے خوبصورت کپڑے زیب تن کر

لیے تھے۔ایک ساتھ کئی ثقافتوں کا ملاپ ہوا تھا جہاں گلگت کی انارکلی کے ساتھ چترالی پشواز کا جوڑ تھا جہاں کیلاشی سنہرے آنچل کے ساتھ ایون کے گوٹی شال مدمقابل تھی۔روشنی، رنگ، خوشبو اور خوشیاں ایک ساتھ آئی تھیں۔

عبادہ کے لیے گل نے کالاشی پشواز جسے ششت پیرن کہتے ہیں، نکالا تھا۔سیاہ رنگ کا بھاری گہرا انارکلی فراک جس پر نیلے رنگ کے بڑے بڑے پھول کھدے ہوئے تھے۔ان پھولوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے شیشے لگے تھے۔

گل کمرے میں بیڈ کی پائنتی پر تیار ہو کے بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے اپنی جیولری کا پورا باکس بیڈ پہ انڈیل رکھا تھا۔وہ عبادہ کے لیے کوئی مناسب سی جیولری دیکھ رہی تھی۔دروازہ کھلنے کی آواز پر سر اٹھا کے دیکھا تو سامنے عبادہ تولیے سے بال خشک کرتی ہوئی باہر آئی تھی۔

''واؤ.....'' گل کسی ٹرانس میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔''سو بیوٹی فل۔'' وہ مسکرائی، تولیہ ایک طرف رکھا اور دو قدم آگے آئی۔

''تھوڑا کھلا نہیں ہے یہ؟'' اس نے کمر کے پاس موجود کپڑے کو انگلیوں سے مخالف سمت کھینچا۔

''کالاشی لباس تنگ نہیں ہوتا عبادہ۔یہ کھلا ہی ہوتا ہے۔یہ دیکھو مجھ میں بھی کھلا ہے۔'' اس نے اپنی بانہیں کھول دیں۔اس کی آستین تو عبادہ سے بھی لمبی تھیں۔اس نے گہری سانس لی۔

''اب تم یہ باقی چیزیں بھی پہن لو پھر نیچے جائیں گے۔مٹھائی کھائیں اور میوزک سنیں گے۔اور ہاں۔مجھے تصویریں بھی بنانی تھیں تمہارے ساتھ۔''

گل نے بیڈ سے چیزیں اٹھائیں اور قریب آ گئی۔اس کے ہاتھ میں ایک بیلٹ نما پٹی تھی اور دوسرے ہاتھ میں حلیمہ سلطان والی ماتھا پٹی تھی۔دونوں کے رنگ اس کے جوڑے سے مل رہے تھے۔

عبادہ پشواز سنبھالتے ہوئے سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔اس کے نم بال موٹی موٹی لٹوں کی

صورت میں کندھوں پہ پڑے تھے۔گل نے چیزیں میز پر رکھیں پھر ڈرائیر اٹھایا اور اس کے بال سکھانے لگی۔اس وقت اسے اپنا آپ کسی دلہن سے کم نہیں لگ رہا تھا۔اگر احمد نے اسے ان کپڑوں میں دیکھا تو کئی مہینوں تک مذاق اڑاتا۔یہ بے حد کھلے، بھاری اور کامدار تھے جب کہ وہ ہمیشہ سادے اور ہلکے کپڑے پہنتی تھی۔

گل نے اس کے بال سکھا دیے پھر کنگھی کی مدد سے اس کے بالوں کی درمیان سے مانگ نکال کے دو چٹیا بنائیں۔دونوں چٹیوں کو جب اس نے اس کے دونوں کندھوں پہ آگے کو ڈالا تو عبادہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''سکول کی بچی لگ رہی ہوں میں.....''

''ویل یہ یہاں کا مقامی رواج ہے۔سب نے اسی طرح چٹیا بنائی ہوں گی۔''اس نے بے ساختہ گل کو دیکھا۔اس نے بھی بنائی تھیں۔

''میں اس طرح باہر جاؤں گی؟''عبادہ کو ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔

''ارے نہیں۔یہ ہے ناں۔''گل نے وہی کامدار بیلٹ اٹھایا جس پہ ایک ٹوپی سی بنی ہوئی تھی۔گل نے ٹوپی اس کے سر پہ سیٹ کی اور بلیٹ کو اس کے بالوں کے پیچھے رکھ دیا۔ٹوپی بے حد بھاری تھی۔اس ٹوپی پہ آگے عین ماتھے کے اوپر ایک بڑا سا نیلے رنگ کا پنکھ لگا ہوا تھا۔

کالاشی اس کو دوپٹے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

''اب دیکھو۔''گل نے اس کی ٹوپی میں چند پنیں لگائیں۔ٹوپی اس کے سر پہ ٹھہر گئی۔عبادہ کی آنکھیں خوشگوار حیرت سے کھل گئیں۔وہ بالکل کالاشی لگ رہی تھی۔گل نے اس کے گلے میں نیلی موتیوں کی بڑی سی مالا پہنائی جو کئی تہوں پر مشتمل تھی۔عبادہ کی گردن وزن سے جھک گئی۔مالائیں بھاری تھیں۔گل نے اسے ہلکا میک اپ کیا، کاجل لگایا۔

چند منٹ بعد وہ مکمل تیار ہوگئی تھی۔گل نے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

''تو مس لاہور کیسا لگا مس چترال بنتے ہوئے؟''

''بہت..... بہت..... بہت..... اچھا..... فیلز سو امیزنگ.....'' وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے مسحور کن انداز میں بولی۔

''چلیں اب؟'' گل نے پوچھا۔

''ہاں..... چلو.....'' وہ کھڑی ہوگئی۔

وہ دونوں اپنی اپنی پشوازیں سنبھالتی ہوئی نیچے آئیں، صحن میں بچے کلکلیاں ڈال رہے تھے۔ان میں ابراہیم اور ماد بھی تھے۔وہ چور پولیس کھیل رہے تھے۔ابراہیم پولیس والا بنا ہوا تھا۔اس نے ہاتھ میں نقلی بندوق اٹھائی ہوئی تھی۔

''گل..... گل.....'' بھاگتی ہوئی گل کو اس نے واپس کھینچا۔

''ہاں؟'' وہ چونکی۔

''ان بچوں کے ساتھ میری تصویر بناؤ۔بھائی کو دکھاؤں گی۔'' عبادہ نے اپنا فون نکال کے اسے پکڑایا اور خود صحن میں بچوں کے پاس آگئی۔اس نے جھک کے بچوں سے کچھ کہا، بچوں نے یکدم ہی اس کے گرد باڑ سی بنالی۔عبادہ نے ایک بچی کو گود میں اٹھایا، باقیوں کو آس پاس کھڑا کیا اور تصویریں اتاروائیں۔

تصویر کے بعد اس نے گود والی بچی کے گال چومے، پھر اسے نیچے اتارا اور گل کے پاس آئی۔

''لاؤ ایک تصویر ہم دونوں بھی لیتی ہیں۔'' اس نے گل کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور سیلفی لی پھر فون نیچے کر کے تصویر دیکھی۔

''احمد صاحب آپ کی ہونے والی بیوی دیکھ لی ہے میں نے چترال میں۔اب آپ کو پتہ چلے

گا کہ بیوی کہتے کسے ہیں۔'' وہ ہونٹ دبا کے دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ گل کو پتہ ہی نہیں چلا۔

آسمان سے تارے سمٹ گئے تھے۔ سیاہ اندھیرے میں دور پہاڑوں پر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ تیز ہوا سے لان میں موجود اعزازی اشیاء اڑ رہی تھیں۔ قالینوں پہ بیٹھی مہمان خواتین راگ الاپنے والی لڑکی کو داد دے رہی تھیں۔ وہ دونوں چلتے باہر آئیں تو موسیقی کی دھنیں کانوں میں پڑیں۔ گیت گانے والی لڑکی نیا راگ چھیڑ رہی تھی۔

عبادہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ جگہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ وہ محوی قدم لیتی آگے آئی۔ اس کی منڈی چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لاہور کی گلیوں میں چاند رات اتر آئی ہو۔ کالاشی لڑکیاں گول دائرے میں پیروں سے پیر ملا کے تھرک رہی تھیں۔ وہ کبھی بائیں اور کبھی دایاں پیر فٹ بال کو کک کرنے والے انداز میں آگے کرتیں، تھرکتیں پھر پیچھے ہو جاتیں۔ اس نے فوراً اپنا فون نکالا۔

''تم ان کی ویڈیو مت بنانا۔ یہ لوگ برا مان جاتے ہیں۔'' گل نے جلدی سے اسے ٹوکا۔

''اوہ.....'' اس نے خجالت سے فوراً فون نیچے کیا۔

''ویسے.....تم میری تصویریں لے سکتی ہو۔'' گل نے آنکھ میچ کے کہا۔ عبادہ مسکرائی۔

ریشم یہیں موجود تھی۔ ہمیشہ کی طرح کام میں جتی ہوئی۔ اس کا پشواز زرد اور سیاہ تھا۔ اس کے سر پہ ٹوپی بھی زرد تھی۔ وہ ہاتھوں میں پرات لے کے مہمانوں کو زعفرانی شربت دے رہی تھی۔ وہ دونوں سیدھا عالیہ بیگم کے سامنے رکھے جہازی سائز کشن پر بیٹھ گئیں۔ عالیہ بیگم ٹیک لگائے، ران پہ انگلیاں بجاتے ہوئے سامنے مسند پر بیٹھی ایک چترال اور دوسری گلگت کی لڑکی کو داد دے رہی تھیں، اسے آتا دیکھ کے تکلف سے مسکرائی۔ گل نے نظریں پھیر لیں۔

مسند پر بیٹھی لڑکیاں ایک دوسرے سے ٹپوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ٹپے مقامی زبان میں

تھے۔عبادہ کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے مگر میوزک اچھا تھا۔طبلہ، رباب اور لڑکیوں کی آواز بہت اچھا ساز بنا رہی تھی۔

گلگت کی لڑکی نے ایک لمبا سُر کھینچا۔محفل میں تالیوں اور واہ واہ کی آوازیں گونج گونج گئیں۔ عبادہ نے چونک کے سب کو دیکھا، وہ ایسے اچھل رہے تھے جیسے ریسلنگ میں ایک فریق نے دوسرے کو پچھاڑ دیا ہو۔

''پتہ ہے اس لڑکی نے ابھی کیا کہا ہے؟'' گل نے اس کے کان کے قریب جھک کے سرگوشی کی۔

''کیا؟''

''آج سے بیس سال پہلے گلگت کے بڑے سردار نے جب اپنے بیٹے کو دستار پہنائی تو جیسے ہی وہ کرسی سے کھڑا ہوا، دستار لڑھک کے نیچے گر گئی۔دو منٹ پہلے پہنائی تھی۔دو منٹ بعد گر گئی۔'' وہ تالی پہ تالی مار کے زور زور سے ہنسنے لگی۔''اس لڑکی نے وہی یاد دلایا ہے۔کہہ رہی ہے پگڑی نہیں سنبھلی راجے سے، پورا بلتستان سنبھالنے چلا تھا۔''

عبادہ کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔تو وہ سب یہاں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ رہے تھے۔ ثقافتوں کا یہ ذائقہ اس نے پہلی بار چکھا تھا۔اکثر شادیوں پر لڑکے اور لڑکی والے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں مگر یہاں دو قبیلے ایک دوسرے کو اس کی غلطیاں اور کوتاہیاں یاد دلا رہے تھے۔یہ کسی قسم کا طنز نہیں تھا۔کسی قسم کی دل آزاری نہیں تھی۔بلکہ یہ ایک مزاحیہ پہلو تھا۔اس میں ایک فریق دوسرے سے ناراض نہیں ہوتا تھا بلکہ کھلے دل سے دوسرے کی ایسی پول کھولتا کہ ساری محفل چھنچھنا اٹھتی اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے ہر کارنامے کو دو سطروں میں سمیٹ کے اس کا ٹپہ بنا دیا تھا۔چند لفظوں سے اہلِ محفل کو ساری کہانی یاد آجاتی تھی۔اس میں دنوں یا سالوں کا فرق نہیں تھا۔یہ صدیوں کی کوتاہیوں کو بھی دُہرا رہے تھے۔

گل اسے ہر ٹپے کا ترجمہ کر کے دے رہی تھی۔ وہ ترجمے سے ہی اتنی لطف اندوز ہوگئی تھی کہ پیٹ میں درد اٹھنے لگا تھا۔ گلگت اور چترال کے لوگوں کے پاس بہت مزاحیہ کہانیاں تھیں۔ جو لڑکی گلگت کی دھلائی کر رہی تھی، وہ کافی ماہر لگ رہی تھی۔ گلگتی لڑکی ٹپے کے بعد فوراً اپنا ٹپہ پڑھتی اور یوں گلگت کی لڑکی کو باری نہیں دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس نے بلتی قبیلے کی جدی پشتی روایات رٹ رکھی ہیں۔

کچھ دیر گزری جب چترل بازی لے گیا۔ گلگت کی لڑکی نے چترالی لڑکی کو چھ ٹپوں کا جواب نہیں دیا تھا اور یوں چترال چھ ٹپوں سے جیت گیا تھا۔ اسی لمحے عالیہ بیگم ماتھے پر بال ڈالے اپنی شال سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئیں۔ ان کے ادب میں سب ہی اٹھ گئے۔ پیچھے لمبے سے عرشے میں کالاشی رقص چل رہا تھا۔ درمیان میں آگ کا الاؤ سلگ رہا تھا۔ شعلے چنگاریاں چھوڑتے ہوئے ہوا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ عالیہ گودائی کو اپنی ہار ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ الاؤ کے پاس گئی اور تھرکتی لڑکیوں کو روکا۔ سب ٹھہر گئیں اور چونکتے ہوئے انہیں دیکھنے لگیں۔

''میں یہ ہار تسلیم نہیں کرتی۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولیں۔ محفل یکدم خاموش ہوگئی۔

''میرے گلگت کے اتنے کارنامے نہیں، جتنے چترال کے ہیں مگر میں نے ظرف بڑا کیا اور وہ پول نہیں کھولے جو اگر میں کھولتی تو یہ بازی بھی میری تھی اور وہ بازی بھی میری ہوتی۔'' وہ بولیں تو چاروں طرف کھڑے مجمع میں بے چینی دوڑ گئی۔

چترالیوں کے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ مانا کہ ان کے کارنامے بڑے تھے لیکن ان پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس محفل کا مقصد کسی کی عزت پامال کر کے اسے رسوا کرنا نہیں تھا بلکہ وہ کوتاہیاں جو سب کے سامنے کم عقلی یا لاشعوری طور پر ہوئی تھیں، ان کی یاد تازہ کرنا تھا۔ یہ ایک مزاحیہ محفل کے سوا کچھ نہیں تھا مگر عالیہ نے شاید سنجیدگی سے سارے ٹپے لے لیے تھے۔ بی جان نے ان کی بات

سن کر زہر کا گھونٹ پیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ میری لڑکیوں کے ساتھ رقص میں مقابلہ کیا جائے۔ جو تھک کر گری، وہی قبیلہ ہارا ہوا مانا جائے گا۔ خرسندہ بی (بی جان) کیا آپ کی لڑکیوں میں اتنی طاقت ہے کہ میری لڑکیوں سے رقص میں جیت سکیں؟'' انہوں نے کسی لیڈر کی طرح کہتے ہوئے انہیں للکارا۔ بی جان خاموش ہوگئیں۔ ہر سال یہی مقابلے ہوتے تھے۔ رقص کا مقابلہ کبھی بھی نہیں ہوا تھا اور بی جان کی لڑکیوں کو تھرکنا نہیں آتا تھا، جو لڑکیاں تھرک رہی تھیں۔ وہ کالاشی تھیں۔ قبیلے کا حصہ نہیں تھیں۔ انہوں نے آس پاس کھڑی لڑکیوں کو دیکھا جو ایک ایک قدم پیچھے ہوگئی تھیں۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے خرسندہ بی۔ کیا آپ کی لڑکیاں میری لڑکیوں سے مقابلہ کریں گی؟'' ان کی لڑکیاں ایک دم ہی سامنے آگئی تھیں جیسے چترالیوں کو للکار رہی ہوں۔ گل اور عبادہ پیچھے تذبذب سے کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ عالیہ گودائی کی نیم شکل انہیں نظر آرہی تھی۔

''میری لڑکیاں تھرکتی نہیں ہیں عالیہ گودائی۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اچھا؟ میں نے تو سنا ہے جس کو اپنا ثقافتی رقص نہیں آتا، وہ خود کو کسی نسل سے منسوب نہیں کر سکتا۔'' عالیہ نے ٹونٹ کیا۔

''نسل یا خاندان سے محض تھرک کی بنیاد پر صرف میراثی منسلک ہوتے ہیں۔ کھوواری نہیں۔''

''باتیں اچھی کر لیتی ہیں بی جان آپ لیکن ہمیں اس وقت دونوں قبائل کا فیصلہ کرنا ہے۔ آپ اپنی لڑکیاں آگے لائیں، نہیں تو یہ جیت ہماری ہوئی۔'' انہوں نے کھلا چیلنج رکھا۔ بی جان نے موٹی چچی کو دیکھا جنہوں نے پلوشے کو اندر بھیج دیا تھا پھر انہوں نے بریخنہ کو دیکھا جس کی بیٹیاں پلوؤں سے منہ چھپا رہی تھیں۔ نیز کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ گل کے قبیلے پر سوال اٹھا تو وہ تیزی سے آگے گئی۔

''میری لڑکیوں کو رقص.....''

''آتا ہے اور بہت اچھے سے آتا ہے۔'' گل نے درشتی سے ان کی بات کاٹی۔اس کے سامنے سے یکدم بھیڑ ہٹی، راستہ بنا، وہ اپنے آنچل کو کمر میں کراس میں باندھ کے آگے آئی۔'' کہیے عالیہ صاحبہ کس کے ساتھ تھرکنا ہے؟ میں تیار ہوں۔''

عالیہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔''میں نے لڑکی نہیں.....لڑکیاں کہا ہے۔''

''پہلے مجھ سے تو جیت جائیں۔آپ کی.....لڑ.....کی.....یاں.....بھی آجائیں گی۔'' وہ جوش سے کہتی کالاشی لڑکیوں کے پاس گئی۔''پیچھے ہٹو۔پیچھے ہٹو۔جگہ بناؤ، مقابلہ ہونے والا ہے۔'' لڑکیاں تیزی سے پیچھے چلی گئیں۔جگہ خالی ہوگئی۔میدان تیار ہوگیا۔عبادہ ہونٹ کاٹ کے دلچسپی سے گل کو دیکھنے لگی۔(اسے بھی رقص آتا ہے؟)

بی جان فخر سے مسکرائیں اور پشت پہ سردارنی کی طرح ہاتھ باندھ کے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ان کے دائیں بائیں موٹی چچی اور بریخنہ کھڑی تھیں۔گل کے ساتھ چھ لڑکیاں تھیں اور وہ اکیلی تھی۔رقص ایسا تھا کہ طبلے کی تھاپ اور سازندے کی ساز پر اعضاء ایک جیسے تھرکنے تھے۔ہاتھوں اور پیروں میں ایسی لچک اور بناوٹ ہونی چاہیے تھی یہ وہاں ''ڈم'' نکلے تو یہاں پیر بھی ''ڈمڈمائیں۔''

عالیہ گل کو دیکھ کے کھٹک کا شکار ہوگئی تھی۔اگر وہ لڑکی اکیلی میدان میں قبیلے کی عزت رکھنے کے لیے آئی تھی تو وہ ہار کے ہرگز جانے والی نہیں تھی۔ان کی لڑکیاں مشاق تھیں۔پھرتیلی تھیں اور کئی ساعتوں تک رقص کرسکتی تھیں لیکن وہ گھڑسوار تھی۔وہ فٹ اور صحت مند تھی۔اس کا تھک کے گرنا مشکل تھا۔

آگ کا الاؤ ہوا سے بھڑک اٹھا۔

اس کے عقب میں گل آگے اور چھ لڑکیاں پیچھے تھیں۔وہ پرسکون تھی۔چہرے پر اعتماد اور یلغار

نظر آ رہا تھا۔ پیچھے لڑکیاں بھی اسے Taugh time دینے والی تھیں۔ یکدم طبلے کی تھاپ پڑی اور ساتوں سنہری پشواز والی لڑکیاں تھرکنے لگیں۔ گل غیرت ناہید تھی۔ اس کے اعضاء کے زاویے اور پیمائشیں لڑکیوں پر بھاری پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ٹھساٹھس کے بموجب کبھی نہیں جیتنا تھا۔ وہ تب جیت سکتی تھی جب پیچھے والی کو ہرا دیتی۔

یہ تو گل بھی جانتی تھی اسے تھرکنا برائے نام آتا ہے۔ وہ ان نچ بلی لڑکیوں سے نہیں جیت سکتی جو اتنی مشقیں کر کے آئی ہیں اور سرِ میدان ان کو یوں چیلنج کیا ہے۔ مگر وہ ایک داؤ جانتی تھی، خود کے جیتنے کا نہیں، دوسروں کے ہرانے کا۔ اس نے تھرکتے تھرکتے قدم پیچھے پیچھے لینا شروع کر دیے۔ لڑکیاں جو پیچھے تھرک رہی تھیں، وہ مجمع میں تھیں۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھا تو پیچھے ہو گئیں۔ گل نے ان کے درمیان والی جگہ پکڑ لی۔ بظاہر تو وہ تھرک رہی تھی لیکن اس کے خرافاتی دماغ میں کچھ چل رہا تھا۔ طبلچی اور سازندے نے جب زور زور سے ساز نکالنے شروع کیے تو گل ایڑیوں پہ گول گول گھومنے لگی۔ گھڑ سواری نے اس کے دماغ کو اتنا چکرا دیا تھا کہ وہ گھومنے سے چکراتی نہیں تھی۔

اس نے بانہیں کھول دیں۔ اس کے لمبے اور مضبوط ہاتھ جب یکدم سے ساتھ کھڑی لڑکیوں کی کمروں، بازوؤں، سروں اور پیٹوں میں لگے، وہ کرب سے چیخنے لگیں۔ گل جہاز کے پنکھوں کی طرح گول گول گھوم رہی تھی۔ لڑکیاں جان بچانے کے لیے ادھر ادھر ہو رہی تھیں۔

عبادہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی دبائی۔ عالیہ منہ کھولے صدمے سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ گل نے بانہیں نہیں سمیٹیں، وہ دھڑا دھڑ لڑکیوں کو مار رہی تھی۔ کئی بار بند مٹھیوں کے گھونسے پڑے تو وہ خود بہ خود ہار مان کے میدان چھوڑ گئیں۔

گل گھومتی رہی، طبلہ بجتا رہا، ساز نکلتا رہا اور جیسے ہی طبلہ رکا، وہ ٹھہری اور آرام سے زمین پر بیٹھ گئی۔ یہ تھرک ختم کرنے کا انداز تھا۔ اس نے سر جھکایا، ادب سے پھر مسکرا کر اٹھایا۔ سامنے دیکھا

تو لڑکیاں اپنے بازو، سر اور کمر پکڑ کر کراہ رہی تھیں۔

وہ چونک کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے یہاں وہاں دیکھا۔ میدان میں کوئی بھی نہیں تھا۔

''کیا ہوا؟ کہاں گئیں آپ کی.....لڑ.....کی.....یا.....ں؟'' گل نے عالیہ گودائی کو دیکھا جو ایک لڑکی کی کمر سہلا رہی تھی۔ وہ گل کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ بی جان ذرا فاتحانہ انداز میں نیچے آئیں اور عالیہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

''معاف کرنا عالیہ میں نے کہا تھا میری لڑکیوں کو تھرکنا نہیں آتا۔''

''تو تھرکنا سکھائیں ناں۔'' وہ دانت پیس کے بولیں۔

''آئندہ سکھا دوں گی۔ پہلے اس مقابلہ کا فیصلہ کر لیں۔'' بی جان نہایت خیر خواہی سے بولیں۔

''ہارے ہو تم لوگ۔ سب ہارے ہو۔'' عالیہ جل جل کے کہہ رہی تھیں۔ چترال کی لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ گل نے برا سا منہ بنایا۔

''کیوں ہارے ہیں؟ اتنا اچھا سا ڈانس تو کیا ہے ہم نے.....''

''اسے ڈانس کہتے ہیں؟ یہ ڈانس تھا؟''

''میرا ڈانس تو ایسا ہی ہے۔'' اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

''اسے ڈانس نہیں کہتے، اسے سونامی کہتے ہیں۔ جا کے پہلے ڈانس کے مفہوم سیکھ کے آؤ۔'' وہ بہت غصہ تھیں۔ گل نے دانت نکالے۔

''آپ ہار گئی ہیں۔ ہم جیت گئے ہیں۔ وی وان۔ چترال زندہ باد۔ کھووار زندہ باد۔'' وہ ان کے سینے پر سانپ لوٹاتی لان کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور پیروں سے چپل نکالے۔

''تم ہاری ہو۔ نعرے بازی مت کرو۔ تم سب ہارے ہو۔ آئندہ بھی ہارو گے۔ ہم تمہیں شندور میں ہرائیں گے۔ سمجھے تم لوگ۔'' عالیہ بہت کرخت ہو رہی تھی۔ خود بی جان بھی یہ معاملہ سمجھنے سے

قاصر تھیں۔آخران کو ہوا کیا تھا۔

''آپ ہار تسلیم کرلیں عالیہ گودائی۔آپ کو تسلی ہو جائے گی۔''

''ہم نہیں ہارے۔تم نے بے ایمانی کی ہے۔''

''ہاہائیں۔الزام لگا رہی ہیں مجھ پہ۔'' گل نے صدمے سے دیکھا۔''آپ کی چھ لڑکیوں پہ میں، اکیلی بھاری ثابت ہوئی ہوں۔''

''تم ہاری ہو، تمہارا قبیلہ ہارا ہے۔تم سب ہارے ہو۔آئندہ بھی ہارو گے۔تمہیں ہم شندور میں ناکوں چنے چبوائیں گے اور تمہارے وہ چھ گھوڑے ہماری ٹیم جیتے گی۔وہ سارے ہم لے کر جائیں گے۔دیکھ لینا۔'' وہ بری طرح گرج رہی تھیں۔گل نے سر جھٹک دیا۔(ہار برداشت نہیں ہو رہی تھی محترمہ کو۔ہونہہ)

''کیا ہوا گل۔کیا کہہ رہی ہیں؟'' عبادہ الجھے ہوئے انداز میں اس کے ساتھ آ بیٹھی۔گل اپنے تلوے دبا رہی تھی۔اس کے پیروں میں درد ہو رہا تھا۔

''کچھ خاص نہیں۔ہار ہضم نہیں ہو رہی تو دھمکیاں دے رہی ہیں۔''

''دھمکیاں؟ کیسی دھمکیاں؟ کہیں تمہیں کچھ کر.....''

''ارے نہیں.....اب ان کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' گل نے نرمی سے اسے ٹوکا۔''کہہ رہی ہیں کہ شندور کے وہ چھ انعامی گھوڑے جن میں دو مر چکے ہیں، وہ موصوفہ کی ٹیم جیت کر لے جائے گی۔ہماری چترال کی ٹیم کو کچھ نہیں ملے گا۔اب اس کو کوئی سمجھائے کہ وہ بیچارے گھوڑے پرلوک سدھا چکے ہیں۔اللہ ان کی روحوں کو اجر عظیم عطا کرے۔''

عبادہ بری طرح ٹھٹک گئی۔''انعامی گھوڑے؟''

''یار.....خان جی نے وہ چھ گھوڑے شندور کے لیے وقف کیے تھے۔اس دفعہ جیتے والی ٹیم کے

چھ کھلاڑیوں کو وہ گھوڑے ملنا تھے لیکن وہ تو بیمار ہو گئے ہیں۔ان کو نہیں پتہ اور شش.....تم نے بتانا بھی نہیں ہے۔ہماری بدنامی ہو جائے گی۔''اس نے نرمی سے پچکارا۔

تو وہ شندور کے گھوڑے تھے۔کوئی عام گھوڑے نہیں تھے۔غاذان نے تو اسے اس بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کانٹریکٹ میں ایسا کچھ لکھا تھا۔اسے تو بتایا گیا تھا کہ وہ اصطبل کے گھوڑے ہیں۔وہ بھی انہیں چند گھوڑے شمار کر رہی تھی۔وہ خاص شندور کے گھوڑے ہوں گے یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ایک لمحے کے لیے وہ بری طرح الجھ گئی۔

بی جان نے عالیہ کو پرسکون کر لیا تھا۔وہ اب مسکرا رہی تھیں۔یہ مسکراہٹ جعلی تھی یا اصلی،اسے نہیں پتہ تھا مگر ان کے نقش بتا رہے تھے کہ وہ پرسکون ہو گئی ہیں۔لان کا ہنگامہ ختم ہو گیا تھا۔تھوڑی دیر پہلے چھائی افراتفری اور شور تھم گیا تھا۔طبلچی اور سازندنیں بھی سستانے لگی تھیں۔

گل اب جھک کر اپنے ہاتھ دبا رہی تھی۔عبادہ نے غیر ارادی طور پر اسے دیکھا۔

''یہ کیا کیا ہے تم نے؟تم اتنی اکڑ کے گئی،مجھے لگا تمہیں واقعی ناچنا آتا ہو گا۔''اسے افسوس ہوا۔

''ناچنا اور مجھے؟پاگل ہو گیا۔میری دادی،ان کی دادی اور ان کی دادی کو بھی نہیں آتا۔یہ اٹن ،بھنگڑے مردوں کے شوق ہیں۔ہمارے نہیں۔''وہ جھک کر اب اپنے جوتے پہن رہی تھی۔

''تم واقعی میسنی ہو۔''عبادہ نے اسے چپت رسید کی۔وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔ریشم اب کسی فرماں بردار خادمہ کی طرح ناچنے والی لڑکیوں کو ہمدردی سے شربت کے گلاس پیش کر رہی تھی۔ساتھ ہی وہ پرسکون بیٹھی گل کو بھی گھوری سی نوازتی۔لڑکیوں کو واقعی بہت زور کی چوٹ لگی تھی۔گل نے بے ایمانی کی تھی جو یقیناً غلط بات تھی لیکن وہ گل تھی۔

''میں کسی کو جوابدہ نہیں ہوں۔''والی کھڑوس،اکڑو اور بدتمیز لڑکی تھی۔گل نے چپل پہنی اور کھڑی ہو گئی۔

''چلو اندر چلتے ہیں۔ کچھ کھا لیتے ہیں۔'' اس نے اٹھتے ہی عبادہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عبادہ نے ہاتھ دیا اور کھڑی ہوگئی۔ حویلی کے اندر آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مٹن روسٹ کا وقت ہوا چلا ہے۔ مہمانوں کے لیے بروسٹ پر بروسٹ لائے جا رہے تھے۔

وہ راہداری میں آگے بڑھ رہی تھیں جب سامنے سے گول پلیٹ پر سبز پتیوں کے بیچ ایک بروسٹ پیس سجا کر لاتے ہوئے پلوشہ کو دیکھا۔ وہ سہج سہج کر چل رہی تھی جیسے ہاتھ میں خدانخواستہ پلیٹ نہیں کوہِ نور پکڑا ہوا۔ پلیٹ کے اوپر جالی دار رومال کی چھت سی بنی ہوئی تھی۔ رومال بروسٹ کو چھو نہیں رہا تھا۔

وہ قدم قدم قریب آئی تو گل نے یکدم سے روک لیا۔

''کہاں جا رہی ہو میری پلوشی؟'' اس نے قدرلاڈ سے پوچھا۔

''سامنے سے ہٹو۔ عالیہ بیگم کو بروسٹ دینے جا رہی ہوں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ گل نے ذرا جھانک کے پلیٹ میں دیکھا جس میں بکرے کی کمر کی وہ ہڈی رکھی ہوئی تھی جو ذائقے میں ہر گوشت پر بھاری تھی۔ یعنی مس عالیہ کے لیے اب کھانے بھی اعلیٰ تھے۔ موٹی چچی صاحبہ اب ان کی پیٹ پوجا کر کے انہیں راضی کر رہی تھیں۔

انٹرسٹنگ۔

یکدم اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے پلیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''ایسا کرو پلوشی۔ یہ مجھے دے دو۔ میں دے آتی ہوں۔ تم جا کے دوسری پلیٹ لے آؤ۔''

''کیوں؟ میں جا رہی ہوں ناں۔'' وہ بھڑک اٹھی۔ گل نے ہاتھ پیچھے کیے پھر بے جا ہمدردی سے پلوشہ کے کندھے پر ہاتھ حمائل کر دیے۔

''پلوشی کیا تم نہیں چاہتی میرے اور عالیہ گودائی کے درمیان جو یہ دشمنی کی دیوار ہے یہ ختم ہو جائے؟'' اس نے پلوشہ کو گھیرنا شروع کیا۔ ''کیا تم نہیں چاہتیں ہم دونوں ٹھیک ہو جائیں؟ ہنس

خوشی رہیں؟"

"چاہتی ہوں۔" وہ خیر خواہی سے بولی۔

"پھر یہ مجھے دو۔ میں دے آتی ہوں۔ جب میں دینے جاؤں گی ناں تو وہ بہت خوش ہو جائیں گی۔ دیکھ لینا۔" اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔ پلوشہ نے مسکراتے ہوئے پکڑا دی اور مڑ گئی۔ وہ جیسے دونوں کے درمیان صلح کروانے پر بڑی خوش ہوئی تھی۔ گل نے اس کے جانے کا انتظار کیا۔ وہ جیسے ہی اوجھل ہوئی، اس نے عبادہ کا ہاتھ پکڑا، ایک راہداری مڑی، علیحدہ سے ایک کمرے میں آئی، دروازہ بند کیا، پلیٹ میز پر رکھی اور سیدھی ہوئی۔

عبادہ اسے گھبرا گئی۔

"ادھر ہی رہو۔ میں دو منٹ میں آئی۔" کہتے ہی وہ باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ عبادہ جز بز کھڑی رہ گئی۔ پورے دو منٹ بعد وہ واقعی آ گئی مگر خالی ہاتھ نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ وہ میز کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھی اور پیکٹ دانتوں سے کھولا۔ اندر موجود سفوف کو ہتھیلی پر انڈیلا اور نرمی سے پلیٹ سے کپڑا ہٹایا۔ اب نفاست سے چٹکی سے وہ چورن بروسٹ پر چھڑک رہی تھی۔

"یہ..... کیا..... ہے..... گل؟" عبادہ جانتی تھی کہ وہ کوئی خطرناک کام کر رہی ہے، اس لیے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"عالیہ گودائی کا غصہ ٹھنڈا کر رہی ہوں۔" وہ مطمئن سے بولی۔

"مطلب؟"

"انہیں سب سے معزز اور قیمتی بروسٹ دیا جا رہا ہے لیکن یونو وہاٹ عبادہ....." اس نے مظلوم سی نظر اٹھائی۔ "اس کو کھانے کے بعد ان کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔ چھی۔ افسوس۔"

"تم..... نے..... تم....." عبادہ سٹپٹا گئی۔

''ہاں میں نے ایکسٹرا ہاضمے کا چورن چھڑکا ہے اس کے اوپر۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی پھر اس نے پیکٹ مٹھی میں دبایا، کپڑا واپس رکھا اور کھڑی ہوگئی۔

''چلو ان کو دے آئیں۔'' وہ کہتے ہی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ عبادہ ضبط سے اس کے پیچھے آئی۔ راہداری واپس مڑنے پر، لان والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے ریشم کو دیکھا جو خالی ٹرے لیے واپس آرہی تھی۔ لابی میں آمنے سامنے ہونے پر ریشم ٹھٹک گئی۔ گل برا سا منہ بنا کر اس کی طرف بڑھی۔

''یہ لو پکڑلو۔'' اس نے واجبی غصے سے پلیٹ اس کی ٹرے میں پٹخی۔

''یہ کیا ہے گل؟'' ریشم چونک گئی۔

''عالیہ گودائی کا بروسٹ پیس ہے۔ جا کے ان کو دے کے آؤ۔'' وہ غصے سے کہتی پلٹ گئی لیکن ایک قدم پیچھے لیا پھر واپس مڑی۔ ''اور ہاں۔ اپنی ساس سے کہو آئندہ مجھے ان کی خدمت کرنے کے لیے کوئی کام نہ کہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے ان کی خاطر داری کرنے کا۔ چلو عبادہ۔''

اور عبادہ ہکا بکا سی اس کے ساتھ چل پڑی۔ ریشم نے الجھتے ہوئے پلیٹ کو دیکھا پھر گہری سانس لی اور لان کی طرف بڑھ گئی۔ راہداری میں کچن کی طرف بڑھتے ہوئے عبادہ یکدم رکی، اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے سامنے آگئی۔ اس کے چہرے پر تعجب ہی تعجب تھا۔

''تم واقعی میسنی ہو۔'' وہ جیسے اب تسلیم کر رہی تھی۔

''شکریہ۔'' وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔

عبادہ نے بے اختیار سر کو نفی میں ہلایا۔ اس لڑکی کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ لاعلاج مرض تھی، لاعلاج!

☆.....☆.....☆

تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو وہ دونوں تھکی تھکی کمرے میں آ گئی تھیں۔اس وقت گل بیڈ پر بیٹھ کے اپنی جیولری اتار رہی تھی جب کہ عبادہ آئینے کے سامنے بیٹھ کے سر پہ لگی ان گنت پنیں نکال رہی تھی۔ایسا کرنے سے اس کے بال بری طرح الجھ رہے تھے۔

وہ گھوڑوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔اگر وہ شندور کے گھوڑے تھے تو ان کو بیک وقت کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر بیک وقت ہوا بھی تھا تو کسی نے بھی نوٹس نہیں کیا کہ یہ اتفاق سے زیادہ ''انتخاب'' ہوسکتا ہے۔کسی کی سوچی سمجھی سازش ہوسکتی ہے؟اگر وہ اصطبل کے عام گھوڑے ہوتے تو کسی پر شبہ نہ کرنا بجا تھا لیکن ایک ساتھ جب خاص گھوڑے بیمار ہوئے تو کسی نہ کسی کو تنقیدی نظروں سے تجزیہ کرنا چاہیے تھا۔

پیچھے آئینے میں گل کا عکس نظر آ رہا تھا جو سب کچھ اتار چکی تھی،اب جیولری سمیٹ کر باکس میں ڈال رہی تھی۔

''گل ایک بات بتاؤ۔''اس نے قدرے کنفیوژن سے اسے مخاطب کیا۔

''پوچھو۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ اصطبل کے باقی گھوڑوں کو چھوڑ کر صرف شندور کے گھوڑے کا اتنی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جانا عجیب نہیں ہے؟اگر میں غور سے دیکھوں تو پہلا یہی سوال کروں کہ شندور کے گھوڑے ہی کیوں بیمار ہوئے؟''

''یہی سوال ہم نے بھی کیا تھا جب ہم سب کو پتہ چلا۔''وہ ایک مالا کو چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔''ان فیکٹ یہ تو ایسا سوال ہے جو ہر کسی کے ذہن میں آیا تھا۔''

''پھر؟تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا؟''اس نے تعجب سے پوچھا۔

''کیوں نہیں کیا۔اس وقت یوسف خان نے تحقیقات کرائیں تو سات ملازموں پر شک ہوا

تھا۔ سارا دن یہ گھوڑے ان ساتوں کے پاس رہے تھے۔ خان جی نے ساتوں کو گرفتار کرایا اور ساجد خان، ہمارے ایون کا تھانے دار ہے، اس کی تحویل میں دے دیا۔ ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے۔ ان ظالم کے بچوں نے ایک بار بھی اعتراف جرم نہیں کیا۔ حالانکہ ساجد خان جیسا جانور بڑے سے بڑے مجرم کے پسینے بھی چھڑا دیتا ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے کیا گھول کے پیا ہے۔ اتنے ڈھیٹ ہیں، ہر روز جسمانی ریمانڈ ملنے کے بعد بھی اب تک خاموش ہیں۔'' وہ جیولری کا باکس بند کرتے ہوئے تنک کے کہہ رہی تھی۔

''تم لوگوں نے چترال میں اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی پھر جب یہ سات ملازم گرفتار ہوئے تو کسی کو خبر نہیں ہوئی کیا؟'' وہ قدرے تعجب سے بولی۔ کالا شی ٹوپی اس نے اتار کے سامنے میز پر رکھ دی تھی۔

''یوسف خان نے جھوٹ بولا تھا۔''

وہ چٹیا کھولتی ہوئی چونکی۔ ''کیسا جھوٹ؟''

''انہوں نے پردہ پوشی کے لیے کہا کہ یہ سات ملازم اصطبل میں ایک گھوڑے کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ حالاں کہ وہ گھوڑا بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے مر گیا۔ خان جی نے کہا کہ ان ملازموں نے اس کو مارا ہے۔ گرفتار بھی اسی لیے ہوئے ہیں۔ اب ان بیچاروں سے گھر والے تو ملنے جا نہیں سکتے، وہ کس کو بتائیں کہ وہ کس جرم میں آئے ہیں اور انہوں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''یعنی ان سات ملازموں نے گھوڑوں کو کچھ نہ کچھ ایسا دیا ہے جس سے یہ بیماری ہوئی ہے لیکن وہ اب اپنا منہ نہیں کھول رہے۔''

''ہاں۔ پتہ نہیں کس مٹی کے بنے ہیں۔'' گل ناک چڑھا کے بولی۔

''مگر گل رپورٹس تو ساری صاف ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا، یہ الزام بے بنیاد ہے؟'' عبادہ کچھ سوچ

کے بول رہی تھی۔

گل نے گردن موڑ کے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔ ''تمہیں لگتا ہے یہ الزام بے بنیاد ہے؟ شندور کے گھوڑوں کا ایک ساتھ بیمار ہونا اتفاق ہے؟''

عبادہ کھسیانی سی مسکرادی۔ ''میں بس یہی جاننا چاہ رہی تھی کہ تم بھی وہی سوچتی ہو جو میں سوچتی ہوں۔'' اس نے بال کھول دیے۔ گل باکس رکھ کے اب واش روم کی طرف چینج کرنے جا رہی تھی۔ عبادہ نے سارے بال کندھوں پر پھیلا دیے۔

پہلے وہ اس بات سے خار کھا رہی تھی کہ سلیبرل اٹیزیہ جو دماغی بیماری ہے وہ ایک ساتھ چھ گھوڑوں کو نہیں ہو سکتی، اب وہ اس بات پر خار کھا رہی تھی کہ سلیبرل اٹزیہ شندور کے چھ گھوڑوں کو قطعی نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ اندر ہی اندر بہت کالا تھا۔ مگر کیا؟

☆.....☆.....☆

وہ آج دوبارہ پریکٹس کرنے آئی تھیں۔ گل میدان میں گیند کے پیچھے گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ اس کا انداز کسی ماہر پولو پلیئر کی طرح تھا جسے ایک ایک نکتے کا پتہ ہو۔ وہ دونوں طرف سے خود کو جھکا رہی تھی۔ اس کے لگام بدلنے اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں سٹک منتقل کرنے کی سپیڈ بہت زیادہ تھی۔ تمام کھلاڑیوں کے شندور جانے سے گل کے کچھ دن کھل کے میسر آئے تھے۔ بقول اس کے وہ ان دنوں کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

عبادہ سفید کپری شلوار کے اوپر سرخ رنگ کی قمیص پہنے، دوپٹے کو گردن میں لٹکائے، ہاتھوں کا چھجا بنا کر گل کو دیکھ رہی تھی، اسی لمحے مہابت خان اس کے شانے کھڑا ہو گیا۔ وہ چونکی، پھر قدرے محبت سے مڑی۔

''سلام کاکا..... کیسے ہیں آپ؟'' اس نے تکلف سے پوچھا۔

''اچھا ہوں بچے۔تم سناؤ۔ٹھیک ہو؟شندور جائے گا یا نہیں؟''انہوں نے اپنائیت سے پوچھا۔

''کاکا.....میں نے سنا حویلی کی کوئی لڑکی شندور نہیں جاتی۔صرف بزرگ خواتین جاتی ہیں۔آپ تو جانتے ہیں میرا اٹھنا بیٹھنا گل کے ساتھ ہے۔اگر گل نہیں جا رہی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔''

''شندور دوبارہ کیسے دیکھو گی بچے؟دوبارہ تو تم کبھی نہیں آؤ گی۔''انہوں نے کافی تشویش سے پوچھا تھا۔

''کاکا.....میں پہلے ہی اس حویلی کی بہت ساری تقریبات دیکھ چکی ہوں۔آج بھی گل بتا رہی تھی کہ کوئی جوسٹ نام کا تہوار ہے۔سچ کہوں میں تھک گئی ہوں۔روز کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔اس لیے میں شندور دیکھنے نہیں جا سکتی اور پھر گل نہیں ہو گی تو میں بہت جلدی بور ہو جاؤں گی۔''وہ رسان سے کہنے لگی۔

''چلو۔جیسا تم کو مناسب لگے۔''انہوں نے مسکرا کے کہا۔

گل کی گیند واپس آ رہی تھی۔وہ دونوں اسے آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔گیند کو ایک گول ٹھوکا مار کے واپس میدان میں موڑنے کے بعد گل ان سے دس قدم پر تھی

آج کا دن بھی اچھا تھا۔بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔سورج کی تپش نہیں پڑ رہی تھی۔بارش کا امکان لگ رہا تھا۔گل اصطبل میں بہت دھیان اور بہت سنجیدگی سے پریکٹس کر رہی تھی۔اس کا گھوڑا میدان میں ہر طرف بے باکی سے دوڑ رہا تھا۔

''گھوڑے کیسے ہیں کاکا؟''وہ نیچے گھاس پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ویسا ہی ہے بچے۔''وہ مایوسی سے کہتے نیچے براجمان ہو گئے۔کھیڑیوں کے بکل کھلے ہوئے تھے۔کندھے پر چادر فولڈ کر کے رکھی ہوئی تھی۔

''اوہ.....دوسرا ڈاکٹر کب آئے گا۔''وہ تشویش سے بولی۔

''آ گیا ہے۔''

''کب؟'' وہ چونکی۔

''کل منیب خان لایا ہے۔ حویلی میں ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑی دیر تک گھوڑوں کا چیک اپ کرنے آجائے گا۔''

''چلو اچھا ہوا۔ کم از کم اتنی ڈھارس تو رہے گی کہ گھوڑے زیر نگرانی ہیں۔'' وہ سکون کا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''بس وہ بھی کوئی اچھا اور تجربہ کار ہو۔ سب ڈاکٹروں کی طرح لمبی لمبی ہانک کے چلا نہ جائے۔''

''آپ کا مطلب میں نے لمبی ہانکی ہیں؟'' عبادہ نے برا منا کے پوچھا۔ وہ سٹپٹا گئے۔

''نہیں تو۔ بالکل بھی نہیں۔ تم کو تو علاج کرنے ہی نہیں دیا گیا ورنہ تم تو بہت شاطر اور ہوشیار ڈاکٹر ہے۔''

''بس کا کا اب مکھن نہ لگائیں۔ آپ نے دل توڑ دیا ہے میرا۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا بچے۔ میں باقی ڈاکٹر کی بات کر رہا تھا۔ تم تو ڈاکٹرنی ہے۔''

عبادہ نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔ ''کا کا آپ بہت تیز ہو گئے ہیں۔''

''تیز.....'' مہابت خان شرما گیا۔ ''اللہ معاف کرے بچے۔ توبہ توبہ۔'' اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ عبادہ ہنس پڑی۔

گھوڑے کی دھڑ دھڑاہٹ کے ساتھ لان سے گرد کا غبار اٹھ رہا تھا۔ گل نے سادی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، سر پہ اور کہنیوں میں وہی سیفٹی بلیٹس لگائے ہوئے تھے۔ آج کے دن وہ ضرورت سے زیادہ فوکس، چوکنا اور سنجیدہ تھی۔ وہ جب سے آئی تھی، لمحہ ضائع کیے بغیر گھوڑے پہ چڑھ گئی تھی۔ ابھی اس کا گھوڑا اس طرف آ رہا تھا۔ پھدک پھدک کرتا گھوڑا ان سے چھ قدم دور رک گیا۔

''کیسا لگا میرا پولو کا انداز؟'' اس نے شوخی سے پوچھا۔ وہ ہلکی ہلکی ہانپ رہی تھی۔

''بہت زبردست ہے گل۔ بہت اچھی ہے۔'' عبادہ نے انگوٹھے اٹھا کے کہا۔

''شکریہ جی۔'' وہ دل سے مسکرائی۔

''تمہیں گھڑ سواری سکھائی کس نے؟ یا بچپن سے ہی سیکھی ہے؟''

''بابا نے پہلے سکھائی تھی رستم پہ پھر بابا کے جانے کے بعد کاکا پریکٹس کراتے تھے۔'' اس نے ممونیت سے مہابت خان کو دیکھا۔ عبادہ نے بھی منڈی گھمائی۔ مہابت خان عاجزی سے گل کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری ذمہ داری دی تھی تمہارے باپ نے۔ وہ تمہاری مشق میرے حوالے کر کے گیا تھا۔ خانوں کی وجہ سے میں کبھی کہہ نہیں پایا ورنہ تمہارا گھڑ سوار اور پولو کھلاڑی بننے کا خواب میرا بھی ہے۔ جب جب میں تم کو کھیلتا ہوا دیکھتا ہوں میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں شندور کا مایہ ناز کھلاڑی بنائے۔ تم بہت ہنر مند ہے گل۔ بہت ہنر مند۔''

''آپ ہی نے سکھایا ہے کاکا۔'' وہ ممنونیت سے مسکرائی۔ ''پتہ ہے عبادہ میں اس رسی سے لٹک کے ہر رات یہاں آتی تھی، اکیلی۔ پیدل چل کے۔ کاکا راستے میں کھڑے ہوتے تھے۔ ہم تین چار گھنٹے رات کو گھڑ سواری کرتے۔ خان جانتے ہیں میرے بارے میں۔ اس لیے میں چھپ چھپ کے آتی تھی۔''

اور یکدم عبادہ کو دیا آیا کہ بلتیوں کی آمد والی رات وہ بہت دیر سے حویلی گئی تھی تب اس نے اصطبل میں کسی کو گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے دیکھا جسے مہابت خان نے اس کا وہم سمجھ کے جھٹک دیا تھا۔ تو وہ گل ہی تھی اور یقیناً اس کی گاڑی کی ڈگی میں بیٹھ کے حویلی آئی تھی۔ اف..... یہ لڑکی بھی.....

''حویلی والوں کو پتہ ہے میری گھڑ سواری کا لیکن وہ مجھے سرعام گھوڑے پر چڑھنے نہیں دیتے۔

اس لیے میں چور راستے کا انتخاب کرتی تھی۔ خیر۔ کاکا اس دفعہ میری درخواست کا جواب بہت لیٹ ہوگیا ہے۔ ویسے تو تیسرے اتنے بڑے اعتراض کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ آپ دعا کریں، اس دفعہ ان کھڑوسوں کا دل پگھل جائے اور مجھ بے چاری کو شندور میں چن لیں۔''

''ان شاءاللہ بچے۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔'' انہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔

''ان شاءاللہ۔'' وہ نرمی سے مسکرائی۔ ''چلو عبادہ۔ مجھے بال پکڑاؤ۔ یہ کونے کھدروں میں چلی جاتی ہے پھر میں اٹھا نہیں سکتی۔'' اس نے گھوڑے کو ہانک لگاتے ہوئے کہا۔ عبادہ ''اوکے'' کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور میدان میں چلی گئی۔ مہابت خان نے کرب سے اس لڑکی کو دیکھا جسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ رستم کچھ دن بعد اس کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوجائے گا۔ اس کا وہ معصوم بچہ اب کسی اور کی ملکیت میں چلا جائے گا۔

عبادہ گل کے آگے بال پھینکتی اور گل ایک زوردار ٹھوکا بال کو مارتی، بال اچھل کے دور چلی جاتی۔ اسی اثنا کچھ آوازیں آئیں، مہابت خان خیال سے نکلا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے گردن گھمائی۔ نیا ڈاکٹر مدثر کے ساتھ چلتا ہوا آرہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھے اور ڈاکٹر کی طرف دوڑ پڑے۔

بال اچھل کے بہت دور چلی گئی تھی۔ عبادہ دوڑ کے بال کے پیچھے گئی، اس نے جھک کے بال اٹھائی ہی تھی کہ کچھ آوازیں آئیں، اس نے سر اٹھایا، سامنے سے مہابت خان اور مدثر ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کے ساتھ گھوڑوں کے کمروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آدمی کے ہاتھ میں بریف کیس تھا، آنکھوں پر باریک فریم کا چشمہ تھا۔ قد چھوٹا تھا اور جسم وزنی۔ سر کے بال تیل کی وجہ سے چمک رہے تھے۔ انہوں نے اوورآل پہنا ہوا تھا اور گردن میں سیٹھوسکوپ تھا۔

اس نے تمسخر سے سر جھٹکا۔ (یہ کریں گے علاج۔ وزن تو اٹھالیں پہلے اپنا۔ ہونہہ۔)

☆.....☆.....☆

صبح دوپہر میں ڈھلنے لگی تھی۔ سورج سوا نیزے پر چڑھ رہا تھا۔ مال مویشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ وہ دونوں تاحال میدان میں بھاگ رہی تھیں۔ عبادہ کو بے حد پسینہ آچکا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی جب کہ گل اور اس کا گھوڑا ابھی تک سالم تھے۔

''بس گل۔ اب تھوڑا ریسٹ کرو۔ میں تھک گئی ہوں۔'' وہ کمر پکڑ کے بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولی۔ گل جو ابھی تک ہشاش بشاش تھی مسکرائی۔

''جاؤ میری لاہوری ککڑ۔ میں خود ہی دیکھ لوں گی۔''

''او کے..... الوداع.....'' وہ کمر پکڑے تھکی تھکی سی کوارٹر کی طرف چلنے لگی۔ گل نے دوبارہ گھوڑے کو ہانک لگائی۔ وہ پھر سے نیا راؤنڈ کھیل رہی تھی۔ پیروں کو معذوروں کی طرح گھسیٹتے ہوئے وہ کچھ ہی قدم آگے بڑھی تھی جب کانوں میں اس چمپو ڈاکٹر کی آواز پڑی۔ وہ تکان سے مڑی۔

''نہیں..... یہ کچھ عجیب ہے..... میں نے نہیں کیا..... چچا میں بتا رہا ہوں..... پتہ نہیں یہ کیسے.....'' ڈاکٹر اور مہابت خان الجھے الجھے چلے آرہے تھے۔ ڈاکٹر کے ماتھے پر بل تھے اور وہ فائل کو تذبذب سے دیکھ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا اس بارے میں۔ کیا پتہ کروایا ہو۔ کیا معلوم؟'' مہابت خان کہہ رہا تھا۔ وہ اس طرف چلی آئی۔ پیچھے چترال کے پہاڑوں پر دھند اتر رہی تھی۔ پہاڑ کا سایہ ان پر پڑ رہا تھا۔ یہاں ٹھنڈی چھایا آگئی تھی۔

''کیا ہوا کاکا؟'' وہ قریب آئی تو پوچھنے لگی۔

''پتہ نہیں بچے۔ یہ ڈاکٹر کچھ عجیب سا کہہ رہا ہے۔'' مہابت خان جز بز تھا۔

''آپ ان کی بیٹی ہیں؟'' ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔

''نہیں۔ میں عبادہ سلیم ہوں۔ لاہور سے۔ میں بھی ایک ویٹرنری ڈاکٹر ہوں۔'' اس نے اپنا

تعارف کرایا۔

"آپ بھی؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"پریشان نہ ہوں۔آپ سے پہلے مجھے ان کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا۔مجھ سے نہیں ہوا تو آپ کو لے آئے۔" وہ بدقت مسکرائی۔

"اچھا.....ٹھیک ہوگیا۔" وہ سرد مہری سے کہتے واپس فائل کے صفحے پلٹنے لگا۔اس کے تعارف سے دلچسپی نہیں دکھائی۔

"کیا مسئلہ ہے سر۔میں کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے خیر خواہی سے پوچھا۔

"خاص مسئلہ نہیں ہے۔ایک کنفیوژن ہے۔" وہ چشمہ انگلی سے پیچھے کرتے ہوئے بولے۔

عبادہ نے پہلے محبت خان کو دیکھا، پھر بولی۔

"کیا کنفیوژن ہے؟"

"یہاں ایک رپورٹ ہے۔وہ میرے دوست کی لیبارٹری کی ہے۔یہ والی۔" انہوں نے ایک صفحہ کھولا اور انگلی سے ٹیپ کرنے لگے۔"یہاں دیکھیے ..... یہ آخر میں لکھا ہے" انٹر بائے ڈاکٹر ذوالفقار داؤد خان....."

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔(دراصل جس ڈاکٹر نے رپورٹس کا جائزہ لیا ہوتا، وہ ہر صفحے پر آخر میں اپنا نام لکھتا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ ادارے کے کس ڈاکٹر نے پڑتال کی ہے۔)

"میں حیران ہوں..... ایسا کوئی آدمی میرے دوست کی لیبارٹری میں کام نہیں کرتا پھر یہ رپورٹ کس نے انٹر کی۔" وہ پریشانی سے بولے۔

"کیا؟" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔"کیا مطلب؟"

"مطلب میرے دوست کی لیبارٹری میں ڈاکٹر صرف وہ ہے۔باقی سٹاف ہے۔"

''ڈاکٹر صاحب ہوسکتا ہے اس نے نیا ڈاکٹر اپائنٹ کیا ہو۔''

''نہیں کیا۔ ابھی میں نے اسے فون کیا تھا۔ اس نے کہا اس کی لیبارٹری میں ایسا کوئی ڈاکٹر کام نہیں کرتا اور چترال کے ان گھوڑوں سے متعلق اس کے پاس کوئی سیمپل نہیں آئے۔ ایسا کوئی کیس اس نے رپورٹ ہی نہیں کیا۔'' وہ بے حد جز بز تھے۔

عبادہ نے تیزی سے ان کے ہاتھ سے کاغذ لیا۔ ''یہ پیپر ان کی لیبارٹری کا ہی ہے۔ یہ جھوٹ کیسے بول سکتا ہے؟ اس میں صاف صاف لکھا ہے۔''

''یہ کاغذ جعلی ہے۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔ عبادہ کے دل پہ گھونسا پڑا۔ ''یہ لیبارٹری کا نام، یہ ایڈریس، یہ پی او باکس نمبر..... یہ درست ہے لیکن یہ کاغذ جعلی ہے۔'' وہ کاغذ اس سے لے کے بولے۔ عبادہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

''کیسے جعلی ہے ڈاکٹر صاحب؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

انہوں نے کاغذ کو ہوا میں لہرایا یوں کہ روشنی اس کے آر پار ہونے لگی۔ ''اس کا واٹر مارک دھندلا ہے اور یہ اس کا اوا ٹر مارک ہے بھی نہیں..... اس کاغذ پہ رپورٹ کی تاریخ پندرہ جون ہے۔ جب کہ اس نے دو مہینے پہلے اس کاغذ کو لیبارٹری میں بین کر دیا تھا۔ اب اس کا نیا واٹر مارک ہے، نیا رنگ ہے کاغذ کا.....''

پورا چترال اس کے سر آن گرا۔ وہ بے چینی سے آگے ہوئی۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔'' وہ برا منا کے بولے۔

''اس کا مطلب یہ کاغذ کہیں سے اٹھایا گیا ہے اور اس پر غلط رپورٹ لکھی گئی ہے؟'' اس کی کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔

''غلط نہیں جعلی رپورٹس لکھی گئی ہیں۔ میں خان سے بات کرتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ جھوٹی رپورٹس کیوں بنائی ہیں انہوں نے۔'' وہ صفحے کو انگوٹھے سے رگڑتے پرسوچ انداز میں بولے اور آگے چلے گئے۔

''ڈاکٹر صاحب؟'' اس نے آواز دی۔ وہ رکے۔

''جی۔''

''کیا میں کچھ دیر کے لیے فائل دیکھ سکتی ہوں؟ مجھے کچھ کام ہے۔'' اس نے گزارش کی۔

''جی۔ دیکھ لیجیے۔'' انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی اور خود مہابت خان کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ عبادہ فی الفور نیچے بیٹھی اور فائل کے سارے کاغذات کھول لیے۔ اس نے یکے بعد دیگرے ہر لیبارٹری کا نمبر ملایا اور ان سے ان گھوڑوں کے متعلق پوچھا۔ اگر ایک رپورٹ جعلی تھی تو اس کا مطلب باقی سب بھی جعلی ہوں گی۔ یہ کاغذات مہابت خان نے سنبھالے تھے۔ اسے گھوڑوں کے متعلق جو کاغذ لیا، اس نے رکھ دیا، کیا معلوم یہ کسی دوسرے گھوڑے کا ہو۔ اس نے پے در پے سب رپورٹس کی تصدیق کی۔

مگر.....

ہر لیبارٹری والے نے ان رپورٹس کا استرداد کیا۔ یہاں موجود کسی بھی لیبارٹری میں یہ کیس فائل ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے، اپنی جگہ جم گئی تھی۔ کوئی کیوں گھوڑوں کی جھوٹی رپورٹس بنائے گا؟ کیوں کوئی نہیں چاہے گا کہ گھوڑے ٹھیک ہو جائیں؟ ان معصوم گھوڑوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ اور جس نے بھی بنائی؟ اس کا کیا مفاد تھا؟ گھوڑوں کی اصل بیماری چھپانے سے کیا ملے گا؟ اس کا سانس رک رہا تھا۔

''یار! خان جی نے وہ چھ گھوڑے شندور کے لیے وقف کیے تھے۔ اس دفعہ جیتنے والی ٹیم کے چھ

کھلاڑیوں کو وہ گھوڑے ملنا تھا لیکن وہ تو بیمار ہو گئے ہیں۔"

یکدم اس کے دماغ میں بجلی سا کچھ کوندا۔ وہ جھٹکے سے آگے ہوئی۔ آنکھوں کے گول کنچے تیزی سے دائیں سے بائیں ہلنے لگے۔

"خیال رکھیے گا ڈاکٹرنی۔ بہت قیمتی گھوڑے ہیں یہ۔ ایسا نہ ہو آپ بغیر بیماری کا پتہ لگائے علاج کرنا شروع کر دیں اور ہم اپنے گھوڑوں سے محروم ہو جائیں۔"

"آپ کو پہلے بیماری معلوم کرنا تھی پھر علاج کرنے تھے۔ قیاس اور اندازے کے علم سے آپ نے میرے دو گھوڑوں کو زہر کے ٹیکے لگائے ہیں۔ کیا آپ جانتی ہیں؟" یوسف خان کی آواز کانوں میں گونجی۔

"ہر بار مفاد کے لیے دوسروں کو نہیں مارا جاتا۔ اپنی نالائقی کو چھپانے کے لیے بھی ایسا کرنا پڑ سکتا ہے۔"

تو یہ سب.....

یہ سب ابتہاج نے کیا تھا؟ مگر کیوں؟

"یوسف خان کا بیٹا ہو کے سردار نہیں بن سکا یہ عبادہ۔ ان پڑھ جاہل اور گنوار جو ہے۔ اس لیے غاذان سے اپنی حسد نکالنے کے لیے مجھ پر غصہ اتارتا ہے۔ یہ بزدل اور ناکارہ انسان ہے۔" گل نے اس کے دماغ میں سوئی چبھوئی۔

"مانا کہ ہم دونوں کے درمیان سرداری کو لے کر جھگڑا ہے مگر گھوڑے مرے تو دونوں کو نقصان ہوگا۔" کہیں سے غاذان چلایا تھا۔

"یہ رپورٹس ابتہاج نے بنائی ہیں۔"

پورا چترال اس کے سر آن گرا۔

''ہاں ہوں۔تم ہی لائے ہو اس پنجابی کو جو دو لفظ پڑھ کر سمجھتی ہے کہ اسے سب آ گیا ہے؟ یہ چھوئی موئی سی لڑکی کچھ نہیں کر سکتی۔اسے علاج آتا ہے نہ گھوڑوں کی خدمت۔تم نے بابا کے کان میں پتہ نہیں کیا ڈالا کہ انہوں نے اسے بلا لیا۔میں بتا رہا ہوں غاذان۔میں تمہیں مزید گھوڑوں کو نقصان پہنچانے نہیں دوں گا۔اس کے بعد تم جو بھی ڈاکٹر لاؤ گے میں اسے بھیجوں گا نہیں۔اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔''

تو اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ علاج کرے۔وہ اسے حقیر نہیں سمجھتا تھا۔وہ ڈرتا تھا۔اپنا پول کھلنے سے ڈرتا تھا۔اس دن جب اس نے ٹیکے لگائے،تب ہی وہ جان گیا تھا اب سب سامنے آنے والا ہے۔اس لیے اس نے فی الفور عبادہ کو یہاں سے روانہ کیا۔

یا اللہ!

کیا غاذان کو یہ سب معلوم تھا؟ کیا یوسف خان جانتے ہیں اس بارے میں؟ اس کے دل نے بے ساختہ ''نہیں'' کہا۔ہاں وہ دونوں نہیں جانتے تھے۔اگر وہ جانتے ہوتے تو اب تک ابتہاج یہاں سلامت ہوتا؟ اس نے سرداری نہ ملنے کی وجہ سے سارا غصہ ان معصوم گھوڑوں پہ نکالا تھا تا کہ اس کا باپ رسوا ہو جائے اور غاذان کو نقصان پہنچے۔اسے اپنے نقصان کی پرواہ نہیں تھی۔پرواہ تھی تو اپنے بدلے کی،اپنی بھڑاس کی۔یہاں سب نے شک ان ملازموں پہ کیا،کسی نے حویلی کے فرد پہ شک نہیں کیا۔وہ کیوں کرتے۔ابتہاج اصطبل کا مالک تھا۔وہ کیوں کر نقصان پہنچائے گا؟ کسی نے اس طرح سے سوچا ہی نہیں ہوگا۔یوسف خان بیٹے کے کارنامے سے لاعلم گھوڑوں کا علاج پہ علاج کیے جا رہے تھے اور وہاں ان کا لاڈلہ،جھوٹی پہ جھوٹی رپورٹس بنا رہا تھا تا کہ کسی کو سچائی کا پتہ نہ چل سکے۔

میدان میں گل کا گھوڑا دھڑ دھڑا رہا تھا۔وہ اپنے کھیل میں مصروف تھی۔

گل اسے ان پڑھ گنوار کہہ رہی تھی۔ وہ ان پڑھ گنوار نہیں تھا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ بہت ہوشیار تھا۔ ایک ساتھ وہ کئی لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ اسے غاذان کو بتا دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ سارے گھوڑے مر جائیں، غاذان کو خبردار ہو جانا چاہیے۔

اس نے تیزی سے فائل سمیٹی، سارے کاغذ اندر ٹھونسنے لگی۔

''عبادہ بچے.....'' مہابت خان کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے کرنٹ کھا کر سر اٹھایا۔ وہ ہلکی ہلکی کانپ رہی تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ ڈاکٹر رپورٹوں کے بارے میں؟''

وہ تیزی سے اٹھی، فائل بانہوں میں پکڑ لی اور اپنی کپکپاہٹ پہ قابو کیا۔ ''کاکا! (اس نے گہری سانس لی) یہ ساری رپورٹس جعلی ہیں۔ میں نے ایک ایک لیبارٹری کو فون کیا ہے۔ سب نے یہی کہا ہے کہ ایسا کوئی کیس ان کے پاس نہیں آیا۔ کاکا آپ مجھے بتائیں، یہ رپورٹس کون لے کر جاتا تھا؟''

وہ جانتی تھی ابتہاج ہی تھا۔ وہی کر رہا تھا مگر وہ ایک دفعہ ان کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

''منیب خان۔''

اور یوں عبادہ کے پیروں تلے بارودی سرنگ پھٹ گئی۔

''منیب خان؟'' وہ بے یقینی سے بڑبڑائی۔

''وہی خود ٹیسٹ لے کے جاتا ہے اور رپورٹس لے کر آتا ہے۔ ساری رپورٹیں وہی لایا ہے۔''

منیب خان اس کا سہولت کار تھا۔ وہی ابتہاج کی مدد کر رہا تھا؟ ہر بار ابتہاج سیمپل تھوڑی ہی لے کر جائے گا؟ وہ خان تھا اور خان خود اپنے کام تھوڑے ہی کرتے ہیں۔ اس نے منیب خان کو اس کام کے لیے رکھا تھا۔ منیب خان جو ایک وفادار ملازم تھا۔ اس قدر نمک حرامی کر رہا تھا۔

اوخدا۔ اس نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔ عبادہ نے بے اختیار پیشانی چھوئی۔

''کیوں کیا ہوا بچے؟'' مہابت خان اسے دھواں دھواں کھڑا دیکھ کے فکر مند ہوا۔

''کاکا۔آپ جانتے ہیں مجھے یہاں سے بھیجنے کے لیے کونسی وجہ بتائی گئی تھی؟'' اس نے اچانک پوچھا تو مہابت خان نے شرمندگی سے نظریں جھکا دیں۔

''میں جانتا ہوں تم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔وہ سب.....''

''کاکا! ابتہاج نے مجھ پر گھوڑوں کو زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ہے ناں؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''وہ جذباتی ہے۔جو بھی ڈاکٹر آتا ہے۔اس سے الجھ جاتا ہے۔پہلے دو ڈاکٹر تو اس سے ڈر کے واپس چلے گئے تھے۔تم کو بھیجنے کے لیے بھی اس نے یہ بات کہی ہوگی، میں جانتا ہوں اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔''

''چچا کیسے ہو سکتی ہے۔وہ رپورٹس بھی جعلی ہیں، ان کی طرح۔'' وہ تکان سے بولی۔

''جانتا ہوں بچے ابتہاج خان نے جھوٹی.....'' یکدم وہ رک گئے، انہوں نے تیزی سے عبادہ کو دیکھا۔عبادہ دمے کی مریض کی طرح انہیں دیکھ رہی تھی۔سانس روکے، پسینہ پسینہ، مہابت خان کے دماغ میں جھماکا ہوا۔

''یہ ساری رپورٹس ابتہاج خان جی.....'' وہ بے حد صدمے سے کہتے اپنی جگہ جم گئے۔

''جی کاکا۔اسی نے گھوڑوں کے ساتھ کچھ کیا ہے۔اب وہ منیب خان کے ہاتھوں جھوٹی رپورٹس بنا رہا ہے تاکہ کسی ڈاکٹر کو پتہ نہ چل سکے اور اس کا راز نہ کھل جائے۔اس نے مجھے بھی جھوٹی رپورٹس میں پھنسا کر یہاں سے بھیجنا چاہا۔''

مہابت خان نے بے یقینی سے ٹوپی اتار لی۔ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔وہ گھوڑے ان کی اولاد کی طرح تھے۔انہوں نے بڑے چاؤ سے ان سب کو پالا تھا۔وہ کیسے اتنی بے رحمی دکھا سکتا

تھا۔کیسے؟

عبادہ نے ہمدردی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چچا! روئیں نہیں۔یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ہمیں اس وقت سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا ہے۔''

وہ رسان سے کہنے لگی۔مہابت خان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔مگر وہ توجہ سے سن رہا تھا۔

''کاکا! غاذان اور یوسف خان کو اس بارے میں علم نہیں۔یہ بات اس وقت آپ کو اور مجھے پتہ چلی ہے۔میں ایسے ہی منہ اٹھا کر غاذان اور یوسف خان کو یہ سب نہیں بتا سکتی۔اگر ان کو بتایا تو وہ یقین نہیں کریں گے کیوں کہ یہ ابتہاج نے کیا ہے۔وہ یوسف خان کا بیٹا ہے۔اس لیے کاکا.....'' وہ سانس لینے کو رکی۔''ہمیں سوچ سمجھ کر چلنا ہے۔''

مہابت خان نے ڈبڈباتی آنکھیں اٹھائیں۔

''مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔کہاں ہیں وہ؟''

''کوارٹر میں کھانا کھا رہے ہیں۔'' انہوں نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔میں ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ابتہاج فی الوقت یہاں نہیں ہے۔آپ خود کو سنبھالیں۔کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہونی چاہیے کاکا۔آپ جانتے ہیں وہ رائفل کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہمیں سچائی پتہ چل گئی ہے تو وہ ہم دونوں کو نقصان پہنچائے گا۔میں نہیں چاہتی کہ ہم دونوں کو کچھ ہو اور گھوڑے اسی طرح بلکتے، سسکتے مر جائیں۔ٹھیک ہے؟''

وہ بہت سمجھداری سے کہہ رہی تھی۔مہابت خان نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

اس نے گہری سانس لی۔گل ہنوز گھوڑے کو دوڑا رہی تھی۔ایسا لگ رہا وہ تھکتی نہیں ہے۔اس کا گھوڑا بھی آرام کا خواستگار نہیں تھا اور نہ ہی اس کا بدن ستانے کی مانگ کر رہا تھا۔یہ پہاڑی لڑکیاں اتنی مضبوط کیوں ہوتی ہیں؟

اس نے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ کوارٹر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئی۔ سوٹڈ بوٹڈ سا وہ آدمی، کھانے میں ایسے مگن تھا جیسے پرچے کے آخری اوقات میں طالب علم ہوتا ہے۔ مہابت خان نے کئی طرح کے کھانے اس کے سامنے رکھے تھے۔ وہ آستین کہنیوں تک چڑھائے، انگلیاں ڈبو ڈبو کے کھانا کھا رہے تھے۔ عبادہ چوکھٹ میں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے شدید کراہیت محسوس ہوئی لیکن اب یہی موٹا آدمی اس کی آخری امید تھا۔

ابتہاج خان سے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینی کی!

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی ٹیبل کے قریب آئی۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے بہت ضبط سے پکارا۔

انہوں نے سر اٹھایا، ان کا منہ، ہونٹ سب سالن سے بھرا تھا۔ عبادہ کو متلی محسوس ہوئی لیکن خود پہ قابو کیا۔ (شش عبادہ۔ برداشت کرو۔)

''مجھے کچھ بات کرنی تھی۔'' اس نے تحمل سے کرسی کھینچی اور فائل ایک طرف رکھ دی۔

''کہیے۔ سن رہا ہوں۔'' وہ واپس سالن میں انگلیاں ڈبوتے ہوئے مشغول ہو گئے۔ (بات سن لیں گے؟ واقعی؟)

اس نے کہنی میز پر رکھی اور مکا سا بنا کر ہونٹوں پہ رکھ دیا۔ ماتھے پر کراہیت سے بل پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک سال کے بچے کی طرح کھانا کھا نہیں رہے تھے۔ کھانے سے ''نہا'' رہے تھے۔ اس نے صبر کا گھونٹ پیا اور گہری سانس لی۔

''سر.....'' اس نے بمشکل خود کو ابکائی سے روکا۔

''ہوں۔'' بھرے ہوئے منہ کا ہنکارا سنائی دیا۔

''کیا آپ جانتے ہیں آپ سے پہلے ان گھوڑوں کا علاج پانچ ڈاکٹرز نے کیا ہے جن میں ، میں بھی شامل ہوں؟''

''جی۔''

''آپ جانتے ہیں ہم کیوں علاج نہیں کر سکے؟'' اس نے بدستور مکا منہ پہ رکھا ہوا تھا۔

''کیوں کہ آپ لوگ جعلی رپورٹس کو اصلی سمجھ رہے تھے۔'' انہوں نے ٹونٹ کیا۔

''جی نہیں سر۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے واجبی سا برا مناتے ہوئے کہا۔ ''باقیوں کا مجھے نہیں پتہ، لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ رپورٹس نقلی ہیں اور یہ کہ گھوڑوں کو سیلبرل اٹیزیہ کا وائرس دیا گیا ہے۔''

اب کی بار انہوں نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

''سیلبرل اٹیزیہ؟''

''جی سر۔''

''آپ جانتی ہیں سیلبرل اٹیزیہ کیا ہوتا ہے؟'' انہوں نے ہتک آمیز لہجے میں پوچھا۔ عبادہ کے ماتھے پر بل پڑے لیکن وہ قدرے برداشت سے مسکرائی۔

''جی سر۔ میں جانتی ہوں۔ مگر میں اس سب پہ آپ سے بحث کرنے نہیں آئی کیوں کہ میرے خیال اگر ہم facts and figures پر فوکس کریں تو زیادہ اچھا ہے۔ کم از کم آپ اس تکلیف سے بچ جائیں گے جو مجھے یہاں ملی۔'' اس نے ہمدردی سے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر الجھن ابھری۔ ''کیسی تکلیف؟''

وہ گھائل انداز میں مسکرائی۔ ''سر۔ یہ کوئی معمولی گھوڑے نہیں ہیں۔ یہ خالص شندور کے

گھوڑے ہیں۔ یوسف خان نے ان گھوڑوں کو شندور کے لیے وقف کیا تھا۔ ایک رات اچانک یہ بیمار ہو کر اسی طرح گر گئے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید ان کو کوئی بیماری ہو گی پھر میں نے سوچا کہ صرف شندور کے گھوڑوں کو بیماری کیسے ہو سکتی ہے؟ پھر میں نے اسے اتفاق سمجھا اور اپنا شک ختم کرنے کے لیے میں نے یوسف خان سے کہا کہ میں گھوڑوں کو ہسپتال لے کر جانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ہسپتال لے جانے سے منع کر دیا۔"

"کیوں؟" انہیں تعجب ہوا۔

"وہی تو بتانے آئی ہوں۔" اس نے خیر خواہ انداز میں کہا۔ "چار دن پہلے انہوں نے مجھے یہاں سے جانے کا حکم دیا اور میرے کریئر کی Crediability کو متاثر کیا۔ انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے دو گھوڑوں کو جان سے مارا ہے۔ یہ گھٹیا الزام سن کے میں بری طرح ٹوٹ گئی۔ انہوں نے مجھے گھر جانے کے لیے کہا لیکن میں رک گئی۔ یہ جو میری دوست ہے نیچے، جو گھوڑے پہ پولو کھیل رہی تھی۔ اسی نے مجھے روکا کہ شندور دیکھتی جاؤ مگر میں (ذرا سر کو جھٹکا دیا) اس لیے نہیں رکی۔ میں اپنے دامن سے یہ الزام صاف کرنے کے لیے رکی ہوں۔"

وہ مسکرائی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ بظاہر تو یہ لوگ علاج کے لیے ڈاکٹر لا رہے ہیں لیکن ان میں ایک خطرناک آدمی ہے ابتہاج خان نام کا۔ وہ بہت زہریلا ہے۔ وہ آپ کو علاج کرنے نہیں دے گا۔ وہ نہیں چاہتا کہ گھوڑے ٹھیک ہو جائیں۔" اس نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔

"میں اس سے ملا ہوں۔"

"ملے ہیں تو پتہ چل گیا ہو گا کیسا آدمی ہے؟"

"سائیکو پیتھ۔" انہوں نے جھرجھری لی۔

''دیکھا۔وہ سائیکو ہے۔ہروقت اس کے پاس رائفل ہوتا ہے۔وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''مگر وہ کیوں نہیں چاہتا کہ گھوڑے ٹھیک ہوجائیں؟''انہوں نے ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کہ اسی نے گھوڑوں کو سیلبرل انژیہ کا وائرس دیا ہے۔''

''کیا؟''پورا چترال ان کے سر آن گرا۔

''آہستہ سر.....آرام سے بولیں۔اگر اس کو بھنک پڑ گئی کہ ہمیں سچائی معلوم ہوگئی ہے تو وہ ہم دونوں کی تکہ بوٹی بنادے گا۔''اس نے پچکارتے ہوئے کہا۔ڈاکٹر صاحب کو کھانا بھول گیا۔

''وہ بہت شاطر ہے۔اس نے سب ڈاکٹرز کو ڈرا دھمکا کے بھگا دیا۔مجھے بھی ڈرایا۔جب میں پہلی بار یہاں آئی مگر میں زنان خانے میں تھی۔اس لیے اس کو زیادہ موقع نہیں مل سکا مگر آپ.....''وہ کہتے کہتے انہیں ہمدردی سے دیکھنے لگی۔''آپ خیال رکھیے گا۔وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے بائیں ہاتھ سے پانی کا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ پی گئے۔

''یہ عام کیس نہیں ہے۔یہ خاندانی دشمنی کا کیس ہے۔اس لیے آپ اس میں براہِ راست نہیں کودیں پلیز۔ابھی آپ نے کہا کہ آپ خان کو سب بتادیں گے۔آپ پاگل ہیں؟ آپ نے کسی بھی خان کو بتایا تو وہ ابتہاج تک بات کرنٹ کی طرح پہنچے گی اور آگے سے اس کی گولی آپ کو چیرتی ہوئی جائے گی۔''

ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔انہوں نے جگ سے دوسرا گلاس نکالا اور غٹا غٹ پی لیا۔

''ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے۔آپ کی طرح میں بھی گھوڑوں سے شدید محبت کرتی ہوں۔ان کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ہم ابتہاج کو علم میں لائے بغیر گھوڑوں کے ٹیسٹ کرائیں،ان کا علاج کرائیں۔''

''مگر میں اپنی جان کا رسک کیوں لوں؟ یہ نہیں چاہتے کہ گھوڑے ٹھیک ہوں تو میں چلا جاتا ہوں۔ کسے فرق پڑتا ہے۔ ہونہہ۔'' وہ منہ بنا کر کہتے، پلیٹ پیچھے کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ عبادہ کے پیروں تلے سرنگ پھٹی۔

''سر جی۔'' وہ مزاحمت میں تیزی سے بولی۔ ''میں نے، آپ نے اور ان چار ڈاکٹروں نے بھی یہی کہہ کر علاج ادھورا چھوڑا تھا۔ اگر ہم یہی سوچ کے سب چھوڑتے رہے تو گھوڑے مر جائیں گے۔ ان معصوم جانوروں کا کیا قصور ہے؟ وہ کیوں ہم انسانوں کے انتقام کا بوجھ اٹھائیں؟'' وہ یکدم جذباتی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے رک کر اسے دیکھا۔

''آپ خود سوچیں۔ جو دو گھوڑے مرے۔ کیوں مرے؟ اسی وجہ سے ناں کہ ابتہاج نے علاج نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح یہ باقی چار بھی مر جائیں گے۔ سر دیکھیں ذرا ان گھوڑوں کو۔ وہ کس قدر شاندار اور اعلیٰ نسل کے جوان جہان گھوڑے ہیں۔ کومے کے مریض کی طرح سدھ بدھ پڑے ہیں کس کی وجہ سے؟ صرف ہم انسانوں کی وجہ سے؟ ان کے معدوں میں روز سرنج سے کھانا ڈالا جاتا ہے۔ کتنی تکلیف سے وہ ملغوبہ اپنے اندر اتارتے ہیں میں جانتی ہوں۔ یہ کس نے کیا ہے ان کے ساتھ؟ ہم انسانوں نے۔ وہ جانور ہیں سر۔ وہ ہمارے آسرے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں امید سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر ہم بھی ابتہاج کی طرح ان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے تو ہم میں اور ابتہاج میں کیا فرق رہ جائے گا؟''

ڈاکٹر صاحب کسلمندی سے پہلو بدلتے ہوئے واپس بیٹھ گئے۔

''میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں اتنے سنگین الزام کے بعد بھی علاج کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے نہیں کرنے دیا گیا۔ مجھے روک دیا گیا اور گھوڑے پر اسلحے سے لیس گارڈز کھڑے کر دیے گئے تاکہ میں گھوڑوں سے مل نہ سکوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب لیکن آپ کے کھلے

ہیں۔آپ ان گھوڑوں کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔'' اس نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''مگر میم۔اگر انہوں نے مجھے بھی روک دیا تو؟''

''ہم انہیں بھنک ہی نہیں پڑنے دیں گے۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''دیکھیں سر۔'' وہ آگے ہوئی۔''آپ سیمپل لیجیے گھوڑوں کے۔ پشاور میں ''Healthy Pet'' نام کا ہسپتال میرے باس کے دوست کا ہے۔میں سیمپل ان کی لیبارٹری میں بھجوادوں گی۔ابتہاج ٹیسٹ کرائے بغیر جعلی رپورٹس بنا تا رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ گھوڑوں کے خون میں کچھ نہ کچھ ایسا ہے جس سے وہ چھپا رہا ہے۔اس دفعہ جب ٹیسٹ ہوں گے تو رپورٹس میں سب سامنے آجائے گا۔ابتہاج جس آدمی کو رپورٹس لانے کے لیے بھیجتا ہے۔وہ اس سے ملا ہوا ہے۔ہم اس بار خفیہ طور پر کسی اور کو بھیجیں گے اور میں اپنے باس کو فون کروں گی کہ اپنے دوست سے کہیں کہ میں نے گھوڑوں کے سیمپل بھیجے ہیں۔ان کا اچھے سے جائزہ لیں۔ظاہر ہے جو بیماری ہوگی۔وہ منظر عام پر آجائے گی۔میں ادھر سے ہی علاج منگوالوں گی۔وہ آدمی رپورٹس بھی لائے گا اور علاج بھی۔ہم یہاں گھوڑوں کا خفیہ علاج شروع کر دیں گے۔دو دن بعد شندور ہے۔اس کے بعد غاذان کی دستاری۔اسے قریباً پانچ سے چھ دن نہیں ملیں گے اصطبل آنے کے لیے،اس دوران ہم گھوڑوں کا فی الفور علاج کریں گے۔اگر سلیبرل اٹیزیہ وائرس کے بموجب ہو رہا ہے تو ہم ان دنوں میں گھوڑوں کو تھوڑا بہت سنبھال لیں گے۔میرے باس نے پہلے ہی تحقیقاتی کمیٹی بنا دی ہے۔وہ ان خانوں کے خلاف ایکشن لے رہے ہیں۔ایسے میں وہ کمیٹی کو لے کر یہاں آجائیں گے اور یوسف خان کو گھوڑے ہسپتال لے جانے کے لیے مجبور کر دیں گے۔اس وقت ہم یہ راز کھول دیں گے کہ سب ابتہاج نے کیا ہے۔تب ابتہاج کچھ نہیں کر سکے گا۔''

وہ چمک چمک کے کہتی میز پر ہاتھ مار کر خاموش ہوگئی۔

''او کے میم۔ میں لے لیتا ہوں سیمپل۔ مگر ہم کس آدمی کو پشاور بھیجیں گے؟ کون اتنا بھروسے مند ہوگا جو ہمارا ساتھ دے گا اور خانوں کا نہیں؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''میرا پوتا۔ ناصر خان۔'' مہابت خان کی آواز پہ دونوں نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ ''وہ جائے گا۔ وہ دو چودھویں پاس ہے۔ وہ رپورٹس لائے گا۔''

عبادہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ٹھیک ہے کاکا۔ آپ اسے بلا لیں۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے مسکرا کے پوچھا۔

''ان شاء اللہ۔'' انہوں نے سر کو جنبش دی۔

''تم ہی لائے ہو اس پنجابی کو جو دو لفظ پڑھ کر سمجھتی ہے کہ اسے سب آ گیا ہے؟ یہ چھوئی موئی سی لڑکی کچھ نہیں کر سکتی۔ اسے علاج آتا ہے نہ گھوڑوں کی خدمت۔''

اب تمہیں بتاؤں گی ابتہاج خان کہ مجھے کیا آتا ہے اور کیا نہیں۔ تمہاری وہ گالیاں مجھے نشتر کی طرح کبھی ہیں۔ مجھے میرے باپ نے گالی نہیں دی اور تم نے ایسی بے ہودہ زبان میرے لیے استعمال کی۔ تم اب اپنی عزت کا تماشا دیکھو گے اور میں منتظر ہوں اس گھڑی کی جب میرے باس تمہیں گھوڑوں کو زہر دینے کے جرم میں ہتھکڑیاں پہنائیں گے۔ باخدا ابتہاج، اس وقت مجھے بہت مزہ آئے گا۔ بہت مزہ۔

☆.....☆.....☆

جس مقام پر دریائے چترال کا بہاؤ کٹاؤ کی صورت میں ہوتا تھا وہاں وہ ایسے بہتا تھا جیسے تنگ سوراخ سے تیز پانی۔ اس کا راستہ روکنے اور اس کا پریشر بڑھانے کے لیے یہاں بڑی بڑی چٹانیں

تھیں جن کے کناروں سے پانی اچھل اچھل کے دوسری طرف گرتا تھا۔اگر یہاں کوئی غلطی سے گر جاتا تو یہ پانی تیز سوئیوں کی طرح اسکن کو انجر پنجر کر دیتا۔اس کی سختی سے اسکن ہڈیوں سے یوں چھل جاتی جیسی کوئی سبزی ہو۔

اور بدقسمت بہرام خان کی سزا کے لیے یہی جگہ منتخب ہوئی تھی۔

یوسف خان سمیت تمام سردار وہاں کھڑے تھے۔وہ دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے،لب سختی سے آپس میں پیوست کیے،غیظ وغضب کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ان کے اعصاب اس قدر تنے تھے کہ کوئی غلطی سے انہیں ہاتھ لگا تا تو وہ ''ٹن'' سے بج جاتے۔

ان کے ساتھ کھڑے سرداروں کے چہروں پر خوف تھا اور پیچھے ٹیلوں،کھائیوں کے سروں اور دریا کے کنارے کھڑے گاؤں کے ہجوم پر لرزہ سا طاری تھا۔وہ آواز پیدا کیے بغیر اس اندوہناک تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ایسی آسیبی خاموشی چترال نے ایک عرصے بعد دیکھی تھی۔سب اپنی جگہ جم گئے تھے۔شل.....ساکت.....ایسا لگ رہا کوئی ذی النفس سانس ہی نہیں لے رہا۔ان کی آنکھیں اس ٹھنڈے بے رحم چپو پر تھیں جن میں یوسف خان کا دیو قامت وحشی تیراک بیٹھا ہوا تھا۔وہ چپو کے کنارے پر یوں جما ہوا تھا کہ دایاں ہاتھ کہنی تک دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔اس کے مضبوط پنجوں میں بہرام خان کے کالر تھے۔وہ بڑی بے رحمی سے اسے دریا کے کٹاؤ میں لمبے لمبے غوطے دے رہا تھا۔

پانچ منٹ تک پانی میں رکھنے کے بعد،وہ اسے بربریت انداز میں اوپر کھینچتا،بہرام زور زور سے ہانپنے لگتا،چند سانسیں بحال کرنے کے بعد وہ اسے واپس کٹاؤ میں ڈبو دیتا۔شدت تکلیف سے وہ غرغرانے لگ جاتا۔

اس کے گھر والے خاموش کھڑے یہ ظلم دیکھ رہے تھے جو بہرام کی کڑی سزا تھی۔ایسی سزا کہ اس کے چہرے،کندھوں پر بے تحاشا زخم آگئے تھے۔اس لمحے پورے چترال کو یوسف خان سے

خوف آیا تھا، ایسا خوف کہ کچھ لوگ تو وہ سفاکیت دیکھے بنا ہی پلٹ گئے تھے۔ بہرام کی کرب ناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یوسف خان کا وحشی تیراک اسے کسی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

اونچے ٹیلے پر کھڑا غاذان ہاتھ سینے پر باندھے یہ دردناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گاگلز تھے، وہ چیونگم چبا رہا تھا۔ اس وقت وہ قطعی دوسروں پر یہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا کہ اسے فرق پڑتا ہے۔ اسے رستم کو بچانا تھا اور رستم کو بچانے کا یہی واحد حل تھا۔

ہجوم میں موجود کوئی شخص یوسف خان سے سفارش اور شفاعت کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سرداران بھی منہ پر تالے لگائے کھڑے تھے۔ شاہ سردار یوسف خان کے دائیں طرف بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اسے اپنے قبیلے کے فرد کو سزا ملنے سے فرق نہیں پڑ رہا تھا اور نہ ہی وہ اس ظلم سے کچھ سیکھ رہا تھا۔ بہرام جیسے کئی کالاشیوں نے سیاحوں کی آمد و رفت اور کالاش کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا۔ خود شاہ سردار نے اپنے ہاتھوں سے بے رحمانہ سزائیں دی تھیں جو تمام اہلِ قبیلہ کے لیے کسی عبرت سے کم نہیں تھیں۔ سرِعام سزاؤں کا یہی تو مقصد ہوتا ہے کہ تمام لوگ سبق سیکھ لیں اور آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں۔

چترال کے دکاندار سیاحوں کو چوگنی قیمت پر لوٹتے تھے۔ اس عرصے میں یوسف خان، ابتہاج اور چند اور مردوں کی ڈیوٹی لگا دیتے کہ وہ مارکیٹ میں ایسے ہتھکنڈوں سے باز نہ آنے والے تاجروں کو گرفتار کریں اور ان کو چترال پولیس کے حوالے کریں۔ اونچی قیمتیں ایک طرح بدنامی کا سامان ہوتی تھیں۔ بین الاقوامی سیاحوں اور ملکی سیاحوں کے لیے یہ ٹورسٹ سائٹس پہنچ سے بالکل باہر ہو جاتیں اور تاجروں اور سرمایہ کاروں کے حوالے سے کئی شکایتیں اخباروں، آرٹیکلز اور رسائل میں پڑھنے کو ملتیں جس سے نہ صرف وہاں کے مقامی باشندوں کی سفاکیت اور ظلم پسند طبیعت پہ سوال اٹھتا بلکہ سیاح متنفر ہو جاتے اور جو وہ خریدنا بھی چاہتے تو نہیں خرید پاتے، اس

لیے یہاں کے معاشی نظام کا سارا انتظام یوسف خان کرتا اور اپنے رعب و دبدبے سے انہوں نے ایک ایسا تصور قائم کر ہی لیا کہ ایک بار جو وہ کسی کو نصیحت کرتے پھر وہ شخص کبھی ان کی خلاف ورزی نہ کرتا تھا۔

غاذان نے پینٹ کی جیب سے فون نکالا اور عبادہ کا نمبر ملایا۔اس کا اس بارے میں آگاہ ہونا ضروری تھا کہ ان پر حملہ کرنے والا اس وقت اپنی سزا بھگت رہا تھا۔فون کان سے لگایا تو گھنٹیاں جا رہی تھیں۔وہ اس وقت ڈاکٹر سے ملنے کے بعد سیڑھیاں اترتے ہوئے آرہی تھی۔جونہی فرش پر قدم پڑا، ہاتھ میں موجود اس کا فون تھرتھرایا۔اس نے کھڑے کھڑے ہی انگوٹھا پھیر کا کال اٹھائی۔

''السلام علیکم غاذان۔کیسے ہیں آپ؟''اس نے خوشگوار موڈ سے پوچھا۔وہ دو دن بعد بات کر رہے تھے۔غاذان اس کی چہکتی آواز سن کر مشکور ہوا۔کم از کم اس کا موڈ تو اچھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں عبادہ۔آپ سنائیں۔کیسی ہیں؟''اس کی آواز جھنجھنا رہی تھی۔پسِ منظر میں کوئی سرسراتی ہوئی آواز آرہی تھی جیسے کوئی شے زور سے بہہ رہی ہو۔

''اللہ کا شکر ہے۔میں اچھی ہوں۔''وہ چلتی ہوئی باہر آگئی۔اب سورج براہِ راست اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔اس نے ہاتھ کا چھجا بنا کر بھنوؤں پر رکھا۔

''میں سوچ رہا تھا آپ کو کال کرلوں، دو دن سے بات نہیں ہوئی مگر بدقسمتی سے وقت نہیں ملا۔''وہ معذرت خواہ تھا۔اس نے ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا، وہ بوٹ کے کونے سے نیچے موجود کنکریاں کھرچ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔میں گل کے ساتھ تھی۔یونو۔وہ کسی کو بور نہیں ہونے دیتی۔''وہ اس کے عقب میں آتے شور سے بری طرح چڑ رہی تھی۔

''یہ بات تو ہے۔خیر مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔''

''کیا؟ آواز کٹ رہی ہے آپ کی غاذان۔'' اس نے فون کان سے ہٹایا۔ سگنلز تو پورے تھے۔

''ہیلو عبادہ۔ آواز آرہی ہے۔'' غاذان نے اپنا رخ تبدیل کیا۔

''کیا ہو رہا ہے، یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں۔ کہاں ہیں آپ؟ رش میں ہیں کیا؟'' اس دوسرے کان میں انگلی ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

''میں اس وقت دریائے چترال کے کنارے ہوں۔''

''وہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اسے تعجب ہوا تھا۔

''یہاں آپ کے مجرم کو ہیبت ناک سزا مل رہی ہے۔ وہی انجوائے کر رہا ہوں۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔ وہ جو چل رہی تھی، یکدم رک گئی، دل زور سے دھڑکا۔ میرا مجرم؟ کون ابتہاج؟

''کک..... کون مجرم؟'' اس نے سانس روکتے ہوئے پوچھا۔

''وہی جس نے کالاش میں آپ کا پرس چھینا تھا اور گل کو زخمی کیا تھا۔ اسے ہم نے پکڑ لیا ہے۔ اس وقت خان جی اسے نانی یاد دلا رہے ہیں۔''

''اوہ.....'' اس نے سکون کا سانس لیا۔

''پوچھیں گی نہیں کیا سزا مل رہی ہے اس کو؟''

''کیا؟'' وہ گل کی طرف چل پڑی جو گھوڑے روک کے اتر رہی تھی۔ وہ شاید اب جا کے تھکی تھی۔

''خان جی اسے دریائے چترال میں ڈبکیاں لگوا رہا ہے۔ بیچارے کا سانس بری طرح گھٹ رہا ہے۔'' اس نے واجبی افسوس کا اظہار کیا۔

''اوہ.....''

''حالت خراب ہے اس کی۔ یوں لگتا ہے خان جی اس کی جان لے لیں گے۔''

''جان کیوں؟'' وہ خفگی سے بولی۔ ''اس نے صرف پرس چھینا تھا غاذان۔ چوری کی سزا موت

نہیں ہوتی۔"

"اس نے سولہ سیاحوں کے پرس اور بٹوے چھینے تھے۔جن میں گیارہ کو زخمی بھی کیا تھا اور ان میں (اس کی آواز مدھم ہوگئی) گل بھی شامل تھی۔"

"مگر چور کو موت نہیں دیتے۔" وہ برہم ہوئی۔گل تک پہنچ گئی تھی۔اسے طیش سے بات کرتا دیکھ کے گل بھی الجھتے ہوئے قریب آئی اور اشاروں سے پوچھا۔(کیا ہوا؟) اس نے اشارے سے صبر کرنے کا کہا۔وہ اس کے ساتھ کھڑے ہو کر تحمل سے سننے لگی۔

"عبادہ مذاق کر رہا تھا۔جان نہیں لے رہے۔وہ ایک نشئی ہے چرس پیتا ہے۔اسے بس نشے سے نجات دلا رہے ہیں۔" وہ ہلکے موڈ میں بولا تو عبادہ کو تسلی ہوئی۔"تم ایسی ہی ڈر جاتی ہو۔ہم اتنے بھی ظالم نہیں ہیں۔"

اس نے گردن گھما کے اس کمرے کو دیکھا جہاں بیمار گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔"جانتی ہوں۔" وہ قدرے کرب سے بولی۔

"ٹھیک ہے گل کو بتا دینا۔میں جا رہا ہوں۔خان جی نے اسے دریا سے نکال دیا ہے۔بعد میں بات ہوتی ہے۔اللہ حافظ۔"

"غازان۔" اس سے پہلے کہ وہ فون کاٹتا وہ تیزی سے بولی۔

"ہاں۔بولو۔"

"میرا پرس ملا؟ اس میں میرا سب کچھ ہے۔کریڈٹ کارڈ،شناختی کارڈ،ہسپتال کا کارڈ،بس کارڈ....."

"او کے او کے۔" اس نے تیزی سے اس کی وضاحت ٹوکی۔"مل گیا ہے۔آپ کے پیسوں کے علاوہ سب کچھ سلامت ہے۔میں شام تک آپ کو بھجوا دوں گا۔"

عبادہ پہ سکون کی برسات ہوگئی۔ ''شکریہ۔ بہت شکریہ۔''

''اٹس اوکے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''اللہ نگہبان۔''

''اللہ حافظ۔'' اس نے فون رکھ دیا۔ منتظر سی کھڑی گل بے تابی سے آگے ہوئی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

اس نے لپک کر گل کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھا اور ہلکا سا جھکی۔ ''گل! جس نے تمہیں یہ کٹ (کندھے کی طرف اشارہ کیا) دیا ہے۔ غاذان نے اسے پکڑ لیا ہے اور یوسف خان نے اسے بہت سخت سزا دی ہے۔''

گل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''سزا؟''

''ہاں سزا۔ کڑی سزا۔ غاذان نے کہا اسے نانی یاد دلائی ہے۔'' یکدم وہ سیدھی ہوئی اور آنکھیں سکیڑیں۔ ''اب دیکھنا وہ کسی سیاح کا پرس نہیں چھینے گا اور کبھی کسی لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اسے ہراساں نہیں کرے گا۔''

''ہوں۔'' گل نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ یوسف خان اس کے مجرم کو کڑی سزا دے رہے تھے؟ واقعی؟ اسے یقین کیوں نہیں آرہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مجرم تو کھلے عام گھوم رہا تھا۔ اسے سزا کیوں نہیں دی، ایک پرس چھیننے والے کو نانی یاد دلانے سے کیا ہوگا؟ کیا ثابت کرنا چاہ رہا تھا وہ؟

☆.....☆.....☆

اس نے گل کو ابتہاج کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ گل جذباتی تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر نہیں بولتی تھی۔ اوپر سے اس کا اور ابتہاج کا چھتیس کا آکڑا لگا رہا تھا۔ ایسے میں اسے یہ ساری تفصیلات بتانا اپنی موت لانے کے مصداق تھا۔ اس لیے وہ فی الوقت گل کو لاعلم رکھنا چاہتی تھی۔ ایک دفعہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجائے پھر اسے تفصیل سے سمجھا دے گی۔

حویلی آنے کے بعد گل سیدھا نہانے چلی گئی تھی جب کہ وہ صوفے پر تھکی تھکی بیٹھ گئی۔اس نے جیسے ہی سر پشت سے ٹکایا اور چھت کو گھورنے لگی۔ابتہاج کی زہر خند گالیاں یاد آ گئیں۔اس کے روئیں روئیں میں پھر کڑواہٹ گھل گئی۔

''تم اکیلی کیسے جاؤ گی عبادہ؟ چترال پہاڑی علاقہ ہے۔ہم تمہیں کیسے بھیجیں؟''

''بابا! مجھے وہاں رہائش مل رہی ہے۔سکیورٹی مل رہی ہے اور کیا چاہیے آپ کو؟''

''تم بہت نازک ہو میری جان۔تمہاری طبیعت میں اس طرح کی پختگی نہیں ہے جو ہمیں اس طرح کا فیصلہ لینے میں آسانی دے سکے۔''

''شادی کے لیے آپ کو میری نفسیاتی پختگی نظر آتی ہے لیکن چترال جانے کے لیے نہیں۔کمال کا تضاد ہے بابا۔''

ابا ٹھیک کہتے تھے۔پہاڑی علاقے بہت دشوار ہوتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کے دل بھی پتھر کی سخت ہوتے ہیں،اس میں اتنی نفسیاتی پختگی نہیں تھی۔وہ ایک کمزور لڑکی تھی۔وہ ان لہجوں اور ان رویوں کو سہہ نہیں پائے گی۔

پہاڑی لوگ گالیاں بھی دیتے ہیں اور مارتے بھی ہیں۔اس کے خاندان میں تو آج تک کسی نے دوسرے انسان سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔وہ کیوں نہ گھبراتی،اسے کیوں نہ برا لگتا؟ اگر وہ ان عورتوں کی طرح عادی ہوتی تو اس کی گالی کو ''عام بات'' کہہ کر بھول جاتی لیکن وہ ایسی لڑکی تھی جس نے ایک بھی گالی نہیں سنی تھی۔وہ کیسے بھول سکتی تھی؟ اسے تو شاید ان کے مفہوم بھی نہ بھولیں۔

☆.....☆.....☆

وہ کھانے کی میز پر براجمان تھے۔مستطیل میز کسی میٹنگ روم میں رکھی جانے والی میز کی طرح تھی۔لمبی،چوڑی۔ہر طرف سے فاصلے فاصلے پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔سربراہی نشست پر یوسف

خان براجمان تھا جو اپنے تندرست ہاتھ سے چمچ پکڑے، دم پخت پلاؤ کھا رہا تھا۔ اس کے دائیں طرف چترالی اور بائیں طرف بلتی سرداران بیٹھے ہوئے تھے۔ دائیں طرف پہلی کرسی غاذان کی تھی۔ وہ سر جھکائے مسکراہٹ روک کے کھانا کھا رہا تھا۔

اسے میز پر موجود اس خاموشی پر ہنسی آ رہی تھی۔ بلتی پچھلے دس دن سے یہاں تھے۔ ہر رات اس میز پر شور اور ہنگامے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مرد، عورتوں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ آج بہرام کی سزا دیکھنے کے بعد میز پر صرف چمچوں اور پلیٹوں کی آوازیں تھیں۔ سب خاموشی سے اور خوفزدہ ہو کر کھانا کھا رہے تھے۔ غاذان نے جگ اٹھا کر یوسف خان کے لیے گلاس بھرا تو غیر ارادی طور پر دونوں کی نظریں ملیں۔

غاذان زیر لب مسکرایا۔

یوسف خان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ذہانت کو قبول کیا۔

''اب کوئی رستم کو چھین کر دکھائے۔'' گلاس بھر کے، جگ ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ پھر سے اپنی خالی بوتل بھرنے کے لیے کچن میں آئی تھی۔ اب کی بار اس کا فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچن کی بیرونی دیوار کے ساتھ کئی گھڑونچیاں اور ان پر مٹکے پڑے ہوئے تھے جن میں سارا دن پانی ٹھنڈا رہتا تھا۔ سفید کاٹن کے لمبے گاؤن پر کریم رنگ کی شال اوڑھے اس نے جمائیاں روکتے ہوئے مٹکے کا ڈھکن اٹھایا اور اندر سے گلاس میں پانی نکالا۔ اب وہ کاؤنٹر پر بوتل رکھ کر اس میں پانی ڈال رہی تھی۔

(جانے یہ لوگ ٹونٹی والا کولر کیوں نہیں رکھتے تھے۔)

دفعتاً اس کا کاؤنٹر پہ رکھا فون تھرتھرایا۔اس نے گلاس پیچھے کرتے ہوئے آنکھیں چندھیا کر سکرین کو دیکھا۔مہابت خان کی کال آرہی تھی۔اس نے فون اٹھایا اور کان سے جوڑ دیا۔

''جی کاکا۔''

''ناصر چترال سے نکل گیا ہے۔صبح تک پشاور پہنچ جائے گا۔''انہوں نے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے کاکا۔شکریہ بتانے کا۔اللہ حافظ۔''اس نے فون نیچے کیا پھر وقت دیکھا،رات کے گیارہ بج رہے تھے۔اس نے دوسرا نمبر طارق سر کا ملایا۔ان کو گھنٹیاں جا رہی تھیں۔آخری گھنٹی پر فون اٹھایا گیا۔

''سر!میرا بندہ چترال سے نکل چکا ہے۔وہ صبح تک پشاور پہنچ جائے گا۔آپ اپنے دوست کو بتا دیجیے گا۔''اس نے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے عبادہ۔میں دیکھ لیتا ہوں۔''نرمی سے کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا۔اس نے فون کاؤنٹر پہ رکھا اور واپس مٹکے سے گلاس بھرا۔یہ سلسلہ اگلے دس پندرہ منٹ چلنا تھا۔کیوں کہ ٹوٹنی جو نہیں تھی۔ہونہہ۔

☆.....☆.....☆

صبح ٹھنڈی ٹھنڈی اتری تھی۔ترچ میر کی سفید چوٹی چمک رہی تھی۔آج دھند چھٹی ہوئی تھی جس کے سبب وادیاں اور پہاڑ نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔علاقہ روشن روشن تھا۔

وہ ڈیرے کے باغ میں مسند پر براجمان تھے۔ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے چائے پی رہے تھے۔غازان،ابتہاج،مجاہد اور نعیم کے علاوہ ان کے ساتھ کچھ ملازمین تھے۔بلتی مہمانوں کی کثیر تعداد شندور پہنچ گئی تھی۔جو مہمان رہ گئے تھے،ان کو کھووار یوں کے ساتھ جانا تھا۔فی الوقت وہ گرم چشمہ (چترال کی ایک خوبصورت جگہ) گھومنے گئے ہوئے تھے۔

نعیم اللہ غازان کے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ذرا جھک کے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ مجاہد درخت کے ساتھ کھڑے تھے۔ ہاتھ پشت پہ بندھے ہوئے تھے جب کہ ابتہاج یوسف خان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا رائفل کو کپڑے سے رگڑ رگڑ کے صاف کر رہا تھا۔

''میرے خیال سے بھائی صاحب، ہمیں بلتی مہمانوں کے جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ابھی ان کی عورتیں وہاں موجود ہیں۔ خصوصاً عالیہ صاحبہ۔ وہ شندور روانہ ہو جائیں تو ہم تسلی سے حویلی چلے جائیں گے۔'' مجاہد خان نے آہستہ سے کہتے ہوئے رائے دی۔

''میں ماں سے، ریشم سے اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں یوسف۔ مسفرہ کی قبر پہ بھی جانا چاہتا ہوں۔ تم چاہو تو میرے ساتھ اپنے آدمی بھیج سکتے ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں ملاقات کے بعد فوراً واپس آجاؤں گا اور کہیں نہیں جاؤں گا۔'' نعیم کے لہجے میں لجاجت تھی۔ ''مجھے ان کی یاد آرہی ہے۔ ان گزرتے لمحوں میں ہر پل میں نے انہیں یاد کیا ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے ملنے دو۔ میرے بیٹے ملنے آگئے ہیں۔ میری بیٹیاں حویلی سے نہیں نکل سکتیں۔ مجھے ان کے پاس جانے دو یوسف۔ مجھ پہ اتنا ظلم مت کرو۔ ایک باپ کو ایسے مت آزماؤ۔ مجھے ان کی یاد آرہی ہے۔''

یوسف خان آگے ہوئے، چائے کا کپ سامنے میز پر رکھا۔

''نعیم! میں بابا جان کی وصیت کے آگے بے حد مجبور ہوں ورنہ میں کبھی کسی اولاد پہ اتنا ظلم نہ کروں۔ میرے لیے تم، تمہاری فیملی سب اہمیت رکھتے ہیں لیکن میرے لیے بابا جان کی وصیت مقدم ہے اور چترال کی عزت اولین ترجیح۔ میں تمہیں ملنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' وہ قدرے سپاٹ لہجے میں بولے۔

''مگر میں ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کو دیکھے کئی سال ہو چکے ہیں۔ مجھے ملنے دو یوسف۔''

''نعیم! بابا جان نے..... جو..... وصیت..... کی ہے۔ میں..... اس..... سے..... پھر..... نہیں

سکتا۔'' انہوں نے رک رک کے خشک لہجے میں کہا۔'' میں تمہاری بے قراری سمجھتا ہوں۔ میں فی الحال اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمہاری بیٹیوں کو کسی جگہ بلا کر تم سے ملوادوں۔ رہی بی جان۔ تو ان کی اپنی مرضی۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں تو چترال میں کسی بھی مقام پر مل سکتی ہیں۔ میں خود سے انہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

ان کے سرد انداز پر نعیم اللہ کا چہرہ افسوس میں بدلا۔

''تم اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہو یوسف؟ تمہیں مجھ پہ رحم نہیں آتا۔''

یوسف خان نے ٹھنڈی سی نظر اس کی طرف اٹھائی۔'' آخری بار گلِ لالہ کو تم نے کب دیکھا تھا نعیم؟ (بہت تیزی سے پوچھا) جب وہ سات سال کی تھی۔ اب وہ پچیس سال کی ہے۔ اٹھارہ سال سے یتیم اسیر ہے۔ تمہیں اس کا باپ قتل کرتے ہوئے ذرا رحم نہیں آیا تھا۔''

نعیم کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

''بابا!'' ابتہاج نے تنبیہی نظروں سے انہیں دیکھا۔'' یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ آپ اس مسئلے کا ذکر مت کریں۔''

''مجھے مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' وہ گردن اکڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔'' میں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ تم حویلی نہیں جا سکتے نعیم! تو نہیں جا سکتے۔ اگر تمہیں میرے حکم کے خلاف جانا ہے تو میں بھی اپنے والد کی بقیہ نصیحت پر عمل کروں گا۔''

وہ سفاکیت سے کہتے وہاں سے چلے گئے۔

نعیم کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔ اس نے گھبرا کر غاذان کو دیکھا جس کے چہرے پر سرد تاثر تھا۔ ابتہاج رائفل کی نال میں پھونک مارتے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

''آپ کو رحم کیوں نہیں آیا بابا؟ آپ نے کیسے اپنے بھائی کی جان لے لی؟ آپ کا دل ذرا بھی

نہیں مچلا؟ اتنے سفاک کیسے ہو سکتے ہیں آپ؟'' غاذان نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔ ابتہاج نے چونک کے غاذان کو دیکھا جس کی گردن کی رگیں شدتِ طیش سے ابھر گئی تھیں۔ نعیم بیٹے کے تاثرات دیکھ کے بری طرح ٹوٹ گئے۔ غاذان کی آنکھوں میں ان کے لیے کہیں سے بھی محبت نہیں تھی۔ صرف غصہ ہی غصہ تھا۔

''میں نے..... میں.....''

''خاموش رہیں۔'' اس نے انگشت اٹھا کر کہا۔ ''آپ کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سمجھے۔ آپ یہاں میری سرداری دیکھنے آئے ہیں۔ بہت شکریہ۔ سرداری دیکھیں اور یہاں سے چلے جائیں۔ مہربانی کریں ہم پر۔''

غاذان ان پہ چبھتی ہوئی نظر ڈال کے وہاں سے چلا گیا۔ ان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ابتہاج نے جاتے ہوئے غاذان کی پشت دیکھی۔ وہ بہت لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔

(اتنا کڑوا کب سے ہونے لگا یہ؟)

☆.....☆.....☆

''آج میں تمہیں رستم پہ بٹھاؤں گی۔ اس کی سواری دوسرے گھوڑوں سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ رستم کا قد بہت اونچا ہے۔ وہاں سے گر کر کوئی بھی خودکشی کر سکتا ہے۔'' وہ اپنی ہی بات سے مزہ لیتے ہوئے ہنس پڑی۔ دونوں گاڑی میں بیٹھ کے اصطبل جا رہی تھیں۔ گاڑی وہی بوڑھا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر قدرے فاصلے سے بیٹھی تھیں۔

عبادہ اس کی طرف مڑ کے دیکھ رہی تھی۔

''جب رستم پہ بیٹھو گی تو دنیا تمہیں اپنے قدموں تلے نظر آئے گی اور جب وہ دوڑتا ہے (ہاتھ ایسے پکڑے جیسے گھوڑے پہ بیٹھی ہو) دھگا دھگ دھگا دھگ۔ تب دل حلق کو اچھل جاتا

ہے۔ بٹ۔ مزہ بہت آتا ہے۔ سارا علاقہ اپنی راجدھانی محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شہزادی دولاکھا ایکڑ کا رقبہ اکیلے فتح کر کے آئی ہو۔'' وہ اپنے تخیل میں ڈوب کے کہہ رہی تھی۔

''پھر تو میں ضرور بیٹھوں گی۔'' وہ پرجوش ہو کے کہنے لگی۔

تھوڑی دیر میں وہ اصطبل پہنچ گئیں۔

''میں اصطبل سے رستم کو لے کے آتی ہوں۔ تم چھاؤں میں ہو جاؤ۔ دھوپ آ رہی ہے۔'' وہ اسے تنبیہہ کرتی اصطبل کی عمارت کی طرف چلی گئی۔ عبادہ درخت کی چھاؤں میں چلی گئی۔

گل اندر آئی۔ قطار میں بنی کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ سطح کی صفائی ہو گئی تھی۔ اندر ایک عجیب سی بھڑاس تھی۔ گھوڑوں کی ناقابل برداشت بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ ظاہر ہے باہر گرمی ہی اتنی تھی۔ اصطبل کی چھت اوپر سے تندور بن رہی تھی اور اندر موجود ساری چیزیں سلگ رہی تھی۔

اس نے ایک ایک کوٹھڑی چیک کی، رستم کا کمرہ بھی دیکھا۔ گھوڑا وہاں نہیں تھا۔ وہ اسی طرح باہر آ گئی۔ عبادہ دور کھڑی، آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنائے پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی قریب آ گئی۔

''گھوڑے اندر نہیں ہیں۔ لگتا ہے ملازم باہر لے کے گئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کب آئیں گے۔ تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔'' گل تاسف سے کہنے لگی۔

''اٹس اوکے۔ کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی ابھی دھوپ تیز ہے۔ ہم اندر چل کر انتظار کرتے ہیں۔'' عبادہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے کوارٹر میں لے آئی۔

مہابت خان نہا کر باہر نکلا تھا۔ وہ تولیہ کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں بالٹی پکڑے اوپر موجود بالکونی میں جا رہا تھا۔

''کاکا.....''

مہابت خان اس کی آواز سن کے ٹھٹک گیا۔

''ہم آ گئے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔''ادھر بیٹھک میں بیٹھ جاؤ بچے۔ہم کپڑے بچھا کے آتا ہے۔''

''جی کاکا۔''

وہ دونوں چل کر بیٹھک میں آ گئیں۔

بیٹھک کی کھڑکیاں پیچھے چترال کے دریا اور پہاڑوں کی طرف کھلتی تھیں۔اس وقت پردے ہٹے ہوئے تھے۔ایک دل افروز سا منظر پس منظر میں آ رہا تھا۔دریائے چترال کے بہنے کی سریلی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔بیٹھک کو معمولی سا سجایا ہوا تھا۔ایک طرف کونے میں لکڑی کے صوفے تھے جب کہ دوسری طرف چارپائیاں جہاں گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ان چارپائیوں کے ٹھیک پیچھے ایک باریش آدمی کی تصویر چسپاں تھی۔سر پہ شملہ والی پگڑی، چہرے پر گھنی مونچھیں، سیاہ آنکھوں سے جھلکتا حزن اور اٹھی گردن سے نمایاں ہوتا غرور۔

وہ دونوں بیٹھک میں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''یہ میرے دادا ہیں۔سرور خان کھووار۔'' گل اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔''سولہ سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔یہ یہاں کے سردار تھے۔اصول پسند، کٹر بارعب اور سخی۔ہمیشہ ترجیحات میں چترال کو اول رکھتے تھے۔ان کے نزدیک چترال کی عزت، چترال کی ترقی اور چترال کی بقا سے زیادہ اہم کچھ نہیں تھا۔یہ میرے پردادا سے مختلف قبیلوں کی فرمائش پہ سردار بنے تھے حالاں کہ ان کے بڑے بھائی تھے لیکن پتہ نہیں قبیلے والوں نے ان میں کیا دیکھ لیا۔شاید لیڈر شپ کی طاقت تھی۔(وہ عبادہ کی طرف مڑی) یونو لیڈر شپ کی طاقت کسی کسی میں ہوتی ہے۔ہر کوئی رہنما نہیں بن سکتا۔یہ چوزن ون (منتخب کردہ) ہوتے ہیں جن

میں سر اٹھا کے چلنے کی طاقت ہوتی ہے۔ جن کے سینے میں تیر کھانے کی سکت ہوتی ہے۔ علم پکڑ کے لبیک کہنا آسان نہیں ہوتا۔ لشکر کی پہلی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ نیزہ، تیر، تلوار کا وار پہلے اپنے سینے پر کھانا ہوتا ہے۔ پتہ ہے۔ میرے بابا میں یہ خوبی تھی۔ لیڈر شپ والی۔ بی جان بتاتی ہیں کہ دادا، بابا کو دیکھ کے ہمیشہ کہتے تھے کہ یہ میری پرچھائی ہے۔ یہ چترال کو وہ دے گا جو میں نہیں دے سکا۔ دادا چترال کو جتنا چاہتے تھے، بابا کو اس سے کہیں زیادہ اپنی سرزمین سے محبت تھی۔ انہوں نے تو چترال کے لیے اپنی وکالت بھی چھوڑ دی تھی۔"

آخری بات پہ وہ فخریہ انداز میں مسکرائی۔

"ایک ایسا وکیل جو اپنی بے گناہی کا مقدمہ ہی نہیں لڑ سکا۔" بے چارگی اور تاسف سے بھری یہ آواز مہابت خان کی تھی۔ وہ دونوں چونک گئیں۔ مہابت خان حزن لیے چہرہ کے ساتھ اندر آئے۔

"اگر وہ خاموش نہ رہتے، پوری دنیا کے سامنے اپنی بے گناہی کا جرح کرتے تو اس وقت تمہارے سامنے موجود ہوتے۔" وہ آگے آئے اور سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ "اس نے دنیا کو خود پہ چڑھنے دیا۔ خود کو روندنے دیا اور دیکھو، دنیا نے اس پر رحم بھی نہیں کیا اور اس کو ختم کر دیا۔"

گل کے چہرے پر ملال در آیا۔ ایک بے عیب سی ویرانی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ عبادہ نے بغور اس کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھا۔ اس کو کاکا کی بات ناگوار گزری تھی۔ کمرے میں ایک طلسماتی سی خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں اپنے اپنے ماضی میں چلے گئے تھے۔ عبادہ کھنکاری اور ذرا جوش سے آگے ہوئی۔

"کاکا! گھوڑے کہاں ہیں؟ اصطبل خالی ہے۔" ماحول کی تلخی دور کرنے کے لیے وہ موضوع بدلنے لگی۔

"گھوڑے چرنے گئے ہوئے ہیں بچے....."

''اور رستم؟ رستم کہاں ہے؟''

''ندی کے پاس اس کو نہلانے لے کے گئے ہیں۔''

''اوہ..... پھر تو جلدی واپس آجائے گا۔'' اس نے مسکرا کے گل کو دیکھا۔

''جب آئے گا میں تب تمہیں دکھاؤں گی کہ اس کی سواری کتنی شاندار ہے۔'' گل نے فوراً اپنے تاثرات ٹھیک کیے۔ وہ ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلخی کو کم ہی خود پہ حاوی ہونے دیتی تھی لیکن بعض اوقات لوگ اس زخم کو کھرچ دیتے جس زخم کی پرت ابھی چڑھی ہوتی تھی۔

''مجھے بہت excitement ہو رہی ہے۔ میں پہلی بار کسی فرائز لینڈ گھوڑے پر بیٹھوں گی۔'' عبادہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مہابت خان دونوں کو اچنبھے سے سن رہا تھا۔ ''تم نے میری اچھی اچھی تصویریں لینی ہیں تاکہ جب میں لاہور جاؤں تو سارے ہسپتال کو جلا جلا کر ماردوں۔''

''میسنی۔'' گل نے سر جھٹک کے کہا۔

مہابت خان چونکتے ہوئے آگے ہوا۔ ''گل بچے تم رستم کے لیے آیا ہے؟''

''جی کاکا۔''

مہابت خان کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ''تم رستم پہ گھڑ سواری مت کرو بچے..... کسی دوسرے گھوڑے پہ کرلو.....'' وہ دھیرے سے بولے۔

''کیوں کاکا؟'' وہ پریشان سے ہوگئی۔ ''رستم پہ کیوں نہیں؟''

''ابتہاج خان جی اسے لے کے گیا ہے۔'' مہابت خان نے اس کی سماعتوں میں بم پھوڑا۔ گل کا رنگ فق ہوا۔

''کس کی اجازت سے وہ لے کے گیا ہے میرے گھوڑے کو؟'' وہ پورے اشتعال سے کھڑی ہوئی۔

''خان بھلا کس کی اجازت لیتا ہے بچے؟'' مہابت خان نے ناک سے مکھی اڑائی۔

''رستم میرا گھوڑا ہے کاکا۔ میں نے آپ کو منع کیا تھا ناں کہ اسے کسی کو نہیں دینا پھر ابتہاج اسے کیوں لے کے گیا ہے۔'' وہ بری طرح تیورا گئی تھی۔

''وہ گھوڑا نہیں لے رہا۔ نہلانے لے کے گیا ہے۔ ابھی واپس آجائے گا۔'' مہابت نے بڑی مشکل سے جھوٹ بولا۔

''اسے فون کریں اور کہیں ابھی اسی وقت لے کر آئے اسے۔''

''وہ بہت ناراض ہو جائے گا۔''

''میں نہیں ڈرتی اس کے غصے سے۔ اسے کہیں رستم کو واپس لائے۔'' وہ ضد سے بولی۔ مہابت خان نے بادلِ نخواستہ فون اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اس نے ابتہاج کو کال ملائی، کچھ بات کی اور واپس اندر آیا۔ گل کھڑی اپنا غصہ ٹھنڈا کر رہی تھی۔

''آرہا ہے۔'' مہابت خان نے بتایا۔

''میں دیکھتی ہوں اسے۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے جاہل، گنوار انسان۔'' وہ بھنا کے کہتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ عبادہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔ گل ہذیانی انداز میں سیڑھیاں اتر کے نیچے آئی اور ہاتھ کا چھجا بنا کر پولو میدان کے اختتام پر موجود دریا کی سمت والا دروازہ دیکھا۔ وہ کھلا تھا۔

وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ عبادہ بھی منتظر سی کھڑی ہو گئی۔

''وہ ہمیشہ میری چیزوں پہ قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلے میرا کمرہ مجھ سے چھینا۔ کتنی مار پڑی تھی مجھے اس پہ۔ یاد ہے آپ کو۔ آپ کو کیسے یاد ہوگا۔ آپ تو ادھر تھے۔ اصطبل میں۔ اس نے بابا کا رائفل لے لیا۔ اب بابا کا گھوڑا بھی چھین رہا ہے۔ میں بتا رہی ہوں۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ جارحانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں اسے دوسری سمت سے ابتہاج آتا ہوا دکھائی دیا۔اس نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔شلوار کے پائنچے گیلے نیچے سے کیچڑ سے سرخ تھے۔قمیص کا دامن بھی نم تھا۔آستین اس نے کہنیوں تک چڑھائی ہوئی تھی۔وہ سر پہ پکول رکھے،ہاتھ میں رائفل اٹھائے عظیم سلطنت کا اکلوتا ولی عہد بن کے اس طرف آرہا تھا۔وہ اکیلا تھا۔رستم ساتھ نہیں تھا۔اس کے ڈگ اتنے لمبے تھے کہ لان کا وہ بڑا قطعہ اس نے چند قدموں میں عبور کیا تھا۔عبادہ نے نتھنے پھلا لیے۔(یہ گھٹیا انسان اور اس کا سامنا۔ہونہہ)

وہ قریب آیا تو گل تیورا کے اس کے پاس پہنچی۔اس کے زخم میں پسینے کی نمی پڑنے سے جلن ہو رہی تھی۔یہی جلن اس کے دل اور خون میں بھی ہو رہی تھی۔ابتہاج آنکھوں میں شرارت لیے کھڑا تھا۔اوپر کوارٹر کی کھڑکی سے مہابت خان سر نکالے اس حالت میں کھڑے تھے جس حالت میں بارودی سرنگ پہ پیر رکھنے والا سپاہی کھڑا ہوتا ہے۔

''رستم کہاں ہے؟'' گل نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''جہاں اسے ہونا چاہیے۔'' ابتہاج نے پرسکون انداز میں بتایا۔

''کہاں؟''

''شہ زور میں۔''

''شہ زور میں کیوں؟تم تو اسے نہلانے لے کر گئے تھے۔''

''نہلا لیا ہے محترمہ۔اب شندور لے کے جا رہا ہوں۔'' ابتہاج نے وزنی رائفل ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کیا۔

''شہ زور میں؟ شندور۔کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' گل کے ساتھ ساتھ عبادہ بھی الجھ گئی۔ابتہاج کے چہرے پر لاعلمی جھلکی۔اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔کھڑکی میں کھڑا مہابت خان

بوکھلا گیا۔

''کیوں کاکا! تم نے تو فون پہ کہا تھا وہ آخری دفعہ رستم سے ملنا چاہتی ہے؟ اسی لیے حویلی سے آئی ہے۔'' وہ آنکھیں میچ کے دیکھ رہا تھا۔ سورج عین اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ ''اس کو تو علم ہی نہیں ہے وہ کہاں جا رہا ہے۔ تم نے جھوٹ بولا مجھ سے؟''

''کک..... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' گل کا دل پوری قوت سے دھڑکا۔

''تمہیں..... یعنی گل لالہ کو..... رستم کے بارے میں نہیں پتہ؟ کیا میں کچھ غلط سن رہا ہوں؟'' وہ پوری طرح بن رہا تھا۔

''مجھے بتاؤ ابتہاج۔'' اس نے ابتہاج کے کالر پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچا۔ ''کیا مطلب ہے تمہاران باتوں سے؟ رستم کے ساتھ کیا کیا؟ (یکدم اس کی آنکھوں میں کچھ کھبا) کہیں تم لوگوں نے اسے بیچ تو نہیں دیا؟''

''جنگلی بلی..... اپنے پنجے پیچھے کرو۔'' ابتہاج نے پوری قوت سے اپنا کالر چھڑا کے اسے دھکا دیا۔ ''بیچا نہیں ہے۔ بھیجا ہے۔ یوسف خان جی نے اسے شندور کے پولو کے لیے انعام کے طور پر وقف کیا ہے۔ جو کھلاڑی میچ کا آخری داؤ کھیلے گا۔ اسے رستم ملے گا۔ یہ ٹرافی چترال کی تاریخ کی سب سے بڑی ٹرافی ہوگی۔'' وہ بہت جوش سے بتا رہا تھا۔ مہابت خان کے پیر کے نیچے سرنگ پھٹ گئی۔

گل لالہ پر چترال آن گرا۔

''کیوں کیا ہوا؟ تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟ چچی اور امی نے بھی نہیں۔ غاذان اور مہابت خان نے بھی نہیں۔'' وہ ہمدردی سے اسے دیکھنے لگا۔ ''چک چک۔ افسوس ہوا گل۔ بہت افسوس ہوا۔ رستم تو اب گیا۔ اب وہ تمہیں کبھی نہیں مل پائے گا۔'' وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ اوپر کھڑے مہابت

خان کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے۔

''نہیں۔نہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا۔تم مذاق کر رہے ہو۔'' گل نے بے رحمی سے تردید کی۔

''تمہارا اور میرا کوئی مذاق ہے گل لالہ؟'' اس نے سرد مہری سے کہتے ہوئے اسے دیکھا۔گل کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ابتہاج پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں۔ہرگز نہیں۔نہیں۔'' گل بے یقینی سے کہتی ایک قدم پیچھے ہوئی۔''ایسا نہیں ہوسکتا۔تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے ہو۔میرے رستم کو وقف نہیں کر سکتے۔وہ میرا ہے۔وہ میرے پاس رہے گا۔میں اسے نہیں جانے دوں گی۔'' وہ حواس باختہ انداز میں کہتی اس سمت بھاگی جہاں سے ابتہاج آیا تھا۔ابتہاج بری طرح گڑبڑایا۔

''گل!رک جاؤ میری بات سنو۔'' عبادہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

دونوں کو رستم کے پاس جاتا دیکھ کے ابتہاج کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔اگر گل وہاں گئی تو سوچ سے بڑھ کر تماشا کرے گی اور رستم.....رستم تو پہلے ہی بپھرا ہوا تھا۔ابتہاج سے سنبھل نہیں رہا تھا۔گل کو دیکھ کے وہ مزید طیش میں آجائے گا اور پھر اسے ہاتھ لگانا بھی مشکل ہو جائے گا۔اسے شندور کیسے لے کے جائیں گے؟نہیں۔نہیں۔اس کے معدے میں تتلیاں گھومیں۔

وہ رائفل سنبھالتا فی الفور گل کے پیچھے بھاگا۔

گل اب دروازے سے نکل کے باہر آگئی تھی۔اس سے بیس قدم کی دوری پر دریائے چترال ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔چیڑ اور صنوبر کے اونچے درخت دریا کے کنارے قطار میں لگے ہوئے تھے۔دریا کے دوسری سمت کالا پہاڑ تھا جس سے ریت پھسلتے ہوئے نیچے آرہی تھی۔سو قدم دور ایک شہ زور کھڑی تھی۔سفید رنگ کی درمیانے سائز کی لوڈنگ کی گاڑی جس میں رستم کو لادا ہوا تھا۔

رستم اس سے سو قدم کے فاصلے پر تھا.....صرف سو قدم.....

''رستم.....'' وہ چیختی ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگی۔

عبادہ اس کے پیچھے تھی۔گل مسلسل رو رہی تھی جس سے اس کی آنکھیں بار بار چندھیا جاتیں اور وہ ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے آنسو پونچھ لیتی۔شہ زور کے ساتھ کچھ مرد کھڑے تھے۔گل کو چلچلاتی دھوپ میں اپنی طرف آتا دیکھ کے وہ بری طرح گڑبڑا گئے۔

''گاڑی چلاؤ۔گاڑی چلاؤ۔'' پیچھے سے بھاگ کے آتے ابتہاج نے مقامی زبان میں ہاتھوں کے اشارے سے چیختے ہوئے کہا۔

''نہیں۔رکو۔رستم۔'' گل منت آمیز لہجے میں بولی۔اس کی آواز سن کے شہ زور میں بیٹھے رستم کے جسم میں والہانہ جنبش ہوئی جیسے کوئی محبوب آواز سنی ہو۔وہ بے چینی سے ہنہنایا۔

''گاڑی چلاؤ خانہ خرابو۔کیا دیکھ رہے ہو؟'' ابتہاج دانت پیستا ہوا بولا۔رستم گاڑی میں بے چین سا ہونے لگا تھا۔ملازموں نے پھرتی دکھائی اور دھپ دھپ گاڑی میں بیٹھ گئے۔گاڑی کے انجن کی آواز ابھری،گڑگڑاہٹ اور ایک ہی جھٹکے میں وہ زن سے آگے بڑھنے لگی۔

''نہیں۔'' گل کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔وہ شندور نہیں جا سکتی تھی۔اسے اجازت نہیں تھی۔وہ رستم کو صرف یہیں روک سکتی تھی۔اسی جگہ۔

''رستم.....رستم.....'' وہ بے بسی کی حد پر چلانے لگی۔اسی لمحے رستم بری طرح ہنہنایا لیکن وہ کوئی ردعمل نہیں دے سکا۔اس کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے ابتہاج نے اسے کئی رسیوں،زنجیروں سے باندھا ہوا تھا۔وہ ان آہنی بیڑیوں کو توڑ کر گل کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔

گاڑی بہت دور چلی گئی تھی۔گل کی ٹانگیں بے دم ہونے لگیں۔جب وہ اس جگہ پہنچی جہاں گاڑی کھڑی ہوئی تھی،تو اسے محسوس ہوا کہ اب وہ سو قدم نہیں،سو میٹر دور ہو گئی ہے۔نظروں سے رستم اوجھل ہو گیا تھا۔گاڑی کی آواز ختم ہو گئی تھی۔

گل نے بے اختیار گھٹنے پکڑ لیے۔ ''رستم۔رستم میرا بچہ۔'' وہ بری طرح ہانپنے لگی۔اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔پسینہ پانی بن کر اس کی گردن، مونڈھوں اور چہرے پر بہہ رہا تھا۔وہ ہار گئی تھی۔رستم چلا گیا تھا۔

''گل.....'' عبادہ نے اس کے ساتھ ہی بریک لگائی۔

''آآ.....'' گل بے ساختہ چیخ پڑی۔

''چلا گیا۔'' ابتہاج کی اطمینان بھری آواز دونوں کے کانوں میں پڑی۔گل کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں میں سکتہ آیا۔وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ابتہاج چند قدم دور تھا۔مسکرا رہا تھا۔پسینہ سے وہ بھی تر تھا لیکن خوش تھا۔

''تم نے کیا ہے ناں یہ سب۔تم نے ہی کہا ہوگا۔لالچی۔کم ظرف۔گھٹیا انسان۔تم نے ہمیشہ میری چیزوں پہ نظر رکھی ہے۔کمینے۔'' وہ چیخ چیخ کے کہتی ابتہاج پہ جھپٹی، اسے لات مار کے نیچے گرایا، اس کے سینے پہ چڑھی اور پے در پے اسے مکے، گھونسے اور تھپڑ مارنے لگی۔

ابتہاج کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔وہ اس کے ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ اپنا چہرہ بھی مشکل سے بچا رہا تھا۔اس کی پکول اور اس کا رائفل کہیں دور گر گئے تھے۔منہ سے خون رسنے لگا تھا۔

''پیچھے ہو جاؤ بے حیا عورت۔نیچے اترو۔چھوڑو مجھے۔''

''چیپ۔لعنتی انسان۔رستم صرف میرا ہے۔صرف میرا۔میں تم لوگوں کو اسے چھیننے نہیں دوں گی۔''

اور یکدم ہی ابتہاج کے ہاتھ میں اس کی کلائیاں آ گئیں۔اس نے جھٹکے سے اسے نیچے اتارا اور بری طرح دھکا دیا۔گل نے منہ کے بل کئی قلابازیاں کھائیں۔وہ جست لگا کر ریسلر کی طرح کھڑا ہو گیا۔

''ذلیل۔خبیث۔گھٹیا عورت، تم نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا ہے؟ ابتہاج خان پہ۔'' اس نے بازو

سے منہ سے رستا خون تھتکار دیا۔ ''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ مارنے کی۔ ہاں؟'' ابتہاج نے جھک کر اسے بالوں سے پکڑا، ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔

''ابتہاج! چھوڑ دو اسے.....'' عبادہ تیزی سے مزاحمت میں آگے آئی۔ وہ یکدم ٹھہر گیا۔ پہلے آنکھیں میچیں پھر گہری سانس لی اور گل کو ساتھ گھماتا پورے قد سے اس کی طرف مڑا۔

''تم.....اس سب کی جڑ تو تم ہو.....سزا تو تمہیں ملنی چاہیے.....'' وہ شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

''ابتہاج نہیں.....'' اس سے پہلے کہ عبادہ وارن کرتی ابتہاج نے اس کا بازو دبوچا اور پوری طاقت سے آگے دھکا دیا۔ وہ گل کے ساتھ بری طرح ٹکرائی۔ سر سے سر ٹکرانے کے بعد اس کی کرب ناک سسکی نکلی۔ سارا جہان آنکھوں کے سامنے گھوم گھوم گیا۔

''لگاتا ہوں میں تم دونوں کو ٹھکانے۔ میں نے بہت سہہ لیا۔ تم لوگوں نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا۔ عورت ہو کے مجھ پہ؟ تھو۔ تھو۔'' اس نے خون کو تھوک دیا۔ وہ دونوں اس کے دونوں ہاتھوں میں تھیں۔ گل کے بال اور عبادہ کا بازو۔

''چھوڑو مجھے۔ چھوڑو ابتہاج۔'' عبادہ اپنے لمبے نوکدار ناخن اس کے گوشت میں دھنس رہی تھی لیکن ابتہاج کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں کو گھسیٹ کے گاڑی تک لایا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس سے دونوں آئی تھیں۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا۔ دونوں کو دھکے دے کے اندر بٹھایا۔ بوڑھا ڈرائیور بری طرح گھبرا گیا۔ ابتہاج کے منہ سے نکلتا خون کالر اور قمیص کے بٹنوں پر لگ گیا تھا۔

اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا، جھکا اور ڈیش بورڈ کے نیچے والے دراز سے کچھ نکالا۔ جب تک کہ وہ سیدھا ہو کر باہر نکلتا، پچھلا دروازہ کھلا اور عبادہ زن سے باہر نکلی اور اس سے قبل کہ عبادہ کچھ کرتی، ابتہاج نے پستول اس کے ماتھے پر تان لی۔ عبادہ کی ساری حرکت تھم گئی۔

''بہت ہوشیار ہو تم لاہور کی ملکہ؟ ہاں۔'' اس نے پستول کا ہیمر نیچے کیا اور گولی بھر لی۔

''تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو ابتہاج۔ میں بتا رہی ہوں یہ بہت غلط ہے۔'' وہ کانپتے لبوں کے ساتھ بولی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے یوں اس پر پستول تانی تھی۔

''بکواس بند کرو۔ اندر بیٹھو۔''

''تم نہیں بچو.....''

''اندر..... بیٹھو۔'' اس نے عبادہ کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کے سیٹ پہ گر گئی۔ وہ بجلی سی تیزی سے اندر آیا لیکن بیٹھنے سے پہلے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ''گاڑی چلاؤ اور حویلی چلو۔'' پھر کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور تھر تھراتے ہوئے بیٹھ گیا، گاڑی کا انجن گرمایا اور زن سے گاڑی ریورس کی۔

''بہت بدمعاشی آتی ہے تم دونوں کو..... ابھی بتاتا ہوں..... تم لوگوں کو تمہاری اوقات یاد نہ دلائی تو میرا نام ابتہاج یوسف خان نہیں۔'' وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ پیچھے گل اور عبادہ کے ساتھ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول عبادہ پہ تنی ہوئی تھی اور وہ بار بار منہ میں آتا خون تھوک رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ حویلی پہنچ گئے۔

گاڑی رکتے ہی ابتہاج نے پستول گل کے سر پر رکھی۔

''اترو۔''

گل جس کا سانس رک رہا تھا۔ بمشکل نیچے اتری۔ عبادہ بھی نیچے آئی۔ دونوں کے ساتھ ابتہاج باہر آیا۔

''چلو آگے۔'' وہ دونوں کو باندیاں بناتا حویلی کے اندر لے آیا۔

حویلی کے صحن میں عورتیں کام کر رہی تھیں۔ ابتہاج کو آتا دیکھا تو پردے کی غرض سے جلدی جلدی یہاں وہاں دبک گئیں۔ وہ دونوں کو صحن کی راہداری کی سیڑھیوں پر لایا اور دونوں کو زوردار

دھکا دیا۔ وہ سیڑھیوں سے پھسل کر بری طرح لڑکھڑاتی ہوئی صحن میں جا گریں۔ عبادہ گھٹنا مڑنے سے منہ کے بل گری۔ اس کی ہتھیلیاں چٹیل فرش سے بری طرح رپٹ گئیں۔ گل بھی دائیں کروٹ ٹھاہ سے جا لگی تھی لیکن وہ پہاڑی لڑکی تھی۔ وہ یکدم باکسر کی طرح کھڑی ہوگئی۔

"یہاں لا کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم۔ ہاں۔ میں یہاں بھی وہی بولوں گی جو وہاں بولا تھا۔ رستم میرا ہے (وہ پوری وقت سے چلائی)۔ سنا تم نے ابتہاج یوسف خان۔ رستم میرا ہے۔ اسے کسی کا باپ بھی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

حویلی میں موجود خواتین شور سن کے کھڑکیوں، کوچوں اور کھدروں سے جھانکنے لگیں۔

"چلاؤ۔ جتنا چلا سکتی ہو۔ اپنا حلق پھاڑ لو۔ میں دیکھتا ہوں تمہاری کون سنتا ہے۔" ابتہاج پورے اطمینان سے صحن کی سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا، پستول ہاتھ میں لٹکا لی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"چلاؤں گی۔ تمہارے ان کانوں کے پردے پھاڑ ڈالوں گی۔ جو میرے بس میں ہوگا میں کروں گی۔ میں رستم کو تم لوگوں کو نہیں لے جانے دوں گی۔" وہ ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی پھر اس نے سر اٹھایا اور چاروں اور دیکھا۔ "رستم ..... میرا ..... ہے ..... صرف میرا ..... سن لیا سب نے ..... رستم صرف گل لالہ کا ہے ..... صرف گل لالہ کا ....."

اس کی گونجتی ہوئی آواز سن کے موٹی چچی اور بریخنہ اوپر والی راہداری میں وارد ہوئیں۔

"گل ....." بریخنہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"آجاؤ۔ سب آجاؤ۔ چھپ کیوں رہی ہو۔ پردہ کیوں کر رہی ہو؟ یہ مرد نہیں ہے۔ نامرد ہے جو اپنی ہی گھر کی عورت کو بندوق کی نال پہ گھسیٹتا ہوا لایا ہے۔ باہر آجاؤ سب۔ دیکھو تماشا۔ اس حویلی نے مجھ سے سب چھینا ہے۔ میرا سکون۔ میری خوشیاں۔ میرے بابا۔ میری یادیں۔ میری ماں اور اب میرا رستم چھین رہی ہے۔ دیکھو۔ میں بھی تم جیسی لڑکی ہوں۔ مجھے کتنا محروم کیا ہے ان سب نے۔"

عبادہ رونے لگی تھی۔ وہ مشکل سے پیچھے ہوئی اور تخت سے پشت لگالی۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ پہاڑی لڑکی نہیں تھی۔ وہ معصوم اور نازک سی لاہوری لڑکی تھی۔ بے جان اور نیم مردہ سا سر اس نے تخت سے ٹیک دیا۔

''گلے! کیا تماشا ہے یہ؟'' موٹی چچی اپنی رعب دار آواز میں کہتی نیچے آئیں اور اس سے پہلے کہ گل کچھ کہتی، ان کی نظر ابتہاج پہ پڑی۔ اس کا خون سے سرخ لباس دیکھ کے وہ مچل کے اس کے پاس بھاگیں۔

''ابتہاج؟ کیا ہوا بچے۔ تم ٹھیک ہے۔''

''وہ ٹھیک ہے موٹی چچی۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہیں صرف میں زخمی ہوں۔ اس وقت میرا خون نکل رہا ہے۔'' وہ حواس باختہ انداز میں چلا رہی تھی۔ اپنے اعصاب پر قابو نہیں تھا۔ اس حویلی جہاں عورتوں کی آواز کا باہر جانا ممنوع تھا، وہ پورے اختیار سے چلا رہی تھی۔

''گل! کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟'' برمنہ تڑپتے ہوئے آگے آئی۔ (ماں کو چلانا نہیں، رونا نظر آیا تھا۔)

''رک جاؤ..... وہیں رک جاؤ چچی..... خبردار جو ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا۔'' اس نے انگشت اٹھا کے انہیں بری طرح وارن کیا۔ ''مجھ سے ہمدردی مت کرنا۔ میرا ماتم کرو۔ جیسے میں کر رہی ہوں۔ میرا رستم جا رہا ہے۔ میرا بچہ جا رہا ہے۔ میری روح نکل رہی ہے۔ سب میرے سکون کا تماشا دیکھو یہاں۔ کیا دیا ہے تم لوگوں نے مجھے آج تک؟ سوائے غارت کے، تکلیف کے، محرومیوں کے؟ کہاں کھڑی ہوں میں؟ حسرتوں کی دہلیز پہ..... اکیلی۔ تنہا۔ لاوارث۔''

اس کا گلا بیٹھ نہیں رہا تھا۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔ ہاں وہ کرچی کرچی ہو گئی تھی۔

''آواز نیچے کرو بے حیا لڑکی۔ یہ حویلی ہے۔'' چچی نے غراتے ہوئے کہا۔ اوپر راہداری سے

عالیہ گودائی نے نیچے جھانکا۔صحن میں فاصلے فاصلے سے سب کھڑے تھے۔گل عین وسط میں تھی۔

''یہ قید خانہ ہے۔یہ میری کال کوٹھڑی ہے۔یہ حویلی نہیں ہے۔اسے حویلی مت کہیں۔کیوں کہ یہاں انسان نہیں بستے۔یہاں جانور رہتے ہیں۔دوسروں کے حق پہ ڈاکہ ڈالنے والے وحشی درندے ہیں یہاں۔''

اور اس کی یہ اونچی آواز مردان خانے میں موجود مجاہد خان نے سن لی۔ان کے کان ایسے کھڑے ہوگئے جیسے خطرے کے وقت خرگوش کے ہوتے ہیں۔وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے زنان خانے کی طرف بھاگے تھے۔

''میں رستم کو نہیں لے جانے دوں گی چاہے کچھ بھی ہوجائے۔رستم کسی کا انعام نہیں۔کسی کی ٹرافی نہیں۔وہ میری ملکیت ہے۔میری ذاتی ملکیت۔میں اسے ہڑپنے نہیں دوں گی۔''اس کے آنسو ٹپ ٹپ گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔

''تم کوشش کرلو بدصورت عورت۔کرلو جتنی بے حیائی کرنی ہے۔رستم تمہیں پھر بھی نہیں ملے گا۔رستم صرف مردوں کی شان ہے۔تمہاری اوقات بھی نہیں ہے اسے اپنانے کی۔''ابتہاج نے پوری طرح زہر اگلا۔

موٹی چچی اس کے پاس بیٹھ کے اس کا خون اپنے پلو سے صاف کررہی تھی۔کمرے میں جائے نماز بچھا کر نوافل ادا کرتی بی جان چونکیں پھر اپنی تسبیح وہیں چھوڑ دی اور جائے نماز کا کونہ موڑتے ہوئے بمشکل اٹھیں اور باہر آگئیں۔

''میرے بابا نے وہ مجھے دیا تھا۔وہ میرا باپ کا خریدا ہوا گھوڑا ہے۔اگر وہ تم مردوں میں اتنی قابلیت دیکھتا تو مجھے رستم نہ دے کر جاتا۔اس نے میرا نام لیا تھا۔اس نے کہا تھا رستم گلِ لالہ کا گھوڑا ہے۔تم نے خود سنا تھا ابتہاج۔اب تم روگردانی مت کرو۔میں تم لوگوں کو رستم کو لے جانے کی

اجازت نہیں دوں گی۔ وہ میرا گھوڑا ہے میرے پاس رہے گا۔ وہ میری ملکیت ہے۔"

"بٹوارہ نہیں ہوا جو تم ہر چیز کو اپنا کہہ رہی ہو۔ وہ سب کا ہے۔ سب کا حصہ ہے اس میں۔" موٹی چچی نے ناک چڑھا کے کہا۔

"کسی کی ملکیت نہیں ہے بھابھی اس میں۔ کلیم خان نے رستم گلِ لالہ کو دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بلوری کو وہی لائے تھے۔ خود خرید کر۔ انہیں داجی نے بلوری نہیں دی تھی اور جب چیز اپنے پیسوں سے خریدی جائے تو اس میں کوئی وراثت شامل نہیں ہوتی۔" بریخنہ نے ان کی طبیعت صاف کی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ کیوں شور کر رہی ہو گل؟" مجاہد خان اپنی شال سنبھالتا راہداری میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے ملازماؤں کے ساتھ چلتی ہوئی بی جان بھی آ گئی تھیں۔

"دیکھو حویلی والو۔ میرا جعلی باپ مجھ سے پوچھ رہا کہ میں شور کیوں کر رہی ہوں؟ کیوں چچا۔ آپ کو کسی نے نہیں بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی کی اس اکلوتی بیٹی سے اس کا آخری حق بھی چھین لیا گیا ہے؟" وہ قدم قدم چلتی ان کے قریب آئی۔ "کیوں بی جان۔ اپنے راج دلاروں کو آپ نے نہیں بتایا کہ میرا رستم جانے والا ہے؟ میں ایک بار پھر اس حویلی کی بھینٹ چڑھنے والی ہوں؟"

بی جان کے چہرے کا رنگ فق ہوا۔

"رستم کا فیصلہ یوسف خان جی نے کیا ہے گل۔ اس پہ اتنا واویلا مت مچاؤ۔" مجاہد خان سختی سے بولے۔

"آف کورس چچا۔ آف کورس۔ ایسا اور کون کر سکتا ہے۔ یوسف خان، اس کا بیٹا، اس کی بیوی کے علاوہ میری زندگی میں زہر کون گھول سکتا ہے؟ میرا جینا حرام کرنے کا ٹھیکہ اس خاندان نے ہی تو لیا ہے۔" وہ پوری نفرت سے پھنکاری۔ عالیہ گودائی نیچے اتر کے اب ستون کے ساتھ کھڑی تھیں۔ یہ سارا ماجرا وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''تمیز سے بات کرو۔ وہ بڑے ہیں تم سے۔''

''تمیز سے بات..... ہونہہ۔'' اس نے منہ بنا کر سر جھٹکا پھر اس نے گم صم کھڑی بی جان کو دیکھا۔ ''بی جان! سن رہی ہیں آپ؟ یہ آپ کے بڑوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے میرے بارے میں ایک اور فیصلہ کیا ہے۔ میرے رستم کو شندور کے لیے وقف کر رہے ہیں۔ میں جو رستم کی مالک ہوں۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا۔ مگر (وہ ٹھہری) آپ کو بتایا تو ہوگا۔ ہے ناں؟'' وہ بے یقینی سے کہتی قدم قدم اوپر چڑھ کے ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''آپ کو یاد ہے داجی نے کیا کہا تھا؟ داجی نے مجھے، چچی (بریخنہ) یوسف خان، آپ کو، مجاہد چچا کو سب کو سرہانے بلا کر کیا وصیت کی تھی؟ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر آپ سب کو مخاطب کر کے کیا کہا تھا؟ یاد ہے آپ لوگوں کو یا میں یاد دلاؤں؟''

بی جان کا تنفس تیز ہونے لگا۔ انہوں نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ مجاہد خان جو انہیں دیکھ رہا تھا، تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

''چپ ہو جاؤ گل۔ اماں جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' انہوں نے تنبیہہ کی۔

''کیوں چپ ہو جاؤں؟ یہ تو بڑوں کا فیصلہ ہے۔ بڑوں میں بی جان بھی آتی ہیں۔ ان کی مرضی سے یہ سب ہوا ہوگا۔ کیوں بی جان۔ بتائیں مجھے؟ کیا آپ کو میری محرومیاں نہیں نظر آئیں؟ آپ کو میری کمیاں، میری کمزوریاں ہی نظر آئی تھیں۔ کیوں؟ کیوں رکھ دیا آپ نے میری شہ رگ پہ ہاتھ؟ کیوں کاٹی ہے میری سب سے دکھتی نس؟'' وہ بلبلا کے رو پڑی۔ بی جان ڈگمگانے لگی تھیں۔

''آپ کو ذرا سا میرا خیال نہیں آیا۔ اپنے مرے ہوئے بیٹے کا خیال نہیں آیا؟ مجھ یتیم پہ اتنا تو ترس کھا لیا ہوتا۔ میں پوتی ہوں آپ کی۔ غیر سے تھوڑے ہی لائے تھے بابا مجھے۔ پیدا کیا تھا۔ آپ کے مقتول بیٹے کی اکلوتی نشانی ہوں میں۔ ان رگوں میں (اس نے کلائی آگے کی) اس کا خون بہہ

رہا ہے۔ مجھ پہ ایسا ظلم تو نہ کرتیں۔ میری جان لے لیتیں۔ مجھ سے رستم نہ چھینتیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے رونے لگی۔

"میں..... مجاہد..... یہ کیا..... کیا....." بی جان بری طرح ہانپنے لگی تھیں۔

"گل! چپ کر کے اندر جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گی۔ میں رستم کا فیصلہ کر کے ہی دم لوں گی۔ رستم صرف میرا ہے سمجھے آپ۔"

"رستم کو بار بار اپنا مت کہو۔ وہ سب کا ہے۔ صرف تمہارا نہیں ہے۔ پوری حویلی کا حصہ ہے اس میں۔" موٹی چچی نے جل کے کہا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے، اس کے نتھنے پھول گئے، آنکھوں میں خون سا اترا۔ وہ سرعت سے نیچے آئی، چچی کی طرف بڑھی۔

"گل....." ابتہاج نے تنبیہ کی۔

وہ نہیں رکی، ایک قدم دور، ہاتھ بڑھایا، موٹی چچی کی موٹی گردن پکڑ لی اور انہیں دھکا دے کے ستون سے جوڑ دیا۔

"کیا کہا؟ ایک بار پھر کہو۔ کس کا ہے رستم؟"

موٹی چچی بری طرح کھانسی۔

"گل....." ابتہاج تیزی سے اس کے ہاتھوں پہ جھپٹا۔ مجاہد خان نے بی جان کو چھوڑا اور بھابھی کی جان بچانے کے لیے بھاگے۔ گل کی آنکھوں میں خون اترا تھا۔ اس نے موٹی چچی کی شہ رگ کو ناخن اور انگلیوں کی مدد سے دبوچا ہوا تھا۔

"بولو کم ظرف عورت۔ رستم کس کا ہے؟" اس نے اپنی انگلیاں ان کی رگوں میں دھنسا دیں۔ شدت سے ان کی آنکھیں ابلنے لگی تھیں۔

"گل چھوڑو....." ابتہاج حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ چھڑا سکے۔

''گل!'' ایک گمبھیر انتباہ۔ ''اب.....بس.....''

یہ آواز مجاہد خان کی تھی جو اسے تب سنائی دی، جب وہ اسے پکڑ کے تخت پہ پھینک چکے تھے پھر اس نے ابتہاج اور ان کو خود پہ جھکتا پایا۔ وہ اسے بری طرح تھپڑوں سے مار رہے تھے۔ اسے خود پہ کئی وار محسوس ہوئے۔ پے در پے۔ تکلیف دہ۔ بے حد تکلیف دہ۔

موٹی چچی کی گردن کو فرار مل گیا تھا۔ وہ ریشم کے بازو میں جھول کے کھانسنے لگیں۔

بریخنہ مزاحمت میں آگے بڑھی، چند قدم لیے، سامنے دھیان نہیں گیا، پھسلیں اور منہ کے بل زور سے فرش پہ جا گریں۔ چہرہ اس قدر زور سے فرش پہ لگا کہ منہ سے خون اچھل کے باہر نکلا۔ وہ شدتِ درد سے کراہیں.....ان سے دور.....بیس قدم دور.....گل مردوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ گل نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف اس کی چیخیں تھیں جو حویلی کی دیواروں سے پلٹ پلٹ کے کانوں میں سیسہ ڈال رہی تھیں۔

پورے میں ایک سحر پھیل گیا۔ عبادہ خود کو گھسیٹتی تخت کے قریب آئی۔ ان مردوں کو قمیص کے پچھلے دامنوں سے پکڑ پکڑ کے پیچھے کرنے لگی۔ گل چیخ رہی تھی۔ اس نے بازو سینے اور منہ پر رکھے ہوئے تھے۔ اسے ہر طرف سے مکے، گھونسے پڑ رہے تھے۔ بی جان کی آنکھوں کے آگے سیاہی پھیلی، منظر بے نور ہوئے۔ گل کی چیخوں نے سماعتوں کو جھنجھوڑا، یکدم بی جان چکرا کے فرش پہ جا گریں۔ لڑکیوں نے بے ساختہ انہیں تھام لیا۔

''رک جاؤ مت کرو۔ چھوڑ دو اسے۔'' عبادہ منت وسماجت کرتی رہی لیکن وہ نہیں رکے۔

اس نے گل کی آواز کو گھٹن میں بدلتے سنا۔ وہ غرغرا رہی تھی۔ بریخنہ کا آگے والا دانت ٹوٹ گیا تھا۔ ان کا منہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تڑپتیں، سسکتیں سینے کے بل خود کو گھسیٹنے لگیں۔ گل ان کی اولاد تھی۔ وہ اسے پٹتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

اور پھر.....

چپ سی کھڑی عالیہ گودئی نے پورے استحقاق سے قدم اٹھائے۔خود کو پرسکون کرتی چچی نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔وہ ایک سردارنی کی طرح قدم اٹھا رہی تھیں۔مجاہد خان اور ابتہاج کے پیچھے پہنچ کر انہوں نے دونوں کے کالر میں پیچھے سے ہاتھ ڈالے اور انہیں کھینچا۔

''دور ہو جاؤ اس سے۔'' یہ آواز نہیں تھی۔ایک سردارنی کا حکم تھا۔مجاہد اور ابتہاج ہانپتے ہوئے پیچھے ہو گئے۔وہ آگے آئیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ گل کو تھامتی،گل بے جان ہو کے تخت سے فرش پہ،ان کے قدموں میں پورے وزن سے جا گری۔

وہ اپنا ہوش کھو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

بریخنہ اس کے تخت کی پائنتی پر بیٹھی اس کی ہتھیلی رگڑ رہی تھی۔عبادہ پیروں کی طرف کھڑی تلوے رگڑ رہی تھی۔گل مکمل حواس کھو چکی تھی،وہ بے دم سے لیٹی ہوئی تھی۔عالیہ گودائی گھٹنوں کے بل بیٹھ کے مسلسل اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔وہ فکرمندی سے کبھی اس کا چہرہ تھپتھپاتی تو کبھی آواز دیتی۔سیڑھیوں پر بیٹھی موٹی چچی کو عالیہ کی فکر بدرجہا چڑھ رہی تھی۔بی جان کو اندر کمرے میں لے گئے تھے۔ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا۔

''کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ۔میری بچی کو ہوش نہیں آ رہا۔گل میری جان اٹھو۔آنکھیں کھولو۔'' بریخنہ تڑپ رہی تھی۔

وہ اپنے خون آلود منہ،ٹوٹے دانت کی تکلیف بھول گئی تھی۔اس کے کپڑے کتنے خراب ہو گئے ہیں۔آستین کتنی بدبودار ہے،سب بھول گیا تھا۔انہیں صرف گل کی فکر ہو رہی تھی۔ان سے چند قدم دور مجاہد خان اور ابتہاج سر جھکائے کھڑے تھے۔حویلی میں بھونچال آ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں یوسف خان اور غاذان آگے پیچھے چلتے ہوئے زنان خانے میں آئے۔ اوپر، دائیں بائیں اور کونوں سے جھانکتی لڑکیاں جن کی طرح غائب ہوگئیں کیوں کہ زنان خانے میں یوسف خان آیا تھا۔ صحن کا ہیبت ناک منظر دیکھ کے ان کے قدم راہداری میں زنجیر ہوگئے۔ موٹی چچی کی آنکھیں پہلے کھل گئیں، پھر انہوں نے جلدی سے گردن پکڑ لی اور کھانسنے لگیں۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' غاذان نے بے چینی سے پوچھا، غیر ارادی طور پر نظر تخت پہ لیٹی گل تک گئی، جس کا ہاتھ تخت سے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ بے سدھ وہاں لیٹی ہوئی تھی۔

غاذان حواس باختہ انداز میں آگے بڑھا، تخت کے پاس رک کے گل پہ جھکا۔ ''کیا ہوا چچی گل کو؟ اس طرح کیوں لیٹی ہے؟'' اس کے صبیح چہرے پر جا بجا نیل کے نشان تھے، اس کے ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ ''کیا ہوا ہے اسے؟ گل۔ گل۔'' وہ اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا۔ گل کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اس کی کلائی اٹھا کے نبض دیکھی۔ نبض چل رہی تھی۔

''میں نے پوچھا کیا ہوا گل کو؟ کوئی بتائے گا؟'' وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔ یوسف آنکھیں سکیڑ کے سب کو دیکھ رہا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ زبان کھولتا۔ وہاں سب اپنی جگہ جم گئے تھے۔

''میں بتاتی ہوں کیا ہوا ہے۔'' عالیہ گودائی نے گلاس نیچے رکھا اور پورے قد سے کھڑی ہوئی۔ غاذان نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ موٹی چچی نے بے اختیار اندوہناک کھانسی منہ سے نکالی جیسے خدا نخواستہ دمے کی مریضہ ہو۔ (اب پتہ چلے گا گل تجھے جب عالیہ خان جی کو تمہاری حرکت کے بارے میں بتائے گی۔)

عالیہ نے چند قدم یوں لیے کہ وہ یوسف خان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ''تمہارے ان دو نامردوں نے (انگلی سے ابتہاج اور مجاہد خان کی طرف اشارہ کیا) اپنی مردانگی دکھائی ہے۔ ان دونوں نے گل کو بے رحمی سے مارا ہے۔ اتنا بے رحمی سے کہ اس کا جسم برداشت ہی نہیں کر سکا اور

وہ (آزردہ سانس لی) بے ہوش ہوگئی۔"

یوسف خان کے پیروں تلے سرنگ پھٹ گئی۔ غاذان کے دل پہ گھونسا پڑا۔ وہ بے اختیار مڑا اور دیوانہ وار گل کے زخموں کو چھونے لگا۔ وہ جا بجا پڑنے والے گھونسوں اور تھپڑوں کے نشان تھے۔ اس کی دائیں آنکھ سوج رہی تھی۔

ابتہاج نے کرختگی بھری نظر عالیہ پہ ڈالی۔ (ڈائن۔) موٹی چچی کا منہ کھل گیا۔ (میری گردن؟ میری سانسیں؟ وہ کیوں نہیں بتائیں۔) وہ اپنا دکھڑا سنانے کے لیے اٹھنے لگیں تو ٹھہر گئیں۔

یوسف خان طنطنے سے دونوں کی طرف بڑھے، ان کے لمبے ڈگ دیکھ کے حویلی کو سانپ سونگھ گیا۔ موٹی چچی کھانسنا بھول گئی، اس کے ساتھ کھڑی ریشم نے خشک گلا تر کیا۔ وہ سردار کی طرح ڈگ بھرتے ان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ دونوں کے سر مجرموں کی طرح جھکے ہوئے تھے۔

"گل! اٹھو..... میری جان..... غاذان! ڈاکٹر کو بلاؤ..... گلے! بچے۔ اٹھو....." بریخنہ مچلتی جا رہی تھی، ان کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ غاذان تیزی سے پیچھے ہٹا، پینٹ کی جیب سے فون نکالا اور ڈاکٹر کو بلانے لگا۔ عبادہ بدستور گل کے تلوے رگڑ رہی تھی۔

"تم نے کیا ہے یہ؟" انہوں نے ابتہاج سے پوچھا۔

اس نے مظلوم سی نظریں اٹھائیں۔ "اس نے مجبور کیا مجھے۔ دیکھیں میری حالت..... اس نے پہلے حملہ کیا....."

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا یوسف خان کا تندرست ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور پوری وقت سے ابتہاج کے بائیں گال پہ جا پڑا۔ تھپڑ کی "چٹاخ" آواز آئی اور وہ بے ساختہ دائیں سمت لڑھک گیا مگر گرا نہیں۔ مجاہد خان گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہوگیا۔

"بے غیرت!"

انہوں نے صرف ایک ہی لفظ کہا اور اتنا ہی کافی تھا۔

غاذان نے ڈاکٹر کو فون کر لیا تھا۔ اس نے اگلے ہی پل گل کو بانہوں میں اٹھایا اور اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بریحنہ چچی بھی گرتی پڑتی اس کے پیچھے لپک گئیں۔

ابتہاج گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

''خان جی! اس بے حیا نے مور جان.....''

یوسف خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس جرأت پر سیدھے ہاتھ سے الٹا تھپڑ مار کر ابتہاج کا دوسرا گال لال کر دیا۔ وہ جو پہلے ایک گال پہ ہاتھ رکھ کے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اب دونوں گالوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑا تھا۔ عالیہ گودائی نے گردن اکڑالی (بہت اچھا ہوا۔ یہی ہونا چاہیے تھا) موٹی چچی خاوند کا یہ اشتعال دیکھ کے ریشم کے پلو میں دبک گئیں۔ انہیں گلے میں اٹھتی خراشیں ایک لمحے کے لیے بھول گئیں۔

''یہاں کیا کر رہے ہو تم؟ تمہیں تو اس وقت شندور میں ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے ساتھی کھلاڑی شندور پہنچ گئے ہیں۔ نہیں؟'' انہوں نے ٹھٹکتے ہوئے پوچھا پھر سر جھکائے کھڑے مجاہد کو دیکھا۔

''کیوں مجاہد خان۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ ابھی تک شندور کیوں نہیں پہنچا؟''

''خان جی وہ.....رستم کو لے کر.....''

''رستم کو لے کر جانے کی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔ میں نے عظیم کو کہا تھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ تعجب سے پوچھ رہے تھے۔

''وہ.....وہ.....'' مجاہد منمنایا۔

''میں نے پوچھا ابتہاج یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ پوری قوت سے دھاڑے۔ مجاہد بے اختیار کپکپانے لگا۔

حویلی کی لڑکیوں نے کمروں کے دروازے بند کر دیے، بچے کونوں کھدروں میں چھپ گئے۔ کل بہرام کے ساتھ ہوئے تشدد پر تا حال کوئی اپنی حالت سنبھال نہیں پایا تھا۔اس وقت ان کا غصہ کل والے ٹھنڈے تاثرات سے زیادہ خطرناک لگ رہا تھا۔ابتہاج شکوہ کناں نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا جس نے اس کی پوری بات نہیں سنی، اس کے زخم نہیں دیکھے، اس کی ماں کا کھانسنا، بلکنا نہیں سنا۔

''بخت.....دلاور.....اندر آؤ.....'' انہوں نے اپنے وحشی گارڈز کو آواز لگائی۔لمحے کی دیر تھی، دونوں گارڈز اسلحہ تھامے راہداری میں آن کھڑے ہوئے۔

''ابتہاج کو لے کر شندور جاؤ۔ابھی، اسی وقت.....اور جب اگلا فون مجھے کرو تو شندور سے کرنا۔''انہوں نے جارحانہ انداز میں حکم دیا۔ابتہاج کے پیروں تلے سرنگ پھٹی۔یوسف خان کے گارڈز رینجرز کے اہلکاروں کے طرح ابتہاج پہ جھپٹ پڑے۔اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا، کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ گھائل نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔گارڈز اسے کھینچتے ہوئے لے گئے۔

وہ وہاں سے ہٹا تو انہوں نے مجاہد خان کو دیکھا جس پر لرزہ طاری تھا۔(اب میری باری)

''اپنی بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی۔خبیث!'' انہوں نے اسے گالی دی۔ عورتوں کی موجودگی میں۔عالیہ کی موجودگی میں۔عبادہ کی موجودگی میں۔مجاہد نے ہزیمت سے آنکھیں میچ لیں۔

''اس کے لیے ڈاکٹر بلاؤ۔اگر اسے کچھ ہوا، میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں غراتے، اپنی شال سنبھالتے مردان خانے کی طرف بڑھ گئے۔ان کے جاتے ہی سب نے اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی۔

☆.....☆.....☆

کرسی پہ بیٹھے ڈاکٹر نے اس کی نبض چھوڑی پھر سیدھے ہو گئے اور سٹیتھوسکوپ کانوں سے اتار لیے۔

''سب ٹھیک ہے۔شاک کی کیفیت میں ہے۔لگتا ہے کوئی صدمہ پہنچا ہے۔زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔جب ہمارا دماغ کسی بات کو قبول نہیں کر پاتا تو اسی طرح بے ہوش کر دیتا ہے۔میں یہ ڈرپ لگا رہا ہوں۔اس کے ختم ہونے تک ان کو ہوش آ جائے گا۔'' ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے سفید پانی والی درمیانے سائز کی ڈرپ نکالی۔غاذان نے ہینڈل لا کر دیا۔انہوں نے ڈرپ ہینڈل سے لٹکائی،گل کے بائیں ہاتھ کی پشت میں سوئی چبھو دی اور ڈرپ چلا دی۔سفید رنگ سیال قطرہ قطرہ اس کے خون کی نالیوں میں داخل ہونے لگا۔

''ڈاکٹر!کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے۔کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں لگی؟'' غاذان نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں۔کوئی خاص چوٹ نہیں ہے۔بس یہ اوپر اوپر سے کچھ زخم ہیں۔ان کے لیے میں ٹیوب دے دیتا ہوں۔روزانہ لگائیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''کوئی دماغ و ماغ کا حصہ متاثر تو نہیں ہوا۔میری بچی ٹھیک ہو جائے گی؟''

''جی جی بالکل۔پریشان مت ہوں بھابھی۔پہاڑی عورت اتنی آسانی سے دماغی توازن نہیں کھوتی پھر گل تو اپنی بہادر بیٹی ہے۔'' انہوں نے چند ٹیوب نکال کے ان کی طرف بڑھائے۔انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے پکڑے۔ان کی تشویش میں کمی نہیں آ رہی تھی۔

''بھابھی!'' ڈاکٹر جو گاؤں کا ہی کوئی آدمی تھا۔ان کو دیکھ کے ذرا ہمدردی سے مخاطب ہوا۔''اپنے دانت کے لیے دندان ساز کے پاس چلی جائیں۔اس کا ایک ٹکڑا لٹک رہا ہے۔وہ کاٹ دے گا۔''

اور یہ سنتے ہی بریخنہ نے دانت کو ہاتھ لگایا۔دانت کی ایک جڑ رہتی تھی۔وہ مکمل الگ نہیں ہوا

تھا۔انہوں نے دو انگلیوں سے دانت کو پکڑا اور جھٹکا دے کے کھینچا۔دانت ٹوٹ کے ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ساتھ ہی خون ہونٹوں اور دانتوں میں ابل پڑا۔انہوں نے ٹیوب عبادہ کو پکڑائی،خود منہ پہ ہاتھ رکھا اور واش روم میں چلی گئیں۔وہاں موجود سب نے ہونقوں کی طرح ان کی یہ جرأت دیکھی تھی۔

''میں چلتا ہوں خان جی۔ضرورت پڑی تو دوبارہ آ جاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے بیگ اٹھائے۔غاذان نے بس سر کو ہلکا سا خم دیا۔ڈاکٹر باہر چلا گیا۔باقی سب بی جان کے پاس تھے جن کو ہوش آ چکا تھا لیکن ان کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔وہ ہائپر ٹینشن (ہائی بلڈ پریشر) کی مریضہ تھیں۔ان کے سامنے سوچ سمجھ کے معاملات رکھے جاتے تھے۔

عبادہ جھک کے سائیڈ ٹیبل پر ٹیوب رکھ رہی تھی۔

غاذان نے پہلی بار اس کو دیکھا۔چہرے پر مٹی لگی ہوئی تھی،بازو رپٹے ہوئے تھے۔بال بکھرے ہوئے تھے۔آنکھیں اور ناک سرخ پڑ رہی تھی۔

''عبادہ۔'' وہ فکرمندی سے کہتا قریب آیا۔وہ جو سائیڈ ٹیبل پر ٹیوب رکھ رہی تھی،چونک گئی۔

''جی؟''

''ادھر آئیں۔'' وہ اسے کلائی سے تھام کر صوفے تک لایا۔وہ ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا؟''

''بیٹھیں یہاں۔''

وہ الجھتے ہوئے بیٹھ گئی۔غاذان کمرے سے باہر نکل گیا۔

بریخنہ باہر آئی تو منہ صاف ہو گیا تھا البتہ سامنے والا دانت نہ ہونے کی وجہ سے منہ بہت برا لگ رہا تھا۔پہاڑی خواتین کی ہڈیاں ہوں یا دانت ساٹھ سال سے پہلے نہیں چٹختے،یہاں بریخنہ نے

پہلا دانت ہی پینتالیس سال کی عمر میں کھودیا تھا۔

غاذان واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ پیچھے ریشم اور پلوشہ تھیں۔ خود اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ وہ چل کر اس کے پاس آیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ایک طرف صوفے پر باکس رکھا۔ اندر سے کاٹن نکالا، اسے پائیوڈین میں ڈبویا اور اس کی کہنیوں پر رکھنے لگا جہاں رگڑ آنے سے خون کے ننھے ننھے قطرے نکلے ہوئے تھے۔ عبادہ یہ ساری کارروائی دیکھ کے مچل گئی۔

ایسا لگا جیسے اس وقت بابا قدموں میں بیٹھے، اس کی مرہم پٹی کر رہے ہوں۔ سارے سانحے میں اسے بھی چوٹ لگی تھی۔ اس کی ہڈیاں بھی چٹخ رہی تھیں۔ اگر یہاں یاد آیا تھا تو صرف غاذان کو۔ وہ فکرمندی سے اس کی پٹی کر رہا تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور آنکھوں کی نمی کو پی گئی۔ ریشم اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے دلاسا دے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈرپ کے قطرے ختم ہوئے تو اسے ہوش آچکا تھا۔ عبادہ نے اس کی نس سے سوئی نکالی اور ڈرپ سٹینڈ کو پیچھے کر دیا۔ گل آنکھیں میچے، پیشانی کو انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اندر دماغ کی شریانوں میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بریخنہ پائنتی پر اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی اسے ہوش میں آتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی آنکھوں کی نمی بھی پونچھ رہی تھی۔

گل نے آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھا۔ کچھ ثانیے وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی پھر اس نے بایاں ہاتھ کھینچا، وہ اٹک گیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا، بریخنہ کی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پیوست تھیں۔ وہ نرمی سے اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ناگواری آئی۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ۔'' اس نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچا اور کہنیوں کے بل اٹھ کے بیٹھ گئی۔

بریخنہ کا دل بری طرح دکھا۔ ''گل میرا بچہ۔'' وہ تڑپ کے قریب ہوئیں۔

''پیچھے ہو جائیں، نہیں ہوں میں آپ کی بچی۔'' وہ غرائی۔

''گل آرام سے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔You have bruises'' عبادہ نے نرمی سے ٹوکا۔ گل کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سر ہاتھوں میں گرا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اس نے خوابوں خیالوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ رستم اس سے الگ ہوگا۔ وہ تو ایسا اثاثہ تھا جس پر اسے ہمیشہ ناز رہا تھا۔ اس کا ذکر، اس کی تعریف، اس پر غرور وہ گردن اکڑا کے کرتی تھی۔ اس کے لہجے میں رستم کے ذکر پر ہمیشہ ''مان'' آجاتا تھا۔ اس کے بابا نے جہاں اسے سب دیا تھا، اس میں رستم اس کے پاس بیش بہا تحفہ تھا۔ وہ اس کا پالتو تھا۔ اٹھارہ سال سے وہ اسے پال رہی تھی اور آج وہ اسے وقف کرنے جا رہے تھے۔ اتنے ظالم وہ کیسے ہو سکتے تھے؟

بریخنہ نے سسک کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے زار و قطار رو رہی تھی۔

''گل بچے۔ خود کو سنبھالو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور خراب ہو جائے گی۔'' انہوں نے تشویش سے کہا۔ اس نے تنفر سے ان کا ہاتھ بالوں سے ہٹایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہچکیاں سن کر بریخنہ نے بے بسی سے عبادہ کو دیکھا۔

عبادہ نے گہری سانس لی۔

وہ گل کو کس لحاظ سے تسلی دیتی؟ کیا کہتی؟ بھول جاؤ رستم کو؟ معاف کر دو مجاہد خان اور ابتہاج کو۔ کوئی بات نہیں دوسرا رستم آجائے گا۔ تمہاری زندگی نہیں رکی۔ ابھی بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔ رستم جیسے اور کئی آجائیں گے؟ وہ کہہ سکتی تھی؟ وہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیوں کہ اس کا اور گل کا غم اس مقام پر آکر سانجھا ہو گیا تھا۔ کئی سال پہلے وہ خود بھی اس مرحلے سے گزری تھی۔ تب اسے کسی

کی تسلی نے پرسکون نہیں کیا تھا۔ وہ گھٹنوں پر بیٹھ حلق کے بل چیختی رہی تھی۔ اس لمحے اسے جس نے بھی دلاسا دیا، وہ بہت معمولی اور کم تر لگا۔ الفاظ کے روایتی دلاسوں میں اب اثر کہاں رہا تھا۔

''تسلی رکھو، حوصلہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ ہے ناں۔ تقدیر میں جو لکھا تھا۔ ہم کچھ بدل نہیں سکتے۔ صبر کرو۔'' یہ وہ الفاظ تھے جو روز کان میں پڑتے تھے۔ ان کی تاثیر اب ختم ہو چکی تھی۔ زندگی سمجھوتوں کا نام ضرور ہے لیکن بظاہر خود یہ سمجھوتا نہیں ہے۔ اس میں پیش آنے والی تمام مصیبتیں ''اتفاقاً'' نہیں ہوتیں جن پر سمجھوتہ کیا جائے اور حالات کو قبول کر کے بیٹھ جائیں۔ ہر مصیبت ''انتخاب'' سے آتی ہے۔ آپ اس کے لیے ''چنے'' گئے ہوتے ہیں۔ مصیبت انسان پہ ہمیشہ اس کا ''حوصلہ'' دیکھ کے آتی ہے اور ''صبر'' آزما کے چلی جاتی ہے۔

یہ مقام گل کے لیے صبر کا تھا۔ کسی کے لفظی دلاسے، روایتی تسلیاں اسے کچھ نہیں دے سکتی تھیں۔ سکون بھی نہیں۔ ان حالات سے اسے خود نکلنا تھا۔ وقت اور حکمت عملی آپ کے ہاتھ میں صرف ''کھربی'' دیتے ہیں۔ اپنی روشنیوں کی سرنگ آپ کو خود کھودنی ہوتی ہے۔ آپ کے کندھوں کی طاقت، آپ کی اپنی خود ہوتی ہے۔ وہ کسی کے کہنے، کسی کے بتانے یا کسی کے سمجھانے سے نہیں آتی۔

اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ''مجھے بی جان سے ملنا ہے۔ کہاں ہیں وہ۔ میں رستم کو وقف نہیں کروں گی۔'' وہ رکھائی سے کہتی کھڑی ہوئی۔

''گل پلیز۔ ایسے مت اٹھو۔ تمہیں کمزوری.....''

''مجھے پرواہ نہیں۔'' وہ درشتی سے اس کی بات کاٹتی ننگے پیر اٹھی اور باہر کی طرف بھاگی۔ وہ دونوں بھی سٹپٹا کر اسے کے پیچھے لپکیں۔

بی جان دادجی کی وصیت سے آگاہ تھیں پھر انہوں نے کیوں اپنے خودغرض بیٹوں کا ساتھ دیا

تھا۔انہوں نے اپنی پوتی کی یتیمی کا کیوں نہیں سوچا۔وہ چاہتیں تو ان کو روک سکتی تھیں۔انہوں نے کیوں منع نہیں کیا۔اسے رہ رہ کر بی جان پر افسوس ہو رہا تھا۔

نیچے آ کے وہ سیدھا بی جان کے کمرے کی طرف بڑھی۔دروازے سے دندناتے ہوئے اندر آنے کے بعد اس نے جارحانہ نظر یہاں وہاں ڈالی۔کمرہ خالی تھا۔چیزیں نفاست سے جگہ پر پڑی ہوئی تھیں۔وہ الٹے پیر مڑی اور باہر آئی۔

راہداریوں میں لڑکیاں نکل نکل کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

''بی جان کہاں ہیں؟''اس نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔لڑکیاں خاموش رہیں۔

''میں نے پوچھا بی جان کہاں ہیں۔''وہ دھاڑی،ساتھ ہی جواب سننے کا انتظار کیے بغیر ایک ایک کمرے،راہداری اور صحن میں جھانکنے لگی۔بی جان کہیں نہیں تھیں۔اسی اثنا اپنے شاہی کمرے سے عالیہ اس کی آواز سن کے باہر آئی۔

''بی جان کہاں ہیں؟''وہ چاروں اور گھوم گھوم کے پوچھ رہی تھی۔''بی جان.....بی جان۔''

''وہ یوسف خان سے تمہارے رستم کی بات کرنے گئی ہیں گل۔''عالیہ نے دلاسا انگیز لہجے میں کہا۔وہ ایڑیوں کے بل پلٹی۔''وہ اس معاملے سے آگاہ نہیں تھیں۔ان کے بیٹوں نے انہیں لاعلم رکھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔اس لیے میں نے ان کو یوسف خان سے دریافت کرنے بھیج دیا ہے۔کچھ دیر میں آجائیں گی۔''

گل کچھ لمحے انہیں بے یقینی سے دیکھتی رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔صبر اور تحمل کا اور گھونٹ پیا اور ایک طرف رکھی کرسی پر ڈھے گئی۔وہ بے تابی سے بی جان کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔بی جان اس کی آخری امید تھی۔جب وہ ماسٹر کرنا چاہتی تھی تب اسے دونوں چچاؤں نے روکا تھا۔اس کے گاؤں میں بارہویں تک سکول تھا۔انٹر کرنے بعد اسے کسی یونی ورسٹی میں داخلہ لینا

تھا۔ اللہ اللہ کرے ماسٹر جی کی مدد سے اس نے پشاور میں ایم اے انگریزی کے لیے درخواست جمع کرائی۔ اس کا پہلی لسٹ میں دسواں نمبر آیا۔ وہ منتخب ہوگئی۔ عین اسی وقت اس کے چچا اس کے خوابوں کے آڑے آگئے۔ انہوں نے اسے روکنے کے لیے انتہائی تگ ودو کی۔ اسے ڈرایا، دھمکایا اور مارا۔ بلا آخر اس نے بی جان کا سہارا لیا اور ان کے قدموں میں گری۔ ان سے بلک بلک کر آگے پڑھنے کی التجا کی۔ انہوں نے ہی یوسف خان کو راضی کیا تھا اور اسے پشاور بھیج دیا تھا۔ آج بھی آخری امید وہی تھیں۔ وہی رستم کو واپس لاسکتی تھیں۔ وہی یوسف خان کا یہ کٹر فیصلہ روک سکتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

بی جان نہیں چاہتی تھیں کہ گل کو اس طرح مار پڑے۔ وہ گل سے محبت کرتی تھیں۔ وہ ان کے بیٹے کی آخری نشانی تھی۔ اس لیے وہ گل کو یوں سسکتا مچلتا نہیں دیکھ سکیں اور اپنے ہوش کھو بیٹھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ان کے دماغ میں ایک ہی خیال گھوم رہا تھا۔

''یوسف خان نے ایسا کیوں کیا؟''

اپنے سوال کا جواب پانے کے لیے بی جان یوسف خان سے ملنے گئیں۔ اس وقت وہ مردان خانے میں یوسف خان کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرہ اے سی کی وجہ سے بہت ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے، دور چترال کے پہاڑ اور سرسبز وادیاں نظر آرہی تھیں۔ یوسف خان جہازی سائز بیڈ کی پائنتی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا مصنوعی ہاتھ ان کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کٹی کلائی کو دیکھ رہے تھے۔

غازان دروازے کی چوکھٹ میں سر جھکا کر کھڑا تھا۔ ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں تھے۔ مجاہد خان نے دوبارہ سامنا کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چھپ گئے تھے۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں یوسف، اگر تم مجھے کسی لائق سمجھو اور تھوڑا حق دو۔'' انہوں

نے چوٹ کی۔ یوسف خان نے نظریں اٹھائیں، وہ جانتے تھے وہ کیا پوچھنے والی ہیں۔

''تم نے کس سے پوچھ کے رستم کو شندور کے لیے نیلام کیا ہے؟'' ان کے انداز میں جلال تھا۔

''میرے خیال سے، میں کسی سے کچھ پوچھنے کا پابند نہیں ہوں۔ ابھی یہ (دستار کی طرف انگلی اٹھائی) میرے سر پر ہے۔ میں جب چاہوں، جس کا چاہوں فیصلہ کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے خودغرضی سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔

''اگر اس دستار کی وجہ سے تم خود کو سردار سمجھتے ہو تو مت بھولو..... میں تمہاری سابقہ سردارنی ہوں۔'' ان کے انداز میں ایک ملکہ والی ڈھارس آئی۔ ''میں تم سے دوبارہ پوچھتی ہوں۔ تم نے رستم کو وقف کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیا وہ چھ گھوڑے کم تھے جن کا اعلان تم نے ڈیڑھ ماہ پہلے کیا تھا۔''

''میں شندور کو معزز رکھتا ہوں اماں جان۔ میں دینا چاہتا ہوں تو اس میں کیا حرج ہے؟'' وہ تلخی سے بولے۔ (اس تلخ رویے کا مقصد بی جان کو گھوڑوں کی بیماری سے آگاہ نہ کرنا تھا۔ وہ بیمار تھیں۔ ان کا فشار خون شوٹ کر جاتا تھا۔ یوسف خان کسی طرح کا خطرہ نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ پرسوں بی جان کو بھی شندور جانا تھا۔)

''حرج یہ ہے کہ وہ گھوڑا تمہارا نہیں ہے۔ وہ گل لالہ کی ملکیت ہے۔ تمہیں اس سے پوچھ کے یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ سردار ہونے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تم کسی بھی حقیر فقیر انسان کو خاطر میں نہ لاؤ۔ رستم کو دینے سے پہلے کیا تم نے گل لالہ سے پوچھا تھا؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''میں کسی سے پوچھنے کا پابند نہیں۔''

''اچھا پھر تو تم اپنے باپ کی وصیت بھی بھول چکے ہو گے۔ ہے ناں؟''

''مجھے یاد ہے۔'' وہ سرد مہری سے کہنے لگے۔

''یاد ہے تو کیوں یہ قدم اٹھایا؟ اگر رستم چلا گیا تو دوسرا رستم گل کو کہاں سے لا کر دو گے؟ کیا

تمہارے پاس کوئی متبادل ہے؟''

''نہیں ہے اماں جان۔ خدا کا واسطہ۔ آپ یہاں سے چلی جائیں۔ میں نہیں دے سکتا آپ کے سوالوں کے جواب۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بے زاری سے بولے۔ بی جان آگے ہوئیں۔

''تم مجھے ہر سوال کا جواب دو گے یوسف۔ تم پابند ہو اس کے۔''

''میں..... کسی..... کا..... پابند..... نہیں..... ہوں۔''

''تم نے رستم کو کیوں وقف کیا؟'' انہوں نے اس کی ناراضی خاطر میں نہ لاتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔ یوسف خان کے ماتھے پر بل پڑے۔ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

''آپ سن نہیں پائیں گی وجہ۔ اس لیے یہاں سے جائیں۔ مجھ پر ترس کھائیں۔''

''کیا وجہ ہے بتاؤ مجھے۔ میں سننا چاہتی ہوں۔'' وہ بضد ہو گئیں۔

''اماں جان۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جا کر آرام کریں۔'' یوسف خان کوفت سے بولے۔ وہ کبھی اتنا کٹر رویہ نہیں اپناتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس وقت جو حالات چل رہے تھے ان میں بہت کشیدگی اور تناؤ تھا۔ اس تناؤ کے پیش نظر ان کا لہجہ بھی خشک ہو رہا تھا۔

''غاذان! کیا وجہ ہے۔ کیا چھپا رہا ہے یہ مجھ سے۔ تم بتاؤ مجھے۔'' انہوں نے تیزی سے چوکھٹ میں خاموش کھڑے غاذان کو مخاطب کیا۔ وہ گڑبڑا کے سیدھا ہو گیا۔ اس نے سرعت سے یوسف خان کو دیکھا، جو گھائل لگ رہے تھے پھر انہوں نے بی جان کو دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ کچھ پوچھا ہے میں نے۔ تم لوگ کیا چھپا رہے ہو مجھ سے؟ بتاؤ مجھے۔ میں بڑی ہوں اس قبیلے کی۔'' انہوں نے دھونس سے کہا تو غاذان نے ٹھنڈی سانس لی، پہلے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر قدم قدم چل کر ان کے پاس آیا۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کے اس نے بی جان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''پہلے آپ خود کو پُرسکون کریں۔آپ کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔گہری گہری سانس لیں۔ شاباش۔ریلیکس ہو جائیں۔''اس نے نرمی سے کہا۔بی جان چند گہرے سانس لیے اور اپنے غصے کو کم کیا۔

''اب جو میں کہنے جا رہا ہوں۔آپ اسے تسلی اور صبر سے سنیں گی۔ہم نے یہ بات آپ سے آپ کی بیماری کی وجہ سے چھپائی تھی مگر اب اس نہج پر آ گئے ہیں کہ آپ کو مجبوراً آگاہ کرنا پڑ رہا ہے۔آپ پورے استقامت اور حوصلے سے میری بات سنیں گی۔ٹھیک ہے؟''

اس نے عہد بھری نظروں سے دیکھا تو انہوں نے عہد نبھانے والے انداز میں سر کو خم دیا۔ غاذان نے خود کو کمپوز کیا اور اول تا آخر ساری کہانی سنانے لگا۔ڈیڑھ ماہ قبل گھوڑوں کی بیماری سے لے کر کل نئے ڈاکٹر کے آنے تک،ابتہاج کے شندور کھیلنے سے رستم کی واپسی تک،اس نے ترتیب اور روانی سے ایک ایک چیز بی جان کو بتائی یہاں تک کہ ان کے تمام وسوسے اور شک وشبہات دور ہو گئے۔اس دوران غاذان ان کا ہاتھ وقفے وقفے سے دباتا رہا۔کبھی ان کا گال چھوتا تو کبھی ان کے ہاتھ چومتا۔یہ اس کے بہلانے اور خبر کے اثر کو ذائل کرنے کا طریقہ تھا۔بی جان کا بلڈ پریشر بڑھانہ ان کے دل میں ٹیس اٹھی۔وہ اپنی جگہ پرسکون بیٹھی رہیں۔

یہ غاذان کے کلام اور اخلاق کا کمال تھا۔

He has This mesmerising Cherisma of Hipnotizing someone!

(اس کے اندر لوگوں کو ہپناٹائز کرنے کا محسور کن سحر تھا)

آخر میں وہ اٹھا۔میز پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور بی جان کو پکڑا دیا۔انہوں نے چند گھونٹ بھرے اور گلاس واپس دے دیا۔یوسف خان خاموشی سے فرش کو گھور رہا تھا۔بی جان

نے پچکارتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''یہ بات تم مجھے پہلے نہیں بتا سکتے تھے یوسف؟''

''آپ بیمار تھیں بی جان۔'' انہوں نے جواز دیا۔

''کہہ دیتے تو کیا ہو جاتا۔ ابھی کچھ ہوا مجھے؟ نہیں ناں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''وہ تو..... وہ.....'' یوسف خان نے سر جھٹک دیا۔

''بی جان! بلتی قبیلہ نہ گھوڑوں کی بیماری سے واقف ہے اور ہی رستم کے لیے ہمارے بنائے ہوئے اس منصوبے سے۔ آپ نے خیال رکھنا ہے کہ ان کو اس چیز کی بھنک نہ پڑے ورنہ ہم جس عزت کے لیے اتنا خوار ہو رہے ہیں۔ اس کی سرعام نمائش ہو جائے گی۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''بے فکر رہو بیٹا۔ میں انہیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دوں گی۔ آخر میرے قبیلے کا سوال ہے۔'' وہ دلاسہ دینے لگیں۔

''جانتا ہوں بی جان۔ مگر آپ یہاں سے جائیں گی تو گل سو سوال کرے گی۔ گو کہ وہ جانتی ہے کہ ہم نے رستم کو شندور میں کیوں دیا ہوگا لیکن وہ پھر بھی چلائے گی۔ کیوں کہ اسے رستم سے مطلب ہے۔ اس کی باغی طبیعت پر قبیلے کی عزت و نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ سے یہی گزارش کرتا ہوں کہ آپ اسے سنبھال لیجیے گا۔ ہم رستم کو واپس لے آئیں گے۔ ہم اسے کہیں نہیں جانے دے رہے۔ وہ بس صبر کرے۔ ہم پر بھروسہ کرے۔''

''یہ بات اگر تم خود اسے سے کہو تو وہ زیادہ اچھے سے سمجھ جائے گی۔'' بی جان مسکرائیں۔

''میں؟'' وہ جیسے ٹھٹک گیا تھا۔

''ہاں تم۔ تمہیں بات سمجھانی آتی ہے۔ تمہاری باتوں میں اثر ہے۔''

وہ کھسیا کر مسکرایا۔ ''ضرور کہتا بی جان مگر..... گل بے حد جذباتی ہے۔ وہ بہت جلدی طیش میں

آجاتی ہے اور مجھے اس کے اسی ردعمل سے ڈر لگتا ہے۔ میں اسے کسی چیز کا واسطہ بھی نہیں دے سکتا۔ میرے وعدوں پر وہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔'' وہ لاچار آواز میں بولا۔ چہرے پر فسوں عود آیا۔

بی جان نے گہری سانس لی۔

'' ٹھیک ہے۔ پھر میں اسے سمجھا دوں گی۔ مگر تم لوگ رستم کا وعدہ کرو کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ خصوصاً تم یوسف۔ تم پہ اپنے والد کی وصیت کا بوجھ ہے۔ تم اس بات کی تسلی رکھو گے کہ رستم صحیح سلامت واپس ہمارے پاس پہنچ جائے۔ سمجھے تم؟'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں تنبیہہ کی۔

''بی جان! بھروسہ رکھیں مجھ پر۔ ہم رستم کو کچھ نہیں ہونے دیں گے۔'' غاذان نے دھونس سے کہا۔ بی جان مسکرائیں۔

'' مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے غاذان بچے۔ میں اس کی بات کر رہی ہوں۔''

''ان پر بھی بھروسہ رکھیں۔''

غاذان نے جھک کر ان کے ہاتھ چومے اور آنکھوں سے لگائے۔ یوسف خان نے سکون کی سانس لی۔ (چلو یہ معمہ تو حل ہوا۔)

☆.....☆.....☆

وہ غاذان کا ہاتھ تھامے چھوٹے چھوٹے قدم لیتیں زنان خانے میں آئیں۔ وہ لمبی تاریک راہداری طے کرنے کے بعد جونہی زنان خانے میں مڑے، لابی کے آخر میں گل کو کرسی پر بیٹھ کے، سر ہاتھوں میں گرائے دیکھا، وہ بایاں پیر بے چینی سے فرش پہ بجا رہی تھی۔ اس کی تشویش دیکھ کے بی جان نے بے اختیار غاذان کو دیکھا۔ غاذان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں حوصلہ دیا۔

وہ جیسے ہی لابی میں آگے بڑھیں، ابھی اختتام میں چند قدم رہتے تھے جب احساس پر گل نے کسی بدروح کی طرح سر اٹھایا اور انہیں دیکھا۔ بی جان لڑکھڑاتی ہوئی آرہی تھیں۔ وہ بجلی کی سی

تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

''بی جان۔'' ان کے پاس رک کے وہ بے قرار ہوئی۔ ''پوچھا آپ نے؟ کیوں کیا ہے انہوں نے میرے ساتھ ایسا؟ میرا رستم کیوں وقف کیا ہے۔ وہ میرا ہے۔ داجی نے مجھے دیا تھا۔ وہ میری اجازت کے بغیر اسے وقف نہیں کر سکتے۔ آپ نے بتایا انہیں۔ کیا کہا انہوں نے؟''

اس نے بے در پے سوالوں سے ان کا بلڈ پریشر بڑھا دیا۔ انہوں نے تکان سے غاذان پہ بوجھ ڈالا۔

''بتائیں مجھے۔ کیا کہا انہوں نے۔ آپ نے یاد تو دلایا ہوگا۔ ان کو یاد آیا۔''

''گل۔ ریلیکس۔ بی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آرام سے بات کرو۔'' غاذان نے نرمی سے کہا۔ لابی میں سب خواتین جھانکنے لگی تھیں جن میں عالیہ گودائی بھی تھی۔ بی جان نے گل کو ایک کرب سے دیکھا۔

''گل۔ کیا میں تم سے ایک چیز مانگ سکتی ہوں؟''

''رستم کے علاوہ کچھ بھی بی جان.....'' اس نے ایک ہی وار میں انہیں لاجواب کر دیا۔ بی جان نے گہری سانس لی۔

''رستم ہی چاہیے۔''

وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔ تو بی جان بھی یوسف خان کی بات مان گئی تھیں۔ اس کی آخری آس بھی چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔

''تمہارے قبیلے کے لیے۔ اس کی عزت و ناموس کے لیے۔ ہمیں تمہارا رستم چاہیے۔''

کھڑے کھڑے بی جان اسے جذبات سے گھیرنا شروع کیا۔ ''چترال کو تمہاری ضرورت ہے گل۔ اپنی سرزمین کے لیے یہ قربانی دے دو۔''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ تھکی تھکی سی لڑکھڑائی۔

''تمہارا باپ اس دھرتی پر قربان ہوا ہے۔ اس نے اپنی بلوری کو بھی قربان کیا ہے۔ کیا تم اس کی اولاد نہیں ہو؟ کیا اس نے کبھی چیزوں کو چترال پر فوقیت دی ہے؟ کیا اس نے تمہیں حب الوطنی نہیں سکھائی تھی۔''

''رستم میرا ہے۔ رستم میرا ہے۔'' وہ بے کسی سے بڑبڑانے لگی۔

''تم ایک اچھی اولاد ہو۔ مجھے معلوم ہے تم اپنے باپ کا سر جھکنے نہیں دو گی۔ تم اس کے خون اور شہادت کا پاس رکھو گی۔''

بی جان کے حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ گل کو ایک گرم تنور میں پھینک رہی ہیں۔ رستم ایک چیز نہیں تھی اور اگر اس کے باپ کو بھی موقع ملتا تو وہ کبھی بلوری کو گرنے نہ دیتا۔ وہ چترال پر اپنا تن من دھن قربان کر سکتا تھا لیکن اپنے دل سے..... کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

گل نے کئی قدم پیچھے لیے پھر وہ پورے قد سے مڑی اور ننگے پیر سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔ لابی میں ایک ناقابل برداشت سناٹا چھا گیا۔ ایسا سناٹا کہ سوئی گرتی تو اس کی آواز گونج گونج جاتی۔ بی جان ہونٹوں کو پیوست کر کے اپنے آنسو روک رہی تھیں جب کہ غاذان گم صم کھڑا تھا۔ عالیہ البتہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''چلیں بی جان۔'' ایک ڈوبتی نیا کو ساحل پر لگانے کے بعد غاذان نے تکان سے کہا۔ وہ بی جان کو لے کر لابی سے باہر لایا تو عالیہ کسی کی پرواہ کیے بغیر آگے آئیں۔

''ضرورت ہی کیا ہے رستم کو دینے کی بی جان۔ مانا کہ آپ کا قبیلہ شندور میں اٹھارہ سال بعد شریک ہو رہا ہے لیکن حاتم طائی بننے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے چھ گھوڑے پہلے ہی وقف کر دیے ہیں۔ رستم کو چھوڑ دیں۔ وہ اس بیچاری بچی کا ہے۔'' انہوں نے سفارش کی۔

''عالیہ! جب میں تمہاری حویلی میں آ کے تمہارے قبائلی معاملات میں مداخلت کروں تو تمہیں پورا حق ہوگا کہ ہمارے خاندانی مسائل میں حصہ ڈالو۔'' انہوں نے ذومعنی جملے میں انہیں لاجواب کر دیا۔ عالیہ تاؤ کھا کر رہ گئی۔ غاذان نے زیرلب مسکراہٹ روک کے بی جان کو کمرے کی طرف بڑھا دیا۔ موٹی چچی بھی کمینی سی مسکرائیں۔

عالیہ کو اس سرد رویے سے ٹھیس پہنچی تھی لیکن انہیں تاحال گل کی فکر تھی۔ وہ جس طرح بلکتی ہوئی یہاں سے گئی تھی، ان کے دل کو بچھوڑا تھا۔ پل بھر میں راہداری خالی ہوئی تو انہوں نے ساتھ کھڑی لڑکی کو اشارہ کیا۔

''مجھے گل کا کمرہ دکھاؤ۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔''

یکدم موٹی چچی سامنے آئیں۔

''وہ تمہاری بات نہیں سنے گی۔'' انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ثمینہ بھابھی۔ اس بار اسے ''میری'' بات سننا ہوگی۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں کہتیں، ان کے کندھے سے ٹکرا کے آگے چلی گئیں۔ موٹی چچی نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور کلستی رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆

وہ گل کے کمرے کے آگے والی لابی میں ٹہلتی ہوئی مسلسل رستم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ معاملے کو سب ایک سادہ نظر سے دیکھ رہے تھے لیکن یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ یوسف خان نے آ کے بیٹے سے گل کی حالت دریافت کی۔ گل کی ایسی حالت کیوں ہوئی؟ انہوں نے نہ سنا نہ وہ سننا چاہتے تھے۔ ابتہاج کو بھی اسی چیز کا زعم تھا۔ اس نے اسے جب جب دیکھا تھا۔ وہ رستم کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ یہ فیصلہ جو آج ہوا، اس کے پیچھے ایک پوری کہانی تھی۔

''یہ یوسف خان کا نہیں، ابتہاج کا پلان تھا۔

وہ پولو کھیلتا ہے۔اس دفعہ شندور اسی نے کھیلنا تھا۔یوسف خان نے اعلان کر دیا کہ جو آخری داؤ کھیلے گا،اسی کو رستم ملے گا اور یہ بات طے ہوگئی کہ اب ابتہاج جیتے گا۔کیوں کہ انعام میں ملی ہوئی رقوم، جائیداد، پراپرٹی وراثت میں شمار نہیں ہوتی،اس لیے اس کا بٹوارہ نہیں ہوتا۔یوسف خان کا ۔دی سردار آف چترال کا بیٹا پولو کھیل رہا ہے۔کس کی مجال ہوگی اس سے جیتنے کی؟ کوئی مائی کا لعل کوشش کرے گا اسے ہرانے کی؟ اسے اپنی جان پیاری نہیں ہوگی؟ ہرگز ہوگی۔

اس لیے آخری داؤ ابتہاج ہی کھیلے گا اور ایسا دونوں ٹیموں کو اچھے سے سمجھا دیا گیا ہوگا۔پیسوں کے ذریعے ہو، دھمکا کے ہو یا لالچ دے کے۔سارے کھلاڑی ملے ہوئے ہوں گے اور وہ ابتہاج کو جتائیں گے۔ابتہاج رستم جیت جائے گا تو کوئی اس سے حصہ نہیں مانگے گا۔اسی طرح اس کے پاس عام وراثت کے علاوہ بھی کروڑوں روپے آجائیں گے اور جہاں تک اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔آج نہیں تو کل اس خاندان کو بٹوارہ تو کرنا ہی پڑے گا۔دنیا ایڈوانس ہو رہی ہے۔سب کو اپنے خاندان کی پڑی ہوئی تھی۔یہ سرداری والا نظام زیادہ دن تک نہیں چل سکتا تھا۔اور اگر بٹوارہ ہوا تو تین سو لوگوں میں اس جائیداد کی تقسیم سے تھوڑا تھوڑا حصہ آئے گا جس میں یہ لوگ صرف ذاتی گھر بنا سکیں گے۔یہ Domestic Politics تھی۔یعنی گھریلو سیاست۔"

وہ پنڈولم کی طرح ٹہلتے ہوئے ناخن کتر رہی تھی۔راہداری سنسان تھی۔

"اس نے خود اپنے کانوں سے موٹی چچی کو حصے، جائیداد کی باتیں کرتا سنا تھا۔اگر گھر کی سربراہ ایسی بات کرے تو کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہوتا ہے۔مانا کہ رستم ایک بیش بہا گھوڑا تھا۔اس کی قیمت کروڑوں میں تھی لیکن گل ان پیسوں کا لالچ نہیں رکھتی تھی۔اگر اس کے دل میں ذرا بھی حرص ہوتی تو وہ اب تک اسے بیچ باچ کے جانے کہاں بیٹھی ہوتی۔"

اس نے ہونٹوں کو گول کر کے ایک اذیت بھری سانس نکالی۔

"گل مخلص تھی۔لیکن اس کی مخلصی کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔جس طرح ابتہاج اور اس کا خاندان رستم کی قیمت کے پیچھے پڑا تھا۔اس کو لگ رہا تھا کہ اگر گل نے حق مانگا تو سارے پیسے گل کو مل جائیں گے حالانکہ گل کو پیسوں اور رقم سے کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا۔گل کو صرف اپنے بابا کی نشانی چاہیے تھی۔ سرداری نہ ملنے کی وجہ سے ابتہاج اب ایک تیر سے کئی شکار کر رہا تھا۔ایک طرف گھوڑوں کو مار کر رستم کو وقف کرایا،اب اسی رستم کو حاصل کر کے باپ کی آنکھوں میں اور قبیلے میں عزت بڑھائے گا جب کہ دوسری طرف گل کو زِچ کر کے،اس سے رستم چھین کے اس کو نیچا دکھائے گا۔وہ خالی ہاتھ رہ جائے گی۔بی جان نے جس قبیلے کی عزت و ناموس کا واسطہ دے کر اسے چپ کرا دیا تھا،وہ قبیلہ کل اپنی عزت بحال کر لے گا اور گل اپنی بے بسی پر ماتم کرے گی۔"

اس کے دل میں ہوک اٹھی۔

"وہ لڑکی جو ہر چیز کے لیے لڑ رہی تھی۔اس کو کس قدر سرحدوں میں یہ لوگ گھیر رہے تھے۔اتنی رکاوٹیں تو شاید ہی کسی کے خاندان نے کھڑی کی ہوں گی۔اسے پولو کھیلنے دیا جاتا تو آج وہ ابتہاج کے ساتھ میدان میں مقابلہ کر کے اپنا رستم چھین لیتی۔یہ سفاک لوگ اسے کھرچ بھی رہے تھے اور سسکی لینے کی اجازت بھی نہیں دے رہے تھے۔کیا ایسے ہوتے ہیں رشتہ دار؟ ایسے ہوتے ہیں ولی؟ باپ مر جائے تو بچے "دربدر" ہو جاتے ہیں۔"

اسی اثنا سامنے سے آنچل لہراتی مٹکاتی پلوشہ نظر آئی جس کے ہاتھ میں خاکستری سربمہر کاغذ تھا۔عبادہ جو ٹہل رہی تھی،اسے آتا دیکھ کے ٹھٹک گئی۔

"پلوشہ؟"

"جی؟" وہ دھپ سے اس کے سامنے جا رکی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

''گل کی چٹھی آئی ہے۔''

یکدم وہ چونک گئی۔چٹھی مطلب سلیکشن لیٹر۔

''لاؤ مجھے دو۔میں گل کو دے دوں گی۔''اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے شانے اچکا کر چٹھی اس کی ہتھیلی پر رکھی اور اسی طرح اپنے من میں لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔اس کے اوجھل ہوتے ہی،اس نے تیزی سے لفافہ چاک کی اور دو انگلیوں سے کاغذ باہر نکالا۔

گل پولو ٹیم میں منتخب نہیں ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔سورج کی نارنجی ٹکیہ ترچ میر کی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہی تھی۔برف سے ڈھکی چوٹی پر سنہری کرنیں افشاں کی طرح پھیل رہی تھیں۔حویلی کا اودھم برقرار تھا۔وہی آوازیں تھیں جو ہر روز سرِ شام بلند ہوتی تھیں۔گاؤں کے گھروں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں جو دور سے کسی جگنو کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔وہ اپنی بالکونی میں تھی۔ریلنگ پر ہاتھ رکھ کے اداس کھائیوں کو افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔جب ہم اداس ہوتے ہیں تو ہمیں ہر چیز اداس لگتی ہے،یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی ماتم کناں نظر آتی ہیں جن میں جان تک نہیں ہوتی۔

اس کا سنہرا آنچل کندھوں سے ڈھلک رہا تھا۔بال ڈھیلے سے جوڑے میں بندھے تھے۔آنکھیں بدستور سرخ تھیں اور مسلسل رونے کی وجہ سے جل رہی تھیں۔وہ کوہ ہندوکش کو دیکھ رہی تھی جن کے دامن میں کہیں رستم ہنہنا رہا تھا۔وہ چوٹیاں اس کی پہنچ سے اتنی دور تھیں کہ راہیں دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک جاتی تھیں۔ایک ٹھنڈی اور بے رحم سی آہ منہ سے نکلتی اور دل کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ جاتا۔

کمرے کی لائٹیں بند تھیں، بالکونی کی لائٹیں بند تھیں۔اس کی زندگی کی لائٹیں بند تھیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔اندر باہر۔گھپ، خاموش۔کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا اندھیرا۔اس نے انگوٹھے سے وہ آنسو صاف کیا جو خود بخود آنکھ سے ٹپک گیا تھا۔اب تو یہ آنسو بھی بے مول لگ رہے تھے۔ایک بوندِ آب جس میں صرف نمک شامل تھا اور کچھ نہیں!

اسی لمحے بالکونی کی لائٹ روشن ہوئی۔وہ چونک کے پلٹی۔عالیہ بیگم کی ملازمہ نے بٹن آن کیا تھا۔وہ بالکونی کے دروازے میں غیر معمولی تاثر لیے کھڑی تھیں۔گل لالہ کے اندر ایک لاوا سلگ اٹھا۔اس نے کچھ سخت کہنے کے لیے لب تھرکے ہی تھے کہ عالیہ نے ہاتھ اٹھا کے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''آج میں کچھ سننے نہیں، کچھ کہنے آئی ہوں۔'' وہ مدھم مگر خشک لہجے میں بولیں۔

''آپ کو لگتا ہے ''میں'' آپ کی بات سنوں گی؟'' اس نے بے لچک لہجے میں پوچھا۔وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

''تم ضرور سنو گی۔''

''خوش فہمی ہے آپ کی عالیہ گودائی۔'' وہ تنفر سے کہتی اندر کی طرف بڑھنے لگی مگر اس سے پہلے کہ چوکھٹ پہ قدم رکھتی، عالیہ نے دفعتاً اپنا موبائل اس کے سامنے لہرایا۔روشن اسکرین کو دیکھ کے وہ ٹھہر گئی۔

وہاں ایک پچیس چھبیس سال کے لڑکے کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔وہ مسکراتا ہوا چہرہ گل پہلے دیکھ چکی تھی۔وہ آنکھیں، وہ ٹھوڑی کا خم.....وہ کچھ جانا پہچانا تھا۔اس نے بھنویں یکجا کر کے غور سے اس کو دیکھا.....وہ.....وہ اسد تھا.....اس کا کلاس فیلو۔

''میرا بیٹا ہے اسد رحمان گودائی۔'' عالیہ کے انکشاف پر اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

''میرے خیال سے اب تم مجھ سے بات کرو گی۔'' انہوں نے فاتحانہ انداز میں کہتے ہوئے فون بیچھے کر دیا۔

☆.....☆.....☆

تاریخ: اٹھارہ سال قبل

مقام: ایون

بلتی قبیلہ ہو یا بلتیوں کی ٹیم۔ دونوں کا خیال حویلی میں بہت خلوص اور اپنائیت سے رکھا جاتا تھا۔ کوشش کی جاتی تھی کہ قبیلے کے کسی بھی فرد کی دل آزاری نہ ہو۔ ان کی ضرورتوں کی پوری پوری تسلی کی جاتی تھی۔ ان کے کاموں کے لیے قبیلے کے ان گنت ملازم تعینات کیے گئے تھے جو ہر وقت ان کی ناز برداریاں اٹھاتے تھے۔ نعیم اللہ کی ٹیم بڑی چست تھی۔ کڑی محنت کر رہی تھی۔ اس دن اصطبل میں جانے کیسے نعیم نے اپنی ٹیم کو بریک دیا تھا۔ وہ میدان کی بجائے پہلی بار اصطبل کے اندر دیکھے گئے تھے۔ وہ بڑی ہی محبت اور ستائش سے کھوواریوں کے گھوڑوں کی نئی کھیپ دیکھ رہے تھے۔ یوسف خان نے اس دفعہ اصطبل میں آٹھ نئے گھوڑوں کا اضافہ کیا تھا۔

اصطبل کے اندر گھوڑے اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں ہنہنا رہے تھے۔ ملازم ہر کوٹھڑی کے ساتھ چوکنا کھڑے تھے جیسے نمائش کے دوران فنکار اپنے نمونے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بلتی ٹیم کے سات لوگ جن میں سردار کا بیٹا ''رمیز'' بھی شامل تھا، وہ گھوڑوں کی پھرتی اور چکناہٹ دیکھ کر داد دے رہے تھے۔

اسی اثنا کلیم اللہ بلوری پر بیٹھے اصطبل کے اندر آئے۔ جیسے ہی بلوری دروازے پر نمودار ہوئی۔ کھلاڑی چوکھٹ میں سائے ابھرنے پر ایڑیوں کے بل پلٹے۔ کلیم اللہ مسکراتا ہوا بلوری کو اندر لایا پھر جست لگا کر اتر گیا، اس کے ہاتھ میں پولو سٹک تھی۔

''السلام علیکم بھائی جان۔کیسے ہیں؟'' رمیز خوشگوار مسکراہٹ چہرے پر سجائے ان کی طرف بڑھا۔

''اچھا ہوں میں۔تم لوگ سناؤ۔پریکٹس کیسی چل رہی ہے؟'' انہوں نے بغل گیر ہونے کے بعد دریافت کیا۔

''مت پوچھیں۔کپتان صاحب سانس نہیں لینے دے رہے۔'' وہ تکان سے مسکرائے۔

''ہاہاہا۔کوئی بات نہیں۔تم لوگ اپنے کپتان کی مجبوری سمجھو۔تمہارے لیے محض ایک میچ ہے جب کہ میرے اور میرے بھائی جان کے لیے وہ سرداری کی شرط ہے۔'' انہوں نے مذاق میں یہ بات کہی مگر نعیم اللہ کا منہ بن گیا۔

وہ تیوریوں پر بل ڈالے آگے آیا۔

''اور بلاشبہ یہ شرط میں جیتوں گا۔'' اس نے کلیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے باور کرایا۔کلیم اس کے تاثرات دیکھ کے ٹھٹک گیا۔رمیز بلوری کی شان کو آنکھوں میں خیرہ کر رہا تھا۔

''ان شاءاللہ۔'' کلیم نے سر جھٹک کر نرمی سے کہا۔

''بھائی جان یہ بلوری ہے ناں؟'' رمیز نے پوچھا۔وہ جو لگام تھامے کھڑے تھے۔بلوری کی گردن کو سہلاتے ہوئے بولے۔

''ہاں۔یہ میری جان ہے۔''

''کمال کی گھوڑی ہے۔اس کا تو قدم چھت سے مل رہا ہے۔کیا آپ اس پر پولو کھیلیں گے؟'' وہ بلوری کی کاٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ہاں۔ان شاءاللہ۔''

''پھر تو نعیم بھائی جان۔ہم ہار جائیں گے۔اس گھوڑی کے رعب سے گھوڑے بپھر سکتے ہیں۔'' وہ رکاب میں پیر ڈال کر بلوری پر بیٹھ گیا اور کلیم سے لگام کھینچ لی۔بلوری نے دو قدم آگے لیے پھر

بے چینی سے دو قدم پیچھے ہوئی۔ اسے دوسرا لمس برا لگا تھا۔

''ہم نہیں ہار سکتے رمیز۔ بھول جاؤ کہ کوئی اس ''لائق'' ہوگا کہ ہمیں ہرا سکے۔'' نعیم نے ناک سے مکھی جھلائی۔ کلیم بلوری کے پیروں میں اٹھنے والے اضطراب کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹھیک نہیں تھی۔

''کیا شاندار سواری ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں براق پہ بیٹھا ہوں۔ کسی دیومالائی شہزادے کی طرح۔'' وہ اپنے تخیل میں کھونے لگا۔

''رمیز اسی گھوڑی چڑھ جایئے گا اپنی شادی پہ۔'' اس کے ساتھی کھلاڑی نے آنکھ دبائی۔ سب ہنس پڑے۔ وہ بھی مسکرایا۔ بلوری کی ہلکی سی ہنکار سنائی دی۔ کلیم کو گڑبڑ محسوس ہوئی۔

''چڑھ تو جاؤں مگر کلیم اللہ اجازت نہیں دے گا۔'' اس نے نروٹھے انداز میں چوٹ کی۔

''رمیز اتر جاؤ دوست۔ گھوڑی ناراض ہو رہی ہے۔'' کلیم نے مفاہمت سے کہا۔

''گھوڑی یا گھوڑا بھی ناراض ہوتا ہے کیا؟'' اس نے بھنویں سکیڑیں۔

''یہ کلیم اللہ کی گھوڑی ہے۔ اس کے ساتھ انسانوں والے سارے جذبات جڑے ہیں۔'' نعیم نے ٹونٹ کیا۔

''ایسا ہے کیا؟ پھر تو یہ سن بھی سکتی ہوگی۔ رکو ایک منٹ۔'' رمیز شرارت سے کہتا سینے کے بل جھکا اور بلوری کے کان کے پاس چہرہ قریب کر لیا۔ ''سنو میری کالی گھوڑی کیا تم مجھے اپنے اوپر بٹھا کر میرے ساتھ بارات میں جاؤ گی؟''

گھوڑی ہنہنائی۔

''سن لیا اس نے۔ دیکھو اس نے ہاں کر دی ہے۔'' وہ خوشی سے مچل گیا۔

''رمیز اترو۔ گھوڑی برا مان رہی ہے۔''

''کپتان صاحب تم نے سنا۔گھوڑی راضی ہے۔میں اسی پہ برات لے کر جاؤں گا۔کلیم بھائی اب تو آپ کو اسے مجھے دینا پڑے گا۔اب یہ میری بارات لے کر جائے گی۔'' وہ بلوری کو سہلا رہا تھا۔یکدم بلوری نے دو قدم پیچھے لیا اور گھومی، وہ اپنا سر اٹھا رہی تھی۔کلیم کو لگا جیسے وہ سرپٹ بھاگنے والی ہے۔

یکدم وہ آگے گئے۔رمیز کو ہاتھ اور گردن سے پکڑ کر نیچے کیا اور جھٹکا دے کر کھینچا۔بے دھیانی میں ان کا دوسرا ہاتھ بازو کی بجائے کالر پہ پڑ گیا۔اس خوف سے رمیز گرے نہیں، کلیم نے بڑی مضبوطی سے اسے کالر سے پکڑا۔اس بے عزتی پر پورا اصطبل منہ کھولے کلیم کو دیکھنے لگا۔اس نے رمیز کو نیچے لا کر زمین پر چھوڑ دیا۔وہ گرتے گرتے بچا۔وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے بلوری کی طرف بڑھے اور اس کا سر سہلانے لگے۔شناسا لمس پا کر بلوری کی بے تابی میں کمی آئی۔

رمیز ہکا بکا اپنے کالر کو دیکھ رہا تھا۔اس کے ساتھی کھلاڑی اسے دیکھ رہے تھے نعیم اللہ کلیم کو دیکھ رہا تھا جو اس بات سے بے خبر تھا کہ اس نے بلتی مہمان کو کھینچ کر گھوڑے سے اتارا ہے۔وہ بلوری کی گردن کو سہلانے میں مصروف تھا۔

رمیز نے قمیص کو جھٹکا دیا۔کالر ٹھیک کیا۔وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے کلیم؟'' نعیم برہمی سے آگے آیا۔

''کیا ہوا بھائی جان۔'' وہ اب بھی لاعلم تھے۔

''تم نے رمیز کو کالر سے کھینچا ہے۔''

ان کے دل پہ گھونسا پڑا۔تیزی سے گردن موڑ کر رمیز کو دیکھا جو اپنا اشتعال قابو کر رہا تھا۔

''تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ وہ ہمارا مہمان ہے۔تم مہمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھو گے۔'' وہ جلتی پر تیل ڈال رہا تھا۔کلیم کا دل دکھا۔وہ بلوری کو چھوڑ کر رمیز کے پاس آیا۔

''رمیز۔ مجھے معاف کرو۔ میں نے جان بوجھ کے ایسا نہیں کیا۔ بلوری کسی دوسرے کو خود پہ نہیں بٹھاتی۔ بپھر جاتی ہے۔ سرپٹ دوڑنے لگتی ہے۔ تمہیں چوٹ نہ لگ جائے اس لیے مجھے تمہیں کھینچنا پڑا۔'' وہ وضاحت دے رہے تھے جب کہ رمیز انہیں سرخ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''گھوڑی تو اپنی جگہ پر ہے۔ وہ تو نہیں دوڑی۔ کیوں بہانے بنا رہے ہو کلیم۔ تم نے میرے ساتھی کی بے عزتی کی ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے بھائی جان۔ میں نے گھوڑی کو پرسکون کرلیا ہے۔ وہ واقعی بھاگ جاتی۔'' وہ تیزی سے بولے۔

''ڈرامے کر رہے ہو جیسے ہمیں نہیں پتہ تم بلوری کو کسی کو چھونے نہیں دیتے۔ ہونہہ۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ کلیم سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ نعیم بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہا ہے۔ پتھر پہ مغز مارنے کی بجائے اس نے رمیز کو دیکھا۔

''رمیز۔ تم میرے دوست ہو۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ بلوری کی بدلتی طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے مجھے۔ اس کی طبیعت پہ گوارہ نہ ہو تو پٹخ کے گرا دیتی ہے۔ تم تو سمجھدار ہو تم جانتے ہو میں نے تمہاری بے عزتی نہیں کی۔'' وہ نرمی سے کہہ رہے تھے۔

''ہم تو بیوقوف ہیں ناں جو اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بھی سمجھ نہیں پا رہے۔'' نعیم نے ہانک کے کہا۔

''بس۔'' کلیم نے ہاتھ اٹھایا۔ ''بات کو طول مت دیں بھائی جان۔ رمیز اگر تمہیں یقین نہیں تو واپس بیٹھ جاؤ بلوری پر۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ تمہیں بہت بری گرا دے گی۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔'' وہ چیلنج کر رہے تھے۔

''وہ کیوں بیٹھے۔ ایک دفعہ بیٹھنے پر تم نے جو عزت افزائی کی ہے وہ کافی ہے۔''

''بھائی جان یہ سچ نہیں ہے۔وہ گر سکتا تھا۔''

''جھوٹ ہے یہ۔اصل میں تمہیں اچھا ہی نہیں لگتا کہ کوئی بلوری پر بیٹھے۔''انہوں نے چوٹ کی۔

'اگر ایسا ہے تو.....''وہ رمیز کی طرف مڑے۔''رمیز تم دوبارہ بیٹھ جاؤ۔لیکن اگر تم گرے تو ذمہ داری میں نہیں لوں گا۔''

''میں.....دوبارہ.....نہیں.....بیٹھوں.....گا.....''وہ چبا چبا کے کہتا، پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گیا۔اس کے ساتھی کھلاڑی بھی ماتھے پر بل ڈالے وہاں سے کھسک گئے۔ان کو روٹھ کے جاتا دیکھ کے ان کے دل کو کچھ ہوا۔ان کا مقصد، ارادہ یا نیت ایسی نہیں تھی۔وہ تو اس کی جان بچانا چاہتے تھے۔وہ برا کیوں مان گیا تھا۔انہوں نے شکوہ کناں نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

''بات اتنی بڑی نہیں تھی بھائی جان۔''

''کسی کو کالر سے پکڑنا بڑی بات ہے کلیم اللہ خان۔بڑی بات ہے۔''انہوں نے سر ہلا ہلا کے کہا۔(اور اگر نہیں ہے تو مجھے بنانا آتی ہے۔)اس پر اچٹتی نظر ڈال کر وہ وہاں سے چلا گیا۔کلیم دھواں دھواں رہ گیا۔

کیسے لوگ تھے یہ.....؟

☆.....☆.....☆

یہ ناخوشگوار واقعہ دو دن میں رفع دفع ہو گیا۔کلیم نے دوبارہ معافی مانگی تو رمیز نے معاف کر دیا۔وہ پکے دوست تھے۔وہ جتنی جلدی ناراض ہوتے تھے۔اتنی ہی جلدی مان جایا کرتے تھے پھر رمیز جانتا تھا کہ اگر کلیم نے کالر سے پکڑنا ہوتا تو پہلا ہاتھ ہی کالر میں ڈالتا۔وہ بازو نہ پکڑتا۔خیر۔یہ بات آئی گئی ہو گئی۔کسی کو یاد نہیں رہی۔شندور کا میلا شروع ہو گیا تھا۔بلتی اور چترالی سب بابوسر ٹاپ پہنچ گئے تھے۔شندور کا میدان سجا ہوا تھا۔شائقین کی بڑی تعداد نے شرکت کی

تھی۔اس دفعہ لوگ نعیم اور کلیم کے درمیان میچ دیکھنے گئے تھے۔انہیں چترال اور گلگت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

دونوں ٹیموں کے گھوڑے میدان میں پہنچ گئے تھے۔سرسبز میدان پر ایک ''فیصلہ کن'' جنگ ہونے والی تھی۔بلتی اور چترالی دونوں فریقین میں ایک دوسرے کو ہرانے کا بھرپور عزم نظر آرہا تھا۔شائقین اس بار خاموش تھے۔وہ شندور پولو کی آڑ میں ''گلگت'' یا ''چترال'' کا ذومعنی نعرہ نہیں لگا سکتے تھے۔یہ ثابت کرسکتا تھا کہ وہ کس بھائی کے ساتھ ہیں۔اس لیے انہوں نے گول کرنے والی ٹیم کو شاباشیاں اور خراج دینا تھا، پھر چاہے وہ گول کوئی بھی ٹیم کرے۔

سرور خان ،خرسندہ بیگم، بڑی بہو ،یوسف خان اور دیگر مہمانان خصوصی اپنے پنڈال میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔سرور خان نے آنکھوں پر چشمہ لگایا ہوا تھا۔وہ بہت غور سے کارروائی دیکھنے والے تھے۔

میچ شروع ہوا۔کھلاڑی دوڑنے لگے۔شائقین نے سانس روک لی۔کوئی شور،کوئی ہنگامہ نہیں ہوا،ٹینس کے میچ کی طرح بھرپور خاموشی رہی۔پہلا راؤنڈ چترال نے جیتا تھا۔کلیم کی بلوری سب پر چھا رہی تھی لیکن اس کے اندر اضطراب برقرار تھا۔کلیم محسوس کرسکتا تھا کہ بلوری کو کچھ ہو رہا ہے۔مگر کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔دوسرا راؤنڈ شروع ہوا تو بلوری کا انداز بہت بدل گیا تھا۔وہ فوکس نہیں کر رہی تھی۔کلیم اس کی باگ کہیں موڑتے،وہ کہیں جا رہی تھی۔پوزیشن فور پر ہونے کی وجہ سے ان پر بے تحاشا پریشر تھا۔وہ سمجھ رہے تھے کہ بلوری رمیز کا لمس نہیں بھولی ابھی تک۔یا خدا۔یہ کچھ کر نہ دے۔وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے۔

دوسرا راؤنڈ بلوری کی عدم توجہ کی وجہ سے گلگت نے جیت لیا۔دو راؤنڈز کے بعد کھلاڑی ستاتے تھے۔وہ میدان میں ہی بلوری سے اترے اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔وہ بظاہر ٹھیک تھی

تو کیا وہ لوگوں سے ڈر رہی تھی۔ لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا اور جلسے کے جیالوں کی طرح بہت جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس جم گھٹے کو دیکھ کر شاید بلوری گھبرا رہی تھی۔ وہ بلوری کو یہاں سے نہیں لے جا سکتے تھے۔ کسی اور گھوڑے پر بیٹھنے کا تجربہ انہیں نہیں تھا نہ ہی وہ اتنی جلدی دوسرے گھوڑے کو اپنے لمس سے مانوس کر سکتے تھے۔ انہیں بے چینی ہونے لگی۔

بلوری نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ جانے اس دفعہ کیوں اتنی مضطرب لگ رہی تھی۔

تیسرا راؤنڈ شروع ہونے سے قبل انہوں نے بلوری کو بے تحاشا پیار کیا۔ اسے سہلاتا رہا۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتا رہا کہ وہ کسی سے نہ ڈرے۔ لوگوں کو میدان میں آنے کی اجازت نہیں ہے مگر گھوڑا تو گھوڑا ہوتا ہے۔ زبانی کلامی تسلیاں اسے کہاں سمجھا سکتی ہیں۔

تیسرے راؤنڈ کے عین درمیان وہ بدک گیا۔ اور کچھ ایسا بدکی کہ پورے میدان میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ حواس باختہ انداز میں یہاں وہاں جانے لگا اور چوں کہ اس دوران اس کے قریب میں کھلاڑی تھے تو اسے پوری طاقت سے ان پر چڑھائی کی۔ قسمت تھی یا پھر موت ہی ایسی لکھی تھی۔ بلوری نے رمیز اور اس کے گھوڑے کو نشانہ بنا لیا۔ اپنی سروقامتی کی وجہ سے وہ رمیز کے گھوڑے کو بالکل دبا گئی۔ رمیز نے گھوڑے سے اترنے کی کوشش کی مگر وہ بری طرح بلوری سے الجھ گیا۔ اس کی مرصع لگام اس کی گردن کے گرد لپٹ گئی۔ بلوری اس کے گھوڑے پر چڑھنے کے بعد شمال کی طرف بھاگنے لگی۔ اس بھاگم بھاگ میں اس نے رمیز کو کھینچ لیا۔ اس کی لگام اس کے اپنے گھوڑے سے ٹوٹ گئی اور وہ گردن پر رسی پھرنے کے سبب بلوری کے پیچھے کسی بوری کی طرح گھسیٹا ہوا چلا گیا۔

بلوری دیو قامت تھی۔ اسے قابو کرنا کلیم کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ مجمع میں ایک بے چینی دوڑ گئی تھی۔ سب اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ بلوری حواس باختہ انداز میں بھاگ

رہی تھی۔ وہ بالکل ہذیانی ہوگئی تھی۔ کلیم کبھی پیچھے دیکھتا، کبھی آگے۔ رمیز بری برح کھانس رہا تھا۔ سکیورٹی کمیٹی کے اہلکار گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ رمیز رپٹا رہا رپٹا رہا۔ جب تک کہ اہلکار وہ رسی کاٹتے، اسے بچاتے۔ وہ دنیا سے جا چکا تھا۔ شندور کی سرزمین پر پولو کے دوران یہ پہلی موت تھی جو بلتی قبیلے کے کھلاڑی اور کھوواری قبیلے کے گھوڑے سے ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ حادثہ ذہنوں میں نصب ہوگیا تھا۔ بلوری تو رک گئی تھی لیکن رمیز چلا گیا تھا۔ پولو میچ منسوخ ہوا۔ شندور کینسل ہوگیا۔ میلہ ختم۔ لوگ مایوسی سے گھروں کو لوٹ گئے اور نعیم اللہ نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور سب کے کانوں میں ایک صور پھونکا۔☆

''یہ حادثہ نہیں۔ قتل ہے۔ کلیم نے کیا ہے کیوں کہ دو دن پہلے دونوں کا بلوری کو لے کر جھگڑا ہوا تھا اور کلیم نے کالر سے پکڑ کر رمیز کو بلوری سے اتارا تھا۔'' یہ صور چترالیوں سے پہلے بلتیوں کے کانوں میں پھونکا گیا۔ اپنے لیے شیطانی طریقوں سے راستہ ہموار کرنے کا ایک چھوٹا سا حربہ تھا۔

پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

بلتی اور چترالی دشمنی کا۔

چونکہ گھوڑا کلیم کا تھا اور کھلاڑی بلتیوں کا۔ اس لیے سب کو اس معاملے کی مکمل تحقیقات چاہیے تھیں۔ بلتیوں کا غصہ آسمان چھو رہا تھا۔ سرور خان یہ دکھ اور یہ تکلیف برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ کلیم پر ہر طرف تھوتھو ہونے لگی۔ سب کی انگلیاں، سب کی حقیر نگاہیں، سب کی گالیاں، تلخ جملوں کا رخ کلیم کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ لوگوں نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ اس نے تصور نہیں کیا تھا کہ خود ان کے بھائی نے یہ غلیظ خبر پھیلائی ہے۔ جس وقت یہ دشمنی پل رہی تھی۔ نعیم اللہ بڑی ہی ہمدری سے گلگت کے چکر لگا رہا تھا۔ اس کا مقصد دونوں طرف سے اس آگ کو برابر ہوا دینا

تھا۔ جب ہم جھگڑا کرتے ہیں تو ہمارا دوسرے سے ایک مقام پر ''اختلاف'' ہوتا ہے مگر جب سامنے والے کو کوئی ''سپورٹ'' کرے تو ہمارے اس سے ''اختلافات'' ہوجاتے ہیں۔ ہمیں برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی ہمارا ساتھ دینے کی بجائے ہم سے اختلاف کرنے والے کا ساتھ دے۔

بلتیوں پر ظلم ہوا تھا کیوں کہ قتل ان کا ہوا تھا۔ چترال اور گلگت کی حمایت ان کے ساتھ تھی۔ کلیم نہتا تھا۔ اکیلا تھا۔ وہ اپنے ہی قبیلے کو سمجھا سمجھا کے تھک گیا تھا کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ الزام بے بنیاد ہے۔

''تم نے رمیز سے جھگڑا کیا تھا یا نہیں؟ بتاؤ کلیم۔'' صحن میں وہ سب چاروں طرف سے کھڑے تھے۔ کلیم درمیان میں تھا۔ وہ لاچار تھا۔ بے بس تھا۔ دشمنی شروع ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ ہر سوال کا جوابدہ تھا۔

''میں نے کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ معمولی غلط فہمی تھی اور میں نے معافی بھی مانگ لی تھی۔''

''اس نے تمہیں معاف کیا تھا؟'' نعیم نے ایک وکیل کو کٹہرے میں کھڑا کیا تھا۔

''ہاں کیا تھا۔ کھلے دل سے کیا تھا۔''

''پھر بھی تم نے اس کی جان لے لی۔ تمہیں رحم کیوں نہیں آیا؟'' نعیم مبالغہ آرائی کر رہا تھا۔ وہ شدید تناؤ پھیلا رہا تھا۔

''میں نے نہیں لی۔ مجھے لینا ہوتی تو میں پہلے لے لیتا۔ اپنی سرداری کے امتحان کے مقام پر ایسی گھٹیا حرکت نہیں کرتا۔'' وہ وکیل تھے دلائل دینے لگے۔

''مگر تم نے کی ہے۔ اب ہم بلتیوں کو کیا جواب دیں گے؟ داجی ہم تو برباد ہوگئے۔ بلتی بہت طاقت ور ہیں۔ وہ ہمیں روند ڈالیں گے۔''

''بھائی جان! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ پلیز خوف مت پھیلائیں۔'' اس نے منت کی۔ سرور خان

تخت پر بیٹھا چھڑی پر ہاتھ رکھ کے ماتھا ٹکائے بری طرح گھبرا رہا تھا۔کلیم کی بیوی، مسفرہ سب ہی رو رہے تھے۔

''نعیم حوصلہ رکھو۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یوسف نے کہا۔

'' کچھ نہیں ٹھیک ہوگا۔وہ قصاص مانگ رہے ہیں۔قتل کے بدلے قتل۔جہانگیر گودائی کا بھائی مارا ہے تم نے سفاک انسان۔اب وہ تمہارا خون ضرور بہائے گا۔''

''بھائی جان آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' کلیم کو دھچکا لگا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔وہ لوگ تمہیں قتل کرنے آئیں گے۔''

''نعیم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ہوش کرو۔'' یوسف نے ڈانٹا۔

''میں ہوش میں ہوں بھائی صاحب۔آپ سب بھی ہوش میں آجائیں۔سب ساری عورتیں بیوہ ہوں گی۔بچے یتیم ہوں گے۔سب کو بھگتنا پڑے گا۔'' کیا اس سے زیادہ کوئی خوف وہراس پھیلا سکتا تھا۔کیا کوئی اور ایسی کھلم کھلا دہشت گردی کر سکتا تھا۔

''آپ ایسا سرداری کی وجہ سے کہہ رہے ہیں ناں؟'' کلیم نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔'' میں جانتا ہوں۔مجھے نہیں چاہیے سرداری۔آپ رکھ لیں۔بن جائیں چترال کے سردار مگر مجھ پر قتل کا الزام نہ لگائیں۔میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

نعیم نے رونا شروع کر دیا۔''داجی.....'' وہ ڈرامہ کرنے لگا۔''سن رہے ہیں۔آپ کا لاڈلہ کیا کہہ رہا ہے۔میں.....میں.....(فنکاری) اس کا بھائی۔اس کا بھائی ایسا کروں گا؟ یا اللہ۔میں مر کیوں نہیں جاتا۔ایک بھائی دوسرے بھائی پر اتنا شدید الزام کیسے لگا سکتا ہے۔''

''داجی یہ جھوٹ ہے۔میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

اس نے بمشکل حالات کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی مگر نعیم ایک طرف کا داؤ نہیں کھیل رہا

تھا۔ یہاں ہر اسانی پھیلانے کے بعد وہ وہاں آگ لگا رہا تھا۔ دشمنی میں دو دشمن خطرناک نہیں ہوتے۔ دو دشمنوں کے درمیان موجود وہ تیسرا خطرناک ہوتا ہے۔ بلتیوں کو اور آگ لگی تو انہوں نے ایک ہفتے کے اندر اندر قصاص مانگا۔ جہانگیر نعیم کا دوست تھا۔ دوست دوست کی کیوں نہ سنتا۔ کیوں نہ مانتا؟ اس نے جہاں تک ہو سکا اسے بھڑکایا۔

اپنے بابت قتل کے بدلے قتل کا سن کے کلیم کے ہوش اڑ گئے تھے مگر جب بلتیوں کے یلغار کر کے پیغام پہنچایا تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے۔ گھناؤنے الزام کے بعد بے رحم سزا سن کر ان کو سب ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

ہو نہ ہو یہ بلتی غلط فہمی میں آ کر اسے سزا دے ڈالیں گے۔ وہ ڈرتا نہیں تھا مگر اس کے قتل کے بعد بھی تو یہ دشمنی نہیں تھمنے والی تھی۔ صدیوں کے تعلقات ختم ہونے والے تھے۔ وہ محض ایک گھٹیا انسان کی سراسیمگی کے سبب ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے احتشام الدین کو حویلی بلایا۔ وہ قانونی آدمی تھا۔ وہی سب کا سدِ باب کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے۔ لوگ رابطوں کے لیے ایک دوسرے کو چٹھی لکھتے تھے جس کے پہنچنے اور آپ کو اس کا جواب ملنے میں پورے پندرہ دن لگتے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔

انہوں نے ملازم کو گاڑی دی، وہ اگلے روز احتشام کو لیتا ہوا آیا تھا۔

''یہ سب کیا کہہ رہے ہو تم؟'' وہ غش کھا رہا تھا۔ بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر میں سچ کہہ رہا ہوں (جذبات سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا) میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ جس چیز کو جواز بنا کر یہ لوگ مجھ پر قتل کا الزام لگا رہے ہیں۔ وہ چھوٹی سی تلخی کلامی تھی۔ اس میں بھی زیادہ میری طرف سے ہوئی تھی۔ بدلہ اسے لینا چاہیے تھا۔ میں زیادتی پہ دوسری زیادتی کیوں کروں گا؟'' وہ بہت پریشان تھے۔

''اچھا تم فکر مت کرو۔ میں پولیس سے ملتا ہوں۔ قانونی کارروائیاں دیکھ لیتا ہوں۔''

''پلیز۔ احتشام۔ مجھے ان سب سے بچالو۔ میری طرف کوئی بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ میں کسی کو صفائی نہیں دے پا رہا ہوں۔'' وہ ایک اذیت سے کہہ رہے تھے۔

''بے فکر رہو۔ میں تمہیں اس سب میں نہیں رہنے دوں گا۔ میں سارا معاملہ خود دیکھ لوں گا۔''

احتشام کی تسلی نے کلیم کو ڈھارس بندھائی۔ مگر ان دونوں کو یہ نہیں پتہ تھا کہ نعیم کلیم سے ملنے آنے والے ہر شخص پر نظر رکھ رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح احتشام اپنی ٹیم اور پولیس کے ساتھ چیدہ چیدہ نکتوں کی کھوج لگا رہا ہے۔ اسے اپنی سرداری میں کلیم کا چہرہ دوبارہ ابھرتا ہوا نظر آیا۔

اس نے جہانگیر (رمیز کا بھائی) کو فون کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ قصاص لیا جائے۔

☆.....☆.....☆

اس دن انہوں نے کالاش سے شاہ سردار کو بلایا تھا۔ ان دونوں نے گھڑ سواری کرنی تھی۔ وہ بنا ڈرے بغیر کوئی خوف دل میں لائے بلوری کو لے کر نکل گئے مگر انہیں یہ نہیں پتہ تھا کہ رمیز کا بھائی جہانگیر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ کسی کو گارڈ یا ملازم کو کبھی اپنے ساتھ نہیں لے کر جاتا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ علاقہ اپنا ہو تو دشمن کوئی نہیں ہوتا۔ چترال ان کا تھا۔ وہاں ان کو کونسا دشمن ہو سکتا تھا۔ وہاں تو لوگ انہیں دل و جان سے چاہتے تھے۔ دشمن تو کہیں اور تھے۔ تو کیا وہ دشمن خفیہ طور پر یہاں آ نہیں سکتے تھے؟

آ سکتے تھے۔ یقیناً آ سکتے تھے۔ ان دونوں احتشام پشاور واپس چلا گیا تھا۔ اسے وہاں جا کر رمیز کے کیس کی قانونی کارروائیاں مکمل کرنا تھیں۔ اس وقت بلوری کے علاوہ ان کا کوئی نہیں تھا۔ وہ تن تنہا تھے اور کہتے ہیں جس کی موت آ جائے اسے ''چن'' لیا جاتا ہے۔ انہیں بھی حویلی کی جھنڈ، ہجوم سے چن لیا گیا تھا۔ وہ جس ٹریک پر ہمیشہ بلوری کو لے کر جاتے۔ اس دن لے جا رہے

تھے۔آج بھی بلوری کی چال میں بے چینی تھی۔وہ پچھلے ڈھائی سال سے گھوڑے کے ساتھ تھے مگر تاحال اس کی طبیعت کے زیر و بم کو سمجھ نہیں پائے تھے۔وہ جھک کر بلوری کی گردن سہلانے لگے۔

''کیا ہوگیا ہے میری جان۔ڈگمگاہٹ کیوں ہے تمہاری چال میں؟'' وہ تشویش میں آگئے تھے۔بلوری سرگرمی کے وقت ہنہناتی نہیں تھی۔چاہے وہ سرگرمی میں گھڑسواری ہوتی یا پولو۔اپنے جسمانی کسرت کو وہ بغیر کسی بلبلاہٹ یا شور پیدا کیے کرتی تھی۔آج اگر وہ وہی والی آواز پھر سے نکال رہی تھی تو یقیناً کچھ گڑبڑ تھی۔وہ گھبرا نہیں رہے تھے۔وہ پریشان تھے۔اتنے قیمتی اور بیش بہا گھوڑے کو یکدم سے کچھ ہوجانا قابلِ تشویش تھا۔

وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے بہلا رہے تھے۔سامنے چلتے ہوئے اچانک ہی سڑک دائیں بائیں مڑ جاتی تھی۔اس کی لگام کلیم کے ہاتھ میں تھی۔اسے پرسکون کررہے تھے۔وہ نہیں جانتے تھے کہ محض چند قدم دور جو دائیں طرف کھائی نظر آرہی ہے وہاں ان کی موت لکھی ہے۔وہ تسلی سے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔جس طرح کچھ دن قبل وہ میدان میں سٹپٹائی تھی۔ادھر سٹپٹا گئی۔اس کی سٹپٹاہٹ ایسی تھی گویا پیروں میں کچھ پھنس گیا ہو۔اس کی کالی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا رہا تھا۔وہ بار بار سر جھٹک رہی تھی جیسے اس کے دماغ پر بے تحاشا دباؤ ہو۔

کلیم اسے قابو کررہا تھا۔چوں کہ لگام بلوری کے منہ سے ننھی تھی۔اس لیے وہ فی الوقت ادھر ہی گھوم رہی تھی۔یکدم ہی اس نے کھائی کی طرف منہ کیا اور سر بہت زور سے جھٹکا۔اس جھٹکے کے سبب اس کی لگام کلیم کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ خالی ہاتھ ہوگئے۔اگلے ہی لمحے وہ دوڑنے لگی۔وہ سروقامت گھوڑی تھی۔اس کی جست کئی میٹر کا فاصلہ طے کرتی تھی۔اسے لگا تھا کہ کھائی کے سرے پر گھوڑی رکی بھی تو بہت زور کا جھٹکا کھائے گی،اس جھٹکے سے وہ اچھل کے آگے گر سکتے

ہیں۔وہ نہیں جانتے تھے کہ گھوڑی رکنے والی تھی ہی نہیں۔وہ تو جیسے بے نور ہوگئی تھی۔اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا تھا۔کلیم نے جب دیکھا کہ وہ کھائی کی سمت جا رہی ہے۔ان کا ماتھا ٹھنک گیا۔انہوں نے گھوڑے پر سے چھلانگ کر خود کو زمین پر پٹخ دیا۔

وہ زمین پر گرے اور کئی قلابازیاں کھائیں،تھوڑا دور جا کے وہ رکے تو فضا میں بلوری کی ہنہناہٹ گونج گئی۔کچھ گرنے کی اندوہناک آواز آئی۔وہ گھبرا کے پلٹے تو دیکھا بلوری وہاں نہیں تھی۔وہ تیزی سے اٹھتے،سر سے ہیلمٹ ہٹا کے پھینکا۔بوکھلا کے آگے دوڑے،کھائی کے سرے پر رک کے نیچے دیکھا۔بلوری کا وجود کئی فٹ نیچے کھردری چٹانوں کے درمیان تار تار پڑا تھا۔ان کے دل میں ایک گھونسا پڑا۔

''بلوری.....'' وہ پوری وقت سے چلائے۔بلوری کھائی سے گر چکی تھی۔وہ حواس باختہ ہو گئے۔''بلوری۔بلوری۔'' وہ شدت غم سے چیخ رہے تھے۔ان کی گھوڑی تڑپ رہی تھی۔وہ کھائی پر بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔یہ کھائی عام کھائی نہیں تھی۔اس کے اندر سے چٹانوں کے نوکیلے کونے نکلے ہوئے تھے۔اس قدر تیز اور تیکھے کونے کے گرنے والے کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیتے تھے۔وہ کھائی پر دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہو رہے تھے جب ایک آواز سنائی دی۔

''مر گئی کیا؟''

وہ ایڑیوں کے بل پلٹے۔سامنے دو آدمی کھڑے تھے۔دونوں نے خود کو بڑی سی شالوں میں اچھی طرح ڈھک رکھا تھا۔نعیم نے چہرے سے چادر ہٹائی۔وہ بے قراری سے بھائی کی طرف بھاگے۔

''بھائی جان۔میری بلوری۔بھائی جان میری بلوری۔ نیچے گر گئی ہے۔'' وہ رو رہے تھے۔بہت شدید تکلیف میں تھے۔

''تو تم اوپر کیا کر رہے ہو کلیم اللہ؟'' نعیم کے چہرے پر ٹھنڈی بے رحمی تھی۔کلیم بری طرح ٹھٹک

گیا۔انہوں نے بے خودی میں گردن موڑ کر ساتھ کھڑے آدمی کو دیکھا جس نے چادر کا پلو منہ سے ہٹایا تھا اور اپنا رائفل نکالا تھا۔وہ جہانگیر تھا۔رمیز کا بھائی۔اس کی سانس رکنے لگی۔

''جہانگیر کا کا.....تت.....تم.....''ان کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''رمیز کو کیوں مارا تھا؟''جہانگیر نے ایک قدم ان کی جانب بڑھایا۔

''مم.....میں.....نے نہیں مارا.....'' وہ بمشکل بولے۔''وہ ایک حادثہ تھا۔صرف ایک حادثہ۔''اس وقت وہ خالی ہاتھ تھے۔اپنی جان بچانے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔

''حادثہ اتنی نفاست سے ہوتا ہے کیا؟ میں نے بڑے حادثے دیکھے ہیں ان کا کوئی رنگ ڈھنگ نہیں ہوتا پھر میرے بھائی کی باری میں یہ حادثہ اتنی صفائی سے کیسے ہو گیا؟'' وہ ایک ایک قدم آگے آ رہا تھا۔کلیم ایک ایک قدم پیچھے جا رہا تھا۔پیچھے کھائی تھی۔گہری،عمیق بے رحم کھائی۔

''دیکھیں جہانگیر کا کا۔میرے پاس آپ کے بھائی کو مارنے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے۔آپ کا بھائی میرا اچھا دوست تھا میں اس کی جان کیوں لوں گا؟''

''کیا تم نے شندور سے دو دن پہلے اس کے ساتھ اصطبل میں جھگڑا نہیں کیا تھا؟''نعیم نے جلتی پر تیل ڈالا۔جہانگیر نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ ایک معمولی سی غلط فہمی تھی۔میں نے اور رمیز نے اسے ختم کر لیا تھا۔وہ اتنی بڑی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کی جان لے لیتا۔''

''مگر تم نے لی۔''جہانگیر اس نے ایک قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

''کا کا۔خدا کے لیے میری بات کا یقین کریں۔یہ جھوٹ ہے۔میں نے اسے نہیں مارا۔'' وہ اب گڑگڑا رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کھائی سے نہیں گرا تو اسے گولیوں سے مار ہی دیں گے۔نہ وہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی سامنا کر سکتا تھا۔وہ صرف باتوں سے انہیں راضی کر سکتا تھا۔

''اب ایک جھوٹ ہم بھی بولیں گے۔'' جہانگیر نے سرد مہری سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔ کلیم نے پہلے نیچے دیکھا، پھر گردن گھما کے پیچھے، وہ کھائی کے عین کنارے کھڑا تھا۔

ان کا دل ڈوب کے ابھرا۔ ''نن.....نہیں کا کا.....نہیں.....آ آ آ.....آپ ایسا نہیں کریں گے۔''

جہانگیر نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''الوداع!'' ساتھ ہی اسے دھکا دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ نیچے گرتے، انہوں نے مضبوطی سے جہانگیر کا ہاتھ پکڑا اور گتھم گتھا ہو گئے۔

جہانگیر انہیں پیچھے دھکا دیتے وہ آگے زور لگا رہے تھے۔ نعیم فاصلے پر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کلیم جوان تھا اور جہانگیر پینتالیس سال کا تھا۔ دونوں کی طاقتوں میں فرق تھا۔ کلیم بھاری تھا۔ چوں کہ جہانگیر نے رائفل کا نشانہ نہیں لیا تھا اور رائفل جم میں بڑا ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اسے تھامنا پڑتا تھا اس لیے جہانگیر کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کے گر گیا۔ کھائی کے سرے پر دونوں کے درمیان زبردست کشتی جاری تھی۔

یہ تماشا اور دھکم پیل اس وقت دو لوگ دیکھ رہے تھے لیکن نعیم کو یہ بات پتہ نہیں تھی۔

کلیم کچھ ہی لمحوں پر جہانگیر پر بھاری پڑ گیا۔ اس نے خود کو کھائی سے بہت دور کر لیا تھا اور اب جھک کر جہانگیر کو گھونسوں سے مار رہا تھا۔ یہ دیکھ کے نعیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کلیم اگر بچ گیا تو بہت سی کتھائیں کھل جائیں گی اور اگر وہ راز طشت از بام ہو گئے تو اس کی سرداری گئی۔

اس نے چادر کے نیچے سے پستول نکالی اور جھک کے جہانگیر کو مارتے کلیم کی پشت پر تان لی۔ ان کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے کانپیں مگر یہ اہم تھا۔ اس کو سرداری چاہیے تھی اور ویسے بھی کلیم نے قتل کیا تھا۔ قتل کا بدلہ قتل ہوتا ہے۔ انہوں نے ضمیر کی آواز کو ڈانٹ پلائی اور آنکھیں بند کرتے

ہوئے پہلی گولی چلائی۔ سائلنسر کی ''شوں'' ابھری اور سرسراتی ہوئی گولی کلیم کی کمر میں کندھوں کے درمیان پیوست ہوگئی۔

کلیم جو جھک کے گھونسے برسا رہا تھا۔ اس تکلیف پر کرب ناک چیخ منہ سے نکلی، وہ جھکے جھکے لڑکھڑائے۔ نعیم نے ایک اور گولی چلائی جوان کی گردن کی پشت میں لگی، اب کی بار وہ پوری وقت سے جہانگیر کے اوپر گر گئے۔ گردن کا پچھلا حصہ اسپائنل کارڈ کہلاتا ہے۔ یہاں گولی کا لگنا، فی الفور موت ہوتی ہے۔ کلیم کی سانس چند منٹوں میں رک گئی۔ جہانگیر کے سینے پر کلیم کا بوجھ بھاری ہوا تو ان کی سانس رکنے لگی۔

''ہٹاؤ..... ہٹاؤ.....'' وہ چلائے۔ نعیم نے پستول کمر بند میں ڈالی اور تیزی سے آگے آئے۔ انہوں نے جھک کے کلیم کے ٹھنڈے وجود کو جہانگیر پر سے ہٹایا اور سیدھا کر دیا۔ کلیم کی گردن آگے سے پھٹ چکی تھی۔ جہانگیر کا پورا جسم اس کے خون سے لت پت ہو گیا تھا۔

چند لمحے وہ اپنے بھائی کی گردن کو دیکھتے رہے، دل میں ایک ندامت ابھری مگر انہوں نے ضمیر کی آواز پر لعنت بھیجی اور کلیم کو ہاتھوں سے پکڑ کر کھائی کی طرف گھسیٹنے لگا۔

''یہ..... یہ..... کیا کر رہے ہو.....'' جہانگیر بمشکل اٹھتے ہوئے بولا۔

''لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہوں۔'' انہوں نے کمال بے رحمی سے کہتے ہوئے کلیم کی لاش کو کھائی سے نیچے دھکیل دیا۔ عالم دنیا چیخ پڑی۔ فضاؤں میں چڑیاں پھڑ پھڑائیں۔ ہواؤں نے رخ بدلا۔ زمین ہلی۔ وہ پوری وقت سے چٹانوں، درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں سے چیختے، پٹختے سیدھا بلوری کی بانہوں میں پہنچ گئے۔ بلوری ان سے پہلے ہی اس دنیا سے جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

حویلی میں طوفان آ گیا تھا۔ پورے چترال کے پہاڑ ہل گئے تھے۔ ایک بھیانک اور کالی

قیامت برپا تھی۔حویلی کی چھتوں پر کالے کوے چلا رہے تھے۔پچھواڑے پہلوانی کے میدان کے آس پاس کتے بھونک رہے تھے۔خاندان کیسے اجڑتے تھے۔زندگیاں کیسے تباہ ہوتی ہیں۔قبیلے پہ قبیلے کیسے فنا ہوتے ہیں۔آج پتہ چلا تھا۔دن دہاڑے قیامت کیسے آتی ہے۔صورِ اسرافیل کیسے کانوں میں ڈالا جاتا ہے۔آج پتہ چلا تھا۔ہنستے مسکراتے چہروں سے ہنسی چھین لی گئی تھی۔کھلتی چہکتی کلیوں کو مروڑا گیا تھا۔کھوار قبیلے پر موت ہنس رہی تھی۔زندگی رو رہی تھی۔☆

کلیم کی بیوی ستون کے پاس کسی غلط جگہ نصب کیے مجسمے کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔گل سیڑھیوں پر کسی چچی کی گود میں تھی۔صحن کے بیچوں بیچ کلیم کی میت رکھی ہوئی تھی۔عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔خرسندہ نیم بے ہوش تھیں۔سرور خان پورے بے ہوش تھے۔یوسف اور مجاہد بڑی مشکل سے خود پہ قابو کر رہے تھے اور نعیم۔وہ عورتوں کی طرح سر پیٹتے ہوئے ماتم کر رہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا وہ قصاص لیں گے۔اس نے میری بات کیوں نہیں سنی؟''

اور پھر ایک اندوہناک چیخ بلند ہوتی اور حویلی کی عورتوں کی آوازوں میں گم ہو جاتی۔وہ کہتا۔

''میں نے اکیلے جانے سے بھی منع کیا تھا۔وہ بھیڑیے اس کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔انہوں نے نوچ دیا ہے اسے۔''

اور پھر مرے ہوئے بھائی کی چارپائی ہلاتا۔

''اٹھو کلیم۔میرے بچے۔میری جان۔اٹھو۔'' وہ پوری مہارت سے اداکاری کر رہا تھا۔کسی کا رتی بھر شک بھی نہیں گیا کہ جو کچھ کیا اس شیطان صفت انسان نے کیا ہے۔

☆.....☆.....☆

دونوں قبیلوں کے مابین بڑھتی کشیدگی کے سبب مقامی جرگے نے کلیم کی موت کے پندرہ دن بعد دونوں قبائل کا بڑا فیصلہ رکھا جو جلندھر کی زمین پر ہوا تھا۔مقامی جرگے میں مذہبی سکالرز سے

لے کر قانون دانوں تک سب ہی موجود تھے۔ مقامی جرگے نے دونوں قبیلوں پر کڑی پابندیاں لگائیں۔ انہوں نے کھووار اور بلتی قبیلے دونوں پر شندور میں شرکت اور شندور پولو میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی۔ انہوں نے بلتیوں کا چترال اور چترالیوں کا بلتیوں کے حدود میں داخل ہونا ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے دونوں قبیلوں کے برسوں کے تعلقات کو ختم کردیا۔ دونوں کسی بھی تقریب خواہ وہ خوشی کی ہو یا غمی کی شرکت نہیں کرسکتے تھے۔ چوں کہ ان کی وجہ سے چوگان شندور میلہ متاثر ہوا تھا اس لیے ان پر کڑی حد نافذ کی گئی تھی کہ وہ شندور کے معاملات سے دور رہیں گے۔ پہلے پہل سرور خان پولو کے کھلاڑیوں کا جائزہ لیتا تھا۔ کون ٹیم میں رہے گا اور کون نہیں۔ اس کا فیصلہ ان کی رائے اور ان کی صلاح سے ہوتا تھا۔ ان سے یہ حق چھین لیا گیا۔ پولو کی تمام ذمہ داری مقامی کمیٹی پر ڈال دی گئی تھی۔ بلتیوں سے بھی یہی حق چھینا گیا۔ چوں کہ قتل دونوں طرف ہوئے تھے اس لیے دونوں ہی اس وقت مجرم تھے۔ کوئی معصوم نہیں تھا۔ اس لیے جتنی بھی سزائیں عائد ہوئیں برابر نافذ ہوئیں۔

سرور خان کو کسی بھی سزا نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا شندور سے جدائی نے پہنچایا تھا۔ تاعمر وہ شندور سے دور ہوگئے تھے۔ ان کے قبیلے کا کوئی فرد پولو نہیں کھیل سکتا تھا۔ وہ ان کا بطور سردار استحصال نہیں ہوا تھا مگر سرداری کی بہت سارے اختیارات چھین لیے گئے تھے۔ جہانگیر کو صلح کے قاصد کا پیغام نہ ماننے اور ان کی بے عزتی کے جرم میں بیس لاکھ روپے (جو اس وقت بہت زیادہ تھے) جرمانہ ہوا۔ یہ جرمانہ شندور کے نقصان کا ہرجانہ تھا جو انہوں نے خوشی خوشی بھرا۔

☆.....☆.....☆

نعیم کو اس وقت ایک ہی فکر لاحق تھی۔ سرور خان کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی تھی۔ کلیم کی موت نے انہیں جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ بستر سے لگ گئے تھے۔ ان کے پھیپھڑوں کی بیماری ان پر حاوی ہوگئی

تھی۔نعیم کو خوشی تھی کہ اس کا مقابلہ کرنے والا مر گیا۔اب سرداری اس کی ہو جائے گی۔مگر کلیم کو مرے ہوئے پچیس دن ہو چکے تھے۔داجی کیوں نہیں کوئی فیصلہ کر رہے تھے۔یہ بے چینی بھی ان کا غصہ بڑھا رہی تھی۔

سرور خان کی طبیعت بری طرح بگڑ گئی تھی۔ان کے دن پورے ہو گئے تھے۔حویلی میں عجیب سی کشمکش تھی۔اسی دوران ان کو احساس ہوا کہ اب سرداری کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔کلیم تو چلا گیا، پیچھے بچا نعیم تو انہوں نے ایک مقررہ دن میں تمام قبائی سرداران کو بلا لیا۔جمعے کی نماز کے بعد دستار پوشی کی تقریب تھی۔نعیم پھولے نہ سما رہا تھا۔اس کا دیرینہ خواب پورا ہو رہا تھا۔اس نے ایک ساتھ کئی شکار کیے تھے۔جب یہ بات شاہ سردار کو پتہ چلی تو اس کا تن بدن جلنے لگا۔اس کا دوست مرا تھا۔اپنے مرے ہوئے بھائی کی قبر پر نعیم گھر کیسے بنا سکتا تھا؟

جمعے کی رات وہ حویلی آیا اور سرور خان، یوسف خان سے خفیہ طور پر ملاقات کی۔وہ کلیم کے قتل کا ''چشم دید'' گواہ تھا۔اس نے سرور خان کو بتایا کہ یہ قتل بظاہر جہانگیر نے کیا ہے مگر کلیم کو مارنے والا نعیم ہے۔ان کا دوسرا بیٹا جسے کل دستاری لگے گی۔ان پر ایک نیا پہاڑ گرا تھا۔ایک نیا غم۔پوری دنیا تاریک ہو گئی تھی۔

اگلے روز سرداری کے لیے حویلی کے لان کا قطعہ سرداران سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔درمیان میں ایک مسند رکھی ہوئی تھی۔اس کے بائیں جانب یوسف خان کھڑے تھے اور دائیں جانب نعیم اللہ نک سک سے تیار ہو کے اداس کھڑا تھا۔(چہرے پہ بھائی کے مرنے کا دکھ تھا) کچھ دیر میں سابقہ سردار کی تقریر شروع ہوئی۔انہوں نے جو جو چترال کے لیے کیا تھا، بیان کیا۔مگر آخری اعلان میں انہوں نے نعیم کا نام لینے کی بجائے یوسف خان کا نام لے لیا۔یوسف خان چترال کا نیا سردار نامزد ہو گیا تھا۔یوسف خان ہکا بکا کھڑا تھا۔نعیم غش کھا رہا تھا۔سرداران بری طرح حیران تھے مگر

انہوں نے کسی کو سوال جواب کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انہوں نے یوسف خان کو دستار پہنائی اور وہ نئے سردار بن گئے۔

نعیم اللہ کے اندر ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ خون کھول رہا تھا۔ وہ پھیکے منہ حویلی واپس آیا اور اپنے کمرے کی ساری چیزیں تہس نہس کر دیں۔ سرِ شام جب تقریب مکمل ہوئی۔ مہمان لوٹ گئے۔ نئے سردار کا چناؤ ہوا تب انہوں نے یوسف، خرسندہ بیگم، پٹواری، پولیس اور نعیم کو بلایا۔

انہوں نے پٹواری کو درج ذیل احکام لکھوائے۔

''نعیم اللہ کو میں سرور خان، سردارِ چترال، پورے ہوش وحواس میں اپنی جائیداد سے عاق کرتا ہوں اور اسے چترال کی سرزمین پر قدم نہ رکھنے کی وعید سناتا ہوں۔ میں اسے پوری طرح وطن بدر کرتا ہوں اور نئے سردار بمع پولیس کو یہ حکم دیتا ہوں کہ اگر اس نے نعیم کو چترال کی سرزمین پر دیکھا تو اسے دم لیے بغیر گولیوں سے اڑا دے۔ نعیم اللہ میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ کبھی چترال نہیں آسکتا، سوائے ایک شرط پر۔ اس کی ماں، بچوں اور بیوی کی موت پر۔ میں اگر مر گیا تو میری موت پر نہ آئے۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے اس حکم کی پابندی کی جائے۔''

نعیم اللہ کے پیروں تلے بارودی سرنگیں پھٹتی چلی گئیں۔ تب انہیں احساس ہو کہ اس کے بابا جان سب جان چکے ہیں۔ وہ عاق کر کے، راتوں رات چترال سے نکال دیا گیا۔ یوسف خان ایک اصول پسند آدمی تھا۔ اس نے باپ کا سر بلند رکھا۔

☆.....☆.....☆

احتشام کے پاس رمیز کا کیس تھا۔ وہ اس کی ساری گتھیاں سلجھا چکے تھے۔ وہ یقیناً ثبوت اور گواہ لے کر سرور خان کے پاس ایک دو دن میں آنے والے تھے مگر انہی دِنوں کلیم کو مار دیا گیا۔ کلیم کی موت کی خبر سن کے انہوں نے اس کیس پر لعنت بھیجی تھی۔ کیا حاصل ہوا تھا اتنی تحقیقات کر کے۔ کیا

ملا تھا اتنا سب کچھ کر یدکر۔ کلیم کی موت نے سب پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اتنی محنت اور کارروائی کے باوجود اگر اپنے دوست کی جان نہیں بچا پایا تھا تو لعنت تھی ایسی تحقیق پر۔

وہ اپنی رپورٹس لے کر گلگت گئے۔ جہانگیر کو کالر سے پکڑا اور اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا بھائی حادثے میں مرا تھا۔ کلیم نے نہیں مارا۔ اس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ یہ رہے ثبوت۔ یہی وہ گواہ۔ یہ ہے ساری کارروائی۔

مگر اس وقت جہانگیر کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا اور مقامی جرگے نے دونوں قبیلوں پر پابندی لگا دی تھی۔ جہانگیر کی ہمت نہیں تھی کہ وہ معافی مانگتا مگر عالیہ گودائی اپنے شوہر رحمان گودائی کے ساتھ خفیہ طور پر چترال گئیں اور ان سب کو اس معاملے سے آگاہ کیا۔ تب انہیں پتہ چلا کہ نعیم اللہ کو داجی نے سزا سنادی تھی۔ تب سرور خان اور خرسندہ بیگم نے ایک درخواست کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اگر یہ بات کھل گئی کہ اس سب کے پیچھے نعیم کا ہاتھ تھا تو ان کی ساری اولاد تباہ ہو جائے گی۔ سرداری ختم ہو جائے گی۔ چترال دوسروں کی قید و بند میں چلا جائے گا۔ کسی کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے کہ نعیم نے ایسا کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے بلتیوں سے درخواست کی کہ وہ اب جرگے کے فیصلے کی قدر کریں۔ جرگے نے جو کہا ہے وہی دونوں قبائل کے لیے سود مند ہے۔

اس کے بعد سرور خان کی عزت رکھنے کے لیے، اپنے جہانگیر کی جان بچانے کے لیے اور چترال کو محفوظ بنانے کے لیے انہوں نے دوبارہ چترال کا رخ نہیں کیا۔ اور ساری دنیا میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ رمیز کا قتل کلیم نے کیا اور کلیم کا قتل قصاص میں ہوا۔

☆.....☆.....☆

وہ جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی، سر ہاتھوں میں گرایا ہوا تھا۔ مغرب گزر چکی تھی۔ اب رات کی سیاہی چترال کی پہاڑوں پر پھسل رہی تھی۔ عالیہ بالکونی میں ریلنگ کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ دور افق کو دیکھ

رہی تھی جہاں تارے آب وتاب سے ٹمٹمار ہے تھے۔

''ہم نے تو کبھی رمیز کی موت کو قتل نہیں کہا تھا۔ہم نے اسے حادثہ ہی کہا تھا۔اس لیے بغیر کوئی چوں چرا کیے ہم لوگ میت لے کر گلگت چلے گئے۔ازراہ ہمدردی نعیم وہاں ٹھہرا۔سوگ کے چوتھے دن اس نے یہ خبر مشہور کردی تھی۔ہمارا نقصان ہوا تھا گل۔ہم کیسے اس کی بات پر یقین نہ کرتے۔ وہ جہانگیر کا دوست تھا اور پھر رمیز کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔جہانگیر کا کا لڑائی کے وقت نہیں تھے۔انہیں اندازہ نہیں تھا کہ لڑائی کی شدت کیا تھی۔اس لیے اس نے جو کہا ہم نے وہی سچ مان لیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر مڑیں۔

''ہم اس کے بہکاوے میں آگئے تھے گل۔خاص طور پر جہانگیر لالہ۔ان کو نعیم نے ایسا زہر پلایا کہ انہیں کچھ سوجھا ہی نہیں۔وہ نعیم کی باتوں میں بہکتے چلے گئے۔جس دن وہ کلیم کو مارنے گئے تھے۔انہوں نے ہمیں نہیں بتایا تھا۔کلیم کی موت کے بعد اس نے ہمیں بتایا۔ہم خوش نہیں ہوئے تھے مگر ہمیں غم بھی نہیں تھا۔غم تو ہمیں تب لگا جب سچائی سامنے آئی۔جہانگیر کا کا کو بہت ندامت ہوئی۔وہ بہت شرمندہ ہوگئے۔اس وقت ہمیں سمجھ آگئی کہ یہ سب نعیم نے سرداری کے لیے کیا تھا۔''

وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں۔گل تاحال سکتے میں تھی۔وہ رو نہیں رہی تھی۔وہ اپنی جگہ جم گئی تھی۔

''بلتی چترالیوں کے کبھی دشمن نہیں رہے تھے گل۔ہم امن پسند لوگ ہیں۔ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میں نے چترال کی عزت رکھی اور اس راز کو مشہور نہیں کیا۔اسی طرح سرور خان نے بھی ہماری عزت رکھی اور ہماری غلطی کی تشہیر نہیں کی۔مقامی جرگے نے ہمیں برابر سزا سنائی تھی۔اس لیے ہمیں کوئی غم نہیں تھا۔ہم نے ان سولہ سالوں تک ایک ساتھ سزائیں کاٹی ہیں۔'' وہ گھائل انداز میں کہہ رہی تھیں۔

گل کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دل ڈوب کے ابھر رہا تھا۔

''اسد نے تمہارے پاس وہ فائل دیکھی تو اس نے اپنے ماموں کو پہچان لیا۔ اس نے مجھے فوراً فون کیا اور سب بتا دیا۔ چوں کہ جہانگیر لالہ مر چکے تھے۔ اس لیے اب ہمارے پاس یہ دشمنی رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہم نے یوسف خان کو پیغام بھجوایا کہ اب صلح کر لیتے ہیں۔ انہوں نے پیغام قبول کیا اور ہم نے انہی کی کوششوں سے چترال میں واپس قدم رکھا۔ ہماری امن پسندی کو دیکھتے ہوئے ہمیں شندور کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ خوشیاں لوٹ آئیں۔ ہم دوست بن گئے۔ ہمارے تعلقات بحال ہو گئے۔''

گل نے نم سانس کھینچی۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''میں ہمیشہ سے جانتی تھی کہ حویلی والوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ ظاہر ہے تم اس وقت بچی تھیں۔ تمہیں اٹھارہ سال بعد کتنا ہی یاد رہ سکتا تھا۔ انسان کا حافظہ اتنا اچھا نہیں کہ اٹھارہ سال پہلے کے واقعات یاد کر سکے۔ اس لیے انہوں نے ایک من گھڑت کہانی سنا دی تا کہ تمہیں اس سارے قصے سے دور رکھ سکیں۔'' انہوں نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں گلابی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے اس کے پاس آئیں اور جھولے پر بیٹھ گئیں۔

''تمہیں سچائی بتانے کا مقصد تمہاری دل آزاری کرنا نہیں تھا گل لالہ۔ میں تمہاری آنکھیں کھولنے آئی ہوں۔ یہ سچائی اگر آج میں تمہیں نہ بتاتی تو تم ہمیشہ لاعلم رہتی۔ اسد نے مجھے بتایا تو مجھے سب سے پہلا خوف یہی لگا کہ اب تم اپنے چچا کے حوالے سے بے خبر رہ جاؤ گی اور ہمارے حوالے سے بدظن۔ تم نے احتشام کی رپورٹس پڑھی تھیں۔ ان رپورٹس میں آدھا سچ تھا اور آدھا سچ پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے اس دفعہ میں خود آئی تا کہ تمہیں اپنے پاس بٹھا کر اچھے سے سمجھا سکوں مگر.....'' وہ سانس لینے کو رکیں۔ ''پہلی ملاقات میں تمہارا سرد رویہ دیکھ کر تو میں

بری طرح ڈر گئی۔ پھر تم نے فائرنگ کی تو میری جان نکل گئی۔ میں سمجھ گئی کہ تم واقعی آدھے سچ کی وجہ سے ایسا کر رہی ہو۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا تھا گل۔ میں سوچ رہی تھی تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ کیسے بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر جب تم نے مجھ سے معافی مانگی تو میں بالکل ساکت رہ گئی۔ تمہارے رویے میں ذرا بھی کھٹاس نہیں تھی۔ تم بالکل ٹھیک تھیں۔ تم نے مجھے مزید الجھا دیا۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔"

اسے اس کے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ بابا نے چھلانگ کیوں نہیں لگائی۔ نعیم چچا کہاں تھے۔ یوسف خان سردار کیوں بنا؟ بلتیوں سے تعلقات کیوں خراب ہوئے۔ شندور سے کیوں نکالے گئے۔ سب پتہ چل گیا تھا۔

"میرے پاس کچھ نہیں بچا عالیہ گودائی۔" اس نے رگڑ رگڑ کر گال پونچھے۔ "تم سب نے آپس میں ایک دوسرے کو مارا اور پھر ایک دوسرے کو سزائیں بھی دے دیں۔ جب مجھے احتشام انکل نے آپ لوگوں کے بارے میں بتایا تھا تب بھی میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ آج اپنے چچا کا سن کر بھی میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ مجھے سچائی نہ بھی معلوم ہوتی تو میں کچھ نہیں کر سکتی تھی جیسے ابھی جاننے کے بعد کچھ نہیں کر پاؤں گی۔" وہ بے بسی سے بولی۔

عالیہ مسکرائیں۔

"میں نے تمہیں اتنی لمبی کہانی سنائی ہے گل۔ اس کا مقصد تمہیں صرف آگاہ کرنا نہیں تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا تو گل ٹھٹک گئی۔

"کیا مقصد ہے؟"

"یہ کہ تم اپنے چچا کو سزا دلاؤ۔ رمیز کی موت کے بدلے اس نے تمہارے باپ کو بے گناہ مارا تھا۔ ایک بے گناہ کی موت پر اس کو صرف جلاوطنی کی سزا کیوں ملے؟" انہوں نے اس کی آنکھوں

میں دیکھا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

عالیہ قریب ہوئی۔''اس دفعہ چترال کا سردار غاذان بن رہا ہے گل۔غاذان کون ہے؟ نعیم کا بیٹا۔اپنے بیٹے کی سرداری کے بعد وہ لوٹ کر آئے گا۔اپنا حق لینے کے لیے۔اپنی جائیداد واپس لینے کے لیے۔''

''نہیں۔نہیں۔'' گل نے بے یقینی سے ان کی بات کی تردید کی۔''ایسا نہیں ہوسکتا۔وہ یہاں آئے گا تو یوسف چچا اسے مار ڈالیں گے۔وہ یہاں آ ہی نہیں سکتا.....''

''اور اگر میں کہوں کہ وہ.....آچکا ہے۔تو؟'' عالیہ نے سرد مہری سے کہا۔اس کا سانس رک گیا۔

''ناممکن.....'' وہ یک ٹک ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''وہ کچھ دن پہلے آیا ہے۔رحمان صاحب نے دیکھا ہے۔تم چاہو تو کسی سے بھی پوچھ لو۔''

وہ خوفزدہ سی ہنسنے لگی۔''دستار پوشی کے لیے آیا ہوگا۔چلا جائے گا۔''

''نہیں جائے گا۔'' عالیہ نے خشک لہجے میں باور کرایا۔''وہ اپنا مقام واپس لینے آیا ہے۔وہ مقام جو اس کا تھا۔وہ حصہ جو جائیداد میں اس کے نام تھا۔''

''یوسف چچا ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے۔'' وہ دھونس سے بولی۔

''یوسف خان سردار ہونے کے باوجود اتنے بے بس ہیں گل۔جب سرداری چلی جائے گی تب کتنے بے بس ہو جائیں گے۔انہیں اندازہ نہیں ہے۔وہ باپ کی وصیت پر عمل کرنا تو دور کی بات ہے خود کو بھی رسوائی سے بچا نہیں پائیں گے۔بی جان نے مجھے بتایا کہ تمہاری شادی غاذان سے ہوگی۔وہ تمہارا سسر بن جائے گا۔اس کی اپنی بیوی مر چکی ہے گل۔اس کی خدمت کرنے کے لیے تم بچ جاؤ گی۔کیا تم چاہتی ہو کہ جس شخص نے تمہارے باپ کو مارا ہو،تم اس کی بہو بن کر اس کی خاطر

مداریاں کرو؟ اس کے حکم مانو؟ وہ تمہارے سامنے اس حویلی میں سردار کا باپ ہونے کے ناطے دندناتے ہوئے پھرے گا۔تمہاری ماں جو جانتی ہی نہیں کہ اس کا دیور قاتل ہے۔وہ تو جی حضوریاں کرلے گی مگر تم گل۔زہر کو شناخت کرنے کے بعد کیسے پیو گی؟ اس کی کڑواہٹ کو اپنے حلق سے کیسے اتارو گی؟''

گل نے خشک لبوں کو تر کیا۔

''غاذان اتنا بے مروت نہیں ہے عالیہ گودائی۔اگر وہ سچ جانتا ہے تو مجھے کبھی اس آزمائش میں نہیں ڈالے گا۔''اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔

عالیہ ہنسنے لگی۔

''اس نے نہ بھی ڈالا تو تم یہ برداشت کرلو گی کہ تمہارے باپ کا قاتل زندہ ہے اور بہت خوشی خوشی رہ رہا ہے؟''

گل کی آنکھوں میں حزن در آیا۔

''تمہارے پاس تین خزانے تھے۔ایک بابا جسے نعیم نے چھینا۔دوم رستم جسے یوسف نے چھینا۔تیسری ماں جسے مجاہد نے چھینا۔تمہارے تینوں خزانے چلے گئے ہیں۔رستم کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر اپنا اٹھارہ سال پہلے لوٹا ہوا خزانہ تم بحال کر سکتی ہو۔تم اپنے باپ کا بدلہ لے سکتی ہو۔''

گل کے چہرے پر الجھن ابھری۔

''تم نے کہا ناں کہ غاذان اتنا بے مروت نہیں ہے کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے۔اگر ایسا ہے تو وہ تمہاری اس کے باپ کو سزا دلوانے کی کوشش میں کبھی ناراض نہیں ہوگا۔وہ تمہیں پورا حوصلہ دے گا۔تمہارے ساتھ کھڑا ہوگا۔''

اس نے واپس سر ہاتھوں میں گرالیا۔شریانوں میں بم پھٹ رہے تھے۔

''جرگے نے فیصلہ بلتیوں اور کھوواروں کا کیا تھا۔کلیم اور نعیم کا نہیں۔اس کو سزا سرور خان نے دی تھی جب کہ مدعی تم ہو۔تم پڑھی لکھی ہو۔پر اعتماد ہو۔تمہیں تو ہرگز ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھنا چاہیے۔اپنے مدعی ہونے کا فائدہ اٹھاؤ۔جا کے پولیس میں رپورٹ کرو۔اس سے پہلے کہ نعیم تم پر حاوی ہو جائے تم اسے نیست و نابود کر دو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ بری طرح الجھ گئی تھی۔

''گل شاہ سردار ابھی زندہ ہے۔وہ تمہارے باپ کا چشم دید گواہ ہے۔میں نے سنا ہے کہ وہ غاذان کی سرداری میں نہیں آرہے۔اگر وہ نہیں آئے تو ممکن ہے کہ نعیم اس کو کچھ کر دے۔اس سے پہلے کہ تمہارا یہ گواہ چلا جائے تم رپورٹ کٹوالو۔''

اس نے سر اسیمگی سے گہرے گہرے سانس لینا شروع کر دیا۔عالیہ نے اس کے گرد ہاتھ حمائل کر دیے۔

''ڈرو نہیں گل۔تم ایک بہادر لڑکی ہو۔میں نے تمہیں ابتہاج جیسے درندے سے الجھتے دیکھا ہے۔تم نعیم جیسے آدمی سے کیسے ہار سکتی ہو؟ بلکہ تم تو سینہ تان کر جاؤ اس کے پاس اور اسے بتاؤ کہ تم کچھ نہیں بھولیں۔تمہیں سب یاد ہے۔یہ اٹھارہ سال کا عرصہ نہیں تھا۔اٹھارہ گھنٹے تھے۔اسے نہیں پتہ کہ تم سب جانتی ہو۔یہاں پہ کسی کو نہیں پتہ۔تم چاہو تو کسی کو علم میں لائے بغیر اپنا بدلہ پورا کر سکتی ہو۔''انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

☆.....☆.....☆

اس نے گل کو درخواست نہیں دی تھی۔وہ پہلے ہی ایک اعصاب شکن آزمائش سے گزر رہی تھی۔اپنی درخواست کی عدم قبولی اسے ایک اور دھچکا دے سکتی تھی۔اس سال کا استرداد بلاشبہ اس

کے لیے پہلے ہی بہت بڑا دھچکا تھا۔ اگر وہ اس بار منتخب ہو جاتی تو وہ رستم جیت سکتی تھی۔ اس بار منتخب نہ ہونے کی وجہ سے وہ رستم کو کھو دے گی اور آئندہ کبھی پولو نہیں کھیل پائے گی۔ خوابوں کے جستجو سے بری یادیں جڑی ہوں تو ان کی کامیابیاں ہنساتی نہیں، رلاتی ہیں۔

گل نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ سرِ شام ہی سو گئی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی، پیر میز پر کر اس میں رکھے، اس کی پولو سٹک دیکھ رہی تھی۔ اسٹک سفید رنگ تھی مگر اس کا ہینڈل سرخ تھا۔ سرخ ہینڈل جو عام سٹک سے حجم میں زیادہ تھا، اس پہ گھوڑے کے منہ کا نقش کھدا ہوا تھا۔ سٹک بہت ہموار تھی۔ اس کا ہاتھ پھسل رہا تھا۔

گل کو دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ ابتہاج نے اس پر سنگین الزام لگایا تھا۔ وہ اپنے طریقے سے تو اسے مزہ چکھا دے گی لیکن گل بے موت ماری جائے گی۔ اس کا نقصان بے سبب ہوگا۔ نہیں، اسے ابتہاج کو نہیں جیتنے دینا چاہیے۔ ابتہاج اپنے مذموم ارادوں میں اتنی آسانی سے کیسے کامیاب ہو سکتا تھا؟

دروازے پہ کھٹکا ہوا، کوئی اندر آیا۔ وہ چونکی۔ بریخنہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ یقیناً وہ گل کے لیے کھانا لائی تھیں۔ اس نے فوراً پیر نیچے کیے اور سمٹ کے بیٹھ گئی۔

''یہ گل کے بابا کی پولو سٹک ہے۔'' انہوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اور میز پر ٹرے رکھ دی۔ ''اس نے اپنے بابا کی ہر چیز سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔ ان کی پولو شرٹ سے لے کر ان کی کتابوں تک، ان کے کپڑوں سے لے کر ان کے عدالتی بریف کیس تک، گل کے پاس ان کا سب کچھ ہے۔''

وہ بے ساختہ مسکرائی۔ ''وہ اپنے بابا سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''بہت زیادہ۔'' بریخنہ نے تائید کی پھر گہری سانس لی اور گل کے بیڈ کی طرف بڑھی، اس کے سرہانے رک کر وہ گل کو جگانے کے لیے قدرے جھکیں۔

''گل.....''

''چچی۔'' اس سے پہلے کہ وہ گل کو جگاتیں، عبادہ تیزی سے بولی۔ انہوں نے جھکے جھکے اس کی طرف دیکھا۔ ''سونے دیں اسے۔ اس وقت اسے آرام کی بے حد ضرورت ہے۔''

''لیکن اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بچے۔'' وہ فکر مندی سے بولیں۔

''چچی۔ فی الحال گل کو پیٹ سے زیادہ اعصابی سکون چاہیے۔ وہ کٹھن حالات سے گزر رہی ہے۔ تھوڑا سوئے گی تو خود کو سنبھال پائے گی۔ اعصابی آزمائشوں میں سب سے بڑا سکون ''صحت مند'' نیند ہوتی ہے۔ آپ اسے سونے دیجیے۔'' وہ رسان سے بولی تو بریخنہ نے گل کو دیکھا جو چہرے کے نیچے ہاتھ رکھے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس وقت وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ ''ممتا'' سے مسکرائی اور پیچھے ہوگئی پھر اس کے پیروں کی طرف بڑھیں اور تھوڑی سی جگہ پر ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کے لحاف میں چھپی ٹانگوں کو ہلکا ہلکا دابنا شروع کر دیا۔ ان کے نرم لمس سے گل کسمسائی لیکن جاگی نہیں۔

عبادہ نے سٹک دیوار سے ٹکائی اور قدم قدم چل کر کھڑکی کے ساتھ رکھی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ وہ کرسی بریخنہ کے عین سامنے تھی۔ باہر رات بھیگ رہی تھی۔ موسم کی بدلتی رت نے نئی بوچھاڑ شروع کر دی تھی۔ دوپہر کی نسبت اب موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ عبادہ کے ذہن میں کئی سوال تھے جن کے جواب بریخنہ سے منسلک تھے۔ اس نے گردن موڑ کے بریخنہ کو دیکھا جو کچھ پڑھتے ہوئے گل پر دم کر رہی تھی۔

وہ پہلو بدلتے ہوئے آگے ہوئی۔

''چچی.....'' اس نے آہستہ سے مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' انہوں نے گردن گھمائی۔

''گل نے مجھے اپنے بابا کی موت کا سارا قصہ سنایا ہے مگر اس نے ایک بات نہیں بتائی۔ میں نے پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ چڑ جاتی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ سے پوچھ سکتی ہوں؟'' اس نے ادب سے گزارش کی۔

''پوچھو بچے۔ کیا بات ہے۔'' وہ توجہگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''چچی۔ پوری کہانی میں گل نے کسی چیز پر اتنا افسوس نہیں کیا جتنا اس نے آپ پہ کیا تھا۔ اسے آپ کی دوسری شادی (آواز مدھم ہوگئی) کرنے اور گل کے بابا کے لیے نہ لڑنے کا بے حد افسوس ہے۔ اس لیے وہ آپ سے اس قدر نفرت کرتی ہے۔ میں جب جب آپ کی بات کروں، وہ اٹھ کی چلی جاتی ہے۔ آپ کے بابت اسے ایک لفظ بھی راس نہیں آتا۔'' وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔ ''چچی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے دوسری شادی کیوں کی؟ وہ بھی گل کے بابا کے مرنے کے پانچ ماہ بعد؟''

بریخنہ کے چہرے پر کرب در آیا۔ انہوں نے چہرہ موڑ کر گل کو دیکھا جو پرسکون سو رہی تھی۔

''گل سمجھتی ہے کہ میں نے اس کے باپ سے وفا نہیں کی اور اسے بھی دوسروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔ کاش یہ جانتی ہوتی کہ میں نے کن بے بسیوں میں اس کا خیال رکھا ہے۔ آدھی راتوں کو اٹھ اٹھ کے اس کے پاس آئی ہوں۔ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ اس کا برابر حصہ مانگا ہے مجاہد خان جی سے۔ میں ہر لمحے، ہر پل گل سے محبت کی ہے عبادہ۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی یاد سے غافل نہیں ہوئی ہوں۔ پانچ سال پہلے اسے جاڑے میں گردن توڑ بخار ہوا تھا۔ میں بیس دن تک اس کے سرہانے سے نہیں اٹھی تھی۔ یہ گھڑسواری کرنے کے لیے جب جب اصطبل جاتی ہے۔ پیچھے سب کی گھٹیا باتیں اور تلخ جملے میں سنتی ہوں۔ یہ ابتہاج سے لڑتی ہے تو گالیاں مجھے پڑتی ہیں۔ اسے لوگ مارتے ہیں تو درد مجھے ہوتا ہے۔ میں اپنی بیٹی کے دکھوں سے لاعلم نہیں ہوں

عبادہ۔نہیں ہوں۔"

وہ بے بسی کی انتہا پر رونے لگیں۔عبادہ نے کرسی کھینچ کر ان کے قریب کردی اور ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"جانتی ہوں۔آپ ماں ہیں۔ماں کیسے غافل ہوسکتی ہے۔وہ تو ہزار کلومیٹر دور سے اپنے بچے کا درد سمجھ جاتی ہے۔ماں لاعلم نہیں ہوتی۔"

انہوں نے گہری سانس لی۔

"مجاہد خان جی کلیم خان جی سے چھوٹے ہیں۔جب کلیم خان جی فوت ہوا تو اس وقت میں بہت جوان تھی۔چوبیس سال کی تھی۔میں نے اپنی زندگی اپنی بیٹی کے نام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔میں اپنے ماں باپ کے پاس جارہی تھی لیکن ان دنوں مجھے کچھ عجیب سے احساس ہورہے تھے۔"انہوں نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔تیزی سے گرتے بارش کے قطروں سے بھینی بھینی مٹی کی خوشبو آرہی تھی۔ہوا کے زور سے پردے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

"عدت کے چار ماہ میں نے حویلی میں گزارے تھے۔اس دوران حالات بہت کشیدہ تھے۔ایک دن میں نے بی جان کو بلایا اور ان سے کہا کہ کلیم اللہ خان جی کے گنہگاروں سے بدلہ لیں۔ان کو چھوڑنا نہیں ہے۔بی جان نے کچھ نہیں کہا۔عدت ختم ہوئی تو میں باہر آئی۔مجھے محسوس ہوا جیسے یہ لوگ سب بھول چکے ہیں۔بلتیوں کا آنا جانا بند تھا پھر بھی نعیم اللہ خان جی آتے جاتے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ داجی نے ان کو چترال سے نکال دیا۔بلتیوں کی طرح۔مجھے بالکل اچھا نہیں لگا کہ میرا دیور میرے شوہر کے قاتلوں سے یاری رکھتا ہے۔

میں نے بی جان سے پھر وہی بات کہی۔انہوں نے مجھے چپ رہنے کا کہا اور میرے شوہر کے قتل کو حادثے کا نام دیا۔ہر جگہ اسے حادثہ کہا جارہا تھا۔میرے شوہر قانونی آدمی تھے۔میں دس

جماعتیں پڑھی ہوں عبادہ۔ مجھے اتنا علم تھا کہ میں ایک بار پولیس سٹیشن جاؤں گی تو میری مدد ہو جائے گی۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں پولیس سٹیشن جا کر کلیم اللہ خان جی کے کیس کی درخواست لکھواؤں گی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی، میرے ارادوں کی خبر ان کو ہو گئی۔ انہوں نے پکڑ کے میرا نکاح مجاہد خان جی سے کر دیا۔

دوسرے مرد کی سرپرستی میں جانے کے بعد میرے پیروں اور میرے ہاتھوں کو بیڑیاں لگ گئیں۔ میں اپنے سابقہ شوہر کا نام بھی نہیں لے سکتی تھی۔ شادی کے بعد میں مجاہد خان جی کے حکم کی باندی بن گئی۔ پھر ایک ہی سال میں ثمامہ پیدا ہوئی اور پھر یکے کے بعد دیگرے چار بچے ہوئے۔ میں گل کو وقت ہی نہیں دے سکی۔ میں ماما جتانے جاتی، مجھے سو کام بولے جاتے۔ میں اسے اپنے پاس سلا بھی نہیں پاتی تھی۔ وہ کبھی کس کے ساتھ سوتی کبھی کس کے ساتھ۔ گل کو یہی گلہ ہے عبادہ۔ یہی تڑپ ہے کہ میں نے دوسری شادی کیوں کی؟ میں مقتول کی بیوہ تھی۔ مجھے لڑنا چاہیے تھا۔ گل نہیں جانتی کہ میرے ساتھ اس وقت کیا کیا نہیں ہوا۔ میں کس طرح مجبور کی گئی۔ میں نے اپنے تئیں ہر جائز کوشش کی تھی۔ عدت کی عورت باہر نہیں جا سکتی۔ ان چار ماہ جو آزاد تھے انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ پھر جب میں باہر نکلی تو مجھے بھی کچھ کرنے نہیں دیا گیا۔'' کہتے ہوئے ان کی آواز نم ہو گئی۔

''ہر چیز کے لیے تنہا لڑتی آئی ہے یہ پاگل۔ بڑے سے بڑے مسئلے اپنی سوجھ بوجھ سے حل کیے ہیں۔ ہر جگہ تنہا گئی ہے۔ نہ کسی سے مدد مانگی نہ کسی سے سہارا۔ دکھ بھی خود جھیلے ہیں اور خوشیاں بھی خود منائی ہیں۔ وہ اپنی روح میں اپنے بابا کو محسوس کرتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو کبھی اکیلا نہیں سمجھتی۔ اسے لگتا ہے اس کی پیٹھ پہ کلیم خان جی کے ہاتھ ہیں جو اسے تھپک رہے ہیں۔''

''ان لوگوں نے یہ کیوں کیا، میں آج تک نہیں سمجھ سکی مگر مجھے اتنا علم ضرور ہے کہ گل کچھ نہ کچھ

جانتی ہے مگر وہ مجھے کیوں بتائے گی؟ اسے کبھی مجھ پر بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اپنی غلط فہمیوں میں اس نے میری صورت میں اپنا ایک غمگسار کھویا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں، کلیم خان جی اس کے والد تھے۔ میں ہی اس کا دکھ بانٹ سکتی ہوں۔ میں ہی اس کی تکلیف کم کر سکتی ہوں مگر وہ مجھے اس لائق نہیں سمجھتی۔''

بریخنہ نے آنکھ کی نمی پونچھی۔

تو بریخنہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ نعیم اللہ خان اس کے شوہر کے قاتل ہیں۔ بی جان نے ان سے یہ بات چھپائی تھی اور گل انہیں یہ بات بتانا نہیں چاہتی تھی۔ ان کو دو طرفہ اندھیرے میں رکھنے سے بی جان اور گل کو کیا مل رہا تھا؟ گل تو چلو متنفر تھی، وہ یہ بات تو کیا، کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر بی جان۔ ان کا اپنی بہو پر اس قدر ظلم کرنا جائز تھا؟ ان کے ضمیر نے ان کو جھنجھوڑا نہیں؟

''میں چلتی ہوں۔ نیچے مہمانوں کو کھانا دینا ہے۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم بھی آجاؤ ہمارے ساتھ کھالو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

''میں یہی والا کھالوں گی۔ آپ فکر مت کریں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''ہوں۔'' وہ پلو سے آنکھیں صاف کرتی باہر نکل گئیں۔

عبادہ نے پرسکون سوئی گل کے چہرے پر نظر ڈالی جہاں اس کی نیلی پڑی آنکھ پر اس نے آئنمنٹ لگایا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔

''کیا ہو جائے گا گل۔ اگر تم ماں کے ساتھ تعلقات ٹھیک کر لو۔ بریخنہ چچی بری نہیں ہیں۔ وہ تمہارے لیے بدر جہا تڑپ رکھتی ہیں۔ صبح ان کا تمہاری طرف دیوانہ وار بڑھنا پھر ان کا سینے کے بل خود کو گھسیٹ کے تمہاری طرف آنا۔ اپنے ٹوٹے دانت کی پرواہ کیے بغیر تمہارے لیے سسکنا، مچلنا۔ میرا دل مسوس کے رہ گیا تھا۔ وہ کس قدر تمہاری پرواہ کرتی ہیں گل تمہیں اندازہ بھی نہیں

ہے۔تمہارے غصے کو پی جاتی ہیں۔تمہارے تلخ رویے کو برداشت کر لیتی ہیں۔کیا ان کا دل نہیں دکھتا ہوگا؟ کیا ان کو تکلیف نہیں ہوتی ہوگی؟ جب جب تمہاری زہر خند باتیں سنتی ہوں گی، وہ روتی نہیں ہوں گی؟''

عبادہ نے دکھ سے کہا۔گل کے چہرے پر کسی تاثر کا شائبہ نہیں تھا مگر عبادہ جانتی تھی وہ سن رہی ہے۔وہ سوئی نہیں ہے۔

''گل میری جان۔اولاد کی تلخ باتیں ماں باپ کو گولی کی طرح لگتی ہیں۔سرسراتی، گرم گولی کی طرح جوان کے جسم کو کئی تہوں میں چیر دیتی ہیں پھر تمہارا اور تمہاری ماں کا تو دکھ بھی سانجھا ہے۔تم کیوں ان کا اور اپنا غم نہیں بانٹ لیتی؟ کیوں دونوں کو اذیت دے رہی ہو؟''

کئی لمحوں تک وہ ٹکٹکی باندھ کے اس کو دیکھتی رہی۔باہر سے بجلیوں کے کڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔بارش کی بوندیں تڑتڑاتے ہوئے بالکونی کے فرش پر پڑ رہی تھیں۔عبادہ کو کوئی ردعمل نہیں ملا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

اسے بھوک نہیں لگی تھی مگر جسم کو ضرورت تھی۔ہمارا دماغ ہماری تکلیف نہیں سمجھتا۔وہ دکھ میں آپ کو بھوک بھی دلائے گا، پیاس بھی لگائے گا، نیند بھی دلائے گا اور ہنسی بھی لائے گا۔یہ دماغ انسان کو زیادہ دیر ایک جذبے میں نہیں رہنے دیتا۔

بے دلی سے ٹرے سے رومال ہٹا کر اس نے پلیٹ نکال کر سامنے رکھی، پھر نان سے چھوٹا سا حصہ کاٹ کر الگ کیا۔جونہی اس نے سالن میں نوالہ ڈبویا اور منہ کی طرف بڑھایا، وہ ٹھٹک گئی۔

اس نے گھوڑوں کی رپورٹس کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں سر سے۔ناصر خان تو اب تک پشاور سے واپس بھی آ چکا ہوگا اور اگر وہ آیا تھا تو یقیناً دوائیں بھی لایا ہوگا۔ڈاکٹر صاحب نے کیا کیا ہوگا اس سب کے ساتھ؟ اسے طارق سر نے فون کیوں نہیں کیا۔اسے بتایا کیوں نہیں؟

اس نے جلدی سے نوالہ نیچے رکھا اور بھاگ کے سائیڈ ٹیبل پہ دھرے اپنے فون تک آئی۔اس نے جلدی سے بٹن دبایا، مگر فون نہیں کھلا۔اس نے دوبارہ دبایا، سکرین بجھی رہی۔اس کا فون بند تھا۔اسے یاد آیا اصطبل میں فون اس کی پینٹ کی جیب میں تھا۔جب صحن میں ابتہاج نے اسے دھکا دیا تو وہ اس کا فون بھی نکل گیا تھا۔شاید اسی وجہ سے بند پڑا تھا۔

اس نے درمیان والا بٹن دبائے رکھا یہاں تک کہ سکرین روشن ہوئی اور فون چلنے لگا۔نوٹی فیکیشن بار میں طارق سر، مہابت خان، ناصر خان، احمد اور ڈاکٹر صاحب کی لاتعداد مسڈ کالز تھیں۔یا اللہ۔انہوں نے کتنی مرتبہ کوشش کی ہوگی۔صبح سے جاری اس چپقلش کی وجہ سے اس کے دماغ سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی۔اس نے آناً فاناً سر طارق کا نمبر ملایا اور صوفے پر آ بیٹھی۔

طارق سر کو گھنٹیاں جا رہی تھیں۔کچھ ہی دیر میں انہوں نے فون اٹھا لیا۔

''مس سلیم۔کہاں تھیں آپ؟ آپ کا فون کیوں بند تھا؟ جانتی ہیں میں نے کتنی دفعہ کال کی آپ کو؟ آپ اتنی غیر ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہیں؟'' چھوٹتے ہی انہوں نے برہمی سے کہا۔عبادہ کو شرمندگی نے گھیر لیا۔

''آئی ایم سوری سر۔میرا فون ڈیڈ تھا۔''

''فون کو زندہ رکھیں۔آپ جانتی ہیں مجھے آپ سے کتنی ضروری بات کرنی تھی؟''

''سر آئی ایم ریلی سوری۔'' اب کیا بتاتی کہ اس پر کیا گزری۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔اب میری بات دھیان سے سنیں۔آپ نے گھوڑوں کے جو سیمپل بھجوائے تھے ان میں پانی، چارے کے تمام اجزاء میں کچھ نہیں نکلا۔وہ سب صاف ہیں۔البتہ خون کی رپورٹس نارمل نہیں ہیں۔'' وہ قدرے تشویش سے بولے۔عبادہ نے دم سادھ لیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں رپورٹس سر؟''

''مس سلیم آپ ٹھیک کہتی تھیں۔گھوڑوں کو سیلیبرل اٹیز یہ نہیں ہوا بلکہ یہ لوگ باقاعدگی سے.....''انہوں نے توقف کیا۔''گھوڑوں کو Immunity Destructive Serum دے رہے ہیں۔''

''امیونٹی ڈسٹرکٹیو سیرم؟''وہ بری طرح چونکی۔

''جی ہاں۔ان کے بلڈ میں وافر مقدار میں یہ سیرم ملا ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ کسی نے گھوڑوں کے Energy Centre یعنی Cell Mitochondria کو ٹارگٹ کیا ہے تا کہ گھوڑوں کے اندر ایمونٹی نہ بن سکے۔وہ جو کھائیں پئیں،اس کا رتی برابر اثر نہ ہو۔اس کی افادیت کے لیے گھوڑوں کے معدے میں ایک خاص چیز ڈالی گئی ہے جس سے ان کا تمام کھانا''گوبر''بن کر نکل رہا ہے مگر ان کو ذرا انرجی نہیں دے رہا۔اسی سیرم کی وجہ سے گھوڑوں کی حالت''بے جان'' مریضوں کی طرح ہوگئی ہے۔Its all That serum Ubadah,It has been a Target While.''

''سر یہ کیسے ممکن ہوگیا۔یہ سیرم انتہائی ڈیپ فارمولہ ہے۔پاکستان میں اس کی کوئی کھیپ موجود نہیں ہے۔ابتہاج جیسے آدمی نے اس کا بندوبست کیسے کرلیا؟''وہ بے حد تعجب سے بولی تھی۔

''کیا آپ کو ان خانوں کی طاقت پر شک ہے مس سلیم؟''

''نہیں سر، مجھے اس کے علم پر شک ہو رہا ہے۔He is not that educated.''وہ متحیر تھی۔

''ویل مس سلیم۔جو خود پڑھے لکھے نہیں ہوتے تو پڑھے لکھوں سے پوچھ لیتے ہیں۔اس نے بھی کسی مدد لے لی ہوگی۔مگر خیر۔یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔جب اسے گرفتار کریں گے تو وہ خود ہی اگل دے گا۔آپ اب میری ایک بات سنیں۔''

''جی سر۔''

''میں نے مبشر سے کہہ کر تمہارے اس لڑکے کو اس بیماری کا علاج دے کر بھیج دیا ہے۔ Its not a big Deal۔ صرف امیونٹی کا مسئلہ ہے۔ آپ وقت وقت سے وہ ساری ادویات گھوڑوں کو دیں، وہ کچھ دِنوں میں ہی ریکور ہو جائیں گے۔''

''اور وہ جو انہیں ابھی تک چپکے چپکے یہ سیرم دے رہا ہے۔ اس کا کیا سدِ باب کیا ہے سر؟'' (یعنی کون؟ منیب خان۔ ہونہہ)

''میں نے اینٹی ڈاٹ دے دیا ہے عبادہ۔ ابھی وہ سیرم گھوڑوں پر کچھ اثر نہیں کر سکے گا۔'' وہ پورے اعتماد سے بولے۔

عبادہ پر سکون کی بارش ہوگئی۔

''شکریہ سر۔ آپ نے میری سا کلفت دور کر دی۔ میں گھوڑوں کو لے کر بے حد پریشان تھی۔'' وہ ممونیت سے کہنے لگی۔

''اٹس اوکے۔'' وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولے۔ ''اللہ حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' اس نے فون نیچے کر دیا۔ اگلا فون اس نے ڈاکٹر مہمت کو ملایا تھا۔ وہ مردان خانے میں کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے دروازے میں صرف ایک ملازم کھڑا تھا۔ باقی کمرہ خالی تھا۔

''السلام علیکم سر۔ آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو کال بیک نہیں کی۔ میرا فون ڈیڈ.....'' وہ جلدی جلدی وضاحت دینے لگی۔

''اٹس اوکے میم۔'' وہ تیزی سے بولے۔ ''ڈونٹ وری۔ میں نے سب کر لیا تھا۔ وہ لڑکا دوائیں لے آیا تھا۔ آپ کو پتہ چلا کہ گھوڑوں کو.....''

''جی سر۔ابھی میرے باس نے مجھے بتایا،لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔گھوڑوں کو زیادہ کچھ نہیں ہوا۔صرف ان کی طاقت نچوڑی گئی ہے۔انہوں نے جو دوائیاں بھیجی ہیں۔ان سے علاج ہوجائے گا۔'' وہ پوری تسلی سے مسکرائی۔

''جی میم۔میں نے رپورٹس دیکھ لی تھیں۔دوائیاں بہت زبردست آئی ہیں۔میں نے پہلی ڈوز دے دی ہے۔''

''اچھا۔'' اسے تعجب ہوا۔''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''

''یقیناً.....مگر.....'' وہ لمحے بھر کو رکے۔

''مگر؟''

''جب میں دوائیں دے رہا تھا تب ایک آدمی آیا تھا۔وہ مجھ سے بہت سوال کر رہا تھا۔''

''آدمی؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔''کک.....کیسا آدمی سر؟''

''پتلا سا لمبا سا لڑکا ہے۔پتلی مونچھیں ہیں۔گاڑی چلاتا ہے۔مجھے ائیر پورٹ لینے بھی آیا تھا۔''

منیب خان۔اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔وہ تیزی سے آگے ہوئی۔''سر۔آپ نے اسے کچھ بتایا تو نہیں؟'' وہ گھبرا گئی۔

''نہیں میم۔میں کیوں بتاؤں گا۔ویسے بھی وہ اس قدر تفتیشی سوال کر رہا تھا کہ مجھے خود ہی شک ہوگیا۔اس لیے میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔''

عبادہ نے سکون کا سانس لیا۔

''اچھا کیا ہے سر۔وہ منیب خان ہے۔وہی وہ آدمی ہے جو ابتہاج خان سے ملا ہوا ہے۔آپ پلیز،چوکنا رہیے گا۔اگر وہ وہاں آیا تھا تو اس کا مطلب وہ آپ پہ نظر رکھ رہا ہے۔اس نے اگر گھوڑوں میں ذرا سی تبدیلی دیکھی تو وہ آپ کو بھی یہاں سے روانہ کردے گا۔میں قطعی یہ رسک نہیں

لے سکتی۔اس لیے پلیز پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔'' وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔

''فکر مت کریں میم۔میں کسی کو کچھ نہیں پتہ چلنے دوں گا۔'' وہ پرعزم انداز میں بولے۔

''شکریہ سر۔بے حد شکریہ۔'' وہ ممنوع ہوئی۔

''اٹس اوکے میم۔ہم دونوں ویٹ ہیں۔ہم دونوں ہی جانوروں کا دکھ سمجھ سکتے ہیں۔ہم جو کر رہے ہیں،اپنے پیشے سے مخلص ہو کر کر رہے ہیں۔اس میں کسی کا شکریہ یا سوری کہنے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ قدرے دوستانہ انداز میں بولے تو عبادہ مسکرادی۔

''یقیناً.....اللہ حافظ۔'' اس نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

تو ابتہاج نے گھوڑوں کو جبراً کمزور کیا تھا۔یہ سیرم جس کا پاکستان میں ملنا ناممکن ہے اس نے اپنے اثر ورسوخ سے اسے بھی منگوالیا تھا۔عبادہ کے دماغ مین سیٹیاں بج رہی تھیں۔وہ کس قدر شاطر انسان تھا۔اس نے اور منیب خان دونوں نے مل کر یہ ساری چال چلی تھی۔ابتہاج خواہ خود کو کتنا ہی چالاک یا شاطر سمجھ لے۔عبادہ سلیم اب اسے ہر میدان میں ہرائے گی۔چاہے وہ گھوڑوں کی بحالی ہو یا رستم کا حصول۔وہ اسے ہر طرف سے ہرائے گی۔ابتہاج سمجھتا تھا کہ اس نے آخری بازی کھیل لی ہے مگر عبادہ کا داؤ ابھی باقی تھا۔شطرنج کی اس بساط پر اب ایک طرف ابتہاج تھا تو دوسری طرف عبادہ۔

☆.....☆.....☆

صبح اچھی اتری تھی۔رات کی پرزور بارش کی وجہ سے ہر طرف جل تھل ایک ہو گیا تھا۔

حویلی میں کل کی نسبت اس وقت چہل پہل تھی۔جن خواتین کو شندور جانا تھا،وہ اپنے تین دن کے سامان اور لوازمات باندھ رہی تھی۔کل شندور میلے کا پہلا دن تھا۔یہ کوئی ایسا تہوار نہیں تھا جس کے لیے باقاعدہ کوئی خریداری کی جاتی تھی۔البتہ کچھ قبائل جو وہاں مقامی وقبائل رقص اور فن پیش

کرتے تھے۔وہ ہر سال اپنے ملبوسات بنواتے تھے جیسے کالاشی کا روایتی رقص کرنے والی لڑکیاں اور گلگت کا روایتی رقص کرنے والے لڑکے ہر سال خصوصاً ایک جیسے جوڑے بنواتے۔اس کے علاوہ خٹک ڈانس، گھڑ ڈانس، پیراشوٹر وغیرہ۔ان کے لباس مخصوص ہوتے۔

مقامی آبادی اور شائقین کے لیے یہ میلہ لطف کا ایک ذریعہ تھا جہاں وہ اپنے موڈ تازہ کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ان میلوں میں سب سے دلچسپ مرحلہ وہ ایک گھنٹہ کا میچ ہوتا تھا جو گلگت اور چترال کے درمیان کھیلا جاتا۔پہلے دو دن ذیلی قبیلوں جیسے لسپر اور خضر کے میچ ہوتے اور آخری دن چترال اور گلگت کا فائنل میچ ہوتا تھا۔

چوں کہ شندور گلگت اور خیبر پختون خوا کی بارڈر لائن پر واقع ہے اس لیے ہر سال شندور میلے کا افتتاح کرنے کے لیے دونوں صوبوں کے وزیر اعلیٰ تشریف لاتے تھے۔کل چترال کے وزیر اعلیٰ نے شندور کا افتتاح کرنا تھا۔پرسوں گلگت کے وزیر اعلیٰ نے آنا تھا اور پھر کچھ مہمان خصوصی تھے جن کا تعلق پاکستان پولو ٹیم سے تھا۔انہوں نے رستم کو بطور انعام جیتنے والے کھلاڑی کو پیش کرنا تھا۔دونوں وزیر اعلیٰ اس ثقافتی ورثے کے افتتاح اور گرم جوشی کے لیے ہر سال باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔شندور میلے کے انعامات ضلعی سطح سے ہرگز نہیں آتے تھے۔یہ مقامی لوگوں کے مختص کردہ انعام ہوتے تھے۔جیسے یوسف خان نے چھ گھوڑوں کا اعلان کیا تھا۔اسی طرح دوسرے سردار اپنی بساط سے جو چاہتے وقف کر دیتے تھے۔

ان انعامات کا مقصد کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا اور شندور کے تقدس اور جاودانی کے لیے ان کی کارکردگی کو سراہنا تھا۔

اس سال بھی شندور میں مقامی شائقین اور سیاحوں کا رش بے حد بڑھ گیا تھا۔خوانچہ فروش، کھیل جھولے وال، فنکار سب پہنچ گئے تھے۔کھانے اور خریداری کی مصنوعات بیچنے والے

لوگ میدان سے ہٹ کر ایک الگ دنیا بساتے تھے۔ بابوسر ٹاپ پورا کئی حصوں میں بٹ جاتا جن میں شندور کا میدان، کیمپ، کھانے اور خریداری کا عرشہ، پارکنگ ہوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے خانہ بدوشوں کا ایک ٹولہ آیا ہو۔ جگہ جگہ ایک نئی دنیا آباد نظر آتی تھی۔

شائقین کی تفریح کے لیے سلطان مراد خیالی اور نوید خان کے میوزیکل کنسرٹ بھی منعقد کیے گئے تھے۔ تحفظ کے لیے بھاری سکیورٹی تعینات کی جاتی تھی۔ میڈیا اور یوٹیوبرز یہاں کے ہر لمحے کو کیمرے میں قید کرتے تھے۔

کھوار قبیلہ اور بلتی قبیلہ چوں کہ معززان قبائل میں آتے تھے۔ اس لیے شندور میں ان کی خاطر مدارات اور مہمان نوازی کے لیے ایک الگ عرشہ قائم کیا گیا تھا جس کے چاروں طرف باڑ تھی اور باوردی گارڈ تعینات کیے گئے تھے۔ ظاہر ہے دونوں خاندانوں کی سکیورٹی لازمی تھی۔ ان کے لیے الگ جیپوں اور فور بائی فور ہائی ایس گاڑیوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس عرشے میں حویلی کے ملازم اور ملازمائیں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر تعینات تھے۔ چوں کہ شندور سطح سمندر سے اونچائی پر واقع ہے، اس لیے وہاں ٹھنڈ بے حد بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں مہمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے، کھووار قبیلے نے اپنے تئیں خیموں، تنبوؤں، قناتوں کا بندوست کر رکھا تھا۔ ضرورت کی چیدہ چیدہ چیزیں وہاں پہنچادی تھیں۔

عبادہ کو حویلی میں وہی چہل پہل نظر آئی جو بلتیوں کی آمد پہ ملی تھی۔ کھووار کی طرف سے موٹی چچی، بریخنہ، بی جان اور کچھ دوسرے بزرگ خواتین جا رہی تھیں۔ جوان لڑکیوں میں سے کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ جبکہ مردوں میں تمام کے تمام جا رہے تھے۔ بلتی جن خواتین کو لے کے آئے تھے وہی جا رہی تھیں۔ کل شندور کا پہلا پولو میچ قریباً گیارہ بجے تھا۔ ان کی روانگی آج بارہ بجے متوقع تھی۔ میلے کی شام کو بھی مقامی گلوکاروں کا ایک بڑا کنسرٹ ہوتا تھا جس میں لاتعداد لوگ شرکت کرتے

تھے۔حویلی کے تمام لوگ،اسی لیے آج جا رہے تھے۔شندور کو شاید معلوم نہیں تھا،کھووار حویلی سے ایک قافلہ وہاں آنے والا ہے۔

وہ صحن میں تخت پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔اس کا اوور آل اور سٹیتھوسکوپ تخت پہ ایک طرف رکھا ہوا تھا۔آج وہ سفید جینز اور گلابی شرٹ میں ملبوس تھی۔یہ کپڑے اسے روز بروز تنگ ہو رہے تھے۔یہاں کا پانی شاید کپڑوں کو شرنک کر دیتا تھا۔بال آج کھلے تھے اور کانوں میں پہنی چھوٹی چھوٹی بالیاں چمک رہی تھیں۔وہ نک سک سے تیار ہوئی تھی۔

اس کے سامنے پلوشہ روشانے آپا کا بیٹا اٹھائے،اسے بہلا رہی تھی۔بچہ بری طرح رو رہا تھا۔دوسرے تخت پہ بیٹھیں بی جان اور عالیہ بیگم آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔موٹی چچی حویلی کی خواتین کے سروں پہ کھڑی انہیں بھاشن دے رہی تھیں۔عجیب سی گہما گہمی تھی اوپر سے روشانے آپا کا بیٹا..... اسی لمحے اسے راہداری میں ابراہیم نظر آیا جو الجھے بکھرے کپڑوں میں ملبوس تھا،رو رہا تھا۔بریخنہ چچی،اسے تسلی دے رہی تھیں۔

عبادہ نے پیالی تخت پہ رکھی اور ان کے پاس آئی۔

''کیا ہوا چچی۔کیوں رو رہا ہے ابراہیم؟''اس نے قریب آتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔

''بہن کے لیے رو رہا ہے۔''بریخنہ نے بتایا۔

''کیا ہوا اس کے بہن کو؟''

''میرا بیٹا ہے یہ عبادہ۔''بریخنہ چچی کے انکشاف پہ اس کا منہ کھل گیا۔

''یہ..... یہ..... آپ کا بیٹا ہے؟''

''ہاں۔''انہوں نے ابراہیم کے بال سہلائے جو قد میں ماں سے ایک انچ اونچا تھا۔''اپنی بہن کے لیے پریشان ہے۔اس کا رستم جا رہا ہے ناں۔''

تو گل ہر وقت اپنے سوتیلے بھائی کے ساتھ نظر آتی تھی جو اس کے لیے ہر وقت سٹینڈ لیتا تھا۔ اس کی طرفداری کرتا تھا۔ اس کی ہر بات مانتا تھا۔ عبادہ سمجھتی تھی کہ وہ شاید گل کے کسی بڑے کزن کا بیٹا ہوگا جیسے ماحد اور باقی بچے تھے۔ تو وہ اس کا اپنا بھائی تھا۔ اپنا سوتیلا بھائی؟

اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں نرم سا تاثر بھرتی ہوئی ابراہیم کے پاس آئی جو اپنی سرخ متورم آنکھیں چرا رہا تھا۔ اس نے ابراہیم کے گال پہ ہاتھ رکھا۔ ابراہیم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھا۔

''اپنی بہن پر بھروسہ رکھو۔ اس کا رستم کہیں نہیں جائے گا۔ تمہاری بہادر بہن اسے واپس کھینچ کے لے آئے گی۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ ابراہیم بلا کا سنجیدہ تھا۔ اس نے نم سی سانس کھینچ کے چہرہ گھما لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ بریحنہ نے دکھ سے اسے جاتے دیکھا۔

''اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ میں نے اسے زبردستی کھلانے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں کھا رہا۔''

''گل سے کہہ دیں، وہ کھلائے گی تو کھا لے گا۔''

''اس نے خود زہر مار صرف چائے نگلی ہے۔ کھایا تو اس نے بھی کچھ نہیں ہے۔''

عبادہ نے گہری سانس لی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا چچی۔ بس تھوڑا صبر کریں۔ آپ کے بچوں کو خوشیاں مل جائیں گی۔ اللہ ان کا مقدر ضرور روشن کرے گا۔''

''ان شاء اللہ۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

اسی لمحے روشانے آپا سر پہ کالا شی آنچل کو پن لگاتیں صحن میں آئیں، پلوشہ ان کا بیٹا لے کر (جان چھڑانے والے انداز میں) تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔

''ہولولو۔ میرا بچہ۔ کیوں رلا رہی ہو میرے بچے کو پلوشے۔'' انہوں نے پچکارا۔

''میں تھوڑی رلا رہا ہے۔ یہ تو پیدا ہی روندو ہوا تھا۔'' اس نے منہ بنا کے کہا۔

''بس بس..... بچے سنبھالنے نہیں آتے تمہیں۔ بی جان اس کی ذرا مشق وشق کرائیں۔ کیا کرے گی یہ مستقبل میں۔'' انہوں نے اپنا بچہ اس سے لے لیا۔ ماں کی گود میں آتے ہی وہ یکدم چپ ہوگیا۔

''روشانے آپا، بچہ اپنا ماں کے ساتھ ہی چپ ہوسکتا ہے۔'' پلوشے نے ٹونٹ کیا۔

''ہاں اس کہاوت کے پیچھے پڑ کہ کسی بچہ کو ہاتھ مت لگانا تم لوگ۔ ماں کے ساتھ چپ ہوتا ہے۔ ہونہہ۔'' وہ نروٹھے پن سے کہتیں تخت پہ چوکڑی مار کے بیٹھ گئیں اور بچے کو بہلانے لگیں۔ پلوشہ منہ بنا کر وہاں سے چلی گئی۔

عبادہ اپنا اوورآل لینے واپس صحن میں آئی تھی۔ ابھی وہ اوورآل پہ جھکی تھی کہ بی جان نے ڈھیلے شانوں اور بجھے چہرے سے قدم قدم چلتی بریخنہ کو دیکھ لیا۔ وہ عام سے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔

''بریخنے۔ تم تیار نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر میں نکلنا ہے ہم کو۔'' انہوں نے ہلکا سا پچکارا۔

''میں نہیں جاسکتی بی جان۔'' وہ دکھ سے کہتیں عبادہ والے تخت پر بیٹھ گئیں۔ ''گل کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

بی جان کے اعصاب مدھم پڑ گئے۔

''اس نے کچھ کھایا ہے؟'' عالیہ بیگم نے پوچھا۔

''صرف چائے پی ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

عبادہ نے اپنا اوورآل اور سٹیتھوسکوپ اٹھائے اور اٹھ کے باہر آگئی۔ اب وہ لان والے راستے سے مردان خانے جارہی تھی۔

مردان خان کے لان میں بلتی اور چترالی سب ہی قبیلوں کے سرداران اور کھووار قبیلے کے مرد موجود تھے۔ آج اس قافلے نے اکٹھے ہی شندور کے لیے نکلنا تھا۔ مردان خانے میں بھی ناشتے کا

اہتمام ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرف کئی گارڈز ہوں گے جو اسے روک لیں گے اور ہو سکتا ہے وہ اسے نہ جانے دیں لیکن وہ بھی سارے ہتھیار تراش کے آئی تھی۔ آج وہ ڈنکے کی چوٹ پہ یوسف خان سے ملنے والی تھی۔

مردان خانے کے داخلی عرشے پر پہنچ کے اسے گارڈز نے روک لیا۔ وہ شلوار قمیص پہنے، رائفل ہاتھوں میں پکڑے توانا اور اونچے مرد تھے۔ ان کی دیو قامتی ہی کسی بھی انسان کو ڈرانے کے لیے کافی تھی۔ عبادہ بڑی تسلی سے ان کے سامنے آئی۔

''اندر کسی کی طبیعت خراب ہے، وہی دیکھنا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔'' اس نے سرد مہری سے ایک ہی جملہ میں انہیں منا لیا۔ وہ خود بخود راستہ دیتے ہوئے ہٹ گئے۔ اس نے چند قدم آگے لیے پھر اچانک پلٹ کے انہیں دیکھا۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ آئے بڑے.....سانڈ!

وہ ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ اٹھائے، اوور آل پہنے ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر لگ رہی تھی۔ انداز بالکل پیشہ ور طبیب جیسا تھا۔ وہ طبیب جو ہسپتالوں میں گشت پر آتے ہیں۔ مردان خانے کی عمارت ختم ہونے کے بعد اگلا حصہ لان کا تھا۔ عمارت کے آس پاس، دائیں بائیں، اندر باہر کچھ کچھ مرد نظر آ رہے تھے جو اسے شاکی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تیز تیز چلتی لان کے بیرونی حصے میں نمودار ہوئی۔

چترال کے پہاڑوں پہ خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ دھند کے بادل نیچے اترے ہوئے تھے۔ گھاس نم تھی اور سوندھی سوندھی سی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لان میں ایک بڑے چکور کی صورت میں چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر خانے میں چار چارپائیاں تھیں۔ اس پہ مہمان مرد براجمان تھے۔ حویلی کے ملازم ٹرے میں ناشتے کے لوازمات بھر کے مہمانوں کو پیش کر رہے تھے۔ یوسف خان کی

پشت تھی عبادہ کی طرف۔وہ چارپائی پر براجمان قہقہہ لگا رہے تھے۔سر پہ دستار پڑی ہوئی تھی، مصنوعی ہاتھ گود میں تھا، دوسرے ہاتھ سے وہ لسی کا گلاس تھامے ہوئے تھے۔

نیچے کھائی سے نکلنے والے اونچے اونچے صنوبر اور چیڑ کے درختوں سے عجیب سا دھواں نکل رہا تھا جیسے کسی نے وہاں نم پتے جلائے ہوں۔وہ مسکرا کے چلتی جب اس طرف آنے لگی تو کئی مردوں کی نظر اس پہ پڑی۔وہ جگہ جہاں عورتوں کا آنا ممنوع تھا، وہ پورے اعتماد سے چل کے آرہی تھی۔یہ ہمارے گھر کی خاتون تو نہیں ہوسکتی۔کئی مردوں نے سوچا تھا۔

وہ قدم قدم چلتی عین یوسف خان کے سامنے کھڑی ہوئی۔وہ جو مسکرا رہے تھے، اسے دیکھ کے مسکراہٹ جن کی طرح غائب ہوئی۔وہ چونکے پھر گھبراہٹ سے یہاں وہاں دیکھا۔سب ہی مرد عبادہ کو دیکھ رہے تھے اور یہی تو وہ چاہتی تھی کہ وہ دیکھیں۔جب وہ دیکھیں گے تو یوسف خان کچھ نہیں دیکھ سکے گا۔

''السلام علیکم خان۔صبح بخیر۔کیسے ہیں آپ۔پہچانا مجھے۔میں عبادہ سلیم۔جانوروں کی ڈاکٹر ہوں جسے آپ نے لاہور سے بلایا اپنے.....'' وہ تیزی سے کہتے کہتے رکی۔یوسف خان کے چہرے کا رنگ اڑا۔''اپنے کچھ.....جانوروں کے علاج کے لیے.....''

ان کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔

''میں معذرت چاہتی ہوں میں ایسے ہی چلی آئی۔آپ کو بتا کے آنا چاہیے تھا۔'' وہ واجبی تلافی سے کہنے لگی پھر یکدم تکلف سے مسکرائی۔''لیکن آپ تو مصروف ہوتے ہیں ملاقات کا وقت نہیں نکال سکتے۔اس لیے میں خود آگئی۔کچھ دیر میں آپ شندور کے لیے روانہ ہوجائیں گے تو ملاقات نہیں ہوسکے گی۔اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ آپ سے مل لوں۔''

یوسف خان نے گلاس ملازم کو پکڑایا اور سیدھے ہوگئے۔سبھی مردوں کی توجہ اس طرف

تھی۔ یوسف خان کوئی سخت بات نہیں کہہ سکتے تھے۔

''مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ کیا ہم اندر چل کے بات کریں۔ ادھر ہماری باتوں سے یہ لوگ ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔'' آخری فقرہ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ یوسف خان کے پاس دوسرا کوئی انتخاب نہیں تھا۔ وہ دانت کچلتے ہوئے اٹھے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے راستہ دیا۔ وہ مشکور انداز میں آگے بڑھ گئی۔

''میں آتا ہوں۔ آپ سب ناشتہ کیجیے۔'' وہ جھینپ کے کہتے، خجالت سے آگے بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

عبادہ ایک پرتعش کمرے میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ صوفے کے ہتھے پر بیٹھی، سیٹی بجاتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ دروازے میں کھنکار ہوئی تو وہ چونکی پھر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ پورے اشتعال میں لگ رہے تھے۔ ماتھے پر بل تھے اور آنکھوں میں شدید برہمی۔

''مجھے لگا آپ جا چکی ہوں گی۔'' وہ خشک لہجے میں کہتے اس کے سامنے آئے۔ دونوں پر کھڑکی کا عکس گر رہا تھا۔ وہ وہاں اکیلے تھے۔ باہر دروازے سے لان نظر آ رہا تھا جہاں ہجوم میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ مرد اٹھ اٹھ کر ناشتے کے لیے آ رہے تھے۔

''آپ کی خاطر رکی ہوئی ہوں خان۔ آخر آپ کے تواضع اور خلوص میں اثر ہی اتنا ہے کہ چترال سے جانے کا دل نہیں کرتا۔ اتنی شاندار حویلی اور اس کے وی آئی پی انتظامات۔ میں تو فدا ہو گئی ہوں۔ سوچ رہی ہوں ہر سال ایک دو مہینے گزارنے کے لیے یہاں آ جایا کروں۔ کیا کہتے ہیں؟'' وہ دوستانہ انداز میں پوچھنے لگی۔

''بات کیا کرنی تھی آپ کو؟'' وہ سرد مہری سے بولے۔

''کافی جلدی ہے آپ کو بات سننے کی.....'' وہ مسخرے انداز سے بولی۔ انداز میں شرارت تھی۔

''مس سلیم! میرے پاس وقت نہیں ہے۔آپ کو جو کہنا ہے جلدی کہیں۔'' انہوں نے مصنوعی ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے مصروفیت سے کہا۔(وقت؟ ہمم۔ابھی بتاتی ہوں۔)

''بے فکر رہیں سر۔میں بالکل آپ کا وقت نہیں لوں گی۔'' عبادہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے قدم قدم ٹہلنے لگی، پینڈولم کی طرح دائیں سے بائیں پھر بائیں سے دائیں۔وہ کافی دیر تک ٹہلتے ہوئے ان کے صبر کا امتحان لیتی رہی۔جب دس منٹ تک وہ کچھ نہ بولی تو یوسف خان نے گہری ہنکار کے ساتھ سانس نکالی۔

آواز پہ وہ چونکی۔سر اٹھا کے دیکھا۔یوسف خان سانس روکے ضبط سے کھڑے تھے۔

''آپ بیٹھ جائیں۔'' اس نے پیشکش کی۔وہ بدستور کھڑا رہا۔عبادہ نے ان کی ضد پہ شانے اچکا دیے۔لان سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔مدھم سی۔کمرہ البتہ پرسکون تھا۔وہ اگلے پانچ منٹ تک مزید ٹہلتی رہی یہاں تک کہ یوسف خان بادلِ نخواستہ صوفے پر بیٹھ گئے۔عبادہ نے پلٹ کے دیکھا، وہ اپنے تندرست ہاتھ کی انگلیاں بے چینی سے مروڑ رہے تھے۔

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔(وقت نہیں۔ہونہہ۔)

''آپ کے شندور میلے کو کے پی کے کلچرل اینڈ ٹورزم اتھارٹی آرگنائز کرتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''گلگت بلتستان کی بھی کرتا ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولے۔

''اس میں پولو کے پلیئرز کا انتخاب مقامی جیوری (جرگہ) کرتا ہے؟ رائٹ؟'' وہ کچھ ترتیب دے رہی تھی۔

''رائٹ۔''

''مقامی جرگے کے سربراہ آپ ہیں کیوں کہ آپ سردار ہیں۔آپ ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کونسا

کھلاڑی اس سال چترال کی ٹیم کا حصہ ہوگا اور کونسا نہیں اور باقی جیوری آپ کے فیصلے کا احترام کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اٹھارہ سال سے پولو نہ کھیلنے والے کھووار قبیلہ اس دفعہ کھیل رہا ہے۔'' وہ پلٹ کے انہیں دیکھنے لگی۔ ''ابتہاج کو بھی جگہ آپ نے دلوائی ہے ناں؟''

یوسف خان فخر سے مسکرایا۔ ''آپ میرے اختیارات ناپ رہی ہیں؟''

''شاید۔'' اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

''مت ناپیے۔ میری طاقت آپ کی سوچ سے زیادہ ہے۔''

''اچھا..... واقعی؟'' وہ ان کے سامنے بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ ''کتنی ہے؟''

''اتنی کہ یہاں بیٹھے بیٹھے میں آپ کو چلتا کر سکتا ہوں۔'' وہ آگے ہوئے اور زہر خند لہجے میں بولے۔ عبادہ بھی آگے ہوئی اور ہلکا سا ان کی طرف جھکی۔

''وہ تو میں بھی کر سکتی ہوں یوسف خان..... میرے پاس آپ کے راز ہیں۔''

ان کا رنگ فق سے اڑ گیا۔

''یہ لوگ جو باہر بیٹھے ہیں لاعلم ہیں کہ چترال کے جنوبی گھنے جنگلوں میں دو گھوڑے مدفون ہیں اور چار گھوڑے آپ کے اصطبل کے ایک مخصوص کمرے میں درد سے ہنہنا رہے ہیں۔ یہ بیچارے لوگ جو اتنا سفر کر کے اپنے ساتھ بیس تیس گھوڑے لائے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے ان گھوڑوں کو خطرناک بیماری ہے جو پھیل سکتی ہے تو آپ کی دو طرح سے بدنامی ہوگی۔'' اس نے انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔

''پہلی شندور کینسل ہو جائے گا، الزام آپ کے سر ہوگا۔ (ایک انگلی نیچے کی) دوسرا آپ پر الزام لگے گا کہ آپ بیمار گھوڑے شندور کے لیے دے رہے تھے۔ اس کم ظرفی اور کنجوسی پر پورا جی بی اور چترال تھوتھو کرے گا۔''

یوسف خان کی کنپٹیاں سنسنائیں۔آنکھوں میں سرخ ڈوریاں ابھریں۔

''میں بڑے وثوق سے بتاؤں گی سب کو کہ کس طرح آپ کے خاندان نے خود ان گھوڑوں کو زہر دیا ہے۔ان کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اب پردہ پوشی کے لیے ایک یتیم سے اس کا گھوڑا چھین کے نیلام کر رہے ہیں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ برہم ہو گئے۔

''آپ جتنا بھی جھوٹ کہہ لیں۔میں تصدیق کرنے کے لیے موجود ہوں خان۔میں ڈاکٹر ہوں۔یہ لوگ میری بات پر نہ صرف یقین کریں گے بلکہ میں وہ تمام ثبوت بھی دکھاؤں گی جو میرے اس فون میں ہیں۔وہ ساری تصویریں،وہ ویڈیوز،وہ ڈاکومنٹس۔سب کچھ۔''

یوسف خان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ایک جا رہا تھا۔

''آپ کو بدنامی سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ناک کٹنا،عزت کا جانا،سر کا جھکنا،باتوں کا سننا۔یہ خوف آپ کے دستار کو بھاری کر دیتے ہیں۔آپ کی جاگیر رسوا نہ ہو اس کے لیے آپ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں یہاں تک کہ.....'' وہ سانس لینے کو رکی۔''کسی یتیم سے اس کا مال بھی چھین سکتے ہیں۔''

''آپ کے یہاں جو کچھ ہوا ہے۔میرے ائیر پورٹ میں قدم رکھنے سے اس وقت آپ سے ملاقات کرنے تک۔میں نے ایک ایک چیز اپنے بھائی اور اپنے ہسپتال کے عملے کو بتائی ہے۔میرا باس سر طارق۔وہ اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں آنے والے ہیں۔آخر آپ لوگوں نے چھ گھوڑوں کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ایکشن لینا تو بنتا ہے۔اس کے علاوہ بریخنہ چچی،گل لالہ،مہابت خان کاکا،اس کا پوتا ناصر،مدثر،غازان۔یہ سب بھی واقف ہیں میری کارروائی سے اور میرے یہاں گزارے ہر دن سے.....اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ آپ میرے ساتھ کچھ کر دیں گے تو میں ان سب کو خبردار کر چکی ہوں یوسف خان۔ان کیس آپ نے مجھے کچھ کر بھی لیا تو آپ بھی خود کو بچا

نہیں پائیں گے۔نہ آپ اور نہ ہی آپ کا مکار بیٹا۔"
وہ تلخی سے بولی۔
"کیا چاہیے تمہیں؟" وہ بلواسطہ مدعے پر آئے۔عبادہ مسکرائی۔
"کچھ زیادہ نہیں۔چترال کی ٹیم میں ایک تبدیلی چاہیے۔"
"ابتہاج ٹیم نہیں چھوڑے گا۔" وہ تیزی سے مگر سختی سے بولے۔
"ہمیں اس کی جگہ نہیں چاہیے خان۔وہ بے شک کھیلے۔آپ کسی اور کو ہٹا کے گل کو ٹیم میں جگہ دیں گے۔"
یوسف خان کرنٹ کھا کے کھڑا ہوا۔"کیا بکواس ہے یہ؟"
"بکواس ہوتی تو میں اتنا وقت نہ لگاتی۔گل نے ہر سال چترال کی مقامی جیوری کو خط لکھے، درخواستیں لکھیں کہ وہ پولو ٹیم کا حصہ بننا چاہتی ہے لیکن آپ نے نہ صرف اس کی ہر درخواست مسترد کی بلکہ اس پر دباؤ بھی ڈالا اور اسے ڈرایا بھی۔اس بار وہ پولو کھیلے گی.....اپنے رستم کے لیے.....اسے جیتنے کے لیے....."
"میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔"
"آپ کریں گے۔اگر آپ نے نہیں کیا تو میں نے جو کہا.....میں وہ کروں گی۔"
"تم شہری لڑکی۔لاہور سے آ کے مجھ جیسے خان کو دھمکا رہی ہو؟" وہ اسے حقارت سے دیکھنے لگے۔"تم جانتی بھی ہو تم کیا کر رہی ہو؟"
"اسی دن جان گئی تھی جب آپ کا نالائق بیٹا میری ٹکٹ کٹا کے آیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں زخمی تاثر جاگا۔
"لڑکی....." وہ تنبیہی انداز میں کہتے ایک قدم قریب آئے۔"تم ایک سردار کو دھمکا نہیں

سکتی۔ مت بھولو اس وقت تمہارے سامنے یوسف خان کھڑا ہے جو تمہارے اس لہجے پر تمہیں دردناک سزا دے سکتا ہے۔"

عبادہ بڑے سکون سے مسکرائی۔ اس کی معنی خیز مسکراہٹ یوسف خان کو چبھنے لگی۔

"بیری فیبر ٹورسٹ کمپنی کے تین ہزار سیاح اس وقت شندور میں موجود ہیں اور ہر سال یہی ٹریول کمپنی کثیر تعداد میں نیشنل اور انٹرنیشنل ٹورسٹ کو سپانسر کرتی ہے۔ جانتے ہیں وہ کس کی کمپنی ہے؟" وہ لمحے بھر کو رکی۔ یوسف خان کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"صائمہ افتخار کی۔ انگلینڈ پولو ٹیم پلیئر کی۔ وہ ایک بہترین گھڑ سوار اور پولو پلیئر ہیں۔ میری راولپنڈی پولو گیریژن کلب میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور ان کے اپنے فارم ہاؤس میں موجود ان کے ذاتی گھوڑے "روسو" کا علاج کیا تھا جس کو ہلکا سا لیمنس تھا۔ میں نے ان کے ساتھ پورا ایک ہفتہ گزارا تھا۔ ان کا نمبر (موبائل دکھایا) اس میں سیو ہے اور میری ہر دوسرے ہفتے ان سے سلام دعا ہوتی ہے۔ ان سے کہہ کر نہ صرف گل کو انٹرنیشنل پولو میں انرول کرواؤں گی بلکہ وہ خصوصی طور پر گل سے ملنے بھی آئیں گی۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ "اس لیے گل کی پولو پلیئر بننے کی فکر آپ چھوڑ دیں..... رہی بات رستم کی تو رستم ابتہاج کو مل بھی گیا تو اس کا ہو نہیں پائے گا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ نے رستم کو کیوں نیلام کیا ہے۔ میں بھی جانتی ہوں لیکن جس طرح باقی آپ کے عتاب سے بول نہیں پا رہے، مجھے آپ سے ذرا ڈر نہیں لگتا اور اسی لیے..... میں..... بولوں گی۔"

یوسف خان کی گردن میں گلٹیاں معدوم ہو رہی تھیں۔

عبادہ نے چند قدم پیچھے لیے یہاں تک کہ وہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ باہر چند قدم پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

"میری بات کے ثبوت میں گواہی دینے والے ہزاروں لوگ ہیں۔ اول تو خود آپ کا بھتیجا

ہے۔آپ کس کس کا منہ بند کریں گے؟ میں نہ صرف یہ لوگ اصطبل لے کے جاؤں گی بلکہ انہیں وہ جگہ بھی دکھاؤں گی جہاں آپ گھوڑے دفنا کے آئے ہیں۔ میں وہ رپورٹس بھی دکھاؤں گی، ان ڈاکٹرز کو بھی بلاؤں گی جنہوں نے علاج کیا۔میں آپ کے ان سات ملازمین جن کو آپ نے لاپرواہی پر گھروں میں قید کیا ہے۔انہیں بھی بلاؤں گی۔ میں میڈیا بھی بلاؤں گی جو پہلے ہی شندور میں موجود ہے۔ میں صائمہ کو بلاؤں گی۔تحقیقاتی کمیٹی تو پہلے ہی آرہی ہے۔آپ کس کس سے بچیں گے یوسف خان۔آپ کے پاس کوئی آپشن نہیں۔ میری بات مان لیں۔اسی میں بھلائی ہے۔''

وہ سرد بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔ یوسف خان کی گردن ڈھلک گئی۔وہ گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''میں شندور کے دوسرے روز تک اس اعلان کا انتظار کروں گی۔اگر یہ اعلان میرے کانوں میں نہ پڑا اور مجھے گل کا سلیکشن لیٹر نہ ملا تو پھر میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں کہتی صوفے کے قریب آئی اور اپنا سٹیتھوسکوپ اٹھایا۔''میرا دیدار کر کے آپ کے مہمانوں کے چہرے پر کئی سوال ابھر آئے ہیں۔ مجھے مجبور مت کریں کہ میں ان سوالوں کے جواب دوں۔''

یوسف خان اسی طرح کھڑے تھے۔

''بے وجہ معصوم جانوروں کو مارنے پر کونسی دفعہ لگتی ہے۔آپ تو جانتے ہوں گے۔کیوں؟ ٹھیک کہا ناں..... یوسف..... خان؟''اس نے ان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔

یوسف خان کو اپنا بولا ہوا فقرہ یاد آ گیا۔

''دو دن ہیں آپ کے پاس۔ان دنوں میں وہ انرول نہیں ہوئی تو میں آپ کو پورے چترال کے سامنے وائٹ واش کر دوں گی۔'' اس نے انگلیوں سے وکٹری بنائی اور ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''دو دن.....''انہیں سرد مہری سے باور کراتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

عبادہ سلیم نے شطرنج کی بساط پہ پیادہ چلایا تھا۔اپنا پیادہ.....اب اس بساط پہ بہت سارے مہرے چلنے تھے۔عموماً تو شطرنج کا کھیل دو کے درمیان ہوتا ہے لیکن یہاں تین کے درمیان تھا۔وہ تینوں اپنی اپنی گوٹیاں چل رہے تھے۔یوسف خان کے پیادے کے جواب میں عبادہ نے پیادہ چلایا تھا۔اب اس کھیل میں تیسرا آدمی کیا چلائے گا؟

☆.....☆.....☆

ان کی گاڑیاں قافلے کی شکل میں سڑک پر چل رہی تھیں۔وہ ابھی ایون سے نکلے تھے۔ جیپ،کاریں،فورایکس فور پک اپس،ڈبل سٹرز،جن کو خاص طور پر پہاڑی علاقوں کے لیے بنایا گیا ہے وہ کسی ریس کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے،دائیں بائیں چل رہی تھیں۔قافلے کی قیادت غاذان اور یوسف خان کررہے تھے۔

تیسری گاڑی یوسف خان کی تھی۔سیاہ چمچماتی فورایکس فورڈبل سٹر۔وہ درمیان والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔شیشہ نیچے تھا،انہوں نے کہنی شیشے میں رکھی ہوئی تھی۔وہ تندرست ہاتھ کی انگلیاں بے چینی سے مروڑ رہے تھے۔چہرے پر اضطراب تھا۔ان کے ساتھ غاذان بیٹھا ہوا تھا۔وہ کن انکھیوں سے تایا کے اترتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔قافلے میں شامل بالک سیٹیاں اور نعرے بازی کررہے تھے۔کچھ گاڑیوں میں ڈیگز لگے ہوئے تھے۔ان کی آوازوں سے سارا قافلہ جھنجھنا رہا تھا۔مانو کوئی بارات چلی آرہی تھی۔

غاذان کافی دیر سے یوسف خان کے چہرے پر یہ بے چینی دیکھ رہا تھا،اس سے مزید برداشت نہیں ہوا۔وہ کھسک کے قریب آیا۔

"خان جی....."اس نے آہستہ سے آواز دی۔یوسف خان نے محض گردن موڑی۔"سب ٹھیک ہے؟آپ کیوں اتنے پریشان لگ رہے ہیں؟"

اس سوال پہ ان کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرایا۔

''میں دو دن تک اس اعلان کا انتظار کروں گی۔ اگر یہ اعلان میرے کانوں میں نہ پڑا اور مجھے گل کا سلیکشن لیٹر نہ ملا تو پھر میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی۔'' عبادہ کی اٹھی انگلی، آنکھوں میں دھرا طیش اور ارادوں میں بھری پختگی ان کو کرچیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

''وہ لڑکی۔ تمہاری ڈاکٹر۔ وہ آئی تھی صبح میرے پاس۔ اس نے مجھے دھمکایا ہے کہ اگر میں نے گل کو اس دفعہ پولو ٹیم میں نہیں لیا اور اس کی درخواست مسترد کر دی تو وہ بیمار گھوڑوں کا راز نہ صرف چترال اور گلگت کے سامنے کھولے گی بلکہ میڈیا کو بھی بتائے گی۔''

غازان کچھ دیر ان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ گاڑیاں ایون پل پر چڑھ رہی تھیں۔ وہ آگے ہوا۔ ''یہ کہا ہے اس نے؟''

''ہوں۔''

''آپ نے بتایا نہیں اس کو کہ ہم شندور کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ اٹھارہ سال پہلے مقامی جرگے نے ہم پر پابندی عائد کی تھی۔''

''یہ سب بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا غازان۔ اس کی نظروں میں ہم اپنا اعتماد اس قدر کھو چکے ہیں کہ ہماری سچائیاں بھی اسے جھوٹ لگتی ہیں۔ اسے لگتا ہے کہ ابتہاج کو میں نے شندور میں داخل کرایا ہے اور اگر میں ابتہاج کو کر سکتا ہوں تو میں گل کو بھی کر لوں گا۔''

''کمیٹی اس بات کے لیے قطعی راضی نہیں ہوگی خان جی۔ اول تو ہم شندور کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے سکتے اور اگر سردار ہونے کے ناطے آپ نے فرمائش یا گزارش کر بھی لی تو وہ فی الفور تبدیلی ہرگز نہیں کریں گے۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''ان کو کرنا ہوگا۔ اب تک میں اپنے قبیلے کی عزت بچاتا آیا ہوں غازان۔ اس آخری مرحلے

میں، میں ہرگز ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا جو میری اتنے مہینوں کی محنت اور پردے کو چاک کردے۔'' وہ سرد لہجے میں کہنے لگے۔

''خان جی.....ہم کمیٹی میں مداخلت نہیں کرسکتے۔'' اس نے صاف لفظوں میں باور کرایا۔

''ہم دخل اندازی نہیں کرسکتے مگر کوئی ہے جو ایسا کرسکتا ہے۔'' وہ شیشے کے پار پہاڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے پرسوچ انداز میں بولے۔ غاذان ٹھٹک گیا۔

''کون؟''

''جب میں ایف اے کررہا تھا تب میری کلاس میں لڑکا پڑھتا تھا۔ وہ بہت نالائق اور انتہائی شرارتی تھا۔ ہمارا ہر استاد یہاں تک کہ پرنسپل بھی اس سے تنگ تھے۔ وہ اپنی جاہلانہ شرارتوں سے ہر وقت سکول کی ناک میں دم کیے رہتا تھا۔ استاد کہتے تھے اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ اس کا باپ شہر میں نوکری کرتا تھا۔ گھر میں صرف ماں تھی۔ ماں نے پرنسپل کو بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کو قابو نہیں کرسکتی۔ گھر میں بھی کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو ان کے سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کو اپنی ہٹ دھرمی اور بے حیائی سے روک سکے۔ پرنسپل نے کہا کہ اگر کوئی نہیں ہے تو اس کے باپ کو شہر سے بلاؤ۔ لڑکے کا باپ شہر سے آیا۔ اس نے دو دن گھر گزارے۔ تیسرے دن جب وہ لڑکا کالج آیا تو ایک سلجھا ہوا۔ شریف لڑکا بن چکا تھا۔ کئی لوگوں نے اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہا، اسے صرف اس کا باپ ٹھیک کرسکا تھا کیوں کہ.....'' وہ سانس لینے کو رکے۔ ''باپ تو پھر باپ ہوتا ہے۔''

غاذان الجھ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

''میں شندور میں مداخلت نہیں کرسکتا کیوں کہ میں پرنسپل ہوں مگر میں شندور کے باپ کو بتا سکتا ہوں۔'' انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے غاذان کو دیکھا۔ غاذان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک ہی جھٹکے میں سب سمجھ آ گیا۔

”کے پی کے ٹورازم اتھارٹی۔“ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

گل بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی زندگی کی رَمق ختم ہوگئی ہو۔ اس کی مثال اس کھلاڑی جیسی تھی جو سالہا سال دوڑ کے میچ کی مشقیں کرتا ہے اور پھر عین میچ کے روز اسے انجری ہو جائے تب وہ خود سے، خدا سے بدگمان ہوتا ہے۔ گل بھی اس وقت خود سے نہیں، زندگی سے مایوس ہوگئی تھی۔ پچھلے دو دِنوں میں اس نے شاذ و نادر ہی کچھ کھایا تھا۔ بریخنہ اس کے لیے کھانا لاتی، وہ دو لقمے (زندہ رہنے کے لیے) لیتی پھر اٹھ جاتی۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ اور عبادہ رات گئے تک گپیں لڑانے والی لڑکیاں تھیں۔ دو راتوں سے اس نے عبادہ سے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔

بی جان کی گزارش کے بعد اس کے اندر ویرانی بھر گئی تھی جس نے اس کے نٹ کھٹ اور چنچل رویے کو مفقود کر دیا تھا۔ وہ خاموش ہوگئی تھی۔ عبادہ نے تاحال اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے یوسف خان کو دھمکایا ہے کیوں کہ جب تک اس کے لیے انتخاب کا خط نہ آجاتا، وہ خود سے اس کو کسی جھوٹی امید پہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس سے گل کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گل جلد از جلد اس صدمے سے باہر آجائے گی لیکن یہ چوٹ اس کا مستقل زخم بن جائے گی جو اس کی روح اور اس کے دل پہ کسی مہر کی طرح ثبت ہوگی۔ وہ تاعمر اس خلش کو بھلائے نہیں بھلا سکے گی۔ اس کے بعد شاید یوسف خان اس کے دل افزائی کے لیے پورا اصطبل دے دیں، دنیا جہاں کے گھوڑے لا دیں مگر وہ رستم کی تلافی کبھی نہیں کر سکیں گے۔

ازل سے ہوتا آیا ہے کہ وراثتی معاملات میں عورتوں کے حقوق بری طرح ضبط کیے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ تو دور، انہیں چوتھائی حصہ بھی نہیں ملا۔ اسلام اور شریعت نے جو احکامات جاری کیے

تھے،ان کے خلاف ورزیاں کرتے ہوئے اس دنیا کے مرد ذرا نہیں چُوک رہے تھے۔اپنے ماں باپ کے حصے میں اپنی شراکت کے لیے اٹھنے والی ہر عورت کی آواز دبائی گئی ہے۔

وہ صبح دیر تک بیڈ پہ لیٹی چھت کو گھورتی رہی تھی۔اس کے ہاتھ گرے ہوئے پردوں کو ہولے ہولے چھو رہے تھے۔وہ یک ٹک پنکھے کو گھورے جا رہی تھی۔جانے کتنے لمحے اس نے خام خیالی میں گزارے۔میز پہ پڑا اس کا ناشتہ ٹھنڈا ہوا گیا تھا۔پھر وہ اٹھی،بڑی پژمردہ انداز میں پائنتی پر بیٹھ گئی،پیر لٹکائے وہ کتنی دیر جوتوں سے کھیلتی رہی،سورج اوپر آ چکا تھا۔دن چڑھ چکا تھا لیکن اس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

خود کو جبراً واش روم تک گھسیٹنے میں اسے گھنٹہ لگا پھر وہ ڈیڑھ گھنٹہ واش روم کے اندر گزار کے آئی۔جب باہر نکلی تو صرف چہرہ گیلا تھا۔اس نے کپڑے تک نہیں بدلے تھے۔وہ اسی طرح بے دلی سے چلتی ہوئی بیڈ پر واپس لیٹ گئی۔ریشم نے آ کے اس کا کمرہ صاف کر دیا اور پردے بھی باندھ لیے وہ اوندھے منہ تکیے پر لیٹے،سائیڈ ٹیبل پہ رکھی بابا کی تصویر کو دیکھے جا رہی تھی۔

پرسوں رات نیم غنودگی میں ان کے منہ سے نکلنے والی بے بسی سن کر،وہ جان گئی تھی کہ ماں کو کس قدر بے بس کر دیا گیا تھا۔بریخنہ نے اسے ہر قدم پر چاہا تھا۔اپنی بے لوث محبتیں اس پر حویلی کی تند ومند نظروں کے باوجود نچھاور کی تھیں مگر وہ اپنے بچپن کی خلش میں اس قدر سفاک ہو گئی تھی کہ ہر بار ماں کی ممتا کو ڈھونگ یا ڈرامے کا نام دے کر اپنے ضمیر کی ملامت خاموش کر دیتی۔ایسا بارہا ہوا تھا کہ اسے بریخنہ کی پیش قدمیوں میں ماں کی حدت محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈپٹ دیا تھا کہ اس کی ماں اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ چکی تھی۔

اس نے کبھی بریخنہ سے نہیں پوچھا کہ انہوں نے دوسری شادی کیوں کی۔اس رات عبادہ کے سوال سے وہ جان گئی تھی کہ عبادہ کا مقصد خود اس سچائی کے بارے میں جاننا نہیں تھا کیوں کہ اگر چہ

ایسا ہوتا تو وہ کسی دوسری جگہ بھی ماں سے پوچھ سکتی تھی۔اس کے کمرے میں اچانک یہ سوال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گل سن سکے کیوں وہ جان گئی تھی کہ گل جاگ رہی ہے۔بریخنہ نے جب ایک ایک کتھا کھولی تو اس نے عالیہ کی بتائی ہوئی تفصیل سے اس کا موازنہ کیا۔وہ سمجھ گئی کہ حویلی والوں نے اس کی ماں پر بھی ظلم ڈھائے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجاہد خان جی ماں سے کسی حاکم کی طرح بات کرتے ہیں حالانکہ اس کے دوسرے چچا اپنی بیوی کی سرزنش کر دیتے ہیں لیکن ان کو حقارت سے نہیں دیکھتے۔بڑے بھائی کی بیوہ،ایک بچی کی ماں سے شادی کر کے انہوں نے ماں پر احسان تو کیا تھا مگر اندر ہی اندر وہ اپنی ہم عمر بیوی کی خواہش بھی رکھتے تھے۔

گل میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ براہِ راست ان کی ازدواجی زندگی پر سوالیہ نشان لگا لیتی مگر جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس نے اپنی ماں کو حویلی والوں کے آگے رلتا ہوا دیکھا تھا۔وہ کبھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس ذلالت کی کیا وجہ ہے۔ظاہر ہے وہ خود بھی ماں کو ملنے والے زخموں کا جشن مناتی تھی۔بہرحال بریخنہ اس کی نظر میں بھی ایک بری عورت تھی۔لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ جانے بغیر کسی کے بارے میں رائے نہیں قائم کرنی چاہیے۔انسان بیک وقت اپنے اندر کئی جنگیں لڑ رہا ہوتا ہے۔اس کی ماں بھی لڑ رہی تھی۔مگران میں کس قدر صبر تھا۔وہ کتنی زیادہ استقامت پسند تھیں۔گو کہ وہ نعیم کے راز سے ناواقف تھیں مگر انہوں نے ساس کے حکم پر سر تسلیم خم کیا تھا۔انہوں نے دوسرے شوہر کے کہنے پر کلیم کو بھلا دیا تھا۔وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر کے بارے میں پتہ نہیں لگا سکی اور اس بات پر یقین کر لیا کہ جہانگیر نے کھائی سے گرایا۔

بھلا ستر پچھتر کلو کا مرد اور چودہ سو کلو کا گھوڑا کوئی کھائی سے گرا سکتا ہے؟ جہاں تک بھنگ کی بات ہے تو بلوری کے بپھرنے کے بعد بابا نے چھلانگ نہ لگائی ہوتی؟ کتنے عام سوال تھے اور کتنی مشکل سے ذہن میں آتے تھے۔اس کی ماں کے ذہن میں کیوں نہیں آئے۔کیا معلوم آئے بھی ہوں مگر بی

جان کے عتاب اور یوسف خان کے دبدبے نے خاموش کر دیا ہو۔اس کی ماں جی حضوری کرنے والی عورت تھی۔وہ بڑی مشکل سے اپنے لیے آواز اٹھاتی تھیں۔کون جانے وہ قبیلے کے تناؤ میں آ کر دب گئی ہوں یا کیا معلوم بی جان نے ان کو بھی واسطے دیے ہوں، قسمیں دلائی ہوں۔

بی جان کو جذباتی طور پر ہراساں کرنا آتا تھا۔کیا پتہ انہوں نے ماں کو بھی بابا اور اس کا واسطہ دے کر چپ کرا دیا ہو۔ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔بی جان ایک دور اندیش خاتون تھیں، وہ اپنے قبیلے کی سلامتی اور عزت کے لیے سرور خان کی طرح کسی بھی حد سے تجاوز کر سکتی تھیں۔خیر جو بھی ہوا تھا۔ماں کے بیان کے بعد وہ سمجھ گئی تھی کہ انہیں بابا کے ہر معاملے سے دور رکھا گیا تھا۔

اس کے ذہن میں بیک وقت کئی خیالات آ رہے تھے۔سچائیاں کھلنے کے بعد اس کا اپنا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور اگلا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ماضی کی ساری سچائیاں قبول کر لیتی۔اس سب کشمکش نے اسے ذہنی طور پر اپاہج کر دیا تھا۔اس پہ آج سے پہلے کبھی ڈپریشن کا حملہ نہیں ہوا تھا۔اس کا یہ ڈپریشن اس کی جان لے رہا تھا۔

عبادہ بڑی تسلی سے اس کی ڈوبتی رنگت کو دیکھ رہی تھی۔اس نے کل شام سے ایک دفعہ بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔سارا دن وہ کمرے میں بیڈ پر پڑی رہی۔اس نے دوپہر کا کھانا کھایا نہ رات کا۔ابراہیم بھی کچھ کھائے پیئے بغیر اس کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔وہ اکثر رات کو گل سے انگریزی کی کہانی سننے آتا تھا۔دو راتوں سے اس کی باجی نے اسے کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔جتنی وہ ڈپریشن میں تھی، اس سے زیادہ وہ بچہ تھا۔

بریخنہ اپنی دونوں اولادوں کو جھڑتا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔مجاہد خان کے لیے بے شک گل سوتیلی تھی لیکن ان کے لیے گل اور ابراہیم دونوں سگے تھے۔آج رات تو گل نے چاہ کر بھی ابراہیم کے بال نہیں سہلائے تھے۔ان دونوں نے لاشعوری طور پر عبادہ کو بیڈ پہ جگہ بھی نہیں دی تھی۔گل

اوندھی لیٹی رہی، ابراہیم یہاں سے گیا ہی نہیں جس کی وجہ سے عبادہ کو صوفے پر سونا پڑا۔

☆.....☆.....☆

آج شندور کا پہلا دن تھا۔

میلے میں بے انتہا رش تھا۔ لوگ دور دراز سے کٹھن اور مشکل سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ بابوسر ٹاپ کے چاروں طرف چٹیل پہاڑ ہیں جن کے دامن پہ ایک درخت بھی نہیں اگتا۔ یہ سطح سمندر سے ۱۲۲۶۴ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اسے ''دنیا کی چھت'' یعنی ''Roof Of the World'' بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہندوکش، ہمالیہ اور پامیر کی چوٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہاں ایک بڑا سا کھلا سرسبز میدان ہے جسے ''شندور'' کہتے ہیں۔ کھوواری زبان میں پہلے پہل شندور کو ''ماس جونالی'' کہتے تھے۔ ''ماس'' کا مطلب ''چاند'' ہوتا ہے اور ''جونالی'' کا مطلب ''پولو گراؤنڈ۔'' اسے ۱۹۳۶ء میں تعمیر کیا گیا اور جب ہی سے یہاں پولو کے میچ ہوتے ہیں۔

گلگت اور چترال کے درمیان ہونے والے ان میچوں کا سلسلہ پچھلے کچھ سالوں سے رائج ہوا ہے اس سے قبل یہاں صرف برطانوی سرکار کے میچ ہوتے۔ جب سے یہاں گلگت اور چترال کے مابین تین روزہ میچ کا انعقاد ہونے لگا ہے۔ اس جگہ نے اپنے آپ میں مثالی شہرت حاصل کر لی ہے۔

یہ گراؤنڈ شندور تالاب سے تھوڑا دور بنا ہوا ہے۔ اس کے گرد چھوٹے چھوٹے مگر پہاڑیوں کی طرح اونچے ٹیلے ہیں جہاں سٹیڈیم کی طرح قطاروں میں لمبے لمبے بنچ لگائے ہیں۔ میچ کے دوران شائقین یہیں براجمان ہوتے ہیں۔ میچ سے پہلے یہاں کئی طرح کے فنکشنز ہوتے ہیں جن میں ثقافتی رقص و سرود اور دیگر تماشے پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے روز پاک آرمی کے نوجوانوں کی طرف

سے پیراشوٹنگ بھی ہوتی ہے اور بعض تنظیموں کی طرف سے باقاعدہ پریڈ کا اہتمام ہوتا ہے۔ میچ سے قبل اس مستطیل گراؤنڈ میں سب حصہ دار اپنے اپنے اصناف دکھاتے ہیں۔

اس دفعہ شندور کافی مختلف اور الگ تھا۔ چترال کے نمبردار یعنی سردار یوسف خان کی طرف سے رستم کی نمائش تھی۔ اس خوبصورت گھوڑے کی تصاویر اور اس طوفانی خبر نے پورے پاکستان میں آگ لگادی تھی۔ جو لوگ شندور نہیں آرہے تھے وہ اس تجسس کی وجہ سے گھروں سے نکل آئے تھے۔ سالہا سال ویران رہنے والی شندور کی سڑکوں پر ان دِنوں گاڑیوں کی آبیاری ہوتی تھی۔ ایسا لگتا جیسے اسلام آباد کی کوئی مشہور شاہراہ ہو۔

شائقین کے پنڈال کے عین درمیان میں بل بورڈ ہوتا ہے جس پہ ٹیم کے اسکور ایک آدمی کی مدد سے چسپاں کیے جاتے ہیں۔ اس بورڈ کے بائیں طرف عین سامنے ایک قنات لگا ہوا تھا۔ اس قنات کے نیچے مہمانِ خصوصی اور کمینٹیٹر کے لیے نشستیں لگائی گئی تھیں۔

یوسف خان اور باقی سرداران یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایسا زاویہ تھا کہ پورا گراؤنڈ اور اس میں موجود لوگ آنکھوں میں کیمرے کی طرح نظر آتے۔ میچ کا افتتاح وزیراعلیٰ کے پی کے نے کردیا تھا، اس وقت میدان میں مختلف تماشے دکھائے جارہے تھے۔ کچھ دیر میں میچ شروع ہونا تھا۔ پہلا میچ لسپر اور غذر کے درمیان تھا۔ یہ گلگت اور چترال کے ذیلی علاقے تھے۔ شندور میں سات میچ ہوتے۔ ساتواں میچ فائنل میچ ہوتا ہے جو چترال اور گلگت کے درمیان ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

صحن میں وہ سامنے والی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں میں ابراہیم تھا جس نے اس کی ران پر سر ٹکایا ہوا تھا۔ وہ بھی گل کی طرح افسردہ تھا۔ فوارے کے اطراف میں بچے بے ہنگم شور کررہے تھے۔ ماحد دیگر بچوں کے ساتھ اچھل اچھل کے طوفانِ بدتمیزی اٹھا رہا تھا۔

اس طرف سیڑھیوں پر عبادہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی گرائے، گل کو دیکھے جا رہی تھی جو ابراہیم کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گل کس کے بابت سوچ رہی ہوگی۔ یہ وقت اس کے ذہن میں رستم کا خیال نہیں ہوگا بلکہ وہ سنہرے پل ہوں گے جو اس نے رستم کے ساتھ گزارے تھے۔

بریخنہ کب اس کے ساتھ آن بیٹھی، عبادہ کو محسوس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ بھی نم آنکھوں سے گل کو دیکھ رہی تھیں۔ گل کی حالت شکست خوردہ تھی۔ خود کی تقدیر سے ہارنے والوں کے جیسے وہ نہ گلہ کر رہی تھی اور نہ آنسو بہا رہی تھی۔ وہ بے رحمی سے اپنے مقدر پر راضی ہو گئی تھی۔

''وہ سمجھوتے نہیں کرتی عبادہ۔ وہ دوٹوک لفظوں میں جواب دینے والی لڑکی ہے۔'' ان کی آواز پر اس نے چونکتے ہوئے ٹھوڑی اٹھائی۔ وہ گل کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ''اسے حیص بیص سے کام لینا نہیں آتا۔ جو ٹھیک لگے وہ کر لیتی ہے اور جو نہ لگے، وہ نہیں کرتی۔ اس نے کبھی اپنے لیے ''درمیان کے راستے'' کا انتخاب نہیں کیا۔ وہ اپنی چیزوں پر بھی سمجھوتا نہیں کرتی اور اگر..... وہ چیز اس کے بابا سے جڑی ہو تب یہ رعایت، گزارش یا درخواست کا ایک لفظ بھی نہیں سنتی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جنہیں ان کے حق نہ ملیں تو صبر کر لیتی ہیں۔ سب اللہ پہ چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہے اللہ بے شک سب دیکھ لیتا ہے لیکن اگر میں نے اپنا حق چھوڑ دیا تو میرے باشعور انسان ہونے پہ لعنت ہے۔ اللہ میرا ساتھ تب دے گا جب میں خود لڑوں گی۔ وہ مانگنے سے زیادہ چھیننے پر یقین رکھتی ہے۔ اسے اپنے حق کا کچھ نہ ملے تو جھپٹ لیتی ہے۔ وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔''

''پھر رستم پر سمجھوتا کیسے کر لیا چچی؟ رستم تو اس کی قیمتی متاع ہے۔'' وہ تعجب سے بولی۔

''وہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں۔ بی جان کے چند لفظ اسے خاموش کر دیں گے، میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ لفظوں میں آنے والی لڑکی تو نہیں تھی۔ پھر اس نے اتنی جلدی ہار کیسے تسلیم کر

لی۔'' وہ محو حیرت تھیں۔

''شاید وہ لڑلڑ کے تھک گئی ہے۔'' اس نے سرد سانس کھینچی۔

''عبادہ۔ میری گل لڑلڑ کے تھک ضرور سکتی ہے لیکن ہار نہیں سکتی۔ اسے اس کے بابا نے ہارنا سکھایا ہی نہیں ہے۔''

''مگر اس کی حالت دیکھیں، وہ کہیں سے بھی پلٹ کر وار کرنے والی حالت میں نہیں ہے۔''

''اس نے اس صدمے کو دل پہ لے لیا ہے عبادہ۔'' یکدم بریخنہ کی آواز نم ہوگئی۔ ''میری بیٹی ٹوٹ گئی ہے۔ اسے لگتا ہے اب وہ اس حویلی کے ظلم کے آگے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس نے خود کو حویلی کے حوالے کر دیا ہے۔'' وہ رونے لگیں۔ ایک گل ہی تو تھی جس کے جارحانہ اور دلیرانہ انداز پہ ان کی گردن موٹی چچی کے آگے تنی رہتی تھی۔ ان کے بیٹے اپنے تمام کزنز میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ اپنے معصوم اور کچی جوانی چڑھنے والے بیٹوں پر ظلم نہیں کر سکتی تھیں۔ جہاں موٹی چچی ابتہاج اور مسفرہ غاذان جیسے بیٹوں کی وجہ سے گردن میں سریا لگائے رکھتی تھیں، وہاں بریخنہ کو اپنی بیٹی پر ناز تھا۔ جہاں موٹی چچی غیر ارادی طور پر بریخنہ کو کچھ کہہ دیتی تھیں وہاں گل موٹی چچی کی کلاس لینے میں ذرا دیر نہیں لگاتی تھی۔

بظاہر وہ اپنی ماں سے نالاں تھی۔ اس سے نفرت کرتی تھی لیکن وہ کسی دوسرے کو ہرگز حق نہیں دیتی تھی کہ وہ بھی بریخنہ پر چڑھائی کرے۔ خود اپنے حق کے لیے بھی وہ نہ موٹی چچی سے ڈرتی تھی نہ یوسف خان سے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر ہر بات کہتی تھی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔

عبادہ نے بہت غور سے گل کا چہرہ دیکھا۔ ماحد گود میں کسی بنجارن بلی کو اٹھائے اسے دکھا رہا تھا۔ وہ غیر دلچسپی سے اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ بھیگی سی بلی اس کے لمس سے بپھر رہی تھی۔ اس کی میاؤں میاؤں ایک لمحے کے لیے عبادہ کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ اس کا تنفس تیز ہوا تو اس

نے آنکھیں گھما دیں۔

''کلیم خان جی گل کو پڑھانا چاہتے تھے۔اپنی طرح گھڑسوار اور پولو کھلاڑی بنانا چاہتے تھے۔گھڑسواری اور پولو تو یوسف خان جی نے نہیں کرنے دیا البتہ پڑھا لیا۔اسلامیہ کالج پشاور سے انگریزی میں ایم اے کرا دیا۔اتنا احسان کر دیا اس کی ذات پہ۔'' بریخنہ ہچکیوں روک کے کہہ رہی تھی۔

''اس کو گلہ کیسے نہ ہو؟ ماں نے شوہر کا غم ایک سال بھی نہیں جھیلا۔بیٹی کو در بدر کر دیا۔نئے شوہر اور نئے بچوں کے ساتھ مصروف ہوگئی۔اس کو ہر چیز میں نظر انداز کر دیا۔اس کے بعد گل نے مجھے کبھی ماں نہیں کہا، ہمیشہ چچی کہا ہے اور کوئی جب اس کو یاد دلاتا ہے میں اس کی اماں ہوں تو اس کا غصہ ساتویں آسمان پہ پہنچ جاتا ہے۔یوسف خان جی، اس کی بیوی، اس کے بیٹے اور اس کی بہنوں سے وہ اسی لیے نفرت کرتی ہے۔باپ بھی چھینا پھر ماں بھی۔اس کو یوسف خان سے جڑی ہر چیز سے نفرت ہے۔اس لیے وہ ان سب سے لڑتی ہے۔باقیوں کو اتنا کچھ نہیں کہتی۔''

ماحد نے اب بلی اس کی گود میں ڈال تھی اور خود وہ دودھ لینے چلا گیا تھا۔ابراہیم اور وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بلی کو پیار کر رہے تھے۔گل کا چہرہ ویران تھا۔وہاں کوئی رمق نہیں تھی۔

''اس کا کمرہ کلیم خان جی اور میرا تھا۔شادی کے بعد میں مجاہد چچا کے ساتھ چلی گئی تو یہ کمرہ خالی کرا دیا گیا۔یہاں کاٹھ کباڑ پڑا ہوتا تھا۔گل جیسے ہی سولہ سترہ سال کی ہوئی، اس نے لڑ لڑ کے یہ کمرہ لیا۔اس سے سارا کاٹھ کباڑ نکلوایا۔اس کو صاف کیا۔اس کی مرمت کی۔کلیم خان جی کی ایک ایک چیز یہاں رکھی۔تصویر، کتابیں، کرسیاں، بستر، تکیے، صوفے۔جو چیز بھی تمہیں نظر آ رہی ہے وہ سب اس نے صاف کرایا، سجایا، سنوارا اور خود کسی چوکیدار کی طرح ادھر رہنے لگی۔ابتہاج بہت لڑا۔اس کو مارا بھی لیکن گل نے کمرہ نہیں دیا۔اس کمرے میں اس کو ایک بندہ بھی برداشت نہیں ہوتا۔''

بے ساختہ اس کو گل کی وہ تمام حرکتیں یاد آ گئیں۔ کس طرح اس دن اس نے اس کا گیلا تولیہ اٹھا کے بالکونی کی ریلنگ پہ ڈالا تھا۔

''پوری حویلی میں وہ ایسی لڑکی ہے جس کے پاس ذاتی کمرہ ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس سے لے سکے۔ ابھی بڑی ہوگئی ہے ناں۔ اس لیے سب ڈرتے ہیں کہ اگر اس نے باپ کے بارے میں سوال کر دیا تو یہ لوگ کیا جواب دیں گے؟ یہاں سب اس کے سوالوں سے ڈرتے ہیں۔ وہ سوال نہیں کرتی۔ انصاف نہیں مانگتی، وہ خاموش رہتی ہے اور اس خاموشی کو وہ وقفے وقفے سے نکالتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے اندر کی آگ اس کو کھا جائے گی۔'' وہ بہت تشویش سے کہہ رہی تھی۔

ماحد دودھ کا پیالہ لے آیا تھا۔ گل بائیں ہاتھ میں پیالہ پکڑے، دائیں ہاتھ سے بلی کا سر دودھ کے پیالے میں ڈبو رہی تھی۔ بلی اپنی چھوٹی سی زبان نکال کر دودھ چاٹنے لگی۔

''اس کا دل نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں ذرا سی بھی اچھائی نہیں بچی۔ وہ بہت سفاک ہوگئی ہے۔ اپنے ساتھ۔ میرے ساتھ۔ سب کے ساتھ۔ اس کو کسی کی پرواہ نہیں۔ چھوٹے کی پرواہ ہے نہ بڑے کا لحاظ۔ وہ بچپن میں ایسا نہیں تھی۔ بہت معصوم تھی۔ سب سے اچھی بچی تھی لیکن خان جی کے بعد اس کا روپ رویہ ہی بدل گیا ہے۔ وہ پہلے والی گل لگتی ہی نہیں۔ وہ بہت بدل گئی ہے۔ بہت زیادہ.....''

اور ہم کہتے ہیں آتش فشاں ابھی کیوں پھٹا؟ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کب سے آتش فشاں بن رہا ہے۔ پھٹنے کا وقت تو تھوڑا سا ہوتا ہے۔ وہ عرصہ کہاں جائے جو اسے قطرہ قطرہ لاوا بناتا ہے؟ وہ صدیاں؟ وہ بیسیوں سال؟

''پتہ ہے وہ بہت ہنر مند ہے۔'' بریخنہ کھڑی ہوگئی اور دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس

آئیں۔" وہ ایک اچھی کاریگر ہے۔لکڑی کا کام کرتی ہے۔ہماری حویلی میں جہاں جہاں لکڑی کے اوپر یہ نقش بنے ہیں۔یہ دیکھو۔" انہوں نے ایک تختہ اٹھایا اور اس کی سطح دکھائی جہاں بھورا بھورا سیاہ سا کوئی نقش بنا تھا۔" یہ سب وہ کرتی ہے۔اسے شوق ہے۔کیا کہتے ہیں اس کو انگریزی میں؟ پارو..... پارو....."

"پائیروگرافی (Pyrography)۔"

"ہاں وہی۔کتنا شاندار کر دیا ہے ناں اس نے حویلی کو۔وہ جنگل سے لکڑیاں توڑ کے لاتی ہے پھر اس کے تختے سے بناتی ہے اور پھر یہ نقش۔وہ بہت قابل اور ہنر مند ہے۔اسے گھڑ سواری بھی آتی ہے۔پولو کھیلنا آتا ہے۔اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔اس کے پاس تعلیم ہے۔میری بیٹی ہر ہنر سے لیس ہے مگر وہ اپنے مقدر کے ہاتھوں ہمیشہ ہار جاتی ہے۔جہاں خوشیاں بانٹنے کی باری آ جائے، وہاں وہ خالی کشکول لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔اس کے نصیب میں لاتعداد قابلیتیں ہیں لیکن ان قابلیتوں کا کوئی مول نہیں ہے۔اس سب کا کوئی حاصل نہیں ہوگا اسے۔"

وہ مسلسل رو رہی تھیں۔گل کا دھیان اس طرف نہیں تھا صحن میں کھیلنے والے بچے بے تحاشا شور مچا رہے تھے۔وہ سب موٹی چچی اور بی جان کے جانے کی خوشی میں پاگل ہو رہے تھے۔اس لیے حویلی کے اصولوں سے بھرپور بغاوت کر رہے تھے۔بریحنہ اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی جب کہ وہ گھائل نظروں سے گل کو دیکھ رہی تھی۔

"میں اس کو اپنے پاس رکھوں گا۔ٹھیک ہے گُلے باجی۔" ماحد نے کہا۔گل زبردستی مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔"

"آپ امی کو منا لیں گی؟" اس نے چمک کے پوچھا۔

"بالکل۔"

''یہ چوہے کھاتی ہے۔ میں نے اسے سٹور روم سے پکڑا ہے۔ کہیں امی کو گندی نہ لگ جائے۔''

وہ گھبرا گیا۔

''نہیں لگے گی۔''

''اگر اس نے جگہ جگہ گند کر دیا تو؟ پھر تو امی مجھے الٹا لٹکا دیں گی بیر والے درخت سے۔''

''تم کیوں گھونچو کر رہے ہو سب کو؟'' ابراہیم جو ضبط سے سن رہا تھا، بالآخر برہمی سے چیخ پڑا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ پالنا ہے تو پالو۔ ویسے بھی تھوڑے دن تمہارے پاس رہے گی پھر کوئی نہ کوئی لے جائے گا۔''

عبادہ نے دیکھا، گل کے دل پہ گھونسا پڑا تھا۔ ابراہیم نے اس کی گود سے بلی کو اچک لیا پھر ماحد کی بانہوں میں ڈال دیا۔

''لے جاؤ اس کو۔ پالنا ہے تو پالو نہیں تو چھوڑ دو۔'' وہ تلخی سے کہتا وہاں سے اٹھ گیا۔ ماحد برا سا منہ کرا سے دیکھنے لگا پھر خفگی سے سر جھٹکا اور بلی کو لے گیا۔ گل کے ہاتھ، اس کی آنکھیں اپنی جگہ جمی ہوئی تھیں۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ جیسے شاک سے نکلی، اس نے پیالے کو سیڑھی پہ رکھا پھر بھاگ کر راہداری میں غائب ہو گئی۔ عبادہ کا دل مسوس کے رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی، کمرے کا بند دروازہ کھولا۔

کمرہ پورا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پردے برابر تھے۔ باہر بالکونی میں جلتی روشنی کی وجہ سے ہلکا ہلکا مدھم مدھم عکس اندر گر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کے دیوار سے جڑا بورڈ ٹٹولا۔ اس کے ہاتھ کئی بٹنوں پر لگے۔ ٹِک ٹِک ٹِک۔ ایک ساتھ بہت ساری روشنیاں جل اٹھیں۔ پورا کمرہ ایک لمحے میں منور ہو گیا۔

اس کی نظر تیزی سے گل پہ پڑی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ فرش پہ بیٹھی، پشت بیڈ سے جوڑے، سر بیڈ پہ رکھے، خاموش تھی۔ وہ رو نہیں رہی تھی۔ اس کے آنسو ختم ہو چکے تھے۔ یہ آنسوؤں کے بعد کا مرحلہ تھا۔ اندرونی تکلیف کا، خاموشی کا، دبے دبے غصے کا۔ عبادہ قدم قدم چل کے اس کے پاس آئی اور پائنتی پر بیٹھ گئی۔

بیڈ پہ جنبش ہونے کی وجہ سے گل نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا پھر تیزی سے سیدھی ہوئی۔ اس کے بال اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ لباس سلوٹ زدہ تھا۔ وہ نازک کلی چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مرجھا گئی تھی۔

"گل....."

"میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی..... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ رکھائی سے بولی اور اٹھنے لگی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا تھا۔ سر جھول رہا تھا۔ اسے بے حد کمزوری ہو رہی تھی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ ترک کے واپس اسی طرح بیٹھ گئی۔

عبادہ نے سامنے کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

"کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمارا غم، ہمارا درد سب سے زیادہ ہے۔ ہم سوچتے ہیں مجھ سے زیادہ بھی کسی نے سہا ہوگا؟ مجھ سے زیادہ بھی کسی کو تکلیف ہوئی ہوگی؟ لیکن اگر ہم اپنے غم دوسروں سے شیئر کریں تو ہمیں پتہ چلے کہ ہم نے تو کچھ سہا ہی نہیں ہے۔ ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ اللہ کسی بھی انسان پہ اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا لیکن اگر ہم دوسروں کے غم دیکھیں تو ہمیں پتہ چلے کہ اللہ کے حقیقی اور اصلی بندے تو وہ ہیں۔ ان کی برداشت اور ان کا صبر کتنا بڑا ہوگا کہ اللہ نے اتنی تکلیف دی اور وہ سہہ گئے۔

ہم پہ جو آیا ہے۔ ہمارا حوصلہ بھی اتنا ہے۔ ہم اتنی ہی طاقت رکھتے ہیں۔ جانتی ہو، ہم سب پہ

تقریباً ایک جیسے غم گزرتے ہیں۔ مثلاً تمہارے بابا اس دنیا سے گئے۔ وہ پہاڑ جتنا دکھ تھا لیکن ایسے کتنے لوگ ہوں گے جن کے باپ اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ تمہارا اور ان کا دکھ سانجھا ہے لیکن نوعیت الگ ہے۔ اور جانتی ہو کسی کے جانے کے غم کی نوعیب کا انحصار کس چیز پر ہوتا ہے؟ اس غم کی نوعیت کا انحصار آپ کی اس انسان سے محبت پر ہوتا ہے۔ جس قدر آپ کو محبت ہوتی ہے۔ اس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں تمہارے بابا سے بہت زیادہ محبت تھی گل۔ تمہارا غم آج تک نہیں مٹ سکا۔ یہ کون سمجھے گا؟ وہی ناں جسے تمہارے جتنی محبت ہوگی اور اس کا باپ دنیا سے گیا ہوگا؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جب ہم غم میں ہوتے ہیں تو ہم چاہتے ہیں پوری دنیا غم ہو۔ پوری دنیا غم میں کیسے ہوسکتی ہے گل؟ آزمائش انفرادی طور پر آتی ہے۔ سب پر اپنی اپنی۔ پھر آپ کے غم میں وہ کیوں شریک ہوں جن کا غم آپ کا نہیں ہے؟ جب ہمارے ہاں فوتگی ہوتی ہے تو لوگ روتے ہیں۔ اس ''میت'' کے لیے رونے والے چند لوگ ہوتے ہیں۔ خصوصاً رشتہ دار۔ باقی رونے والوں کو تو اپنے بچھڑے رشتے یاد آجاتے، جب ہی وہ روتے ہیں۔ وہ اس میت کے لیے نہیں روتے۔ ہمارے غم میں وہی روتا ہے جس کا درد سانجھا ہوتا ہے۔''

وہ اٹھی اور کھڑکی کے پردے ہٹائے، پٹ باہر کی طرف کھولے اور ہوا کا راستہ بنایا۔

''اس حویلی میں تمہارا غم وہی سمجھے گا جس کا کوئی پیارا جانور بچھڑا ہوگا۔ جس نے کسی پالتو کو زندگی دی ہوگی اور اس سے یوں چھینا گیا ہوگا۔ (وہ مڑی) کیا کوئی ہے اس حویلی میں ایسا؟''

گل کی گلابی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے بے اختیار سر کو نفی میں ہلایا۔ عبادہ نے گہری سانس لی، اپنا فون کھولا، گیلری کھولی، ایک تصویر نکالی اور اس کے پاس آئی، جھک کے اسے اپنا فون پکڑایا۔ گل نے الجھتے ہوئے تھام لیا اور پھر ناسمجھی سے اسکرین کو دیکھا۔

اسکرین پہ سفید بھبھسی بلی کی تصویر تھی جسے بھورے بالوں والی ایک لڑکی نے اٹھایا ہوا تھا۔ سفید موٹی سی بلی کے گلے میں سنہرا پٹہ تھا جس پہ اس کا نام لکھا تھا۔لڑکی کا چہرہ اس بلی کے چہرے سے جڑا ہوا تھا اور یہ تصویر غالباً سیلفی تھی۔

''یہ کرسٹی لینا تھی۔میری بلی۔میں دس سال کی تھی جب میری خالہ نے آسٹریلیا سے اسے بھجوایا تھا۔میری برتھ ڈے پہ۔'' گل نے ایک لمحے میں عبادہ کی آنکھوں میں سمٹا حزن دیکھا تھا۔ایک ملال،ایک اداسی۔پل بھر میں عبادہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''مجھ سے بہت سارے لوگوں نے پوچھا کہ تم ویٹ کیوں بنی؟ کوئی خاص وجہ۔یہ ہے وہ وجہ.....یہ.....کرسٹی.....میری بلی.....میری جان.....میری زندگی.....میری دھڑکن.....'' وہ زکام زدہ سانس اندر کرتی،کرسی پہ بیٹھ گئی۔''گل.....اس حویلی میں میرے علاوہ کوئی نہیں جو تمہارا درد سمجھے۔میں نے.....اس بلی.....کو.....کھویا ہے۔''اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔گل نے بے ساختہ تصویر کو دیکھا۔وہ بھورے بالوں والی لڑکی عبادہ تھی۔اس وقت وہ بیس سال کی تھی۔بال ڈائی کرواتی تھی۔بڑی فریم والا چشمہ لگاتی تھی۔وہ باؤلی سی چنچل اور لاڈلی لڑکی تھی۔وہ جانور کو ٹاکنے اور سینے والی بہادر اور دلیر لڑکی نہیں تھی۔وہ کمزور اور نازک تھی۔بالکل روئی کے نرم گالوں کی طرح۔

''تم سے رستم بچھڑا ہے۔تم نے اسے کھویا نہیں ہے گل۔میں نے اس کا کٹا ہوا جسم دیکھا ہے۔میں نے اس کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا ہے۔گل بہت مشکل ہوتا ہے۔بہت مشکل ہوتا ہے اپنے سالم اور صحیح بچے کو کٹا ہوا دیکھنا۔خون سے لت پت،جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔میں.....میں وہ لمحے یاد کرتی ہوں تو مجھے میری روح چرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔کرسٹی میرا دس سال کا بچہ تھا۔میرا وجود تھا۔میرا کھانا پینا،سونا جاگنا،اٹھنا بیٹھنا اسی کے لیے تھا۔میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوگا۔ایسا ہوگا۔''اس نے ڈھیر سارے آنسو پی لیے۔

''مجھے پتہ ہے تمہارا غم اپنا کیوں لگتا ہے؟ کیوں کہ یہ بلی حادثتاً نہیں مری تھی۔ میری کرسٹی کو میرے بیسٹ فرینڈ نے مارا تھا کیوں کہ اسے میری بلی کے ناخن اور آنکھیں چاہیے تھیں۔''

گل کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''میں شہر سے باہر گئی تھی ان دنوں۔ میری امی کو جانور نہیں پسند۔ انہوں نے کہا کرسٹی کو کسی کے پاس چھوڑ جاؤں۔ میں نے اپنے بیسٹ فرینڈ کے گھر چھوڑ دیا۔ میں دو دن بعد آئی، کرسٹی کو لینے گئی تو پتہ چلا کہ وہ لڑکا ایک دن پہلے ہی فلیٹ خالی کر کے جا چکا ہے۔ میری کرسٹی آسٹریلین تھی۔ اس کے ناخن اور اس کی آنکھوں کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اسے فون کرتی رہی۔ اس نے سم بند کی تھی۔ وہ شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ کس شہر، کہاں؟ کچھ پتہ نہیں تھا۔ مجھے کرسٹی چاہیے تھی۔ میں نے اس کے آس پڑوس سے پوچھا۔ اس نے بلی کسی کو نہیں دی تھی پھر جانتی ہو مجھے اس سوسائٹی کا ایک بچہ عمارت کی پچھلی سائیڈ پہ لے کے گیا اور وہاں کاٹھ کباڑ کے بیچ.....'' وہ سانس لینے کو رکی۔ دل درد سے پھٹ رہا تھا۔ ''میں نے کرسٹی کا کٹا ہوا جسم دیکھا۔ اس ظالم نے اس کے سارے ناخن اکھاڑ لیے تھے۔ اس کی آنکھیں نکال دی تھیں اور اس کا پیٹ کاٹ کے اسے پھینک دیا تھا۔''

اس کے گلے میں کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ اٹھی، جگ سے پانی نکالا، گلاس میں ڈالا اور غٹا غٹ پی گئی۔

''میری کرسٹی کی سنہری چین اس کی گردن سے بندھی ہوئی تھی۔ میں اسے خود سے جوڑ کے زار زار روئی تھی۔ اس وقت مجھے بھی یہی لگا تھا کہ میرا غم سب سے زیادہ ہے۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف ملی ہے۔ میرے ساتھ برا ہوا ہے لیکن جب میں نے ویٹرنری کورس کیا۔ میں ویٹ بنی۔ میں ہسپتال گئی۔ مجھے تب ریلائز ہوا کہ یہاں تو ہر روز ایسے لوگ آتے ہیں جن کے پالتو جانوروں کو بے

دردی سے مارا گیا ہوتا ہے۔ یہاں تو ہر روز درجنوں کے حساب سے کٹے ہوئے جانور آتے ہیں۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ کرسٹی کے ساتھ زیادہ برا نہیں ہوا تھا۔ ان جانوروں کے ساتھ زیادہ ہوا ہے۔"

اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا، منہ اور آنکھیں پونچھی اور خود کو کمپوز کرنے لگی۔ اس واقعے کو سات سال ہو گئے تھے لیکن ان سات سالوں میں وہ کبھی کرسٹی کو نہیں بھولی تھی۔ وہ جب جب یاد آتی، اس کا دل ایسے ہی پھٹنے لگتا۔

گل نے اس کا فون اٹھا کے بیڈ پہ رکھ دیا۔

"تم رستم کے لیے ماتم کر رہی ہو گل حالانکہ وہ زندہ ہے۔ جس کے پاس بھی جائے گا وہ اسے مارے گا نہیں۔" وہ اس کے پاس آ کے بیٹھی تو گل نے گردن گھما کے اسے دیکھا۔ "غم کو اوور کم کرنا سیکھو گل۔ سیکھو کہ غم سے فی الفور کیسے نکلا جاتا ہے۔ میں نے کرسٹی کے جانے کے دوسرے دن ہی نفسیات کو خیر باد کہا اور ویٹرنری بننے چلی گئی۔ مجھے اپنا غم بھولنا تھا۔ مجھے بابا نے سکھایا ہے کہ غم کو پہلے چوبیس گھنٹوں میں اور کم کرو۔ پھر اس سے نکلو اور اس کا سدِ باب کرو۔ تمہیں چوبیس گھنٹوں سے زیادہ ہو چکا ہے گل۔ تمہیں نکلنا ہوگا۔ ان حالات سے نمٹنا ہوگا۔"

وہ اسے موٹیویٹ کرنے لگی۔ بالکونی کی لائٹ کی روشنی دونوں پر براہِ راست پڑ رہی تھی۔

"میری بلی نے پیسوں کے لیے اذیت سہی۔ تمہارے رستم کے پیچھے بھی سب پیسوں کے لیے پڑے ہیں۔ اس دنیا کے باسی پیسوں کے لیے کروڑوں جانوروں کی بلی چڑھا سکتے ہیں گل۔ اس دنیا سے رحم کی امید نہیں رکھنی۔ بس تم اس بات پر خوش ہو جاؤ کہ وہ جہاں ہوگا۔ خوش ہوگا۔ تندرست ہوگا۔ میری کرسٹی کی طرح نہیں ہوگا۔ وہ پورے کا پورا بیش بہا ہے۔ اس کا کوئی اعضاء قیمتی نہیں ہے۔ کوئی اسے کاٹ کے پھینکے گا نہیں۔"

گل نے نم سی سانس لی پھر یکدم چہرہ ہاتھوں میں گرایا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ عبادہ جانتی

تھی کہ اپنے بچے کو کھونا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب ماں کو کٹے ہوئے بچے اور بچھڑے ہوئے سالم بچے کے درمیان ایک کا انتخاب کرنا ہو تو وہ کٹے ہوئے بچے کی بجائے ہمیشہ ''بچھڑے ہوئے'' سالم بچے کو ترجیح دے گی۔ ماں جدائی برداشت کر لیتی ہے لیکن بچوں کی سلامتی پر سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ یہ احساس کہ ان کا بچہ صحت مند ہے۔ خوش ہے۔ مزے میں ہے ان کی ساری جدائیوں، فراقوں کا مداوا کر لیتا ہے۔

''گل! کچھ لوگ حالات کو لے کر چلتے ہیں اور کچھ لوگوں کو حالات لے کر چلتے ہیں۔ اب اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ تم دونوں میں کس کا انتخاب کرنا ہے۔ حالات کے ساتھ چلنا ہے یا حالات تمہیں لے کر چلیں گے۔''

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

وہ فی الوقت اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے یوسف خان کو دھمکی دی ہے۔ عبادہ کو اعتماد تھا کہ وہ اس کی بات سنیں گے لیکن دل ہی دل میں وہ ڈر رہی تھی کہ اگر انہوں نے نہ مانی تو کیا ہوگا؟ اس نے گھوڑوں کا راز کھول بھی دیا تو تب تک شندور ہو چکا ہوگا۔ رستم جا چکا ہوگا۔ یوسف خان اور اس کے مکار بیٹے کو قانون کے تحت سزا ہو جائے گی لیکن وہ خان تھے۔ سردار تھے۔ وہ چند پیسوں میں ہی اپنے بچے کو رہا کر لیں گے۔ تب اس کا بنایا ہوا یہ جال، یہ منصوبہ کیا کرے گا؟

مانا کہ پاکستان میں جانوروں کا مارنے پر سزاؤں اور جرمانوں کا قانون ہے لیکن وہ کیوں ایک سردار کو جوان کو اپنی سزا کے بدلے بھی ہرجانے بھرنے کے لیے تیار ہوگا، اسے جیل میں رکھیں گے؟ ابتہاج یوسف خان کا بیٹا تھا۔ گو کہ وہ اس سے ناراض تھے لیکن وہ اسے جیل جیسی تکلیف نہیں دے سکتے تھے۔ ہر کسی کے پاس ضمیر ہوتا ہے لیکن ہر کسی کا ضمیر ''جاگا'' نہیں ہوتا۔

فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گئی۔ اس نے پائنتی سے فون اٹھا کے دیکھا، مہابت خان کی کال تھی۔

''سلام کاکا.....'' اس نے دھیرے سے کہا مگر ان کی بات سن کے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کرنٹ کھا کے کھڑی ہوئی۔ ''کیا.....کب.....کس نے؟ کیا سچ میں.....'' اس نے پیروں تلے رنگ پھٹ گئی۔ ''اب کہاں ہے وہ.....ڈاکٹر صاحب کیسے.....کاکا.....میری.....کاکا..... اچھا میں.....'' وہ تیزی سے بولی، مہابت خان بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ ''کاکا.....آرہی ہوں..... میں ابھی آتی ہوں.....ٹھیک.....پریشان نہ ہوں.....''

گل تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی جس کی حالت غیر ہوگئی تھی مگر گل کے پوچھنے سے پہلے ہی وہ عجلت میں ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی، وہاں سے ایک باکس لیا اور باہر نکل گئی۔ اسے فی الفور اصطبل جانا تھا۔

حویلی کی پارکنگ میں لاتعداد گاڑیاں پارک ہوتی تھیں جن کے ڈرائیور ہر وقت دستیاب ہوتے تھے۔ اسے سواری کی فکر نہیں تھی لیکن وہ حویلی سے اکیلی نہیں نکلتی تھی مگر ابتہاج نہیں تھا تو وہ کسی بھی ڈر یا خود کی پرواہ کیے بغیر پارکنگ میں آئی اور بوڑھے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

(آخری قسط)

عصر کا وقت ہو رہا تھا جب وہ بھاگم بھاگ اصطبل پہنچی۔اس کا دوپٹہ شانوں پہ جھول رہا تھا۔ بال بھاگنے کے سبب کھل گئے تھے۔چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔وہ جیسے ہی کوارٹر کے اندر داخل ہوئی،اس نے مہابت خان کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب کے کراہنے کی آواز سنی۔وہ دوڑی دوڑی اندر چلی گئی۔ڈاکٹر صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے ایک بڑا سا کپڑا سر پہ رکھا ہوا تھا۔ان کا سارا چہرہ،گردن اور شرٹ خون سے لت پت تھی۔مہابت خان کپکپاتا ہوا کسی کو فون ملا رہا تھا۔اسے آتا دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"بچے.....دیکھو.....اس کمینہ نے کیا کیا....."

"یااللہ۔" وہ گھبرا گئی۔ڈاکٹر صاحب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔خون سے ان کا پورا چہرہ بھر چکا تھا۔انہوں نے نقاہت بھری نظریں اٹھائیں۔اس نے باکس نیچے رکھے اور گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھی۔یہ وہی ایڈ باکس تھا جو غاذان اسے مرہم لگانے کے بعد چھوڑ کے گیا تھا۔

"کاکا! پلیز۔روئیں نہیں۔سنبھالیں خود کو اور جا کے بالٹی میں پانی لائیں۔جلدی کریں۔"اس نے نرمی سے پچکارنے کے بعد کہا۔مہابت خان آنکھوں کی دھندلاہٹ کو رگڑتا باہر چلا گیا۔

"اس نے بہت زور کا ہٹ کیا۔میں اس حملے کے لیے بالکل.....بالکل.....تیار نہیں تھا میم....."مہمت کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔عبادہ نے وہ کپڑا ان کے سر سے ہٹایا۔ان کے سر کے دائیں طرف بڑا گہرا زخم آیا تھا جہاں سے خون ابل ابل کے باہر آ رہا تھا۔اس نے دوپٹہ سنبھالا، آستین فولڈ کیے۔اسی وقت مہابت خان بالٹی لے آیا اور اس کے قدموں میں رکھ دی۔

اس نے کاسے میں پانی لیا اور بیٹھے بٹھائے ان کے زخم پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ پل بھر میں وہ پوری طرح گیلے ہوگئے اور ان کا سر، ماتھے، گردن اور بالوں سے چپکا خون دھل گیا۔ سرخی ہٹی تو عبادہ کو زخم کی نوعیت دیکھنے میں آسانی ہوئی۔ اس نے جھک کے ان کے بالوں کو دائیں بائیں دھکیلا۔ زخم گہرا تھا مگر بڑا نہیں تھا۔ چھوٹی سی جگہ پر گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ اس نے روئی اور پائیوڈین کی مدد سے ان کے زخم پر لیپ سا لگایا پھر روئی لی، اس کو تہہ در تہہ رکھ کے ایک بیگ سا بنایا اور زخم پر رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے پورے سر پہ اچھی طرح پٹی کر دی اور ان کو پین کلر دے کر لٹا دیا۔

کچھ ہی دیر میں ان کا درد کم ہو گیا تھا۔ کمرے سے پانی پونچھنے، اور ایڈ باکس سنبھالنے تک وہ مسلسل الجھی ہوئی تھی۔ مہابت خان ڈاکٹر صاحب کے لیے دودھ ابال کے لایا تو اس کے اعصاب نے کام شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب چارپائی کے کراؤن سے ٹیک لگائے، دودھ کے گھونٹ بھر رہے تھے جب کہ مہابت خان ان کے پائنتی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرے پر شدید اضطراب تھا۔

"ہمیں سمجھ ہی نہیں آیا۔ کب اس نے ہماری ساری باتیں سن لیں۔ میں تو ڈاکٹر صاحب سے یہ کہہ رہا تھا کہ گھوڑوں میں ہلچل نظر آئی ہے۔ وہ پلکیں اور دم ہلانے لگے ہیں۔ کب وہ اصطبل کی پچھلی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ ہمیں پتہ نہیں چل سکا۔" مہابت خان کہہ رہا تھا۔ "کچھ دیر پہلے ڈاکٹر صاحب گھوڑوں کو دوسری ڈوز دے رہے تھے۔ اسی دوران میری اور ان کے درمیان گھوڑوں کے بابت لمبی گفتگو ہوئی جس میں ہم دونوں گھوڑوں کی تندرستی پر خوش ہو رہے تھے۔ یہ ساری گفتگو منیب خان نے سن لی۔ جیسے ہی کھڑکی سے باہر میں نے اسے کھڑے دیکھا ہم دونوں اسے کو پکڑنے کے لیے بھاگے۔ مین گیٹ کے اختتام سے پہلے ہی مدثر اور میں اسے پکڑ لیا۔ وہ پتلا ضرور تھا مگر طاقت ور تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی، جب ہی مزاحمت میں ڈاکٹر صاحب بھی آگے بڑھے۔

منیب نے پاس پڑا لکڑی کا ڈنڈا اٹھا کے ڈاکٹر صاحب کے سر میں دے مارا جس سے وہ بری طرح زخمی ہو گئے مگر مدثر اور میں نے اسے چھوڑا نہیں۔ ہم اسے گھسیٹتے ہوئے کوارٹر کے اندر لے گئے اور سٹور روم میں کرسی پر باندھ دیا۔ اس کے منہ پر زور سے کپڑا کسنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے تو پتہ چلا تو وہ درد سے نڈھال ہو رہے تھے۔ تب میری حالت غیر ہو گئی اور مجھے سمجھ نہیں آئی تو میں نے تم کو فون کر دیا۔"

مہابت خان نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا دی۔ اس نے گہری سانس لی۔

"تو اسے سب معلوم ہو گیا ہے۔"

"مگر فکر کی بات نہیں میم۔ وہ کسی کو بتا نہیں پائے گا۔ اس کا فون میرے پاس ہے۔" مہمت نے منیب خان کا فون پینٹ کی جیب سے نکال کر دکھایا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ فون ان سے لے لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک نوکیا موبائل تھا۔

"ہوں۔" اس نے سر کو خم دیا۔

"وہ ہم پہ نظر رکھ رہا ہے عبادہ بچے۔ اس کو پتہ ہے ہم کیا کر رہے ہیں۔" مہابت خان نے سراسیمہ انداز میں کہا۔

"میں نے آپ دونوں کو منع کیا تھا ناں کہ بہت احتیاط سے کام لینا ہے؟ آپ لوگ کیسے اتنے آرام سے اتنا حساس معاملہ کھلے عام ڈسکس کر سکتے ہیں؟" وہ خفگی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ملامتی نظروں سے دیکھا پھر سر پشیمانی سے سر جھکا دیے۔

"ہمیں اندازہ نہیں تھا میم کہ وہ ہماری چوکیداری کر رہا ہے۔ یہاں اتنے سارے ملازم ہیں۔ کون کب کیا کر رہا ہے۔ سب پہ بیک وقت نظر رکھنا مشکل کام ہے۔" مہمت نے جواز رکھا۔

"منیب خان کے بارے میں، میں نے آپ کو مطلع کر دیا تھا ڈاکٹر صاحب۔ کم از کم اس کے

معاملے میں آپ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔'' وہ ناراضی سے کہہ رہی تھی۔ مہمت نے سر جھکا دیا۔ دونوں نے گھوڑوں کی تندرستی کی طرف پیش رفت دیکھی تو جوش سے بہت کچھ کہہ گئے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، شاید انہیں یہ محاورہ اس لمحے بھول گیا تھا۔

''مدثر کہاں ہے کاکا۔ وہ بھی تھا ناں آپ لوگوں کے ساتھ؟'' اس نے پوچھا۔

''اسی کو اس بدمعاش کی چوکیداری کے لیے کھڑا کیا ہے۔''

''اور وہ بدمعاش کہاں ہے؟''

''سٹور والے کمرے میں۔''

''میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔'' وہ یکدم کھڑی ہوگئی۔ مہابت خان چونک گیا۔

''مل کر کیا کروگی بچے، جب ہم ساری سچائی جان چکے ہیں۔'' مہابت خان نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ زہر وہ کیسے لایا تھا۔ جہاں تک میں اور ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں۔ یہ سیرم پاکستان میں موجود نہیں۔ اگر وہ باہر سے لایا ہے تو کس ملک سے؟''

''کیا وہ بتا دے گا آپ کو میم؟'' مہمت نے پوچھا۔

''اسے بتانا ہی پڑے گا۔'' وہ پرعزم انداز میں بولی پھر اس نے مہابت خان کو دیکھا۔

''کاکا۔ آپ کا رائفل کہاں ہے؟''

''کمرے میں.....'' وہ ٹھٹک گئے۔ ''کیوں؟''

''اگر اس بدمعاش سے کچھ اگلوانا ہے تو ہتھیار کا استعمال کرنا پڑے گا۔ آپ کو چلانی تو آتی ہے ناں۔'' وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ آتا تو ہے۔'' وہ قدرے جھینپ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ مہابت خان کے ساتھ بالائی منزل پر آئی۔ بیٹھک سے ملحق سٹور روم کے سامنے مدثر پستول لیے کھڑا تھا۔ ان کو آتا دیکھا تو ایک طرف ہو گیا۔ عبادہ چل کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''یہاں ہے؟''

''جی۔'' مدثر نے کہا۔

''کھولو۔'' وہ فاصلہ چھوڑتے ہوئے ایک طرف ہوئی۔ مدثر نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی اور دروازے کو ہاتھ سے ہلکا سا دھکیلا۔ باہر کی روشنی کا تیز عکس فرش پہ گرا تو ان تینوں کا سایہ وہاں ابھرا۔ مدثر ایک طرف ہو گیا، وہ اندر چلی گئی۔ اس کے بعد دونوں اندر آئے۔ داخل ہونے کے بعد مدثر نے دروازہ بند کر دیا اور کمرے کی لائٹ جلائی۔

زرد بلب کی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ اسے منیب خان کمرے کے کونے میں پیٹیوں اور ٹرنکوں کے پیچھے دبکا دبکا سا نظر آیا۔ وہ کرسی پر رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ منہ پر موٹا سا کپڑا تھا جس کی وجہ سے مزاحمت کرتے ہوئے اس کی آوازیں گھٹ گھٹ کر نکل رہی تھیں۔

کمرے میں ناقابلِ برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جا بجا پڑی صندوقوں، پرانی پینٹنگز، ٹوٹے فرنیچر اور مٹی سے اٹے کارپٹ پڑے ہوئے تھے۔ کمرے کے کونوں سے بڑے بڑے مکڑی کے لٹکے جالے اسے پراسرار بنا رہے تھے۔ یہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی کمرہ نہیں تہہ خانہ ہو۔

وہ خراماں خراماں چلتی آگے آئی۔ منیب خان کے سامنے موجود پیٹیوں اور کارٹن کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا۔ سامنے والا عرشہ خالی ہوا تو اسے دیکھ کے منیب خان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ مزید خود کو کھینچ کھینچ کر مزاحمت کرنے لگا۔

عبادہ نے دوسری طرف موجود کرسی کھینچی، پھونک مار کر دھول چھانٹی پھر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا

کر بیٹھ گئی۔اس کے انداز میں ایک چمک تھی۔منیب خان پوری قوت سے اپنے آپ کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی سعی دیکھ کے عبادہ مسکرائی۔"کوشش کرتے رہو۔پولیس کی ہتھکڑیاں لگنے تک شاید تم ان رسیوں کو کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

اس نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔وہ سرتاپا پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔گریبان کے بٹن کھلے تھے،گردن پر تشدد کے نشان تھے۔عبادہ مطمئن انداز میں آگے ہوئی۔

"تمہارا اور تمہارے خان کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے منیب خان۔میں اور میرے ساتھ موجود کئی لوگ یہ بات جان گئے ہیں کہ تم نے گھوڑوں کو Immunity Destructor Serum دیا ہے جس کا اثر برقرار رکھنے کے لیے تم تاحال ہر روز ایک ایک ٹیکہ اسے لگاتے ہو۔تم نے گھوڑوں کی جھوٹی رپورٹس بنائیں تاکہ علاج کے لیے آنے والا ہر ویٹ کنفیوز ہو سکے اور گھوڑوں کا علاج نہ کر سکے۔"

اس کی مزاحمت تھم گئی۔چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

"یہ سب تم نے اپنے خان کے کہنے پر کیا کیوں کہ آف کارس۔تمہاری ذاتی دشمنی تو نہیں ہو سکتی گھوڑوں سے۔اس لیے منیب خان....." وہ رکی،اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔"اب جب کہ تمہاری ساری سچائی میں جان چکی ہوں تو مجھے ایک سوال کا جواب دو گے۔تم یہ سیرم کہاں سے لائے تھے۔یہ پاکستان میں موجود نہیں ہے۔کس ملک سے لائے ہو۔کس ویٹ ہسپتال یا لیبارٹری نے تمہاری مدد کی ہے۔تم سب سچ سچ بتاؤ گے۔"

ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے اس کے منہ سے کپڑا نیچے کر دیا۔اس نے سر کو جھٹکا دے کر پیچھے کیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

''تمہیں لگتا ہے میں تمہیں بتاؤں گا؟'' وہ کمینگی سے مسکرایا۔

''تم ضرور بتاؤ گے۔'' عبادہ نے اطمینان سے کہا پھر ہاتھ سے مدثر کی طرف کچھ اشارہ کیا۔ دفعتاً مدثر اور مہابت خان نے پکڑی رائفل اور بندوق لوڈ کر لیں اور جھٹ سے دونوں کی نال عین منیب خان کے سینے پر تان لیں۔ وہ غش کھاتے کھاتے رہ گیا۔ اس نے وحشت سے عبادہ کو دیکھا۔

''تمہیں لگتا ہے ناں کہ تم اور تمہارا وہ خان بہت بڑے چالباز ہیں۔ تم لوگ پیٹھ پیچھے ایسی چالاکیاں کرو گے اور ہم بے چارے لوگ اسے تم دیہاتی لوگوں کے کم عقلی یا لاشعوری کا نام دے کر یہاں سے سے چلے جائیں گے، کوئی ایکشن نہیں لیں گے۔ چھ گھوڑے مریں یا چھ سو۔ کسے پرواہ ہے؟ رائٹ؟'' وہ رکھائی سے بول رہی تھی۔

''مگر یہ تم لوگوں کی بھول ہے۔ ہم نے یہ جانوروں کا پیشہ شغل کے لیے نہیں اپنایا تھا منیب خان۔ ہم نے ایک عہد لیا تھا کہ جب تک ہمارے بس میں ہوگا ہم ہر جانور کی قیمتی زندگی بچاتے رہیں گے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کتنی ہی اذیت کیوں نہ سہنی پڑ جائے۔ تمہیں کیا لگا۔ تم لوگ مجھے ٹریپ کرو گے۔ تم مرے ہوئے گھوڑوں کی جھوٹی رپورٹس لاؤ گے اور یوسف خان کو دکھا کر کہو گے کہ دیکھو یہ ڈاکٹر کتنی ان پڑھ، جاہل اور بچگانہ ہے اور میں اناپہ چوٹ کھالوں گی، وہاں سے فی الفور رفع دفع ہو جاؤں گی؟ جناب۔ تم لوگوں نے مجھے بہت ہلکا لیا تھا۔ میرے یہاں رکنے کا جواز بلاشبہ کوئی اور ہو مگر دل ہی دل میں، میں واقعتاً اس معاملے کی تحقیق کرنا چاہتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ گھوڑوں کو کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ہوں ناں۔ نئی بیماریوں کے بارے میں جاننے کا تجسس ہمارے خون میں ہوتا ہے۔''

آخری جملے پر اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس کی بات پر منیب خان کا شیطانی قہقہہ گونجا۔ وہ گلا پھاڑ کے زور زور سے ہنس رہا تھا۔

''کیا فائدہ ہوا اتنا سب جان کر ڈاکٹرنی؟ کیا کرلوگی تم۔ہاں۔زیادہ سے زیادہ ہمیں گرفتار کرالوگی۔پھر۔تمہیں لگتا ہے خان جی ہمیں جیل میں رہنے دیں گے؟ ایک سردار کو جیل میں رہنے دیں گے۔سوچ ہے آپ کی۔'' وہ استہزائیہ انداز سے بولا۔

''منیب خان! مجرم ان لوگوں کی جیلوں سے نکلتے ہیں جن کی مدعیت کمزور ہوتی ہے۔تمہاری مدعی میں ہوں۔یہ کیس میری اور میرے ہسپتال کی مدعیت میں درج ہوگا۔اگر میں نے تمہاری حویلی میں رہ کر،تم لوگوں کے درمیان تمہیں پکڑ لیا ہے تو اندازہ لگا لو۔میری مدعیت کتنی مضبوط ہوگی۔'' وہ دھونس سے گویا ہوئی۔

''مدعیت۔'' وہ طنز سے ہنسا۔''ڈاکٹرنی۔تم ہوشیار ہو مگر میرے خان نے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ایک ذرے (انگوٹھے اور انگلی کو ملایا) برابر بھی نہیں۔تم کیسے ثابت کروگی کہ یہ سب اس نے کیا ہے۔(اس کی آنکھوں میں دیکھا،عبادہ مسکرائی) میں؟ بے فکر رہیں۔میں کبھی منہ نہیں کھولوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

عبادہ نے ہاتھ پھیلایا،مدثر نے پستول اس کے ہاتھ میں رکھ دیا پھر مدثر نے اپنی آستینیں چڑھائیں اور مٹھیاں بھینچ لیں۔مدثر کو تاؤ کھاتے ہوئے دیکھ کر منیب خان کا رنگ فق ہوا۔

''یہ.....کیا.....کیا کرنے والا ہے.....'' وہ بوکھلا گیا۔

''تمہارا منہ کھولنے والا ہے۔'' عبادہ سرد مہری سے بولی۔

''نن.....نہیں.....'' اس سے پہلے کہ وہ منہ زور احتجاج کرتا،مدثر نے کپڑا اس کے منہ پر چڑھا دیا۔اگلے ہی لمحے وہ پوری وقت سے اس پر مکے،تھپڑ،گھونسے اور لاتیں برساتا رہا۔عبادہ اطمینان سے دیکھتی رہی۔اس کی کرب بھری دبی دبی چیخیں نکل رہی تھیں۔پے در پے ہونے والے تشدد نے اس دبلے پتلے وفادار ملازم کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔مدثر کسرت پوری کر کے پیچھے ہوگیا۔

منیب خان ادھ موا ہو چکا تھا۔ عبادہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا۔ وہ بے دم انداز میں آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

''اب بتاؤ..... کیسے کیا اور کب کیا۔'' ٹھنڈے انداز میں پوچھتے ہوئے اس نے اپنا فون نکالا اور کیمرہ آن کرلیا۔ وہ اس کی ویڈیو بطورِ ثبوت ریکارڈ کرنے لگی۔ منیب خان نے ہانپتے ہوئے تھوک نگلا۔

''یہ دوا میں..... میں نہیں لیا..... خان جی..... خان جی کے دوست نے بھیجی تھی۔ لندن سے۔ وہاں کوئی بڑی لیبارٹری ہے جہاں یہ دوائی بنتی ہے۔ انہوں نے منگوائی اور میں نے لگادی۔ اب بھی انہی کے کہنے پر لگاتا ہوں۔ آج بھی لگانے آیا تھا مگر ڈاکٹر اور مہابت خان کی باتیں سن لیں۔''

''لندن کی کس لیبارٹری سے لائے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں معلوم۔'' وہ منکر ہو گیا۔

''او کے۔'' عبادہ نے سر ہلایا پھر پینٹ کی جیب سے اس کا فون نکالا۔ ''یہ لو۔ اپنے خان کو فون ملاؤ اور اس سے پوچھو۔ یہ دوائی کہاں سے لایا تھا۔ کس نے دی تھی اور کس کے کہنے پر یہ دوا منگوائی تھی۔ اس کے پاس اتنی معلومات خود تو نہیں ہوں گی یقیناً.....''

منیب خان نے فون تھام لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھے پر کلائیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی مدد سے اس نے نمبر ملایا۔

''سپیکر پہ کرو۔'' عبادہ نے برہمی سے کہا۔ اس نے سپیکر کا بٹن دبا دیا۔ گھنٹیاں جا رہی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ پولیس کی ملی بھگت سے ابتہاج اور منیب دونوں چھوٹ جائیں گے۔ منیب خان نے یہاں منہ نہیں کھولا تو پولیس سٹیشن میں کھولنے کے بعد وہ جھوٹا بیان دے گا۔ پولیس ایک مہتر کے بیٹے کو مجرم نہیں مانے گی۔ منیب خان جو اس کا بڑا گواہ ہے۔ اگر وہ منکر ہو گیا تو وہ چاہ کر بھی ابتہاج کو

گرفتار نہیں کر پائے گی۔ پولیس تو شاید اس پر تشدد بھی نہ کرے۔ اوپر سے وہ لاہور سے تھی۔ ایک الگ صوبہ۔ پولیس اسے یہ کہہ کر بھی خاموش کرا سکتی تھی کہ مادام آپ نے مجرم ہمارے حوالے کر دیے۔ اب آپ جائیں۔ ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔ اس صوبے کے قوانین آپ نہیں جانتیں۔ آپ کا کام تھا نشاندہی کرنا۔ آپ نے کر دی۔ مقدمہ بھی درج کرا دیا۔ اب آپ مہربانی کریں لوٹ جائیں۔ تب وہ کیا کرے گی؟ کس حق سے رکے گی؟ وہ جانتی تھی کہ اس کے یہاں سے جانے کے بعد فوراً ابتہاج اور منیب خان رہا ہو جائیں گے۔ پھر کوئی فائدہ ہوگا اس کی محنت کا؟ اسے ایسے ٹھوس ثبوت پیدا کرنے تھے کہ چاہ کر بھی ابتہاج اور منیب خان بری نہ ہو سکیں۔ وہ حوالات تک نہیں، اس کیس کو عدالت کی راہداریوں تک لے کے جانا چاہتی تھی۔

فون اٹھا لیا گیا۔ ایک رعب دار آواز آئی۔

"منیب۔ کہاں ہو تم۔ تمہیں پتہ ہے ناں کہ تم ہی عبادہ اور گل کو شندور لے کر آؤ گے؟ کہیں تم بھول تو نہیں گئے؟" وہ بہت برہم ہو رہا تھا۔ عبادہ آواز سن کے ٹھٹک گئی۔ دل میں کچھ کھنکھایا۔

"خان جی مجھے یاد ہے سب....."

"شکر ہے....." ایک ٹھنڈی سانس آئی۔

"خان جی وہ..... وہ..... مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔" اس نے ہمت مجتمع کی۔ عبادہ نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر اس کے منہ کے قریب پکڑ لیا اور کھڑی ہو گئی۔

"کیا پوچھنا تھا؟ جلدی پوچھو۔" وہ اکتاہٹ سے بولا۔ عبادہ آواز سے بری طرح الجھ رہی تھی۔

"خان جی۔ آپ نے وہ زہر والا ٹیکہ کہاں سے منگوایا تھا؟"

"کیوں۔ تم نے گما دی ہیں کیا؟ اللہ۔ دو دن ہی تو رہ گئے ہیں سرداری میں۔ تم ذرا صبر نہیں کر سکتے تھے۔ جانتے ہو وہ کتنی قیمتی ہیں؟ کتنی مشکلوں سے ملی تھیں۔ میں نے کہا تھا سمجھ کر

استعمال کرنا لیکن لگتا ہے تم نے قسم کھائی ہے مجھے زِچ کرنے کی۔'' وہ بری طرح خفا ہو رہا تھا۔ دور کہیں عبادہ کے دل میں گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ یہ آواز۔ یہ آواز مختلف کیوں تھی؟

''آپ زحمت مت کریں خان جی۔ میں منگوالوں گا۔''

''اوہ۔ اس کا مطلب تم نے واقعی گمادی ہیں۔ منیب خان الو کے پھٹے۔ ذرا سی چیز نہیں سنبھلتی تم سے.....''

''خان جی میں لے آؤں گا۔''

''لے آؤ گے۔ لندن میں تمہارا باپ بیٹھا ہوا ہے جو تمہیں لا کر دے گا؟ یا تمہاری ماں ائیر ہوسٹس ہے وہاں؟'' وہ گرج رہا تھا۔ عبادہ کے ہاتھ میں موجود فون کانپنے لگا تھا۔ مہابت خان اور مدثر البتہ اطمینان سے سن رہے تھے۔

''معذرت چاہتا ہوں خان جی۔'' وہ مسمسی سے آواز میں بولا۔

''خیر۔ رہنے دو منیب خان۔ ویسے بھی دو دن ہیں۔ دو دن میں وہ ٹھیک نہیں ہو سکتے اور ہو بھی گئے تو کیا۔ اب کسے فرق پڑتا ہے۔ ہونہہ۔'' وہ کروفر سے کہنے لگا پھر قدرے توقف کیا۔ ''اچھا۔ تم کہاں ہو۔ میں نے تم سے جو کہا تھا۔ وہ یاد ہے ناں؟''

''جی خان جی.....''

''ٹھیک ہے۔ اسی کے لیے فون کر رہا ہے۔'' وہ شاید فون رکھنے والا تھا۔

''خان جی وہ.....'' منیب خان نے تیزی سے کہا۔

''ہاں۔ بولو۔''

اس کا حلق خشک ہوا۔ اس نے عبادہ کو دیکھا پھر تھوک نگلا۔

''میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹرنی اصطبل آتی جاتی ہے۔ کل بھی آئی تھی۔ آج بھی آئی تھی۔

کہیں وہ کچھ کر نہ دے۔"

"کیا وہ گھوڑوں کو دیکھنے گئی تھی؟" وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں خان جی۔"

"پھر کیوں ڈر رہے ہو۔ جب تک وہ گھوڑوں سے دور ہے ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" وہ مطمئن تھا۔ عبادہ کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

"اگر اس نے پہنچا دیا تو ہم کیا کریں گے؟"

"تم ڈر رہے ہو منیب خان؟" ایک نونٹ بھرا جملہ تھا۔

"جی خان جی۔"

"بے فکر رہو بچے۔ یہ غاذان خان کا کھیل ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو بھنک تک نہیں پڑ سکتی۔ وہ لڑکی چاہے کچھ بھی کر لے۔ کہیں بھی چلی جائے۔ کسی سے بھی مدد لے لے۔ وہ مجھے منظر عام پر نہیں لا سکتی۔"

کتنا سکون بھرا لہجہ تھا۔ کتنا مطمئن تھا وہ شخص۔ عبادہ کے پیروں تلے ایک کے بعد ایک سرنگ پھٹتی چلی گئی۔ وہ اپنے ہی قدموں پر لڑکھڑا گئی۔ بے یقینی، نا اعتباری، مان، بھروسہ سب کی دیوار چھناکے سے ٹوٹی تھی۔ روح کی، جسم کی کرچیاں فرش پہ جا بجا پھیل گئی تھیں۔ یہ زمین، یہ فرش، یہ جہاں۔ اتنا ٹھنڈا کیوں تھا۔ وہ سٹور روم میں تھی پھر ایسا کیوں لگ رہا تھا وہ کسی برف خانے میں ہے؟ چاروں طرف زمہریر پھیلا ہوا ہے۔ برف تہہ در تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے۔ کیوں اپنا وجود کسی برفیلی جھیل میں تیرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کمرے کے پردے اسی طرح ہل رہے تھے۔ وہ پائنتی سے ٹیک لگا کر عالیہ اور عبادہ کی باتوں

کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ذہن بری طرح منتشر تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس وقت اسے خود میں توانائی کی شدید کمی محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے سر میں بے پناہ درد کی ٹیس پہ ٹیس اٹھ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ جب احتشام کے منہ سے سچائی سنی تھی تب دل کیا تھا کاش جہانگیر زندہ ہوتا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کو مار دیتی۔ اسے جہانگیر سے جتنی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ شاید ہی کسی سے ہوئی تھی۔ مگر وہ بدنصیب اپنے مقدر کا لکھا پا چکا تھا۔ اس کی موت اس کے ہاتھوں لکھی ہی نہیں تھی۔ اس کی موت تو غرق ہونے میں لکھی تھی۔ تب دل کو تسلی ہوئی کہ چلو وہ جس کا بدلہ نہیں لے سکی۔ اللہ نے لے لیا۔ اس کی لاش کو مچھلیوں نے بری طرح نوچا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دیدار کے لائق تھا نہ اس کا جسم۔ اس کے جبر پر قدرت نے اسے بھی اندوہناک موت دی تھی۔ کوئی غم نہیں تھا کہ اس کو اپنے ہاتھوں سے سزا نہیں دے سکی مگر اب..... اب تو ساری کہانی کھل گئی تھی۔ اس کا حقیقی دشمن۔ اس کے باپ کا سچا قاتل زندہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کیا وہ اب اس کے لیے ویسا نہیں سوچے گی جیسا اس نے جہانگیر کے لیے سوچ رکھا تھا؟ کیا اس کے اندر کا وہ غصہ ختم ہو گیا تھا؟ کیا وہ اپنے چچا کو معاف کرنے والی تھی؟

اس کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ گل تم بزدل نہیں ہو۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو مگر تم فی الوقت رستم کی وجہ سے بہت پریشان ہو۔ اتنی پریشان کہ تمہیں اپنے باپ کا قاتل تک نظر نہیں آ رہا۔ تم سمجھ رہی ہو کہ تم کمزور ہو گئی ہو۔ جب تک تمہارے پاس رستم تھا تمہیں ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ ایک تسلی تھی کہ بابا کا سب سے بیش بہا تحفہ تمہارے پاس ہے۔ اب جب کہ وہ چلا گیا ہے تو تم سمجھنے لگی ہو کہ زندگی کا مقصد ہی ختم ہو گیا ہے۔ یہ بات قابلِ یقین تھی کہ دل سے چاہے جانے والے جانور کا جدا ہونا انسان کو توڑ دیتا ہے مگر ایسے موقع پر جب کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ لے سکتی تھی، وہ رستم کا غم سہنا چاہتی تھی؟ کیا رستم کا غم بابا کے بدلے سے زیادہ اہم تھا۔ عبادہ نے کہا کہ رستم جہاں جائے گا سلامت

رہے گا۔ہاں۔وہ مانتی تھی۔کون اسے کیوں جان سے مارنا چاہے گا۔اس کے لیے یہی کافی ہونا چاہیے تھا کہ رستم سلامت تھا۔اس کے بابا کی طرح دنیا میں نہیں تھا۔کیا وہ رستم کا غم سینے سے لگا کے اپنے ہاتھوں آئے اس سنہرے موقع کو کھونا چاہتی ہے؟

اس کا ذہن خالی تھا۔آنکھیں ویران تھیں۔وہ ٹکٹکی باندھ کر فرش کو دیکھ رہی تھی۔عالیہ گودائی کی باتیں اس کے ذہن کے پردوں پر فلم کی طرح ابھر رہی تھیں۔''وہ اپنا مقام واپس لینے آیا ہے۔وہ مقام جو اس کا تھا۔وہ حصہ جو جائیداد میں اس کے نام تھا۔''

''وہ تمہارا سسر بن جائے گا۔اس کی اپنی بیوی مر چکی ہے گل۔اس کی خدمت کرنے کے لیے تم بچ جاؤ گی۔کیا تم چاہتی ہو کہ جس شخص نے تمہارے باپ کو مارا ہو،تم اس کی بہو بن کر اس کی خاطر مداریاں کرو؟ اس کے حکم مانو؟ وہ تمہارے سامنے اس حویلی میں سردار کا باپ ہونے کے ناطے دندناتا ہوا پھرے گا۔تمہاری ماں جو جانتی ہی نہیں کہ اس کا دیور قاتل ہے۔وہ تو جی حضوریاں کرلے گی مگر تم گل۔زہر کو شناخت کرنے کے بعد کیسے پیو گی؟ اس کی کڑواہٹ کو اپنے حلق سے کیسے اتارو گی؟''

وہ سوچ رہی تھی۔کیا وہ اپنے باپ کے قاتل کو چائے پانی پیش کر سکے گی؟ کیا وہ اپنے باپ کے قاتل کی خدمتیں کر سکے گی؟ یہ جانتے ہوئے کہ اس نے کس قدر بے رحمی سے اس کے باپ کو مارا تھا وہ ان کے ہر چھوٹے بڑے کام کر سکے گی؟ سب سے بڑھ کر کیا وہ اسے ''بابا جان'' کہہ سکے گی؟ اس کے سب سوالوں کے جواب ''نہیں'' میں نکل رہے تھے۔یہ مشکل تھا۔بہت مشکل تھا۔وہ کچھ بھی کر سکتی تھی لیکن نعیم کو اپنے سامنے قبول نہیں کر سکتی تھی۔وہ اپنے باپ کے قاتل کو بابا جان نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ اٹھی۔اس کے قدموں میں نقاہت تھی۔ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔اس لمحے اسے ڈگمگانا نہیں

تھا۔اب وقت آچکا تھا کہ اپنے باپ کے قاتل کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔اب وقت نے اسے موقع دیا تھا۔وہ موقع نہیں گنوا سکتی تھی۔اتنے سال جس لمحے کا انتظار کیا تھا، وہ بالآخر آ گیا تھا۔اس نے خود کو ڈھارس بندھائی کہ رستم نہ سہی مگر وہ اپنے باپ کے قاتل کو سزا دلوائے گی۔رستم کو حاصل کرنے میں بھلے ہی ناکام ہو جائے مگر وہ اپنے باپ کے قاتل کو ختم کرنے میں ضرور کامیاب ہو گی۔کل تک اس کے مقاصد میں پولو پلیئر بننا شامل تھا۔آج اس کا مقصد بدل گیا تھا۔بریخنہ نے کہا تھا کہ قلم اور بندوق میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔اس نے دونوں کا کیا تھا۔

وہ واش روم گئی۔واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔چہرہ زرد تھا آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔وہ دو راتوں سے شدید ڈپریشن میں تھی۔اس نے اپنی خوراک، آرام اور صحت کا بالکل بھی خیال نہیں رکھا تھا۔اس کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔اس نے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے پھر بیسن کے کنارے ہتھیلیاں جما کر خود سے ایک بار پھر پوچھا۔کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟ دل دھڑکا۔دماغ میں ان دیکھا سا خوف آ گیا۔اس نے بے اختیار آئینے کی طرف نظر اٹھائی۔کیا وہ گھبرا رہی تھی؟ کیا اسے ڈر لگ رہا تھا۔اس نے خود سے دوسرا سوال پوچھا۔اس مقام پر کیا اسے ڈرنا چاہیے تھا۔کیا بابا نے یہی سکھایا تھا کہ گل لالہ تم بہادری کے امتحان میں ہمیشہ لڑکھڑا جانا۔دلیری کی چوکھٹ پر بزدل بن کر کھڑی رہنا۔اپنا حق حاصل کرنے کے لیے آواز اٹھانے کی بجائے خاموشی اختیار کرنا؟ نہیں۔بابا نے یہ نہیں سکھایا تھا۔بابا نے سر اٹھا کر جینا سکھایا تھا۔ڈنکے کی چوٹ پر اپنا حق چھیننا سکھایا تھا۔تو وہ.....؟ نہیں ڈرے گی۔

اس نے کناروں سے ہاتھ ہٹائے اور اپنے گیلے چہرے کو پونچھ لیا۔اب وہ یہ قدم اٹھائے گی۔جو ہو گا دیکھا جائے گا۔جس نے جو کرنا ہے کر لے۔اب وہ نہتی ہو کر سب سے لڑے گی۔

☆.....☆.....☆

عشاء کے بعد وہ اپنے بالکونی والے راستے کے ذریعے حویلی سے نکل گئی تھی۔اسے شاہ سردار سے ملنے جانا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ اسے عالیہ گودائی کی باتوں پر شبہ ہو رہا تھا جس کی تسلی کرنے کے لیے وہ شاہ سردار سے زبان زدِ خود سننا چاہتی تھی بلکہ انہوں نے تو اس کے ہر سوال کا جواب دے دیا تھا۔کلیم کی موت کے حوالے سے اس کے ذہن میں ابھرنے والے تمام فلسفیانہ،تحقیقانہ اور سنجیدہ سوالوں کے جواب وہ جان گئی تھی۔وہ شاہ سردار سے اس لیے ملنا چاہتی تھی تاکہ وہ ان کو لے کر چترال جائے اور نعیم کے خلاف ایف آئی آر کٹوالے۔اگرچہ اس کے پاس رستم کو حاصل کرنے کا کوئی منصوبہ یا طریقہ نہیں تھا مگر نعیم سے وہ اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔چوں کہ اس کو بریخنہ نے بہت اصرار کر کے اس جھمیلے میں پڑنے سے روکا تھا۔اس لیے وہ براہِ راست ہتھیار اٹھا کر اپنے اندر کی بھڑاس نہیں نکال سکتی تھی مگر جب ملک میں قانون موجود تھا۔اس کو حشام کی شکل میں ایک قانونی سہولت کاری بھی مل رہی تھی تو وہ کیوں اپنے ہاتھ اس وحشی کے خون سے رنگتی؟

کیسی بدقسمتی ہوتی ہے ناں وہ جب ہم اپنے ماں باپ کو اس مقام پر پہنچا دیں جہاں ان کو ہمیں صفائیاں دینی پڑ جائیں،ہم سے معافیاں مانگنی پڑ جائیں۔وہ بریخنہ کو اس مقام پر نہیں لانا چاہتی تھی مگر سچائی جاننے کے بعد وہ self denial یعنی (خود استرداد) کا شکار تھی۔وہ اٹھارہ سال سے اپنی ماں کو ہر چیز کا ذمہ دار مانتی ہوئی آئی تھی۔اب اچانک خود کو قصوروار کیسے مان سکتی تھی؟اس کے ساتھ ہوئی ہر زیادتی کے ذمہ دار باقی لوگ تھے مگر اس کی ماں کے ساتھ ہوئی زیادتی کے ذمہ داروں میں گل کا نام بھی آتا تھا۔اب تک وہ خود ان ذمہ داروں میں شمار نہیں کرتی تھی مگر سچائی پتہ لگنے کے بعد وہ خود بہ بخود اس گروہ کا حصہ ہو گئی تھی۔وہ کیوں اس تلخ اور کڑوی حقیقت کو قبول کرتی؟

گل ماں کی بے قصوری کی سچائی جان کر اپنے دل کو کسی ضدی بچے کی طرح بہلا رہی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے،اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔اگر اس کی ماں نے دوسری شادی اتنی مجبوری اور

زبردستی سے کی تھی تو اسے وقت پہ بتا دینا چاہیے تھا۔ (کل سنتی ہی کب تھی ان کی) ہاں۔ یہ دلیل کافی تھی خود کو ہر طرح سے بری کرنے کے لیے۔ اس کی ماں کا پہلے بھی قصور تھا، اب بھی تھا۔ سچائی جاننے کے بعد بھی اس کی ماں نے اس کے لیے مجرم ہی رہنا تھا۔

اس لیے اس نے سوچا کہ وہ قلم کا استعمال کرے گی۔ قلم جو جج کے ہاتھ سے چلتا ہے اور مجرم کو تکلیف دہ سے تکلیف دہ سزا سناتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ نہیں جج کا ہاتھ چلائے گی۔ اس کے پاس گواہ موجود تھے۔ وہ شاہ سردار کی گواہی لے گی، احتشام صاحب کی تحقیقاتی رپورٹس جمع کروائے گی اور اگر اس بار کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ اپنی شامت کا خود ذمہ دار ہوگا۔ جب آر یا پار میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ہمیشہ "پار" کا کرنا چاہیے۔ اپنی زندگی کا طارق بن زیاد بن کر ساری کشتیاں جلانی چاہئیں اور آنے والی تمام آزمائشوں کے سامنے اپنی شمشیر کھول کر، سینہ تان کر کہنا چاہیے۔ "مجھے خوش آمدید کہو۔"

حویلی میں ہمہ وقت گاڑیاں اور ڈرائیور دستیاب ہوتے تھے مگر وہ ان کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی بھی ڈرائیور سے براہ راست خدمات طلب کرنے کا مطلب حویلی کے مردوں کو اپنے ارادوں کی خبر کرنے کے مترادف تھا۔ اس لیے اس نے اپنے فون سے اجمیر کو فون کیا اور جنگل میں بلایا۔ اجمیر یوسف چچا کا داماد تھا۔ اکثر حویلی آتا جاتا تھا مگر حویلی میں اسے کم لوگ ہی پسند کرتے تھے اور جن کو کوئی شکایت نہیں تھی، وہ داماد سمجھ کر اس کی خاطر مدارت کرتے۔ خود اجمیر بدر جہا کوشش کرتا تھا کہ حویلی والوں کے منہ نہ ہی لگے بالکل شاہ سردار کی طرح۔

وہ جنگل کے راستے ہوتے ہوئے، جگنوؤں کے قطعے کو کراس کر کے نشیبی طرف آئی جہاں حویلی کی سڑک کٹ کے گزرتی تھی۔ یہاں سے تھوڑا دور اجمیر کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے اندر کوئی روشنی نہیں جل رہی تھی۔ یہ سیاہ گاڑی یوسف خان نے اسے تحفے میں دی تھی۔ اب اتنا خوددار تو وہ تھا

نہیں کہ سسر کو انکار کر دیتا۔اس لیے بے شرم ہو کر رکھ لی۔وہ خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹے کسی ڈاکو کی طرح گاڑی کی طرف آئی، پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔

اس نے دھیرے سے چہرے سے چادر کا پلو ہٹایا۔اجمیر نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔آنکھ کے پاس موجود زخم بھیانک لگ رہا تھا۔نچلے ہونٹ کے کونے میں کٹ لگا ہوا تھا جہاں تازہ جما ہوا خون لگا تھا۔وہ بہت ماندا ماندا لگ رہی تھی۔

''اجمیر بھائی! کالاش چلیں۔مجھے شاہ سردار سے کچھ بات کرنی ہے۔'' نڈھال سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے سر سیٹ سے ٹکا دیا۔وہ بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔اس کی ذات کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔اجمیر نے کوئی سوال نہیں کیا۔وہ روشانے سے حویلی کے بارے میں وقتاً فوقتاً جانتا رہتا تھا۔اسے علم تھا کہ گل اس وقت کن حالات سے گزر رہی ہے۔اگر اس نے آدھی رات کو خفیہ طور پر بلایا تھا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات تھی مگر اس نے موقع اور وقت کو مناسب نہیں جانا۔اس لیے بغیر کوئی سوال کیے گاڑی کالاش کی طرف بھگا دی۔

وہ چوں کہ رات کو آیا تھا اس لیے اسے آنے اور جانے میں زیادہ وقت لگا کیوں کہ تاریکی میں کالاش کا سفر کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔تیس چالیس منٹ کا سفر انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا تھا۔رات کا ایک بج رہا تھا جب وہ شاہ سردار کے گھر میں پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔علاقے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ گل لالہ نے آدھی رات کو شاہ سردار کے گھر قدم رکھا تھا۔اجمیر اسے بیٹھک میں بٹھانے کے بعد شاہ سردار کو بلانے چلا گیا۔گل بہت بے چین تھی۔احتشام کے گھر جاتے ہوئے جو حالت ہو رہی تھی، ٹھیک وہی حالت اس وقت تھی مگر اس وقت غصہ نہیں تھا۔اس وقت سب سے بڑی فیلنگ ہی ''غصے'' اور ''فرسٹریشن'' کی تھی۔عالیہ کی بات پر اگرچہ اسے یقین تھا مگر شاہ سردار نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا اور جو واقعہ کا شریک ہو، عینی

شاہد ہو، اس کے بیان سے سچائیاں سامنے آئیں تو روح تک چر جاتی ہے۔ اسے ہمت کرنا تھی۔ خود کو حوصلہ دینا تھا۔ اس نے چادر کے پلو سے ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔

وہ جس چارپائی پر بیٹھی تھی، اس کے پیچھے کھڑکیاں تھیں جو فی الوقت بند تھیں۔ انہی کے پار سے گیدڑوں اور جھینگروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بے چینی سے بری طرح اپنی ٹانگیں جھلا رہی تھی جب شاہ سردار دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ بجلی سی تیزی سے کھڑی ہوئی۔

شاہ سردار شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھے اور سفید رنگ کی شال خود کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے تذبذب سے اندر آئے۔ ان کے پیچھے اجمیر اور کبیر بھی تھے۔ اندر آنے کے بعد انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔

''گلِ لالہ.....'' شاہ سردار حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثر سے بولا۔ ''اس وقت؟ یہاں؟ سب خیریت ہے؟ تم ٹھیک ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے ان کو دیکھتے ہوئے گھائل لہجے میں کہا۔ وہ بے چینی سے قریب آئے۔

''کیا ہوا میرے بچے؟ کھوواروں نے کچھ کیا ہے؟ یوسف خان نے کچھ کہا ہے۔ کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ۔''

''بابا! اسے بیٹھنے دیں۔ ہم تسلی سے بات کر لیتے ہیں۔'' کبیر نے مفاہمت سے کہا۔ شاہ سردار نے سر ہلایا۔ گل واپس چارپائی کے کنارے ٹک گئی۔ کبیر اور اجمیر بھی الجھے الجھے سے ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

''مجھے تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے سامنے والی چارپائی پر براجمان ہوتے ہوئے کہا

''میں .....آپ کو لینے آئی ہوں کاکا۔ میں چترال جا رہی ہوں اپنے بابا کے قتل کیس کی رپورٹ لکھوانے اور ان کے قاتل کا اریسٹ وارنٹ نکلوانے۔ آپ کو اپنے ساتھ بطورِ گواہ لے کے

جانا چاہتی ہوں۔آپ چلیں گے ناں؟''اس نے ایک ہی سانس میں کہتے ہوئے انہیں دیکھا۔شاہ سردار کو چپ لگ گئی۔وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

''بتائیں کاکا۔چلیں گے ناں؟''اس نے بے تابی سے پوچھا۔

انہیں ایک لمحے کے لیے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہیں۔وہ بری طرح لاجواب ہو گئے تھے۔گلِ لالہ کو کیسے پتہ چلا کہ اس کے باپ کا قتل انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔آج تک بی جان، یوسف خان اور سرور خان کے علاوہ کوئی نہیں جان پایا تھا۔گل کو کیسے معلوم ہو گیا؟ کیا ان میں سے کسی نے بتایا تھا۔اگر ہاں تو اب تک گلِ لالہ چپ کیوں تھی؟ اگر چپ تھی تو اب کیوں آئی تھی؟

انہوں نے دوبارہ اسے دیکھا۔گل امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔آنکھیں نم تھیں اور آواز بوجھل۔لفظوں میں لمبی مدت کی تکان تھی۔

''تمہیں.....کس.....نے.....بتایا کہ.....میں.....''انہوں نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ہاں۔دیر ضرور ہوئی ہے مگر ابھی بھی دو دن ہیں۔میں ان اڑتالیس گھنٹوں میں اپنے باپ کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتی ہوں۔آپ پلیز میرے ساتھ چلیں۔''

''تم یوسف خان کو بتا کر آئی ہو؟''انہوں نے سوال کیا۔

''کیا انہوں نے مجھے اٹھارہ سالوں سے کچھ بتایا تھا؟''اس نے دوبدو پوچھا۔

''اگر اسے معلوم ہو گیا تو تمہارے ساتھ بہت برا کرے گا گل بچے۔''

''مجھے فرق نہیں پڑتا۔میں اٹھارہ سال سے ان سب کی وکٹم بنتی ہوئی آئی ہوں کاکا۔اب نہیں بنوں گی۔وہ مجھے مزید نہ اس اندھیرے میں رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی مجھے قید کر سکتے ہیں۔میں ہر حال میں یہ ایف آئی آر کٹواؤں گی۔''وہ قطعیت سے کہنے لگی۔

''اور غاذان، کیا وہ تمہیں ایسا کرنے دے گا؟''

''وہ کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا۔ اس کے باپ نے میرے باپ کو جان سے مارا ہے۔ اسے تو اخلاقاً بھی مجھے نہیں روکنا چاہیے۔ اگر اس میں ضمیر نام کی کوئی چیز ہے تو وہ مجھے کبھی بھی نہیں روکے گا اور بہر صورت اس نے ایسا کر بھی دیا تو میں پھر بھی باز نہیں آؤں گی۔ میرے باپ نے مجھے اس لیے نہیں پڑھایا تھا کہ میں زمانے کے رواجوں اور رسموں سے دب جاؤں۔ اس نے مجھے اس لیے پڑھایا تھا تاکہ میں اپنے لیے، ان کے لیے سب کے لیے آواز اٹھا سکوں۔ آج اگر میں اس نہج پر ہوں تو یہ اپنی حویلی والے کے سبب ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے اپنے ہونے والے سسر کو گرفتار کرنے کا مگر وہ میرا سسر بننے سے پہلے میرے باپ کا قاتل بنا تھا۔ اس لیے پہلے اس کی بہو بننے سے پہلے اس کی مدعی بنوں گی۔'' وہ گردن اکڑا کے بے رحمانہ انداز میں بولی تھی۔

اجمیر اور کبیر نے خشک نظروں کا تبادلہ کیا تھا۔ شاہ سردار البتہ اس چھوٹی سی لڑکی کی جرأت دیکھ رہا تھا۔

''آپ میرے بابا کے قتل کے چشم دید گواہ ہیں۔ میں جانتی ہوں اس دن وہ آپ کے ساتھ گھڑ سواری کرنے حویلی سے نکلے تھے اور پرانی کھائی کے پاس آپ نے نعیم اللہ کو انہیں مارتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ ہی نے داجی کو بتایا تھا کہ یہ سب۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' وہ بچوں سی ضد سے انہیں منا رہی تھی۔ شاہ سردار زیر لب زخمی سا مسکرایا۔

''جانتی ہو گل۔ میں اس سلسلے میں کتنی بار کھوواروں کے پاس جا چکا ہوں۔ میں نے کتنی منتیں کی ہیں کہ نعیم کو اس کے کیے کی جو سزا سردار نے دی تھی وہ کم ہے۔ اسے گرفتار کرایا جائے۔'' وہ تکان سے کہتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

''میں خود بھی اپنی پھیروں کا شمار نہیں کر سکتا۔ اٹھارہ سال سے میں ان کی سماجت کر رہا ہوں کہ

تمہیں انصاف دلائیں۔ بریخنہ بھابھی کو انصاف دلائیں۔ وہ ہر بار اپنی بے بسیوں کا راگ الاپنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں میری بات بہت معمولی لگتی ہے۔ اچھا کیا جو تم نے خود آواز اٹھائی۔ میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔ نعیم کو اپنے کیے کی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔'' وہ مستحکم لہجے میں کہنے لگے۔ گل نے انہیں ممنونیت سے دیکھا۔

''شکریہ۔''

''ایف آئی آر کاٹنے کے بعد شکریہ ادا کرنا جب میں اپنے دوست کا پورا حق ادا کر دوں گا۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔ گل نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے سر کو خم دیا۔

☆.....☆.....☆

اس دن میں اپنے گھوڑے کو لے کر کالاش کے کھیتوں کی طرف گیا ہوا تھا۔ دو دن پہلے میری اس سے اصطبل میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ گھوڑوں کی ریس لگانا چاہتا ہے۔ ہم نے دو دن صبح کا وقت طے کیا۔ ہم نے ایون سے کالاش تک مگر جلندھر کی زمین اور دریا کے کنارے کنارے دوڑ لگانی تھی۔ مجھے وقت معلوم تھا۔ اس لیے میں صبح ہی گھوڑے کو لے کر اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ کلیم بھی بلوری کو لے کر آیا ہوگا۔ وہ کافی دِنوں سے بلوری کی کارکردگی کو لے کر پریشان تھا۔ بلوری ٹھیک تھی مگر یکا یک اسے کچھ ہو جاتا تھا۔ یہ ریس دراصل بلوری کا امتحان تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر اس کی گھوڑی سرگرمیوں میں دلچسپی کیوں نہیں لے رہی۔

حادثے کے وقت میں اس سے کافی تھا جب میں نے دیکھا کہ وہ بلوری پر بیٹھ کر بے چینی سے دائیں بائیں ہو رہا ہے۔ گھوڑا ایسا جانور ہے جو کبھی اچانک نہیں مڑتا۔ اس کا گھومنا لمبی گاڑی کی طرح دور سے ہوتا ہے۔ جب یہ چھوٹے چھوٹے موڑ کاٹنے لگ جائے تو اس کے بپھرنے کا خطرہ

ہوتا ہے۔کلیم کو بلوری کے ساتھ گتھم گتھا دیکھ کے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بپھر گئی ہے۔لہٰذا میں نے اپنے گھوڑے کو ہانک لگائی اور اس کی مدد کے لیے بڑھا۔اسی لمحے اس بلوری نے کھائی کا رخ کیا۔میں کلیم کی لگام سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ بلوری کو کھائی کی سمت جانے سے روک رہا ہے مگر بلور لگامیں، باگ اور اپنے قابو کی تمام چیزیں تڑوا کر سرپٹ دوڑ رہی تھی۔میں جانتا تھا کہ کلیم اپنی گھوڑی سے کس قدر محبت کرتا ہے۔وہ قطعی گھوڑی کو نہیں چھوڑے گا۔مگر یہ اس کی بے وقوفی تھی۔اس کی اپنی جان سے زیادہ وہ گھوڑی اہم نہیں تھی مگر ایسا میں سوچ رہا تھا۔وہ نہیں۔وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔میں نے اپنے گھوڑے کو بہت چابک لگائے مگر مجھ سے پہلے کلیم کھائی پہ پہنچ گیا۔میں نے اپنی آنکھوں سے کلیم کو گھوڑی سے کودتے دیکھا تھا۔میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ چلو اس نے کچھ تو عقل استعمال کی۔مجھے لگا شاید بلوری آگے نہ گئی ہو۔کھائی کے سرے کے پاس رک گئی ہو مگر میں نے کلیم کو کھائی کی سمت جاتے دیکھا۔تب تک میں دوسری طرف سے پہاڑی چڑھ چکا تھا۔اس پہاڑی پر چوں کہ ہر طرف درخت، جھاڑیاں اور جنگلی پودوں کے جھنڈ ہیں۔اس لیے میں اور میرا گھوڑا کلیم کو نظر نہیں آئے تھے۔

وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ میں اب پیدل چل کے اس کے پاس جا سکتا تھا۔میں گھوڑے سے کود گیا، گھوڑے کو درخت سے باندھا اور اس سمت بھاگا مگر اس سے پہلے کہ میں وہاں پہنچتا میں نے جہانگیر کو کلیم کے ساتھ ہاتھا پائی کرتے دیکھ لیا۔میں تیزی سے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔میں جانتا تھا کہ اگر جہانگیر یہاں آیا ہے تو ضرور بہت بڑی قیامت آنے والی ہے۔میں نے گردن نکال کر دیکھا تو کلیم جہانگیر کو زمین بوس کر چکا تھا۔میں مسکرایا۔وہ میرے دوست سے نہیں جیت سکتا تھا۔اس وقت تک میں نے نعیم کو نہیں دیکھا تھا۔میں کلیم کی ہمت کی داد دینے، اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھا جب مجھے پستول سے گولی کے سائلنسر سے نکلوانے والی

''شوں ں ں ں'' سنائی دی۔تب مجھے نعیم نظر آیا۔پستول نظر آئی۔کلیم کی پشت نظر آئی۔خون نظر آیا۔بے رحمی نظر آئی اور.....

میں کانپنے لگا۔اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں جاتا۔میرے پاس ہتھیار نہیں تھا۔میں خالی ہاتھ تھا بالکل کلیم کی طرح۔میں جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔گو کہ میں درختوں میں چھپا ہوا تھا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ لیں گے۔لہٰذا میں جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔کچھ دیر گزری تھی۔محض کچھ دیر۔پھر میں نے کہیں گاڑی کے انجن کی گڑگڑانے کی آواز سنی۔میں دھیرے سے اٹھا۔جھاڑیوں کے پار سے کھائی پر نظر ڈالی۔وہاں کوئی نہیں تھا۔میں کھڑا ہو گیا۔میں نے چاروں اور گھوم گھوم کر دیکھا۔کسی ذی النفس کا نشان نہیں تھا۔میں تیزی سے اس طرف گیا۔گرتے پڑتے،روتے بلکتے،کھائی کے سرے پر پہنچا،یہاں وہاں دیکھا۔چند لمحوں میں کلیم کہاں چلا گیا تھا۔ہر طرف ویرانی تھی۔سناٹا تھا۔ژولیدگی تھی۔جب ہی مجھے مٹی پر تازہ گرا خون نظر آیا۔میں سرعت سے اس طرف لپکا۔وہ نم خون بالکل تازہ تھا۔گاڑھا۔سرخ۔چپچپا۔میں نے دو انگلیاں اس خون پر رکھیں،وہ گرم تھا۔میں اٹھا۔پلٹ کر دیکھا۔یہاں وہاں۔کلیم نہیں تھا۔پھر مجھے اپنے پیروں کے ساتھ کچھ نشان نظر آئے۔کسی چیز کو گھسیٹنے کے بعد جو مٹی پر نشان رہ جاتے ہیں کسی راستے کے مانند بالکل ویسے ہی۔

میری چھٹی حس نے الارم دیا۔میں وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا جو حقیقت تھا۔میری ٹانگیں خوف سے لرز رہی تھیں۔میرا پورا وجود پسینہ پسینہ تھا۔میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھائی کے پاس آیا۔میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر مجھے دیکھنا پڑا۔

مجھے بلوری کے ساتھ مسلی ہوئی،کچلی ہوئی،ٹھنڈی پڑی کلیم کی لاش کو دیکھنا پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

پولیس اسٹیشن میں بہت ٹھنڈ تھی۔ایس ایچ او کے آفس میں میز کے پیچھے سربراہی نشست پر ایس ایچ او ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم پھنسا کر میز پر رکھے، آگے کو ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی جب کہ اس طرف ایک کرسی پر شاہ سردار اور دوسری کرسی پر رپورٹ لکھنے والا حوالدار بیٹھا ہوا تھا۔شاہ سردار اپنا بیان قلم بند کروا رہے تھے۔دیوار سے گل لالہ نے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔بازو سینے پر بندھے تھے۔وہ ٹھوڑی گردن سے جوڑے دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھی۔

باہر کرسیوں پر اجمیر اور کبیر دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

''تو کلیم خان کو مارنے کے بعد کھائی سے نیچے پھینکا گیا تھا؟''ایس ایچ او نے پوچھا۔

''ہاں۔''شاہ سردار نے بھاری سر ہلایا۔

''کس نے پھینکا تھا۔نعیم نے یا پھر جہانگیر نے؟''

''نعیم نے۔''

گل نے آنکھیں میچ لیں۔نئے تازہ آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔

''آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ نعیم نے پھینکا تھا۔''ایس ایچ او نے خفگی سے پوچھا۔

''مرنے کے بعد انسان کا جسم بھاری ہو جاتا ہے ایس ایچ او صاحب۔جب کلیم زندہ تھا تب جہانگیر اسے دھکا تک نہیں دے سکا۔مرنے کے بعد اس کے بھاری بھرکم لاش کو کھائی سے پھینکنے زخمی جہانگیر کے بس کی بات نہیں تھی۔یہ ٹھیک ٹھاک۔ہٹا کٹا نعیم ہی کر سکتا تھا۔''انہوں نے پر یقین لہجے میں کہا۔

''ہوں۔''ایس ایچ او نے سر کو جنبش دی۔گل کی ہلکی ہلکی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

ایس ایچ او وقفے وقفے سے سر اٹھا کر اسے دیکھتا جو منہ پر ہاتھ رکھ کے ہونٹ کچل رہی ہوتی تھی۔

''اٹھارہ سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا۔کونسی تاریخ بتائی تھی آپ نے؟''

'' تیرہ جولائی، بروز جمعرات، دو ہزار (۲۰۰۰۔۰۷۔۱۳)''شاہ سردار نے بنا پلکیں جھپکے کہا۔ایسا لگا جیسے اس واقعے کو پیش آئے اٹھارہ سال نہیں، اٹھارہ منٹ ہوئے ہوں۔

''یہ قتل جیسے کہ آپ نے بتایا بدلے کا قتل تھا۔تو جس آدمی کے قتل کے بدلے یہ قتل ہوا۔اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں آپ۔وہ.....کیا نام لیا ابھی آپ نے؟''ایس ایچ او نے آنکھیں میچ کے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔اسی لمحے ٹھپ کی آواز آئی۔

''رمیز گودائی۔''

انہوں نے چونک کر دیکھا۔گل لالہ نے میز پر ایک فائل رکھی تھی۔انہوں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی جو خشک تھا مگر آنکھوں میں بڑی سرد مہری تھی۔

''یہ ہے اس کی فائل۔وہ قتل نہیں۔حادثہ تھا۔''اس نے سپاٹ لہجے میں باور کرایا۔انہوں نے دھیرے سے فائل اٹھائی اور کھولی۔

''یہ کاپی ہے۔اوریجنل میرے وکیل کے پاس ہے۔یہ رہا میرا وکیل۔''اس نے احتشام کا کارڈ میز پر رکھا اور دو انگلیوں سے اس پر ٹیپ کیا۔''اس نمبر پر فون کر کے تسلی کر لیں۔میرا وکیل پشاور سے چترال کے لیے نکل چکا ہے۔کچھ گھنٹوں میں پہنچ جائے گا۔وہ اوریجنل فائل لے کر آ رہا ہے۔''

ایس ایچ او نے متعلقہ فائل بند کر کے پیچھے ایک طرف رکھ دی۔

''میں گلِ لالہ کلیم اللہ۔مقتول کلیم اللہ خان کی بیٹی ہوں اور اپنے والد کی مدعیت میں قاتل نعیم اللہ پر پرچہ کٹانے آئی ہوں۔''وہ سامنے دیکھتے ہوئے خشک خشک انداز میں کہہ رہی تھی۔

''ہم نے رپورٹ درج کر لی ہے مادام۔آپ کے چشم دید گواہ کی گواہی بھی لے لی ہے۔ہم

اریسٹ وارنٹ نکلواتے ہیں۔'' انہوں نے پیشہ ورانہ لہجے میں بتایا۔

''مجھے اسے فی الفور گرفتار نہیں کرانا ایس ایچ او صاحب۔ میں اسے ایسے وقت میں گرفتار کرنا چاہتی ہوں جب وہ اپنی فتح کا جشن منا رہا ہوگا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ایس ایچ او نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

''مادام! آپ سردار گھرانے سے ہیں۔ یہ کیس ہونے والے سردار کے باپ کا کیس ہے۔ غاذان، آپ کا چچازاد ہے۔ آپ چوں کہ اکیلی آئی ہیں۔ حویلی سے کوئی ساتھ نہیں آیا تو مجھے ذرا فکر ہے کہ کہیں یہ معاملہ قانون میں آنے کے بعد بھی آپ کے قبیلے کے رسموں اور رواجوں کے نذر نہ ہو جائے کیوں کہ اگر دیکھا جائے تو یہی قانون اٹھارہ سال پہلے بھی موجود تھا مگر اس وقت کسی نے پولیس کو بیچ میں لانے کی بجائے جرگوں اور مقامی بزرگوں کی رائے کو ترجیح دی۔ اگر اس وقت بھی یہ کیس ہمارے حوالے کیا جاتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ ہم مجرم کو اٹھارہ سال پہلے گرفتار کر لیتے۔'' وہ پچھتاوے سے کہنے لگے پھر انہوں نے گل کو دیکھا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار بھی آپ کے سرداران یہ کیس ہم سے لے لیں۔ میں اس صورت کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

گل کے دل پر گھونسا پڑا۔

''کیا مطلب؟ کیوں نہیں کر سکیں گے؟''

''سردار کے پاس پوزیشن اور پاور ہوتی ہے۔ میں چاہ کر بھی لڑ نہیں پاؤں گا۔'' وہ بے بسی سے کہنے لگے۔

''میں بھی سردار ہوں۔ کیا میرے حکم کی کوئی قیمت نہیں ہے۔'' وہ دبی دبی غرائی۔

''آپ سردار گھرانے سے ہیں، سردار نہیں ہیں۔'' ایس ایچ او نے خشک لہجے میں جتایا۔

''یہ انتہائی بچگانہ بہانہ ہے ایس ایچ او صاحب۔ سردار چاہیں یا نہ چاہیں۔ آپ کا تعلق ان کی

چاہ سے نہیں۔ مجرم سے ہے۔ آپ مجرم سے کام رکھیں۔"

"کل اگر مسٹر غاذان اپنے باپ کو چھڑانے آ گئے تو ہم کیسے روکیں گے۔ وہ دو دن بعد سردار بن جائیں گے۔ ہم تو تب مجرم کو کڑی سے کڑی سزا دیں گے جب آپ سب سردار اس سے متفق ہوں گے۔ آپ خود مجرم کی پشت پناہی کرنے آئیں گے تو ہم..... مادام..... اپنی وردی کا رسک تھوڑی ہی لیں گے....." وہ سرد مہری سے کہنے لگا۔

"او کے..... میرے وکیل ہی آپ سے بات کریں گے۔" وہ ایک قدم پیچھے ہوئی اور دھمکیانہ لہجے میں بولی۔ ایس ایچ او نے گہری سانس لی۔

☆.....☆.....☆

وہ گومگو کی سی حالت میں منیب خان کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ پہلو میں گرے ہوئے تھے، آنکھوں کی پتلیاں اپنی جگہ جم گئی تھیں۔ اس کے پیروں تلے سرنگیں نہیں پھٹی تھیں۔ اس کے دل پہ گولیاں چلی تھیں۔ زندگی میں دوسری بار اس کا اعتماد اور بھروسہ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ اس سے قبل جب اس کے دوست نے کرسٹی لینا کو مارا تھا تب اور ایک آج۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیسے ری ایکٹ کرے۔ منیب کی ساری کہانی پر کیا ردعمل دے۔ اس کی تو سانس سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔ یاد نہیں پڑ رہا تھا اس ساری کہانی کے دوران اس نے سانس کتنی بار لیا تھا اور کتنی بار نہیں۔

منیب خان کو یہ نہیں پتہ تھا کہ عبادہ اس سے ابتہاج کی بات کر رہی تھی، غاذان کی نہیں۔ غاذان کی سچائی معجزانہ طور پر سامنے آئی تھی۔ مدثر اور مہابت خان کو بھی اپنی سماعتوں پر گمان ہو رہا تھا۔ مہابت دیدے پھاڑ کے عبادہ کو دیکھتے پھر منیب خان کو..... وہ ایسے ہو گئے تھے جیسے منیب سچائی نہیں، ان کا اعمال نامہ سنا رہا ہو۔ غاذان فون بند کر چکا تھا۔ کونوں کھدروں میں چھپے چھچھوندروں اور کاکروچوں کی "چھیں چھیں" کے علاوہ کمرے میں ٹھہری خاموشی تھی۔ منیب خان "رہائی" ملنے

والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔اسے اب کوئی غم نہیں تھا۔اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔اب غاذان جانے اور اس کا کام۔

عبادہ ڈگمگاتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہوئی۔اس کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتے ہوئے دلبرداشتہ انداز میں دروازے کی بڑھنے لگی۔

''عبا.....'' مہابت خان کہتے کہتے رک گیا۔وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

فجر کے بعد کا وقت ہو گیا تھا۔نیلگوں اندھیرا چھٹ چکا تھا۔سفید دھاری،سیاہ دھاری سے الگ ہو چکی تھی۔ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔چترال کے پہاڑوں پر جمی دھند آہستہ آہستہ اوپر جانے لگی۔وہ اصطبل سے باہر آئی تو ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔اسے فی الفور حویلی جانا تھا۔اسے آرام کی اور تحمل سے اس سب کے بارے میں سوچنے کی اشد ضرورت تھی۔وہ جذبات میں آکر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔گو کہ اسے غاذان پر بے انتہا غصہ آرہا تھا۔دل کر رہا تھا اس کو جان سے مار ڈالے مگر یہ وقت کسی بھی طرح اپنے حواس کھونے کا وقت نہیں تھا۔

پارکنگ میں بوڑھا ڈرائیور گاڑی پر کپڑا مار رہا تھا۔اسے آتا دیکھا تو جلدی جلدی کپڑا ایک طرف رکھا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔وہ نڈھال قدموں سے چل کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔بوڑھے ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

سفر کٹنے لگا۔ہم کہتے ہیں کہ جب زندگی میں کوئی بڑا المیہ رونما ہو جائے تو وقت کی گردش لمحوں کے لیے تھم سی جاتی ہے۔یوں لگتا ہے جیسے ہم جہاں کھڑے ہیں،وہیں گردن تک دھنس گئے ہیں۔یہاں سفر تمام ہو گیا ہے۔اب اسے آگے کوئی قدم نہیں لے سکتے۔درحقیقت ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ہم بھلے ہی اس لمحے میں ٹھہر جائیں مگر وقت اپنی گردش نہیں روکتا۔وہ چلتا رہتا ہے۔کسی کے غم میں،کسی کی تکلیف میں وہ اپنی گھڑیاں ماتم کے لیے جامد نہیں کرتا۔وہ صبح سے شام کرتا ہے۔شام سے صبح

کرتا ہے۔ یہ ہم ہوتے ہیں جن پر اس المیے کے بعد نہ کبھی صبح آتی ہے اور نہ کبھی روشنی۔

شیشے میں کہنی رکھے، مٹھی ہونٹوں پر رکھے وہ اپنی ہچکیوں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ بوڑھا ڈرائیور تشویش سے بیک ویو میں اسے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کچی سڑک پر چل رہی تھی۔ دونوں طرف ایون کے کھیت تھے جن میں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ صبح کا وقت تھا۔ آکسیجن سے بھرپور ہوا زندگی کو روئیدگی بخش رہی تھی۔ سورج کی نارنجی کرنیں ہندوکش کی پہاڑیوں سے نکلنے لگی تھیں۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سینے میں عجیب سی جکڑن تھی۔

''کاکا! گاڑی روک دیں۔'' اس نے گیلی آواز میں کہا۔ ڈرائیور اس کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے بغیر کوئی اعتراض کیے، گاڑی ایک طرف روک دی۔ وہ تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتری اور کھیتوں کی طرف بھاگی۔ حواس باختہ..... بے لگام.....

لہلہاتے کھیتوں کے درمیان بغیر کسی سمت کے وہ آگے دوڑتی چلی گئی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک قطعے کے وسط میں رک گئی اور رکوع کی طرح گھٹنے پکڑ لیے۔ وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔

آنسو بھل بھل کر چہرے پر پھسل رہے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

فجر سے پہلے ہی احتشام پہنچ گئے تھے۔ جیسا کہ گل نے انہیں سب بتایا تھا۔ وہ اپنی ساری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے احتشام کی قانونی خدمات حاصل کرتے ہوئے گل کی مدعیت میں ایف آئی آر درج کرائی اور نعیم کے خلاف اریسٹ وارنٹ نکلوایا۔ گل کو دھڑکا لگا تھا کہ کہیں ایس ایچ او اپنی چاپلوسی کا ثبوت دیتے ہوئے غازان کو آگاہ نہ کر دے۔ جب ہی وہ پولیس سٹیشن میں ٹھہری رہی اور احتشام کے ذریعے بات کرنے کو ترجیح دی۔ وہ جانتی تھی کہ احتشام اپنی قانونی قابلیتیں

استعمال کرتے ہوئے ایس ایچ او کو کسی خفیہ پیش قدمی سے روک دیں گے۔ ظاہر ہے اگر ایس ایچ او کو سردار سے اپنی وردی کے اترنے کا غم تھا تو اسے قانون کے بالائی طاقتوں سے الجھنے کا سامان بھی نہیں کرنا چاہیے تھا کیوں کہ بہر حال وردی تو وہ بھی اتار سکتے تھے۔

احتشام نے پہنچ کر ایس ایچ او کو قانون کی زبان میں چپ لگا دی۔ اس نے نہ صرف گل کی بات سے اتفاق کیا بلکہ نعیم کی گرفتاری کے لیے بھی اس وقت اور موقع پر راضی ہو گئے جس وقت اور موقع کے بارے میں گل نے کہا تھا۔

گل جانتی تھی کہ ابھی نعیم کو گرفتار کرنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ کیوں کہ شندور چل رہا ہے۔ غاذان پر اس کی صحیح سالم انجام دہی کی بھاری ذمہ داری ہے۔ اگر اس نے لاشعوری پر کوئی قدم اٹھایا تو شندور کو دوبارہ کسی خمیازے کا سامنے کرنا پڑ سکتا ہے۔ وہ اٹھارہ سال بعد اس کھیل میں شریک ہوئے تھے۔ وہ دوبارہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے کہ شندور کو کوئی نقصان پہنچے۔ ایک دفعہ یہ گتھا گتھا کیفیت چھٹ جائے، معمولات زندگی بحال ہو جائیں تو وہ گرفتاری بھی کر لے گی اور چترال کی ناموس پر سوال بھی نہیں اٹھے گا۔

نیلگوں دھاری کے چھٹنے سے قبل ہی وہ جگنوؤں کے قطعے کے راستے حویلی آ گئی اور نعیم کو خبر نہ ہو، اس خوف سے احتشام نے چترال کے ہوٹل میں دو دن کے لیے سکونت اختیار کر لی۔

☆.....☆.....☆

صبح ہو چکی تھی۔ دنیا جاگ چکی تھی جب وہ حویلی پہنچی۔ اس کی ساری بھڑاس کھیتوں میں نکل گئی تھی۔ جو غصہ اس ذلیل انسان پر اعتبار کرنے کی وجہ سے دل میں پوری رات پنپتا رہا تھا۔ رونے سے، بلکنے سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

اسے خود سے زیادہ گل کے لیے برا لگ رہا تھا۔ غاذان ایک پرائی زمین پر ملنے والا اجنبی شخص

تھا جس کے ساتھ اس نے گن گن کر بیس دن گزارے تھے۔ان بیس دِنوں میں ان دونوں کی کتنی ہی کوئی ملاقاتیں ہوئی ہوں گی جس سے وہ اس شخص کے بھروسے کا مان لے سکتی؟ بیس دن ہو گئے تھے۔شندور کے بعد دو دنوں میں وہ چلی گئی تھی۔غاذان پرایا تھا۔پرایا ہی رہ جائے گا اور پرائے تو دیتے ہی غم ہیں۔وہ کب اپنا سمجھ کر دل نہیں توڑتے؟ وہ غاذان کو ایک برا پرایا جان کر بھول جائے گی۔بھول جائے گی کبھی اس نے حویلی میں اس شخص پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا تھا۔بھول جائے گی کہ کبھی اس سے دوستی ہوئی تھی بالکل اس طرح جس طرح وہ اپنے اس دوست کو بھول گئی تھی جس نے کرسٹی کو مارا تھا۔اگر یہاں کسی کے لیے دنیا بدلنے والی تھی تو وہ گل تھی۔گل غاذان پہ جتنا اعتماد کرتی تھی،شاید ہی خاندان میں کوئی کرتا ہوگا۔جب اس کو معلوم ہوگا کہ یہ سب غاذان نے کیا ہے، ابتہاج نے نہیں تب وہ کیا کرے گی۔یقیناً بری طرح ٹوٹ جائے گی۔وہ پہلے ہی رستم کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔وہ اس تکلیف کو کیسے سہے گی؟

یہی سوچتے ہوئے وہ حویلی میں داخل ہوئی۔صحن میں عورتوں کی ریل پیل جاری تھی۔بچے، بوڑھے سب جاگ گئے تھے۔کوئی انگڑائی لے رہا تھا تو وہ گلا پھاڑ کر رو رہا تھا۔کوئی ناشتے کی دہائی کر رہا تھا تو کوئی حویلی کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے کمر کس رہا تھا۔عجیب سی گہما گہمی ہوتی تھی اس حویلی میں۔

وہ ماندہ ماندہ قدموں سے چل کر جب اپنے کمرے میں داخل ہوئی،اس نے بیڈ کے پاس گل کو کھڑے پایا۔اس نے سیاہ رنگ کی لمبی اور گھیرے کلیوں والی فراک پہنی ہوئی تھی۔سیاہ رنگ پہ قوس قزاح کی طرح کئی رنگوں سے کڑھائی کی گئی تھی۔جگہ جگہ موتیاں،شیشے اور مصنوعی سکے لگے ہوئے تھے۔شلوار باقی کھلی تھی،پائنچے تنگ تھے اور وہ بھی اسی طرح کڑھائی سے بھری ہوئی تھی۔دوپٹے کو سر پہ دلہن کی طرح لیا ہوا تھا۔

وہ بہت روئیدہ اور تازہ تازہ لگ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکان تھی جو اسے آتا دیکھ کے مزید گہری ہوگئی تھی۔ عبادہ اداسی سے مسکرا کے اس کے پاس آئی۔

''گڈ۔ چار دن سے بجھی بجھی گل کو دیکھ کے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اچھا ہوا جو تم نے اور کم کرلیا۔''

''ایک خوشخبری ہے۔'' گل نے نچلے ہونٹ کا کونہ دبایا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ (اتنے کھٹے ماحول میں خوش خبری؟)

''کیا؟''

''میں شندور پولو کے لیے سلیکٹ ہوگئی ہوں۔'' دفعتاً اس نے ایک کاغذ ہوا میں بلند کرتے ہوئے چہک کے کہا۔ عبادہ نے چونکتے ہوئے کاغذ کو تھام لیا۔ وہ گل کا سلیکشن لیٹر تھا۔ اس نے بے یقینی سے اوپر تا نیچے پڑھا۔ یوسف خان نے اسے پولو کے لیے مقامی ٹیم میں جگہ دلا دی تھی۔ اس کا مطلب وہ واقعی اس کی دھمکی سے ڈر گئے تھے۔ ایک استہزائیہ بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چلو۔ کچھ تو اچھا ہوا تھا۔

''مبارک باد نہیں دو گی؟'' گل نے برا مناتے ہوئے پوچھا۔

یکدم اسے پشیمانی ہوئی۔ ''اوہ۔ سوری۔ بہت بہت مبارک ہو۔ یہ بہت بڑی اچیومنٹ ہے۔'' وہ کھلے دل سے اس کے گلے لگی۔

''جانتی ہوں مگر..... خوشی سے زیادہ مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔'' وہ پیچھے ہوئی اور الجھن سے بولی۔

''کیسی حیرانی؟''

''کل میرا میچ ہے۔ آج مجھے ٹیم میں لینے کا مقصد۔ اتنی اچانک انہوں نے یہ فیصلہ کیسے لے لیا۔''

''ان کو ریلائز ہوگیا ہوگا۔'' عبادہ پائنتی پر نڈھال سی بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اچانک کیسے ریلائز ہوسکتا ہے عبادہ؟ ابھی کل تک تو مجھے ریجیکشن کی عجیب عجیب سی وجوہات

دے رہے تھے۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔عبادہ نے پیشانی کو انگلیوں سے چھوا۔دفعتاً گل ٹھٹک گئی۔''کہیں تم نے تو.....؟''

اس نے گہری سانس لی اور گھائل سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے اسے دیکھا۔''میں نے یوسف خان سے کہا تھا کہ تمہیں ٹیم میں شامل کرلیں ورنہ میں ان کے گھوڑوں کا راز پورے پاکستان کے سامنے کھول دوں گی۔''

''تت.....تم نے ایسا کہا؟'' گل کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''جب ہی میں کہوں پچھلے دو سال سے نہیں لے رہے۔اس دفعہ یکا یک کیسے لے لیا۔'' وہ تعجب سے کہتے ہوئے اس کے برابر بیٹھ گئی۔عبادہ جھک کر اپنے جوتوں کی سٹریپ کھولنے لگی۔

''ویسے.....تم نے اچھا کام کیا ہے۔میں نے اس بارے میں سوچا تھا مگر میرے پاس کوئی ثبوت وغیرہ نہیں تھے اور پھر میری بات کا یقین کون کرتا۔میں کوئی ویٹرنری ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔'' وہ شانے اچکاتے ہوئے ہنس پڑی۔

''ہوں۔'' اس نے ہنکار بھرا۔جوتے اب نیچے پڑے تھے۔اس نے پیر اٹھا کر پائنتی پر رکھ لیے اور انگلیوں کو دبانے لگی۔وہ جب جب جوتے اتارتی تھی۔عادتاً پیروں کی انگلیوں میں کچھ لمحوں کے لیے مساج کرتی تھی۔گل اپنے لیٹر کو دیکھ رہی تھی۔وہاں لکھے الفاظ پر اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

تم نے گھوڑوں کا کھیل رستم کے لیے رچا تھا ناں غاذان۔اب گل تمہارا یہ کھیل تم پہ شندور کے میدان میں الٹائے گی۔یوسف خان نے دیر سے اس کو ٹیم میں شامل نہیں کیا تھا بلکہ وقت پہ کیا تھا۔اگر وہ کچھ دن پہلے کرتے تو شاطر غاذان کوئی نہ کوئی منصوبہ بنا کر گل کو میدان میں اترنے سے روک

دیتا۔اچھا ہے۔جتنا اس کے پاس وقت کم ہوگا،اتنا وہ کم سوچے گا۔

''اصطبل میں کیا ہوا تھا۔تم اتنی جلدی چلی گئیں مجھے پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔''

''جو گھوڑوں کے نئے ڈاکٹر آئے ہیں۔وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر گئے تھے جس سے سر پہ چوٹ لگ گئی۔مہابت خان کا کانے بوکھلاہٹ میں مجھے بلا لیا۔''

''اوہ.....''

''میں ذرا چینج کر لیتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔گل اس کے بجھے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔کل تک یہی حالت اس کی تھی اور آج عبادہ کی تھی۔اس نے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھا جو سوجی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی گلابی تھیں۔

''تم سوئی نہیں کیا رات کو؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''سوئی ہوں مگر نیند پوری نہیں ہوئی۔'' وہ واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''نظر آ رہا ہے۔'' وہ ہنس دی۔''ایسا کرو۔تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ پھر ہم تسلی سے شندور کے لیے نکلیں گے۔''

''ہوں۔'' اس نے تائید کی۔

فی الحال اسے نیند کی سخت ضرورت تھی۔وہ گل پہ یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے پوری رات اصطبل میں گزاری ہے۔اس سے گل سو سوال کر سکتی تھی۔اچھا تھا کہ جب گھوڑوں کے جرم میں غاذان گرفتار ہو،تب گل کو غاذان کی سچائی پتہ چل جائے۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ گل کا دل بھی ٹوٹے اور وہ خود کو بے بس بھی محسوس کرے جس طرح پچھلے چار دن وہ مسلسل کر رہی تھی۔وہ رستم کی وجہ سے پہلے ہی ایک بڑے امتحان سے گزر رہی تھی۔ایسے میں وہ غاذان کا قصہ سنا کر اسے مزید پریشرائز نہیں کر سکتی تھی۔اگر گل پہ غاذان کی حقیقت کا بوجھ پڑا تو وہ ٹھیک سے کھیل نہیں سکے گی۔

دوران میچ اس کا دھیان بار بار ٹوٹے گا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خالی دماغی سے بے فکر ہو کر کھیلے۔ اس نے عبادہ کو نہیں بتایا تھا کہ نعیم اس کے باپ کا قاتل ہے۔ اسے عالیہ کے بتانے سے قبل جتنا معلوم تھا۔ وہ اسے بتا دیا تھا۔ کل پوری رات وہ کہاں تھی۔ اس نے کیا کیا۔ اس نے عبادہ کو نہیں بتایا۔ وہ عبادہ کو اپنے ذاتی مسئلے خود حل کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ اس ایف آئی آر کے بارے میں جتنا کم لوگ جانیں گے، اتنا ہی یہ راز چھپا رہ سکے گا۔ کل جب نعیم گرفتار ہوگا تو وہ عبادہ کو بتا دے گی۔ تب عبادہ کے سامنے وہ بے بس بھی نہیں ہوگی اور نہ ہی عبادہ کو لگے گا کہ وہ ٹوٹ چکی ہے۔

☆.....☆.....☆

شندور کا دوسرا دن!

صبح آٹھ بجے.....

آج گلگت کے وزیر اعلیٰ آئے تھے۔ گو کہ ان کی آمد و رفت کا دورانیہ ایک دو گھنٹے ہوتا ہے اور وہ آتے بھی ایم آئی سیونٹین ہیلی کاپٹر میں ہیں اس لیے ان کے جانے کے بعد ماحول میں ایک آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی میں ظاہر ہے سکیورٹی سخت ہوتی، عوام کو آزادانہ حرکات وسکنات کی اجازت نہیں ہوتی تھی کہ کہیں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے لیکن ان کے جانے کے بعد شندور اپنے اصل ذائقے میں لوٹ آتا تھا۔

دوسرے دن کا میچ ختم ہو گیا تھا۔ گلگت نے میدان مار لیا تھا۔ کل کی طرح آج بھی وہی جیت گئے تھے۔ چترال کے لیے اپنی پوزیشن مستحکم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پچھلے چھ سال سے مسلسل جیتنے والی ٹیم کے اس بار ہارنے کے امکانات نظر آرہے تھے۔ کل کا میچ تھا جس نے فیصلہ کرنا تھا کہ کون جیتے گا اور کون نہیں۔

عالیہ بیگم، موٹی چچی اور بریخنہ باقی سرداران خواتین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ خیموں کے

درمیان پلاسٹ کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ درمیان میں الاؤ جل رہا تھا جس پر چائے کی بڑی کیتلی ٹنگی ہوئی تھی۔ ملازم چائے کی پیالیوں میں چائے ڈال رہے تھے۔

میچ کے کھلاڑی ایک طرف کرسیوں پر براجمان تھے۔ سب نے سرخ اور نیلی شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں۔ وہ صرف میدان میں حریف تھے۔ میدان سے باہر وہ اچھے دوست، غمگسار اور ہمدرد تھے۔ یہ ان کی جنگ نہیں تھی، ایک طریقہ تھا قابلیت دکھانے کا۔ نعیم اللہ گلگت کی مستوج ٹیم کے لڑکوں کو شاباشی دے رہے تھے کہ انہوں نے اچھی کارکردگی دکھائی تھی۔

غاذان البتہ رستم کے پاس تھا جسے ابتہاج دو گھنٹے سے بہلا رہا تھا لیکن اس کا نخرہ تھا کہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چھ فٹ کا اونچا، مضبوط اور سیاہ گھوڑا تھا جس کی گردن اور دم کے بال کسی دوشیزہ سے زیادہ لمبے اور گھنے تھے۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا جیسے یہ قید توڑ کے بھاگ جانا چاہتا ہو۔ ابتہاج اسے مسلسل قابو کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

اس کے چاروں طرف میڈیا اور یوٹیوبرز کا بے انتہا رش تھا۔ صحافی کیمروں کے آگے کھڑے تیز تیز اور بے ترتیب مائیک میں بولے جا رہے تھے۔ کیمروں کے فلیشز کھچ کھچ گھوڑے پر پڑ رہے تھے۔ گھوڑے کو ایک محدود باڑ کے اندر رکھا گیا تھا۔ چاروں طرف لکڑی کی چار فٹ اونچی دیوار تھی لیکن اتنے رش اور اتنے ہجوم کو دیکھ کے گھوڑا بدک رہا تھا۔ غاذان نے بارہا سمجھایا سب کو کہ یہاں رش نہ بنائیں لیکن لوگ آئے ہی اس لیے تھے۔ غاذان ڈر رہا تھا کہ گھوڑا کھونٹی نہ توڑ دے۔ وہ بے لگام ہوا تو یہاں اسے کوئی قابو نہیں کر سکتا اور جو قابو کر سکتا تھا وہ ایون میں تھی۔

وہ خجل خوار ہوتا، لوگوں کے درمیان جگہ بناتا، مشکل سے باڑ کے قریب آیا۔ اسے ہر طرف سے لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔

''ابتہاج.....ابتہاج.....'' وہ اسے آواز دینے لگا۔اپنے نام کی مدھم سی پکار سن کے تھکے ہارے اور اکتائے ابتہاج نے ادھر ادھر دیکھا۔غاذان نے ہاتھ اٹھا کے لہرایا تو اس کا دھیان پڑا۔وہ رستم کو چھوڑ کے اس کے پاس آیا۔

''لوگوں کا رش ہے یہاں گھوڑا ڈر رہا ہے۔اسی طرح لگے رہے تو یہ کل تو کیا اگلے سال تک نہیں رکے گا۔اسے چھوڑ دو۔میرے ساتھ لوگوں کو ہٹاؤ۔''اس نے بمشکل اپنی بات پوری کی۔ابتہاج نے سر ہلایا اور چار دیواری کود کے اس طرف آ گیا۔

''پیچھے یہاں سے.....گھوڑا ڈر رہا ہے.....آپ لوگ پیچھے ہو جائیں.....یہاں سے چلے جائیں.....''

وہ یہی فقرے بول بول کے ہجوم کو پیچھے کرنے لگے۔ان کی مدد کے لیے گارڈز اور دیگر عملہ بھی آ گیا۔وہ رستم کی باڑ کے آگے ہاتھوں کی زنجیر بنا کے کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو پیچھے کرنے لگے۔ایسا کرنے سے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر پیچھے ہونے لگا تھا۔وہ ان کے سینوں اور ہاتھوں پر چڑھ رہے تھے لیکن انہوں نے بھی ہاتھوں کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔غاذان کو بے حد غصہ تھا۔ابتہاج بھی چیخ رہا تھا۔کاش اسے رائفل استعمال کرنے کی اجازت ہوتی،وہ ایک فائر کرتا اور سب دبک کے پیچھے ہو جاتے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ عرشہ کلیئر ہو گیا اور ان کو سکون کا سانس آ گیا۔رستم کی بے چینی میں کمی آ گئی۔ظاہر ہے جانور ہو یا انسان،اس طرح مسلسل تنگ کرنے سے ری ایکشن دیتا ہے۔انسان کو قابو کیا جا سکتا ہے لیکن جانور کو نہیں.....اور وہ رستم جسے انعام کے طور پر پیش کرنا تھا۔اس کے ساتھ فی الوقت ایسا رسک نہیں لے سکتے تھے۔

لوگوں کو ہٹانے کے بعد ابتہاج واپس رستم کی طرف مڑا لیکن غاذان نے ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

''اسے کچھ دیر چھوڑ دو ابتہاج اور خود بھی آرام کرو۔ نماز کے بعد اسے تسلی سے سدھا لینا۔'' اس نے مخلصی سے کہا تو ابتہاج نے گہرا سانس نکالا۔ بلاشبہ وہ واقعی بری طرح تھک گیا تھا۔ وہ رستم کو چھوڑ کے کیمپ میں موجود اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

غاذان ان دیکھا پسینہ پونچھتا اس درمیانی عرشے میں آیا جہاں چاروں طرف خیمے تھے، فوجی کیمپ کی طرح۔

کھلاڑی ناشتہ پانی کر چکے تھے اور اب اٹھ اٹھ کے جا رہے تھے۔ ان کے دوست رشتہ داران کے گھوڑوں کا خیال رکھ رہے تھے۔ وہ قدم قدم چل کے آیا اور پلاسٹک کی میز پہ پڑے پلاسٹک کے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ کھڑے کھڑے چند گھونٹ لیے جب ہی اس کی نظر یوسف خان پر پڑی، وہ یہاں سے بہت دور اکیلا کھڑا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو گارڈز وقفے وقفے سے کھڑے تھے۔ ان کا مصنوعی ہاتھ حسب عادت کمر کے پیچھے تھے۔

پھر اس کی نظر عالیہ بیگم پر پڑی جو قہقہے لگا رہی تھیں۔ موٹی چچی اور بریخنہ کل سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ موٹی چچی گل کی حرکت کی وجہ سے ناراض تھیں۔ البتہ بی جان اچھے سے پیش آ رہی تھیں۔ اس نے گلاس نیچے رکھا اور جب ہی اس کا فون تھرتھرایا۔ اس نے دو انگلیوں کی مدد سے جیب سے فون نکالا اور اسکرین کو دیکھا۔ عظیم کا نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے انگوٹھا پھیر کے کال اٹھائی اور دوسری طرف سے جو سنا، اس کے ہوش و حواس بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ اچھلا نہ کودا..... بس اپنی جگہ جم گیا.....

☆.....☆.....☆

عبادہ سو کر اٹھ چکی تھی۔ اس وقت دونوں شندور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ عبادہ نے جینز شرٹ کا انتخاب کیا تھا (اس کا سب سے آرام دہ لباس) اور گل انہی کپڑوں میں ملبوس تھی جو اس صبح

ہی پہنے تھے۔عبادہ پائنتی پر بیگ رکھ کے،جھکی جھکی چیزیں اندر ڈال رہی تھی۔گل نے اپنا جم والا بیگ میز پر رکھا تھا۔

''عبادہ!میرے پاس پولو کا یونیفارم نہیں ہے۔بابا کی ایک شرٹ ہے صرف۔میں وہ تو نہیں پہن سکتی۔''گل نے تشویش سے کہا۔

''اب تک تم نے اپنے لیے یونیفارم نہیں سلوایا؟''عبادہ نے خفگی سے دیکھا۔اس نے معصومیت سے سر کو نفی میں ہلایا۔

''ویری گڈ.....''وہ طنز سے بولی۔

''چترال ٹاؤن سے گزریں گے تو وہاں سے لے لیں۔کوئی غم نہیں۔''وہ زیرلب مسکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''برینہ کی آواز کانوں میں پڑی تو دونوں نے یکلخت گردن گھمائی۔برینہ ہینگر میں سیاہ پینٹ اور سرخ شرٹ لٹکائے کمرے میں داخل ہوئیں۔گل سیدھی ہوگئی۔''یہ لو۔تمہارا یونیفارم۔''انہوں نے ہینگر اس کی طرف بڑھایا۔وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔''بہت پہلے خریدا تھا۔میں نے سوچا جب موقع آئے گا تو تمہیں دوں گی۔رکھ لو۔میں نے بہت انتظار کیا ہے اس لمحے کا۔''وہ وارفتگی سے بولیں۔

''اس کی ضرورت نہیں میں اپنا خرید لوں گی۔''وہ سردمہری سے کہتے ہوئے واپس بیگ میں چیزیں ڈالنے لگی۔

''کب گراؤ گی تم اپنے اور میرے درمیان بنی یہ نفرت کی دیوار؟''انہوں نے دوبدو پوچھا۔

''آپ کو بنانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔''اس نے تنفر سے زپ بند کردی۔

''تم نہیں جانتی مجھے کتنا مجبور کردیا گیا تھا اس وقت گل۔کاش میں تمہیں ماضی میں لے کر جاسکتی۔تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی کہ میں کتنی بے بس تھی۔''ان کی آواز نم ہوگئی۔عبادہ اپنی جگہ

کھڑی دکھ سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے خود کو مجھ سے چھینا ہے چچی۔ جب مجھے آپ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ آپ نے میرا ساتھ نہیں دیا، دوسری شادی کر لی۔''

''دوسری شادی کرنے میں اور کروائی جانے میں فرق ہوتا ہے۔''

''قبول ہے تو اپنی زبان سے کہا تھا ناں؟''

''نہیں۔ زبردستی اس انگوٹھے پر سیاہی مل کر نکاح کے فارم پر چھپوایا تھا۔ تمہیں سامنے کھڑا کر کے، تمہارے واسطے دیے گئے تھے۔''

''آپ کو منع کرنا چاہیے تھا۔'' وہ چیخی۔

''کیا تھا۔ بہت بار کیا تھا۔ جانتی ہو مجھے بی جان نے کیا کہا تھا؟'' وہ یونیفارم صوفے پر پھینکتے ہوئے اس کے پاس آئیں۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ میرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں مجاہد خان سے شادی کر لوں کیوں کہ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ مجھے اس حویلی سے نکال کر تمہیں اپنے پاس رکھ لیں گے۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی تھی گل۔ مجھے یہ گوارہ نہیں تھا کہ میں تم سے دور ہو جاؤں اور کسی ایسے مرد سے شادی کر لوں جو مجھے اس حویلی میں آنے تک نہیں دے گا۔ مجھے یہ گوارہ تھا کہ میں اپنے دیور سے شادی کر لوں۔ کم از کم تم میرے سامنے تو رہو گی۔'' وہ پھٹ پڑی تھیں۔

''مجھے کوئی شوق نہیں تھا دوسری شادی کر کے کلیم خان جی سے بے وفائی کرنے کا۔ میری مجبوری تھی وہ گل۔ یہ حویلی، اس کی شہنشاہی، اس کی دولت ہی تمہارے وہ خواب پورے کر سکتی تھی جو تمہارے باپ نے تمہارے لیے دیکھے تھے۔ مجھے بتاؤ بالفرض بی جان تمہیں میرے حوالے کر دیتیں اور میں کسی دوسرے شخص سے شادی کرتی تو وہ تمہاری ذمہ داری اٹھاتا؟ نہیں۔ پرائے مرد، بیوی کے پہلے بچوں کی ذمہ داریاں نہیں لیتے۔ اگر میں شادی نہ کرتی تو کیا میں تمہیں تنہا پال سکتی

تھی؟ اتنی بڑی یونی ورسٹی میں، کالج میں داخلہ دلا سکتی تھی؟

نہیں۔ تمہاری دسویں پاس ماں کے پاس کوئی تجربہ یا ہنر نہیں تھا گل۔ مجھے اس حویلی کے رحم و کرم پر رہنا تھا۔ مجاہد خان جو بھی تھے۔ جیسے بھی تھے۔ اگر انہوں نے تمہیں پیار نہیں کیا تو تمہارا برا بھی نہیں چاہا۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل میں تمہیں دیکھ کر یہ خیال ضرور آتا تھا کہ تم ان کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہو۔ دوسرا شخص ایسا کبھی نہ کرتا۔ رہی بات تمہیں اس حویلی کے حوالے کر کے یہاں سے جانے کی تو وہ بھی میں نہیں کر سکتی تھی۔ بھابھی بیگم کا مزاج تم سے چھپا نہیں ہے۔ بی جان کسی کی سگی نہیں ہیں۔ ان کو موقع کے مناسبت سے جو ٹھیک لگتا ہے وہی کرتی ہیں۔ رہی مسفرہ..... تو نعیم کی غیر موجودگی میں بھابھی بیگم کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا تھی؟ وہ تو اپنے لیے آواز نہیں اٹھا پاتی تھی، تمہارے لیے کیا اٹھاتی۔ بھابھی بیگم نے سردارنی بننے کے بعد ہم دونوں دیورانیوں کا بھرکس نکالا ہے گل۔ میں نے اس اذیت کو قبول کیا مگر میں تم سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ سردیوں کی راتوں میں آدھی آدھی رات کو اپنی ثمامہ کو دودھ پیتا چھوڑ کر میں تمہیں لحاف اوڑھنے آئی ہوں۔ خود نوالہ لینے سے پہلے، تمہیں کھلایا ہے۔ اپنی ہر چیز سے پہلے میں نے تمہیں ترجیح دی ہے۔ مجاہد خان جی ناراض ہوتے تھے۔ کہتے تھے گل بڑی ہے۔ میں ان کے بچوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس کیوں چلی جاتی ہوں۔ تم اب میری ذمہ داری سے نکل چکی ہو۔ بی جان مجھے ڈانٹتی تھیں کہ میں حویلی کے کام چھوڑ کر تمہیں کیوں وقت دیتی ہوں۔ ہر شخص مجھے بیوگی کا طعنہ دیتا تھا۔ ہر انسان مجھے نیچا دکھاتا تھا۔ کلیم خان کے بعد اس حویلی میں مجھے پالنا ایک احسان ہے گل جو سب نے مجھ پہ کیا ہے۔ اس احسان کا بدلہ میں پچھلے اٹھارہ سال سے چکا رہی ہوں۔"

گل لاجواب ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تم سمجھتی ہو میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ کب کہاں چھوڑا ہے میں نے؟ اب تک جب جب

تمہیں میری ضرورت ہوتی ہے میں پہنچ جاتی ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر تمہیں کھلایا ہے۔ البتہ تمہیں ہر چیز ان سے زیادہ دی ہے۔ تم نے یہ کمرہ مانگا۔ بظاہر تم نے اسے خالی کروایا تھا مگر بی جان کے پیروں میں، میں پڑی تھی۔ میں گڑگڑائی تھی۔ بظاہر یہ ساری تعلیم تمہیں تمہارے تایا نے دلوائی ہے لیکن اپنی عزت نفس کو روندتے ہوئے میں نے ان کے ترلے کیے تھے۔ تم گھڑسواری کرنے ہر رات اصطبل جاتی ہو، ہر صبح مجھے بی جان سے، بھابھی بیگم سے صلواتیں سننی پڑتی ہیں۔ ابتہاج سے تم پنگے لیتی ہو گل لیکن معاملہ حد سے نہ بڑھ جائے اس کا سدباب میں کرتی ہوں۔ حد سے تم باہر جاتی ہو، تربیت پہ سوال میری اٹھتا ہے۔ دن ہو یا رات، تمہاری باغی طبیعت کے طعنے مجھے ملتے رہتے ہیں۔ تمہارے لیے اپنی ہڈیوں کا چورا بنا چکی ہوں میں گل..... خدا کے لیے مجھے یہ مت کہو کہ میں نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔"

انہوں نے دلبرداشتہ انداز میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ عبادہ کے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے۔ گل اپنے آنسو روک کے، بہت ضبط سے کھڑی تھی۔

"میں تمہاری ماں ہوں گل۔ میں نے پیدا کیا ہے تمہیں۔ تم میری اور کلیم خان جی کی نشانی ہو۔ میرے جگر کا ٹکڑا ہو تم۔ مجھ سے ایسے پیش مت آؤ۔ میں مر جاؤں گی۔ اٹھارہ سال سے میں تمہارے ایک میٹھے لفظ کا انتظار کر رہی ہوں۔ صرف ایک میٹھا لفظ بول دو۔ میری ساری زندگی کی تکان اتر جائے گی۔ کیا تم اپنی ماں پہ اتنا احسان بھی نہیں کر سکتی؟"

وہ بہت تکلیف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں....." ایک تھکی سی سانس لی۔ "تھک چکی ہوں گل۔ ہر چیز سے اکتا گئی ہوں۔ کلیم خان جی کے بعد تم میرا سہارا تھیں۔ تمہارا بھائی چھوٹا ہے۔ میں اس کے کندھوں کے مضبوط ہونے کا

انتظار نہیں کر سکتی۔ تم میرا بیٹا ہو۔"

گل نے آنکھیں میچ لیں، آنسو ٹپ ٹپ گالوں پر گر گئے۔

"تم جانتی ہو گل۔ میں تمہیں بھابھی بیگم کے ساتھ منہ ماری سے کیوں نہیں روکتی۔ کیوں کہ بھابھی بیگم نے مجھے بہت تکلیف دی ہے۔ آج جب تم ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہو تو مجھے حوصلہ ہوتا ہے کہ میں بھی ایک عدد سہارا رکھتی ہوں۔ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میری بیٹی ہے جوان کو دو بدو جواب دے سکتی ہے۔ وہ سب اپنے بیٹوں پر فخر کرتی ہیں۔ میں تمہاری وجہ سے گردن اکڑاتی ہوں۔ جانتی ہو، آج بھابھی بیگم کے سامنے میں اپنی زبان کھول سکتی ہوں، مجھے ان کا ڈر نہیں ہے۔ یہ حوصلہ تمہاری وجہ سے ملا ہے مجھے..... تم نے دیا ہے۔ لیکن جب تم....." آواز کپکپائی۔

"جب تم مجھ سے اس طرح پیش آتی ہو تو میں بھابھی بیگم کے سامنے وہی پرانی بریخنہ بن جاتی ہوں جو اپنے لیے کچھ بھی نہیں بول سکتی۔ تم اپنے رویے سے میرا حوصلہ توڑ دیتی ہو گل۔ بظاہر تم تو بھابھی بیگم کو، بی جان کو، ابتہاج کو سب کو جواب دے دیتی ہو لیکن تمہارے جانے کے بعد میں کچھ نہیں کہہ پاتی۔ کیوں کہ وہ آگے سے کہتے ہیں کہ تمہاری نظروں میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے، میں کس منہ سے ان سے بات کر رہی ہوں۔"

گل نے ایک سیسہ اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کیا۔

"دوسری شادی بہت اذیت ناک ہوتی ہے گل۔ اسے تم میری خوشی مت سمجھنا۔ میں نے اپنی زندگی میں خوشی کے اگر کوئی سال گزارے ہیں تو وہ کلیم خان جی اور تمہارے ساتھ تھے۔ اس کے بعد میں نے اب تک خوشی کا ایک لمحہ محسوس نہیں کیا۔ مجھے مت کہو کہ میں خود غرض ہوں۔ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کیا ہے۔ میں نے اپنے جسم کو تمہارے سکون کے لیے چھلنی کیا ہے گل۔ میں نے اپنی عزت نفس، اپنی غیرت اور اپنی خودداری کو تمہارے لیے نیلام کیا ہے۔ آج

اگر میں اتنی کمزور اور بے بس دکھتی ہوں تو اس کی وجہ تم ہو۔ اگر تم ایک لمحے کے لیے بھی پورے خاندان کے سامنے میرا سہارا بنو تو میں واپس طاقت ور ہو جاؤں گی۔ مگر تم ایسا کیوں کرو گی؟'' وہ اداسی سے بولیں۔ گل کا دل چاہ رہا تھا۔ چیخ پڑے۔ پورا کمرہ آکسیجن سے خالی ہو گیا تھا۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن تھی۔

انہوں نے بے دردی سے رگڑ رگڑ کر اپنے گال پونچھے۔

''ایک ماں ہونے کے ناطے میں تمہارے لیے یہ یونیفارم لائی تھی۔ پہننا چاہتی ہو تو پہن لینا۔ ورنہ میں نے کب تم پہ زبردستی کی ہے۔'' وہ لاچارگی سے کہتے ہوئے دروازے کی طرف مڑیں۔ وہ بہت تکلیف میں تھی۔ دل کے کئی ٹکڑے ہو چکے تھے۔

ان کے منہ سے نکلتے اقرار اور بریت کے جملے سن کر گل کا دل چھریوں سے ادھیڑا جا رہا تھا۔ کیسی بدقسمتی ہوتی ہے بعض اوقات سچائی سننا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں سچائیاں کڑوی ہوتی ہیں۔ سچائیاں کڑوی نہیں ہوتیں، ہم کڑوے ہوتے ہیں، کیوں کہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ان سچائیوں کا تعلق بھی تو ہم سے ہوتا ہے۔ اگر ہم میٹھے ہوں تو سچائیاں کیوں کڑوی ہوں؟

وہ خود کو مزید بے قصور نہیں مان سکتی تھی۔ اس مقام پر اسے اپنا جرم قبول کرنا ہی تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوئی زیادتیوں کی آدھی ذمہ دار ہے۔ ان کی تکلیفوں میں اس کا بھی حصہ رہا ہے۔ اٹھارہ سال سے جاری ماں سے بدسلوکی، بدلحاظی اور بدتمیزی کی ذمہ دار گل لالہ کلیم تھی۔ اگر اس نے ماں کو چند منٹ کی مہلت دی ہوتی تا کہ وہ اپنی صفائی پیش کر سکیں تو دونوں کے درمیان یہ تلخ دیوار کب کی گر چکی ہوتی۔ بریحنہ صفائی دینا چاہتی تھی لیکن گل صفائی سننا نہیں چاہتی تھی۔ آج نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ساری سچائی سن لی تھی۔

اب تک وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس حویلی میں وہ اپنے بل بوتے پر جی رہی ہے مگر آج یہ خوش فہمی

مٹی کی دھول کی طرح اڑ گئی تھی۔اس کے پیچھے ہمیشہ اپنی ماں کا مضبوط کندھا رہا تھا۔اس کی ہر جرأت کو بریخنہ نے پردے میں ڈھانکا تھا۔اس کی ہر شرارت کو سرعام آنے سے بریخنہ نے بچایا تھا۔وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ حویلی والے اب تک اس کی خفیہ جرأتوں سے واقف کیوں نہیں ہوئے،تو اس کی وجہ بریخنہ تھی۔انہوں نے کبھی ان کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا۔ہر بار اپنی بیٹی کی پردہ پوشی کی تھی۔آج گل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔اپنی ماں کے مقابلے میں وہ کتنی کمزور اور بے بس ہے۔اس کا ادراک آج ہوا تھا۔جب حویلی والوں نے اس کی ماں کی موجودگی میں اس کو اس قدر تباہ کیا تھا اگر اس کی ماں نہ ہوتی تب کتنا تباہ کرتے؟ یہی سوچ کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

بمشکل اپنے قدموں پر چلتی اس کی لاغر سی ماں دروازے تک پہنچ نہیں پائی تھی جب وہ خود ساختہ انداز میں ان کی طرف بڑھی اور پیچھے سے گردن میں ہاتھ حمائل کر کے اپنے سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

''سوری ماما.....آئی ایم رئیلی سوری.....''وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔وہ معافی اپنے اندر کے گلٹ کو ختم کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی۔وہ جانتی تھی کہ اس نے جو کیا ہے لاشعوری طور پر ہی سہی،کسی غلط فہمی میں پڑ کر ہی سہی،اس نے اپنی ماں کا دل دکھایا ہے۔ماں کے دل سے بے شک یہ فریاد نہ نکلی ہو مگر قدرت تو سنتی ہے ناں۔قدرت تو ماں کی ادنیٰ سی آواز ہے۔اس کے ساتھ جو ہو رہا تھا وہ ماں کی تعظیم نہ کرنے کا نتیجہ بھی تو ہو سکتا تھا۔

جب ہم ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں تو قدرت کبھی بھی ہمیں چین میں نہیں رہنے دیتی۔بریخنہ نے کچھ نہیں کہا۔بس ہاتھ بڑھا کر اس کے بازو پر رکھا اور سہلانے لگی۔

برسوں سے قائل دونوں ماں بیٹی کے درمیان سرد مہری،تکلف اور نفرت کی دیوار گر گئی تھی۔عبادہ کو اندرونی سکون مل گیا تھا۔اس سے بہتر کچھ نہیں ہوتا کہ دو کے درمیان صلح ہو جائے۔اگر گل کو

ذرا سا محسوس ہوتا کہ اس کی ماں کا اور اس کا دکھ سانجھا ہے تو وہ کبھی بھی اپنی ماں کو برا اور خود کو اکیلا نہ محسوس کرتی۔ اگر کلیم کے لیے ایک دیوار سے پشت جوڑ کر وہ زار زار روتی تھی تو دوسری طرف بریخنہ پشت جوڑ کر دبی دبی سسکیاں لیتی تھیں۔ دونوں ایک ہی غم پہ روتی تھیں مگر الگ الگ۔ یہ اختلاف گل نے قائم کیا تھا۔

آج یہ فرق ختم ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ ماں کے کندھے پر سر رکھ کے باپ کے نقصان پہ رونا تکلیف کو کم کر رہا تھا۔ اس کو ماں کے لمس میں خود کو دفنا کر باپ کی اذیت کم لگی تھی۔ دوسری طرف بریخنہ جو ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو اپنے اندر جذب کرتی تھی، گل کی تمازت پا کر سکون پا گئی تھی۔ لوگ مشکل وقت میں بیٹوں کا کندھا مانگتے ہیں۔ انہوں نے اس کا مانگا تھا کیوں کہ ان کے لیے گل بیٹا تھا۔ ہمیشہ سے.....

☆.....☆.....☆

وہ ماں کی دعاؤں کے ساتھ گھر سے نکلی تھیں۔ بریخنہ ساتھ نہیں گئی تھیں کیوں کہ مجاہد خان سے اجازت نہیں لی تھی۔ اور کوئی دوسرا سربراہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ رک گئیں۔

عبادہ جانتی تھی کہ غاذان نے ان دونوں کو شندور لانے کے لیے منیب خان کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ منیب خان جس کو اچھی طرح سمجھایا گیا تھا کہ کسی بھی حال میں دونوں شندور نہ پہنچیں، اس وقت ایک کال کوٹھڑی میں کرسی پر رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غاذان چاہ کر بھی منیب خان کی موجودگی کا پتہ نہیں لگا سکے گا۔ اس لیے وہ دونوں اب کسی بھی ڈرائیور کے ساتھ جا سکتی ہیں۔ البتہ سکیورٹی کے لیے ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔

وہ فی الحال اپنی حفاظت کے لیے کسی مرد کو تلاش نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو جلد از جلد شندور پہنچنا تھا۔ عبادہ پچھلے ایک ہفتے سے منیب خان کی بجائے اس بوڑھے ڈرائیور کی خدمات لے رہی تھی۔

اس وقت اس سے زیادہ قابلِ بھروسہ ڈرائیور اور کوئی نہیں تھا۔ اس لیے دونوں نے اپنا سامان چھوٹی سی جیپ میں ڈالا اور شندور کے لیے روانہ ہوگئیں۔ جب ان کی گاڑی حویلی سے نکلی، تب عبادہ کو احساس نہیں ہوا کہ پارکنگ میں کھڑے کسی نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

سنگل روڈ پہ گاڑیاں وقفے وقفے سے گزر رہی تھیں۔ شندور کی وجہ سے یہاں کی ویران سڑکیں سال میں ایک بار کسی مصروف شاہراہ کا منظر پیش کرتی تھیں۔ کچی، کھردری سڑک سے دھول اٹھ رہی تھی۔ انہوں نے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ سارے اپنے اپنے شیشوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ عبادہ نے کھڑکی کے قریب کھسک کے سر سیٹ کی پشت سے جوڑ دیا اور آسمان کو دیکھنے لگی جہاں بادل تہہ بہ تہہ تیر رہے تھے۔

یہ وقت تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا تھا۔ ایون سے شندور کا فاصلہ پانچ سے چھ گھنٹوں میں سمٹ سکتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ شام میں اپنے صحیح وقت پہ شندور پہنچ جائیں گی۔

''تم نے بہت کوشش کی..... مجھے الجھانے کی..... پھنسانے کی..... مجھے بری طرح ہرانے کی..... لیکن تم شاید جانتے نہیں تھے کہ جب ایک چیز کا راز کھلنا ہوتا ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ تم نے شطرنج کی بساط پہ ان دیکھی، انجانی چالیں چلیں..... ان چالوں میں، میں الجھتی چلی گئی۔ ایک کڑی پھر دوسری۔ ایسا لگ رہا تھا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا لیکن اب میرے ہاتھ میں بس کچھ ہے''

عبادہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''میں تمہیں دکھاؤں گی کہ تم کیا ہو اور میں کیا ہوں۔ یہ دشمنی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ میں اور تم چترال کی سرزمین پر ملنے والے دو اجنبی تھے جو نہ اس سے پہلے کبھی ملے تھے اور نہ اس سے پہلے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ تم اور تمہارے چچے شاید مجھ سے واقف تھے لیکن میں تم سے چترال میں

ہی پہلی بار ملی تھی۔ہم دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہاں البتہ.....تم دشمن تھے.....میرے اور گل کے..... میں نے خود کو اور گل کو صرف تم سے بچایا ہے۔ مجھے دشمنی یا جنگ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میرا مدعا ہی نہیں ہے۔ میں تو حق کے لیے لڑ رہی ہوں۔ یوسف خان نے جب میری بے عزتی کی اور مجھے جانے کا کہا.....میں جا رہی تھی..... مجھے رکنا پڑا۔ صرف یہ جاننے کے لیے کہ آخر گھوڑوں کو ہوا کیا تھا۔ میں مانتی ہوں تم نے میرے لیے حالات بہت مشکل کر دیے تھے لیکن کہیں نہ کہیں غلطیاں تم نے بھی کی ہیں اور ان غلطیوں کو میں تمہیں تب گنواؤں گی جب تم میرے مدمقابل کھڑے ہو گے۔ پھر سے۔"

سڑک کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ میں کہیں کہیں لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

"شطرنج کی بساط پہ چال چلنے والے دونوں حریفوں کو لگتا ہے کہ وہ ہی جیتیں گے کیوں کہ ان کی چال کا توڑ نہیں۔ پہلے کی چال کو دوسرا توڑتا ہے اور دوسرے کی چال کو پہلا۔ جب دونوں ایک دوسرے کی گوٹیوں کو مارتے ہیں تو وہ عام الفاظ میں "مات" کہلاتی ہے لیکن جانتے ہو شطرنج میں اچھا کھلاڑی کبھی اپنی چال نہیں چلتا۔ وہ ہمیشہ دوسرے کی چال اس سے چلواتا ہے۔ وہ اپنا مہرہ چلانے سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ سامنے والا اس کے بعد کیا کرے گا اور جب اس کھیل میں ملکہ فتح ہوتی ہے تو اسے مات نہیں "شہ مات" کہتے ہیں اور تمہیں عنقریب شہ مات ملنے والی ہے۔"

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ ان کی گاڑی اس چٹیل پہاڑی پر چل رہی تھی جس کے ایک طرف پہاڑ تھا اور دوسری طرف کھائی۔

"اس دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ دل سے برے، دل سے اچھے۔ دل سے اچھے لوگ Expressive ہوتے ہیں۔ جلدی React کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں غصہ کر کے، غبار نکال کے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ دل میں خلش نہیں رکھتے جب کہ دل سے برے،

نیتوں میں برے ہوتے ہیں۔ حاسد ہوتے ہیں، بغض پالتے ہیں۔ وہ دوسروں کو ملی ہر اس چیز جو ان کے پاس نہیں ہوتی، اس سے جلتے ہیں، کڑھتے ہیں اور اسے پانے کے لیے وہ خود کی شخصیت تو تباہ کرتے ہی ہیں۔ ساتھ میں وہ دوسرے کو بھی صریح نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ناسور ہوتے ہیں، نسلوں کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔"

"عبادہ....." یونہی گل نے مخاطب کیا تو وہ اپنی سوچوں سے نکلی۔

"ہوں؟"

"شکریہ....." وہ اس کا ہاتھ دبا کے بولی۔

"کس لیے؟" عبادہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہر چیز کے لیے....."

عبادہ نرمی سے مسکرا دی۔ "میرے خیال سے جب ہمیں پتہ ہو کہ ہم کسی کی مدد کر سکتے ہیں تو ہمیں مدد کرنی چاہیے۔"

گل نے سر کو خم دیا۔ وہ دل سے خوش تھی۔ کل اس کے پاس دو کامیابیاں سمٹ کر آنے والی تھیں۔ ایک رستم کی، ایک بدلے کی۔ اس کے اندر سالوں سے پنپنے والا غصہ اب ختم ہو رہا تھا۔ ماں سے تعلق بحال ہو گیا تھا۔ نعیم کی گرفتاری کا سامان ہو گیا تھا۔ اس کا شندور میں پولو کھیلنے کا دیرینہ خواب بھی پورا ہو رہا تھا۔ رستم بھی مل جائے گا۔ اور کیا چاہیے تھا؟ زندگی میں سب "حاصل" ہونے والا تھا۔

گاڑی پہاڑ کے نشیب میں اتر رہی تھی۔ چاروں طرف پہاڑ تھے۔

"میں نہیں جانتی کہ تم آگے کیا کرنے والے ہو مگر میں تمہاری شکل پہ آنے والے اس ڈر کو دیکھنا چاہتی ہوں، جو تم نے میرے چہرے پر دیکھا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب چاروں طرف

سے چت ہو گئے تو تمہاری شکل پہ ہر وقت جاری و ساری رہنے والی مدھم سی مسکراہٹ اور کمینی سی خوشی کہاں جاتی ہے۔'' گو کہ یہ خیال سفاک تھا مگر وہ واقعی اس کی ہار کی منتظر تھی۔

اسی لمحے انہیں سڑک کے بائیں جانب کوئی آدمی کھڑا نظر آیا جو کوئی ٹوکری پکڑے گاڑی کے لیے ہاتھ جھلا رہا تھا۔اس نے شانوں کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ڈرائیور نے اس کے قریب گاڑی روک دی۔

''کیا ہوا رجب خان؟ ادھر کیوں کھڑا ہے؟'' ڈرائیور نے شاید اس آدمی کو پہچان لیا تھا۔اس لیے تعجب سے پوچھنے لگا۔

وہ شیشے میں آ جھکا۔''چترال تک جانا ہے صداقت خان اگر.....'' وہ بوڑھا آدمی چہکتے ہوئے بولا مگر یکدم اس کی نظر پیچھے بیٹھی ان دونوں پر پڑی۔''زنانہ ہے۔ٹھیک ہے۔تم جاؤ۔'' وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔

ڈرائیور نے بیک ویو میں اجازت طلب نظروں سے گل کو دیکھا۔چترال میں رواج تھا کہ راہ چلتے اگر کسی نے لفٹ مانگی تو اسے لفٹ دے دیا کرتے ہیں۔چوں کہ یہ پہاڑی علاقہ تھا اس لیے کم ترین ہی کسی کے پاس گاڑی ہوتی تھی۔لوگ پیدل ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ایسے میں اگر وہ لفٹ مانگتے تو لفٹ نہ دینا برا سمجھا جاتا تھا۔

''کاکا! بٹھا دو۔بوڑھا آدمی کب تک دھوپ میں انتظار کرے گا۔'' گل فکرمندی سے بولی۔

ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے شیشہ نیچے کیا اور سر باہر نکالا۔

''آ جاؤ رجب خان۔ہم بھی ادھر ہی جا رہا ہے۔تمہیں لے جائے گا۔''

رجب خان کے چہرے پر ممنونیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ پھرتی سے آگے آیا، دروازہ کھول کے بیٹھ گیا۔ٹوکری اپنی گود میں رکھ لی۔

''چترال کسی کام سے جا رہا ہے؟'' صداقت نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ رجب کے چہرے پر لفٹ ملنے کی دبی دبی سے خوشی تھی۔

''ہاں۔ دکان پہ جا رہا ہے۔''

''تمہارا دکان پہ آج کل تمہارا بیٹا بیٹھتا ہے ناں۔''

''ہاں۔ شعیب کو بٹھاتا ہوں ادھر۔ وہ حساب کتاب میں اچھا ہے۔ مجھ سے تو چند پیسوں کا حساب بھی نہیں ہوتا۔ کبھی گاہک کم دے جاتا ہے اور کبھی میں کسی کا بقایا رکھ لیتا ہے۔ اس لیے بیٹے کو بٹھا دیا ہے۔''

''اچھا.....''

گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ آگے ایون کا پل آنے والا تھا۔ پل پہ گاڑیاں ایک ساتھ نہیں گزرتی تھیں۔ ایک ایک گاڑی کے گزرنے کا انتظار ہوتا تھا۔ اوپر سڑک سے نیچے دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے ٹھنڈی سانس نکالی۔ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار پل کے دونوں جانب لگی ہوئی تھی۔

''شندور جب جب آتا ہے یہ سڑکیں آباد ہو جاتا ہے۔ دیکھو۔ کتنا گاڑی کھڑا ہے نیچے۔'' رجب خان کہہ رہا تھا۔

''وہی دیکھ رہا ہے۔'' ڈرائیور نے فکرمندی سے کہا۔ اسے جلد از جلد گل کو شندور پہنچانا تھا۔ یہ ٹریفک اور سڑکیں اس کے سفر میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ عبادہ باہر دیکھ رہی تھی جب کہ گل آنکھیں موندے کچھ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

''تم کو میرا دوسرا بیٹا یاد ہے صداقت خان۔'' رجب کوئی بات شروع کرنے لگا۔

''عمر؟''

''ہاں۔ وہی۔''

''یاد ہے۔''

''وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگے۔

''ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ کب ہوا ہے؟''

''کل ہی اس کا لیٹر آیا ہے جی ایچ کیو سے۔'' رجب خان پھولے نہ سما رہا تھا۔

''اچھا اچھا۔ بہت مبارک ہو۔ بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو۔'' وہ پل کے پاس پہنچ گئے تھے جہاں گاڑی کی قطار لگی ہوئی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے جس نے یہ دن دکھایا۔ میں تم کو مٹھائی کھلاتا ہے۔'' اس نے جلدی سے ٹوکری کھولی، اندر سے ڈبا نکالا جس میں سفید اور سیاہ گلاب جامن پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاب جامن اٹھا کے اسے پکڑایا۔

''شکریہ۔'' صداقت نے لڈو لیتے ہوئے ممونیت سے کہا۔

''بچے تم لوگ بھی لو۔ میرا بیٹا بھرتی ہوا ہے فوج میں۔'' اس نے ڈبا گل کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔ گل نے مسکراتے ہوئے ڈبے سے ایک لڈو نکال لیا۔ عبادہ نے بھی مروت سے لڈو اٹھایا۔

''شکریہ کاکا۔'' وہ دونوں بیک وقت بولیں۔

''کوئی بات نہیں۔ میں تو اتنا خوش ہے کہ کل سے سب کو مٹھائی بانٹتا پھر رہا ہے۔'' اس نے ڈبا بند کیا اور ٹوکری میں واپس رکھ دیا۔ ٹوکری کے گرد ہاتھ باندھتے ہوئے وہ اطمینان سے باہر دیکھنے لگا۔

''عمر کو میری طرف سے مبارک باد دینا۔'' صداقت نے لڈو نگلتے ہوئے محبت سے کہا۔

''ان شاءاللہ۔ ضرور۔'' اس نے سر کو خم دیا۔

گاڑیوں کی لمبی قطار دھیرے دھیرے سے پل پر چڑھ رہی تھی۔ ان کی گاڑی ہلکی ہلکی رینگ

رہی تھی۔عبادہ اور گل کو تھکن تھکن محسوس ہونے لگی۔گردن کے پٹھے کھنچے جا رہے تھے۔شاید گاڑی چیز ہی ایسی ہے۔یہ تھکے ہوئے انسان کو لوریاں سنا سنا کے سلا دیتی ہے۔دونوں کو گہری غنودگی نے گھیر لیا۔جمائیوں پہ جمائیاں آنے لگیں۔گل نے سیٹ کی پشت سے سر جوڑ دیا جب کہ عبادہ سر شیشے پہ رکھے بھاری بھاری پلکیں جھپکنے لگی۔

پل کراس کرنے کے بعد رجب نے احتیاطاً مڑ کر پیچھے دیکھا۔وہ دونوں گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔وہ مسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔

''صداقت خان۔''

''ہوں؟''

''گاڑی کالاش کی طرف موڑ دو۔''وہ سپاٹ سے انداز میں بولا۔صداقت خان چونکا۔

''تم کو کالاش جانا ہے؟''

''نہیں۔ہم سب کو کالاش جانا ہے۔'' کہتے ہی اس نے ٹوکری سے پستول نکالی اور بڑے ہی آرام سے بوڑھے ڈرائیور کی کنپٹی پر تان لی۔صداقت کا دل ڈوب کر ابھرا۔

''یہ.....یہ.....کیا کر رہا ہے تم رجب خان.....'' گھبراہٹ سے اس کے ہاتھوں گاڑی ڈگمگانے لگی تھی۔

''میں نے کہا گاڑی کالاش کی طرف موڑو صداقت خان ورنہ اس پستول کا سارا گولی تمہارا کھوپڑی میں اتار دے گی۔'' جس طرح رک رک کے رجب خان نے یہ فقرہ ادا کیا تھا صداقت خان کو اپنا دل پیٹ میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے بے اختیار بیک ویو میں دونوں بیبیوں کو دیکھا جو نشہ آور لڈو کھانے کے بعد گہری نیند میں چلی گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھوں پر بھاری پتھر پڑے ہوئے تھے، پپوٹے اٹھ نہیں رہے تھے۔اس نے خمار آلود انداز میں پلکیں اٹھانے کی کوشش کی۔آنکھوں کے آگے شدید دھندلاہٹ تھی۔اس کی گردن بائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔گردن کا وہ حصہ سن ہوگیا تھا۔غالباً کوئی نس تھی جو کھنچ گئی تھی۔اس نے بے اختیار گردن کی پشت پہ ہاتھ رکھا اور دھیرے سے سر کو دائیں بائیں موڑا۔سارا منظر گھوم رہا تھا۔ہر چیز دہری نظر آرہی تھی۔

وہ پوری طرح بھیگی ہوئی تھی۔چہرے اور سر پہ بار بار کچھ نم سا گر رہا تھا۔کئی بار پلکیں جھپکنے کے بعد اس کے اعصاب قدرے بیدار ہوگئے۔اس نے ارگرد نظر دوڑائی۔

وہ ایک چھوٹا سا چکور کمرہ تھا جہاں وہ ایک ستون سے ٹیک لگا کے بیٹھی ہوئی تھی۔کمرے کی دیواریں چکنی سیمنٹ سے بنی ہوئی تھیں جن پر ہلکا ہلکا پانی پھسل رہا تھا۔کونے میں ایک ڈِم سی لائٹ بار بار جل بجھ رہی تھی جس کی وجہ سے صحیح سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔یہ کونسی جگہ تھی؟ وہ یہاں کیا کر رہی تھی۔تعجب اور الجھن سے وہ دھیرے سے کھڑی ہوئی اور یہاں وہاں دیکھا۔چھت سے کئی جگہوں سے پانی ٹپک رہا تھا جس سے فرش مناسب حد تک پانی سے بھرا ہوا تھا۔اس کے پیر پانی کے اندر تھے۔وہ بری طرح گھبرا گئی۔وہ کہاں تھی؟ یہ کیسی جگہ تھی۔

ذرا ٹھہر کے دماغ پہ زور ڈالا۔

وہ شندور جا رہی تھی۔وہ عبادہ.....صداقت خان۔ایون کا پل آیا تھا۔وہ لڈو کھائے۔اسے نیند آئی پھر.....پھر.....اس کے بعد کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔اس نے کنپٹی رگڑی۔اصولاً اسے اس وقت شندور ہونا چاہیے تھا۔وہ کہاں تھی؟ کیا وہ شندور پہنچ گئی تھی؟ نہیں۔یہ شندور نہیں تھا۔پھر؟

اس سے پہلے کہ وہ گھومتی، آس پاس کو ٹٹولتی اسے بہت قریب سے ایک مزاحمت بھری آواز سنائی دی۔"اووووں.....اووووں....."

اس کا حرکت کرتا وجود رک گیا، وہ سانس روکتے ہوئے دھیرے سے مڑی.....اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

عبادہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔منہ پہ کس کے کپڑا بندھا ہوا تھا۔اس کے سر پہ ایک اسلحہ بردار کھڑا تھا جس نے رائفل کی نال اس کے سر پہ تانی ہوئی تھی۔وہ بری طرح سسک رہی تھی۔کئی ساعتیں لگیں گل کو یہ یقین کرنے میں کہ وہ عبادہ کو دیکھ رہی ہے۔

''اووں.....اووں.....'' عبادہ خود کو چھڑانے کی مکمل کوشش کر رہی تھی۔یکدم کمرے میں لائٹ جل اٹھی، ہر چیز روشن ہوگئی۔

''ہوش کی دنیا میں خوش آمدید گل.....''

وہ ایڑیوں کے بل پلٹی۔وہاں سیڑھیوں پر وہ پرسکون سا بیٹھا ہوا تھا۔ایک ٹانگ نیچے فرش پہ تھی اور ایک مڑ کر نچلی سیڑھی پہ رکھی ہوئی تھی۔وہ ہاتھ میں گن کو انگلی پر گول گول گھما رہا تھا۔

''غاذان.....'' اس کے لب ہلے۔

''کریکٹ!!'' وہ اس کے تاثرات دیکھ کے محظوظ انداز میں مسکرایا۔

☆.....☆.....☆

دو ماہ قبل.....

اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔اس سب کا فیصلہ غاذان نے خود کبھی نہیں کیا تھا۔اس کا فیصلہ اس کا باپ کرتا تھا۔اس کو کس کلاس میں کتنے مارکس لینے ہیں۔کونسی پوزیشن لینی ہے۔کب پڑھنا ہے۔کب کھیلنا ہے۔کس سے دوستی رکھنی ہے۔کس سے بات کرنی ہے۔کب سونا ہے؟ کب جاگنا ہے۔کس کلاس میں کس مضمون کا انتخاب کرنا ہے۔کس موقع پر کس طرح کا طرزِ عمل اپنانا ہے۔کب کہاں کس سے کیسے پیش آنا ہے۔رشتوں کی حدود کیا ہے۔زندگی کا مقصد کیا

ہے۔اس سب کا تعین نعیم اللہ خان کرتا تھا۔غاذان کو بذاتِ خود کسی قسم کے انتخاب کی گنجائش نہیں تھی۔اگر نعیم کہتا کہ آج میٹھا نہیں کھانا تو بے پناہ دل ہونے کے باوجود غاذان خان میٹھا نہیں کھاتا تھا۔اس نے اپنے بیٹے کی تربیت نہیں کی تھی۔اسے اپنے تابع کیا تھا۔

وہ بچپن سے ہی اسے سردار بننے کا خواہاں رہا تھا۔جیسے ازل سے بادشاہی کا قانون قائم ہے کہ بادشاہ کا پہلا بیٹا مستقبل کا بادشاہ ہوتا ہے،اسی طرح مہتر کا قانون بھی تھا۔ہر سردار کا پہلا بیٹا ہی سردار بنتا ہوا آرہا تھا۔یوسف خان کی نااہلی کے بعد اس کو پورا یقین تھا کہ وہ سردار بنے گا۔چوں کہ کلیم اس سے زیادہ چھوٹا نہیں تھا اور سردار کے سارے گن بھی اس میں پائے جاتے تھے۔اس لیے نعیم کو اس سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔جب سرور خان نے دونوں کو سرداری کے لیے نامزد کیا تب کلیم اللہ کے دل پہ گھونسا پڑا۔اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ قابلیت اور ہنر کے میدان میں اس کے داجی اس کا موازنہ اس کے چھوٹے بھائی سے کریں گے جو نہ صرف سرداری میں غیر دلچسپی دکھا رہا تھا بلکہ اسے کوئی خاطر خواہ شوق بھی نہیں تھا۔

جانے کیوں اس کے والد نے وہ ان دیکھا بوجھ اس کے سر تھوپ دیا تھا۔کلیم اللہ نہیں بننا چاہتا تھا سردار تو کیا حرج تھی۔نہ بنتا۔زبردستی اس سے وکالت چھڑا کر اس کو مہتر کے لیے دوڑ میں شامل کر دیا۔اگر داجی نے پولو کی بجائے کوئی اور شرط رکھی ہوتی تو اسے کوئی غم نہیں تھا۔وہ با آسانی جیت سکتا تھا کیوں کہ کلیم پچھلے سات سال سے شہر سے باہر تھا۔اس دوران اس نے اپنی تمام تر طاقت اپنی قابلیتوں کا لوہا منوانے میں نکال دی تھی۔اس نے ہر طرح سے داجی کو راضی کر لیا تھا۔چاہے وہ تیر بازی کا میدان ہو یا پہلوانی کا اکھاڑا۔نجی معاملات کی لین دین اور مسائل ہوں یا پھر قبائلی تعصب کی چپقلش۔کھیتی کے زیرو بم ہوں یا پھر انتظامی امور کے نشیب و فراز۔اس نے ہر طرح سے اپنی قابلیت اور اپنے کارکردگی سے داجی کا دل جیتا تھا۔

وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اتنے سالوں کی کڑی محنت کے بعد اس کے داجی کلیم اللہ کو سرداری کی دوڑ میں شامل کرلیں۔کلیم نے تو گاؤں کے مسئلوں پر کبھی توجہ دی ہی نہیں تھی۔وہ جب جب چھٹیوں میں آتا تھا۔قریہ قریہ بلوری پہ گھومتا تھا۔لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔ان کے حال احوال دریافت کرتا تھا۔ان کے مسائل کی باز پرس کرتا تھا۔اس نے کبھی ان مسائل کو حل نہیں کیا تھا۔اپنی ذہانت سے وہ نجی مسائل کا نقشہ کھینچ کے ان کے حل کے طریقے بتا دیتا تھا۔داجی اس کے حل سے متاثر ہوکر ان مسائل کو ختم کردیتے۔یوں کسی بھی صلح یا فتح کے بعد کلیم اللہ کا جھنڈا وہاں لہرانے لگ جاتا۔اس فتح میں نعیم نے کتنی محنت کی ہے۔اس نے کتنا کشت ولہو سے کام لیا ہے۔اس کا ادراک کوئی نہیں کرتا تھا۔اس کی مثال ایک مزدور کی طرح تھی جو ساری عمارت تو بنا دیتا ہے مگر آخر میں عمارت پر اس کے مالک کا نام کندہ ہوجاتا ہے۔

داجی چاہے کوئی بھی مقابلہ رکھتے،اس کو شکایت نہیں تھی مگر جیسے ہی انہوں نے شندور پولو کا انتخاب کیا۔وہ زِچ ہوگئے۔کلیم کے پاس چترال کے مسائل اور معاملات کی پہچان قدرے کم تھی لیکن وہ ایک بہترین گھڑسوار اور شندور پولو پلیئر تھا۔وہ ہر سال شندور کھیلنے آتا تھا اور اس کی کارکردگی قابلِ تحسین ہوا کرتی تھی۔ایسا نہیں تھا کہ نعیم کو پولو کھیلنا نہیں آتا تھا۔وہ بھی اچھا کھیلتا تھا مگر اس نے باقی معاملات پر بدرجہا دھیان دیا تھا۔اس نے ہر کھیت میں قدم رکھا تھا۔خود کو کئی صورتوں میں الجھانے کے بعد ان کے پاس حاصل صورت یعنی شندور پولو کے لیے مشق کی اتنی گنجائش نہیں نکل پاتی تھی جو عموماً نکلنی چاہیے۔کلیم کا سارا دھیان ہی بلوری اور اس کی سواری پر ہوتا تھا۔نامزدگی کے بعد شرط کا اعلان سن کے اس کا دماغ اڑ گیا تھا۔ایسا لگا تھا جیسے داجی نے شرط نہیں رکھی،اس کی تذلیل کی ہو۔وہ یوسف خان کی نااہلی کے بعد بغیر کوئی حدو قیود رکھ کے بھی تو اس کا انتخاب کرسکتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ کلیم مہتر میں دلچسپی نہیں لیتا پھر اس کو اس کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی کیا

منطق بنتی تھی؟

کلیم قابل تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس مقابلے میں جیت سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھلے ہی کلیم کا سرداری میں کوئی ذوق نہ ہو مگر وہ داجی کی خواہش پر نہ صرف اس مقابلے میں بھرپور حصہ لے گا بلکہ اس مقابلے کو جیت کر سرداری کی پگڑی اپنے سر سجائے گا۔ نعیم کو اس بات کا غم لگ گیا۔ بلاشبہ داجی کی طرف سے زیادتی ہوئی تھی لیکن اس نے بجائے باپ سے بات کرنے کے اپنے دل میں باپ اور بھائی کے خلاف کڑواہٹ پال لی۔ اس کڑواہٹ کا اثر اس قدر تلخ نکلا کہ وہ بے حس ہو گئے۔ جس بھائی کے ساتھ ایک تھالی میں کھانا کھایا تھا۔ مہتر کے لیے اس کا خون کر دیا۔ وہ کلیم کی گھوڑی کو شندور کے میدان میں بپھرنا چاہتے تھے تاکہ وہ سرپھری ہو کر بھاگ جائے اور یوں کلیم گر کر زخمی ہو جائے۔ اس کا زخمی ہونا یعنی پیشگی سرداری کے لیے نااہل ثابت ہونا۔ تب داجی بغیر کوئی سوال کیے اس کو منتخب کر لیتے اور وہ مہتر بن جاتا۔ بدقسمتی سے کلیم کا گھوڑا رمیز پہ چڑھ دوڑا۔ اگر رمیز زخمی ہو جاتا تو کمیٹی کلیم سے بلوری چھین لیتی اور اس کو کوئی اور گھوڑا دے دیتی۔ چوں کہ کلیم کو کسی دوسرے گھوڑے کے لمس کی پہچان نہیں تھی تو ممکن تھا کہ وہ ڈگمگا جاتا مگر بدقسمتی سے رمیز کی موت ہو گئی۔

اسے پتہ تھا کہ بلتیوں نے اس کو حادثہ مانا ہے لیکن ان کا اس المیہ کو حادثے کا نام دینا نعیم کی ہار کے مترادف تھا۔ اس کے بعد فیصلہ سکور پہ ہوتا۔ کلیم کا سکور زیادہ تھا۔ وہ یہ چانس ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے جہانگیر جو اس کا دوست تھا۔ اس کے کان بھرنا شروع کیے۔ جب ہمارا کوئی پیارا مرتا ہے تو ہم ان دنوں میں ایک ساتھ کئی تکالیف سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ کچھ تکلیفیں باہر کی ہوتی ہیں اور کچھ ہمارے اندر کی۔ اس لمحے ہمارا دماغ جگہ پر نہیں ہوتا۔ ہم دیوانے ہوئے پھرتے ہیں۔ جہانگیر کی اس دیوانگی کا فائدہ اس نے اٹھایا اور کلیم اللہ کو مجرم مان کر مار دیا۔ اس دن کھائی کے

سرے پر اس کا ارادہ نہیں تھا کلیم کو گولی مارنے کا۔ وہ یہ سارا کام جہانگیر کے ہاتھوں کرنا چاہتا تھا لیکن جہانگیر ڈگمگا گیا۔ اس کی ڈگمگاہٹ نے کلیم کا راستہ ہموار کیا اور اس کو بچاؤ کی صورت نظر آ گئی۔ اس نے اپنے دفاع میں کئی ہاتھ پیر مارے اور یوں جہانگیر کو زمین بوس کر دیا۔ اگر جہانگیر مر جاتا یا زخمی ہو جاتا تو کلیم نہ صرف اپنی جان بچا لیتا بلکہ اس کا سارا پلان ہی چوپٹ ہو جاتا۔ اس لیے اس نے دو گولیاں چلائیں اور اسے مار دیا۔

جب جہانگیر کو حقیقت پتہ چلی تو اس نے نعیم سے رابطہ کیا۔ تب نعیم چترال چھوڑ کے جا چکا تھا۔ جہانگیر نے بہت غصہ کیا، بہت لعنت ملامت کی لیکن نعیم نے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اس نے کلیم سے اس کی جان بچائی تھی۔ اگر وہ گولی نہ چلاتا تو کلیم اسے مار چکا ہوتا۔ دوم وہ کلیم کی موت میں اول تا آخر شامل رہا ہے۔ اگر اس نے زبان کھول بھی دی تو دونوں ایک ساتھ سزا پائیں گے۔ نعیم نے کہا کہ اس کے داجی کو سب معلوم ہو گیا ہے اس لیے وہ عاق کر کے چترال سے نکالا جا چکا ہے مگر وہ اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ اپنے مذموم ارادوں اور شیطانی نیتوں سے تھما نہیں تھا بلکہ اپنی پکڑ نے اسے مزید شیر کر دیا تھا۔ بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے اور بھاوج و بھتیجی سے معافی مانگنے کے اس نے اپنے بیٹے کو اپنا مہرہ چنا اور اسے تراشنے لگا۔

غاذان سے باپ جدا ہوا تھا۔ وہ باپ جو ہر وقت اس کے سر پہ سائے کی طرح رہتا تھا جو اس کو پورے دن کا شیڈول بنا کر دیتا تھا۔ نعیم نے اپنے بیٹے کو سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے اپنا فرماں بردار نہیں بنایا تھا بلکہ پیار محبت، لالچ، تعریف اور حرص سے اسے اپنا وفادار بنایا تھا۔ اس وقت فون عام نہیں تھے مگر وہ پھر بھی خطوط کے ذریعے اپنے بیٹے سے رابطے میں تھا۔ اس کے سکول، کالج اور یہاں تک کہ یونی ورسٹی تک ساری تعلیم کے گریڈز، پرسنٹ ایج، پوزیشن اس نے منتخب کی تھی اور بلاشبہ غاذان نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے چھیانوے فیصد لکھ کر دیا تھا تو غاذان

ستانوے فیصد نمبر لیے تھے۔ وہ اپنے باپ کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اس کا دل سے تابعدار تھا۔

پانچ سال پہلے جب وہ لندن جا رہا تھا تو اس کی اپنی مرضی شامل نہیں تھی لیکن یہ اس کے باپ کا فیصلہ تھا تو اسے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ نعیم اللہ جانتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو لندن بھیج کے کیا کچھ حاصل کرنے والا ہے۔ انہوں نے چترال کی سرزمین پر کھیتی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بیج کی بوائی سے فصل کی کٹائی تک سارا انتظام انہوں نے سنبھالا تھا اور ایک مہتر کے لیے یہی چیز انتہائی اہم ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے غازان کو لندن بھیجا تا کہ وہ وہاں سے کھیتی باڑی اور معیشت میں ڈگری لے کر آئے اور یہاں چترال کی سرزمین پر اپنی عقل و ذہانت کی دھاک بٹھا لے۔

لندن میں ابھی چار سال چار ہی ہوئے تھے جب اس کی ماں مسفرہ بیمار پڑ گئی۔ انہیں ٹی بی ہوا تھا۔ اپنے مرض سے وہ دو ماہ بھی نہیں لڑ پائیں اور دنیا سے چلی گئیں۔ وہ اپنی ماں کی موت پہ لندن سے واپس آیا۔ اس کی ڈگری مکمل ہو گئی تھی۔ یہاں آ کے نعیم اللہ نے اسے دو ہفتے بھی ماں کا سوگ نہیں منانے دیا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یوسف خان نے اٹھارہ سال سے چلتی کھووار اور بلتیوں کی دشمنی کو پچھلے سال ختم کر لیا ہے اور اس سال یقیناً نیا سردار چنا جائے گا۔ اسے علم تھا اس لیے اس نے روگ اور سوگ پہ وقت ضائع کرنے کی بجائے بیٹے کو یوسف خان کی نظروں میں اعلیٰ مقام بنانے کا حکم دیا۔

اس وقت وہ اپنی کی قبر پہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ پہلو میں پھولوں سے بھرا شاپر تھا جس سے وہ مٹھیوں میں پھول بھر بھر کے مسفرہ کی قبر پر ڈال رہا تھا۔ اس کے کان سے فون جڑا ہوا تھا جہاں نعیم اللہ کہہ رہا تھا۔

"تمہیں اپنی ماں کا سوگ نہیں منانا غازی۔ تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ اپنی ماں کی قبر پہ بہانے کے لیے تمہیں آنسو بھی مل جائیں گے اور وقت بھی۔" وہ بہت سفاکیت سے کہہ رہے

تھے۔اس کے پھول ڈالتے ہاتھ تھم گئے۔''اس وقت تم بھول جاؤ کہ تمہاری ماں مری ہے۔تم نکلو اس روگ سے اور اس بھیڑیے (یوسف خان) کی نظروں میں اپنا مقام بناؤ۔مجھے گلگت سے رمق پڑی ہے غازی کہ اس سال ہی نئے سردار کا اعلان کیا جائے گا۔تمہیں اس کی تیاری کرنی ہے۔بے کار باتوں پر وقت ضائع نہیں کرو۔مرد ہو تم۔اس عمر میں روتے ہوئے اچھے لگو گے؟مسفرہ کی اتنی ہی عمر لکھی تھی۔ہم اللہ کے کاموں میں مداخلت نہیں کر سکتے۔اس لیے تم سے تقدیر کا لکھا جان کر قبول کرلو اور اپنی سرداری کی تیاری کرو۔اب تم لندن سے واپس آچکے ہو۔تمہاری عمر بھی سرداری کے لائق ہوگئی ہے۔اس لیے اپنے اصل مقصد کی جدوجہد میں لگ جاؤ۔''اسی لمحے اسے غاذان کی سسکی سنائی دی۔وہ اٹھائیس سال کا مرد رو رہا تھا۔نعیم اللہ کو اپنی سفاکی کا احساس ہوا۔اس نے گہری سانس لی اور اپنے لہجے کو نرم رکھا۔

''غازی!میرے بچے۔تمہاری ماں وہاں چلی گئی ہے جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا لیکن تمہارا باپ ایسی جگہ ہے جہاں سے واپس آسکتا ہے۔میری جان میں نے اٹھارہ سال تم لوگوں سے دوری سہی ہے۔میں نے یہ سزا،یہ تکلیف اس لیے کاٹی ہے کہ مجھے امید تھی کہ میرا غازی بڑا ہوگا۔وہ میرے دشمنوں کی دی ہوئی ذلت کا بدلہ لے گا۔وہ مجھے واپس لائے گا۔اگر تم نے مجھے آج بھی ناامید کیا تو وہاں اپنی ماں کے پہلو میں ایک قبر میرے لیے بھی کھود دینا۔میں بھی خودکشی کر کے مرجاؤں گا۔''

جذباتی دھمکیاں!

''میں نے اتنا انتظار کیا ہے کہ کب میرا غازی بڑا ہوگا۔کب وہ میرے کمزور کندھوں کا سہارا دے گا مگر تم وہاں اپنی ماں کا ماتم کر رہے ہو۔مرد ہو کر ٹسوے بہا رہے ہو۔میں نے اپنے بیٹے کو اتنا کمزور تو نہیں مانا تھا۔اس لیے خدارا میرے غازی،تمہاری ماں واپس نہیں آسکتی،اس کا غم چھوڑ

دو۔وہ ہم سے اچھی جگہ پر ہے۔تم میری فکر کرو۔میں تکلیف میں ہوں۔اٹھارہ سال سے تم لوگوں سے دور ہوں۔میرے بچے میرے بغیر بڑے ہوگئے ہیں۔میری بیٹیاں،میرے بیٹے۔کچھ تو کرو کہ تمہارے باپ کو اس بڑھاپے میں تم لوگوں کا سکھ نصیب ہو جائے۔"

غاذان کا دل کٹ کے رہ گیا۔وہ دونوں سے ایک عرصے تک دور رہا تھا۔وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اس کی ماں کے بعد اس کا باپ بھی چلا جائے؟ ہم سارے رشتوں سے محبت کر سکتے ہیں۔ان پہ جان چھڑک سکتے ہیں لیکن جان دینے کی بات آجائے تو وہ ہم صرف ماں باپ کے لیے یا ماں باپ ہمارے لیے دے سکتے ہیں۔یہ جگر کاٹنے والی قربانی۔والدین اور اولاد سے منسوب ہے۔

اس نے باپ کا حکم سر تسلیم خم کیا۔اس نے کڑی محنت شروع کردی۔اول اول اس نے یوسف خان کے ذاتی مسائل کی طرف توجہ دی اور اسے حل کرنے میں ان کی مدد کی جن میں اکثریت کا تعلق کسی قبیلے سے ناراضگی تھی۔قبائل کو راضی کیا۔کہیں لفظ استعمال کیے،کہیں خوشامدیں کیں۔کئی جگہ ذاتی پیسہ بھی لگایا لیکن اس نے یوسف خان کو جائز اور ناجائز دونوں میں حمایت دی۔یوسف خان اس کی ذہانت اور رویے سے متاثر ہو رہا تھا۔غاذان جب جب ان کے ساتھ ہوتا،خود نہیں بیٹھتا تھا۔کھڑا رہتا تھا۔یوسف خان کو پانی بھی چاہیے ہوتا تو غاذان خود لاکر دیتا تھا۔کوئی تحفہ،سوغات،کوئی ملاقات،کچھ منگوانا ہو،کسی کو سمجھانا ہو،کسی کی تعزیت،کسی کی تیمارداری کرنی ہو سب کچھ غاذان کر رہا تھا یہاں تک وہ گھر کے ذاتی مسائل میں بھی مداخلت کرنے لگا تھا۔یہ سب ایک کارگر کا منصوبہ تھا۔نعیم نامی کاریگر کا۔اپنے طور طریقوں سے تو غاذان ابتہاج کے مقابلے میں تعلیم یافتہ اور باشعور مرد نظر آتا تھا لیکن اس نے کب کہاں کیسے بات کرنی ہے۔کس کو کیسے کس نظر سے دیکھنا ہے۔لوگوں،قبیلوں اور یوسف خان کی نظر میں کیسے مقام بنانا ہے۔یہ سب اسے فون پر

وقتاً فوقتاً نعیم اللہ بتاتا تھا۔ وہ بھی کسی شاگرد کی طرح ہر رات اپنے سبق دہرا کر باپ کو سنا دیتا تھا پھر اگلے دن کی ڈائری لینے کے بعد سو جاتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس نے فصلوں اور کھیتوں پر دھیان دیا۔ لائیو سٹاک، اصطبل، کھیت کھلیان اور ان کی زرخیزی کو ماپنے، مٹی کی ٹیسٹنگ، کھادوں کی ملاوٹ، پانی، نہری نظام کیسے چلانا ہے۔ اس میں کیسے جدیدیت لائی جاسکتی ہے۔ زرخیزی کو کیسے بڑھایا جاسکتا ہے۔ بارانی زمین میں کھاد اور نہری زمین میں نمکیات ملانے کی مقدار کا تعین اس نے کیا تھا۔ وہ اس سب کا تجربہ رکھتا ہے۔ لندن سے پڑھ کے آیا تھا۔ اس نے جہاں کھیتوں کی پیداوار میں ہاتھ بٹایا، وہیں ادویات، مشینری کو متعارف کروایا۔ فصلوں کی بوائی اور کٹائی میں نت نئے مشینوں سے چترال کی مقامی فصلوں کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ لوگوں کے کاندھوں اور ہاتھوں کی محنت میں سہولت آئی تھی۔ جو فصل پہلے درانتی سے کاٹی جاتی تھی، اب اس کے لیے مشین آگئی تھی جو نہ صرف فصل جاتی تھی بلکہ اس کا بیج میں ساتھ ساتھ نکالتی جاتی تھی۔ اس طرح لوگوں کا وقت کم استعمال ہونے لگا اور فصل کی پیداوار بھی اچھی ہوگئی۔

ان چھ گھوڑوں کو شندور میں دینے کا مشورہ بھی اس کا تھا جو یوسف خان کو بے حد پسند آیا تھا۔ اسی طرح نئے پل بنانے، روڈ ٹھیک کرنے، ہسپتال، ڈسپنسریاں بنوانے کے منصوبے بھی اسی نے متعارف کرائے تھے۔ اس کی محنت اور مشاقی سے کھووار قبیلے کی فصل چالیس فیصد زیادہ ہوئی تھی۔ ربیع اور خریف دونوں کی فصلوں میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا جو غاذان کے لیے ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس نے یوسف خان کے دل میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ وہ لیڈری باڈی (راہبری جسم) رکھتا تھا۔ اس کے انداز میں طنطنہ تھا۔ اس کے رویے میں مٹھاس تھی۔ اسے بات کرنے کا اور لوگوں کا دل جیتنے کا فن آتا تھا۔ بچہ ہو، بوڑھا ہو یا جوان، غاذان سب کا ہم عمر تھا۔ وہ سب کے ساتھ ان کی

عمر کے مطابق پیش آتا تھا۔ یوسف خان کو اپنی بھتیجے سے انسیت ہوگئی تھی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ سب ڈھونگ ہے۔ دکھاوا ہے۔ نمائش ہے۔

نعیم اللہ نے اسے گھڑ سواری سیکھنے کا مشورہ دیا لیکن غاذان کو گھوڑے پسند نہیں تھے۔ وہ گاڑیوں کا شوقین تھا اور اس شوق کی نشوونما خود لندن نے کی تھی۔ وہ عالیشان گھوڑوں کی بجائے چمچماتی اور لش پش گاڑیوں کا دلدادہ تھا۔ وہ دو تین بار گھوڑے پہ بیٹھا لیکن ہر بار ڈگمگا گیا۔ اس ڈگمگاہٹ کی وجہ جھجھک اور غیر دلچسپی تھی۔ اگر کوئی غاذان کو لینڈ کروزر اور فریشین گھوڑوں میں سے انتخاب کرنے کا موقع دیتا، تو وہ لینڈ کروزر لیتا۔ مہنگی، چمکتی ہوئی، دھونس والی کار۔ اگر وہ اپنے اس انتخاب کی وجہ بتاتا تو وہ کہتا۔ ''یہ گھوڑے سے تیز چلتی ہے۔''

ظاہر ہے اس کے نزدیک مغربی لباس پہننا، پٹ پٹ انگریزی میں بات کرنا، مہنگی ایکسیسریز پہن کے نک سک سے تیار ہو کر نرم و نازک لڑکیوں کا دل موہ لینا ہی اصل لش اور ششکے والی زندگی تھی۔ لندن سے اکنامکس پڑھ کے آنا اور یہاں کھیتوں کھلیانوں اور جرگے قبیلوں کے جمگھٹے میں پھنس جانا اپنی زندگی کو خراب کرنے کے مترادف تھا۔ وہ اس سب کا شوق نہیں رکھتا تھا لیکن نعیم اللہ کے کہنے پر اور اس کے بے جا اعتراض پر غاذن کو زبردستی ہر چیز سے محبت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ یا منزل نہیں تھی۔ بس ایک سادہ سا منصوبہ تھا کہ چترال کا سارا کام باپ کو سونپ کر وہ اسلام آباد چلا جائے گا اور وہیں سیٹل ہو جائے گا۔

نعیم اللہ کو اس کی اس خواہش کی بھنک تھی، ظاہر وہ اس کا خون تھا۔ اس لیے وہ اکثر غاذان سے کہتا کہ تمہیں اگر ''اپنی'' زندگی ''اپنے'' مطابق جینی ہے تو تمہیں رستم کو حاصل کرنا ہوگا جو سب سے قیمتی اور تمام جائیداد کا بس فیصد ہے۔ نعیم جانتا تھا کہ جیسے ہی وہ اپنے بیٹے کو سرداری کی گدی پر بٹھائے گا۔ چند مہینوں بعد وہ چترال آ کر اپنی دھونس جماتے ہوئے نہ صرف پورے خاندان کو تباہ

کرے گا بلکہ سب کا بٹوارہ کر کے سب کو اپنی راہ لگائے گا۔ اتنے سالوں میں اس نے بھی شہر کے خوش و خوشبو کا مزہ چکھ لیا تھا۔ اسے سرداری کی طلب ہی اس لیے تھی تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جائیداد اپنے نام کر سکے۔ چوں کہ وہ بلوری کی قیمت سے واقف تھا اس لیے اسے رستم کی قیمت اور نایابی کا اندازہ بھی تھا۔ اس لیے اس نے غاذان کو رستم کو کسی بھی طرح کا غذی کارروائی ہو یا زور زبردستی، اپنا بنانے کا مشورہ دیا۔

اس لالچ کے پیش نظر غاذان نے رستم کو حاصل کرنے کی ہامی بھر لی۔ رستم چھ فٹ کی لمبی سیاہ گھوڑی تھی۔ اس کا وزن، قد کاٹھ اتنا بھاری اور رعب دار تھا کہ عام نوعیت کے تین گھوڑے اس کے وزن سے مساوی ہو سکتے تھے۔ وہ گھوڑوں کے بیچ بے نیازی سے رہنے والی اعلیٰ اور عالیشان گھوڑی تھی۔

اسی دوران یوسف خان نے سردار کو نامزد کر دیا۔ سرداری میں اپنا ایک وایک نام دیکھ کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کتنے ہی سالوں بعد یہ اتفاق ہوا تھا کہ سرداری کے منصب کے لیے اس کا ہامی امیدوار ساتھی نہیں تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ یوسف خان کے اعلان کے بعد غاذان کو لگا جیسے اس نے زندگی کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ سردار بننا اس کی گول تھا اور اس کے باپ کا خواب۔ وہ شاید اپنے وقت کا واحد سردار نامزد ہوا تھا جس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے دوسرا کوئی ہمعصر نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا اور جب مقابلے میں انسان اکیلا ہوتا ہے تو وہ کبھی بھی ہار نہیں سکتا۔

یوسف خان نے جو اس کے لیے شرائط رکھی تھیں وہ قدرے مشکل تھیں۔ دراصل یوسف خان دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا بھتیجا لندن کے زیر اثر تو نہیں گو کہ اب تک وہ اس کے اثر و رسوخ دیکھ چکے تھے لیکن دل میں کہیں شک ابھی بھی باقی تھا۔ غاذان کوئی اعتراض کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی رعایت مانگ سکتا تھا۔ ہر سرداری کے لیے سرداری کی شرائط پتھر کی لکیر ہوتی۔ آریا پار کے علاوہ دوسرا کوئی

آپشن نہیں ہوتا تھا۔ غاذان کے لیے یہ معاملات دیکھنا مشکل نہیں تھا۔ اعلان سے پہلے بھی وہ یہ سب کرتا آ رہا تھا لیکن اعلان میں دی گئی شندور کے مابین شرائط اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اپنے باپ سے ہدایات لے رہا تھا لیکن اس کے لیے جگہ جگہ جا کے بندوبست کرنا، لوگوں سے ملنا، انتظام دیکھنا، یہ سب تھکا دینے والا کام تھا۔ یوسف خان دیکھنا چاہتے تھے کہ غاذان کے اندر قوتِ برداشت، قوت صبر و تحمل، قوت فیصلہ، قوتِ رہنمائی کس قدر ہے۔

ان دنوں چھ گھوڑوں کی نمائش بھی ہوئی۔ گلگت سے اور چترال کے قبائل سے لاتعداد لوگ گھوڑوں کو دیکھنے آئے تھے۔ بلتیوں نے شندور کے لیے اٹھائے جانے والے یوسف خان کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا تھا۔ کھوار قبیلہ جو پچھلے اٹھارہ سال سے شندور سے باہر تھے اور ایک سردار قبیلہ ہونے کے ناطے یہ ان کے لیے ایک تضحیک کا مقام تھا۔ اس شرمندگی کے خاتمے کے بعد انہوں نے شندور میں ابتہاج کے ذریعے وارد ہونے پر ان چھ انعامات کا اعلان کیا۔ یہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور ساکھ کی بحالی کی ایک ادنیٰ سی کوشش کے ساتھ ساتھ اپنے کھوئے ہوئے مقام اور لوگوں کی نظر میں کھٹکنے والے مجروح کارنامے کا سدباب بھی تھا۔ چھ گھوڑوں کی نمائش میں گلگت، چترال اور سوات سے کئی بڑے سرداران اور لوگوں نے شرکت کی اور یوسف خان کے ظرف، سخاوت اور وسیع قلبی کو سراہا۔ چترال کا ہر قبیلہ ان چمکتے، چکنے، اٹھے اٹھے گھوڑوں کو دیکھ کے انگشت بدنداں تھا۔ یہ چھ گھوڑے بڑی نزاکت، لاڈ اور محبت سے پالے گئے تھے۔ ان کی مشقیں بھی چترال کے اصطبل میں ہوئی تھیں اور ان کی رکھوالی کے لیے خاص ملازم تعینات گئے تھے۔ یہ وہ اصطبل کے مہنگے، قیمتی اور بیش بہا گھوڑوں میں سے چن چن کے الگ کیے جانے والے گھوڑے تھے۔ ان کو دیکھ کے کسی بھی گھڑ سوار کا دل مچل سکتا تھا۔

پورے کے پی کے اور گلگت میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ہر شخص شندور کھیلنے کا خواہش

مند نظر آنے لگا تھا۔ مقامی جرگے نے دو ماہ قبل ہی ٹیم ترتیب دے دی تھی۔ اس بار ٹیم بھی تگڑی تھی اور ان کی مشق بھی بہت تسلی سے کی گئی تھی۔ جو لوگ ٹیم سے باہر ہو گئے تھے وہ دل میں یہ خلش ضرور پال رہے تھے کہ کاش وہ منتخب ہو جاتے تو گھوڑوں کو جیتنے کی چھوٹی سی کوشش کر لیتے۔ غاذان اور ابتہاج کے ذمے اصطبل کی ذمہ داریاں ڈالنے کے بعد یوسف خان جیسے ہر چیز سے دستبردار ہو گئے تھے۔ ان کو اپنے قبیلے کے حالات بہتری کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ان دنوں غاذان کو سرداری کا بخار چڑھ گیا تھا۔ اس کی گردن میں سریا آ گیا تھا۔ وہ ہر کسی سے بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے چند مخصوص لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ یوسف خان کو اس میں پیشگی سردار کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا، بے نیاز رہنے لگا تھا۔ اس کا سارا فوکس شرائط کی ادائیگی پر تھا۔ اس نے اس معاملے میں ابتہاج کو بہت تنگ کیا۔

غاذان نے محنت شروع کر دی تھی۔ جہاں وہ یوسف خان کی جی حضوری کرتا تھا وہیں وہ یوسف خان کو ابتہاج سے بدظن کرتا تھا کیوں کہ نعیم اللہ جانتا تھا کہ سرداری کے مقابلے میں غاذان کا ایک ہی حریف ہو سکتا ہے اور وہ ابتہاج خان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کی ڈھارس بھی تھی کہ ابتہاج ان پڑھ اور جاہل ہے اور سرداران پڑھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ چترال کا قاعدہ تھا مگر باپ کی شفقت اور محبت سے مجبور ہو کر اگر اس نے ابتہاج کو موقع دیا تو ممکن تھا کہ وہ غاذان کو شکست دے دیتا کیوں کہ غاذان کلیم کی طرح کئی سال باہر رہا تھا اور ابتہاج اس کی طرح چترال کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اگر اس کا نام اس فہرست میں ڈال دیا جاتا تو اسے پھننگ فہرست آنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ بے شک اس نے پڑھائی نہیں کی تھی مگر یوسف خان قبائل کو اس شرط کو نظر انداز کرنے کے لیے مائل کر سکتے تھے۔ اس لیے اس نے ابتہاج کو یوسف خان کی نظر میں اتنا برا بنا دیا کہ یوسف خان نے اس حوالے سے بات کرنا ہی بند کر دیا۔ جو اعمال پہلے اسے بیٹے کی شرارت

نظر آتے تھے۔غاذان کی تقلید میں وہ گناہ نظر آنے لگے۔پہلے بیٹے کی قبائلی لڑکوں کے ساتھ کوبہ کو آوارہ گردی،اس کے لیے جوانی کی رغبت تھی مگر جونہی غاذان نے ابتہاج کے ساتھ دوسرے پلڑے میں اپنا قدم رکھا تو یوسف خان نے دونوں کے اخلاق کا موازنہ کیا۔تب اسے ابتہاج ایک بدمعاش،بدقماش اور بدتمیز انسان نظر آنے لگا۔

نعیم کو یقین تھا کہ غاذان سردار بنے گا لیکن اسے ڈر تھا کہ یوسف خان نے اگر سرداری غاذان کو دی تو وہ اپنے بیٹے کو بھی خالی ہاتھ نہیں چھوڑے گا۔اگر وہ ساری جائیداد کا تخمینہ لگاتا تو سب سے زیادہ قیمتی چیز رستم تھا۔اس نے غاذان کو دو چیزوں کی تنبیہہ کی۔اول رستم اور دوم سرداری۔غاذان نے دونوں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔نعیم اللہ خان جیسے جیسے اسے بتاتا،وہ ویسے ویسے کرتا۔

چار ماہ میں اس نے یوسف خان کا وہ اعتماد حاصل کر لیا جو بیٹے ہو کر ابتہاج نے بھی نہیں حاصل کیا تھا۔ان چار ماہ میں وہ موٹی چچی سے لے کر بریخنہ تک سب کا چہیتا بن گیا تھا۔سب اس کی رائے کا احترام کرتے،اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھتے،اس کے فیصلوں کو ترجیح دیتے تھے۔اس سے عزت سے پیش آتے تھے۔چار ماہ میں ماں کی موت کو ہمدردی کی وجہ اور باپ کی جدائی کو غم کا سبب بنا کر اس نے چترال کے ہر فرد کی محبت،ہمدردی سمیٹی۔

اس کا باپ گھریلو سیاست سے واقف تھا۔اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ رشتوں میں سب سے زیادہ کونسا جذبہ کام آتا ہے۔

ہمدردی۔

اس نے ہر انسان سے ہمدردی کی۔اس نے گل لالہ سے بھی ہمدردی کی۔وہ ہر چیز کو منصوبے کے ساتھ چلا رہا تھا۔اس کی زندگی میں اگر کھانے کا وقت نکل جاتا تو اس لیے نہیں کہ وہ کہیں مصروف تھا بلکہ اس لیے کہ آج اس کے باپ نے اسے کھانا کھانے سے منع کیا تھا۔

اپنے اعلان کے گھمنڈ میں آ کر اس نے ابتہاج کو بہت تنگ کیا تھا۔ابتہاج جو بچپن سے ہی اپنے باپ کی آنکھوں میں کڑھتا تھا۔کھٹکتا تھا۔جوانی کی دہلیز پہ وارد ہونے کے بعد وہ اپنی باپ کو اپنے کردار سے راضی نہیں کر پایا تھا۔وہ برا تھا۔برا ہی رہنے والا تھا۔گو کہ اس نے زندگی میں کبھی سرداری کا غم نہیں کیا تھا کیوں کہ اس نے ساری زندگی ہی سردار کے بیٹے کی نسبت سے گزاری تھی۔اس کے ایک حکم پر ملازموں کی فوج چلی آتی تھی۔اس کی بادشاہی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ جو کرنا چاہتا ہے۔جس طرح سے زندگی جینا چاہتا ہے۔وہ جی رہا ہے۔اسے ہر آسائش مل رہی ہے۔ہر پروٹول دیا جا رہا ہے۔اسے کیا ضرورت سرداری کے بکھیڑوں میں پڑنے کی مگر بڑے ہونے کے بعد اسے اس چیز کا احساس ہو گیا تھا کہ باپ کی سرداری کیا ہوتی ہے اور اپنی سرداری کا عالم کیسا ہوتا ہے۔پگڑی باپ کے سر ہو تو مراعات زیادہ ملتی ہیں یا پھر اپنے سر تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔اسے یقین تھا کہ اس کا باپ سرداری کے معاملے میں اس پر نظر ثانی کرے گا۔وہ اور غاذان ہم عمر تھے مگر جیسے ہی انہوں نے غاذان کو بلا مقابلہ چن لیا۔اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔اپنا باپ بالکل ویسے ہی لگا جیسے اٹھارہ سال پہلے نعیم کو لگا تھا مگر اس نے نعیم کی طرح شیطانی نہیں دکھائی۔اس کی طرح چالبازیاں نہیں کیں۔اس کی طرح عیاری سے کام نہیں لیا بلکہ صبر کیا جس طرح وہ بچپن سے اپنے باپ کے رویوں پر کرتا ہوا آیا تھا۔

غاذان نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔وہ اسے ہر لمحے چڑاتا تھا۔

''بادشاہ کا بیٹا ہی بادشاہ بنتا ہے لیکن افسوس ابتہاج.....تمہارے باپ نے تمہیں کچھ نہیں چنا۔''

وہ اس پر ہنستا گیا۔اس کا مذاق اڑتا گیا۔اس پر آوازیں کستا گیا۔ابتہاج نے بہت کوشش کی کہ غاذان کی اٹکھیلیوں پر اسے کوئی جواب نہ دے۔مگر جب وہ حد سے بڑھ گیا اور ملازموں کے سامنے اس کی عزت تار تار کرنے لگا تو اس نے جان لیا کہ اب ردعمل نہیں دیا تو یہ طعنے اور تشنے

ساری عمر سننے پڑیں گے۔ یہاں تک کہ اس کے قبائلی دوست بھی اسے چڑائیں گے۔

اس لیے اس نے غاذان کو سبق سکھانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس نے اس کی سماعتوں میں بم پھوڑتے ہوئے بتایا کہ یوسف خان نے اسے رستم دیا ہے تو غاذان کی ہنسی پل بھر میں غم میں بدل گئی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ سرداری مل گئی تو رستم اپنے آپ مل جائے گا لیکن اسے صرف سرداری ملی تھی۔

اس نے نعیم اللہ کو دو خبریں دی تھیں۔ ایک خوشی کی اور ایک غم کی اور دوسری طرف اسے بھی دو چیزیں سننے کو ملی تھیں۔ ایک شاباشی اور دوسری گالیاں.....

نعیم اللہ بری طرح ناراض ہوا تھا۔ لاہور میں بیٹھ کے اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے ایک ہفتے تک غاذان سے بات نہیں کی اور جب ایک ہفتے بعد اس کا فون آیا تو اس نے غاذان کو ایک حکم دیا۔ وہ حکم لے کر غاذان ابتہاج کی خدمت میں عاجزی سے حاضر ہوا۔

''ابتہاج! مجھے رستم دے دو.....'' اس نے کہا۔

ابتہاج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غاذان نے دوبارہ پوچھا۔ ابتہاج خاموش رہا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ''رکو بابا سے بات کرتا ہوں۔'' کیوں کہ پچھلے چار ماہ میں غاذان نے اس کی باپ کی آنکھوں میں اس کی عزت کا جو فالودہ بنایا تھا اس کی وجہ سے یوسف خان اس کی ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان کی زبان پر ہمیشہ نفرت اور حقارت ہوتی۔ اپنے جواب میں ابتہاج چپ رہا، خاموش۔

یہ درخواست غاذان نے کئی دِنوں تک کی۔ وہ ابتہاج کو بری طرح پریشان کر رہا تھا۔ ایک دن بالآخر ابتہاج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔ اس نے دوٹوک انداز میں کہا کہ وہ رستم نہیں دے گا۔ غاذان کو لگ رہا تھا کہ ابتہاج جاہل ہے ان پڑھ ہے اسے کیا پتہ رستم کی قیمت کا۔ اس کی نایابی کا۔ وہ اسے

باتوں میں لا کے ورغلا لے گا جب کہ ابتہاج کا خیال تھا کہ غاذان اس کی منتیں کر رہا ہے۔ اگر اسے رستم میں دلچسپی نہیں بھی تھی تو وہ غاذان پر یہ ضرور ثابت کر رہا تھا کہ اسے رستم سے دلچسپی بھی ہے اور محبت بھی۔

ایک ہفتے کی انتھک کوشش کے باوجود جب ابتہاج نہیں مانا تو اس نے نعیم اللہ کو سارے حالات سے آگاہ کیا۔ نعیم اللہ نے دو دن کا وقت مانگا۔ اس کے بعد اس نے غاذان کو ایک ایسا زہر منگوانے کا کہا جس سے گھوڑے مریں گے نہیں مگر وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ گھوڑے جن کے بارے میں پورا گلگت اور چترال جان گیا ہے اس زہر سے اپاہج ہونے کے بعد یوسف خان کی عزت پہ بجلی بن کر گریں گے۔ غاذان نے لندن سے اپنے ایک دوست کی مدد سے وہ ٹیکے پاکستان منگوائے اور منیب خان کے ہاتھوں سے گھوڑوں کو لگوا دیے۔ جس رات گھوڑوں پر زہر نے اثر کیا تھا اس دن غاذان نے ہر اس ملازم کو آنکھ کے نیچے رکھا تھا جو گھوڑوں کے ساتھ نظر آیا تھا۔ دوپہر میں وہ منیب کے ساتھ آیا، اصطبل کے میدان میں کھیلنے والے کھلاڑیوں کو ان چھ گھوڑوں پر سواری کرنے سے منع کیا اور ان چھ گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ دیا۔

جس رات گھوڑے ہمیشہ کے لیے زمین سے لگ گئے تھے۔ اس رات ایک طوفان آیا تھا۔ حویلی کے سارے خان اصطبل پہنچ گئے تھے۔ ابتہاج سب سے پہلے پہنچا تھا۔ گھوڑوں کی حالت بہت تشویش ناک تھی۔ جس طرح سے وہ تڑپ رہے تھے۔ کسی بھی ملازم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ دل بڑا کرتا اور ان کی ہنہناہٹ سن لیتا۔ گھوڑوں کی موت سے یوسف خان بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ بدنامی، رسوائی اور عزت جانے کا خود اس کی رگ رگ سے عیاں ہو رہا تھا۔ اس رات جو سکون غاذان کو ملا تھا وہ سکون حویلی کے کسی مرد کو نہیں ملا تھا۔ ابتہاج کو اتنا شک ضرور تھا کہ جو کچھ کیا ہے غاذان نے کیا ہے لیکن کیا کیا ہے اس کا علم نہیں تھا۔ دوسرے دن وہ سیخ پا ہو کر اس کے پاس

پہنچا۔وہ کمرے میں سو رہا تھا۔ابتہاج نے اس کا کمبل کھینچا اور اس کے اوپر پانی ڈال دیا۔وہ بھیگا بھیگا سا ہڑبڑا کے اٹھ گیا تھا۔

''کیا کیا تم نے گھوڑوں کے ساتھ؟'' ابتہاج چلا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ مکمل نا آشنا انداز میں بولا۔

''میں جانتا ہوں غازی، یہ سب تو نے کیا ہے۔صاف صاف بتا دے ورنہ بہت برا ہوگا۔''

ابتہاج بمشکل اپنے غصے کو قابو کر رہا تھا۔

''مجھے بھی تمہاری طرح فون آیا تھا ابتہاج۔مجھے نہیں پتہ۔'' غازان نے مکمل لاعلمی ظاہر کی۔

ابتہاج نے گھٹنا بیڈ پہ رکھا اور جھک کے اس کا کالر پکڑ لیا۔''میں بچہ نہیں ہوں غازی۔میں تمہارے جتنا ہوں۔مجھے بے وقوف نہیں بناؤ۔میں سب جانتا ہوں۔اچھا ہوگا تم خود اپنے منہ سے بول دو کہ تم نے کیا کیا ہے۔''

اس نے کہا کہ اسے بھی فون کیا گیا تھا لیکن اس طویل بحث اور جھگڑے میں تنگ پڑ کر غازان نے منہ سے ایک فقرہ نکلا۔

''اگر میں نے کچھ کیا ہے مسٹر ابتہاج تو اسے ثابت کرو'' اور اپنے کالر چھڑا لیے۔

اور وہیں پہ ابتہاج زچ ہو گیا۔وہ کیسے ثابت کرتا؟ اس کے پاس ثابت کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔نہ اختیار، نہ تعلیم، نہ قابلیت، نہ سہولت اور نہ ہی کسی کا ساتھ اور مدد۔اسے کسی کی حمایت حاصل تھی نہ ہمدردی۔وہ اکیلا تھا۔تن تنہا۔نہتا۔مگر اس نے ہار نہیں مانی۔اس نے اپنے تئیں تحقیق شروع کر دی۔جب کہ یہاں غازان نے خود کو مکمل مظلوم ثابت کیا اور اپنی تعلیمی کارکردگی اور قابلیت کا ڈنکا پیٹ کر اس نے یوسف خان کو یقین دلایا ہے کہ گھوڑوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اصطبل کے کسی ملازم نے کیا ہے۔یوسف خان اس کی بات پر یقین کیوں نہ کرتے؟ غازان کہہ رہا تھا۔شندور کے

گھوڑوں کی یہ حالت ہوئی تھی۔ وہ چھ گھوڑے۔ ایک ساتھ، ایک مقام پر، ایک ہی وقت میں ایک ہی طرح کی بیماری میں کیسے مبتلا ہو سکتے تھے۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ کسی کا انتخاب تھا۔ کسی اپنے کا منصوبہ تھا۔ کوئی چال تھی۔

انہوں نے اندھا اعتماد کیا۔ غاذان نے پہلے ہی سات لوگوں کو مدنظر رکھا تھا۔ اس نے واجبی سی تحقیق کرائی، کچھ کارروائیاں ہوئیں اور پھر اس نے ان ساتوں کو یوسف خان کے جرگے میں پیش کر دیا۔ اس نے الزام یہ نہیں لگایا کہ انہوں نے گھوڑوں کو کچھ ٹیکہ لگایا ہے۔ غاذان کا مدعا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے ان کی غفلت سے ہوا ہے اور کیا ہوا ہے اس کے لیے اس نے یوسف خان کو یقین دلایا کہ وہ دنیا کے بہترین ویٹرنری بلائے گا۔ گھوڑوں کے ٹیسٹ کرائے گا اور پھر ان ساتوں سے تفتیش کرے گا تب تک ان ساتوں کو یوسف خان نے سب کو جیل بھیج دیا۔ پورے چترال میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان ساتوں کو اصطبل سے کیوں نکالا۔ غاذان نے مرے ہوئے گھوڑے کو مدعا بنا لیا تھا۔ نہ لوگوں نے شک کیا اور نہ ہی کسی نے تحقیق میں دلچسپی لی۔

نعیم اللہ کے کہنے پر اسے ڈاکٹروں میں احتیاط کرنی تھی۔

"غازی! تم نے ان ڈاکٹروں کا انتخاب کرنا ہے جو تمہارے علاقے کی ریت رسم اور رواجوں کو نہ جانتے ہوں۔ عموماً شہری ڈاکٹر۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم ان کو اپنی باتوں سے ورغلا سکو گے اور دوسری طرف یوسف خان کو شہر کے ڈاکٹرز ہونے کا لارا دے کر اس کا اعتماد بھی پا لو گے۔ شہری ڈاکٹروں کو دیہات کے رسموں اور رواجوں کا علم نہیں ہوتا۔ تم جھوٹ بھی گھڑو گے تو وہ سچ مان کر یقین کر لیں گے۔ میرے بچے۔ ایک تیر سے کئی شکار کرنا سیکھو۔ ڈاکٹرز کا انتخاب سوچ سمجھ کے کرو۔ وہ جب آئیں تو ان کی بے جا تعریف کرو۔ اس سے ڈاکٹر مزید تمہارا ہمعصر بنے گا۔ کوشش کرو کہ ابتہاج کی شخصیت کو کاٹ کے رکھ دو۔ وہ پاگل آدمی۔ جاہل گنوار۔ اس کے پاس دینے اور

ظاہر کرنے کو غصے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔تم ذرا سا اسے اکساؤ گے تو وہ اپنی عزت کی پرواہ بھی نہیں کرے گا۔اس لیے کوشش کرنا کہ سب ڈاکٹر خود اس سے زچ ہو جائیں اور اپنے تئیں اس سے دور رہیں۔"

غاذان نے باپ کی بات کان میں ڈال لی۔

اس نے دوائیں لانے،ٹیسٹ کرانے کی ذمہ داری منیب خان کو دی۔جو پشاور یا گلگت یا اسکردو جاتا تھا لیکن وہیں پہ مختلف لیبارٹریوں کے کاغذات گوگل سے نکال کر ان پر جھوٹی رپورٹ بناتا تھا۔جو ڈاکٹر آیا،اس کا انتخاب غاذان نے کیا۔سارے ڈاکٹروں کو اس نے علاج چھوڑنے پر مجبور کیا،کسی کو ڈرایا تو کسی کو دھمکایا،کسی کو انتہائی بے بس کیا۔

عبادہ سے پہلے تین مرد ڈاکٹر آئے تھے لیکن تینوں نہ علاج کر سکے اور نہ ہی مرض کی شناخت۔عبادہ کو بلانے کا فیصلہ خود نعیم اللہ نے کیا تھا۔وہ لاہور میں ہوتا تھا۔اسے وہاں کے اس مشہور ویٹ ہسپتال کا پتہ تھا اور اس ہسپتال کی ساری معلومات اس کے پاس درج تھیں۔اس نے غاذان سے کہا کہ وہ عبادہ کو بلائے اور اگر وہ نہیں آئی تو لاہور سے ہی ڈاکٹر چنے۔کوئی پنجابی ڈاکٹر۔اس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ شہر سے ہوتے ہیں انہیں گاؤں،بیابانوں اور پہاڑوں میں رہنے کی عادت نہیں ہوتی۔وہ حویلیوں کو مسحور کن انداز میں دیکھتے تو ہیں لیکن وہ ان سے ڈرتے بھی ہیں۔اس لیے غاذان نے جتنے بھی ڈاکٹروں کا انتخاب کیا تھا وہ سب کے سب شہر سے تھے۔دوسری طرف عبادہ ایک لڑکی بھی تھی اور لڑکیاں عموماً نئی تجربوں سے ڈرتی ہیں۔اگر انہیں ڈرایا جائے تو سہم جاتی ہیں لیکن پہلی بار.....دوسری دفعہ خوفزدہ کرنے پر وہ آپ کو اس روپ میں نظر آتی ہیں جس سے ہر کوئی پناہ مانگتا ہے۔

ابتہاج کو لگ رہا تھا کہ غاذان جس بھی ڈاکٹر کو لے کر آ رہا ہے۔وہ یا تو جان بوجھ کر علاج نہیں

کر رہا یا پھر گھوڑوں کو مزید بیمار کر رہا ہے۔ اسے لگتا تھا کہ سارے ڈاکٹرز غاذان سے ملے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ کسی بھی طرح ڈاکٹرز کو بھیج دیا جائے۔ کوئی بہانہ مل جائے، کوئی وجہ بن جائے۔ ظاہر ہے وہ خود تو نہیں بھیج سکتا تھا۔ وہ اپنی ہر حرکت کے لیے اپنے باپ کو جواب دہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنے تئیں ہر چیز کی کوشش کی تھی۔

ان کی قسمت اچھی تھی یا عبادہ کی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ وہی آئی۔ ائیر پورٹ پہ ابتہاج لینے گیا۔ وہی جاتا تھا، کیوں کہ دیکھتا تھا کہ کون سا ڈاکٹر آیا ہے۔ کیسا ہے۔ کیوں کہ اس کی بھی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ کس طرح یہ ڈاکٹر چلا جائے کیوں کہ وہ غاذان کی بات مانے گا اور گھوڑوں کو مزید بیمار کرے گا۔ اس نے ایک دفعہ اپنا کوئی جان پہچان کا ڈاکٹر بلوایا۔ اس نے ٹیسٹ کرائے۔ یہ ٹیسٹ لے کر جانے والا منیب تھا۔ سو وہی نتائج آئے جو آ رہے تھے۔

عبادہ کو منیب خان پہچانتا تھا کیوں کہ غاذان نے اسے تصویر دکھائی تھی۔ اس لیے اس نے احتیاط کیے بغیر ائیر پورٹ پر عبادہ کو پہچان لیا جس سے عبادہ پہلے قدم پر ہی بری طرح الجھ گئی تھی۔ عبادہ آئی تو ابتہاج کا رویہ بہت تلخ ہوا۔ وہ جب راستے میں بھیڑ کا اعلاج کرنے رکی تو ابتہاج کے ٹھنڈے اور سفاک لہجے نے اس پر ابتہاج کا پہلا اثر بہت برا ڈالا۔ یہ دیکھ کے منیب خان کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

اس کے ساتھ ابتہاج کا رویہ کیسا نکلا، یہ بات جب منیب خان نے غاذان کو بتائی تو وہ سمجھ گیا کہ اسے کیسے رویہ رکھنا ہے۔ اس لیے اس نے دوستانہ رویہ ہی رکھا۔ اس نے عبادہ کو اعتماد میں لے لیا۔ اس نے ڈریسنگ سینس کا خیال رکھا، پرفیوم، بات چیت اور جینٹل مین بننے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے ابتہاج ایک روایتی پٹھان مرد تھا۔ وہ کیوں کسی نامحرم کے لیے رکھ رکھاؤ کرتا؟ کیوں تیار ہوتا؟ وہ تو ہمیشہ سے ہی سادہ تھا۔ اسے کیا پتہ تھا لڑکیاں کس چیز سے متاثر ہوتی ہیں۔ وہ تو جیسے مردوں کے

ساتھ تھا۔ ویسے ہی عورتوں کے ساتھ تھا۔ غاذان نے عبادہ کو اپنی تعلیمی قابلیتیں بتائیں، اپنا انداز بھاری رکھا۔ اس کے کام آیا۔ اسے سراہا۔ اس کی تعریف کی۔ اس کی مدد کی۔ اس کا اعتماد لیا۔ اس اعتماد کا مقصد تھا کہ کل علاج کے دوران اگر عبادہ کو کسی چیز کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ کسی اور کو بتانے کی بجائے صرف اور صرف غاذان کو بتائے گی اور بلاشبہ عبادہ نے ایسا ہی کیا۔ اسے لگتا تھا کہ جہاں اتنے بڑے بڑے مرد ویٹ نہیں ٹھہرے، وہاں ایک چھوئی موئی سے لڑکی کیسے ٹھہرے گی؟

حویلی میں عبادہ کو گل لالہ کے کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا کیوں کہ باقی کمرے بلتی مہمانوں کے لیے تکلف سے سجائے گئے تھے۔ یہاں غاذان کو دھڑکا سا لگ رہا تھا کیوں کہ گل پڑھی لکھی تھی۔ وہ عبادہ سے دوستی کر سکتی تھی جب کہ وہ چاہتا تھا کہ عبادہ حویلی میں اپنے دل کے راز ریشم یعنی اس کی بہن کو بتائے اور باہر کے راز اسے۔ اس طرح وہ دونوں طرف عبادہ کی پیش قدمیوں پر نظر رکھ سکے گا۔ اس لیے اس نے ریشم کو بھرپور ہدایت کہ وہ ہر طرح سے عبادہ کو میسر آئے۔ ہر کام وہی کرے، ہر چیز وہی لا کر دے۔ اس لیے عبادہ کے آس پاس ہر وقت وہی بھنبھناتی تھی۔

ادھر ابتہاج کے دل پہ عبادہ سانپ بن کے بیٹھی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح عبادہ کو یہاں سے واپس بھیج دے۔ کئی دن ہو گئے، عبادہ کو بیماری سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا اور ظاہر ہے اسے جو بھی محسوس ہو رہا تھا اس نے غاذان کو بتایا۔ اسے یہ بیماری ڈپریشن لگ رہی تھی جس میں تھوڑا سا لیمنس تھا۔ اس نے ٹیکے لگائے۔ جب ابتہاج نے دیکھا تو اسے خبردار کیا۔ ظاہر ہے وہ روک نہیں سکتا تھا لیکن اس دن ابتہاج نے ان دونوں گھوڑوں پر کلمہ شہادت پڑھ لیا تھا۔ جب عبادہ نے غاذان کو بتایا کہ اسے بیماری کا شک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے استاد یعنی طارق سر کو بھی سب بتا رہی ہے تو غاذان نے اسی رات سوچ لیا کہ اب عبادہ خطرناک ہو رہی ہے۔ وہ دھوتی کھول سکتی ہے لہٰذا اسے چلے جانا چاہیے۔ اس نے منیب خان سے کہہ کر ان دو

گھوڑوں کو اصلی زہر دے دیا۔ اگلے روز اس نے منیب خان کی مدد سے گھوڑوں کا خون لیا اور اسے پشاور سے ان کی رپورٹس لانے کا کہا۔

رپورٹس لانے کے بعد منیب خان سیدھا ازراہ ہمداری ابتہاج کے پاس چلا گیا اور اسے گھوڑوں کے مرنے کی حقیقت بتائی۔ ابتہاج اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اس نے وہ رپورٹس جا کے یوسف خان کو دکھا دیں۔ یوسف خان نے اول تو بیٹے کی بات پر یقین نہیں کیا مگر جب منیب خان نے لیبارٹری کا نمبر ملا کے دیا اور یوسف خان نے خود بات کی تو پتہ چلا کہ واقعی گھوڑے زہر سے مرے ہیں۔ رپورٹس میں کیا لکھا ہے وہ والی زبان صرف ڈاکٹر جانتا تھا اس لیے یوسف خان کو یقین تھا کہ اگر عبادہ نے اپنی اس حرکت سے انکار کیا تو وہ اسے رپورٹس دکھا دیں گے۔

شاہی مسجد میں عبادہ سے ملنے سے قبل اس نے غاذان کو وہ رپورٹس پکڑا دیں۔ غاذان نے یوں ثابت کیا جیسے وہ جانتا ہی نہیں کہ اسے کیا پکڑایا جا رہا ہے۔ یہی معصومیت اس نے عبادہ کے سامنے دکھائی۔ عبادہ نے ابتہاج کو مجرم مان کر نہ صرف غاذان کی بری الزمہ کر دیا بلکہ اسے اپنی چال مزید کامیاب کرنے کا حکم بھی دیا۔ عبادہ کے لیے ٹکٹ لانے کا مشورہ غاذان کا تھا۔ جو اس نے منیب خان کو بتایا۔ منیب خان نے ابتہاج کو بتایا اور ابتہاج واقعی ٹکٹ لے آیا۔

غاذان نے اس معاملے کی لگام یوسف خان کے ہاتھ میں دے کر خود کو بری کر دیا۔ اس نے یوسف خان کو مجرم ٹھہرا دیا کہ وہ گھوڑوں کو ہسپتال لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسے چترال کی فکر رہے۔ جب وہ سردار بنے گا تو یہ کرے گا وہ کرے گا۔ عبادہ شہری تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ غاذان اسے بری طرح پھنسا رہا ہے۔ اس نے خود کو بے حد مظلوم بنا دیا تھا۔ گھوڑوں کو دفناتے وقت اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے اسے ان گھوڑوں کے جانے کی فکر ہے اور ابتہاج عبادہ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کھا جائے۔

وہ جانتا تھا کہ اس ہزیمت کے بعد عبادہ وہاں نہیں رکے گی۔ وہ جائے گی۔ اس لیے وہ خود اسے ائیر پورٹ چھوڑنے گیا تا کہ تسلی سے دیکھ کے سکے اب وہ مصیبت ٹل گئی ہے۔ ائیر پورٹ ٹرمنل کے مہمان خانے میں بیٹھتے ہوئے عبادہ نے بے انتہا لاتعلقی اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ عبادہ ناراض ہے۔ وہ اسے منانا چاہتا تھا۔ ابھی تک اس نے ایک اچھے اور فرشتہ صف انسان کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ اتنی جلدی اپنی سفاکیت دکھا کر اپنے تاثر کو متنازعہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لیے اس نے عبادہ کو مخاطب کیا۔ خود کو مظلوم اور بے کس بنایا۔ جب عبادہ نے پوچھا کہ رپورٹس کون لایا تھا تو اس نے ابتہاج کا نام لگا دیا۔ پھر عبادہ کے انکشاف سے وہ سمجھ گیا کہ عبادہ اس سے ناراض ضرور ہے مگر اس پر شک نہیں کر رہی۔ اپنے کزن پر پورا اعتماد ظاہر کرنے کے لیے اس نے ڈھونگ رچایا کہ ابتہاج ایسا نہیں کر سکتا اور فوراً اپنی خوش فہمی کو ٹھیک ثابت کرنے اور عبادہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے ابتہاج کو فون کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ابتہاج کیا کہے گا۔ بہتر تھا کہ عبادہ اپنے کانوں سے سن لے۔ ابتہاج اپنے جذبات کا بند توڑتے ہوئے بری طرح تلخ ہوا تھا۔ اس کے زہر خند الفاظ سن کے عبادہ کا دل کتنا بیٹھا ہوگا۔ میز کی دوسری سمت ہمدردی کی اداکاری کرنے والا غاذان خان اچھی طرح جانتا تھا۔

اس کے بعد وہ اٹھ کے باہر چلا گیا۔ جب ہی اسے پتہ چلا کہ فلائٹ کینسل ہوگئی ہے۔ اسے شدید غصہ آیا۔ اب وہ مروت کے مارے عبادہ کو واپس حویلی لے کر جائے گا۔ اف اف۔ کتنی مشکل سے نکالا تھا اسے وہاں سے۔ اس کا دل کیا وہ گاڑی میں عبادہ کو بٹھا کر لاہور روانہ کر دے۔ مگر تب عبادہ کو شک ہو سکتا تھا کہ وہ بھی اسے بھیجنا چاہتا ہے۔ وہ پہلے ہی اسے شندور تک رکنے کی پیش کش کر چکا تھا۔ ایسے میں وہ کیسے اسے بھیج سکتا تھا۔ اس نے فی الفور نعیم کو فون ملایا تھا اور اسے حالات سے آگاہ کیا۔ نعیم نے اس سے کہا کہ بے شک وہ رک جائے مگر وہ پوری کوشش کرے کہ عبادہ علاج

کے معاملات سے دور رہے۔ وہ بیمار گھوڑوں کے کمرے کے آگے گارڈز کھڑے کر دے اور عبادہ کا جانا ممنوع قرار دے دے۔ ظاہر ہے وہ سوال نہیں کرے گی کیوں کہ اس کے ذہن میں یہ یوسف خان نے کیا ہے اور یوسف خان کے ذہن میں یہ تم نے کیا ہے۔ اس طرح کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔

اس نے عبادہ کو آگاہ کیا۔ عبادہ رکنے کے لیے تیار نہیں تھی مگر اپنی مروت کی وجہ سے وہ مجبور ہو گیا۔ کاش اس نے چترال کی مہمان نوازی کے بارے میں اتنا سچ نہ بولا ہوتا۔ آج اس کے لالے پڑ رہے تھے۔ اس نے عبادہ کو سمجھایا کہ بس ابتہاج سے احتیاط کرے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے اور وہ کتنا برا آدمی ہے اس کا اندازہ تو عبادہ کو فون پہ اپنے لیے گالیاں سنتے وقت ہو گیا تھا۔ بڑے ہی کھٹے دل اور اور پرسان دل سے وہ عبادہ کو واپس حویلی لایا تھا مگر وہاں آتے ہی اس نے گل کو عبادہ کے لیے اچھلتے دیکھا تب وہ سمجھ گیا کہ دوستی عبادہ اور گل کی ہوئی ہے۔ ریشم اور عبادہ کی نہیں۔

اس نے ریشم کو بلا کر اس سے باز پرس کی تو ریشم نے بتایا کہ تب تک دونوں کی دوستی ہو رہی تھی جب تک گل اپنے کمرے سے دور تھی مگر جب سے اس نے کمرہ لیا ہے ریشم بے بس ہو گئی ہے۔ مگر تب غاذان نے اسے مزید چوکنا رہنے کا حکم دیا۔

اس ساری کشمکش میں وہ ایک چیز بھول گیا تھا کہ سرداری کے لیے قبائلی سرداران کا راضی ہونا بھی لازمی ہے۔ کالاش کا سردار اس سے ناراض تھا۔ پہلے اسے منانا ضروری تھا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ کالاش میں فوتگی ہوئی ہے اور حویلی میں ٹھہرے کالاشی مہمان واپس جانا چاہتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس وقت اسے صحن میں عبادہ نظر آئی۔ حویلی سے دور رکھنے، اپنے علاقے کی خوبصورتی میں اسے مصروف رکھنے کے لیے یہ ایک اچھا بہانہ تھا۔ یوں وہ زیادہ دیر حویلی میں نہیں رہ سکے گی اور اسے ساتھ لے جا کر وہ کالاش کی سیر کروائے گا جس سے اس کے کردار سے عبادہ مزید متاثر ہو جائے گی۔

اس نے عبادہ کو پیشکش کی تو پتہ چلا کہ گل اور وہ پہلے سے ہی تیار ہیں۔اس لیے بادلِ نخواستہ اسے گل کو بھی لے جانا پڑا۔وہاں جا کر اس نے دونوں کا اکیلا چھوڑ دیا۔وہ جانتا تھا کہ عبادہ اعتراض کرے گی مگر گل نہیں۔گل کو اس کے اور عبادہ کے درمیان چلنے والی اس پر تکلف جذبے کی پہچان ہو رہی تھی جسے عبادہ اپنے تئیں دبا رہی تھی۔وہ عبادہ کی اس نسوانی کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔نادان لڑکیاں کتنی جلدی دل دے بیٹھتی ہیں!

کالاش کا سردار نہیں مانا تھا۔جانے اسے کیا مسئلہ تھا۔نعیم کے بارے شاہ سردار جانتا تھا کہ اس نے قتل کیا ہے مگر یہ بات نہ نعیم کو پتہ تھی اور نہ ہی غاذان کو۔شاہ سردار چشم دید گواہ تھا۔وہ دیکھ سکتا تھا کہ نعیم اپنی چالوں میں کامیاب ہو رہا ہے۔وہ یوسف خان کے مقام پر نہیں تھے کہ غاذان کو سرداری سے ہٹا دیتے۔یوسف خان بے شک بھتیجے پر اندھا اعتماد کر کے اپنی بھائی کی سفاکیت کو بھول گیا تھا مگر وہ اپنے دوست کی شہادت کو یوں ضائع نہیں کر سکتا تھا۔اس لیے اپنے تئیں اس سے جتنا ہو سکتا تھا وہ کر رہا تھا۔اگر غاذان پورا چترال اس کو پیش کر دیتا تو وہ انکار کر دیتا۔کلیم کے خون کے آگے چترال تو کیا پوری دنیا کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔مقامی ورثے تو بہانے تھے اصل کھوروایوں سے نفرت اسی بے رحمی اور سفاکی کی وجہ سے تھی۔

اپنی بے عزتی پر وہ بہت غصے میں شاہ سردار کے گھر سے نکلا تھا۔اس نے باہر آتے ہی فوراً نعیم کو فون ملایا۔

"بابا میں کیا کروں؟ کتنی دفعہ سمجھاؤں؟ میں نے بارہا کوشش کر کے دیکھ لی۔یہ مان کے نہیں دے رہے۔" وہ بہت زیادہ جھنجھلا گیا تھا۔

"تم نے جتنا کرنا تھا کر لیا۔اب ان کو جہنم میں بھیج دو اور واپس حویلی جاؤ۔دفعہ کرو۔یہ سب۔" انہوں نے رکھائی سے کہا۔غاذان تھک گیا تھا اسے باپ کی بات اچھی لگی۔اب بھاڑ میں جائے

شاہ سردار۔ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ وہ گل اور عبادہ کو ساتھ لایا ہے۔ ان کو کالاش گھمانا چاہتا ہے۔ جب ہی نعیم کا ماتھا ٹھنک گیا۔ شاہ سردار اسے عرصے سے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ذلیل کر رہا تھا۔ یہ اچھا موقع تھا اسے سبق سکھانے کا۔ اس نے غاذان کو بہرام کے بارے میں بتایا۔ بہرام پہلے ہی کالاش میں اپنی چوری اور بدمعاشی سے بدر جہا مشہور ہو گیا تھا۔ وہ سیاحوں کو لوٹتا تھا۔ اس نے غاذان کو گل اور عبادہ کے پاس جانے سے منع کیا اور بہرام کو عبادہ کے پرس کی بو سونگھائی۔ بہرام اپنی نیت کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ کیونکر پیچھے ہٹتا۔ وہ بھی اس صورت جب اسے یہ لالچ دی گئی تھی کہ عبادہ کے پاس پرس میں بے انتہا پیسہ ہے۔ وہ بھوکے کتوں کی طرح شکار کی تلاش میں نکل پڑا۔

غاذان کو پتہ نہیں تھا کہ بہرام گل کو زخمی کر دے گا۔ وہ گل کو کسی قیمت پر زخمی ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بچپن سے اس سے محبت کرتا ہوا آیا تھا۔ وہ اسے تکلیف میں دیکھ کر سسک اٹھا تھا۔ اوپر سے عبادہ کی لاپرواہی نے اسے مزید طیش دلا دیا۔ کیا ضرورت تھی اسے پرس نہ دینے میں اتنی دیر کرنے کی؟ اگر وہ پہلے ہی بول پر اپنا پرس اس کے حوالے کر دیتی تو گل اتنا بڑا کٹ لگنے سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر اس نے اپنی کم عقلی سے اس معصوم کو چوٹ پہنچا دی۔ ایک لمحے کے لیے دل چاہا کھینچ کے ایک زوردار چماٹ اس کے منہ پر مارے مگر وہ اپنے اوڑھے ہوئے اچھائی کے ملمع کو اتار نہیں سکتا تھا۔ اس لیے صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

غاذان کو گل کی چوٹ سے ٹھیس پہنچی تھی مگر نعیم جانتا تھا کہ یہ چوٹ اسے کتنی بڑی مصیبت سے بچا سکتی تھی۔ اگر کل سرداری کے معاملے میں شاہ سردار نے کوئی اونچ نیچ کی تو وہ کالاش میں ہوئے گل پر حملے کو وجہ بنا کر ان کو وہیں خاموش کر دیں گے۔ اس لیے گل کا خون بہے یا اس کے باپ کا۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

شندور بے حد قریب آ گیا تھا۔ایک ہفتے کے اندر وہ گھوڑوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے تھے۔اس نے یوسف خان کو بری طرح بے بس کیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے پلان بی Activate کرنے کا۔

پلان بی تھا بلاواسطہ رستم کا حصول۔اب چھ گھوڑوں کی بجائے رستم شندور میں وقف ہو گا۔ یوسف خان نے اس درد کو اپنے سر سے ہٹا کے حسبِ معمول غاذان کی جھولی میں پھینک دیا تھا۔یہ تو یوں ہو گیا جیسے چور کو تجوری کی چابی پکڑا کر کہا جائے کہ اس کی رقم کی حفاظت کرو۔یوسف خان نے جو کیا تھا وہ نعیم نے چاہا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ یوسف غاذان کو یہ ذمہ داری سونپ دے۔اس نے غاذان کو بتایا کہ جب یوسف خان بے یارومددگار رہ جائے گا اور اپنی ہی دستار تلے دبنے لگے گا تب تم نے ازراہِ ہمدردی انہیں تسلی دینی ہے کہ تم سب سنبھال لو گے۔

جب شندور قریب ہو جائے گا اور اس کٹھن معاملے کا سنجیدگی سے سدباب کرنا ہو گا تب تم رستم کی نیلامی کا اعلان کرنا۔یہ اعلان اس مقام پر کرنا جہاں یوسف خان کو بات کرنے یا اعتراض کرنے کا موقع نہ مل سکے۔تمام بلتی و چترالی قبائلی سرداران کی موجودگی کے علاوہ کوئی ٹھیک مقام کونسا ہو سکتا تھا۔اس لیے اس نے جلندھر کی زمین پر یہ راز کھول دیا۔جیسے سوچا تھا ویسے ہی ہوا۔جائے مقام پر یوسف خان کچھ بول نہیں سکے۔سرداروں کی موجودگی میں وہ نہ اس بات سے انکار کر سکے اور ہی اس کا کھل کر اقرار کر سکے۔غاذان نے انہیں بھنور میں پھنسا دیا تھا۔انہوں نے رات میں اس کو اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔

پلان بی کے پارٹ اے کو ابھی Activate کرنا تھا۔اس نے وہی کچھ کہا جو نعیم نے بتایا تھا۔اس نے پوری کوشش کی کہ اپنے تاثرات، جذبات اور لہجے سے یہ ثابت کر سکے کہ وہ رستم کو بچانا چاہتا ہے۔خود اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔وہ تو بس گلِ لالہ سے مخلص ہے۔ابتہاج کو فوقیت دے رہا

ہے۔ چترال کی عزت کا نگہبان ہے۔ خود وہ اس قدر بے نیاز اور بے مفاد ہے کہ کوئی بھی اس کی معصومیت پر شک نہ کرے جب کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہے۔ یوسف خان کو رستم کے لیے راضی کرنے کا مطلب، شندور کے مقام پر ابتہاج کو ہرا کر رستم کو اپنے نام کرنا تھا۔

از طے شد۔ یوسف خان مان گئے۔ دوسری طرف اس نے بہرام کو پکڑوایا۔ اس کی سزا کا انتخاب بھی اس نے کیا تھا۔ وہ گل کو ملے ہوئے زخموں کی تلافی کر رہا تھا۔ بہرام نے سزا پائی تو اسے سکون مل گیا۔

کچھ دنوں بعد ابتہاج نے وہ کر دیا جس کا اسے ڈر تھا۔ وہ خود گل کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا مگر ڈرتا تھا کہ گل جانے کیسے ردعمل دے گی۔ وہ یوسف خان کے ذریعے یہ بات پہچانا چاہتا تھا مگر ابتہاج نے سب برباد کر دیا۔ گل کا ردعمل جنون بن کر آیا تھا۔ وہ اتنے غصے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی جتنے غصے میں وہ اس دن نظر آئی تھی۔ ریشم نے اس کو گل کی جنونیت کا حال سنایا تھا۔ سن کے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر جب ابتہاج اور مجاہد نے گل کو مارا تو اس کا بند بند تڑپ اٹھا تھا۔ کتنی بے رحمی دکھائی تھی ان درندوں نے۔ اس کی گل کو اتنی سفاکی سے کیسے پیٹ سکتے تھے۔ اس دن وہ مردان خانے میں موجود تھا۔ مجاہد چچا کو ہڑبڑی میں زنان خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی ان کے پیچھے آیا تھا۔ زنان خانے میں داخل ہونے سے قبل جب اس نے گل کے چلانے کی آواز سنی تو انہی قدموں سے پلٹ کے یوسف خان کے پاس گیا اور انہیں بلا کر لایا۔ جب تک وہ آتا تب تک گل بری طرح مار کھا کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ خود کو آس پاس سے انجان اور ناواقف جان کر اس نے بھرپور اداکاری کی مگر جب گل کو بے دم سا لیٹے دیکھا تو یکبارگی وہ دہل سا گیا تھا۔

اس نے یوسف خان کا ری ایکشن دیکھے بغیر گل کو بانہوں میں بھرا اور اوپر لے گیا۔ گل کے چہرے، گردن پر تشدد کے نشان دیکھ کے اس کا دل چاہ رہا تھا ابتہاج کے گھٹنے توڑ دے۔ رہ رہ کر اس

بے غیرت پر غصہ آرہا تھا مگر اس وقت اسے بہت پھونک پھونک کر چلنا تھا۔ جب حالات میں کشیدگی آجائے تو منصوبے ناکام ہوجاتے ہیں۔ اس وقت اسے Neutral رہنا تھا یعنی نہ اس طرف اور نہ ہی اس طرف۔ وہ گل کو کسی ایسے قدم پر آمادہ نہیں کرسکتا تھا کہ رستم اس کے ہاتھ سے چلا جائے۔ گل ابتہاج سے زیادہ جذباتی تھی۔ وہ ایک بار بھڑک اٹھتی تو اس کی چنگاریوں کو بجھانا مشکل ہوجاتا تھا۔

اس لیے اس نے بی جان کا سہارا لیا اور یوں وہ حالات سنبھال لیے۔ بی جان نے پہلے بھی کئی دفعہ گل کو ٹھنڈا کیا تھا۔ وہ دادی تھیں۔ ان کے پاس ہر پوتے، پوتی کا علاج تھا۔ انہوں نے گل کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو وہ مچل گئی۔ بی جان نے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کیا اور واسطے قسمیں دیں تو وہ بری طرح گھر گئی۔ اس کے پاس کوئی انتخاب نہیں بچا۔ اس لیے وہ کوئی ردعمل دیے بغیر شکست خوردہ انداز میں اوپر چلی گئی۔ غاذان کو تسلی ہوگئی کہ اب وہ کسی بھی طرح رستم کا نام نہیں لے گی۔ اب تک جو مسئلے اسے کھٹک رہے تھے۔ وہ سارے حل ہوگئے تھے۔ اب صرف شندور میں پلان سی پر عمل کرنا رہتا تھا۔ اس کا پلان سی خطرناک تھا۔ بہت خطرناک۔

اب رستم بھی اس کا تھا اور سرداری بھی۔ اس نے رستم کے کاغذی دستاویزات بنالیا تھے۔ چوں کہ گل لالہ کے پاس کوئی قانونی ڈاکومینٹس نہیں تھے اس لیے وہ براہِ راست رستم پر حق نہیں جتا سکتی۔ مگر شندور میں جب رستم اس کو مل جائے تب پوری دنیا دیکھ لے گی۔ میڈیا، ٹی وی سب اس کا نام لیں گے۔ تب کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ رستم پر حق جتا سکے۔ بظاہر تو یہ ابتہاج جیتے گا مگر ابتہاج جب ''جیتے'' گا۔ اور ابتہاج تو اس سے ہر قدم پر ہارا تھا۔

اس نے نعیم اللہ کو بتا دیا کہ وہ اسی فیصد اپنے منصوبے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ بس تین دن ہیں۔ اس کے بعد اس کے پاس سب آجائے گا۔ اختیارات سے لے کر دولت و جائیداد تک وہ

سب کا اکلوتا وارث اور اکلوتا سردار بن جائے گا۔ابتہاج کو رسوا کر کے،عبادہ کو ذلیل کر کے،گل کو بے بس کر کے،اور یوسف خان کو مجبور کر کے وہ اپنے سارے حریفوں کو حملہ سے باز رکھنے کے لیے توڑ چکا تھا۔اسے ڈر نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اسے نقصان پہنچانے کی جرأت کرے گا۔عبادہ شندور سے محظوظ ہو کر لاہور لوٹ جائے گی۔بیمار گھوڑے کچھ عرصے میں مر جائیں گے اور ابتہاج اس کے ساتھ جو شندور میں ہونے والا تھا۔کیا معلوم وہ اس کے بعد اٹھے ہی نہیں؟ بے شک وہ اس کا بہنوئی تھا مگر وہ کسی بھی رشتے کے جذبات میں آ کر اپنے منصوبے کو التوا کا شکار نہیں کر سکتا تھا۔

بہنوئی کو بعد میں دیکھیں گے پہلے وہ سردار بن جائے۔

وہ بہت خوش تھا۔بہت خوشی خوشی قافلے کی صدارت کرتے ہوئے شندور جا رہا تھا جب ایون سے نکلتے ہی یوسف خان نے اس کے سر پہ بم پھوڑ دیا۔وہ جو عبادہ کو کمزور اور ڈرپوک سمجھ رہا تھا۔اس نے چپکے چپکے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔اس نے شندور میں ابتہاج کو مزہ چکھانے کا بندوبست کیا تھا۔ایسے میں اگر گل بھی میدان میں اتری تو اس کے لیے دونوں کی مزاحمت کرنا مشکل ہو جائے گا۔اس نے گل کی مشقیں دیکھ رکھی تھیں۔وہ دوسرے کھلاڑیوں سے زیادہ چابک دست اور شاطر تھی۔اسے پولو کھیلنا بھی آتا تھا اور میدان میں اپنی ٹیم کی رہنمائی کرنا بھی جانتی تھی۔اگر اس کی صدارت میں ٹیم نے باہمی تعاون کیا تو کچھ بعید نہیں تھی کہ وہ ہی رستم جیت جاتی۔بظاہر تو عبادہ کا مطالبہ چونکا دینے والا تھا مگر اس نے ایسا سوچا کیسے؟ گل کو مسترد ہونے کا خط مل چکا تھا۔تو کیا وہ اس سے دلبرداشتہ ہو گئی تھی؟ یا پھر گل نے اسے اپنی کوششوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی کہانیاں سنا دی تھیں؟ کیوں اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔اس کے دماغ میں اچانک اس خیال کا آنا اتفاق نہیں تھا۔ضرور اس میں گل کا ہاتھ تھا۔اسی نے اپنی لاچارگی اور بے کسی کی پٹیاں پڑھائی تھیں۔

وہ عبادہ کو فون کر کے اسے باتوں میں الجھا نہیں سکتا تھا کیوں کہ تب وہ اس پر شک کرتی کہ شاید وہ بھی باقی مردوں کی طرح گل کو پولو کھیلنے سے روک رہا ہے۔ اس نے اپنا تاثر ایک پڑھے لکھے مرد کا ڈالا تھا۔ وہ یکا یک ایک روایتی مرد کی صورت میں عبادہ کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اگر وہ عبادہ کو کال کر کے اسے لفظوں میں الجھائے گا تو یہ بے سود ہوگا۔ اگر وہ یوسف خان کو تسلی یا دلاسا دے کر اس دھمکی کے اثر سے نکالے گا تو یہ بھی بے سود ہوگا کیوں عبادہ سے بعید نہیں تھی کہ اس نے جو کہا تھا وہ کر بھی ڈالے۔ اس نے دوران سفر بہت سوچا۔ اپنے باپ سے وہ لحہ بہ لحہ میسج پہ لگا ہوا تھا مگر دونوں کے دماغ میں اس کا حل نہیں آ رہا تھا۔ شندور پہنچ کے اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

ہلچل کے تھم جانے، لوگوں کے سو جانے اور شندور کے مقام پر مکمل خاموشی ہو جانے کے بعد اس نے آدھی رات کو نعیم کو فون کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب تک اس کا باپ اس معاملے کا حل نکال چکا ہوگا۔

''تم گل کو ٹیم میں شامل کر لو غاذان۔'' انہوں نے بڑے ہی سکون سے کہا۔ اس کے پیروں تک سرنگ پھٹی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا آپ؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم اسے ٹیم میں شامل کرو غاذان۔ تم یوسف خان کی آنکھوں میں برے نہیں بن سکتے۔ تم جانتے ہو۔''

''مگر بابا گل ایک منجھی ہوئی پولو پلیئر ہے۔ میں اس کا سد باب کیسے کروں گا؟'' وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔

''غاذان! تم ہر بار اپنے باپ کے فیصلوں پر ایسے ہی مچل جاتے ہو۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے

کہ اگر میں ایسا کرنے کو کہہ رہا ہوں تو میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہوگا؟'' اس نے ہلکا سے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''کیا بندوبست کیا ہے آپ نے؟'' وہ بری طرح ڈر گیا۔ کیا اس کے بابا گل کے ساتھ بھی وہی کرنے والے تھے جو ابتہاج.....

''دیکھو غاذان! شندور اور ایون کے درمیان ایک سو پچاس کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ راستہ دشوار ہے۔ سڑکیں کچی ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ ہو جاتی ہے اوپر سے موسم بھی خراب ہے۔ کب بارش شروع ہو جائے اور نالے آ جائیں، کوئی نہیں جانتا۔ وہ دونوں بیچاری لڑکیاں قافلے کے ساتھ نہیں آئیں تو ایسے خراب موسم میں عین پہاڑوں کے درمیان کسی ویرانے میں جب ان کی گاڑی خراب ہوگی تو ان کو کون لے کر آئے گا؟ پیدل تو وہ شندور نہیں آ سکیں گی۔''

غاذان سمجھ گیا تھا کہ اس کا باپ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ گل کو شندور تو بلائے گا مگر اسے شندور پہنچنے نہیں دے گا۔ جس سے وہ میچ میں شامل ہونے سے لیٹ ہو جائے گی۔ چوں کہ میچ کسی کے لیے رک نہیں سکتا تھا تو گل کی شراکت کے بغیر میچ شروع ہو جائے گا۔ یہ کوئی کرکٹ یا میچ تو تھا نہیں کہ بالز کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ یہ ایک گھنٹے کا پندرہ پندرہ منٹ کے راؤنڈ پر مشتمل میچ تھا۔ جو آٹھ بجے شروع ہو کر نو بجے ختم ہو جائے گا۔

اس طرح گل پہنچ نہیں پائے گی اور اس کی عدم شراکت کی ذمہ دار اور کوئی نہیں خود وہی ہوگی۔ اس لیے وہ کسی کو الزام بھی نہیں دے سکے گی اور عبادہ سلیم صاحبہ بھی اپنے منہ کو سی کر بیٹھ جائیں گی۔ چاہے دنیا اس کے لیے کتنے بھی مسائل کھڑے کر رہی تھی مگر اس کے باپ کے پاس ہر چیز کا حل تھا۔ کبھی کبھار وہ سوچتا تھا کہ اس کا باپ کوئی سیاسی پارٹی کیوں نہیں بنا لیتا۔ چترال تو کیا پورے پاکستان پر حکومت کرنے کو مل جائے گی مگر اس نے باپ سے کبھی پیشہ ورانہ بات کے

علاوہ دوسری بات نہیں کی تھی۔اس لیے ہر بار دل میں آنے والے آؤٹ آف دا باکس سوال کو وہ وہیں دبا دیتا۔

ایک چال انسان چلتا ہے۔ایک چال اس کا حریف چلتا ہے اور ایک چال وہ ہوتی ہے جسے قدرت چلتی ہے اور بلاشبہ قدرت کی چال سب پہ بھاری ہوتی ہے۔شندور میں پرسکون بیٹھ کے اپنی پیشگی جیت کا جشن منانے والا غاذان نہیں جانتا تھا کہ اصطبل میں اس کا راز اللہ نے فاش کر دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ پتھر کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔اس کی سیاہ فراک نم ہو کے اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔وہ سانس لے رہی تھی یا نہیں،اس سے چند فٹ دور کھڑے غاذان کو نہیں پتہ تھا۔وہ اس حالت میں کھڑی تھی کہ کوئی اسے ہاتھ لگاتا،تو وہ ٹوٹ کے کرچی کرچی ہو جاتی۔

غاذان نے ساری کہانی سنانے کے بعد گل کے کندھے سے جھانک کے پیچھے دیکھا،عبادہ مسلسل اپنے ہاتھ چھڑانے کے لیے مزاحمت کر رہی تھی۔اس کا منہ بہت کس کے باندھا گیا تھا۔اس کا چہرہ نم تھا بھنویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں بے تحاشا غصہ تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے اٹھا اور قدم قدم چلتا اس کے پاس آیا۔گل کا کاجل بہہ کے آنکھوں کے نیچے پھیل گیا تھا۔

''یہ تو ہوئی ماضی کی کہانی،اب سنو مستقبل کی کہانی۔'' غاذان توقف لیتے ہوئے مسکرایا،اس کی چہرے پر جو شیطانیت چھائی ہوئی تھی،وہ عبادہ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔وہ حواس باختہ لگ رہا تھا۔

''شندور میں یقینی طور پر آخری داؤ ابتہاج ہی کھیلے گا کیوں کہ یوسف خان نے کھلاڑیوں کو بلیک میل کیا ہے کہ اگر انہوں نے ابتہاج کو جیتنے نہ دیا تو ہم ان کے ساتھ وہ سلوک کر سکتے ہیں جو بہرام

کے ساتھ کچھ دن پہلے کیا تھا۔ بیچارے کھلاڑی چاہ کر بھی رستم کو نہیں پا سکیں گے۔ رہ گیا انتہاج....." وہ روانی میں کہتا سانس لینے کو رکا۔ "تو اس کے ساتھ میں وہی کروں گا جو آج سے اٹھارہ سال پہلے تمہارے باپ نے گلگت کے رمیز کے ساتھ کیا تھا۔" وہ کسی فاتح کی طرح کمرے میں دائیں بائیں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

گل کو لگا کسی نے گرم برچھی اس کے پیٹ میں گھسا دی ہو۔ ایک ان سنی سسکی اس کے بند ہونٹوں کے اندر معدوم ہوگئی۔ اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ بال گیلے ہو کے موٹی موٹی لٹوں کی شکل میں کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

"میں اسے گھوڑے سے گرا دوں گا۔ وہ انجرڈ ہو جائے گا۔ اس کی Replacement میں، میرا نیا کھلاڑی جائے گا جو آخری داؤ کھیلے گا۔ اب تم دونوں سوچ رہی ہو گی کہ جب ابتہاج انجرڈ ہو کے میچ سے آؤٹ ہو جائے گا تو باقی کھلاڑیوں کے دل میں رستم کی لالچ نہیں پیدا ہو جائے گی؟"

اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"ضرور ہو گی۔ ابتہاج کے جانے کے بعد باقی کھلاڑیوں کی کوشش یہی ہو گی کہ وہ آخری داؤ کھیل لیں مگر مجھے کوئی پروا نہیں کیوں کہ ابتہاج واحد ایسا بندہ تھا جس سے میں کسی بھی قیمت پر رستم چھین نہیں سکتا تھا اور جس طرح کا اس کا مزاج ہے، وہ کبھی دینے پر بھی راضی نہ ہوتا۔ جب وہ نکل جائے گا، باقی کوئی بھی رستم جیتے، اس سے لینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" عیاری سے مسکراتے ہوئے اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

گل اپنی جگہ جم گئی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں تک ساکت ہو گئی تھیں۔ وہ چلتے چلتے رکا اور پلٹ کے مورت بنی گل کو افسوس سے دیکھا۔

''کتنی بار میں نے کوشش کی کہ تم دونوں کو روک دوں لیکن تم دونوں کس مٹی سے بنی ہو؟ ایک گرتی ہے تو دوسری سنبھال لیتی ہے۔ دوسری گرتی ہے تو پہلی سنبھال لیتی ہے۔ میں نے خوابوں خیالوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم دونوں اس قدر ایک دوسرے پر وار جاؤ گی کہ میرے (خود کی طرف افسوس سے اشارہ کیا) میرے خلاف محاذ بنالوگی۔'' وہ حیران بھی تھا اور غصہ بھی۔ اس نے گل کے تھکے ہوئے وجود پر نظر ڈالی۔

''گل..... کیا تم بھول گئی ہو کہ تم میری کیا لگتی ہو؟ میری منگیتر ہو کے تمہیں اس بات کی فکر لگی ہوئی ہے کہ رستم ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ چلا بھی گیا تو کیا ہو جائے گا؟ پلٹ کر تو میرے پاس ہی آئے گا اور میں کون ہوں تمہارا؟ ہونے والا شوہر۔ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے پھر کیا ضرروت تھی یہ قدم اٹھانے کی۔ وہ بھی ایک باہر کی لڑکی کے کہنے پر۔ کیا اب باہر والے بتائیں گے کہ ہم لوگ کیسے ہیں؟'' طنزیہ نظروں سے عبادہ کو دیکھا۔ وہ خود کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''تم عبادہ!'' وہ تیز تیز چلتا اس کے پاس آیا اور پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں گن پکڑے رکھی۔ ''تم تو لاہور سے ہو، بزدل، نازک اور لاڈوں سے پلی لڑکی جو حویلی سے ڈرتی تھی۔ تم میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی؟ ہاں؟ تم تو صرف باتوں سے قائل کر سکتی ہو، یہ منصوبے کب سے بنانے لگ گئیں؟''

عبادہ دبا دبا غرا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ غاذان کے کئی ٹکڑے کر دے۔

''تمہیں منع کیا تھا کہ ناں کہ ہمارے معاملات سے دور رہنا۔ ہم دس گھوڑوں کو زہر دیں یا پورے اصطبل کو آگ لگا دیں۔ تمہیں کوئی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارا کام تھا علاج کرنا، ہمارے نجی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں۔''

عبادہ نے زور سے کندھے کھینچے، وہ اس پر جھپٹنا چاہتی تھی۔

”میں نے مروت کے مارے تمہیں روک کیا دیا تم تو حویلی کو اپنا سمجھ کے بیٹھ گئیں۔اچھا ہوتا اگر اس دن جانے دے دیتا۔نہ تم میرے متھے مزید لگتی نہ مجھے یہ قدم اٹھانا پڑتا۔“ وہ ندامت سے کہہ رہا تھا۔عبادہ کی آنکھوں میں ہلکورے تیر رہے تھے۔اگر اس سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی ملتا تو غاذان کے بیسیوں ٹکڑے کر چکی ہوتی۔

”مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے مس سلیم۔یور آر آؤٹ سائیڈر۔تم میری ٹارگٹ لسٹ میں کبھی شامل نہیں تھی۔تم نے خود کو خود ہی ٹارگٹ بنا دیا تھا۔اگر تم میری بات مان جاتی تو آج اس کمرے میں خود کو آزاد کرنے کے لیے جی جان کی محنت نہ کر رہی ہوتی۔“

وہ بار بار کندھے جھٹک رہی تھی۔اس کی کلائیوں کے گرد باریک رسی گوشت میں دھنس گئی تھی۔خون رک گیا تھا۔ہاتھ جامنی پڑ رہے تھے۔اس کی بے بسی بھری مزاحمت،اس کی تڑپ،اس کی سسک دیکھ کے غاذان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

”یہ رسیاں نہیں ٹوٹیں گی۔یہ تاریں ہیں۔انہیں جتنا تم کھینچو گی،یہ تمہارے گوشت میں گھستی چلی جائیں گی۔اس سے پہلے کہ تمہارا گوشت دو تہوں میں بٹ جائے،اپنی مزاحمت بند کر لو۔“ برہمی اور سفاکیت سے کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تم دونوں پہ ضائع کروں۔شندور سے یہاں تک بڑی مشکل سے آیا ہوں اور صبح ہونے سے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔تم دونوں یہاں اگلے دو دن تک قید ہو جب تک مجھے سرداری نہیں لگ جاتی۔“ گن کو پینٹ کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ مصروفیت سے کہنے لگا۔”میری بڑی خواہش تھی عبادہ کہ تم اور گل میری سرداری اپنی آنکھوں سے دیکھو مگر تم لوگ نے اپنی پیروں پہ خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔اب یہاں رہو جب کہ پورا چترال میرا نہیں ہو جاتا۔“

گل کی دبی سی سسکی نکلی۔اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کر رہی

تھی۔اس کے دل کو کچھ ہوا۔ ہمدردی سے چلتے ہوئے اس کے پاس آیا اور نرمی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''گل۔رو نہیں۔پلیز۔تم کیوں فکر کر رہی ہو۔میں رستم کو بچالوں گا۔ابھی میں نے کہا ناں کہ میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے۔سرداری کے بعد میں تم سے شادی کرلوں گا۔تم میری سردارنی بن جاؤ گی۔ہم خوشی خوشی رہیں گے۔پلیز اس طرح خود کو اذیت مت دو۔'' وہ فکرمندی سے اس کے آنسو پونچھنے لگا تو گل نے بے دردی سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

غاذان نے گہری سانس لی۔''میں جانتا ہوں تم ناراض ہو مگر مجھے پورا یقین ہے تم مجھے معاف کردو گی۔کیوں کہ میں نے جو کچھ نہ کیا ہے۔تمہارے لیے کیا ہے۔ہمارے مستقبل کے لیے کیا ہے۔''

گل نے متورم آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔اس کی آنکھوں کا نیلا بٹن سفیدی میں بھیانک لگ رہا تھا۔

''یہ سب.....تم نے رستم کے لیے کیا ہے۔ہے ناں؟'' گل کے لب بمشکل ہلے۔

''نہیں۔ہمارے لیے کیا ہے۔ہم دونوں کے لیے۔''

''تم نے جو کچھ کیا ہے اب تک،سب میرے خلاف کیا ہے۔مجھے کچھ میرے لیے ہوتا ہوا کیوں نظر نہیں آرہا غاذان؟'' وہ پرشکوہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔کچھ پل کے لیے غاذان لاجواب ہوگیا۔

''ابھی حالات بکھرے ہوئے ہیں۔صرف دو دن تک صبر کرو۔جب سب ٹھیک ہوجائے گا تو تمہیں سمجھ آجائے گی کہ میں نے سب تمہارے لیے کیا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے نم سی سانس کھینچی۔''میرے لیے نہیں کیا۔اپنے لیے کیا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے گل۔ میں نے.....''

''مجھے کوئی وضاحت نہیں دینی۔'' اس نے انگشت اٹھاتے ہوئے وارن کیا۔ ''تمہیں رستم چاہیے ناں۔ رکھ لو۔ مجھے نہیں چاہیے۔ تمہیں ابتہاج کے ساتھ بھی وہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں علی الاعلان خود رستم کو تمہارے حوالے کردوں گی۔'' وہ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''میں مانتا ہوں کہ میں نے غلط طریقہ اپنایا ہے مگر میری نیت بری نہیں ہے۔''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہوگئی۔ ''ہم یہاں رہ لیں گے۔ تم چلے جاؤ شندور۔ میں..... میں..... نہیں آؤں گی وہاں۔ نہیں کھیلوں گی پولو۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ صرف اس کا دل جانتا تھا کہ اس وقت وہ تکلیف کے کتنوں مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ غاذان اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر تب ہی پینٹ کی جیب میں رکھا اس کا فون بجا۔ اس نے رک کر فون نکالا۔ اسکرین پہ نعیم کا نام آرہا تھا۔

اس نے انگوٹھا پھیر کے کال اٹھائی۔

''کہاں ہو غازی۔ جلدی واپس پہنچو لوگ تمہارا پوچھ رہے ہیں۔'' نعیم سرگوشیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''آرہا ہوں بابا۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہتے ہوئے فون کاٹ دیا۔ گل اب ستون کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔ وہ ٹانگوں کے گرد ہاتھ باندھے، چہرے چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ لب بھینچتا ہوا، اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں گل۔ یہ آخری بار تم رو رہی ہو۔ اس کے بعد میں تمہیں رونے کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔'' نرمی سے اس کے سر پہ رکھتے ہوئے بولا۔ گل نے سر کو جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ کچھ لمحے غاذان اپنے ہاتھ کو دیکھتا رہا، پھر گہری سانس لیتے

ہوئے پیچھے کرلیا اور کھڑا ہوگیا۔عبادہ بدستور خود کو چھڑا رہی تھی۔اگر غاذان کو اس کے "hit" کرنے کا ڈر نہ ہوتا تو اس کو رسیوں سے نہ باندھتا۔اپنی مہمان کے لیے وہ اتنی مروت تو دکھا ہی سکتا تھا۔چند قدم پیچھے لینے کے بعد وہ مڑ گیا۔

"چلو عظیم!" اسلحہ بردار کو حکم دیتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

چھت سے پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔نیچے سیلاب بنے فرش پہ بوند گرتی تو چاروں طرف کئی گول دائرے بن جاتے۔وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھی ہوئی تھی۔عبادہ نے گل کے ہاتھ اور گل نے اس کے کھول دیے تھے۔وہ خاموش تھیں۔ٹینکوں میں رہنے والی سپاہیوں کی طرح جو بیس پچیس دن تک آسمان نہیں دیکھتے اور جب باہر نکلتے ہیں تو روشنی سے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

زرد بلب اسی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔کمرے میں موجود بدبو برقرار تھی۔فرش پہ پانی اس قدر تھا کہ ان کے پیر ڈوبے ہوئے تھے۔عبادہ اپنی کلائی کے گرد بنے رسی کے نشان پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"میں نے کل کی پوری رات اصطبل میں گزاری تھی گل۔میں حویلی نہیں آئی تھی۔" وہ خشک لہجے میں کہنے لگی۔"میں آ ہی نہیں سکی۔جب منیب خان نے مجھے غاذان کی ساری کہانی سنائی تو میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ہونہہ۔حویلی آنا تو دور کی بات ہے۔"

گل نے آنکھیں اس کی طرف گھمائیں،عبادہ تکلیف میں تھی لیکن اس سے زیادہ نہیں۔اس کی تکلیف بہت زیادہ تھی۔

"مجھے ہمیشہ سے ہی شک تھا کہ یہ سب غاذان نے کیا ہوگا۔اتنی بڑی گیم ابتہاج کے بس کی بات تھی ہی نہیں۔"

"تمہیں پتہ تھا؟" عبادہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

''ہوں۔ میں بچپن سے دونوں کے ساتھ بڑی ہوئی ہوں، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ دونوں کے دماغ، مزاج اور نیتیں کیسی ہیں۔ جب گھوڑے بیمار ہوئے تو مجھے یہ حقیقت سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب ایک مکمل منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش رچائی گئی تھی۔ بھلا اچانک محض شندور کے گھوڑوں کو راتوں رات کچھ ہو جانا اتفاق کیسے ہو سکتا تھا۔''

''اگر تمہیں پتہ تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' عبادہ نے شکوہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کس بارے میں؟''

''کہ تمہیں غاذان پہ شک ہے۔''

''کیا تمہیں کبھی اس پہ شک ہوا تھا؟'' اس نے دوبدو پوچھا۔ عبادہ کو چپ لگ گئی۔ گل اس کی خاموش پر نرمی سے مسکرائی۔

''میں نے بھی اسی لیے اپنے شک کو جھٹک دیا تھا کیوں کہ میرے نزدیک غاذان کبھی ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ تم خود سوچو اگر منیب خان تمہیں سچائی نہ بتاتا تو تم خود سے کبھی غاذان کا پتہ فاش کر سکتی تھی؟'' گل نے سر گھما کر اسے دیکھا۔

عبادہ کے چہرے پر تکلیف بھرے آثار آ گئے۔ غاذان کا میٹھا لہجہ، نرم خو اور فکر کرتا انداز یاد آنے لگا۔ بھلا اس خوش اخلاق، سادے اور قبیح چہرے کے پیچھے چھپے بدمعاش اور ظالم انسان کو وہ کیسے ڈھونڈ سکتی تھی جب تک کہ وہ خود سامنے نہ آتا۔ اس کی بناوٹی اچھائیوں کے پیچھے اس کے اصل مزاج کو تسخیر کرنا واقعی مشکل کام تھا۔ لوگ اچھائی کے سات پردوں میں چھپے ہوتے ہیں، غاذان آٹھ پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ محبت، اپنائیت، فکر، نرمی، اخلاق، ادب، دوستی اور ہمہ وقت مسکراہٹ کے آٹھ پردے اس کی عیار شخصیت کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے بھی ان پردوں کو چاک نہیں کر سکتی تھی۔

گل نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''پریشان نہ ہوں عبادہ۔ اسے رستم چاہیے ناں۔ اسے لینے دو۔ مجھے نہیں چاہیے۔''

عبادہ نے دکھ سے اسے دیکھا وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھی۔

''تم نے کہا تھا ناں کہ اگر ماں کو انتخاب دیا جائے کہ اسے اپنے بچے کو کٹی ہوئی حالت میں پاس رکھنا ہے یا سالم سلامت حالت دور میں تو وہ ہمیشہ کس کا انتخاب کرے گی؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے عبادہ کو دیکھا پھر نرمی سے مسکرائی۔ ''میں نے سالم سلامت حالت میں دور کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ رستم سلامت رہے۔ چاہے جس کے پاس بھی رہے۔''

''مگر گل، وہ تمہارا پالتو ہے۔ میں نے.....''

''جانتی ہوں کہ تم یوسف خان سے بہت لڑی ہو اور انہوں نے پریشر میں آ کے مجھے سلیکٹ بھی کر لیا ہے اور کہیں نہ کہیں اس سلیکشن کے بعد میرا بھی دل چاہا تھا کہ میں رستم کو خود جیتوں مگر چوں کہ میں نے اسے ہار جانے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اس اغواء میرا کچھ خاص بگاڑ نہیں ہے۔''

وہ کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے زخمی سی مسکرائی۔

وہ کیوں نہ مسکراتی۔ پتھر کے اندر ہیرا ہو تو لوگ پتھر توڑ کر ہیرا نکالتے ہیں جیسے کرسٹی لینا کو قتل کر کے اس کے ناخن اور آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ رستم خود ہیرا تھا۔ وہ جس کے پاس بھی جاتا اس نے رستم کو ہمیشہ سنبھال کے، سہج کے رکھنا تھا بالکل ایک ہیرے کی طرح۔ اس کی سالمیت اور خوشی پر گل کو کوئی شک نہیں تھا۔ اس لیے رستم کے حوالے سے وہ مطمئن تھی۔ رہی بات اپنی کامیابی کی تو نعیم کو جیل بھیج کے اسے زندگی کی اصل کامیابی تو مل ہی جانی تھی۔ رستم نہ سہی، نعیم سہی۔ ایک طرف غاذان اس سے رستم چھین لے گا تو دوسری طرف وہ اس سے باپ چھین لے گی۔ داؤ دونوں طرف پھر بھی برابر ہی لگیں گے۔ گل کو اگرچہ اپنے رستم کی سالمیت کا اعتماد تھا مگر بیچارہ غاذان۔ کیا وہ اپنے

باپ کی سالمیت کا اعتماد کر سکتا تھا؟ کیا وہ کہہ سکتا تھا کہ اس کا باپ چاہے جس بھی جیل جائے گا، خوش رہے گا؟ آباد رہے گا؟ اس کا خیال رکھا جائے گا؟ نہیں۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رہی بات پولو کھیلنے کی تو جنہوں نے آج منتخب کیا تھا۔ وہ اگلے سال بھی کر لیں گے۔ اگر انہوں نے اس سال اس میں کچھ انوکھی خوبی دیکھی تھی آئندہ سال بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے بھی سردار یوسف خان ہو یا غاذان۔ دونوں شندور کے معاملات میں نہیں بول سکتے تھے۔ اس لیے اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا کہ غاذان سردار بننے کے بعد اسے پولو کھیلنے سے روک دے گا۔

''گل!'' عبادہ نے دھیرے سے مخاطب کیا۔

''ہوں؟'' وہ چونکی۔

''مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ یہ وقت درست تھا کہ اسے ساری سچائی بتا دی جائے۔ اسے کہہ دیا جائے کہ بھلے ہی وہ اس پنجرے میں قید ہیں مگر آزاد گھومنے والا غاذان بھی بچ نہیں پائے گا۔ وہ نادانستہ ہی سہی، اس کا سد باب کر کے آئی ہے۔

''بولو۔'' گل سنجیدگی سے متوجہ ہوگئی۔ عبادہ نے گہری سانس لی اور کہنا شروع کیا۔

''جانوروں کو قتل کرنا ایک جرم ہے۔ پاکستان میں دانستہ طور پر قتل کیے گئے جانوروں کے قاتلوں کے لیے سزائیں اور جرمانے مختص کیے گئے ہیں۔ تم چترال سے ہو۔ تم جانتی ہوگی۔ یہاں کا مارخور دنیا کا سب سے خوبصورت مارخور ہے۔''

''ہاں۔''

''پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ اگر اسے کسی نے ٹھیس پہنچائی تو حکومت پاکستان اس کو کڑی سے کڑی سزا دے گی۔''

''ہاں۔''

''بالکل اسی طرح Domestic Animals یعنی گھریلو مال مویشیوں کو مارنے والوں کے لیے بھی سزائیں مقرر ہیں۔ میں خود دو بار ایسے Crew کا حصہ بن چکی ہوں جس نے بے سبب کتوں، بلیوں اور جنگلی حیات کو مارنے والوں کے خلاف Legal FIR درج کرائی ہے۔ میں یہاں چترال دو مشنز کے ساتھ آئی تھی۔ اول گھوڑوں کا علاج کرنا اور دوم بیماری ڈھونڈنا۔ چوں کہ بیماری از خود کسی چیز سے نہیں لگی بلکہ گھوڑوں کو شعوری طور پر مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لیے ایسا قدم اٹھانے والے کے خلاف Legal FIR کٹے گی۔''

''مطلب؟'' گل چونکی۔ عبادہ فاتحانہ وار مسکرائی۔

چھت ٹپکتی رہی۔ چکنی دیواروں سے اٹھتے بھبکوں میں سانس لینا دوبھر ہوتا گیا۔ زرد رنگ کا بلب جلتا رہا، بجھتا رہا۔ اس مدھم ماحول میں، خالی دیواروں کے درمیان عبادہ کی آواز گونجتی رہی، گل کے تاثرات جگنوؤں کی طرح چمکنے لگے۔ خوشی، مسرت اور دل فریبی کے سارے رنگ ایک ایک کر کے اس کے چہرے پر نمایاں نظر آنے لگے۔ وہ پہلے حیرت، پھر شاک پھر ممنونیت سے عبادہ کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں تشکر، اپنائیت اور وارفتگی کا احساس تیر رہا تھا۔ عبادہ اسے کترائے، ڈرے اور خائف خائف انداز میں بتا رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ پوچھ لے کہ اب تک اس بات کو چھپایا کیوں تھا۔

''اس کا مطلب وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں بچا سکتا۔'' اس کے چپ ہونے کے بعد گل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل.....''

''ہمم.....'' وہ پھیکی سی مسکرائی۔

''میں وقت سے پہلے تمہیں کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی اس کا درست وقت آئے گا تو تب بتاؤں گی۔'' اس نے تاخیر کی وجہ پیش کرتے ہوئے معذرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''اگر ایسا ہے تو مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔'' وہ ذرا سیدھی ہوگئی اور گلا کھنکارا۔

''تم نے بھی کچھ چھپایا ہے؟'' عبادہ نے تیزی سے پوچھا۔گل نے جھینپتے ہوئے بال کھجائے۔

''ہوں۔''

''کیا؟''

''میرے بابا کو غاذان کے باپ نے مارا تھا عبادہ.....''

عبادہ کو اگلا سانس نہیں آیا۔اس نے دیدے پھاڑ کے گل کو دیکھا۔

''داجی نے بابا اور نعیم چچا کو سرداری کے لیے نامزد کیا تھا۔ان کی شرط گلگت سے پولو کا میچ جتنا تھا۔جس بیٹے نے زیادہ گول داغے، وہی سردار ٹھہرنا تھا۔بی جان نے داجی کو منع کیا کہ دونوں بیٹوں کے مابین اتنا جان لیوا مقابلہ نہ کرائیں۔وہ دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن داجی نے کہا کہ سب کے سامنے وہ کیا کرلیں گے۔جو کریں گے، ہم دیکھ لیں گے۔جس دن مقابلہ تھا۔اس دن دوسرے مرحلے میں عالیہ بیگم کا بھائی اپنے گھوڑے سے نادانستہ طور پر گرا۔بابا کی بلوری غلطی سے اس پر چڑھ گئی۔اس کی گھوڑی کی لگام رمیز کے گردن کے گرد بندھ گئی اور بلوری اچانک مچل گئی جس پہ وہ سرپٹ دوڑنے لگی۔رمیز کی گردن میں پھندا تھا۔بلوری کے دو جست کے بعد رمیز کی موت ہوگئی۔بابا نے اس وقت بلوری کو بہت قابو کیا لیکن وہ قابو نہیں ہوئی۔رمیز کی موت لکھی ہوئی تھی۔''

وہ پانی کی تہہ پر ہاتھ پھیر رہی تھی جیسے ماضی کی گڈمڈ یادیں مٹا رہی ہو۔

''میچ ڈرا ہوگیا۔دستار ملتوی ہوگئی۔کوئی میچ نہیں جیتا۔گلگت نے الزام لگایا کہ ہم نے قتل کیا ہے۔انہوں نے قصاص مانگا۔میرے بابا بے قصور تھے۔انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔داجی بھی حیران تھے کہ ہزاروں لوگوں کے سامنے ہونے والے حادثے کو بلتی کیوں کر قتل کہہ رہے ہیں۔دا

جی لڑے، انہوں نے بابا کا دفاع کیا لیکن اس وقت حالات بہت خراب تھے۔ حالات کی نزاکت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نعیم چچا نے بابا کی بلوری کو پہاڑ سے نیچے پھینک دیا۔ اس کے بعد میرے بابا کو شوٹ کر کے بلوری کے ساتھ نیچے پھینک دیا۔''

وہ سانس لینے کو رکی۔ عبادہ بھی سانس روک کے سن رہی تھی۔ گل انگلیوں سے پانی پر نقش بنا رہی تھی۔ ''اس کے بعد داجی نے نعیم چچا کو سرداری کے لیے منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ عالیہ کے باپ نے بدلا جب انہوں نے داجی کو سچائی بتائی۔ نعیم چچا بلتیوں سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے بابا پر قتل کا الزام بھی اپنی مدد سے لگایا تھا۔ داجی نے نعیم چچا کو گھر سے نکال دیا اور بلتیوں سے خلش برقرار رکھی۔ مقامی جرگے نے یوسف چچا کو تنبیہہ کی کہ بلتیوں سے کبھی میلاپ نہیں رکھنا۔ ادھر بلتیوں کو تاکید کی کہ چترال کے کھووار قبیلے سے دور رہنا ہے۔ داجی کو لگا کہ اگر یہ معاملہ کھلا کہ قتل کس نے کیا ہے تو قبیلے میں طوفان آجائے گا۔ انہوں نے نعیم چچا کو نکالنے کی وجہ بی جان اور یوسف خان کے علاوہ کسی کو نہیں بتائی۔ میں چھوٹی تھی۔ حویلی والوں نے مجھ سے سب چھپائے رکھا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ بابا گھوڑے کے ساتھ کھائی سے گر گئے تھے۔ ان کے ساتھ حادثہ ہوا تھا۔ جانے کیوں مجھے ان کی بات کا یقین نہیں ہوتا تھا۔ جب بڑی ہوئی تو میں نے تحقیق کی، تب مجھے یہ سچائی پتہ چلی۔''

کہتے ہوئے اس کا لہجہ کربناک ہو گیا۔ اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔

''تمہارے بابا کو غاذان کے بابا نے مارا تھا۔'' عبادہ شاک سے کہہ رہی تھی۔

''ہوں۔'' اس نے سر کو جنبش دی۔

''غاذان یہ بات جانتا ہے؟''

''ظاہر ہے۔''

''پھر بھی وہ اپنے Culprit باپ کا ساتھ دے رہا ہے۔'' وہ دھواں دھواں رہ گئی تھی۔

''ہاں..... کیوں کہ اس کے باپ نے اس کی تربیت ہی ایسی کی ہے۔ اسے یہی سکھایا گیا ہے کہ اگر کچھ صحیح طریقے سے حاصل نہ ہو تو اسے برے طریقے سے حاصل کرو۔ چاہے اس دوران تمہیں کتنی ہی زندیاں تباہ کیوں نہ کرنی پڑ جائیں۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''مگر گل۔ بے شک ہمارے والدین کی تربیت معنی رکھتی ہے مگر زندگی کے ایک مقام پر پہنچ کر ہمیں خود بھی اچھائی اور برائی کی سمجھ آجاتی ہے۔ غاذان بچہ تو نہیں ہے ناں کہ اس عمر میں پہنچ کر بھی اسے نیک اور بد کے درمیان تمیز کرنے کے لیے باپ کی انگلی کا سہارا لینا پڑے۔'' وہ دبے دبے غصے سے کہہ رہی تھی۔

گل نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ ''خون خون کا فرق ہوتا ہے عبادہ۔ اس کی تربیت کو ہم بھلے ہی نظر انداز کر لیں مگر اس کے اندر خون تو نعیم اللہ کا ہی بہہ رہا ہے۔''

''ہوں۔'' عبادہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''فطرت خون کے تابع ہوتی ہے۔''

''اور خون کبھی نہیں بدلتا۔'' وہ گھائل انداز میں مسکرائی۔

''یقیناً۔''

''یونو وہاٹ۔ مجھے اس سے زیادہ خود پہ افسوس ہو رہا ہے۔ میں نے کیسے اس پر اعتماد کر لیا۔ میں اتنی بدھو کیسے ہو سکتی ہوں؟'' وہ بالوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے تاسف سے بولی۔ وہ بری طرح پچھتا رہی تھی۔

جب اسے پتہ چلا کہ گھوڑوں کو Immmunity dsetruction کے ٹیکے لگے ہیں تو اس نے طارق سر سے پہلا سوال ہی یہی کیا تھا کہ یہ ٹیکے جو پاکستان میں ملتے ہی نہیں، وہ ابتہاج کہاں سے پیدا کر سکتا ہے۔ سر نے کہا کہ ابتہاج گرفتاری کے بعد خود ہی بتا دے گا۔ اس نے بھی سوچا

کہ تب پوچھ لیں گے مگر وہ اندر ہی اندر اس خلش کا شکار تھی کہ اتنے نایاب اور غیر دستیاب ٹیکے ایک ان پڑھ جاہل آدمی کیسے لا سکتا ہے پھر سوچا کسی سے پوچھ لیا ہوگا۔ ابتہاج پر شک کرنے کے لیے اس نے ہمیشہ ہی خود کو سو بہانے دیے تھے۔ اس نے ایک دفعہ بھی غاذان کے بارے غیر جانبداری سے نہیں سوچا تھا۔ اگر غاذان اس سے بات کرنے میں ذرا سی سختی برتتا تو ممکن تھا کہ اسے اس کے "خلاف" سوچنے کا بہانہ مل جاتا جیسے ابتہاج نے اسے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج سے "غلط" سوچنے کا موقع دیا تھا مگر غاذان شاطر تھا۔ وہ کسی بھی مقام پر اپنی اچھائی کا لبادہ نہیں اتار سکتا تھا۔

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے عبادہ۔ حالات کا ہے۔" گل نے اس کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "خود کو Guilt مت فیل کرواؤ۔ تمہیں Frame کیا گیا تھا۔ تم سب سے پہلی بار مل رہی تھیں۔ تمہیں کیا معلوم کون کیسا ہے۔ تمہیں جس نے اپنا آپ جیسے دکھایا۔ تم نے اس کو ویسے ہی سمجھ لیا۔ جس نے اچھائی کا ملمع اوڑھا، تمہیں وہ اچھا نظر آیا۔ جس نے دوستی کا ملمع اوڑھا، تمہیں وہ دوست نظر آیا۔ تم ان کے ساتھ بچپن سے پلی بڑھی نہیں تھی کہ تمہیں ان کی گھٹی گھٹی کا ادراک ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مت سوچو کہ تم نے لوگوں کو پہچاننے میں غلطی کر دی ہے۔" گل اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"کاش مجھے تھوڑا سا اندازہ ہو جاتا۔ کاش مجھے ذرا بھنک لگ جاتی۔ میں کبھی بھی غاذان کو اس حد تک نہ جانے دیتی۔" وہ پچھتاوے، پشیمانی اور افسوس میں جکڑی ہوئی تھی۔

"عبادہ! ہم انسان ہیں۔ کوئی سکین مشین نہیں کہ لوگوں کے جسموں کے اندر موجود جسموں کو دیکھ سکیں۔ ہم دو آنکھیں رکھتے ہیں اور یہ دو آنکھیں وہی دیکھ سکتی ہیں جو انہیں دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے خود کو مت کوسو۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔"

"مگر گل، ہم نے ایک بے قصور آدمی پر شک کیا ہے جس کی کوئی غلطی ہی نہیں تھی۔"

''کس نے کہا ہے کہ ابتہاج کی غلطی نہیں تھی؟'' گل نے تیزی سے پوچھا۔عبادہ نے سر اٹھا کر اسے الجھن سے دیکھا۔''اس کی غلطی تھی۔اس نے مجھے کتنے درد دیے ہیں بھول گئی ہو؟ غاذان نے مجھ پہ ہاتھ نہیں اٹھایا مگر ابتہاج۔'' کہتے ہوئے حلق میں کانٹے اگے۔''ابتہاج نے میری چمڑی ادھیڑی ہے۔مت کہو اسے بے قصور۔وہ بھی غاذان کا ہم پلہ ہے۔میرے مجرموں کی فہرست میں وہ بھی آتا ہے۔''

ٹھیک کہہ رہی تھی وہ۔اگر ابتہاج کا رویہ ٹھنڈا اور مزاج ہلکا ہوتا تو عبادہ غاذان اور اس کے درمیان ترازو کیوں بناتی؟ کیوں وہ دونوں کے درمیان فرق کرتی؟ ایسا کرنے کے لیے اگر اسے غاذان نے Frame کیا تھا تو ابتہاج نے نادانستہ اور لاشعوری طور پر اس کا پورا ساتھ دیا تھا۔اگر وہ اپنے ''متضاد'' میں غاذان کو مزاج سے ہرا دیتا تو کیوں عبادہ ایک کو اچھا اور دوسرے کو برا کہتی؟

ابتہاج غصے کا تیز تھا۔اس کے جذبات ہر وقت بھٹی کے الاؤ میں جلتے تھے۔بلاشبہ وہ کسی کے لیے دل میں خلش نہیں رکھتا تھا مگر زبان پر تو ہر وقت ببول اگتے تھے ناں۔اس کے گرم جذبات اور انتھک غصہ نا چاہتے ہوئے بھی اسے کئی نظروں میں مشکوک بنا دیتا تھا۔اس کا فی الفور ردعمل دینا اور بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھانا، اسے مجرم بنا رہا تھا۔اگر غاذان نے اچھائی کا چہرہ چڑھایا ہوا تھا تو ابتہاج نے اپنی برائی کا چہرہ بھی تو کھلا رکھا تھا۔اس نے اپنے مزاج سے غاذان کے منصوبے کو Support کیا تھا۔غاذان شاطر تھا۔اس نے حویلی کے کسی دوسرے مرد کو نشانہ بنانے کی بجائے ابتہاج کو بنایا تھا کیوں کہ وہ اس کا ہمعصر تھا۔اس کے ساتھ بچپن سے رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ باقی مرد کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے اپنی عقل اور فہم کو بروئے کار لائیں گے لیکن ابتہاج نہ کسی سے مشورہ لے گا اور نہ ہی خود نظر ثانی کرے گا۔

وہ بغیر کوئی جمع تفریق کیے ایسا اندوہناک قدم لے گا کہ یوسف خان سے لے کر ابراہیم تک

سب اس پر کڑی تنقید کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ لاہور سے آئی عبادہ کی نظروں میں ابتہاج نے اپنے پہلے تعارف میں ہی خود کو انتہائی برا بنا دیا۔ وہ کیسے اسے برا نہ مانتی؟ کیا اس نے کبھی خود کو اچھا دکھانے کی کوشش کی تھی؟ کیا اس نے کبھی سوچا تھا کہ اس کی شخصیت کے بارے میں اپنے پرائے کیا رائے رکھتے ہیں؟ دل سے برا منہ کے برے سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے لیکن لوگ سنتے تو منہ والے کو ہیں ناں؟ دل کی باتیں سنائی کہاں دیتی ہیں مگر ابتہاج ایسا شخص اس سے لاعلم تھا۔

''میں مانتی ہوں کہ میں نے جب اسے اکسایا تو اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اسے غصہ دلایا تو اس نے غصہ کیا۔ مگر میں کیوں غصہ نہ کرتی؟ اس کے باپ نے میرے باپ کا بدلہ لینے کی بجائے صلح کی تھی۔ اپنے بھائی کو کڑی سزا دینے کی بجائے اسے صرف جلاوطن کیا تھا۔ اس کی ماں حویلی پر پھن پھلائے بیٹھی ہوتی ہے۔ کوئی اس کی موجودگی میں سانس نہیں لے سکتا۔ گھر کی باقی خواتین اس کے جوتوں کے برابر ہیں۔ مجھے کیوں غصہ نہ آئے۔ وہ بزدل قماش حویلی کی ہر عورت پر ایسے حکم جتاتا ہے جیسے وہ اس کی زرخرید غلام ہو۔'' وہ ناک چڑھا کر کروفر سے کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے اس سے عوامی بیر نہیں ہے۔ ذاتی بیر ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔ اس کا حاکمانہ انداز، جابرانہ سلوک، کڑوا لہجہ اور متنفر مزاج۔ کون اس سے محبت کرے گا۔ اس کے اندر صرف زہر بھرا ہے۔ تلخ اور کڑوا زہر جس نے اسے اس قدر بداخلاق بنا دیا ہے کہ کوئی بھی اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔''

''مگر اس نے تمہارے غاذان جتنا برا نہیں کیا۔ غاذان نے تمہاری روح پر وار کیا ہے اور ابتہاج نے جسم پر۔ تمہارے جسم کے داغ مٹ جائیں گے گل مگر روح کے داغ کیسے مٹاؤ گی؟'' عبادہ اسے دکھ سے دیکھ رہی تھی۔

گل نے گہری سانس لی۔

''چوٹ چوٹ ہوتی ہے عبادہ۔ چاہے جسم پہ لگے یا روح پہ۔ دونوں کے درد کا مرکز دل ہوتا ہے۔ یہاں (سینے پر ہاتھ رکھا) سے ٹیس اٹھتی ہے۔ میں خود کو ملی تکلیف کو لے کر دونوں کا موازنہ قطعی نہیں کروں گی۔ میرے لیے دونوں یکساں ہیں۔''

وہ بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔ عبادہ نے اس سے دبا دبا اتفاق کیا۔ اپنی جگہ گل بھی ٹھیک تھی۔ غاذان ہو یا ابتہاج، دونوں نے اسے برابر دکھ دیے تھے۔ ابتہاج کی لغت میں نظر انداز کرنے نام کا کوئی مرکب نہیں تھا۔ وہ اپنا بدلہ لیتا تھا لیکن اس سے جس پر اس کا بس چلتا ہے اور حویلی کے خواتین سے بڑھ کر اس کا Target بھلا کون ہو سکتا تھا۔

باقی کی عورتیں تو سر جھکا کر اس کی سراسیمگی کے آگے تابعداری دکھا دیتی تھیں مگر گل چوں کہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانا اور اچھے و برے میں تمیز کرنا جانتی تھی، اس لیے وہ اس کے کسی بھی ناجائز بات کا دھڑلے سے جواب دیتی تھی جس سے وہ ابتہاج کی نظروں میں Bad Target بنتی چلی گئی۔ بری ٹارگٹ بننے کے سبب اس نے ابتہاج سے ان دیکھی دشمنی مول لی تھی۔

دونوں کے درمیان بات بات پر محاذ کھل جاتے تھے۔ ابتہاج اپنے مزاج سے مجبور ہو کر گل کو جھکانے پر مجبور کرتا جب کہ گل اپنے مزاج سے مجبور ہو کر سر اٹھائے رکھتی۔ جب دونوں کے متضاد مزاج ملتے تو اکثر حویلی کے برتن بجتے رہتے۔ دونوں کے درمیان چھتیس کا آنکڑہ لگا ہوتا تھا۔ اگر دادا جی زندہ ہوتے تو لان میں موجود اکھاڑے میں ہر وقت ابتہاج اور گل لالہ کو گتھم گتھا پاتے۔

عبادہ نے ہاتھ اس کے گرد حمائل کر لیے..... گل نے آہستہ سے اس کا سر تھپکا۔

☆.....☆.....☆

صلح کے بعد وہ دو سال تک چترال اس لیے نہیں آ سکے کیوں کہ ابھی تک دونوں قبیلوں میں پھر

سے دوطرفہ تعلقات بڑھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ دونوں جس بڑے المیے سے گزرے تھے، اس کا اثر اس قدر زیادہ تھا کہ جن لوگوں نے تکلیف دی تھی دوبارہ ان لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھا دل پہ پتھر رکھنے کے برابر تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ صلح کے بعد انہوں نے اپنی آپسی خلش کو دور کرنے کے لیے کوئی محنت نہیں کی بلکہ بلتی قبیلے کی طرف سے کئی معزز مہمان ان دو سالوں میں چترال آچکے تھے۔ خود گودائی قبیلے کے کم ہی افراد ایسے تھے جو اس لمبے عرصے میں اپنے نقصان کو بھلا سکے تھے۔ اپنے تئیں انہوں نے اس حادثے کو جلد بھلا دیا تھا ورنہ دیہی علاقوں میں خاندانی دشمنیوں کی داستانیں کئی نسلوں تک چلائی جاتی ہیں۔ دادا، پردادا سے شروع ہونے والی دشمنی ایک ناختم ہونے والی زنجیر ہوتی ہے۔ ہر نسل کی کڑی اس میں جکڑی ہوتی ہے۔ یہ لوگ صدیوں تک اپنے دشمن اور دشمنی کو یاد رکھتے ہیں۔

عالیہ اس سال اس لیے آئی تھی کہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ کھوار قبیلے نے گل لالہ کو آدھی سچائی بتائی ہے۔ جس طرح انہوں نے آج سے اٹھارہ سال پہلے اپنے خاندانی ناموس اور عزت کے لیے نعیم کا گناہ چھپایا تھا اور کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی، اس طرح انہوں نے گل کو بھی مکمل سچائی سے لاعلم رکھا تھا۔ پشاور میں جب اسد کو معلوم ہوا کہ گل ہی وہ لڑکی ہے جس کے باپ کے قتل میں اس کا ماموں ملوث تھا تو اس نے فوراً عالیہ کو بتایا۔ عالیہ پہلے تو یہ سب سن کر شاک میں چلی گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کھوار قبیلے والے ایک لڑکی کو تن تنہا یونی ورسٹی جیسے بڑے تعلیمی ادارے میں پڑھائیں گے پھر جیسے تیسے کر کے انہیں یقین آیا تو اس بات پر ایمان لانا غیر یقینی تھا کہ وہ ان کے بیٹے کے ساتھ چار سال پڑھتی رہی اور دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں پہچانا تھا حالاں کہ بچپن میں جب جب اسد چترال آتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ ان میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ مگر ظاہر ہے وہ کیسے پہچان سکتے تھے ایک دوسرے کو۔ اول دونوں کا سیکشن الگ تھا۔ دوم ان کو

ملے اٹھارہ سال ہو چکے تھے۔وہ بچے نہیں رہے تھے۔بڑے ہو چکے تھے۔ان کے نین نقش بدل چکے تھے۔

عالیہ نے اسد کو سمجھایا کہ گل کے بارے میں کچھ معلومات جمع کرے۔چوں کہ اسد نے گل کے پاس فائل دیکھی تھی اس لیے اس نے سب سے پہلے فائل کی کھوج لگائی کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔یہ مشکل نہیں تھا۔گل نے ایک پورا دن آف کیا تھا۔اس دن وہ ہاسٹل نہیں ٹھہری تھی۔وہ جگہ جگہ گھومی تھی۔لاء ڈیپارٹمنٹ سے گل کے بارے میں معلوم کرنے پر احتشام کا بھی پتہ چل گیا تھا۔چوں کہ عالیہ احتشام سے مل چکی تھی۔اس کو وکیل ہونے کی حیثیت سے جانتی تھی،اس لیے اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ احتشام نے گل کو کس قدر سچائی بتائی ہوگی۔ظاہر ہے احتشام جہانگیر تک سچائی سے واقف تھا۔نعیم کے بارے میں نہ وہ خود جانتا تھا اور نہ ہی وہ گل کو بتا سکتا تھا۔اس لیے یہ سو فیصد قابلِ یقین ہو گیا کہ اس لڑکی کی نظر میں کھووار قبیلہ بہت برا ثابت ہونے والا تھا۔

جب صلح ہو گئی اور دونوں قبائل ایک دوسرے کے یہاں جانے لگے تو حالات سے ممکن حد تک پتہ چل رہا تھا کہ گل لالہ حقیقت سے ناواقف ہے۔اس غلط فہمی میں آ کر وہ ایسے لوگوں سے نفرت کر رہی تھی جو اس کے باپ کی موت کے قصوروار تو تھے مگر قاتل نہیں تھے۔اس کا اصلی قاتل سے لاعلم ہونا اسے مزید نقصان پہنچا سکتا تھا۔ظاہر جب انسان کو اس کا دشمن معلوم ہو تو وہ اس کے عتاب اور شر سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔گل بھی کوشش کر سکتی تھی۔عالیہ کو خلش تھی کہ گل آدھی سچائی کی وجہ سے کسی بے گناہ کو ٹھیس نہ پہنچا دے۔اگر کل گودائی قبیلہ چترال گیا،ان کے حویلی میں ٹھہرا تب گل لالہ ضرور کچھ ایسا کر سکتی تھی جس سے دشمنی کی ایک نئی لہر کو ہوا مل جاتی۔اس کو سچائی بتا کر اس بات کی ضمانت حاصل کرنا اہم تھا کہ گودائی قبیلہ صلح کے بعد بھی کسی خطرے میں نہیں اور یہ ایک ہی صورت ممکن تھا۔گل لالہ کو تصویر کا وہ رخ دکھایا جائے جو اسے کم سن اور کم عمر جان کر ان کے حویلی والوں

نے چھپایا ہوا تھا۔

اس لیے اس بار وہ خود آئیں۔ان کے دل میں اسد کے لیے گل لالہ کی خواہش اس وقت پیدا ہوئی جب انہوں نے اس کو دیکھا۔ظاہر ہے یہ ایک فطری خواہش تھی۔جیسے جوان بیٹوں کی مائیں ہر تقریب،شادی بیاہ میں کنواری لڑکیوں پر تنقیدی نظر ڈالتی ہیں،انہوں نے بھی ڈالی تھی اور بلاشبہ گل انہیں بہت پسند آئی تھی مگر جب انہوں نے بی جان سے اسد کے لیے گل لالہ کی بات کی تو انہوں اس کی نسبت غاذان سے طے کرنے کا انکشاف کیا۔غاذان یعنی نعیم اللہ کا بیٹا اور نعیم یعنی گل لالہ کا گنہگار۔کیا یہ اتنا آسان تھا کہ وہ عنقریب اپنے باپ کے قاتل کی بہو بننے والی ہے؟

کیا یہ لوگ اتنے ٹھنڈے دل کے مالک ہوگئے تھے کہ ایک لڑکی کو اس کے دشمن کے سپرد کر رہے تھے وہ بھی ایک ایسا دشمن جس کو اپنے کیے پر ذرا بھی ندامت یا پچھتاوا نہیں تھا؟ جس نے اپنی بھابھی اور بھتیجی سے معافی مانگنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔جس کے کٹھور دل اور پتھر جیسے جذبات میں اتنے سالوں بعد بھی رحم نام کی کوئی چیز شامل نہیں ہوئی تھی۔انسان اپنی اولاد اور خاندان سے دور ہو جائے تو نرم دل ہو جاتا ہے کیا اس عرصے میں اس کے چٹان جیسے دل میں رتی برابر نرمی نہیں آئی تھی۔اس نے اتنے عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ جو اس نے کیا وہ کس قدر برا عمل تھا؟ اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔سگا بھائی۔ایک ماں باپ کی اولاد۔کوئی اتنا سنگ دل کیسے ہو سکتا تھا؟

مانا کہ بی جان نے اور سرور خان نے نعیم کا راز اگلے بغیر اسے سزا اس لیے دی تھی کہ چترال میں قبیلے کی بدنامی اور رسوائی نہ ہو مگر گل کو غاذان کی بیوی بنا کر وہ اپنی غلطی پر ایک اور غلطی کر رہے تھے۔اگر گل آج اس حقیقت سے لاعلم ہو کر غاذان کی بیوی بن جاتی ہے تو کل زندگی کے کسی موڑ پر جب اس کے سامنے یہ سچائی سامنے آئے گی۔کیا وہ خود کو،بی جان کو،حویلی والوں کو معاف کر سکے

گی؟ کیا اس کے اندر اتنی طاقت ہوگی کہ اپنی جان پر ایک اور ستم سہہ جائے۔ وہ کھوار تھے۔ ان کے ہاں سسر کی عزت باپ کی طرح کی جاتی تھی۔ کل شادی کے بعد گل پر بھی لازم ہو جاتا کہ وہ نعیم کی خدمت کرے۔

بالفرض اسے اپنی شادی کے کچھ سال بعد اس سچائی کا پتہ چلتا ہے۔ کیا وہ برداشت کر پائے گی کہ اس نے اپنے جس سسر کو کھلایا پلایا۔ اس کی آؤ بھگت کی، وہی اس کے باپ کا سفاک قاتل ہے جس کے مکروہ چہرے پر ندامت یا معافی نام کا کوئی تاثر نہیں؟ اگر نعیم اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا اور بری طرح پچھتاتے ہوئے معافی مانگتا تو ممکن تھا کہ گل اخلاقیات اور شریعت کے ناطے اس کو معاف کر دیتی مگر تب بھی وہ اس کی شکل دیکھنے کی خواہاں نہ ہوتی۔ یہاں اس سے سچ چھپا کر حویلی والے اس کو اندھے کنویں میں پھینک رہے تھے۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے سکتی تھیں۔ گل کا جارحانہ انداز اور اپنے اندر لیا ہوا غصہ دیکھ کر عالیہ سمجھ گئی تھی کہ وہ نیم سچائی جان کر اپنا ردعمل دے رہی ہے جو دونوں قبائل کے لیے انتہائی پرخطر ہے۔ اس صورت وہ ہرگز رسک نہیں لے سکتی تھیں جب تک کہ وہ حویلی میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ گل کی پے در پے ہولناکیاں دیکھنا اور اس کے مزاج کے الجھاؤ نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ جھوالہ مکھی بنی ہوتی تھی دوسرے لمحے وہ معافی مانگتی تھی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ کوئی کھیل کھیل رہی ہو۔ کھیل بھی ایسا کہ اسے خود بھی نہیں معلوم وہ کیا کر رہی ہے۔

اس لیے انہوں نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ گل کو سچائی بتا دی جائے۔ جو حالات عالیہ آگے دیکھ رہی تھی وہ حویلی والے بھی دیکھ رہے تھے مگر حویلی والے ہمیشہ کی طرح ان حالات کو نظر انداز کر رہے تھے جب عالیہ گل سے حقیقی ہمدردی رکھتی تھی کیوں کہ ایک نہج پر ان دونوں کا دکھ سانجھا ہو جاتا تھا۔ انہوں نے گل کو سچائی بتانے کا فیصلہ کیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ باقی کی آدھی سچائی بھی

جان لیتی۔

عالیہ کی گل سے سچائی بیان کرنے کے ایک دن بعد:

گل کو اپنے لیے Stand لینے کے لیے سمجھانے کے بعد عالیہ اس کی حالت دیکھ کے جان گئی تھی کہ وہ بیچ بھنور میں پھنس گئی ہے۔اس پر بیک وقت ایسی سچائیاں کھلی ہیں کہ وہ گومگو ہے۔اس کا دماغ ''یقین'' سے ''ردعمل'' کی طرف جاتے ہوئے کچھ وقت لے گا مگر جس طرح انہوں نے اس کو ڈھارس بندھائی تھی۔وہ جان گئی تھیں کہ گل دیر سے سہی مگر ردعمل ضرور دکھائے گی۔

وہ جب سے حویلی آئی تھیں۔انہوں نے گل اور عبادہ کو اپنی نظروں کے نیچے رکھا تھا۔عبادہ ان کے لیے ایک اجنبی لڑکی تھی۔ایک ایسی لڑکی جو شندور تک یوسف خان کی مہمان تھی اور شندور تک ٹھہری ہوئی تھی۔شندور کے دنوں میں مقامی لوگوں کے یہاں خاص مہمانوں کا ٹھہرنا عام بات تھی۔چاہے وہ گلگت ہو یا چترال،دونوں اپنے علاقوں میں آنے والے سیاحوں پر جان چھڑکتے ہیں۔اس لیے عبادہ کی حویلی میں موجودگی اور گل سے دوستی پر اعتراض یا تنقید کرنا انتہائی غیر اخلاقی عمل تھا۔جب عبادہ آس پاس ہوتی تب گل کم ہی نظر آتی تھی۔وہ دونوں باقاعدگی سے ایک ساتھ نظر آتی تھیں۔چوں کہ گل ان کی نظر تلے تھی تو عبادہ نادانستہ طور پر ان کی نظر کا حصہ بن گئی۔

رستم کے جانے کے بعد گل بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔اس کی بچی کھچی امید اور آس کو حویلی والوں نے پھر سے اپنے ناموس کے نام کر دیا تھا۔کل اس کے باپ کے قاتل کو قبیلے کی عزت کی خاطر جلا وطن تو کر دیا مگر راز کھلنے نہیں دیا،آج اس کے رستم کی بلی چڑھا دی مگر راز نہیں کھلنے دیا تھا۔ماضی تھا یا حال۔گل ہی قربانی کا مرکز تھی۔ممکن تھا کہ غاذان سے شادی کے بعد بھی اس کی بلی چڑھائی جاتی۔جانے ہر موقع کے لیے وہ کیونکر مناسب ٹھہر جاتی تھی۔

عالیہ کی نیت اچھی تھی۔انہوں نے ابتہاج اور مجاہد کو گل کو مارتے ہوئے دیکھا تو اس بچی کی بے

بسی سمجھ آ گئی۔ وہ لوگ اسے اپنی دہشت اور طاقت سے دبا رہے تھے۔ ایک طرف زیادتی اور دوسری طرف احتجاج نہ کرنے دیے جانے کا غم۔ گل جاتی بھی تو کہاں۔ اس کی شکایت سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے گل کو سچائی سے آگاہ کر دیا۔ اگر اس کا بیڑہ آر نہیں لگ رہا تھا تو پار ضرور لگے گا۔ پھر وقت بھی ایسے گزر رہا تھا کہ توبہ۔ آج اس کے گواہ زندہ تھے۔ کون جانے کل وہ ہوں گے یا نہیں۔ تب سچائی پتہ لگنے کے بعد پچھتانے سے بہتر تھا کہ گل آج سب جان کر اپنا بدلہ لے لے۔ حویلی کو جس ناموس اور عزت کا خوف ہے پھر بھلے سے ہی اس بار اس کی بلی چڑھ جائے۔ جس رات انہوں نے گل سے بات کی، اس کی اگلی صبح وہ مردان خانے میں اپنے بیٹے اسد سے ملیں۔

''میں جانتی ہوں گل کشمکش میں ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ کیا کرے اور کیا نہیں۔ اس کے پاس باپ اور رستم دونوں کا غم ہے مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ دونوں میں سے کسی کا انتخاب ضرور کرے گی۔''

''کس کا؟'' اسد نے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔

''وہ اپنے باپ کے بدلے کا انتخاب کرے گی۔'' انہوں نے مکمل یقین سے کہا۔ ''وہ نعیم کے خلاف جائے گی اور رستم پر اس کی سزا کو ترجیح دے گی۔''

''مگر امی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو غاذان اور نعیم اس کو قطعی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔'' اسد پریشانی سے بولا۔

''وہ کبھی بھی کھلے عام یہ حرکت نہیں کرے گی۔ وہ جب بھی قدم اٹھائے گی۔ خفیہ طور پر اٹھائے گی۔''

''مگر وہ اکیلے یہ سب کیسے ہینڈل کرے گی؟ حویلی سے نکلنا۔ پولیس سٹیشن جانا۔ ایف آئی آر کٹانا۔'' وہ فکر مند تھا۔

عالیہ نے گہری سانس لی۔ ''اس کا حل بھی میں نے سوچا ہے۔''

''کیا؟''

''گل بہت ہوشیار اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ کبھی بھی غاذان اور نعیم کو بھنک نہیں لگنے دے گی مگر پھر بھی وہ لڑکی ہے۔ اسے اتنا بڑا قدم اٹھانے کے لیے سو سوراخوں پر ایڑی رکھنی ہوگی۔ ظاہر اس کے دو پیر ہیں۔ وہ ہر سوراخ نہیں دبا سکتی۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ جو سوراخ اس سے کھلا رہ جائے گا۔ وہ ہم دبائیں گے۔''

''ہم؟'' وہ چونک گیا۔

''ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ اپنا قدم اٹھاتے ہوئے کوئی غلطی نہ کرے۔ ذرا سی بھی نہیں۔'' وہ بہت چوکنا تھیں۔

''مگر ہم یہ کیسے کریں گے؟'' وہ یکدم پریشان ہوگیا۔

''میں مہمان خصوصی ہوں اسد۔ میں نہ چھپ سکتی ہوں اور نہ کھلے عام ملاقاتیں کر سکتی ہوں۔ میرا ایسا مقام ہے کہ ہر کسی کی نظر مجھے تلاش کرے گی اور میں بڑی آسانی سے لوگوں کے Notice میں آؤں گی۔ بالکل اسی طرح تمہارے بابا بھی ہیں۔ وہ بھی چوری چھپے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔''

''پھر؟'' وہ خوفزدہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ عالیہ زیر لب مسکرائی اور ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پہ رکھا۔

''تم اس کی مدد کرو گے۔''

''میں؟'' وہ بری طرح چونک گیا۔

''ہوں۔ تم ایسے انسان ہو جس پر کسی کی نظر نہیں جائے گی۔ کوئی محفل میں تمہاری غیر موجودگی

کے بارے میں سوال نہیں کریگا۔تم شندور میں بھی نظر نہیں آؤ گے تو کوئی پوچھے گا نہیں۔اس لیے تم اس کا ساتھ دو گے۔"

"مگر میں ہی کیوں؟" وہ خفگی سے بولا۔

"کیوں کہ وہ تمہاری کلاس فیلو ہے۔" انہوں نے جتایا۔

"مگر اس نے میری کبھی مدد نہیں کی۔" وہ دبا دبا سے برہم ہوا۔

"دیکھو اسد۔ہم دوسروں کی مدد اس لیے نہیں کرتے کہ وہ بھی ہماری مدد کریں گے۔ہم اس لیے کرتے ہیں کہ موقع پر وہ مدد ہم کر سکتے ہیں۔تم اس وقت اس کی مدد کر سکتے ہو۔اس لیے تم مدد کرو گے۔ٹھیک ہے۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

اسد ماں باپ کا نافرمان نہیں تھا۔اس نے ہامی بھر لی۔

"مگر مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"تمہیں اس پہ نظر رکھنی ہوگی۔وہ کیا کر رہی ہے۔کہاں جا رہی ہے۔کس سے مل رہی ہے۔ہر چیز نوٹس کرنی ہوگی۔ایسا کرنے سے تمہیں پتہ چلے گا کہ کب وہ قدم اٹھاتے وقت غلطی کر رہی ہے۔وہ جب جب غلطی کرے،تم تب تب اس کو سنبھال لینا۔"

اس نے سر کو تائیدی انداز میں خم دیا۔مرد ہونے کے ناطے وہ زنان خانے نہیں جا سکتا تھا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ اندر ہونے والے معاملات سے وہ آگاہ ہو سکتا۔لیکن کہتے ہیں کسی سے ملنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔

اول:اس کے پاس جاؤ

دوم:اسے پاس بلاؤ

اگر وہ اندر نہیں جا سکتا تھا تو کیا؟ گل تو باہر آ سکتی تھی۔اس کا ٹارگٹ کیا تھا؟ پولیس سٹیشن جہاں

گل پیدل تو نہیں جا سکتی۔ وہ جب بھی جاتی، گاڑی لے کر جاتی۔ تو ممکن تھا کہ وہ پولیس سٹیشن کے آس پاس رہے اور وہاں آنے والوں پر نظر رکھے۔ کام کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ سمجھدار اور آسان راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔ گل کی چوکیداری کا مشکل کام کرنے کی بجائے اس نے گل کے مقصد پر فوکس کیا اور وہاں ڈیرا ڈال دیا پھر وہی ہوا۔ صرف تین دن لگے گل کو اپنی منزل تک آنے میں۔ وہ رات کے تاریک پہر میں آئی اور پوری رات پولیس سٹیشن میں رہی۔ اس تاخیر کی وجہ سے وہ ناواقف تھا مگر جب اس نے احتشام کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ گل نے صرف بڑا قدم نہیں اٹھایا بلکہ سوچ سمجھ کے قانونی چارہ جوئی کا سہارا لیا ہے۔

اس نے فورا عالیہ کو خبر پہنچائی۔ عالیہ جو اس وقت شندور میلے میں تھی۔ یہ خبر سن کر overexcited تو نہیں ہو سکتی تھی مگر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی کہ گل نے ان کی بات مان لی تھی۔

اس کے بعد اسد سیدھا حویلی آ گیا تھا۔ وہ تین دن سے وہاں بنجاروں کی طرح سر کھپائے خود کو خجل خوار کیے ہوئے تھے۔ نہ کھانے کا وقت ٹھیک سے ملا تھا اور نہ نہانے کا۔ چوں کہ ان کی رہائش حویلی میں تھی تو چار و ناچار اسے نہائی دھلائی کے لیے حویلی آنا پڑا۔ وہ اچھی نیند لینے کے بعد شندور کے لیے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کا کام یہی تک تھا کہ گل FIR درست طریقے سے درج کرا لیتی۔ بالکل عبادہ کی طرح سونے اور دوپہر میں اٹھنے کے بعد وہ نہا دھو کر شندور نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جب اسے پتہ چلا کہ گل اور عبادہ ڈرائیور کے ساتھ کہیں نکل گئے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اس وقت گل کی پولو میں شمولیت سے لاعلم تھا۔ اس لیے وہ بری طرح چونک گیا کہ اس وقت وہ دونوں بھلا کہاں جا رہی تھیں۔ اس نے فورا عالیہ گودائی کو فون کیا۔

''اس وقت؟ ڈرائیور کے ساتھ۔ کہاں؟''

''نہیں پتہ امی۔ میں نے خود پارکنگ میں دونوں کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' وہ بہت تشویش میں تھا۔

''ایسا کروان کے پیچھے جاؤ۔ دیکھو کہاں جارہی ہیں۔'' انہوں نے حکم دیا۔

''جی امی۔'' اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔

''مگر اسد'' کہتے کہتے وہ رکیں۔

''جی امی۔''

''احتیاط سے بیٹا۔ کسی کو پتہ نہ چلے۔ تعاقب کرنا اچھی بات نہیں ہوتی پھر تم ہو بھی دشمن قبیلے سے۔ جوان جہان لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہوئے پکڑے گئے تو نئے لہر شروع ہو جائے گی۔'' وہ ڈر رہی تھیں مگر یہ کام بھی اہم تھا۔

''جی امی سمجھ گیا۔'' وہ بھی پہاڑی مرد تھا۔ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو پتہ تھا کہ عزت اور ناموس کیا ہوتا ہے اگر وہ اتنا ہی کم عقل ہوتا تو گل کا پیچھا نہ کر رہا ہوتا۔ پولیس سٹیشن کے آس پاس رکتا۔ مگر خیر۔ اس بار تو اسے گل کی منزل پتہ نہیں تھا۔ اس لیے تعاقب کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

چوں کہ وہ دن شندور کے تھے۔ اس لیے ایون اور چترال کی سڑکوں پر گاڑیوں کی ریل پیل لگی ہوئی تھی۔ لوگ قافلوں کی صورت میں شندور ٹریک چڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی ذاتی گاڑی لے کر ان کے پیچھے چل پڑا۔ ڈھاڈھول سڑک پر دونوں طرف سے گاڑیاں وقفے وقفے سے گزر رہی تھیں۔ علاقہ سنسان نہیں تھا۔ اس لیے اس کی گاڑی کا پیچھا کرنا گل کے ڈرائیور کے لیے کوئی مشکوک بات نہیں تھی۔ اس دوران جس قدر لمبی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔

جب اس نے پل سے دور ایک آدمی کو ان کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ اس آدمی کو

دیکھ کے اس کا دل مزید الجھنوں میں گھر گیا۔ پل کراس کر کے جب اس نے گاڑی کو کالاش کی طرف جاتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ شاید گل شاہ سردار سے ملنے جارہی ہے مگر اسے مکمل طور پر اس کی تسلی کرنی تھی کہ وہ واقعی شاہ سردار سے ملنے جارہی ہے یا پھر اس کی آنکھ کا دھوکا ہے۔ وہ کالاش کے اندرون تک دونوں کا پیچھا کرتا رہا۔ کالاش میں داخل ہوتے ہی، اس نے دیکھا کہ وہ گاڑی سڑک کنارے رک گئی ہے۔ دوسرا آدمی اترا، اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ ڈرائیور والے دروازے تک آیا۔ ٹھک سے اس کا دروازہ کھولا، ڈرائیور کو باہر نکال کر اسے یرغمال بنالیا۔ اس دوران ایک اور گاڑی جس کے سارے شیشے سیاہ تھے زن سے آکر رکی۔ کسی نے اندر سے ہی اس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ آدمی نے بوڑھے ڈرائیور کو اس میں دھکیل دیا۔ اس کی ٹانگوں کو بے رحمی سے اندر اڑسنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا اور انگوٹھے سے گاڑی کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سیاہ گاڑی مخالف سمت میں چلی گئی۔ پھر وہ آدمی ان دونوں کی گاڑی میں آگے بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کردی۔

یہ سارا ماجرا دیکھ کے اس کا دماغ کھولنے لگا۔ یہ کیا ہورہا تھا۔ وہ شیشے سے سر جوڑ کر سوئی ہوئی عبادہ کو دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ دونوں اندر تھیں تو وہ شخص دونوں کو کہاں لے کر جارہا تھا؟ کون تھا وہ؟

اس نے فوراً گاڑی سٹارٹ کی اور ان کا تعاقب کرنے لگا۔ چوں کہ وہ سڑکیں اور راستے کٹھن اور بل کھاتے ہوئے ہیں اس لیے اس کے لیے دور سے گاڑی پہ نظر رکھنا مشکل نہیں تھا۔ پہاڑوں میں رینگتی ہوئی گاڑیاں سب کو نظر آتی ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ گاڑی شاہ سردار کے گھر کی طرف جانے کی بجائے پرانے جھرنے کی طرف مڑ گئی ہے تو وہ دم بخود رہ گیا۔ پرانا جھرنا پچھلے پندرہ سال سے بند تھا۔ اس کا راستہ جس پر پہلے بڑے بڑے ٹریکٹر گزرتے تھے آمد و رفت کے مفقود ہونے کے بعد سواری جانے کے بالکل قابل نہیں رہے تھے۔ وہ اس قدر ڈھما ڈھول اور ناہموار تھے کہ گاڑیوں کے ٹائر چرچرا جاتے تھے۔ وہ علاقہ بھی سنسان اور ویران تھا۔ کوئی بھی انسان اس

طرف نہیں جاتا تھا۔ اگر وہ اس طرف جا رہا تھا تو کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔

وہ اکیلے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ جانے وہ شخص ان دونوں کے ساتھ کیا کرنے والا تھا۔ پرانا جھرنا خطرناک تھا۔ کہیں وہ آدمی غاذان کا تو نہیں تھا۔ کہیں اس کو بھنک تو نہیں پڑ گئی کہ گل نے اس کے باپ کے خلاف ایف آئی آر کٹائی ہے۔ کہیں اس نے گل اور عبادہ کو مارنے کا پروگرام تو نہیں بنایا۔ کہیں وہ دونوں کو تشدد کا نشانہ تو نہیں بنانا چاہتا تھا؟

وہ اکیلے ان کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ اگر اندرونِ کالاش میں بوڑھے ڈرائیور کو لینے کے لیے سیاہ شیشے والی گاڑی آ سکتی تھی تو اس آدمی کی مدد کے لیے ممکن تھا کہ اس کے سہولت کار بھی وہاں موجود ہوں۔ وہ نہتا وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لاپرواہی کرتے ہوئے اکیلے حویلی سے نکلا تھا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ ہوتا، تب بھی وہ اس آدمی کا تعاقب کر لیتا۔ دوسرا وہ پچیس سال کا لڑکا تھا۔ اسے لڑنے جھگڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور قابلِ بیان کوئی اوزار بھی اس کے پاس تھا جسے وہ بروقت استعمال کر لیتا۔ اس نے گاڑی ریورس کی۔ اس معاملے کے بارے میں عالیہ کو آگاہ کرنا اہم تھا۔ واپسی پر اس کا دل مختلف خدشوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسٹیئرنگ پر جمے اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ وہ بے حد بے چین ہو گیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی کالاش سے نکالنے کے بعد ایک کنارے رک گیا۔ اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ گھبراہٹ سے ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ اس نے انگوٹھے کی مدد سے پیشانی پونچھی اور پھرتی سے جیب سے فون نکالا۔

عالیہ کا نمبر ملاتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ فون کان سے لگانے کے بعد اس نے شیشہ کھول دیا تاکہ گھٹن ختم ہو جائے۔ باہر موسم بگڑ گیا تھا۔ گھنگھور گھٹاؤں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد عالیہ کی آواز آئی۔

''ہاں اسد۔ بتاؤ کچھ پتہ چلا کہاں گئی تھیں؟'' وہ بیتابی سے پوچھنے لگیں۔

''امی۔'' اس نے ہانپتے ہوئے سانس لی۔ ''میں نے ان کا پیچھا کیا ہے۔ وہ کالاش لائی گئی ہیں۔''

''کالاش کیوں گئیں؟'' کہتے کہتے وہ ٹھٹک گئیں۔ ''لائی گئی ہیں؟ کیا مطلب۔ کیا کہہ رہے ہو؟''

''امی میں نے دیکھا کہ.....'' اس نے بتانا شروع کیا۔ وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ گھبراہٹ سے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ عالیہ شندور میں خیموں سے دور باڑ کے قریب کھڑی ہو کر یہ ناقابلِ یقین المیہ سن رہی تھی۔ ان کی آنکھیں ناقابلِ یقین حد تک پھیل گئی تھیں۔ پریشانی سے انہوں نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''کیا تم نے واقعی ان دونوں کو دیکھا ہے اسد؟ تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟'' عالیہ کو یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے خود ان کو دیکھا ہے۔''

''اللہ میرے۔'' ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''اب میں کیا کروں امی؟'' اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''تم فی الحال وہاں سے نکلو اسد۔ تم اکیلے ہو۔ تم فوراً سے پہلے حویلی پہنچو۔ میں سوچتی ہوں کیا کرنا ہے۔ حویلی والے سب یہاں ہیں۔ میں ان کو آگاہ کرتی ہوں۔'' انہوں نے سرعت سے کہا۔

''جی امی۔'' اس نے فون کاٹا۔ وہ اس وقت ایک بیابان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اپنی گاڑی لے کر اس نے حویلی کا رخ کر لیا۔

☆.....☆.....☆

عبادہ فرش پہ ہتھیلیاں رکھتے ہوئے اٹھی۔ گل نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے باریکی سے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

دروازہ موٹے لوہے بنا ہوا تھا۔اس کی چوڑائی سے اس کے وزن کا اندازہ ہو رہا تھا۔وہ چاروں طرف سے اپنے درزوں میں یوں گھسا ہوا تھا جیسے بچ بٹن اپنے ہول میں گھستا ہے۔اندر کی سمت کنڈی والی جگہ پر ایک ہینڈل تھا جو باقی دروازے کی طرح زنگ آلود تھا۔یہ زنگ اس قدر پرانا اور بوسیدہ تھا کہ ہاتھ لگانے سے اس کا رنگ اسکن پہ چڑھ رہا تھا۔وہ دروازے کے کونوں کو پکڑ کے دھڑ دھڑانے لگی۔تہہ خانے میں کانوں میں چبھتی ہوئی آواز گونج گئی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' گل نے کانوں میں انگلی ٹھونستے ہوئے چڑتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ رہی ہوں،شاید نکلنے کا راستہ مل جائے۔'' وہ ہینڈل کو کھینچنے لگی۔

''یہ نہیں کھلے گا عبادہ۔بلاوجہ کوشش مت کرو۔'' گل نے ٹانگیں لمبی کرتے ہوئے کہا۔مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھنے سے اس کے گھٹنوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔

''یہ بہت پرانا دروازہ ہے۔پوری طرح سے زنگ آلود ہے۔تین چار ٹھڈے مارنے سے اس میں کریک پڑ سکتا ہے۔'' وہ ایک قدم نیچے اتری تاکہ اپنے بھاری جوگرز سے اچھے سے نشانہ لے سکے۔

''یہ نہیں کھلے گا عبادہ۔'' گل نے نروٹھے انداز میں کہا۔

عبادہ نے بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوری قوت سے تین چار ٹھوکے مارے۔دروازہ معمولی سا بھی اندر کی طرف نہیں دھنسا۔اس نے غصے سے مزید تین چار ٹھڈے مارے۔اس کے ٹھڈے مارنے کی آوازیں گونجتی رہ گئیں۔گل نے کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے مگر دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم تھک جاؤ گی عبادہ۔میری بات مانو بیٹھ جاؤ۔'' گل نے ایک بار پھر کہا۔

''نہیں گل۔میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔''ہیلو۔کوئی ہے۔ہماری مدد کرو۔ہمیں یہاں سے نکالو۔ہم پھنس گئے ہیں۔'' وہ اونچا اونچا چلانے لگی۔گل نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کوئی سن رہا ہے۔پلیز ہماری مدد کرو۔ہمیں نکالو یہاں سے۔'' وہ مسلسل دروازہ دھڑ دھڑا

رہی تھی۔

''یہ نہیں کھلے گا۔'' گل نے سرد مہری سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ تیورا کے پلٹی۔

''کیوں یہ جگہ Haunted ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے یہ کمرہ اور یہ علاقہ ویران پڑا ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ سب ڈرتے ہیں۔ تم جتنا بھی چلاؤ گی، کسی کو آواز نہیں جائے گی اور بالفرض چلی بھی گئی تو کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرے گا کیوں کہ وہ تمہیں چڑیل سمجھ لیں گے۔'' گل اپنا ضبط کھوتے ہوئے ایک ہی سانس میں بول گئی۔

''ہان.....ٹڈ.....'' عبادہ کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''ہاں۔ پہاڑوں کے درمیان سنسان جگہ پر آج سے بیس سال پہلے ایک جھرنا نکلا تھا۔ اس جھرنے کا کٹاؤ گہرا تھا جس کی وجہ سے بہت اونچائی سے پانی گرتا تھا۔ اس کے نیچے ایک جھیل بن جاتی تھی۔ یہاں جہاں ہم ہیں، یہی جھیل ہے۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے حکومت نے اسے ٹورسٹ سائٹ بنا دیا تھا۔ یہ کمرہ، اس علاقے کا خیال رکھنے والے منتظم کا تھا۔ پندرہ سال پہلے یہ جھرنا خود بخود بند ہو گیا۔ پانی نہ آنے کی وجہ سے یہاں سیاحوں کی آمد کم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ علاقہ سنسان اور ویران ہو گیا۔ پچھلے پندرہ سال سے اس جھرنے کی جھیل تو موجود ہے مگر باقی سب ختم ہو گیا ہے۔''

عبادہ بکھرے ہوئے انداز میں پیچھے ہو گئی۔

''اب یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ ٹہلو گی۔ دروازے سے زور زبردستی کرو گی تو ساری انرجی ختم کر دو گی۔ مت بھولو، ہمیں یہاں سے زندہ نکلنا ہے۔''

گل نے سر پیچھے دیوار سے جوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ٹانگوں کی قینچی بنائے پیر ہلکے ہلکے

جھلا رہی تھی۔ عبادہ تھکے تھکے انداز میں اس کی جانب چل پڑی۔

''بھلے سے تم سب جیت جاؤ غاذان۔ سرداری، چترال، رستم، جائیداد پیسہ سب کچھ۔ مگر تم ایک چیز ہار جاؤ گے۔'' سوچتے ہوئے ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔

''تم مجھے ہار جاؤ گے۔''

آنکھوں میں امڈتی نمی کو اس نے حلق کے ذریعے اندر اتار لیا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ کے دل پہ ٹھوکے پڑے رہے تھے۔ ایک اجنبی آدمی دو لڑکیوں کو سنسان جگہ لے کر گیا تھا جس کا گواہ صرف ان کا بیٹا تھا۔ یہ کیا ماجرا تھا۔ کیا غاذان کو گل کے اٹھائے گئے قدم کے بارے میں بھنک پڑ گئی تھی؟ کسی نے مخبری تو نہیں کر دی تھی؟ اگر ایسا تھا تو یقینی طور پر گل کی جان کو خطرہ تھا۔ غاذان اسے ضرور نقصان پہچانے والا تھا۔ ان کو بری طرح بے چینی کاٹ گئی۔ کیمپ میں میڈیا بی جان اور باقی معزز خواتین کا انٹرویو لے رہا تھا۔ یوسف خان مردان خانے میں تھے۔ ان کے شوہر میدانوں میں گھڑ سواری کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں شندور کے میدان میں موسیقی کی تقریب شروع ہونیوالی تھی۔ مقامی لوگ اور سیاح جوق در جوق وہاں جمع ہو رہے تھے۔ ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ سب ہی اپنے تئیں مصروف تھے۔

ایسے میں کس سے بات کی جائے۔ کس کو بتایا جائے۔ وہ کھوار قبیلے کو یہ خبر نہیں سنانا چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے وہ سب کالاش سے بہت دور تھے۔ وہ چاہ کر بھی فی الفور وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اپنی غیر موجودگی میں وہ گل کی مدد کرنے کی بجائے، اسے مزید خطرے میں ڈال سکتے تھے۔ ان کی دھڑکن منتشر تھی۔ دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچن والے خیمے کی طرف آتے ہوئے انہوں نے چند بوند پانی حلق سے نیچے اتارا۔ عصر کا وقت ہونے والا تھا کیمپ میں رات کا کھانا تیار ہو رہا تھا۔ وہ اپنی

گھبراہٹ اور کلفت چھپاتی اپنے خیمے میں آگئیں۔ یہاں آتے ہی انہوں نے فوراً اپنے شوہر کا نمبر ملایا۔اس سارے معاملے میں اسد بھی شامل رہا تھا۔اپنے بیٹے کی حفاظت اور ان لڑکیوں کی بازیابی کے لیے ان کا رحمان گودائی سے بات کرنا اشد ضروری تھا۔فون کان سے لگا ہوا تھا۔گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ ہر گھنٹی پر ان کا دل ڈوب کر ابھر جاتا۔رحمان گودائی نے آخری گھنٹی پر فون اٹھالیا۔

''رحمان! کہاں ہیں آپ۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے جلدی آئیں۔''انہوں نے افراتفری میں کہا۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟'' رحمان کو ان کی آواز میں بے حد پریشانی محسوس ہوئی۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔آپ جلدی آجائیں۔ مجھے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ اپنی جگہ ٹک نہیں رہی تھیں۔ خیمے میں دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھیں۔رحمان صاحب گھڑ سواری چھوڑ کر کیمپ کی طرف آنے لگے۔

جب تک وہ آتے انہوں نے اسد کو دوبارہ فون کیا۔وہ ایون پہنچ گیا تھا۔حویلی سے چند کلومیٹر ہی دور تھا۔ان کے دل میں ہوک اٹھ رہے تھے۔ظاہر ہے وہ تب ہی گل اور عبادہ کے لیے کچھ سوچ سکتی تھیں جب تک ان کا بیٹا حفاظت سے حویلی پہنچ جاتا کیوں کہ بہر حال اس نے گاڑی کا پیچھا کیا تھا۔اس کی صفائی دینے پر اس سے تعاقب کو لے کر سوال ہو سکتا تھا کہ اسے کیا ضرورت تھی ان کے پیچھے جانے کی؟ اس کا کیا مقصد تھا۔

انسان دوسروں پہ تب وار کر سکتا ہے جب اس پہ دوسرا وار نہ کر سکے۔موقع اور تلاش دونوں ایک ہی وقت میں ملتے ہیں مگر لوگ موقع کو گنوا دیتے ہیں اور تلاش کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔تلاش دوبارہ موقع نہیں دیتی۔اس لیے ایک ہی جست میں پہلے موقع کو حاصل کرنا چاہیے۔

رحمان ان کے خیمے میں آگئے تھے۔جیسے ہی وہ دروازے پر وارد ہوئے، وہ ٹھہر گئیں۔ پلٹ کر

انہیں دیکھا اور تیزی سے ان کی طرف لپکیں۔

''رحمان۔''

''کیا ہوا؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔ سب ٹھیک ہے ناں۔'' وہ پریشانی سے بولے۔

''نہیں۔ کچھ عجیب ہونے والا ہے۔ کچھ بہت برا۔'' وہ ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے تشویش سے کہنے لگیں۔

''اچھا ریلیکس ڈرو نہیں۔ ادھر بیٹھو۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' انہوں نے ان کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کرسی پر بٹھایا اور خود دوسری کرسی قریب کھینچتے ہوئے براجمان ہو گئے۔ وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس تھے۔ پیروں میں کاؤ بوٹس تھے اور سر پہ کیپ۔ ہلکا ہلکا پسینہ ماتھے پہ چمک رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔ عالیہ نے کہنا شروع کیا۔ وہ سب نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ اتنا وقت نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے سرسری سے خلاصہ بیان کر دیا۔ رحمان کے چہرے پر فکرمندی نظر آئی۔

''یہ بات ہے۔'' انہوں نے سر کو خم دیا۔

''اللہ جانے وہ آدمی دونوں کو پرانے جھرنے کے پاس کیوں لے کر گیا ہے۔ وہ ان دونوں کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ آپ خدا کے لیے پتہ لگائیں۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

''گل شندور آنے والی تھی۔ کل اس کا میچ ہے۔ شاید اس لیے وہ حویلی سے نکلی ہو۔'' انہوں نے انکشاف کیا۔

''میچ؟'' وہ ٹھٹک گئیں۔ ''کیسا میچ؟''

''کل یوسف خان نے مقامی کمیٹی سے بات کی تھی کہ گل کو پولو کی ٹیم میں شامل کر لیں۔ کمیٹی

مان گئی تھی۔ رات اس کو لیٹر بھیجا گیا تھا۔ اگر اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی تو صبح وہ یقیناً یہاں آنے کے لیے نکلی ہوں گی۔'' وہ پرسوچ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''یہ سب کیسے ہوگیا۔ اتنی اچانک؟'' وہ ششدر رہ گئی تھیں۔

''پتہ نہیں۔ یوسف خان نے بتایا مجھے۔ میں خود بھی حیران ہوگیا تھا۔''

''مگر اس کو بیچ راستے سے وہ آدمی کیوں لے کر گیا ہوگا؟''

''ظاہر ہے اس کو میچ میں آنے سے روکنے کے لیے۔'' وہ شانے اچکاتے ہوئے بولے۔

''مگر کوئی اسے کیوں روکنا چاہے گا۔'' وہ تعجب سے کہنے لگیں۔

''اللہ بہتر جانتا ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ عالیہ کی بھنویں پرسوچ انداز میں تن گئیں۔ گل کی شمولیت اور اغواء سے کسی کا کیا تعلق ہوسکتا تھا۔ اگر یوسف خان نے گل کو اس لیے شامل کیا تھا تاکہ وہ رستم جیت سکے تو دوسرا شخص بھی اس لیے روک رہا تھا تاکہ وہ رستم نہ جیت سکے۔ مگر ایسا کون ہوگا؟

''غاذان اور نعیم ادھر ہی ہیں؟ یا کہیں چلے گئے ہیں؟'' انہوں نے تیزی سے پوچھا۔ کچھ کچھ دماغ چلنے لگا تھا۔

''نعیم تو ادھر ہی ہے مگر غاذان کسی کام سے باہر گیا ہے۔ یوسف خان کو بتا رہا تھا اسے کچھ ضروری کام پڑ گیا تھا۔''

''ضروری کام؟'' عالیہ کے دل پر گھونسا پڑا۔ اس کا مطلب غاذان پرانے جھرنے گیا تھا جہاں اس کا آدمی گل اور عبادہ کو لایا تھا۔ اوہ خدا۔ یعنی اس سب کے پیچھے ہر طرح سے غاذان اور نعیم تھے۔

''کیا ہوا؟'' رحمان نے ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں۔'' انہوں نے فوراً اپنے جذبات اور حیرانگی چھپالی۔ اپنے شوہر سے چھپ کر

انہوں نے اپنے بیٹے کو گل کی امداد میں لگایا تھا۔ رحمان کو گل اور اس کے بدلے شدلے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان کے ہر قدم کو لے کر بے پر کی اڑا دیتے تھے۔ اس معاملے میں بھی وہ خود کو دور رکھنے والے تھے۔ اس لیے انہوں نے بتانے میں احتراز برت لیا۔

''آپ یوسف خان کو اس بارے میں مت بتایئے گا۔ میں خود کچھ کرتی ہوں۔'' انہوں نے اچانک سے تنبیہہ کی۔

''کیا کریں گی آپ؟'' رحمان ٹھٹک گئے۔

''کسی کے اغواء کے وقت کیا کرتے ہیں رحمان صاحب۔'' انہوں نے نروٹھے انداز میں انہیں دیکھا

''رپورٹ!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑائے پھر یکدم سر اٹھا کے انہیں دیکھا۔ ''آپ رپورٹ کرنے والی ہیں؟''

''یہی واحد حل ہے۔ قانون کی مدد لینے سے ہم بھی مشکوک نہیں بنیں گے اور اس کے اغوا کار بھی ہمیں پہچان نہیں سکیں گے۔ سرِ راہ کسی نے ان کو دیکھ لیا اور رپورٹ کر دی۔ یہی کہہ کر ہم انہیں بازیاب کرائیں گے۔'' وہ مستحکم لہجے میں کہنے لگیں۔

''اسد کہاں ہے؟''

''حویلی پہنچ گیا ہوگا۔''

''آپ اسے بھی شامل کریں گی؟'' انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ وہ چشم دید گواہ ہے۔'' انہوں نے قدرے بے نیازی سے کہا۔

''اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟ کتنی بار میں نے آپ سے کہا تھا سب بھول جائیں صلح کے بعد ذاتی خلش کا رہنا اچھی بات نہیں مگر آپ نہیں مانیں۔ ہم یہاں ہیں۔ ہمارا بیٹا وہاں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟'' وہ تشویش سے کھڑے ہو گئے۔ اب ان کے اندر کا باپ جاگ گیا تھا۔

''میری مجبوری تھی۔ میں گل کو مزید تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔'' وہ پرواہی سے بولیں۔

''چاہے جو بھی ہو عالیہ۔ ہم دشمن قبیلے سے ہیں۔ ہم نے پورے اٹھارہ سال دشمنی نبھائی ہے۔ ہمیں اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔ کھواروں کے گھاؤ بھرے نہیں ہیں بس ہلکی سی پرت چڑھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہم اپنی درست نیتوں میں کچھ غلط کر بیٹھیں اور ان کے گھاؤ دوبارہ تازہ ہو جائیں۔''

''آپ کا مطلب میں نعیم کو پکڑوانے میں جو گل کی مدد کر رہی ہوں وہ غلط ہے؟'' انہوں نے درشتی سے پوچھا۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ تم جو کر رہی ہو ٹھیک ہے۔ اس بچی کو سچائی معلوم ہونی چاہیے مگر یہ سچائی ہم نہیں بتا سکتے۔ ہم اسے بتا کر خود کو مشکوک بنا رہے ہیں۔''

''کیسے؟'' وہ تیورا گئیں۔

''ایسے کہ ہمیں نعیم سے کیا غرض؟ ہماری آپس میں جو دشمنی تھی اس کا صلح ہو چکا ہے۔ نعیم اور ان کی ذاتی دشمنی سے ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جانیں، ان کا کام جانیں۔ وہ سزا دیتے ہیں یا نہیں۔ ان کا بیٹا ہے وہی فیصلہ کریں گے۔''

''اس شخص نے شندور کے میدان میں میرے بھائی کو مارا ہے۔ اس کی دشمنی ذاتی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمارا بھی دشمن ہے۔'' وہ غرائیں۔ ان کی بڑھتی آواز سن کے رحمان تیزی سے ان کے پاس آئے۔

''آہستہ۔ ہم اپنی حویلی میں نہیں ہیں۔ کوئی سن لے گا۔''

''سنتا ہے سنے۔ کسی کے سننے سے سچائی نہیں بدلے گی۔ وہ آدمی میرے بھائی اور گل کے باپ کا قاتل تھا اور قاتل ہی رہے گا۔'' وہ رونے لگیں۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' وہ مفاہمتی انداز میں جلدی جلدی بولے۔ ''روئیں نہیں۔

آپ نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔'' وہ ان کے سر کو تھپکنے لگے۔

اس وقت وہ جہاں کھڑے تھے۔ وہاں ہنگامہ کرنا ایک بڑا رسک تھا۔ عالیہ ایک ٹوٹی ہوئی بہن تھی۔ ان کے جذبات کا بند ہر بار ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ ان کی حالت سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے بغیر اس مسئلے کو طول دیے ان کی بات مان لی۔ اگر ان کی بیوی نے اب تک سب سنبھالا ہوا تھا تو آگے بھی سنبھال لیں گی۔ ان کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عالیہ کو خاموش کرانے اور بہلانے کے بعد وہ باہر چلے گئے۔ عالیہ نے فوراً اسد کو فون ملایا۔

''اسد۔ حویلی پہنچ گئے ہو؟'' فون اٹھاتے ہی وہ پوچھنے لگیں۔

''جی امی۔ ابھی پارکنگ میں رکا ہوں۔'' وہ گاڑی روک کے سیٹ بیلٹ ہٹا رہا تھا۔

''اسی لمحے چترال جاؤ۔ پولیس سٹیشن۔'' انہوں نے قطعیت سے کہا۔ وہ جو بیلٹ کھول رہا تھا، ٹھٹک گیا۔

''پولیس سٹیشن؟''

''ان دونوں کو غاذان نے اغواء کرایا ہے۔ تم ابھی اسی وقت پولیس سٹیشن جاؤ۔ نفری کے ساتھ جائے وقوعہ پہنچو اور ان دونوں کو بازیاب کرا کے شندور لے کر آؤ۔'' کیسا سپاٹ حکم تھا۔

''مگر شندور کیوں لاؤں؟''

''زیادہ سوال مت کرو۔ وقت نہیں ہے۔ جتنا کہا اتنا کرو۔ جاؤ جلدی اور ہاں صبح نو بجے سے پہلے پہلے یہاں پہنچنا ہے تمہیں سمجھے۔'' ایک اور حکم۔ چند لمحے اسد کچھ بول نہیں سکا۔

''جی امی۔'' کہتے ہی بادلِ نخواستہ اس نے اگنیشن میں واپس چابی ڈالی۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ عصر کے سائے پھیل گئے تھے۔ ایون سے چترال۔ پھر نفری اور جائے وقوعہ پہنچنا پھر بازیابی۔ شندور۔ جانے اس میں کتنا وقت لگنا تھا مگر انہیں

اپنی آخری کوشش ضرور کرنی تھی۔ وہ گل کے لیے ہر اس سوراخ کو بند کر رہی تھیں جہاں سے اسے ڈسے جانے کا خطرہ تھا۔

☆.....☆.....☆

رات تھی یا دن۔ اگر دن تھا تو کونسا پہر چل رہا تھا اور اگر رات تھی تو کتنے پہر بیت گئے تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے باہر کے حالات کا سراغ لگایا جاتا۔

وہ دونوں دیوار سے کمر جوڑے ساتھ ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ عبادہ کا سر گل کے کندھے پر تھا اور گل ساکت نظروں سے فرش کو دیکھ رہی تھی جس میں چھت سے ٹپکتا پانی بوند بوند گر رہا تھا۔ جگہ جگہ سے ٹپکتے پانی کی وجہ سے کمرے میں ایک عجیب سی موسیقی کی دھن پیدا ہو رہی تھی۔

''مجھے بابا یاد آ رہے ہیں۔'' عبادہ نے بچوں کی طرح ہونٹ لٹکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی.....'' وہ بے ساختہ بولی۔ عبادہ نے تیزی سے سر ہٹایا، اسے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ عبادہ کو اپنے جملے کی ''حدت'' کا اندازہ ہوا۔ اس وقت..... کم از کم اس وقت اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اسے بری طرح ندامت ہوئی۔

''اللہ سب ٹھیک کر دے گا گل۔ پریشان نہ ہو۔'' اس نے گل کا سر کندھے پہ رکھتے ہوئے کہا۔

''ان شاء اللہ.....'' وہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔ اسی لمحے کمرے کے دروازے میں کھٹکا ہوا۔ ان دونوں کا دل مچل کے حلق میں آ گیا۔ اپنی اپنی جگہ سے وہ اس طرح اچھلیں گویا کسی نے اسپرنگ لگا دی ہو۔ دروازہ پہ ٹھوکے پڑ رہے تھے۔

''گل.....'' عبادہ سراسیمہ انداز میں اس کے پہلو میں چھپ گئی۔

''آیت الکرسی پڑھو۔'' گل نے دھیرے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بری طرح ڈر گئی تھیں۔ دروازہ باہر سے مسلسل دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی لوہے کی بھاری چیز سے

اسے مار رہا ہو۔عبادہ نے کانپتے ہوئے ورد کرنا شروع کر دیا۔

نادانستہ طور پر اسد کو بہت وقت لگا تھا۔موسم کی خرابی،رات کے اندھیرے اور راستوں کی دشواری نے اس کی ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی وہ آدھی رات کو یہاں پہنچ پایا تھا۔جھرنے کے دروازے کے باہر دو پولیس موبائلیں کھڑی تھیں۔سائرن بج رہے تھے۔نیلی سرخ روشنی ڈسکو لائٹس کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔پولیس اہلکار اپنے ساتھ کتے اور ہتھیار لیے جائے وقوعہ میں چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔اسد اپنی گاڑی کے ساتھ کھڑا تھا جب کہ ڈی ایس پی اور سپاہی دونوں کو بازیاب کرنے کے لیے جھرنے کے چاروں طرف مستعدی سے چھاپہ مار رہے تھے۔

کتے.....ٹارچ.....سائرن.....گہما گہمی.....

''کون ہے؟'' گل نے اونچا سا پوچھا۔

بھاری پتھر سے تالا توڑنے کی کوشش کرتے حوالدار کے ہاتھ ٹھہر گئے۔نسوانی آواز کانوں میں پڑی تو تیزی سے ساتھ کھڑے،گن کی نال دروازے پہ تھامے ڈی ایس پی اور باقی ساتھیوں کو دیکھا۔

''میں نے پوچھا کون ہے؟'' گل غرائی۔

''وہ اندر ہی ہیں۔صاب وہ اندر ہی ہیں۔'' حوالدار چمکتے ہوئے بولا۔

''توڑو دروازہ.....'' ڈی ایس پی نے آرڈر دیا اور ایک قدم پیچھے ہو گیا۔دو چار سپاہی آگے آئے اور دروازے کو ٹھڈے مارنے لگے۔بھاری عسکری بوٹوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دروازے میں کریک پڑ گئے جسے دیکھ کے اندر موجود عبادہ نیم غنودگی میں جانے لگی۔

ہانٹڈ.....بھوت پریت.....وحشت ناک جگہ.....

''گل.....میں مر جاؤں گی.....گل میں.....'' عبادہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔گل کا ماتھا بھی

پسینہ سے تر تھا۔اس کا دل بھی سو کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔تہہ خانہ ہونے کے سبب یہاں تک پولیس سائرن کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔

سپاہی ٹارچ کی روشنیاں پھینکتے ہوئے دروازہ کو پیٹ رہے تھے۔اگلے ہی لمحے دروازے کنڈی سے الگ ہوااور چٹاخ سے تہہ خانے کی دیوار سے لگ گیا۔

''آآآ.....''عبادہ نے چیخ ماری اور فرش پہ بیٹھتی چلی گئی۔

''ڈرو نہیں.....ڈرو نہیں.....پولیس ہے پولیس.....''ڈی ایس پی چیخ سن کے بوکھلاتے ہوئے بولا۔انسانی آواز سماعتوں میں پڑی تو عبادہ کی ٹوٹی ہوئی سانسوں میں اعتدال آیا۔

☆.....☆.....☆

ان دونوں کو پولیس موبائل کے اندر آمنے سامنے سیٹوں پر بٹھایا ہوا تھا۔موٹی موٹی چادریں دونوں نے اوڑھ رکھی تھیں۔باہر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ان کے کپڑے نم ہونے کے سبب دونوں کو شدید سردی لگ رہی تھی۔اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے وہ پھونکوں پہ پھونکیں مار رہی تھیں۔

پولیس دونوں کو بازیاب کرنے کے بعد جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔نفری کی کثرت دیکھ کے وہ دونوں ابھی تک شاک میں تھیں۔اتنے سپاہی تو شندور میں تعینات کیے جاتے تھے۔ان کو کتنا سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔

گل ہلکی ہلکی کانپتے ہوئے دور ڈی ایس پی کے ساتھ کھڑے اسد کو دیکھ رہی تھی جس کو اس نے ٹھوڑی کے خم کی وجہ سے سیکنڈ میں پہچانا تھا۔وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈی ایس پی کی باتیں سن رہا تھا۔

''یقین نہیں آتا ہم باہر آگئی ہیں۔''عبادہ نے تھرتھراتے لبوں کے ساتھ بمشکل کہا۔

''مجھے..... بھ..... بھی.....'' وہ کپکپائی۔

''یہ لڑکا کون ہے جس نے بچایا ہے؟''

''عالی..... عالیہ..... گودائی..... کا بے..... ٹا ہے.....''

''اوہ.....''

سردی کے سبب دونوں کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ناک اور آنکھیں تو پہلے ہی زکام زدہ مریض کی طرح لگ رہی تھیں۔عبادہ کی سوں سوں شروع ہوگئی تھی۔گل مسلسل ہاتھوں کو گرم پھونکیں مار رہی تھی۔

''شکریہ سر۔سمجھ گیا۔'' اسد نے ممنونیت سے کہا پھر پیچھے ہوگیا۔ڈی ایس پی اب وا کی ٹا کی سے تھانے اطلاع پہنچا رہا تھا۔وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم قدم گل کی طرف بڑھنے لگا۔اسے اپنی طرف آتا دیکھ کے گل غیر آرام دہ ہوگئی۔

''اب ٹھیک ہیں آپ دونوں؟'' موبائل کے سامنے رکتے ہوئے وہ فکرمندی سے پوچھنے لگا۔

''ہوں۔'' عبادہ نے سر ہلایا۔وہ ہلکا سا مسکرایا پھر ذرا دوستانہ انداز میں گل کی طرف نظر اٹھائی۔

''آپ ٹھیک ہیں گل؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''گڈ.....''

''شکریہ ہماری مدد کرنے کے لیے۔آپ نہ آتے تو ہم وہیں مر جاتے۔'' عبادہ جذباتی ہوگئی۔

''شکریہ کی کیا بات ہے۔میری جگہ کوئی بھی آپ لوگوں کو اغواء ہوتے دیکھتا تو یہی کرتا۔''

''میرا نہیں خیال۔کوئی غاذان سے ٹکر لیتا۔'' وہ شانے اچکا کے بولی۔''یہ آپ ہیں جس نے اتنا بڑا ظرف دکھایا ہے۔''

''وہ شاید اس لیے کہ کسی زمانے میں کوئی تھا جس نے میری مدد نہیں کی تھی اور میں اپنی ڈگری مکمل نہیں کر سکا۔ سوچا اس کی مدد کر دوں۔ کیا پتہ اسے اس کی غلطی کا احساس ہو جائے۔'' اس نے کن انکھیوں سے گل کو دیکھا جس نے بے اختیار پہلو بدلا تھا۔

''کیا مطلب؟؟'' عبادہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ.....''

''ہم کہاں جائیں گے؟'' گل نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ وہ زیر لب مسکرایا۔

''جہاں ہمیں جانا چاہیے۔''

''کہاں؟'' لہجہ سپاٹ تھا۔

اسد نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''شندور.....''

☆.....☆.....☆

دو گھنٹے پہلے پر زور بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ سارا موسم جو کل دوپہر سے اپنا رعب دکھا رہا تھا رات میں کھل کر برسا تھا۔ شندور میں سردی قدرے بڑھ گئی تھی۔ سطح سمندر سے اونچائی کے سبب یہاں بسا اوقات سردی ہی رہتی تھی۔ بارش کی وجہ سے تا حال پہاڑوں پر دھند تھی۔ کیمپ اور خیموں کے کپڑے گیلے پڑے تھے۔

آج کے دن لوگوں میں جوش پچھلے دو دن سے زیادہ لگ رہا تھا۔ آخری دن تھا، چترال اور گلگت کا فائنل میچ شروع ہونے والا تھا۔ شندور کے میدان کی سرحدیں لوگوں کے ہجوم سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ڈھول اور بانسریوں کی آواز سے سارا جہان گونج رہا تھا۔ کمنٹیٹر کی بھاری اور مشینی آواز وقفے وقفے سے ابھر رہی تھی۔

میچ شروع ہونے والا تھا۔ دونوں ٹیموں کے گھوڑے میدان میں لائے جا رہے تھے۔ ان کے

منتظمین ان کے ساتھ تھے۔کھیل کے سربراہ کے ہاتھ میں بال تھی اور وہ آگے آگے چل رہے تھے۔اپنی اپنی ٹیموں کو بمع گھوڑوں کے میدان میں آتے دیکھ کے شائقین استقبال کے لیے نشستوں سے کھڑے ہوگئے،وہ تالیوں اور سیٹیوں سے ان کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔کھلاڑیوں نے سرخ (چترال) اور ہلکی نیلی (گلگت) کی شرٹ پہنی ہوئی تھیں۔ان کے سروں پر کھلے ہیلمٹ تھے اور پیر گھوڑوں کے زین میں کس کے رکھے ہوئے تھے۔وہ پولو اسٹک کو کندھوں پر ٹکائے ،دوسرے ہاتھ سے لگام پکڑے میدان میں پوزیشن بنا رہے تھے۔

ہر ٹیم کے چھ چھ کھلاڑی ہوتے ہیں۔یہ چھ کھلاڑی ایک زاویے میں کھیلتے ہیں۔پہلے تین کھلاڑی ہمیشہ آگے آگے کھیلتے ہیں،چوتھا کھلاڑی درمیان میں ہوتا ہے اور پانچواں اور چھٹا کھلاڑی پیچھے کھیلتے ہیں۔وہ آگے نہیں جاتے۔بال کو سب سے زیادہ ہٹ کرنے والا کھلاڑی چوتھا ہوتا ہے کیوں کہ اس کی رسائی دونوں طرف ہوتی ہے۔اس پر باقیوں کی نسبت پریشر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ابتہاج کی یہی پوزیشن تھی۔

گو کہ شندور پولو ایک فری سٹائل گیم ہے۔اس کے کچھ خاص اصول نہیں۔یہ دلوں اور محبتوں سے کھیلا جاتا ہے لیکن دونوں ٹیموں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔اس کے تحفظ کے لیے یہاں شائقین کھلاڑی پہ کڑی نظر رکھتے ہیں۔پولو کا یہ میدان زیادہ بڑا نہیں ہے۔اس کے گرد بیٹھے شائقین کی نظریں گیند،کھلاڑیوں اور یہاں تک کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کو بھی دیکھ سکتی ہیں۔میدان کے احاطے کے گرد پولیس والے کھڑے تھے جن کا کام ہجوم کو میدان میں آنے سے روکنا تھا۔میدان کے درمیان سفید لائن تھی جو دونوں ٹیموں کا بارڈر تھا جیسے کبڈی میں ہوتا ہے۔

میدان میں شمالی طرف کرسیاں نہیں تھیں۔وہ لوگ ایسے ہی زمین پر جمگھٹا بنا کے بیٹھے ہوئے تھے۔گھوڑے اپنی دھن میں جیسے ہی ان کے قریب جاتے،ہجوم میں کھلبلی مچتی اور سب اٹھ اٹھ کے

پیچھے بھاگ جاتے کہ کہیں گھوڑے اوپر نہ چڑھ جائیں۔ رستم ابھی تک بپھرا ہوا تھا۔اس کے نعم البدل کے طور پر ابتہاج کو دوسرا گھوڑا دے دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت میدان میں گھوڑے پر سوار، بال پھینکے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ لوگ سربراہی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یوسف خان کا موڈ بری طرح آف تھا۔ گل نہیں پہنچی تھی جس کی وجہ سے اس کی جگہ وہی کھلاڑی پھر سے آ گیا تھا جس کو نکالا گیا تھا۔ ظاہر ہے مقامی کمیٹی گل کے آنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ میچ کا اپنا وقت ہوتا ہے۔ وہ وقت مقررہ پر شروع اور ختم ہوتا ہے۔ ہر کھلاڑی عزت و مقام رکھتا ہے۔ گل کا سردار قبیلے سے ہونا اسے وی آئی پی نہیں بناتا تھا کہ اس کا انتظار کیا جائے۔

گل کے نہ پہنچ پانے کی وجہ سے پنڈال کے نیچے کرسیوں پر براجمان یوسف خان بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ دونوں کو لانے کی ذمہ داری غاذان نے لی تھی۔ یوسف خان اس سے دس بار پوچھ چکا تھا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچی، ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ”صداقت فون نہیں اٹھا رہا۔ میں دیکھتا ہوں۔“

کئی گھنٹوں تک وہ بے قراری سے لب کاٹتے رہے۔ میچ شروع ہو گیا تھا۔

انہوں نے غاذان کو بلایا۔ وہ کرسیوں کے درمیان سے جگہ بناتے اور لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے یوسف خان کے پاس پہنچا اور ذرا سا ان کے منہ کے قریب جھک گیا۔

”گل آ گئی ہے کیا؟“ وہ بہت پریشانی سے پوچھنے لگے۔

”وہ نالوں (شندور جانے والے راستے پر تین نالے بہتے ہیں جن میں بارش کے بعد طغیانی آتی ہے۔ ان نالوں کے بہہ جانے کے بعد ہی کوئی گاڑی اس جگہ کو کراس کر کے نکل سکتی ہے۔) میں پھنس گئے ہیں تایا جان۔ صداقت نے بتایا ہے۔“

''کیا؟'' یوسف خان کا منہ کھل گیا۔ ''کب نکلیں ہیں وہ وہاں سے؟ بارش تو کچھ دیر پہلے ہوئی ہے۔ نالے کیسے آ گئے؟''

''نہیں جانتا۔ شاید آخری نالہ میں تھے وہ لوگ.....''

''میچ شروع ہو گیا ہے۔ وہ نہیں آئی اب تک۔'' یوسف خان نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''وہ نہیں پہنچی تو وہ لڑکی سب برباد کر دے گی۔''

''خان جی، آپ فکر مت کریں۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی۔'' غاذان نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''تم کسی کو بھجواؤ وہاں.....اس کی مدد کے لیے.....''

''میں بھجوا چکا ہوں خان جی.....ایک گاڑی بھیجی ہے۔ وہ لوگ لے کے آتے ہی ہوں گے۔'' غاذان نے جھوٹ بولا۔

''اب کیا کریں؟'' انہوں نے تشویش سے پیشانی مسلی۔ اسی لمحے میدان میں ریفری نے بال کو اچھال دیا، سائرن بجا اور گھوڑے دھڑا دھڑ بال کے پیچھے بھاگنے لگے۔ فضا میں لوگوں کا ایک بھیانک شور اٹھا۔ چیخیں، تالیاں، سیٹیاں، قہقہے۔

غاذان نے میدان کو دیکھا پھر دھیرے سے گردن موڑ کے یوسف خان کو.....میچ شروع ہو گیا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے بے بسی سے شانے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ غاذان نے ان کو واجبی تسلی دینے کے لیے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا سا تھپکنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا۔

میچ کے پہلے مرحلے کا مقابلہ چل رہا تھا۔ سبز گھاس پہ گھوڑوں کے ٹاپوں سے گرد اٹھ رہی تھی۔ کھلاڑی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سٹک ان کے ہاتھوں میں تھی، وہ گھوڑے سے ذرا جھک کے جھک کے بال کو ہٹ کر رہے تھے۔

وہ مسکراتا ہوا سربراہی نشستوں کو چھوڑ کے پیچھے آ گیا۔ وہاں اس کا باپ کھڑا تھا۔ لانگ اوور

کوٹ پہنے، سر پہ پکول رکھے، ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، دوسرے سے سگار سلگا رہا تھا۔ آنکھوں پہ موٹی فریم کا چشمہ تھا اور گردن میں گول سا سرخ مفلر۔

وہ بے نیاز کھڑے تھے، ہلکے ہلکے مسکرے رہے تھے۔

غاذان ان کے شانے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے کیوں کہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سردی لگ رہی تھی۔ اس نے بھی کپڑے بدل لیے تھے، وہ کالی پینٹ اور سرمئی جرسی ہائی نیک شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے کوٹ نہیں پہنا تھا البتہ سر پہ پکول رکھی ہوئی تھی۔

''کیا پوچھ رہا تھا بھیڑیا؟'' انہوں نے رکھائی سے پوچھا۔

''یہی کہ ان کی پیاری بھتیجی اب تک کیوں نہیں پہنچی۔'' وہ طنز سے ہنس دیا۔

''بھتیجی کی فکر ہو رہی ہے.....'' انہوں نے سگار منہ میں رکھا اور کش لیا۔ ''بیٹے کے حادثے کے بعد کیا ہو گا؟ رستم کے جانے کے بعد کیا ہو گا؟ ابھی تو بہت ساری چیزوں کی فکر کرنی ہے اس کو.....''

غاذان نے قہقہہ لگایا۔ ''کیا کرتے ہیں بابا؟ وہ مر جائیں گے۔''

''تو مرنے دو۔ کسے فرق پڑتا ہے۔ اب تو تم (انہوں نے اس کی پکول سیدھی کی) سردار بننے والے ہو۔''

غاذان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''میں یا آپ؟'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

وہ اس کے کان کے قریب جھکے۔ ''ہم دونوں۔''

اور جب ہی میدان میں چترال کی طرف سے ابتہاج نے پہلا گول کر دیا۔ میدان شور سے جھنجھنا اٹھا۔ موٹی چچی سربراہی نشست پہ خوشی سے مچل گئیں۔ انہوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں پھر یکدم رکیں۔ وہ سردارنی تھی، اتنا واویلا زیب نہیں دیتا تھا۔ فوراً سے مسکراہٹ دبائی، پیچھے ہوئیں اور پہلو بدلا۔

غاذان کے چہرے پر ناگواری ابھری۔نعیم اللہ خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''جانے دو.....''

''بہت شوق ہے اس کو خوشیاں منانے کا بابا.....'' وہ موٹی چچی کو دیکھ کے دانت چبا رہا تھا۔

''اس کا بیٹا ہے وہ.....منانے دو خوشی.....کچھ دیر بعد ان کو غم بھی تو منانا ہے۔'' وہ کمینگی سے مسکرائے۔غاذان نے نظریں گھما دیں۔میدان میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔وہ اس طرف متوجہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

دو مرحلوں کا میچ ختم ہو گیا تھا۔چترال چھ چار سے جیت گیا تھا۔ابتہاج نے تین گول داغے تھے۔اب تک وہی مین آف دی میچ تھا۔اس وقت کھلاڑی بریک لے رہے تھے۔سب اپنے اپنے گھوڑوں کے پاس تھے،انہیں پانی پلا رہے تھے۔بریک کے دوران خالی میدان میں ایک طرف لڑکیاں کالاش کا ثقافتی رقص پیش کر رہی تھیں۔اور دوسری طرف گلگت کے لڑکے گلگت کا روایتی ڈانس دکھا رہے تھے۔کالاشی رقص میں خواتین جگہ سے ہل رہی تھیں اور ایک دائرہ بناتے ہوئے پیروں کو آگے پیچھے کر رہی تھیں جب کہ گلگت کے لڑکے ایک ہی جگہ کھڑے،ایک فنکارانہ انداز میں سینے اور کندھے کو ہلا رہے تھے۔وہ دائرے میں نہیں گھوم رہے تھے۔

ابتہاج کے گھوڑے کو کوئی ملازم پانی پلا رہا تھا۔وہ اپنی سٹک ہاتھ میں پکڑے بھاگتا ہوا یوسف خان کے پاس آیا تھا۔ماں،دادی،چچی سے لاڈ اور پیار لینے کے بعد،صائمہ سے داد اور شاباشی لی۔وہ سب سے ملتے ہوئے مسکرا رہا تھا لیکن جب یوسف خان کے پاس پہنچا تو مسکراہٹ غائب ہو گئی۔وہ باپ کے گلے لگنے کے بعد انہیں ایک سائیڈ پہ لے آیا۔

''بابا گل کہاں ہے؟'' اس نے دبے دبے غصے سے پوچھا۔

''آ رہی ہے۔راستے میں ہے۔''

''اتنا لمبا راستہ تو نہیں ہے۔کیا اونٹ پہ بیٹھ کے آرہی ہے؟''اس نے جل کے کہا۔

''قریبی نالے میں پھنس گئے ہیں وہ لوگ.....غاذان نے گاڑی بھجوائی ہے۔آتی ہی ہوگی۔''

وہ مصنوعی ہاتھ دباتے ہوئے بولے۔اضطراب ختم نہیں ہورہا تھا۔

''غاذان نے گاڑی بھجوائی ہے؟''اس نے بے اختیار پوچھا اور پلٹ کے ہجوم میں غاذان کو ڈھونڈنے لگا۔وہ دور کسی گلگت کے قبیلے کے سردار سے بات کررہا تھا۔اس کو دیکھ کے ابتہاج کا ماتھا ٹھنک گیا۔اس نے گاڑی بھجوائی ہی نہیں ہوگی۔وہ کیوں بھجوائے گا؟

''آپ نے فون پر بات کی۔''اس نے تیزی پوچھا۔

''نہیں۔غاذان کررہا ہے۔''

اسی لمحے میدان میں تیسرے مرحلے کا سائرن بجا۔کھلاڑی گھوڑوں پر چڑھنے لگے۔ابتہاج گڑبڑا گیا۔''بابا!باان کو فون کریں۔ان سے رابطہ کریں۔وہ گل کو لارہے ہیں۔وہ کہاں ہے۔ان کو پتہ ہوگا۔آپ ان کو کال کریں۔''اس نے آپ پر زور دیا۔

کھلاڑی میدان کی طرف جارہے تھے۔اس کا گھوڑا صرف رہ گیا تھا۔

''بابا!میں صبح سے رابطہ کررہا ہوں۔نہیں ہورہا۔اس کے بعد میں بات نہیں کرسکوں گا۔فائنل راؤنڈ آنے والا ہے۔پلیز آپ رابطہ کریں۔''وہ چلتے چلتے کہہ گیا اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتا،جگہ بناتا میدان کی طرف بھاگ گیا۔مہمان خصوصی نشستوں پر براجمان ہورہے تھے۔شائقین تھم رہے تھے۔میدان سے کالاشی اور گلگت رقص کلب واپس جارہا تھا۔وہ سربراہی نشستوں کی طرف چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

میدان میں ایک طرف گھوڑے فائنل راؤنڈ کے لیے گھوڑے سانس لینے کو رکے تھے۔یہ دس منٹ کی بریک تھی۔کھلاڑی بہت بوکھلائے ہوئے تھے۔گھبرا رہے تھے۔اب تک چترال کا پلڑہ

بھاری تھا۔آخری راؤنڈ میں فیصلہ ہونا تھا کہ کون فاتح ٹھہرے گا۔

غاذان اب کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔یہ آخری مرحلہ اس کا پلان کیا ہوا تھا۔اس کا باپ فخر سے گردن اکڑا کے میدان کو دیکھ رہا تھا۔وہ تصور کر رہا تھا کہ یہاں کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے۔اس تصور سے ہی وہ محظوظ ہو رہا تھا۔غاذان نے گھڑی میں وقت دیکھا۔بس سات منٹ رہ گئے تھے۔

''تم نے رضا کو سب سمجھا دیا ہے ناں غازی.....'' انہوں نے ایک بار پھر پوچھا۔وہ ابھی تک شک کا شکار تھے۔

''جی بابا.....بس تماشا دیکھیں، کیا ہونے والا ہے۔'' غازی نے سنسنا کر جوش سے کہا۔اسے سردی بھی لگ رہی تھی۔پنڈال میں ملازم مہمان خصوصی کے آگے چائے رکھ رہے تھے۔موسم بھی خراب ہو رہا تھا۔آسمان گھنگھور گھٹاؤں سے بھر گیا تھا۔تیز ہوا چل رہی تھی۔پنڈال کا کپڑا اڑ رہا تھا۔یوسف خان کے چہرے پر تہہ بہ تہہ پریشانی تھی۔ان کی چائے ان کے سامنے میز پر پڑی تھی۔وہ اتنی ہمت نہیں کر رہے تھے چند گھونٹ زہر مار کر لیں۔

بی جان.....موٹی چچی.....اور عالیہ ہنس رہی تھیں۔ان کے مدھم قہقہے پنڈال میں گونج رہے تھے۔موٹی چچی کو اپنے جیتے پر بڑا مان آ رہا تھا۔غرور اور تکبر سے ان کی گردن جھک نہیں رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

میدان میں سائرن بج چکا تھا۔ابتہاج اور باقی کھلاڑی آخری راؤنڈ کے لیے میدان میں اتر چکے تھے۔گھوڑے دھڑا دھڑ بھاگ رہے تھے۔شائقین سانس روکے اس سنسنی خیز مقابلے کو دیکھ رہے تھے۔یوسف خان ماتھے پر بل ڈالے اداس بیٹھا ہوئے تھے۔موٹی چچی شال سنبھالتیں، ذرا دھونس سے بیٹھی تھیں، ان کا بیٹا جیتنے والا تھا۔

کمنٹیٹر اونچی آواز میں تبصرے کر رہا تھا۔غاذان اور نعیم چوکنا بیٹھے ہوئے تھے۔ہوا سرسرا رہی

تھی، بادل اون اون تیر رہے تھے۔ میدان میں الغم مچا ہوا تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز کانوں میں موسیقی کی طرح پڑ رہی تھی۔ یوسف خان ہونٹ کاٹ رہے تھے۔

نیچے میدان میں موجود ڈی ایس پی فون لیے اوپر آ رہا تھا۔ دور ہجوم میں موجود مجاہد خان پنڈال کو دیکھتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ بی جان صائمہ کی بات پر ہنس رہی تھیں۔ بریحنہ چائے پی رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے۔ خوش تھے۔ میدان میں سفید لکیر کے قریب گھوڑے پہنچ گئے تھے۔ گلگت کے لڑکے آگے تھے اور ابتہاج بیچھے، بال درمیان میں تھی۔ وہاں بے حد گرد بھر گئی تھی۔ کوئی کھلاڑی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شائقین گردنیں اٹھا اٹھا کے دیکھ رہے تھے۔

ابتہاج کا گھوڑا پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ وہ ہلکا سا نیچے جھکا، سٹک سے بال کو ہٹ کیا، اسی لمحے پیچھے سے آنے والے رضا کے گھوڑے کے منہ نے اس کی پشت پر اسے زور کا ٹھوکا دیا۔ اسی لمحے موٹی چچی کے دل میں ایک گھبراہٹ اٹھی، ایک ٹیس، وہ چونکیں، بے ساختہ دل پہ ہاتھ رکھا۔ آس پاس سب ٹھہر گیا جیسے تالاب کا پانی پتھر گرنے کے بعد ٹھہر جاتا ہے۔

ابتہاج کے ہاتھ سے لگام چھوٹی، ہوا میں گھوڑے کی ہنہناہٹ گونج گونج گئی۔ اس کا پیر زین میں مڑا اور وہ پورے قد سے زمین پہ جا گرا۔ اس کا ایک پیر زین میں اٹکا رہ گیا۔ گھوڑا گھبرا گیا۔ وہ مڑا، پلٹا، بھرا اور پھر سرپٹ بھاگنے لگا۔ ابتہاج سر کے بل گھوڑے کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھاگتے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں، گھوڑے زور سے ہنہنائے، وہ گھوڑوں سمیت پلٹے، ابتہاج کا گھوڑا ان کے درمیان سے زن سے آگے نکل گیا۔

سیڑھیاں چڑھنے والا ڈی ایس پی تھم گیا۔ غاذان اور نعیم کی باچھیں کھل گئیں۔ دل مسرت سے دھڑکے۔ یوسف خان، بی جان، موٹی چچی بے اختیار کرسیوں سے کھڑے ہوئے۔ شائقین میں ایک بے چینی دوڑ گئی۔ شاک..... بے یقینی..... حیرت ہی حیرت.....

اس میں میں جو چیز سنائی دی وہ۔

''گھوڑے کو روکو۔''

منتظم کی آواز تھی جو میدان میں حواس باختہ انداز میں کودا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابتہاج کا گھوڑا شمالی سمت بیٹھے ان لوگوں نے روکا تھا جو زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی لوگوں نے اسے لگام سے پکڑا، کچھ نے دم سے اور بالآخر گھوڑا تھم گیا۔ ایک جمگھٹا سا ابتہاج پہ جھپٹا، اس کا پیر چھڑایا۔ وہ پوری طرح نیچے ہو گیا۔ وہ نیم بے ہوشی میں بری طرح کراہ رہا تھا۔ مقامی لوگوں نے جھک کے اسے اٹھایا اور جب ہی منتظم ریسکیو ٹیم اور میڈیکل ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

''ہٹو پیچھے..... سائیڈ پہ ہو سب.....'' منتظم ہجوم چھیرتے ہوئے آگے آیا جب تک دو لوگوں نے اس کی بغلوں کی نیچے کندھے دے کر اسے اٹھا لیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا، سینہ رگڑا ہوا تھا۔ پیچھے سے قمیص گھس کے پھٹ گئی تھی۔ چہرہ دھول، مٹی اور خون سے بھرا ہوا تھا۔

منتظم نے فوراً اسے سٹریچر پر لٹایا اور میڈیکل ٹیم اس پہ جھک گئی۔ منتظم اور پولیس نے ٹیم کے گرد باڑ بنائی اور لوگوں کو دور کر دیا۔ لوگ قدم قدم پیچھے ہوتے دور چلے گئے۔ اب میدان میں سب دیکھ سکتے تھے کہ ابتہاج کا علاج ہو رہا ہے۔

پنڈال سے یوسف خان اور غازان بھاگ کے نیچے آئے تھے۔ موٹی چچی کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ اپنی نشست پہ مچلتے ہوئے دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھیں۔ ''میرا بچہ..... ابتہاج..... میرا بیٹا.....''

بی جان انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ عالیہ بیگم انہیں سرد مہری سے دیکھ رہی تھیں۔ کبھی یہاں ان کا بھائی زندگی کی رمق ہار گیا اور کبھی وہ انہی کی جگہ پر بیٹھ کے سینہ پیٹ رہی تھیں۔ وقت وقت کی بات

ہوتی ہے ورنہ غم تو ازل سے سب پہ ایک ہی طرح کے گزرے ہیں۔

نعیم اللہ ہجوم میں کھڑا کسی ملازم سے بات کر رہا تھا۔اس کا دھیان میدان طرف نہیں تھا۔

میڈیا کی ساری کوریج ان کی طرف تھی۔وہ پاکستان کے ٹی وی چینلوں میں دکھایا جا رہا تھا۔ایک گرما گرم بریکنگ نیوز بن گئی تھی۔صحافی کیمروں کے آگے کھڑے بریفنگ دے رہے تھے اور یوٹیوبرز ٹھنڈی بے رحمی دکھاتے ہوئے اپنے کیمرے لے کر میدان میں آگئے تھے۔انہیں کانٹینٹ جو مل گیا تھا۔

ہر طرف سنسنی اور اضطراب پھیلا ہوا تھا۔لوگ سانس روک کے دیکھ رہے تھے۔

غاذان اور یوسف خان دو قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ابتہاج بازو دباتا ہوا کراہ رہا تھا۔میڈیل ٹیم کے ڈاکٹرز اس کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ابتہاج کے دائیں ٹانگ کی ہڈی میں کریک آگیا تھا۔کمر بھی بہت بری طرح رگڑ گئی تھی اور ماتھے پر بھی چوٹ کے نشان تھے۔وہ سسک رہا تھا۔غاذان کے چہرے پر ایک کمینی مسکراہٹ تھی۔منتظم جس نے شندور کا انتظام کیا،وہ اوپر سے آرڈر ملنے پر آگے آیا اور یوسف خان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"خان.....ابتہاج انجرڈ ہو گیا ہے۔ہم اس کو طبی خیمے میں لے جا کے اس کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔آخری مرحلہ ہے،ٹیم چترال کی طرف سے نیا کھلاڑی لے آیئے تاکہ ہم میچ شروع کر سکیں۔"

ظاہر ہے یہ کھیل کا اصول تھا۔زخمی کھلاڑی کو جلد از جلد میدان سے ہٹایا جاتا اور ملتوی کھیل جاری کر دیا جاتا۔یوسف خان کے دل میں ٹیس اٹھ رہی تھی لیکن غاذان نے بڑی نرمی سے اس کا کندھا تھاما۔

"تایا جان چلیے.....اس کو ڈاکٹر دیکھ لیں گے.....ہمیں کھیل شروع کرنا ہے۔" وہ واجبی فکر اور ہمدردی سے ان کے کان کے پاس بولا۔دل میں جگنو اڑ رہے تھے۔دل خوشی سے پھول رہا تھا۔

ابتہاج لبوں کو دانتوں میں دباتا، درد کو برداشت کر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ران پہ تھے۔ یوسف خان بادلِ نخواستہ پیچھے ہوا، جاتے ہوئے وہ مڑ مڑ کر ابتہاج کو دیکھ رہے تھے۔ ابتہاج کی آنکھوں کے آگے دھند چھا رہی تھی، لوگ، آسمان گھوم رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میڈیکل ٹیم نے اس کا سٹریچر اٹھایا اور میدان سے باہر لے جانے لگے۔

☆.....☆.....☆

فضائیں عجیب سی ہو رہی تھیں۔ بادلوں میں خنکی آ گئی تھی۔ ہوا بے حد ٹھنڈی ہو گئی تھی یا پھر حالات، کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ شائقین ایک دوسرے سے شالیں لے کر ان میں دبک رہے تھے۔ میدان میں کھلاڑیوں کے گھوڑے قدم قدم آگے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے کا اضطراب اب مدھم پڑ رہا تھا۔

ڈی ایس پی مایوسی سے اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ یوسف خان کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے میچ کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ نعیم اللہ اسے پنڈال میں کھڑا نظر آ گیا تھا۔ اس سے چند سیڑھیاں نیچے وہ سگار پھونکتے ہوئے دلچسپی سے میدان کو دیکھ رہا تھا جہاں کناروں پر اضافی نفری شطرنج کے مہروں کی طرح آگے پیچھے کھڑی تھی۔ نمبر پلیٹ لگانے والا آدمی بل بورڈ کے پاس ہاتھوں میں مختلف نمبروں والی پلیٹس پکڑ کے بے تابی سے اچھال رہا تھا۔

پنڈال میں سربراہی نشستوں پر بیٹھے یوسف خان کو عالیہ جھک کے تسلی دے رہی تھی۔ موٹی چچی اٹھ کے خیموں میں ابتہاج کے پاس چلی گئی تھی۔ غاذان واپس اپنے باپ کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔

چترال کی انتظامیہ خوش تھی اور کمنٹیٹر پرجوش.....

(''میرے بچے.....اس دنیا میں انسان اور حیوان میں ایک فرق ہے۔ انسانیت کا فرق۔ یہ جذبہ جسے ہم انسانیت کہتے ہیں، یہ وہ بے عیب سی کشش ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے

ایک ہی طرح کے جاندار ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ یہ انسان سے نکلی ہے لیکن یہ ختم ''نیت'' پر ہوتی ہے۔ نیت، جو دو طرح کی ہوتی ہے۔ اچھی اور بری۔ نیت دراصل ہمارا ارادہ ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی صیغے میں دو طرح سے کام کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے ساتھ۔ جب نیت خراب ہو تو اس میں برائی آجاتی ہے اور وہ انسانیت نہیں، حیوانیت بن جاتی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں گلِ لالہ؟ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس چیز کو اچھے سے سمجھو۔ یہ لوگوں سے بچنے میں تمہاری مدد کرے گی۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ بری نیت حیوانیت ہوتی ہے کیوں کہ حیوان اپنے اندر ہمدردی نہیں رکھتے۔ انسانیت کی جڑ ہے ہمدردی۔ انسانیت کا تنا ہے غم گساری، انسانیت کا پھول ہے محبت اور انسانیت کا پھل کیا ہے گلے؟''

''دوستی!''

''شاباش۔'')

اس نے گہرا سانس لیا۔ رستم سامنے کھڑا تھا۔ بیس قدم کے فاصلے پر میدان تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ سیاہ فراک میں ملبوس تھی۔ کلیم اللہ کی سٹک عبادہ کے پاس تھی۔ وہ ہونٹ دبا رہی تھی۔ نروس تھی، نااعتباری تھی۔ ماتھا پٹی کو عبادہ نے اتروا دیا تھا۔

''کسی بھی کھیل میں ساتویں کھلاڑی کا نام کوئی نہیں لیتا..... کبھی اس کی ضرورت جو نہیں پڑتی..... بڑی بڑی ٹی وی سکرینوں پر دکھا دیا جاتا ہے۔'' کمنٹیٹر تمہید باندھ رہا تھا۔ غاذان سینے پر ہاتھ باندھ کے کھڑا بار بار ایڑیوں پہ ایکسائٹمنٹ سے اٹھ رہا تھا۔ ''میں آپ کو دکھا نہیں سکتا..... لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ اس کھلاڑی کا نام سن کے میرے ہوش اڑ گئے ہیں۔ میں تو کیا آپ بھی یہ سوچیں گے کہ شندور پولو کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا تو آج کیسے؟''

(''حیوانیت انسانیت کے پودے میں سب سے پہلے پھل کھاتی ہے۔ آپ کو جو انسانیت نہیں

دکھاتا، وہ آپ کا دوست ہی نہیں ہے۔ دوست وہ ہوتا ہے جو مشکلات میں وقت کا بہانہ، طبیعت کا بہانہ، مصروفیت کا بہانہ اور گھر والوں کا بہانہ نہ بناتا ہو۔ جو آپ کے ہر وقت، ہر لمحہ کام آئے۔ دوست پتہ ہے کیسے بنتے ہیں؟ دوستوں پہ جان مارنی پڑتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں گھر ایسے ہی نہیں ہو جاتے، ان کے درد سمجھ کے ان کا مداوا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے دکھ کو سانجھا ماننا پڑتا ہے۔ ہم جس کے دل میں ہمدردی کی جڑ لگاتے ہیں، وہ لوگ ہمیں دوستی کا پھل دیتے ہیں اور یہ ساری خوبیاں کس کے اندر ہوتی ہیں۔ انسانیت کے اندر۔ اگر تم میں انسانیت نہیں ہے تو تم میں ہمدردی، غمگساری، محبت اور دوستی بھی نہیں ہے۔"

"بابا انسانیت کے پودے میں پتے کیا ہوتے ہیں؟"

"ہوں..... پتے..... پتے ہوتے ہیں خلوص..... خلوص اور اپنائیت..... جو کریں، سچے دل اور بے مقصد کریں....."

رستم سنہری کاٹھی پہنے تن کے کھڑا تھا۔ فخر کرتا ہوا، سواری کی پیشکش کرتا ہو۔ اپنے شہ سوار کا استقبال کرتا ہوا۔ اس نے زین میں پیر رکھا، اس کی گردن کے بال پکڑے اور اٹھ کے ہوا میں فراک لہراتے ہوئے کاٹھی پر بیٹھ گئی۔ رستم کھڑا رہا۔ فرماں بردار تھا، ہلا تک نہیں۔ اس نے جھک کے اس کی گردن سہلائی۔

"شندور کی سرزمین پہ آج یہ پہلا واقعہ ہوگا۔ ناظرین، سامعین، دل تھام لیجیے، یہ خبر آپ کو چھوٹا سا ہارٹ اٹیک دلا سکتی ہے۔" کمنٹیٹر نے شائقین میں تجسس کی کھلبلی مچادی۔ لوگ بے چین ہو گئے۔ غاذان ٹھٹکا۔ اتنی تمہید کیوں باندھ رہا تھا یہ۔ ہر سال تو کھیلتا ہے وہ۔

("مجھ میں انسانیت ہونی چاہیے یا نہیں؟"

"تم بتاؤ۔"

''ہونی چاہیے۔ بہت زیادہ!''

''شاباش! جب تم میں انسانیت ہوگی۔ تم دوسروں کو خود سے پہلے رکھو گی، تب تک تم ایک بہترین انسان بنو گی لیکن جس دن تم نے خود کو آگے کیا، لوگوں کو پیچھے کیا، اس وقت تم ایک کامیاب انسان بنو گی اور ہر کامیاب انسان بہترین نہیں ہوتا گل۔ تمہیں پہلے بہترین بننا ہے اور پھر کامیاب۔'')

عبادہ نے ہاتھ بڑھا کے اسے ہیلمٹ دیا۔

(''چچا! کیا وجہ ہے کہ میں پولو کے لیے منتخب نہیں ہو رہی؟ میں کھیل سکتی ہوں۔''

''تم وہ چھوٹے کپڑے پہنو گی۔ وہ شرٹ، وہ پینٹ؟''

''کیا خرابی ہے ان میں۔ میں حجاب کر لوں گی۔''

''حجاب تمہارا سر ڈھانپے گا، تن نہیں۔'' کبھی مجاہد نے تنفر سے کہا تھا۔)

اس نے دوپٹے کو سر پہ رکھا، دائیں پلو سینے پہ ڈالتے ہوئے بائیں طرف گزارا اور سر سے پن نکال کے کندھے پر لگا دی۔ سر پہ پلو آگے کھینچا، بال چھپا لیے۔ اب صرف گردن نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہیلمٹ سر پہ رکھ کے سٹریپ کو ٹھوڑی کے نیچے نتھی کر دیا۔ اب گردن بھی چھپ گئی۔

(''ہر پیشے، ہر کھیل کا لباس.....اس کی شناخت کے لیے ہوتا ہے چچا۔ ڈاکٹر سفید کوٹ پہنتے ہیں تاکہ پہچانے جائیں۔ یہ ضرورت کے لیے نہیں ہوتا۔ میں شرٹ نہیں بھی پہنوں گی تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا کیوں کہ شندور فری سٹائل پولو ہے۔ یہاں میں گھاگھرا، ساڑھی، فراک سب پہن کے کھیل سکتی ہوں۔ اور میں صرف شندور ہی کھیلنا چاہتی ہوں ناں۔ پلیز۔'')

اس کی آنکھوں میں سایہ تھا۔ بابا کا سایہ۔ پلکیں اٹھی ہوئی تھیں۔ کاجل بہہ گیا تھا۔ نیلی آنکھوں میں اضطراب تھا۔ گلابی ہونٹ خشک تھے لیکن دل ایک عزم سے دھڑک رہا تھا۔

عبادہ نے اس کی طرف سٹک اچھالی، اس نے اچک کے پکڑ لی۔

"کھووار قبیلے کا ظرف بلند ہو..... جو فیصلہ اسی سالوں سے کوئی نہ کر سکا..... کھووار قبیلے نے کر کے نہ صرف اعلیٰ ظرفی کی مثال قائم کی ہے بلکہ دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ کھیل میں مرد و عورت کی کوئی تفریق نہیں....."

میدان میں کھلاڑی انتظار کر رہے تھے چترال کے کھلاڑی کا۔ غاذان بے چین ہو گیا تھا۔ کمنٹیٹر کیا کہہ رہا تھا؟

"کم آن گل..... جاؤ..... اپنا خواب پورا کرو....." عبادہ نے دو قدم پیچھے لیتے ہوئے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

"دل تھام کے استقبال کیجیے..... تاریخ میں پہلی بار..... مردوں کے مابین کھیلنے والی پہلی فی میل کھلاڑی..... مس گل لالہ کلیم کا....."

غاذان کے پیروں سے زمین کھسک گئی۔ وہ اختیار اگلی سیڑھی پر پھسلا، آگے کھڑے ایک آدمی نے اسے پکڑ لیا۔

"سوری..... سوری....." وہ خجالت سے کہتا پیچھے ہوا اور تیزی سے میدان کی طرف دیکھا۔

رستم میدان میں وارد ہو گیا تھا۔ گل سٹک کو کندھے پر ٹکائے، لمبی فراک پہنے، سیاہ گھوڑے پر کسی شہزادی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ نعیم اللہ کو اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

"گل یہاں؟" اس نے گھبرا کر یہاں وہاں دیکھا۔ سب لوگ خاموش تھے۔ ایسے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ یوسف خان، بی جان، بریخنہ سب کو شاک لگا تھا۔ عالیہ بیگم آنکھوں میں نرمی لیے خوشگوار حیرت سے آگے ہوئی تھی۔

غاذان نے بے ساختہ اپنے باپ کو دیکھا۔ ان کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ اس کا اپنا حلق خشک ہو

رہا تھا۔(وہ یہاں کیسے آئی؟ وہ تو پرانے جھرنے میں تھی۔اسے کون لے کر آیا تھا؟)

(''گل،تم پولو کھیل سکتی ہو،ڈرو نہیں رستم سے.....ایسے بیٹھو۔''

''گر جاؤں گی بابا۔''

''نہیں گرو گی۔زین میں پیر کس کے ڈالو۔لگام پکڑ لو۔جب تم اچھے سے بیٹھی ہو گی تو تم نہیں گرو گی۔یہ سٹک پکڑو۔''

''بابا پلیز۔''

''چپ گل.....ایک دم چپ.....خبردار جو تم روئیں۔رستم اتنا سا ہے۔گر گئیں تو خروچ تک نہیں آئے گی۔واویلا مت کرو۔مضبوط بنو۔'')

اس نے کس کے زین میں پیر ڈالے،لگام کی رسی کو کئی بل دے کر مٹھی کے گرد لپیٹ لیا۔

''جب میدان میں جاؤ تو آس پاس مت دیکھو۔بال کو نظروں میں رکھو۔پلکیں مت جھپکنا،فوکسڈ رہنا۔یوں سمجھنا وہ ایک خالی میدان ہے اور تم اکیلی کھیل رہی ہو۔جیسے شہ سوار کرتے تھے۔کون شہ سوار؟ جیسے حضرت علیؓ،جیسے خالد بن ولیدؓ۔وہ جب گھوڑوں پر سوار ہو کے،ہاتھ میں تلوار لیے میدان میں اترتے تھے تو وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ پیچھے لشکر ہے۔وہ کہتے تھے اس لشکر کے ساتھ ہم ہیں۔تم جب میدان میں اترو تو یہ دماغ میں نہیں رکھنا کہ تمہارے ساتھ ٹیم ہے۔یہ دماغ میں رکھنا کہ تم ٹیم کے ساتھ ہو۔)

گل کھلاڑیوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔اس کا گھوڑا اونچا تھا اور سٹک لمبی۔وہ گلگت کے کھلاڑیوں کو للکارتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں کا حزن اور گھوڑے کا جلال دیکھ کے باقی گھوڑے خود بخود پیچھے ہو گئے۔میڈیا کھچا کھچ تصویریں اتار رہا تھا۔

خبروں پہ خبریں چڑھ رہی تھیں۔نیوز ہینڈ لائنز،سرخ پٹیاں،صحافی اور شور.....کیمرہ اس پہ لگا

ہوا تھا اور لاہور میں آفس میں بیٹھا احمد چائے پیتے پیتے بری طرح چونکا تھا۔اس کے سامنے لگے ٹی وی پر شندور سے لائیو خبریں آ رہی تھیں۔

''نہیں نہیں .....گل نہیں کھیل سکتی.....'' غاذان نے تیزی سے سر نفی میں ہلایا۔اس کے ہاتھ پیر نم ہو رہے تھے۔اس سے دس قدم دور کیبن تھا۔کمنٹیٹر اعلان کر کے اب پانی پی رہا تھا۔(اس کی تو.....) وہ تیزی سے اس طرف لپکا، درمیان میں ہجوم تھا۔لوگ کھڑے تھے۔وہ راستہ بناتا، لوگوں کو دھکیلتا، گرتا، سنبھلتا آگے آیا اور جب ہی سینے پر کسی کا ہاتھ پڑا، وہ چلتے چلتے رکا۔اس نے ٹھٹک کے ہاتھ کو دیکھا.....وہ اسد کا ہاتھ تھا.....وہ ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسی اثنا منتظم نے میدان میں گیند اچھالی.....کھلاڑیوں نے پوزیشن سنبھالی۔

''کہاں جا رہے ہیں سردار؟'' اسد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سامنے سے ہٹو مجھے کام ہے۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''گل کو روکنے جا رہے ہیں؟'' اسد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو اس نے ٹھہر کے اس بالے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھا۔''نہ اسے ٹیم سے نکال کے روک سکتے ہیں اور نہ ہی اسے پرانے جھرنے میں مقید کر کے۔''

ایک لمحے کے لیے وہ جگہ سے ہل نہیں سکا۔

''میں لایا ہوں اسے۔اپنے اس (پیشانی پر انگلی بجائی) چھوٹی سوچ پر زور مت ڈالیے گا۔''

''تمہاری اتنی مجال دو ٹکے کے لڑکے؟'' غاذان دانت پیستے ہوئے بولا۔''ہٹو میرے سامنے سے، ورنہ ایسی جگہ گھونسا ماروں گا کہ کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کر پائے گا۔'' وہ وارننگ دے رہا تھا۔اسد نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے۔

''مارو۔'' ڈھٹائی سے للکارا۔

غاذان نے وار کرنے کے لیے مٹھی بھینچی مگر جب ہی نعیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اپنے کندھے پر لمس محسوس کر کے وہ پلٹا۔ لوگ میچ دیکھنے میں مصروف تھے لیکن بہت سارے لوگوں کی آنکھیں کن اکھیوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

''جانے دو.....اس دفعہ جانے دو.....'' اس نے زبردستی جبڑے کستے ہوئے کہا۔

''مگر بابا.....''

''تم چلو میرے ساتھ.....'' وہ اپنے بیٹے کو کلائی سے تھام کر پنڈال سے باہر لے گیا۔ غاذان زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

(جگنو کی روشنی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ سیاہی میں زرد۔ جیسے کوئلے میں جھلملاتا ہوا ہیرا۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتے ہیں یہ جگنو۔ مگر جو اتنی خوبصورتی اور روشنیاں پھیلاتے ہیں، یہ بہت نازک ہوتے ہیں بالکل ایک لڑکی کی طرح۔ مگر مجھے وہ لڑکی نہیں بننا تھا۔ میں چمکوں گی، میں خوبصورت بھی ہوں گی اور میں ہی سب سے زیادہ.....مضبوط بنوں گی۔ مجھے کوئی ناخن تلے مسلے گا نہیں۔ مجھے کوئی اپنے اصولوں کا پابند نہیں بنائے گا۔ میں گھوڑوں پر بیٹھوں گی، پولو کھیلوں گی اور پورے لباس میں کھیلوں گی۔ مجھے تمہارے معاشرے کی پرواہ نہیں، تمہارے سماج کی فکر نہیں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔)

کھیل صرف پندرہ منٹ کا تھا.....میدان میں رعب دار لڑائی جاری تھی۔ سیاہ فریشین گھوڑے پر بیٹھی گل اور دیگر خوبصورت گھوڑوں پر براجمان پولو کے منجھے ہوئے کھلاڑی.....گرد کا ایک طوفان تھا جو میدان میں اٹھ رہا تھا۔ گل جھک کے بڑی مہارت سے گلگت کے کھلاڑیوں کا راستہ روک رہی تھی۔ ایک تو رستم لمبا تھا، سارے گھوڑوں میں واضح نظر آ رہا تھا دوسرا اس کا طنطنہ تھا کہ گھوڑے قریب ہی نہیں آ رہے تھے۔ کھلاڑیوں کو غصہ تھا۔ ایک لڑکی اور ہار.....؟ قطعی نہیں.....وہ گل کے

ساتھ مقابلہ کے لیے کم، اس پر جھپٹنے کے لیے زیادہ آ رہے تھے۔ گل مکمل پرسکون تھی۔

اس کا گھوڑا گول کے ستونوں کے قریب جا رہا تھا۔ وقت کے آخری سیکنڈز تھے۔ دس ..... نو..... آٹھ..... گلگت کے کھلاڑی پوری جان لگا رہے تھے کہ بال کو روک لیں..... بال جا رہی تھی..... شائقین سانس روک کے دیکھ رہے تھے۔ گردنیں اٹھ رہی تھیں، لوگ سیٹوں سے دھیرے دھیرے اٹھ رہے تھے۔ گل جھکی، زین میں پیر کس کے دیے، لگام انگلیوں میں سختی سے پکڑ لی.....

(آئی لو یو گل..... جو میرا ہے وہی تمہارا ہے..... تم رستم پہ جتنا چاہے گھڑ سواری کرنا۔ میں منع نہیں کروں گا۔"

"گل۔ رو نہیں۔ پلیز۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو۔ میں رستم کو بچا لوں گا۔ ابھی میں نے کہا ناں کہ میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ سرداری کے بعد میں تم سے شادی کر لوں گا۔ تم میری سردارنی بن جاؤ گی۔ ہم خوشی خوشی رہیں گے۔ پلیز اس طرح خود کو اذیت مت دو....."

"میں ابتہاج کے ساتھ وہی کروں گا جو تمہارے باپ نے رمیز کے ساتھ کیا تھا۔)

اس نے گہری سانس لی۔

(جاؤ گل اپنا خواب پورا کرو۔"

"تم چھوٹے کپڑے پہنو گی۔ پینٹ شرٹ؟"

"ہم خوشی خوشی رہیں گے۔ پلیز اس طرح خود کو اذیت مت دو۔"

آئی لو یو گل..... جو میرا ہے وہی تمہارا ہے..... تم رستم پہ جتنا چاہے گھڑ سواری کرنا۔ میں منع نہیں کروں گا۔")

اس نے آنکھیں بند کیں اور پوری قوت سے بال کو ہٹ کیا..... بال جگہ سے اچھلی اور اڑتی اڑتی دونوں ستونوں کے پار ہو گئی..... لوگ ٹھاٹھوں کی صورت میں سیٹوں سے اٹھے اور چیخ چیخ کر شور

کرنے لگے۔اس نے رستم کی لگام کھینچی،اس کے پیر چر چرائے ،دھول اڑی اور وہ رک گیا۔اس نے لگام سے تھام کے موڑ دیا۔گل نے آخری داؤ کھیل لیا تھا۔

''یہ کھیل چترال کے نام.....'' کمنٹیٹر نے اعلان کیا تو پورا چترال باڑ توڑ کے میدان میں کود پڑا۔لوگ لشکر کی طرح گل لالہ کی طرف بھاگنے لگے۔میدان میں ڈھول کی تھاپ گونجی اور روایتی گانے بجنے لگے۔

عالیہ کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہی تھی۔یوسف خان ہنوز بیٹھا ہوا تھا۔بی جان آنکھوں کی نمی صاف کر رہی تھیں۔اسد پورے دل سے تالیاں بجا رہا تھا۔مہمان خصوصی بہت حیرانگی سے سراہا رہے تھے۔کھچا کھچ میدان لوگوں سے بھر گیا۔گل کے گھوڑے کو لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔وہ مٹھیاں بند کر کے ہاتھ بلند کرتے ہوئے آوازیں لگا رہے تھے۔

''گلِ لالہ.....گلِ لالہ.....''

وہ ہلکا ہلکا مسکرا رہی تھی۔اسے رونا بھی آ رہا تھا لیکن وہ خود پہ قابو پا رہی تھی۔لوگ بہت چاہت سے، بہت محبت سے اس کی تعریف کر رہے تھے۔کلیم اللہ کا چترال،اس پہ محبت لٹا رہا تھا۔اسے دوستی دکھا رہا تھا۔پورے پاکستان میں خبریں چل رہی تھیں کہ شندور کا آخری میچ چترال کے نام رہا اور آخری داؤ کھیل کر جیتنے والی گل لالہ نے نایاب نسل کا رستم بھی جیت لیا ہے۔

پنڈال سے لوگ اتر اتر کے میدان میں جا رہے تھے۔گل نے ہیلمٹ اتارا، چہرہ پسینے سے بھرا ہوا تھا۔ہلکے ہلکے بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔سر پہ دوپٹہ برقرار تھا۔اس نے ہیلمٹ زین سے ننھی کیا اور گھوڑے سے اتر گئی۔سامنے سے عالیہ،بی جان اور دیگر معزز خواتین چلی آ رہی تھیں۔گارڈز نے لوگوں کو گل سے دور ہٹا لیا تھا۔وہ پسینے سے بھیگی بھیگی اور تھوڑی سی خوفزدہ کھڑی تھی۔رستم کو ایک ملازم لگام سے پکڑ کے لے گیا۔

عالیہ قریب آئی اور تیزی سے اس کے گلے لگی۔ ''میرا بچہ.....''

بی جان نے آگے سر پہ ہاتھ رکھا، کندھا چوم اور پشت سہلاتے ہوئے پیار کرنے لگیں۔ وہ عالیہ سے الگ ہوئی تو دادی کے گلے لگ گئی۔ عالیہ وارفتگی سے دیکھتے ہوئے اس کا پسینہ پونچھنے لگیں۔ بی جان نے ماتھا چوما، گال چومے۔ انہیں تو لگا تھا یہ آرام سے، سکون سے شندور پہنچی ہے۔ انہیں کیا پتہ.....وہ دوزخ کے کن کن تہوں کو چیر کے آئی ہے۔

''بہت اچھے میری ننھی پری۔ تم نے کمال کر دیا ہے۔'' عالیہ اس کا چہرہ والہانہ انداز سے چھوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''شکریہ۔'' اس نے دھیرے سے سر کو خم دیا۔

پیچھے میڈیا کھچا کھچ تصویریں اتار رہا تھا۔ صحافی مائیک لیے انٹرویو کے لیے مچل رہے تھے۔ منتظم ہاتھوں میں ٹرافیاں لیے میدان میں آ رہا تھا اور اس کے ساتھی کھلاڑی گھوڑوں سے اتر کے میدان میں اس حصے میں جمع ہو گئے تھے۔ یوسف خان آئے.....اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پانی کی بوتل پکڑائی۔ گل نے آنسوؤں کو قابو کرتے ہوئے بوتل کھولی اور گھونٹ بھرنے لگی۔ اس کا گلا بری طرح خشک پڑ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

منتظم ٹرافیوں کی تقسیم کے لیے جلدی میں تھا۔ آن کی آن میں میدان میں بیک گراؤنڈ شیٹ لگی۔ سامنے کیمرے سجے۔ صحافی آئے اور انہیں ٹرافیوں کے لیے بلایا جانے لگا۔ بیسٹ پلیئر، مین آف دا میچ، گڈ ہٹر کی ٹرافیوں کی نامزدگیاں ہو رہی تھیں۔ شائقین واپس اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔

وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، رومال سے چہرے کا پسینہ صاف کر رہی تھی۔ عالیہ اور بی

جان اس کے دائیں بائیں کھڑی تھیں۔ یوسف خان بیک گراؤنڈ کے آگے کھڑے تھے۔ دیگر مہمان خصوصی کھلاڑیوں میں انعامات تقسیم کررہے تھے۔ عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''مین آف دا میچ ایوارڈ لینے کے لیے ہم گلگت سکاؤٹ کی ٹیم بی سے مسٹر ارحم جان بہادر کو اسکرین پر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔'' صحافی جس نے مائیک پکڑا ہوا تھا، وہ مسکرا کے بولا۔ میدان میں تالیاں بجیں اور ارحم جان بہادر گل کے پہلو سے اٹھ کے سامنے چلا گیا۔

پہلے مہمان خصوصی سے مبارک باد ملی، مصافحہ کیا، کیمرے میں تصویر کھنچوائی..... پھر ٹرافی لے کر صحافی کے پاس آیا۔

''مبارک ہو آپ کو ارحم۔ کیسا لگ رہا ہے مین آف دا میچ کا ایوارڈ جیت کے؟'' صحافی نے مائیک اس کے منہ کے آگے کردیا۔

''اچھا لگ رہا ہے۔ یہ چھٹی بار الحمدللہ مین آف دا میچ بن رہا ہوں۔'' وہ خوشدلی سے بولا۔ صحافی متاثر ہوا۔

''ویلڈن.....''

اس نے ہاتھ ملایا۔ ارحم شکریہ ادا کرتا ہوا واپس اپنی جگہ پر آکے بیٹھ گیا۔ گل نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔

''مبارک ہو ارحم بھائی۔'' اس نے تحسین بھرے انداز میں کہا تو اس نے سر کو خم دیا۔

''شکریہ گل.....''

میچ چترال نے جیتا تھا لیکن ٹرافیاں گلگت لے گیا تھا۔ میچ کی ٹرافی ایک واحد ٹرافی تھی جو چترال کو ملی تھی۔ جب چترال کی نامزدگی کا وقت آیا تو گل کے ہاتھ نم پڑ گئے۔ بریخنہ نے محسوس کیا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ اٹھایا، پشت چومی اور اسے تسلی دی۔ گل لب دباتے ہوئے مسکرائی۔

''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ چترال کے سردار نے جیتنے والی ٹیم کے آخری گول کرنے والے کے لیے ایک بیش بہا انعام کا بھی وعدہ کیا تھا۔ ہم سردار یوسف خان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آخری ہٹ مس گل لالہ کو رستم بطور انعام پیش کریں۔'' میزبان نے محبت سے کہا۔ یوسف خان سر پہ دستار کو درست کرتے ہوئے بیک گراؤنڈ کے عین سامنے آ گئے یوں کہ باقی مہمان پیچھے ہو گئے۔

گل دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کبھی نہیں سوچا تھا، یہ وقت بھی آئے گا جب پوری دنیا کے سامنے اپنے ہی رستم کو کولڑ کر حاصل کرنا پڑے گا۔ وہ پہلو میں مٹھیاں دباتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ بی جان اور عالیہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ اس شور، ہنگامے میں من من بھر قدموں سے چلتی یوسف خان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ جھجک رہی تھی جب کہ وہ بے حد اپنائیت سے آگے آئے، اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور جھک کے ماتھا چوم لیا۔ تایا کا یہ لمس بالکل باپ کی طرح لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ آنسو آ گئے۔

ملازم رستم کو لگام سے پکڑے اسکرین کے سامنے لایا اور لگام نرمی سے اس کے ہاتھ میں دے دی۔ کئی تصویروں کی کھینچنے کی آواز آئی۔ فلیش پڑے، اس نے پہلی بار اتنے سارے بڑے بڑے کیمرے دیکھے تھے۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ اس نے رستم کی گردن سہلائی، کیمروں میں وہ ہر زاویے سے مقید ہو گئی۔

میزبان صحافی مائیک لے کے اس کے پاس آیا۔ نیوز میں اس کو لائیو دکھایا جا رہا تھا۔

''مس گل لالہ..... مبارک ہو آپ کو..... آپ شندور کی پہلی خاتون پولو پلیئر ہیں۔'' صحافی نے اس انداز سے کہا جیسے اسے چونکا رہا ہو جب کہ وہ بے نیازی سے مسکرائی۔

''شکریہ.....''

''کیسا لگ رہا ہے رستم جیسا شاندار گھوڑا پا کر؟'' میزبانی نے دلچسپی سے پوچھا۔

وہ نرمی سے مسکرائی۔ ''جو اپنی چیز پا کے لگتا ہے۔''

''جی؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ کہانی بہت لمبی تھی۔ اس نے رستم کی زین میں پیر ڈالا اور جھٹکا دے کر اس پر چڑھ گئی۔ اس نے لگام کھینچ کے رستم کو چابک لگائی اور اسکرین کے بائیں سمت گھوڑے کو میدان میں دوڑا دیا۔ میزبان، صحافیوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ چترال ٹیم کی ٹرافی کے لیے کیوں نہیں رکی تھی؟

اور وہ..... اسے ٹرافیوں سے کیا لینا دینا؟ اسے جو چاہیے تھا وہ پوری دنیا کے سامنے مل گیا تھا۔ کروڑوں لوگ اس کے گواہ تھے اور سینکڑوں لوگ ہامی۔ وہ میچ کے دوران یہاں پہنچی تھی مگر جانتی تھی کہ دوران میچ اسے نہیں کھیلنے دیا جائے گا۔ اس لیے اس نے غاذان کے رچائے کھیل کا انتظار کیا اور پھر.....

اپنی چال چل کر دوسروں کو ہرانے کا کیا مزہ..... مزہ تو تب آتا ہے جب ان کی چال میں ان کو ''ہرایا'' جائے!

وہ اندھا دھند میدان میں بھاگ رہی تھی جیسے کھلی فضاؤں میں کچھ دیر پہلے آزاد کیا گیا پرندہ اڑتا ہے۔ آج ہوائیں بھی ساتھ تھیں اور فضائیں بھی۔ نہ زمین پر کوئی ٹوک تھی اور نہ آسمان سے کوئی روک۔ سیاہ گھوڑا بھاگ رہا تھا۔ دھڑ دھڑ..... دھڑ دھڑ..... وہ بانہیں کھولے، چہرہ اٹھائے آزادی کی ایک ایک لہر کر محسوس کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اوپر اپنے خیمے کے اندر تھے۔ نعیم اللہ انگیٹھی کے سامنے کرسی پر بیٹھا، آگ کو دیکھتے ہوئے سگار پہ سگار پھونک رہا تھا۔ خیمے میں کلارسینوجن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے وجود میں ایسی بے

چینی تھی کہ ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ مشکل سے باپ کے پیچھے کھڑا تھا۔

''بابا.....'' اس نے بمشکل حلق تر کیا۔

''ابھی خاموش رہو غازی..... ابھی کچھ مت بولو۔'' وہ سختی سے بولے۔

''اسے رستم مل گیا ہے بابا۔ وہ میدان میں آ گئی تھی۔ اب وہ جیت جائے گی۔ میں..... میں ہار جاؤں گا.....'' وہ بے حد صدمے میں تھا۔ نعیم اللہ اٹھا اور درشتی سے اس کی طرف بڑھا، اسے کالر سے پکڑ کے نیچے کھینچا۔

''میں نے..... کہا..... خاموش..... رہو.....'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھاڑے۔

غاذان کا سانس رک گیا۔ ''اس وقت تم ہار گئے ہو غازی..... تم (سینے پر انگوٹھے سے ٹھوکا دیا) ہار چکے ہو..... سوچو اگر انہوں نے سب کو بتا دیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے تو ہمارا کیا ہوگا؟''

غاذان کے دل پہ گھونسا پڑا۔

''وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا..... عبادہ..... وہ سب جانتی ہے اور وہ قطعی خاموش رہنے والوں میں سے نہیں..... گل کو رستم مل چکا ہے۔ وہ ہمیں نہیں چھوڑے گی۔ اس لیے اپنا غصہ ختم کرو اور تحمل سے سوچو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

انہوں نے اس کا کالر جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ غاذان پیچھے لڑکھڑا گیا۔

''میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ تمہاری طرح میرے بھی ذہن میں کئی سوال ہیں لیکن میں ان سب پہ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے پاس تھوڑا سا وقت ہے غاذان۔ ہمیں سوچنا ہوگا..... سوچو..... سوچو کہ اب آگے کیا کریں۔'' وہ بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

''دستار پوشی ہو جانے دیں بابا۔ اس کے بعد میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

وہ رک گئے۔ ''کیا کہا؟''

''دستار پوشی تک انتظار کریں۔''

''غاذان صاحب! سب ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کس دنیا میں ہو تم؟'' وہ بری طرح تیورا گئے۔

''اب صرف ایک ہی حل ہے..... یہاں سے نکلو..... جان بچاؤ..... جائے وقوعہ پہ قاتل کا پایا جانا، براہِ راست پھانسی ہوتا ہے۔ یہ سب مصروف ہیں..... گاڑی نکالو اور ہم چلتے ہیں یہاں سے۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' وہ سگار پھینک کے جلدی جلدی سامان نکالنے لگے۔

''میں کاہلوں کی طرح میدان چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔'' وہ گردن اکڑا کے بولا۔

''تمہارا باپ بھی جا رہا ہے تم بھی جاؤ گے۔'' وہ اپنی گھڑی، فون اور پرس اٹھا کے کوٹ کی جیب میں ڈالنے لگے۔

''بابا، یہ بزدلی ہے۔ ہمیں سامنا کرنا چاہیے۔''

''سب کو بعد میں دیکھ لیں گے۔ فی الحال نکلو یہاں سے۔''

''بیک اپ پلان ہے ناں۔ کیا ثبوت ہیں ان کے پاس کہ ہم نے سب کیا ہے؟ ہم تو کل رات یہاں تھے۔ شندور میں۔''

''جس نے ان کی مدد کی ہے ناں۔ اس کے پاس تمہاری اس بات سے زیادہ اچھا جواز ہوگا۔'' نعیم اللہ نے ناک چڑھا کے کہا۔

''یہاں سے جانے کے بعد آپ کیا کر لیں گے؟ ہم سامنے سے سامنا کر سکتے ہیں۔''

''بس غازی.....'' انہوں نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ''میں جتنا کہہ رہا ہوں، اتنا کرو۔''

''بابا، لیکن.....''

''شش..... زبان نہیں چلاؤ میرے آگے۔ کوٹ اٹھاؤ اپنا اور چلو میرے ساتھ۔'' انہوں نے سختی سے جھڑکا، غاذان کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بادلِ نخواستہ کوٹ کی طرف بڑھ گیا۔ نعیم جیسے

ہی اپنا چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈال کے جیسے ہی خیمے سے باہر نکلے، ان کے قدم زنجیر ہو گئے۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بال نم تھے اور کپڑے گندے۔ چہرے پر فاتحانہ شرارت تھی۔ اس کے دائیں طرف ڈی ایس پی کھڑا تھا اور بائیں طرف ساجد خان..... دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے جو نعیم اللہ پر تنے ہوئے تھے۔ نعیم اللہ کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ کے گر گیا۔ اسی لمحے غاذان کوٹ کی آستین پہنتا باہر نکل آیا۔

''بابا.....'' اور پھر وہ اگلا سانس نہیں لے سکا۔ ایک بازو ہوا میں تھا اور ایک نیچے معلق رہ گیا۔

''مسٹر غاذان اور مسٹر نعیم اللہ..... یو آر انڈر آریسٹ.....'' ڈی ایس پی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ساجد، خ ہتھکڑیاں لگاؤ۔'' ساجد نے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔

''ایک منٹ.....'' غاذان نے ساجد کو ہاتھ اٹھا کے روکا۔ پھر وہ قدم قدم ڈی ایس پی کے سامنے آیا۔ ''کس خوشی میں گرفتار کیا جا رہا ہے ہمیں؟ کیا کیا ہم نے؟'' اس نے چاروں طرف کھڑے پولیس کے سپائیوں پر استہزائیہ نظر ڈالی۔

اسی اثنا میں تین آدمی اس کے سامنے آ گئے۔ ایک اونچا، اوسط جسامت کا خوبرو سا آدمی تھا۔ ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ آنکھوں پر گاگلز تھے، بال جیل سے جمے ہوئے تھے۔ وہ منہ میں چیونگ گم چبا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے میں فوجی جرنیل لگتا تھا۔ باقی دو سوٹڈ بوٹڈ سے کھلی پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھے۔ دیکھنے میں کسی محکمے کے افسران لگتے تھے۔ غاذان تینوں کو دیکھ کے بری طرح ٹھٹک گیا۔ جرنیل نے ہاتھ میں پکڑا اریسٹ وارنٹ چہرے کے آگے اٹھایا۔

''چھ گھوڑوں کو زہر دینے..... دو کو مارنے..... چار لوگوں کو جبس بے جا میں رکھنے اور..... ابتہاج خان کو شندور میں زخمی کرنے کے جرم میں غاذان خان، آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے اور کلیم اللہ خان کے قتل..... بلوری کی موت..... اور رمیز کی موت میں تعاون فراہم کرنے اور سہولت کار بننے

کے جرم میں نعیم اللہ آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ ساجد خان..... اب..... ہتھکڑیاں لگاؤ۔'' جرنیل نے کاغذ نیچے کر کے سرد مہری سے کہا۔

غاذان کے پیروں تلے زمین کھسکی۔ ساجد خان اسے ہتھکڑی لگانے لگا۔ غاذان نے ہاتھ پیچھے کھینچے اور مزاحمت کرنے لگا۔ ''کیا کر رہے ہیں آپ۔ میں ہونے والا سردار ہوں۔ آپ مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ چھوڑیں مجھے.....''

''' چھ گھوڑوں کو زہر دینے..... دو کو مارنے..... اصطبل کو جلانے..... چار لوگوں کو حبس بے جا میں رکھنے اور..... ابتہاج خان کو شندور میں زخمی کرنے کے جرم میں غاذان خان آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔'' جرنیل نے وہی ٹھنڈک دکھائی۔

غاذان ٹھٹکا۔

''کون ہو تم لوگ؟ تم لوگ مجھے مجرم نہیں ٹھہرا سکتے۔''

جرنیل اور دو آدمی قدم قدم آگے آئے۔ دونوں آدمیوں نے اپنے کارڈ نکالے اور اس کے چہرے کے سامنے کیے۔ ساجد اس کے ہاتھ کمر پہ لے جا کے اسے ہتھکڑی لگا رہا تھا۔ غاذان نے ٹھہر کے کارڈ دیکھا۔

''عبداللہ کاردار..... وائلڈ لائف آرگنائزیشن ڈائریکٹر..... کے پی کے.....''

دوسرے نے اپنا کارڈ دکھایا۔

''حجاز دستگیر رحمانی..... اینیمل ہسبینڈری آفیسر.....''

ان دونوں نے اپنے کارڈ پیچھے کیے تو جرنیل آگے آیا۔ اس نے اپنا کارڈ نکالا، دو انگلیوں سے پکڑا کے غاذان کے سامنے اٹھایا۔

''طارق زمان..... سینئر ویٹرنری ڈاکٹر..... سیو لائف ہسپتال..... لاہور.....''

اب کی بار غاذان کے چہرے پر کئی رنگ گزرے۔دل مچل کے حلق میں آ گیا۔جرنیل نے مسکراتے ہوئے کارڈ پرس میں رکھا اور پرس جیب میں ڈال دیا۔''کہا تھا ناں.....تحقیقاتی کمیٹی بناؤں گا؟'' جرنیل نے گاگلز آنکھوں سے ہٹائے اور سرد مہری سے غاذان کو دیکھا۔''دیکھولو.....ہم اسی کمیٹی سے ہیں۔''

''اور تم پہ فرد جرم عائد کر سکتے ہیں۔'' یہ آواز عبادہ کی تھی جو تلخی سے ابھری تھی۔

''چھوڑو مجھے۔میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ غرایا۔

''جو تم نے کیا ہے۔وہ کوئی نہیں کر سکتا۔'' عبادہ نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''تم جھوٹی ہو۔ایس ایچ او صاحب یہ جھوٹ بول رہی ہے۔''

'' غاذان خان۔کار سرکار میں مداخلت مت کریں۔آپ کے خلاف کڑی ایف آئی آر کٹی ہے۔'' ایس ایچ او نے کڑے لہجے میں تنبیہہ کی۔

''اور میرے خلاف کس نے کاٹی ہے؟'' نعیم نے طنز سے پوچھا۔

''میں بتاؤں.....'' یکدم احتشام نے ان کا راستہ روک لیا۔احتشام کو دیکھ کے نعیم کی بھنویں تن گئیں۔''گل لالہ نے خود.....''

ان کے پیروں تلے بارودی سرنگیں پھٹ گئیں۔

''گل،جس کے باپ کو تم نے بے دردی سے قتل کر کے سفاکی سے کھائی سے گرایا تھا۔کچھ یاد آیا؟'' عبادہ نے تلخی سے پوچھا۔ایک سایہ ان کی آنکھوں میں لہرایا۔جہانگیر.....گن.....گتھم گتھا.....گولی.....کلیم اللہ.....بلوری.....فلیش بیک میں سارا ماضی چلنے لگا۔

''تمہیں کیا لگا گل بھول چکی ہوگی۔ہونہہ۔تم نے اس کے باپ کو مارا تھا۔کوئی چاہ کر بھی یہ اذیت نہیں بھول سکتا۔''

نعیم سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ اٹھارہ سال تک وہ اپنی سزا کے طور پر چترال سے دور رہا تھا۔ اس نے قیدیں، سلاخیں اور ٹارچر دیکھا ہی نہیں تھا۔ سرور خان نے خاندان کی عزت کی خاطر اس کو سزا میں مراعات دی تھیں لیکن قانون کی سزا میں کوئی سگا نہیں ہوتا۔ جواب تک یہ سمجھتا ہوا آ رہا تھا کہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا، آج ہتھکڑیوں کو دیکھ کے کلائیوں میں ٹیس اٹھی تھی۔ سونے پہ سہاگہ، پیچھے کوئی والی وارث بھی نہیں تھا کہ چشم پوشی کے لیے جیل کے پھیرے لگاتا۔ ان کا اپنا چشم و چراغ تو ان کے ساتھ ہی جا رہا تھا۔ ایک ٹھنڈی اور بے بسی بھری نظر غاذان کی طرف اٹھائی۔

غاذان سانس نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ جم گیا تھا۔

ساجد نے نعیم اللہ کو ہتھکڑی لگا دی اور اس کو کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے گیا۔ وہ اپنی ساری طاقتوں کے مفقود ہو جانے پر بے بسی سے چپ چاپ گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ غاذان اپنے باپ کو نقاہت سے دیکھ رہا تھا۔

''تو مسٹر دی لندن ریٹرن.....'' طارق سر نے چٹکی بجا کر اس کا دھیان واپس کیا۔ ''تمہیں فلاپ کیا ہے میری پاکستانی ویٹرنری ڈاکٹر عبادہ سلیم نے.....'' اس نے گاگلز کھول کے شرٹ سے رگڑے۔ ''اب کیا خیال ہے، لندن کی ڈگری کا کیا کرو گے؟''

غاذان نے جبڑے شدت سے کچکچائے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا عبادہ کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلائے۔ وہ چھوئی موئی سی لڑکی اس پر حاوی ہو گئی تھی۔ وہ کل کی آئی لاہور کی لڑکی نے اس کا راز فاش کیا تھا۔ اس کے ہاتھ کھلے ہوتے تو اب تک عبادہ مر چکی ہوتی۔

''ڈی ایس پی..... تمہیں اچار پسند ہے؟'' طارق نے سر ٹیڑھا کر کے پیچھے کھڑے ڈی ایس پی سے پوچھا۔

''جی سر.....''

''ایک کام کرو.....ان صاحب کی ڈگریاں لے جاؤ اور ان کا اچار ڈال لو.....بہت چٹخارے دار بنے گا.....'' وہ مکا ہونٹ پہ رکھ کے ہنسی دباتے ہوئے بولے۔عبادہ کھل کر ہنسی جس کو دیکھ کے غاذان کے اندر غصے سے کھلبلی مچل گئی۔

''چھوڑوں کا نہیں میں تمہیں.....دو ٹکے کی.....گالی.....گالی.....گالی.....عورت.....'' وہ بدتہذیبی پہ اتر گیا۔''سمجھتی کیا تم خود کو۔میں تمہیں چبا ڈالوں گا۔تم.....گالی.....ایک بے حیا عورت ہو.....اکیلی آئی ہو لاہور سے.....کتنی ہی عزت دار ہو گی تم.....گالی.....عورت.....گالی.....عورت.....''

اور پھر بعض لوگوں کی اوقات بعض مقامات پر پتہ چلتی ہے۔عبادہ نے مسکرا کے سوچا۔

''لے جائیں ان کو.....باقی کی کارروائی پولیس سٹیشن میں کریں،مقدمہ ہمارا ہے۔ہم دیکھتے ہیں یہ لوگ کیسے باہر آتے ہیں۔'' طارق سر برہمی سے پیچھے ہوئے اور پولیس کو راستہ دیا۔ساجد خان نے غاذان کو پیچھے سے دھکا دیا،وہ آگے لڑکھڑایا،یکدم عبادہ آگے آئی اور ہاتھ اٹھایا۔

''ایک منٹ سر.....'' اس نے روکا،ساجد خان رک گیا۔وہ قدم قدم چلتی غاذان کے پاس آئی،چند انچ دور ٹھہر کے اس نے سر اٹھا کے اسے دیکھا،آنکھوں میں وحشت مچل رہی تھی۔

''دیکھ لو غاذان.....تمہیں ہرا دیا ہے میں نے.....'' اس نے فاتحانہ انداز میں سر کو خم دیا۔غاذان کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ پڑ رہا تھا۔

''کیوں کیا تم نے غاذان ایسا؟ میرے بھروسے۔میرے مان کا ایسا صلہ کیسے دے سکتے ہو تم؟ اس انجان سرزمین پر اگر میں کسی کو ہم خیال مانتی تھی تو وہ تم اور گل تھے۔تم مجھے ایسے کیسے سکیم کر سکتے ہو۔یہ گھوڑے میرے تھوڑے ہی تھے۔یہ علاقہ،یہ سرداری،یہ پیسہ،دولت جائیدادیں میرے تھوڑے ہی تھیں۔یہ سب تم لوگوں کا تھا۔میں تو ایک مہمان تھی جو لاہور سے تم لوگوں کی مدد کے

لیے آئی تھی۔ میری اس طرح تضحیک کر کے، مجھے ابتہاج سے گالیاں پڑوا کے، یوسف خان کے آگے بچگانہ اور طفلانہ ثابت کر کے تمہیں کیا ملا؟ میرے ہسپتال اور میرے پیشے پر کس قدر بڑے تہمت لگائی ہے تم نے غاذان۔

تم نے خود ہی کہا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہوئے۔ ڈاکٹریٹ ہو۔ کیا تمہیں کسی کتاب نے نہیں سکھایا کہ اچھا کیا ہوتا ہے اور برا کیا ہوتا ہے؟ اگر کسی لڑکی کو جو تمہاری مہمان بن کر آئی ہو، اسے یوں بے عزت کرنا تمہاری تعلیمی قابلیتوں میں شامل تھا تو میں تمہارے اس ہنر پر تمہیں سلام پیش کرتی ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ لندن کے تعلیمی اداروں نے تمہیں یہی سکھایا۔"

"ہونہہ....." غاذان نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"میں نے کیا ہی کیا تھا جو تم نے مجھے بھی اپنا وکٹم بنا دیا؟ ہاں۔ میں تو مخلصی اور ایمانداری سے علاج کر رہی تھی۔ اس میں تمہاری سچائیاں سامنے آ رہی تھیں تو میرا کیا قصور؟ میں نے تھوڑے ہی کہا تھا ایسی گھناؤنی حرکتیں کرو۔ تم نے گل کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اپنا وکٹم بنایا۔ ابتہاج کو بھی وکٹم بنایا۔ جو جو تمہارے آڑے آ رہا تھا تم نے سب کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا۔ کسی کی عزت پامال کی تو کسی کو زخمی کیا۔ کسی کا شخصی اعتبار تباہ کیا تو کسی سے اس کا پالتو چھین لیا۔ تم انسان ہو کہ جانور ہو۔"

غاذان کے چہرے پر ندامت کا سایہ تک نہیں تھا۔ وہ اب بھی ڈھیٹوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

"تمہارے مہنگے پرفیوم..... برانڈڈ کپڑوں..... یونیک فیشن سٹائل..... اور اس (چہرے کے آگے انگلی گول گول گھمائی) شکل نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا غاذان خان..... میں متاثر ہوئی تھی تو صرف تمہارے کردار اور تمہارے اخلاق سے کیوں کہ اس دوران میں تمہارا موازنہ ابتہاج سے کر رہی تھی۔ لڑکیاں ان چیزوں پر تب مرتی ہیں جب یہ منہ اور یہ زبان بھی پھول کھلائے۔ جب اس زبان اور اس کردار میں کھوٹ ہو تو میں تو کیا ہر لڑکی تم پہ تھوکے گی بھی نہیں۔"

اس نے تمسخر بھری نظر اس کے وجود پہ ڈالی پھر راستہ چھوڑ دیا۔ ساجد غاذان کو گردن سے پکڑ کے آگے لے گیا۔

''میں نہیں چھوڑوں گا کسی کو۔ میں واپس آؤں گا عبادہ سلیم۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔'' وہ چیختا چلاتا رہا۔ ساجد خان نے اسے موبائل میں بٹھایا، دروازہ بند کر کے بڑا سا تالا لگا دیا۔ عبادہ نے گہری سانس لی۔ جو گرجتے ہیں وہ کبھی نہیں برستے.....

پولیس کے سارے سپاہی مجرموں کو لے کر اپنی گاڑیوں میں چڑھ گئے۔ آج وہ شندور کی سرزمین سے خطرناک اپرادھیوں کو لے کر جا رہے تھے۔ زن زن ساری گاڑیاں وہاں سے چلی گئیں۔ پیچھے دھول چھٹتے ہوئے رہ گئی۔

وہ تھکن سے مڑی تو ٹھٹک گئی۔ سر طارق پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ اس کا پارہ ہائی ہوا، وہ مٹھیاں بھینچتی ہوئی قریب آئی۔

''ویل ڈن مس سلیم..... آپ تو جاسوسی بھی اچھی کر لیتی ہیں۔ گڈ۔ ویری گڈ۔'' وہ اس کے تاثرات کو نظر انداز کر کے بولے۔

''اگر دوبارہ مجھے بلیک میل کر کے ایسی خطرناک جگہ پہ بھیجا تو میں آپ کو بھی اپنے کولیگز پر تشدد کرنے کے جرم میں گرفتار کروا دوں گی۔'' وہ ان پر جھپٹتے جھپٹتے رہ گئی۔ ''آپ بھی ظالم ہیں۔ سفاک ہیں۔ ایک لڑکی کو ان مگرمچھوں کے جھنڈ میں بھیج دیا۔ آئندہ ایسا کیا تو میں آپ کو گنجا کر دوں گی۔''

''ایسا ہے کیا؟'' طارق سر پہ ہاتھ رکھ کے بے اختیار پیچھے ہوا۔

''جی.....'' وہ حلق کے بل چلائی۔

''میں تو سوچ رہا تھا آپ کو چھانگا مانگا بھیج دوں..... وہاں کی لومڑیاں کم ہو رہی ہیں لیکن خیر.....'' طارق نے کھسیا کے کہا۔ عبادہ ٹھٹکی۔

''لومڑیاں؟''

''ہاں..... پتہ نہیں کہا جا رہی ہیں۔ پیداوار میں کمی دیکھی گئی ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولے۔ عبادہ نے تشویش سے سر جھکا دیا، چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ یکدم ان کی کھی کھی سنائی دی، اس نے جھٹ سے سر اٹھایا، وہ ہنس رہے تھے۔

''آپ.....'' وہ مٹھیاں بھینچ کے کہتے کہتے رکی.....اور پھر.....اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''مذاق کر رہا تھا۔ اب تمہیں نہیں بھیجوں گا کہیں۔'' وہ نرمی سے بولے۔

'' فکر مت کریں.....حویلی میں ریشم نام کی لومڑی رہتی ہے۔ جاتے ہوئے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ پیدا کر لے گی بہت ساری لو.....مڑی.....یاں.....'' وہ کندھے جھٹک کے کروفر سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ طارق سر نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک دن بعد.....

حویلی میں دستار پوشی کا جشن ہو رہا تھا۔ مردان خانے میں لان کا حصہ مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی سرخ گاؤ تکیوں والی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دو دو، تین تین مرد نفیس کپڑے پہنے، نکھرے نکھرے چہروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آج پورا چترال یہاں سمٹ آیا تھا۔

سربراہی نشست عین درمیان میں تھی جس کے آگے ایک گول میز پڑی ہوئی تھی۔ میز پر قینچی، پانی کا گلاس اور کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ شاہ سردار اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ میز کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ باقی قبیلوں کے سردار ان پہلی پہلی چارپائیوں پر براجمان تھے جب کہ قبائل کے خاص لوگ پیچھے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ سربراہی نشست کے ساتھ ایک وہیل چیئر پر ابتہاج

بیٹھا ہوا تھا۔ایک ہاتھ پٹیوں میں لپٹا، گردن سے لٹک رہا تھا اور دوسرا ہاتھ گود میں تھا۔ ماتھے پر سفید پٹی لگی ہوئی تھی۔ چہرے اور بازوؤں پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ٹھنڈا، یخ۔

مجاہد خان، خالد خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ان کے ساتھ والی چارپائی پر طارق سر، عبداللہ اور حجاز دستگیر بیٹھے ہوئے تھے۔طارق سر پہلی بار یہ سب دیکھ رہے تھے۔ان کے چہرے پر دلچسپ مسکراہٹ تھی۔

سب سربراہی نشست کے آگے کھڑے یوسف خان کو دیکھ رہے تھے جو سفید کپڑے پہنے، سرمئی شال کندھوں پر ڈالے، سر پہ دستار رکھے، اپنے مصنوعی ہاتھ کو انگلیوں سے سہلا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر حزن تھا۔

پورا چترال غاذان اور اس کے باپ کی شاطر چالوں سے واقف ہو چکا تھا۔وہ یہ جان گئے تھے کہ کل رستم کے اعلان کے دوران پولیس ان دونوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔اب سب کے دماغ میں دستار کے حوالے سے سوال پنپ رہے تھے۔دستار کا کیا ہوگا؟ اگلا سردار کسے چنا جائے گا۔ابتہاج کو تقریب میں دیکھ کے سب ہی کے دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ یقیناً اب اگلا سردار ابتہاج ہوگا۔یوسف خان اپنے بیٹے کو نامزد کریں گے۔

یوسف نے ایک طائرانہ نظر اس ہجوم پہ ڈالی، دور دور تک سفید کپڑوں میں ملبوس لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔منتظر اور الجھے ہوئے چہرے تھے جو انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہر انسان کے تاثر میں تشویش رقم تھی۔ ہر آنکھ بتا رہی تھی کہ وہ کتنی متذبذب ہے۔

''آپ سب کی آمد کا بہت بہت شکریہ۔''یوسف خان نے کھوواری زبان میں کہنا شروع کیا۔ الجھے ہوئے چہرے الرٹ سے ہو گئے۔

''میں مشکور ہوں کہ آپ سب ان حالات کے باوجود یہاں آئے جو چترال کی تاریخ میں کبھی

نہیں آئے تھے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ہونے والا سردار گرفتار ہو چکا ہے.....آپ لوگ اس تقریب میں آئے اور اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔ (دل پہ ہاتھ رکھا۔) یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے اور مجھے اتنی عزت اور میرا اتنا لحاظ کرنے کے لیے آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

مجلس نے تابعداری سے سر خم کیا۔ چہرے ہلکے ہلکے مسکرائے۔

"آپ سب حالات سے واقف ہیں۔ دو دن پہلے شندور میں کیا ہوا۔ آپ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سب کے بعد جتنی تکلیف آپ لوگوں کو ہوئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف سے میں گزرا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ غاذان میری محبتوں، میری قدردانیوں اور میری امیدوں کا یوں جواب دے گا۔ میرا بیٹا آپ سب کے سامنے ہے۔ میں چاہتا تو اسے ولی عہد چن سکتا تھا لیکن میں نے اسے چنا کیوں کہ میں نے اسے سرداری کے اصولوں پر پرکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے بچے کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں لیکن اس وقت مجھے خون اور رشتوں کا لحاظ نہ تھا۔ مجھے چترال کی فکر تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انسان کو عہدے کے اصولوں پر پرکھنے سے قبل اخلاق اور انسانیت کے اصولوں پر بھی پرکھنا چاہیے۔ اس کی خوبیوں اور اس کی خامیوں کا امتحان بھی لینا چاہیے۔ ایک بدکردار اور بداخلاق عہدے دار سے ایک نالائق عہدے دار بہتر ہوتا ہے۔ اس بچے نے خود کو ہر طرح سے بہترین ثابت کیا تھا۔ چاہے وہ کوئی بھی حالت ہو، کسی بھی قسم کا وقت ہو، اس نے اپنی عقل مندی کے جوہر دکھائے جس نے نہ صرف مجھے بلکہ آپ سب کو بھی حیرت میں ڈالا ہوگا۔"

محفل میں چہ میگوئیاں سی سنائی دیں۔

"میں اس کی ہنرمندی کو دیکھ کے بہت خوش تھا کہ اٹھارہ سال بعد چترال کو اس کا حقدار سردار مل جائے گا۔ جس کا مستحق چترال ہے۔ وہ شخص آ گیا ہے۔ خدا کی قسم اگر مجھے ذرا بھی بھنک ہوتی

کہ وہ جو کر رہا ہے اپنے باپ کے کہنے پر کر رہا ہے تو میں کبھی اس بچے کی قابلیت پر یقین نہ کرتا۔ وہ معصوم تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں یہ چالاکیاں، یہ شیطانیت اس نے اپنے باپ سے سیکھی ہیں۔ (وہ ابھی بھی غاذان کے کیے پر یقین نہیں کر رہے تھے۔) اس کے باپ نے اپنے بچے کو مہرہ بنا کر اپنے اٹھارہ سال قبل ہونے والی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہا تھا۔ میرے پیٹھ پیچھے، کتنی دنیا غارت ہو رہی تھی، مجھے اس کی بھنک تک پڑنے نہیں دی گئی۔"

وہ چاروں طرف گھوم رہے تھے تاکہ سارے جرگے میں آواز پہنچ سکے۔

"شندور میں چھ گھوڑے انعام کرنے ہیں۔ یہ مشورہ اس کا تھا۔ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ خود یہ چھ گھوڑے بھی اسی نے چنے۔ ان کا خیال۔ اس کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔ مجھے ڈھارس تھی کہ اب کی بار شندور میں ہمارا کھویا ہوا مقام ہمیں واپس مل جائے گا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ان گھوڑوں کو مارے گا۔ اس نے کب زہر منگوایا، کب عتاب میں گھوڑے بیمار کیے، کب وہ جھوٹے ڈاکٹر لاتا رہا۔ کب اسے منیب خان کی سہولت کاری ملی، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔" وہ بے بسی سے کہہ رہے تھے۔

"ایک سردار ہونے کے ناطے تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا۔" خالد خان نے ٹونٹ کی۔ یوسف خان پلٹ کے اسے دیکھنے لگے۔

"کیسے ہوتا خان؟ میرے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ میرے سامنے اس نے کبھی میری بات سے انکار کیا نہ میری رائے سے اختلاف۔ میں نے اسے جہاں بھیجا۔ وہ گیا۔ جو مسئلہ حل کرنے کا کہا۔ اس نے کیا۔ میرے لیے وہ ایک اچھا اور نیک انسان بنا رہا تھا۔ پیچھے اس کا کردار کیا تھا۔ اس کا باطن کیسا تھا۔ اس کے ارادے کیا تھے۔ میں کیسے جان سکتا تھا؟"

"جس کا باپ بھگوڑا ہو۔ اس لڑکے پر تم نے اعتبار کر کے اچھا نہیں کیا۔ نعیم اور کلیم اللہ کے

جانے کے بعد ان کی اولادوں کی پرورش کی ذمہ داری تم نے اٹھائی تھی۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کیا کیا کر رہے ہیں۔"

"میں صرف ایک تایا نہیں ہوں خالد خان۔ میں ایک سردار بھی ہوں۔ یہ مت بھولو۔ میں گھر میں بیٹھا کوئی بے روزگار مرد نہیں جسے زنان خانے کے اندر ہونے والے ہر معاملے کا علم ہو۔ میں ایک سردار ہوں۔ میرا دن تین جگہوں پر گزرتا ہے اور رات جب جہاں آجائے۔ ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے میں زنان خانے نہیں گیا۔ مجھے کیسے علم ہو سکتا تھا؟" وہ شانے جھٹک کے بے بسی سے بولے۔

"اس لڑکے نے جو کیا..... وہ ہماری پس پشت ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہمارے شک اور ہماری الجھنوں کو ختم کرتے ہوئے بھی کیا ہے۔ جب ہم نے گھوڑوں کے بارے میں تحقیق کرائی تو کس نے کی؟ خود اسی نے کی اور کن کا نام لیا؟ ان سات ملازموں کا۔" مجاہد خان نے تلخی سے کہا۔ "اس نے ایک مہرہ کھیلا ہو تو ہم کو پتہ چلتا ناں۔ اس نے تو کئی چالیں ساتھ چلی ہیں۔"

"یہ تو بھلا ہو اس ڈاکٹر کا جو لاہور سے آئی اور جس نے پوری جی جان لگا دی لیکن اس مکار کو اپنے شیطانی منصوبوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس بچی نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی۔ وہ لاہور سے آئی، گاؤں قبیلوں کی ریت رسموں سے ناوقف لڑکی تھی، اسے تو دانستہ اور نادانستہ ہمارے معاملوں سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اسے جان کی پرواہ اور عزت کی پرواہ کرنی چاہیے تھی لیکن اس نے کسی چیز کا لحاظ نہیں کیا اور لڑتی رہی۔" وہ دل سے کہہ رہے تھے۔

"تمہیں اس لڑکی کا مشکور ہونا چاہیے یوسف خان۔" شاہ سردار نے جتایا۔

"میں ہوں۔ کس نے کہا کہ میں نہیں ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے اور اس کے استاد (طارق سرکو دیکھا) ان کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے میری اتنی مدد کی۔ اگر میں اس عیار کی باتوں کا یقین کرتا تو آج یہاں اس کے سر پر دستار رکھ رہا ہوتا۔ میرے لیے تو اس نے خود کو

ہمیشہ فرشتہ ثابت کیا ہے۔'' وہ تاسف سے کہنے لگے۔ابتہاج نے ناک بھوں چڑھالی۔(اپنے بیٹے کا اعتبار انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔)

''مجھے سب سے زیادہ افسوس تمہاری سوچ پہ ہو رہا ہے یوسف.....'' رحمان نے گلا کھنکارتے ہوئے مداخلت کی۔یوسف خان نے نادم سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔''تم نے کیسے مان لیا کہ چترالیوں کے سامنے تمہاری عزت رکھنے والے وہ گھوڑے ہی ہیں۔ان گھوڑوں کا شندور میں جانا اور نہ جانا تمہاری عزت کو کم کر سکتا ہے؟'' سوالیہ نگاہیں۔تاسف بھرے چہرے۔

''چترال کے لیے تم بہت معزز ہو۔ہمارے لیے، ہمارے قبائل کے لیے تمہیں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے تھا۔کیا ہو جاتا اگر گھوڑوں کے بارے میں ہمیں یا کسی اور کو علم ہو جاتا؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ بیماریوں کا عزتوں سے تعلق نہیں ہوتا۔ہماری تو چالیس چالیس ساٹھ ساٹھ مرغیاں ایک ہفتے میں مر جاتی ہیں تو کیا ہم ان کو یہ سوچ کر ہسپتال نہیں لے کر جائیں گے کہ ہماری عزتوں کو کچھ ہو جائے گا؟''

یوسف خان نے سر جھکا دیا۔

''یوسف خان.....'' خالد خان بولا۔''تمہاری عزت ہماری عزت ہے۔تم بڑے ہی نادان ہوں جو تم نے ہمیں اتنے گھٹیا پیمانے پر پرکھا تھا۔یقین کرو۔ہم تمہیں کبھی شندور کے گھوڑوں کا طعنہ نہ دیتے۔''

''چترال جتنا تمہارا ہے۔اتنا ہم سب کا ہے۔ہم سب اس کی عزت ہیں۔ہماری سلامتی، اس کی عزت ہے۔یہ گھوڑے، مال مویشی، یہ ہماری عزتیں نہیں ہیں اور نہ ہی یہ ہمارے ناموس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' رحمان نے نرمی سے کہا۔

''تمہیں لگا کہ شاید ہم تمہیں رسوا کر دیں گے۔ہونہہ۔ہم تمہاری عزت کے لیے لڑنے والے

لوگ ہیں یوسف خان۔ہم تمہیں کبھی رسوا نہیں کریں گے۔'' خالد خان نے کہا۔یوسف خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔جس بدنامی کے ڈر سے انہوں نے پچھلے دو ماہ سے ٹھیک سے سانس نہیں لی تھی۔آج پتہ چلا، وہ تو بدنامی تھی ہی نہیں۔بھلا اس چیز کا بدنامی سے کیا تعلق۔

''ہمارے قبیلے نے مہتر ہونے کے باوجود اٹھارہ سال سے شندور سے دوری سہی ہے۔نعیم اللہ کے گناہ نے ہمیں آنکھیں اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔مجھے ڈر تھا کہ میں نے بڑے چاؤ سے گھوڑوں کا اعلان کیا ہے۔اب اگر میں مکر جاؤں گا۔معذرت کروں گا تو مجھے آپ لوگ کم ظرف کہیں گے۔مجھے تنگ نظر ہونے کا طعنہ دیں گے۔''

''ہم ایسا کیوں کریں گے یوسف خان؟'' خالد خان نے خفگی سے کہا۔''کیا ہم تم ایک نہیں ہیں؟''

وہ لاجواب ہو گئے۔

''مجھے ڈر لگ رہا تھا۔''

''ہم چترالی ہیں۔ہم بھائی بھائی ہیں۔ہمارے دکھ، عزتیں، خوشیاں اور کامیابیاں سانجھی ہیں۔کسی بھی مشکل حالت میں خود کو اکیلا مت سمجھو۔ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔کیوں بھائیو؟'' خالد خان نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''جی ہاں۔بالکل۔بالکل۔'' بیک وقت کئی آوازیں بلند ہو گئیں۔یوسف خان نے تھوک نگل کر اپنے آنسو روکے۔حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ایسا سوچا۔آپ سب مجھے معاف کر دیں۔'' انہوں نے ندامت سے سر جھکا دیا۔

''ایسے مت کہو۔تم ہمارے بھائی ہو۔'' خالد خان اٹھ کر ان کے گلے لگ گیا۔وہ اپنی جگہ بالکل

ہل کے رہ گئے تھے۔اس کا چترال،اس کے قبائل اس سے کتنی محبت کرتے تھے آج پتہ چلا تھا۔ یہ تلخیاں، یہ دشمنیاں کبھی قبیلے کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ یہ تو اپنے خاندان، دو بھائیوں کی لڑائی تھی۔ اس میں کسی قبیلے نے کچھ نہیں کیا تھا۔وہ پرامن لوگ تھے۔ پرامن رہنا پسند کرتے تھے۔ پہاڑی لوگ کبھی تشدد پسند نہیں ہوتے۔

خالد خان نرمی سے پیچھے ہو گئے۔

''تو اب تم کس کو یہ دستار پہنانا چاہتے ہو یوسف خان؟'' شاہ سردار نے آنکھیں سکیڑ کے پوچھا، وہ ٹھوڑی کو انگلیوں سے سہلا رہے تھے۔

یوسف خان نے گہری سانس لی۔ یہ جرگے، یہی سننے کے لیے آیا تھا۔ چترال کا گھر گھر، گاؤں گاؤں اس اعلان کا منتظر تھا اور شاہ سردار اپنے اعلان کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ یوسف خان شال سنبھالتے ہوئے جھکا اور میز سے فائل اٹھائی۔ اپنے تندرست ہاتھ میں فائل کو اوپر اٹھایا یوں کہ ان کا اٹھا ہوا ہاتھ سب نے دیکھ لیا۔

''یہ ہے آپ کا نیا سردار۔'' انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔ محفل میں اضطراب دوڑ گیا تھا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو الجھ کے دیکھا۔ چہ میگوئیاں ہوئیں، کچھ آوزیں، کچھ کھسر پھسر.....

''یہ کون ہے؟'' شاہ سردار نے پیشانی پر بل ڈالے۔

''یہ ہے اس نظام کا اختتام۔''

''کیا؟'' وہ بری طرح چونک گئے۔

''جب میری باری تھی تب چترال کے لیے میرے چھوٹے بھائی لڑ رہے تھے۔ دونوں بھائی نااہل ہوئے تو بابا نے میری نااہلی کو بھی پسِ پشت ڈال دیا اور مجھے اس (مصنوعی ہاتھ اٹھایا) کے ساتھ سرداری کی کرسی پر بٹھا دیا۔ یہاں، اسی مقام پر مجھے یہ دستار پہنائی گئی اور میری کندھوں پر

چترال کی ذمہ داری کی شال ڈال دی گئی۔ میرے آگے بہت محاذ تھے۔ نئی دشمنی بنی تھی۔ منصب کے مخالفین تھے۔ سرداری کے اصولوں کی پامالی پر میری سرداری متنازعہ ہوگئی تھی۔ گل یتیم ہوگئی تھی۔ نعیم چلا گیا تھا۔ ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ میں نے دن رات محنت کر کے حالات کو سدھارا۔ اپنی معذوری کو کسی کام کے آڑے نہیں آنے دیا۔ بابا کے جانے کے بعد یہ بوجھ مزید بڑھا۔ جب تک وہ زندہ تھے مجھے ڈھارس تھی کہ میں اکیلا نہیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سات لاکھ کی آبادی کے سامنے خود کو تنہا پایا۔ تب میں نے کسی چیز کو خود پہ حاوی نہیں ہونے دیا اور انتھک محنت کی۔ میں جو اس منصب کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے خود کو بنایا۔

غاذان وہ واحد سردار تھا جس کے مقابلے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو بھی اس کے مقابلے میں نہیں کھڑا کیا۔ اس کو یہ مقام تنہا دیا۔ اکیلے۔ اب جب وہ نہیں رہا تو میرے یعنی یوسف خان کے پاس دوسرا کوئی سردار نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو میں کسی کو نامزد نہیں کرنا چاہتا۔"

پوری محفل میں کرنٹ دوڑ گیا۔ سب بے چینی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"میں جو فیصلہ کرنے جا رہا ہوں، وہ چترال کے حق میں ہے۔ آپ سب کے حق میں ہے اور مجھے پورا یقین ہے یہ تمام سرداران میرے اس فیصلے سے اتفاق کریں گے۔" وہ مان سے مسکرائے۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ "میں نے..... چترال کا..... یونین کونسل سے الحاق کر لیا ہے..... آج کے بعد چترال پر کوئی سردار حکومت نہیں کرے گا..... آج سے چترال آزاد ہے۔"

پورے چترال کے پہاڑ شاہ سردار پہ آن گرے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ فیصلہ اس لیے ہے کہ یہاں موجود بہت سے قبائل کو سرداروں سے مسائل ہیں۔ ہم سردار آپ کے متوالے تھے۔ رکھوالے تھے مگر جیسے جیسے وقت بدل رہا ہے۔ نسلوں کی ترجیحات بدل رہی ہیں۔ وہ پڑھ لکھ کر شہری زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ قطعی بڑی بڑی ڈگریاں لے کر اس گاؤں میں

رہنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہم لوگ تھے جنہوں نے آبائی اقدار کی پرواہ کی اور جی جان سے گزر گئے۔ اب تو نیا زمانہ آ گیا ہے۔ بچے سردار نہیں بننا چاہتے، بچے وکیل ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ ایسے میں، میں کیوں تمام قبائل کے بچوں کو کمتری میں ڈالوں۔ جہاں پوری دنیا جدید ہو رہی ہے۔ وہاں چترال کیوں نہیں؟ تو آج سے۔ سب آزاد ہیں۔ اس علاقے پر اب کھووا روں کا کوئی حق نہیں۔ ہم اپنے حقوق سے دستبردار ہوتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ اب ہم صرف اپنے مسائل اور اپنے معاملات کے ذمہ دار ہیں۔

ہم کسی بھی قبیلے، گاؤں اور علاقائی مسائل میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ چترال کے باسیوں کو کسی بھی چیز کے لیے ہماری اجازت کی ضرورت نہیں۔ یہ سردار..... یوسف خان ولد سرور خان ولد ولی خان..... سرداری کے نظام کا خاتمہ کرتا ہے۔"

انہوں نے اعلانیہ کہتے ہوئے دستار سر سے اتاری، ان کے سیاہ بال ماتھے پر بکھر گئے۔ محفل سانس روک کے انہیں دیکھنے لگی۔ انہوں نے دستار میز پر رکھی اور قینچی اٹھاتے ہوئے دستار میں لگے شملہ کو کاٹ دیا پھر شملہ کو بلند کیا۔

"یہ ہے وہ منصب جس کے لیے میرے بھتیجے نے رشتوں کی پرواہ نہیں کی۔ آج میں اس منصب کو..... پیروں تلے روندتا ہوں۔" انہوں نے وہ ٹکڑا نیچے پھینکا پھر جوتے سے مسل دیا۔ محفل نے کئی آہیں بھریں۔ انہیں اس سب کی قطعی امید نہیں تھی۔ شاہ سردار حیرت سے یوسف کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ انہوں نے کب یہ الحاق کرایا؟ حیرت سے سب کا برا حال تھا۔

"آج سے سارے قبائل آزاد ہیں۔ ہم کھووار ہر چیز سے دستبردار ہوتے ہیں۔" وہ قینچی پھینکتے ہوئے مسکرائے اور یہ مسکراہٹ پورے دل سے نکلی تھی۔

شاہ سردار بے اختیار اٹھا اور قدم قدم بھرتے ہوئے ان کے پاس گیا اور وارفتگی سے انہیں گلے

لگایا۔ یوسف خان نے محبت سے ان کی پشت سہلائی۔

"محض چند لوگوں کی وجہ سے آپ نے ہم سے بغض پالا تھا شاہ سردار۔ قبائل کب برے ہوتے ہیں؟ قبیلوں کے لوگ برے ہوتے ہیں۔ چترال ہو یا گلگت، کسی کی ذاتی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک دوسرے کے لیے کینہ رکھتے ہیں۔ یہ چند لوگ ہوتے ہیں۔ چند لوگ۔ جن کی وجہ سے پورا قبیلہ بدنام ہو جاتا ہے۔" وہ ان کے کان میں کہہ رہے تھے۔ باقی سرداران بھی گلے لگنے کے لیے اٹھ گئے تھے۔

اور پھر اس تلخیوں کے موسم کے بعد چاشنی کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ منظر اوپر سے دیکھا جائے تو سب سردار یوسف خان سے گلے مل رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ انہوں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ اب وہ اپنی ساری جائیدادیں بی جان کی مرضی سے تمام بھائیوں میں تقسیم کر دیں گے اور پھر اپنا اپنا حصہ پا کر جو مرضی کریں۔ کسی کو پرواہ نہیں ہوگی۔ وہ بھی سکون سے رہیں گے اور باقی بھی۔ نہ دشمنی ہوگی اور نہ ہی کوئی دکھ ہوگا۔

آج انہوں نے خود کو دستاری کے بوجھ سے آزاد کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اسی دن شام کو.....

چترال ائیر پورٹ کا منظر تھا۔ شام کی سیاہی چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ چترال کے کھردرے پہاڑ بھیانک لگ رہے تھے۔ جہاز تیار تھا۔ ان کا سامان لوڈ ہو رہا تھا۔ وہی لوگ ٹرمنل میں کھڑے تھے۔ گل اداس تھی، عبادہ جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ طارق سر بھی تھے۔ ائیر پورٹ پر اسے یوسف خان، مجاہد خان، بریخنہ، بی جان، گل، ابراہیم اور مہابت خان چھوڑنے آئے تھے۔ وہ جب آ رہی تھی، تو اسے لینے کے لیے ابتہاج آیا تھا لیکن اسے چھوڑنے کے لیے وہ نہیں آیا تھا۔

وہ جب حویلی سے نکل رہی تھی تب وہ اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے نظر آیا تھا۔اس نے دانستہ ہی اوپر دیکھا تھا لیکن جب اس سے نظریں ملیں تو ابتہاج نے پردے برابر کر دیے۔وہ عبادہ سے ناراض نہیں تھا بس اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کتنا شک کیا تھا اس پر۔ لاشعوری طور پر اس کے بارے میں کتنے برے خیالات بنا لیے اس نے۔

ان کی فلائٹ کچھ دیر میں تھی۔گل بار بار اس کا ہاتھ پکڑ کے بچوں کی طرح کہہ رہی تھی۔

''نہ جاؤ۔اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔بعد میں چلی جانا۔''

وہ جان وار جاتی۔''میں دوبارہ آؤں گی گل۔بارات لے کر۔'' وہ شرارت سے کہتی۔گل جھینپ جاتی لیکن پھر وہی ضد دہرا لیتی۔

''دوبارہ کب آؤ گی عبادہ؟'' بی جان نے اپنائیت سے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔''جب آپ گل کا ہاتھ میرے بھائی کے ہاتھ میں دیں گی۔'' اس نے گل کو دیکھتے ہوئے آنکھ دبائی۔گل بلش کر گئی اور وہ سب ہنسنے لگے۔اس نے بریخنہ سے گل کا ہاتھ مانگا تھا۔ بریخنہ جانتی تھی کہ حویلی میں گل کا کسی کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔وہ پڑھ لکھی ہے۔پڑھے لکھے آدمی سے شادی کرے گی۔ان سب کے دل و دماغ اور مسفرہ کی وصیت کے بعد ہمیشہ سے غاذان کا خیال رہا تھا لیکن اس کی کمینگی کے بعد وہ گل کے دل و دماغ سے ایسے اترا تھا جیسا کبھی رہا ہی نہیں تھا۔

عالیہ نے دوبارہ اپنی پیشکش رکھنے کی کوشش کی مگر اسد نے خود ہی منع کر دیا۔وہ گل سے شادی کے بارے میں ''سوچ'' بھی نہیں سکتا تھا۔

احمد کے بارے میں عبادہ کی زبانی انہوں نے جو کچھ سنا۔اس پر اعتراض نہیں تھا۔اگر اس لڑکی نے بنا کسی مفاد کے ان کو خون کی جنگوں سے بچایا تھا تو وہ گل کے لیے اس کا مان کیسے توڑ سکتے

تھے۔انہوں نے ہامی بھر لی تھی اور خود گل کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔اسے تو عبادہ کے ساتھ رہنا تھا چاہے جو کچھ ہو جائے۔

''میں امی ابو کے ساتھ آؤں گی بی جان۔کچھ ہی دِنوں میں۔تب ہم رسم کریں گے اور گل کو لے کر جائیں گے۔جب تک (اس نے گل کا گال چھوا۔) یہ آپ کے پاس امانت ہے۔اس کا خیال رکھنا ہے۔'' وہ نصیحت آمیز لہجے میں بولی تو بی جان مسکرائیں۔

''ہمیں تم جیسی قابل ڈاکٹر سے رشتہ داری جوڑ کر اچھا لگے گا۔''

''مجھے بھی۔'' عبادہ مسکرائی۔

وہ سیاہ پینٹ، گلابی شرٹ میں ملبوس تھی۔مفلر گلے سے لٹک رہا تھا۔ہاتھ میں گلابی ڈائل والی گھڑی تھی۔

''بچے.....'' یوسف خان نے دھیرے سے پکارا۔وہ مڑی۔

''جی۔''

''مجھے دھمکا کے اچھا تو نہیں کیا لیکن میں بتا دوں میں ابتہاج کو قطعی اس لیے نہیں بھیج رہا تھا۔میں تو رستم کو بچانا چاہتا تھا۔ساری حویلی سے۔'' انہوں نے جانے یہ بات کتنی بار دہرائی تھی۔عبادہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

''مجھے یقین آ گیا ہے خان۔بس کر دیں۔''

''نہیں وہ.....آپ نے میری نیت پہ بے تحاشا شک کیا تھا۔'' وہ ٹونٹ کر رہے تھے۔

''اس میں میرا کیا قصور۔میں شہری لڑکی ہوں۔مجھے قبیلوں کا کیا پتہ۔'' وہ شانے اچکا کے مسکرائی تو سب ہنس پڑے۔باتوں ہی باتوں میں فلائٹ کا اعلان ہوا،اس نے بیک پیک پہنا اور جہاز کی طرف چل پڑی۔گل کی اور بریحنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔پورے ایک ماہ بعد حویلی

سنسان رہی تھی۔عبادہ جو گل کا ایک عکس تھی۔وہ کمرے میں جاتی تو عبادہ پہ نظر پڑتی،اسے بے وجہ ہی سب اچھا لگتا۔

ہوتا ہے ناں ایسا؟

کوئی آپ کے ساتھ ہو تو ایک انجانی خوشی ہوتی۔ہمیں پتہ نہیں ہوتا کہ ہم کیوں خوش ہیں لیکن ہم مسکراتے ہیں۔ہمیں دکھ دکھ نہیں لگتے۔ہمیں تسلی ہوتی ہے۔گل کو بھی تھی اور عبادہ کو بھی تھی۔عبادہ جو کبھی اس نیت سے آئی ہی نہیں تھی کہ چترال میں حالات کا سامنا کرے گی اور گل جو اسے کمرے سے نکالنا چاہتی تھی۔اسے ڈانٹتی تھی۔اس پر بھڑکتی تھی۔اسے کیا پتہ تھا،یہی لڑکی مسیحا بنے گی۔

ہم کب،کہاں،کیسے اپنا کردار ادا کر لیتے ہیں ہمیں پتہ نہیں چلتا۔وہ سب تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے۔نہ عبادہ آتی اور نہ گل اپنا خواب پورا کرتی۔ایک چال ہم چلتے ہیں۔ایک ہمارا حریف چلتا ہے اور ایک چال وہ بھی تو ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی مگر کوئی چل جاتا ہے؟یعنی کون؟

چترال نے اسے بہت خوشگوار یادیں دی تھیں،محبتیں،حیرانگیاں،شاک،دکھ،تکلیف اور ناراضگیاں۔وہ کئی رنگوں کا شہر تھا۔کئی امنگوں کا علاقہ تھا۔کھردرے پہاڑوں کے درمیان،دریائے چترال کے کنارے آباد کئی کہانیوں کو خود میں سمیٹ رہا تھا۔ان سب کہانیوں میں ایک لاہور کی لڑکی کی کہانی بھی تھی جس کے تعاقب میں جگنو چل پڑے تھے اور جس کے قدموں میں وارفتگیوں نے زندگی کو جی لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تین گھنٹے میں وہ اسلام آباد پہنچ گئی تھی۔احمد اسے لینے آیا تھا۔طارق سر اپنے ڈرائیور کے ساتھ چلے گئے تھے جب کہ وہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ میں بیٹھی،چترال کے بارے میں احمد کا دماغ کھائے جا رہی تھی۔احمد اس کو دیکھ کے بہت بری طرح چونکا تھا۔

یہ وہ عبادہ نہیں تھی جسے وہ پچیس دن پہلے ائیر پورٹ چھوڑنے آیا تھا۔ یہ کوئی اور عبادہ تھی۔ پہلے تو اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی اور پھر پہچان لیا تو مان نہیں رہا تھا۔ ائیر پورٹ سے گھر تک عبادہ گل اور رستم رٹ رہی تھی اور وہ دانتوں میں مٹھی ڈال کے بے چینی کا شکار ہو رہا تھا۔

گھر پہنچ کے جیسے ہی اس نے مین دروازہ کھولا۔ سامنے اماں، ابا، صائم اور فاطمہ آنٹی صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دروازے کی آواز پر کھڑے ہو گئے۔ فاطمہ آنٹی ڈیزائنر لان کے جوڑے میں ملبوس تھیں۔ گردن میں نفیس سا ہار تھا اور انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں..... وہ کچھ الجھی الجھی مسکرا رہی تھیں۔

''بابا.....'' وہ بھاگ کے ابا کے گلے لگی۔ صائم نے ماں کو دیکھا اور ماں نے صائم کو۔ یہ عبادہ ہی تھی ناں؟..... عبادہ سلیم صاحب کے گلے سے ہٹی پھر ماں کو دیکھا۔ ''اماں.....'' ان کے گلے لگ کے جھول جھول گئی۔ اماں کو یقین نہیں آ رہا تھا یہ ان کی بیٹی ہے۔ احمد سامان دروازے کے ساتھ کھڑا کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

وہ ماں کے گلے سے ہٹی۔ نظر ان دونوں پر گئی جو مروت سے مسکرا رہے تھے۔

''السلام علیکم آنٹی..... ہائے صائم۔'' اس نے پُر جوش سے لہجے میں کہا۔

''وعلیکم السلام..... کیسی ہو بیٹا۔ فلائٹ کیسی رہی؟'' فاطمہ آنٹی نے پوچھا۔

''اچھی رہی۔'' وہ مسکرائی پھر صائم کو بھنویں یکجا کر کے دیکھا۔ ''وزن کم کیا ہے کیا صائم؟ کافی بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''ہاں۔ اس نے پورے پندرہ کلو وزن کم کیا ہے۔'' فاطمہ آنٹی نے فخر سے بتایا۔

''اوہ..... نائس..... اب سمارٹ لگ رہے ہو۔''

''شکریہ عبادہ.....'' وہ ذرا سرد لہجے میں بولا۔ عبادہ مسکرائی پھر مڑ کے بابا کو دیکھا جو اسے اچنبھے

سے سرتا پیر دیکھ رہے تھے۔

''آپ بتائیں بابا۔کیسے ہیں مجھے مس کیا؟'' وہ بچوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے.....'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے..... زور سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔وہ سب بری طرح اپنی اپنی جگہوں پر اچھل اٹھے۔

''نہیں!'' نادیہ لاؤنج کے دروازے میں کانوں پر ہاتھ رکھ کے کھڑی تھی۔پیروں میں پانی کا گلاس کرچی کرچی ہوگیا تھا۔عبادہ گھبرا کے اس کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا نادیہ؟''

وہ اسے آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہوا البتہ صائم استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔اسی لمحے احمد ہاتھ میں چکوری چیز لیے لاؤنج کے اندر آیا۔

''ریلیکس نادیہ۔سنبھالو خود کو۔ابھی حالات زیادہ خراب نہیں ہوئے۔'' اس نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''کون سے حالات؟ کیا ہوا ہے؟'' عبادہ تشویش میں آگئی۔

احمد نے وہ چکوری مشین اس کے قدموں میں رکھی۔''اس پہ کھڑی ہوجاؤ۔''

''یہ کیا ہے؟''

''وزن والی مشین۔''

''وزن.....اس وقت.....''

''ہاں.....''

''مگر کیوں.....''

''باتیں بعد میں.....''

احمد نے اسے مزید بولنے کا موقع دیے بغیر شانوں سے تھام کے زبردستی مشین پر کھڑا کر دیا۔ مشین پر اس کے پیروں کے آگے سبز سٹریپ بنی تھی۔اس پر کچھ ہندسے ابھرنے لگے۔

اناسی.....اسی.....اناسی اور پھر اسی.....

عبادہ نے اس وزن والی مشین کو دیدے پھاڑ کے دیکھا.....اسی.....اسی.....وہ تیزی سے سیدھی ہوئی۔سامنے آئینہ لگا تھا۔اپنا عکس دیکھ کے اس کا دل حلق میں آیا۔ٹھوڑی کے نیچے دہری ٹھوڑی نکل آئی تھی.....گال موٹے ہو گئے تھے۔پیٹ باہر نکل آیا تھا۔

"نہیں....." وہ حلق کے بل چیخی۔اس کا وزن پچیس دنوں میں بیس کلو بڑھا تھا۔پورے بیس کلو۔

صائم دھیرے سے مسکرا دیا۔

ختم شد

http://sohnidigest.com